تصنیف

حضرت شیخ مخدوم علی ہجویری

مترجم

مولوی فیروز الدین

تصوّف کا ایک عظیم شاہکار

بیانُ المطلُوب

اُردُو ترجمہ

کشفُ المحجُوب

تصنیف

حضرت شیخ مخدُوم علی ہجویریؒ

المعرُوف بہ

داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ

مترجم

مولوی فیروز الدّینؒ

لاہور - راولپنڈی - کراچی

مجلد: 969 0 00606 1

باراوّل ـــــــــــــــــ ۲۰۰۳ء

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

ہیڈ آفس وشوروم: 60۔شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

راولپنڈی آفس: 277۔ پشاور روڈ، راولپنڈی۔

کراچی آفس: فرسٹ فلور، مہران ہائٹس، مین کلفٹن روڈ، کراچی۔

کشف المحجوب	Kashaf-ul-Mahjoob
حضرت شیخ مخدوم علی ہجویریؒ	Hazrat Sheikh Makhdoom Ali Hajveri"
مولوی فیروز الدین (مفسّر)	Maulvi Feroz-ud-Din (Interpreter)

چھٹی اشاعت ـــــــــــــــــ ۲۰۱۳ء

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام ظہیر سلام پرنٹر و پبلشر

email:support@ferozsons.com.pk
www.ferozsons.com.pk

فہرستِ مضامین

جناب سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ

ابتدائی حالات:

جنابِ مخدوم کا اسم گرامی علی ہے۔ آپ کا خاندان ہجویر میں رہتا تھا، جو غزنی سے بہت قریب ہونے کی وجہ سے اس کا ایک محلّہ ہی سمجھا جاتا تھا۔ غزنی افغانستان کا ایک مشہور شہر ہے۔ آپ کی پیدائش غالباً وہیں ہوئی۔ اس کے بعد جناب کا خاندان جلاّب آگیا۔ یہ قصبہ غزنی سے ہجویر کی نسبت زیادہ قریب ہے، یہی وجہ ہے کہ جنابِ ممدوح کو علی ہجویریؒ یا جلاّبی کہتے ہیں۔ جناب کے والد کا نام بھی عثمان جلاّبیؒ مشہور ہے۔ آپ حسنی سیّد ہیں۔ ذیل میں جناب کے دو نسب نامے درج کیے جاتے ہیں: ایک نسبی[1] اور دوسرا مشربی[2]۔

(ا) آپ کا نسب نامہ نو واسطوں سے جناب علی کرم اللہ وجہہ سے جاملتا ہے یعنی سیّد علی بن عثمان جلاّبی بن علی بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن ابی الحسن بن حسین بن زید شہید بن حضرت امام حسنؓ شہید بن حضرت علی شہید کرم اللہ وجہہ۔

(ب) مشرب کے لحاظ سے آپ حضرتِ امام اعظم علیہ الرحمتہ کے طریقِ حنفیہ پر تھے اور تصوف میں آپ کا طریقہ جنیدیہ تھا یعنی سید علی ہجویریؒ مرید حضرت خواجہ ابوالفضل غزنویؒ کے اور وہ مرید حضرت علی حصر مکیؒ کے اور وہ مرید حضرت شیخ شبلیؒ کے اور وہ مرید حضرت جنید بغدادیؒ کے، وہ مرید حضرت سری سقطیؒ کے، وہ مرید حضرت معروف کرخیؒ کے، وہ مرید حضرت داؤد طائیؒ کے، وہ مرید حضرت حبیب عجمیؒ کے اور وہ مرید حضرت سیّد حسنؒ بصری کے اور وہ مرید حضرت سید علی المرتضٰی شیر خدا کرم اللہ وجہہ کے اور وہ مرید جنابِ رسول اللہ ﷺ کے۔

لاہور میں تشریف آوری:

لاہور میں آپ کی تشریف آوری کے متعلق یہ روایت ہے کہ آپ کے مرشد حضرت ابوالفضل غزنویؒ نے حکم دیا کہ آپ لاہور تشریف لے جائیں۔ ان دنوں سلطان محمود غزنوی کا ایک لشکر لاہور آرہا تھا۔ حضرت ابوالفضلؒ نے فرمایا کہ سلطان محمود اس سے پہلے کئی مرتبہ ہندوستان پر حملہ آور ہو چکا ہے مگر ہمیشہ فتح یابی کے ساتھ واپس آجاتا رہا ہے۔ اب کی بار آپ اس کے علمبردار ہو کر جائیں اور لاہور پر اسلامی جھنڈا لہرائیں۔ اس پر آپ اپنے دو پیر بھائیوں یعنی حضرت ابوسعیدؒ اور سیّد لطفیؒ کے ہمراہ پرچم اٹھائے واردِ لاہور ہوئے اور شہر کے شمالی جانب دریائے راوی کے نزدیک شب بسری کے لیے ٹھہرے۔

اگلے دن صبح جب شہر میں داخل ہوئے تو آپ کو ایک جنازہ ملا جو حضرت حسین زنجانی ”(قطبِ[3] لاہور) کا تھا۔ آپ اپنے دونوں ساتھیوں کی معیت میں اس جنازے کے ساتھ ہو لیے اور ادائے نمازِ جنازہ کے بعد اس کی تدفین میں بھی حصہ لیا۔ شہر کے مغربی بیرونی حصے میں ہندوؤں کا ایک مندر تھا، جس کے پاس سے دریائے راوی گزرتا تھا۔ آپ نے اس مندر کے قریب اسلامی جھنڈا نصب کر دیا اور فرمایا کہ اب یہ جھنڈا انشاء اللہ قائم اور دیارِ لاہور پر سایہ فگن رہے گا۔ آج کل جہاں ایک پانی کا چھوٹا سا مدوّر حلقہ سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے، جس میں خدام روضۂ مبارک ہر وقت تازہ پانی بھر دیتے

---

[1] نسبی یعنی خاندانی [2] مشربی سے مراد مذہبی اور روحانی بلسلہ [3] قطب کے معنی تو میخ کے ہیں جو کسی ایک جگہ گڑی رہے مگر یہ لفظ اصطلاح میں ایک ایسی ہستی سے متعلق ہے، جس کے ذمے کائنات کی تکوینی خدمات کا تعلق ہوتا ہے۔ اس مقدس ہستی کے ساتھ مددگار کے طور پر اور حضرات بھی ہوتے ہیں، جو ابدال و اوتار وغیرہ کہلاتے ہیں۔

ہیں، زائرین اس پانی کو پی بھی لیتے ہیں اور تھوڑا سا آنکھوں پر بھی مل لیتے ہیں، اسی جگہ دریا کے کنارے آپ کا قیام تھا۔

جوگی کا قبولِ اسلام:

روایت ہے (جس کا کوئی تاریخی ثبوت تو ہے نہیں) کہ ایک دن ایک غریب بڑھیا تازہ دودھ کی مٹکی لیے جا رہی تھی۔ آپ نے آواز دے کر بلایا اور کہا کہ "یہ دودھ قیمت لے کر ہمیں دے جاؤ۔" اس نے کہا کہ "یہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر رائے راجو جوگی رہتا ہے اور یہ دودھ اس کو ہی پہنچایا جاتا ہے اور اگر نہ پہنچایا جائے تو جانوروں کے تھنوں سے بجائے دودھ کے خون آنا شروع ہو جاتا ہے۔" آپ نے تبسم فرما کر کہا کہ "یہ دودھ ہمیں دے جاؤ تو تمہاری گائے کے دودھ میں خدا اضافہ کر دے گا۔" اس پر اس نے وہ دودھ آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ نے اس میں سے بقدرِ ضرورت نوش فرما کر باقی ماندہ دریا میں پھینکوا دیا۔ بڑھیا نے گھر آکر جب شام کے وقت دودھ دوہنا شروع کیا تو گھر کے تمام برتن دودھ سے بھر گئے اور دودھ تھا کہ کسی طرح تھنوں میں ختم نہیں ہوتا تھا۔ جب اس بات کی خبر اس کے ہمسایہ دیہاتیوں کو ہوئی تو دوسرے دن وہ بھی اپنی اپنی دودھ کی مٹکیاں لے لے کر آپ کے حضور میں حاضر ہوئے۔ آپ ہر ایک مٹکی میں سے تھوڑا سا دودھ لے لیتے اور باقی دریا میں پھینکوا دیتے۔ اس طرح ان سب کے مویشیوں کے دودھ میں بھی افزائش ہوتی چلی گئی اور تمام گرد و نواح سے دھڑا دھڑ دودھ آنے لگا۔ اب لوگوں نے رائے راجو جوگی کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ جب اس کو اس بات کا علم ہوا تو وہ آپ کے پاس آیا اور کہا کہ "تم نے ہمارا دودھ تو بند کرا دیا، اب کوئی اور کمال بھی دکھاؤ۔" آپ نے فرمایا: "میں کوئی شعبدہ گر نہیں بلکہ اللہ کا ایک عاجز بندہ ہوں، اگر تم میں کوئی کمال ہے تو دکھاؤ۔" چنانچہ اس نے اپنے استدراج[1] کے کئی کرشمے دکھائے، جن میں سے آخری یہ تھا کہ وہ ہوا میں اُڑنے لگا۔ آپ نے اپنے نعلین اس کی طرف پھینک دیئے، جو ہوا میں ہی اس کی کفش کاری کرتے جاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ واپس آکر آپ کی خدمت میں پہنچا اور آپ کے ہی دستِ مبارک پر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا اور آپ کے ساتھ رہنے سہنے لگا، چنانچہ آپ نے اس کو "شیخ ہندی" کا خطاب دیا اور اس کی روحانی تربیت فرماتے رہے۔ وہ بھی آخری دم تک آپ کے نہایت ہی مخلص مریدوں میں شامل رہا اور اب اس کی اولاد ہی حضرت کے روضۂ مبارک کی مجاورت کر رہی ہے۔

تعمیرِ مسجد:

مخدوم سیّد علی ہجویریؒ نے اس مدوّر حلقے کے نزدیک جہاں آپ قیام رکھتے تھے، اپنے صرفِ خاص سے ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کرائی، جہاں آپ اور آپ کے مرید آخری دم تک نماز پڑھتے رہے۔ کچھ دن کے بعد آپ کو معلوم ہوا کہ بعض علمائے لاہور کو آپ کی تعمیر کردہ مسجد کی سمتِ کعبہ پر اعتراض ہے۔ آپ نے ان سب کو ایک شام دعوت پر بلایا اور خود امام بن کر نماز پڑھانے کے بعد ان کو خطاب کیا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کو اس مسجد کی سمتِ کعبہ پر اعتراض ہے، ذرا نظر اٹھا کر دیکھیے کہ سامنے کعبہ نظر آرہا ہے۔ چنانچہ سب نے بچشمِ خود کعبہ کو سامنے پایا اور حضرت کے کمالات کے قائل ہو گئے۔

تصنیفات:

آپ نے منہاج الدین، کشف المحجوب اور دیوان علی تصنیف فرمائے۔ جن میں سے منہاج الدین اور

[1] استدراج: ہندوستان کے جوگی اور عیسائی راہب جسمانی ریاضت و مجاہدات کے ذریعے جو قوت حاصل کر لیتے ہیں، اس کا مظاہرہ استدراج کہلاتا ہے اور یہ شعبدے سے زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔

دیوان علی تو کہیں ملتے ہی نہیں۔ کشف المحجوب کے ترجمے کی سعادت حق تعالیٰ نے اس عاجز بندے کو بخشی۔ سلسلۂ تصنیف و تالیف و تراجم میں میرا سب سے پہلا کام کشف المحجوب کا ترجمہ ہے جو بہت مقبول ہو چکا ہے۔

کتاب کے پڑھنے سے قارئین کو معلوم ہو جائے گا کہ حضرت داتا گنج بخش علیہ الرحمۃ کی معلوماتِ دین اور خیالاتِ تصوّف کس قدر بلند پایہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب آپ نے لاہور میں اقامت اختیار فرمائی تو محمود غزنوی کی طرف سے ظاہری حاکمانِ لاہور اور ملتان کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ اہم معاملاتِ سلطنت میں آپ کی ہدایت کے مطابق کارفرما ہوں۔

گنج بخش کا لقب:

اربابِ تصوف کا اعتقاد ہے کہ ہر ایک ملک اور قصبے کا جس طرح حاکمِ ظاہری ہوا کرتا ہے، ویسا ہی ایک حاکمِ باطن بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کو دربارِ رسالت سے ہندوستان کی ولایت عطا ہوئی تو حکم ہوا کہ پہلے جا کر سیّد علی ہجویریؒ کے روضۂ مبارک پر اعتکاف کرنا اور ان سے فیض حاصل کر کے راجپوتانہ کے صحرا میں جا کر اسلامی جھنڈا نصب کرنا۔ چنانچہ آپ خشکی کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے اور لاہور پہنچ کر روضۂ مبارک کے سامنے ایک کوٹھڑی میں چالیس دن تک معتکف رہے اور جب یہ چلہ کاٹنے کے بعد آپ باہر نکلے تو بے ساختہ زبان سے نکلا:

گنج بخش، فیض عالم، مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را رہنما

عام لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ گنج بخش کا خطاب اس شعر سے شروع ہوا ہے، حالانکہ آپ نے اپنی تصنیف کشف الاسرار میں لکھا ہے: "اے علی! تجھے خلقت گنج بخش کہتی ہے اور تو ایک دانہ بھی اپنے پاس نہیں رکھتا۔ اس بات کا خیال (کہ مخلوق تجھے گنج بخش کہتی ہے) ہرگز دل میں نہ لا، ورنہ محض دعویٰ اور غرور ہوگا۔ گنج بخش یعنی خزانہ بخشنے پر قادر تو وہی ذاتِ پاک ہے، اس کے ساتھ شرک نہ کرنا ورنہ تیری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ بیشک وہ اکیلا خدا ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت کے عوام بھی آپ کو اسی لقب سے یاد کرتے تھے۔

وصال اور مزارِ مبارک:

۴۶۵ھ کے صفر کی اُنیس تاریخ کو آپ کا وصال[1] ہوا اور اس مدوّر حلقہ کے پاس آپ کے جسدِ[2] مبارک کو پیوندِ خاک کیا گیا۔ دونوں پیر بھائیوں کی قبریں بھی آپ کے دائیں بائیں اسی گنبد میں بنائی گئیں۔ راؤ شیخ ہندی کی قبر

---

[1] "سرورِ سردار" اور "زیور لاہور" آپ کی وفات کے تاریخی مادے ہیں، جن سے سن ہجری ۴۶۵ھ نکلتا ہے۔

[2] مستند تواریخ کی رُو سے آپ کا مزار فصیلِ شہر سے چند گز کے فاصلے پر جنوب مغرب کی طرف واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ کی تشریف آوری کے وقت یہاں ایک گھاٹ تھا، جسے عبور کر کے آپ دریا کے اس پار تشریف لائے اور وہیں لبِ دریا قیام فرما کر تبلیغ و اشاعت میں مشغول رہے اور جب وصال فرمایا تو وہیں دفن ہوئے (رضی اللہ عنہ)۔

بعض اربابِ تحقیق کہتے ہیں کہ علی نام کے دو بزرگ غزنی سے لاہور تشریف لائے تھے۔ ان میں سے ایک قلعہ لاہور کے اندر یا فصیل کے ساتھ ہی کہیں دفن ہوئے، جن کا اتا پتا اب کچھ نہیں ملتا اور دوسرے یہی صاحب کشف المحجوب حضرت علی ہجویریؒ ہیں، جو بھاٹی دروازے سے باہر آرام فرما رہے ہیں اور جن کے مزارِ پُر انوار پر جناب سلطان الہند اجمیریؒ اور جناب بابا فریدؒ شکر گنج اکتسابِ فیض کیلئے حاضر ہوئے تھے اور جو اب مرجعِ خلائق بنا ہوا ہے۔ (ناشر)

روضۂ مبارک کے باہر بجانبِ شرق بنائی گئی۔

اس عمارت کی تعمیر بار بار ہوتی رہی چنانچہ حال ہی میں اس عاجز نے روضہ مبارک کا گنبد سبز روغنی ٹائلوں اور اس کا تمام بالائی گردا چوطرفہ چھجوں تک سنگِ مرمر کے ریزوں اور سیمنٹ وغیرہ سے بنوایا اور ہشت پہلو گنبد کے ہر طرف بجائے چوبی جالیوں کے، سنگِ مرمر کی جالیاں لگوادیں۔ جانبِ غرب جو عالی شان مسجد اب دکھائی دیتی ہے، وہ میاں غلام رسول مرحوم امرتسری ٹھیکہ دار کھُ نے بصرفِ کثیر بنوائی اور سابقہ احاطۂ مسجد کے ساتھ بڑی وسیع جامع مسجد تعمیر کرائی۔ میاں غلام رسول مرحوم کی قبر ان کی زندگی ہی میں اعتکاف خانہ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے جنوب میں اس چبوترے پر تیار ہوئی جو خواجہ صاحبؒ کے اعتکاف خانے سے لے کر ڈیوڑھی تک جاتا ہے اور کئی مجاوروں کی نشست گاہ ہے۔

روضۂ مبارک کے چاروں طرف دالان بنے ہوئے ہیں جو عرس کے دنوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔ جانبِ شمال جو دالان بنے، اس کے ایک کمرے میں بڑے بڑے تاریخی کلام مجید کے قلمی اور چھاپہ شدہ نسخے موجود ہیں، جن پر سینکڑوں آدمی ہر روز تلاوت کرتے ہیں۔ روضۂ مبارک اور اس کی متعلقہ عمارات کی کرسی عام سطحِ زمین سے بقدر دس فٹ اونچی ہے۔ اس عمارت کی کرسی کے چاروں طرف حجرے اور دالان بنے ہوئے ہیں اور بعض میں متقدمینِ خاص کی قبریں بھی موجود ہیں۔ اپنی بنائی ہوئی قبر میں میاں غلام رسول مرحوم کو دفن کیا گیا۔ اس عاجز[۱] کو بھی بلحاظِ عقیدت روضۂ مبارک اور مسجد کے شمالی دروازے کے باہر قبر کے لئے جگہ عطا ہوئی ہے، جہاں میرے نام کا کتبہ لگا ہوا ہے۔ حق تعالیٰ حضرت کی بلند ہستی کے قرب کی شرم رکھ کر اس عاجز پر بھی رحم فرمائے۔

فیروز الدین غفرلہٗ

---

[۱] اللہ تعالیٰ نے مترجم کو اسی جگہ دفن ہونے کی سعادت عطا فرمائی۔

مقدمہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ط

نَحۡمَدُهٗ وَ نُصَلِّيۡ عَلٰى رَسُوۡلِهِ الۡكَرِيۡمِ ط

حمد و نعت:

رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ رَحۡمَةً وَّ هَيِّئۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا ط اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ كَشَفَ الۡاَوۡلِيَآئِهٖ بَوَاطِنَ مَلَكُوۡتِهٖ وَقَشَعَ لِاَصۡفِيَآئِهٖ سَرَائِرَ جَبَرُوۡتِهٖ وَ اَرَاقَ دَمَّ الۡمُحِبِّيۡنَ بِسَيۡفِ جَلَالِهٖ وَ اَذَاقَ سِرَّ الۡعَارِفِيۡنَ رُوۡحَ وَصَالِهٖ هُوَ الۡمُحۡيِ لِمَوَاتِ الۡقُلُوۡبِ بِاَنۡوَارِ اِدۡرَاكِ صَمَدِيَّتِهٖ وَ كِبۡرِيَائِهٖ وَالۡمُنۡفِسَ لِهَا بِرَاحَةِ رُوۡحِ الۡمَعۡرِفَةِ بِنَشۡرِ اَحۡمَائِهٖ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاَصۡحَابِهٖ وَاَزۡوَاجِهٖ وَاَهۡلِ بَيۡتِهٖۤ اَجۡمَعِيۡنَ ط

ترجمہ: "اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنی جناب سے رحمت اور ہمارے کام میں ہمیں ہدایت عطا فرما۔ سب تعریف اللہ کے لیے ہے، جس نے اپنے دوستوں کے لیے عالم ملکوت اور اپنے برگزیدہ بندوں کے لیے عالمِ جبروت کے بھید ظاہر فرمائے اور اپنے عاشقوں کا خون اپنے جلال کی تلوار سے بہایا اور اپنے عارفوں کے دلوں کو اپنے وصال کی خوشی کا مزا چکھایا۔ وہی اپنی بے نیازی اور کبریائی کے انوار سے دلوں کی مردہ زمین کو زندہ کرنے والا ہے اور اسے اپنے ناموں اور معرفت کی روح پرور خوشبو سے نشوونما دینے والا ہے اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ اور آپ کی آل، اصحاب، ازواج اور اہلِ بیت، سب پر اللہ کی رحمت ہو۔"

شیخ علی بن عثمان بن ابی الحسن علی جلابی ثم الہجویریؒ عرض پرداز ہے کہ میں نے استخارہ کیا اور ان اغراض کو جو نفس[1] میں پھرتی تھیں، دل سے دُور کر دیا اور تمہاری درخواست کے مطابق (اللہ تمہیں نیک بخت کرے) کام کے لیے مستعد ہو گیا اور اس کتاب سے تمہاری مراد بر لانے کا مصمم ارادہ کر لیا اور اس کتاب کا نام "کشف المحجوب" رکھا، جس سے تمہارا مقصود واضح ہو گیا اور اس کتاب میں تمہارے مقصد سے تعلق رکھنے والی باتیں کئی ابوب میں منقسم ہو گئیں اور میں اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے مدد اور توفیق مانگتا ہوں اور اپنے قول اور فعل میں اپنی ہی طاقت اور قوت سے بیزاری ظاہر کرتا ہوں اور توفیق و مدد اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

کتاب پر مصنف کا نام:

میں نے جو کتاب کی ابتدا میں اپنا نام لکھا ہے، اس سے دو چیزیں مقصود ہیں: ایک خاص لوگوں کا حصہ ہے اور دوسری بات عام لوگوں کا حصہ ہے۔ جو عام لوگوں کا حصہ ہے، وہ تو یہ ہے کہ جب اس علم سے ناواقف لوگ نئی کتاب دیکھتے ہیں جس میں جابجا مصنف کا نام لکھا ہوا نہ ہو تو اس کو اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں، جس سے مقصود پورا

---

[1] نفس ناطقہ: اس کی تین مختلف قسمیں ہیں: ایک نیکی کی طرف ابھارتی ہے، جسے نفس ملکی یا نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔ دوسری قوت برائی کی طرف رغبت دلاتی ہے، اس کو نفس امارہ کہتے ہیں۔ تیسری قوت غصہ لاتی ہے، اسے قوتِ غضبی یا نفس بہیمی کہتے ہیں۔ یہاں مصنف کی مراد نفس امارہ اور نفسِ غضبی سے ہے۔

نہیں ہوتا کیونکہ کتاب کی تصنیف و تالیف اور جمع کرنے سے مصنف کا اس کے سوا اور کوئی مقصود نہیں ہوتا کہ اس کتاب سے مصنف کا نام زندہ رہے اور پڑھنے والے اور تعلیم پانے والے لوگ اس کے لیے نیک دعا کرتے رہیں کیونکہ مجھے یہ حادثہ دو مرتبہ پیش آیا ہے۔ ایک مرتبہ یہ کہ ایک شخص نے میرے اشعار کا دیوان مجھ سے مانگ کر لیا اور اصل نسخہ اس کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اس نے سب کو اُلٹ پلٹ کر دیا، میرا نام اس کے شروع سے اُڑا دیا اور میری محنت ضائع کر دی۔ اللہ اس پر رحم کرے۔ دوسرا یہ کہ میں نے تصوف کے طریق میں (خدا اس کو آباد رکھے) ایک کتاب تالیف کی اور اس کا نام منہاج الدین رکھا۔ ایک ذلیل مدعی نے کہ جس کا نام کہنے کے لائق نہیں، میرا نام اس کتاب پر سے اُڑا دیا اور عام لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کیا کہ وہ کتاب خود اس نے تصنیف کی ہے اگرچہ خاص لوگ اس کی بات پر ہنستے رہے۔ یہاں تک کہ اپنی بے برکتی کی وجہ سے اس حد تک پہنچا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام طالبانِ درگاہِ الٰہی کے دیوان ہی سے خارج کر دیا، لیکن جو بات خواص کا حصہ ہے، وہ یہ ہے کہ جب وہ ایک کتاب دیکھیں گے اور ان کو معلوم ہوگا کہ اس کا مؤلف اس فن اور اس علم کا عالم اور محقق گذرا ہے تو اس کے حقوق کی رعایت اچھی طرح سے کریں گے اور اس کے پڑھنے اور یاد کرنے میں زیادہ کوشش کریں گے اور مصنف اور پڑھنے والے کا مقصود اس سے اچھی طرح حاصل ہوگا۔

دوسری فصل
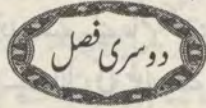
استخارہ:

اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ میں نے استخارہ کیا، اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے ان آداب کی نگہداشت ہے جس کا اپنے پیغمبر ﷺ اور آپ کے پیروؤں کو اس نے حکم دیا ہے اور کہا ہے: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ط (ترجمہ) جب تو قرآن پڑھنے لگے تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ استعاذۃ، شیطان سے اللہ کی پناہ مانگنا، استعانت، ہر بات میں اللہ کی مدد چاہنا اور استخارہ اللہ سے طلبِ خیر کرنا۔ سب کے معنی طلبِ خیر اور اپنے تمام کاموں کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا اور طرح طرح کی آفتوں سے نجات حاصل کرنا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ پیغمبر ﷺ جس طرح قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے، اسی طرح استخارہ کی تعلیم فرمایا کرتے تھے۔ پس جب بندہ جانتا ہے کہ تمام اُمور کی بہتری اس کے کسب اور اس کی تدبیر پر موقوف نہیں کیوں کہ بندوں کی بہتری کو خدا تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اور جو بھلائی اور برائی بندے کو پہنچنی ہے، وہ مقدر ہے۔ پس لامحالہ قضائے الٰہی کو تسلیم کر لینے اور اس سے مدد مانگنے کے سوا چارۂ کار اور کیا ہو سکتا ہے (تاکہ وہ نفس امارہ کی شرارت و سرکشی سے بندے کو ہر حالت میں محفوظ رکھے) اور اس کی بہبودی و بہتری اسے عطا فرمائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تمام کاموں میں بندہ اللہ سے استخارہ کرے تاکہ وہ اس کو خطا و خلل اور آفت سے محفوظ رکھے۔

تیسری فصل
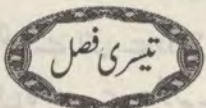
اغراضِ نفسانی سے اعراض:

اور یہ جو میں نے کہا کہ وہ اغراض جو نفس سے متعلق ہیں، میں نے ان کو دل سے نکال دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کام میں غرض نفسانی ہوتی ہے، اس سے برکت اُٹھ جاتی ہے اور دِل صراطِ مستقیم سے ہٹ کر ٹیڑھے اور غلط راستے پر لگ جاتا ہے اور پھر وہ دو حال سے خالی نہیں ہوتا، یا تو اس کی غرض پوری ہوگی یا نہیں ہوگی۔ اگر اس کی غرض

پوری ہوگی تو بھی اس میں اس کی ہلاکت ہے، کیونکہ دوزخ کے دروازے کی کنجی سوائے نفس کی مراد حاصل ہونے کے اور کوئی نہیں اور اگر اس کی غرض پوری نہ ہوگی تو ایسی صورت میں چاہیے کہ غرض پہلے ہی دل سے نکال دی جائے کہ اس کی نجات کا سبب ہو کیونکہ بہشت کے دروازے کی کنجی سوائے نفس کو اپنی اغراض سے روکنے کے اور کوئی نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (ترجمہ: اور جس نے اپنے نفس کو اپنی خواہش سے روکا، بلاشبہ اس کا ٹھکانا جنت ہے) اور امور میں اغراض نفسانی یہ ہوتی ہے کہ بندہ جو کام کرتا ہے اس میں خوشنودی الٰہی کے سوا اور ہی کچھ مطلوب ہو اور عذابِ الٰہی سے اپنے نفس کی نجات طلب نہ کرے اور تمام سرکشیوں میں نفس کے لیے کوئی حد ظاہر نہیں ہوتی اور اس میں اس کی فریب کاریاں بھی ظاہر نہیں ہوتیں اور اس کتاب میں اس کے متعلق اپنی جگہ پر انشاء اللہ ایک مستقل باب لکھا جائے گا۔

چوتھی فصل
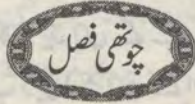
سببِ تالیف:

یہ جو میں نے کہا کہ تمہاری درخواست کے مطابق میں مستعد ہو گیا اور اس کتاب سے تمہارا مقصود پورا کرنے کے لیے پختہ ارادہ کرلیا، اس کا مقصد یہ ہے کہ تم نے مجھے سوال کے قابل سمجھا اور اپنے معاملے کے متعلق مجھ سے پوچھا اور اس کتاب کے تالیف کرنے کی مجھ سے درخواست کی اور تمہارا مطلب اس سے فائدہ حاصل کرنا تھا۔ لہٰذا ضرورتاً تمہارے سوال کا حق ادا کرنا (جواب دینا) مجھ پر واجب ہو گیا اور چونکہ فوراً تمہارے سوال کا پورا پورا حق ادا نہ ہو سکتا تھا، اس لیے ارادہ اور نیت پختہ ہونی چاہیے کہ میں اس کو پورا ادا کروں گا تاکہ اس کتاب کی ابتدا اور اس سوال کے پورا کرنے کی نیت کی حالت میں اس کے حکم اور جواب کو واجبی طور پر ادا کرسکوں اور بندے کا ارادہ جب عمل کے شروع میں نیت سے وابستہ ہو تو اگرچہ اس کام کے کرنے میں کوئی کمی بھی رہ جائے، وہ بندہ اس پر معذور ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِّنْ عَمَلِهٖ (ترجمہ: یعنی کام کے شروع میں مومن کی فقط نیت اس کے اس کام سے بہتر ہے، جسے وہ نیت کے بغیر سرانجام دے)۔ نیت کو کاموں میں بڑا بھاری دخل ہے اور اس پر سچی دلیل موجود ہے، کیونکہ بندہ ایک ہی نیت سے ایک حکم سے دوسرے حکم میں ہو جاتا ہے، حالانکہ اس کے ظاہر پر کوئی اثر نمودار نہیں ہوتا۔ چنانچہ کچھ مدت اگر روزے کی نیت کے بغیر کوئی شخص بھوکا رہے تو اس کو اس کا کوئی ثواب نہیں ہوگا اور جب وہ روزے کی نیت کرلے گا تو مقربانِ الٰہی میں شمار ہو جائے گا اور اس کے ظاہر پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ ایسا ہی جب کوئی مسافر شہر میں آکر کچھ مدت رہے، جب تک وہ قیام کی نیت نہ کرلے گا تو مقیم شمار نہ ہوگا اور جب اقامت کی نیت کرلے گا تو مقیم سمجھا جائے گا اور اسی قسم کے بہت سے امور ہیں کہ نیت کے بغیر اُن کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا۔ پس نیک اعمال کی نیت عمل کے شروع میں کرنا ضروری ہے۔ واللہ اعلم

پانچویں فصل
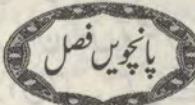
وجہِ تسمیہ:

یہ جو میں نے کہا کہ میں نے اس کتاب کا نام کَشْفُ الْمَحْجُوْب رکھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب کا نام ہی اس کے تمام مضامین و مطالب کی گواہی دے۔ خصوصاً اصحابِ بصیرت جب کتاب کا نام سنیں تو انہیں معلوم ہو جائے

کہ اس کتاب کا مقصد و موضوع کیا ہے اور یہ بھی واضح رہے کہ اولیاء اللہ اور عزیزانِ درگاہِ الٰہی کے سوا سب اہلِ عالم امرِ حق کی تحقیق کی رمز سے بالکل پردے میں ہیں۔ چونکہ یہ کتاب راہِ حق کے بیان کرنے اور امرِ حق کی شرح اور بشریت کے پردوں کے کھولنے میں لکھی گئی ہے، اس لیے اس نام کے سوا کوئی دوسرا نام اس کے لیے مناسب نہ تھا اور حقیقت میں حجاب کا کھولنا محجوب کی ہلاکت کا باعث ہوتا ہے کہ حجاب مکشوف کی ہلاکت کا سبب ہوتا ہے، یعنی جیسے نزدیک دوری کی طاقت نہیں رکھا، ویسے ہی دور نزدیکی کی تاب نہیں لا سکتا۔ جس طرح وہ جانور جو سرکہ میں سے پیدا ہوتا ہے دوسری چیز میں جب وہ گرتا ہے تو مر جاتا ہے اور وہ جو دوسری چیزوں سے پیدا ہوتا ہے، وہ سرکہ میں پڑ کر ہلاک ہو جاتا ہے اور طریق حقیقت پر چلنا، اس سے سوا جو اس کے لیے پیدا کیا گیا ہے، دوسرے کے لیے دشوار ہے۔ چنانچہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: کُلٌّ مُیَسَّرٌ لِّمَاخُلِقَ لَهٗ (ترجمہ: ہر شخص کے لیے وہ کام آسان کیا گیا ہے، جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے) اور اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو ایک چیز کے لیے پیدا فرمایا ہے اور اس کے حصول کا طریقہ اس کے لیے آسان کر دیا ہے۔

پس حجاب دو قسم کا ہوتا ہے: ایک حجاب[1] رینی (ہم اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں) اور یہ حجاب ہرگز نہیں اُٹھ سکتا اور دوسرا حجاب غینی[2]، اور یہ جلدی اُٹھ جاتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ بعض انسان ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی "ذات" حق کا حجاب ہوتی ہے حتیٰ کہ اُن کے نزدیک حق و باطل دونوں مساوی ہوتے ہیں اور بعض ایسے انسان ہوتے ہیں کہ ان کی صفت حق کا حجاب ہوتی ہے اور اُن کی طبیعت ہمیشہ حق کی تلاش میں اور باطل سے گریزاں رہتی ہے۔ پس ذاتی حجاب جس سے مراد حجاب رینی ہے، وہ ہرگز نہیں اُٹھ سکتا اور عربی میں رین و ختم[3] و طبع[4] سب کے ایک معنی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ترجمہ (ہرگز ایسا نہیں بلکہ جو برے اعمال کرتے تھے، اُن کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے) پھر اُس کا حکم ظاہر کر کے فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ (ترجمہ: بلاشبہ وہ لوگ کافر ہیں، ان کے لیے برابر ہے خواہ آپ اُن کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے) اس کے بعد اس کی علت فرمائی: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ (ترجمہ: اللہ نے مہر کر دی اُن کے دلوں اور کانوں پر) نیز فرمایا: طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (ترجمہ: مہر لگا دی اللہ نے اُن کے دلوں پر)۔ حجاب صفتی جس سے مراد حجاب غینی ہے، وہ کبھی کبھی اُٹھ سکتا ہے کیوں کہ ذات کی تبدیلی نادر و بدیع کے حکم میں ہے اور نادر غیر ممکن ہوتا ہے لیکن صفت کی تبدیلی جیسا کہ مشاہدہ ہے، جائز ہے۔

مشائخ صوفیا نے رین اور غین کے معنی میں لطیف اشارہ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں: اَلرَّيْنُ مِنْ جُمْلَةِ الْمُوْطَنَاتِ وَالْغَيْنُ مِنْ جُمْلَةِ الْخَطَرَاتِ (ترجمہ: یعنی زنگ مستقل اور پائیدار چیزوں میں سے ہے اور تاریکی عارضی وسوسوں میں سے ہے) وطن پائیدار اور خطر عارضی ہے۔ چنانچہ کسی پتھر سے آئینہ نہیں بنا سکتے اگرچہ بہت صیقل کرنے والے جمع ہو جائیں لیکن جب آئینے کو زنگ لگ جائے تو صیقل کرنے سے بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پتھر میں تاریکی اور آئینہ میں روشنی اصل ہوتی ہے اور اصلی پائیدار ہوتی ہے اور عارضی صفت کو بقا نہیں۔ پس میں نے یہ کتاب اس لیے تصنیف کی ہے کہ یہ اُن دلوں کو صیقل کرے جو تاریکی کے پردے میں گرفتار ہیں، لیکن نورِ حق کا سرمایہ اُن کے دل میں موجود ہے تاکہ اس کتاب کے پڑھنے کی برکت سے تاریکی کا وہ حجاب ان کے دلوں سے اُٹھ جائے اور حقیقتِ معنی کی طرف راہ پا جائیں، اور وہ لوگ جن کے وجود کا خمیر ہی مایہ حق کا انکار اور باطل کا

---

[1] رَین۔ عربی میں زنگ کو کہتے ہیں مراد طبعی اور پیدائشی۔　[2] غین۔ تاریکی کو کہتے ہیں اور یہاں مراد عارضی اور طبعی ہے۔
[3] مہر لگانا۔ مراد استعداد کا سلب کر لینا۔　[4] طبع کے معنی ہیں چھاپہ لگانا، مہر لگانا۔

ارتکاب ہے، وہ دلائل و شواہد کے باوجود حق کی طرف راہ نہیں پاتے لہٰذا ان کو اس کتاب سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا (اور عرفانِ الٰہی کی نعمت پر اللہ کا شکر ہے)۔

تقسیم ابواب وغیرہ:

لیکن جو میں نے کہا ہے کہ تمہارا مقصود واضح ہو گیا اور تمہاری غرض سے تعلق رکھنے والی باتیں کئی اجزاء میں تقسیم ہو گئیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک سائل کا مقصود معلوم نہ ہو، اس کا مطلب حاصل نہیں ہوتا کیونکہ سوال مشکل امر کے متعلق کیا کرتے ہیں اور جب جواب کے ذریعے سے امر مشکل حل نہ ہو جائے تو وہ فائدہ مند نہیں ہوتا اور امر مشکل کا حل اس امر مشکل کے پہنچاننے کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ جو میں نے کہا ہے کہ تمہاری غرض سے متعلقہ امور کئی اجزاء میں تقسیم ہو گئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب سوال جملہ امور پر حاوی ہو تو جواب بھی جملہ اُمور پر مشتمل ہونا چاہیے، تاکہ سائل اپنے سوال کے تمام درجوں، حالات اور ان کے جوابات کو اچھی طرح جان لے اور پھر مبتدی کے لیے اس کے اقسام اور حدود کو بتفصیل بیان کرنے کی حاجت ہوتی ہے، خصوصاً تمہاری غرض (خدا تمہیں نیک کرے) کا تقاضا یہی ہے کہ میں اسے بالتفصیل بیان کروں اور تمہارے سوال کے جواب میں ایک کتاب تیار کروں (اور توفیق دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے)۔

اِستعانت:

اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے توفیق اور اعانت چاہتا ہوں، اس سے مراد یہ ہے کہ بندے کا اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں، جو نیک کاموں میں اس کی مدد و نصرت کرے اور زیادہ کی توفیق بخشے۔ توفیق کے معنی نیک اعمال میں بندے کے فعل کے ساتھ تائید الٰہی کی موافقت ہے اور کتاب و سنتِ نبویؐ توفیق الٰہی کی صحت پر ناطق ہے اور تمام اُمت کا اسی پر اجماع ہے، سوائے معتزلہ و قدریہ جماعت کے، جو لفظ توفیق کو مہمل اور تمام معانی سے خالی سمجھتے ہیں۔ مشائخ طریقت نے کہا ہے کہ اَلتَّوْفِيْقُ هُوَ الْقُدْرَةُ عَلَى الطَّاعَةِ عِنْدَ الْاِسْتِعْمَالِ (ترجمہ: یعنی توفیق عمل کے وقت فرمانبرداری کی طاقت ہے)۔ جب بندہ اللہ کا فرمانبردار ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو پہلے سے زیادہ قوت اور طاقت ملتی ہے۔ جملہ حالات میں انسان کی تمام حرکات و سکنات اللہ تعالیٰ کے افعال اور اس کی مخلوق ہیں۔ پس اس قوت کو جس کے ذریعے انسان اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتا ہے، توفیق الٰہی کہتے ہیں اور یہ کتاب اس مسئلے کے بیان کرنے کا محل نہیں ہے بلکہ اس سے اور چیز (تصوف) کا بیان کرنا مقصود ہے۔ اب میں تمہارا اصل مقصود بیان کرنے کی طرف رجوع کرتا ہوں اور پیشتر ازیں کہ اس کے متعلق کچھ کہوں، تمہارا سوال بعینہٖ درج کرتا ہوں اور اسی سے کتاب شروع کرتا ہوں (اور توفیق اللہ کے فضل سے ہے)۔

سوال کی صورت

سائل ابوسعید ہجویری نے سوال کیا کہ آپ میرے لیے طریقت و تصوف کی حقیقت، اہلِ تصوف کے مقامات،

اُن کے مذاہب، اقوال اور رموز و اشارات، اللہ کی محبت اور دلوں پر اس کے ظاہر ہونے کی کیفیت، اس کی ماہیت کی دریافت سے انسانی عقول کے حجاب کا سبب، اس کی حقیقت سے نفسِ امارہ کی نفرت اور برگزیدگی اور پاکیزگی سے رُوح کا آرام اور دوسرے جو امور اس سے متعلق ہیں، ان سب کا بیان کیجئے۔

مسئول یعنی علی بن عثمان جلابی (خود مصنف علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ) نے، اللہ اُن کو اس کی توفیق دے، اس سوال کا جواب دیا کہ آپ پر واضح رہے کہ ہمارے اس زمانے میں یہ علم طریقت دراصل مِٹ چکا ہے، خصوصاً ہمارے اس ملک میں کہ سب خواہشاتِ نفسانی میں مستغرق اور رضائے الٰہی کے راستے سے رُوگرداں ہیں اور زمانے کے علماء اور وقت کے مدعیوں کے لیے اس طریقت کے خلاف ایک اور صورت پیدا ہوگئی ہے۔ پس اس چیز (طریقت) کے حصول کے لیے ہمت دکھاؤ کہ خاصانِ درگاہِ الٰہی کے سوا تمام اہلِ زمانہ کا ہاتھ اِس کے حصول سے کوتاہ ہے، اور تمام اہلِ ارادت کی مراد اس سے منقطع ہو چکی ہے اور جملہ اہلِ معرفت کی معرفت اس کے وجود سے برطرف کر دی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کے چند خاص بندوں کے سوا سب عوام و خواص نے (اس کی حقیقت کو چھوڑ کر) صرف اس کی عبادت پر اکتفا کر لیا ہے اور جان و دل سے اس کے حجاب کے خریدار بن گئے ہیں اور کام تحقیق سے نکل کر تقلید میں پڑ گیا ہے۔ چنانچہ امرِ حق کی تحقیق نے اُن سے اپنا رُخ چھپا لیا ہے پس عام لوگ اس بات پر کفایت کرتے ہیں کہ ہم حق کو پہچانتے ہیں اور خاص لوگ اس پر خوش ہیں کہ وہ اپنے دلوں میں اس کی تمنا، نفس[1] میں احساس اور سینے میں اس (عالم طریقت) کی طرف رغبت رکھتے ہیں اور مشغلے کے طور پر کہتے ہیں کہ یہ دیدار (الٰہی) کا شوق اور محبت کی سوزش ہے اور تصوف کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے اپنے دعویٰ کے باوجود تمام حقائق کی دریافت کرنے سے قاصر رہ گئے ہیں اور مریدوں نے مجاہدے سے ہاتھ اُٹھا کر اپنے ظنِ فاسد کا نام مشاہدہ رکھ لیا۔ میں نے اس سے پہلے بھی اس فن (طریقت و تصوف) پر کئی کتابیں لکھی تھیں، جو سب ضائع ہو گئیں اور تصوف کا جھوٹے دعویٰ کرنے والوں نے ان میں سے بعض باتیں لوگوں کو پھانسنے کے لیے چن لیں اور باقی کو دھو کر ضائع کر دیا کیوں کہ جس کے دل پر مہر لگی ہے، اس کے خیال میں حسد و انکار کا سرمایہ بھی نعمتِ خداداد ہوتا ہے۔ ایک دوسرے گروہ نے ان باقی حصول کو دھو کر مٹایا تو نہیں لیکن انہیں پڑھا بھی نہیں۔ ایک اور گروہ نے ان عبارات کو پڑھا لیکن مطلب نہیں سمجھے اور اس کی عبارت پر اکتفا کیا تاکہ اس کو لکھ کر یاد کر لیں اور یوں کہیں کہ ہم تصوف و معرفت کا علم بیان کرتے ہیں اور یہ لوگ عین تاریکی میں ہیں۔ یہ سب اس لیے طے ہوا ہے کہ علم طریقت کے حقائق سرخ گندھک کی مانند ہیں جو بالکل کمیاب ہوتی ہے اور جب اس کو پالیتے ہیں تو وہی کیمیا ہوتا ہے اور اس کا ایک دانگ بھر (چھ رتی تقریباً) وزنی پتھر بہت سے تانبے اور کانسی کو سونا بنا دیتا ہے، الغرض ہر شخص وہی دوا طلب کرتا ہے جو اس کے درد کے موافق ہو اور اسکے سوا کوئی اور دوا اسے درکار نہیں ہوتی جیسا کہ ایک بزرگ فرماتے ہیں:

فَکُلٌّ مَنْ فِیْ فُؤَادِہٖ وَجَعٌ
یَطْلُبُ شَیْئًا یُّوَافِقُ الْوَجَعَا

(ترجمہ: پس جس کے دِل میں کوئی درد ہے، وہ ایسی چیز تلاش کرتا ہے جو اس کے درد کے موافق ہو) جس شخص کی بیماری کا علاج ادنے درجے کی چیزیں ہوں، اسے موتی اور مروارید نہیں چاہیے کہ اس میں شہد اور دواء المسک

[1] نفس سے یہاں دِل مراد ہے۔

ملائیں اور یہ علم (طریقت) زیادہ عزیز اور کمیاب اس لیے ہے کہ ہر شخص کو اس سے حصہ نہیں ملتا اور اس سے پہلے اس علم سے جاہل لوگوں نے مشائخِ طریقت کی کتابوں سے یہی سلوک کیا ہے۔ جب اَسرارِ الٰہی کے وہ خزانے اُن کے ہاتھ لگے تو انہوں نے اس کا مطلب نہ سمجھ کر انہیں جاہل کلاء دوزوں اور ناپاک جلد سازوں کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اُنہیں کلاہ کا استر اور ابو نواس وغیرہ (شراب نوش) شاعروں کے دیوانوں اور ابو عثمان عمر بن سجر الملقب بہ جاحظ مغربی (صاحبِ تصانیفِ کثیرہ) کے خرافات کی طرح جلد بندی کریں۔ بلاشبہ جب شاہی باز کسی بڑھیا کے مکان کی دیوار پر جا بیٹھتا ہے تو اس کے پر اور بازو کاٹ ڈالتے ہیں۔ خدائے عزوجل نے ہمیں ایسے زمانے میں پیدا فرمایا کہ جس کے لوگ خواہشاتِ نفسانی کا نام شریعت، طلب جاہ و ریاست و تکبر کا نام عزت و علم، خلق خدا سے ریاکاری کا نام خوفِ الٰہی، دل میں کینہ چھپا رکھنے کا نام علم، فضول جھگڑے کا نام مناظرہ، آپس میں لڑنے اور جھگڑنے اور نادانی کا نام بزرگی، منافقت کا نام زہد، جھوٹی آرزو کا نام ارادت، طبیعت کے ہذیان کا نام معرفت، دلی حرکتوں اور نفسانی وسوسہ کا نام محبتِ الٰہی، کجروی کا نام فقراء، انکارِ حق کا برگزیدگی، بے دینی کا فنا، پیغمبر ﷺ کی شریعت کے ترک کرنے کا طریقت اور اہلِ زمانہ کی آفت کا مجاہدہ نام رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ معارفِ الٰہی کے جاننے والے اس جہاں سے بالکل الگ ہوگئے ہیں اور اہلِ دنیا نے غلبہ پالیا ہے۔ چنانچہ اسلام کی پہلی ابتری کے وقت کا نقشہ جبکہ اہلِ بیت رسول صلعم پر آل مروان نے غلبہ حاصل کرلیا تھا، اہلِ حقائق کے بادشاہ، تصوف و طریقت کے باریک بین ابوبکر واسطی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہی اچھا پیش کیا ہے۔ قَوْلُهٗ اُبْتُلِیْنَا بِزَمَانٍ لَیْسَ فِیْهِ اٰدَابُ الْاِسْلَامِ وَلَا اَخْلَاقُ الْجَاهِلِیَّةِ وَلَا اَحْکَامُ ذَوِی الْمُرُوَّةِ (ترجمہ: ہم ایسے زمانے میں ابتلا کے اندر ڈالے گئے ہیں کہ جس میں نہ آدابِ اسلام ہیں، نہ اخلاقِ جاہلیت اور نہ ہی اس میں مروّت و محبت کی باتیں ہیں) اور اسی طرح حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ ایک شعر میں فرماتے ہیں:

جَعَلَ اللّٰهُ ذِی الدُّنْیَا مُنَاخًا لِرَاکِبٍ
فَکُلٌّ بَعِیْدِ الْهَمِّ فِیْهَا مُعَذَّبٌ وَّ مُغَلَّبٌ

(ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو صرف ایک شتر سوار کی اُونٹنی بٹھانے کی جگہ (عارضی فرودگاہ) بنادیا ہے۔ پس ہر وہ شخص جس کا قصد دور دراز (آخرت) پہنچنے کا ہے، وہ اس دنیا میں عذاب پاتا اور مغلوب رہتا ہے)۔

آٹھویں فصل
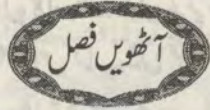
اسرارِ الٰہی اور اُن کے حجاب:

اے طالبِ حق! (اللہ تمہیں قوت دے) جان لو کہ میں نے اس عالم کو (اولیاء اللہ کے حق میں) اسرار الٰہی کا محل، موجودات کو اس کی امانتوں کی جگہ اور مخلوقات کو اس کے لطیف بھیدوں کا مقام پایا ہے اور جواہر و اعراض و عناصر و اجرام فلکی و اجسام ارضی اور طبائع مخلوقات، سب اُن اسرار الٰہی کا حجاب ہیں اور توحید الٰہی کے مقام میں ان میں سے ہر ایک کا اثبات شرک ہے۔ پس خداوند تعالیٰ نے اس عالم کو محلِ حجاب میں رکھا ہے یہاں تک کہ ہر ایک کی طبیعت نے اپنے عالم میں اس کے حکم سے تسلی پائی ہے اور اپنے وجود (ظلی) وجہ سے توحید الٰہی سے پردے میں رہ گئی ہے اور تمام روحیں اس عالم میں اس وجود کی آمیزش کی وجہ سے بے نیاز ہوگئی ہیں اور باوجود نزدیک ہونے کے اپنی خلاصی کے مقام سے دُور رہ گئی ہیں، چنانچہ اسرارِ الٰہی عقول بشری کے حق میں مخفی ہوگئے اور انسان غفلت کے سائے میں رہ کر اپنے وجود

کی وجہ سے حجاب میں ہو گیا ہے اور اپنے محل میں حجابِ ظلماتی کی وجہ سے عیب دار بن گیا ہے، چنانچہ اللہ نے فرمایا ہے: وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (ترجمہ: قسم ہے زمانے کی بلاشبہ انسان گھاٹے میں ہے) اور فرمایا: اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلاً ۔ (ترجمہ: بلاشبہ بڑا ظالم اور جاہل ہے) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: خَلَقَ اللّٰہُ الْخَلْقَ فِیْ ظُلْمَۃٍ ثُمَّ اَلْقٰی عَلَیْہِ نُوْرًا (ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے خلقت کو اندھیرے میں پیدا فرمایا، پھر اس پر اپنا پرتو ڈال کر اسے روشن کیا) پس یہ حجاب ظلماتی عالم ناسوت میں اس کی طبیعت کی وجہ سے جو اس سے تعلق رکھتی ہے اور اس کی عقل کی وجہ سے جو اس میں تصرف کرتی ہے، خود اس کا مزاج واقع ہوا، اسی لیے اس نے جہالت پر اکتفا کر لیا ہے اور حق سے اپنے لیے اسی حجاب کو دل و جان سے خرید لیا ہے لہٰذا وہ کشف کے جمال سے بے خبر، سرِ الٰہی کی تحقیق سے رُوگرداں، حیوانات کے مقام پر آرام کئے ہوئے اور اپنی نجات کے مقام سے بھاگا ہوا ہے۔ نہ اس نے توحیدِ الٰہی کی بو سونگھی، نہ احدیت کے جمال کو دیکھا، نہ ہی توحید کا مزا چکھا ہے اور عناصر کی ترکیب کی وجہ سے مشاہدۂ حق کی تحقیق سے باز رہا ہے، حرصِ دنیوی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی محبت سے منہ موڑ لیا ہے اور خواہش حیوانی نے ربانی زندگی کے بغیر نفس ناطقہ کو اس قدر مغلوب کر دیا ہے کہ اس کی جملہ حرکات اور جستجو فقط حیوانیت قرار پا گئی حتیٰ کہ کھانے، سونے اور شہواتِ نفسانی کی متابعت کے سوا اور کچھ نہیں جانتا، حالانکہ اللہ عزوجل نے اپنے دوستوں کو ان سب باتوں سے اجتناب کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا ہے: ذَرْھُمْ یَاْکُلُوْا وَیَتَمَتَّعُوْا وَیُلْھِھِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ (ترجمہ: انہیں چھوڑ دیجئے کہ وہ کھائیں اور اسبابِ حیات سے فائدہ اُٹھائیں اور دنیا کی یہ آرزو انہیں غافل کر دے، پس عنقریب اُن کو سب حقیقت معلوم ہو جائے گی) اس لیے کہ ان کی طبیعت کے غصے نے سرِ الٰہی کو اُن پر پوشیدہ کر دیا اور ان کے حصے میں توجہ و توفیق الٰہی کی بجائے رسوائی و محرومی آ گئی۔ حتیٰ کہ وہ سب نفسِ امارہ کے تابع ہو گئے، جو سب سے بڑا حجاب، برائی اور شرارت کا منبع ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ (ترجمہ: بلاشبہ نفسِ امارہ برائی کا بہت حکم دینے والا ہے)۔

اب میں کتاب کو شروع کرتا ہوں اور تمہارا مقصود مخفی مقامات اور پردوں میں سے نکال کر ظاہر کرتا ہوں۔ اسے لطیف بیان سے واضح کر دیتا ہوں اور اہلِ صنائع کی عبارات کی تشریح کے ساتھ ساتھ مشائخ صوفیا کے وکلاء کا تھوڑا سا حصہ بھی اس کے ساتھ ملا کر بیان کروں گا اور عمدہ و دِل پذیر حکایات سے اس کی تائید بھی کروں گا تا کہ تمہارا مقصود حاصل ہو اور علمائے ظواہر میں سے جو شخص اس کتاب میں غور کرے گا، اسے معلوم ہو جائے گا کہ علم تصوف کی اصل قوی ہے اور اس کی شاخ بارآور اور تمام مشائخ جو اہلِ علم ہوئے ہیں، اپنے تمام مریدوں کو علم تصوف حاصل کرنے پر اُبھارتے اور اس پر مداومت کرنے کی تحریص دلاتے رہے ہیں۔ نہ وہ خود لچر پوچ باتوں کے تابع رہے ہیں اور نہ لغو طریق پر چلے ہیں اور نہ ہی اپنے مریدوں کو ایسا کرنے کی ترغیب دیتے رہے ہیں، کیونکہ بہت سے مشائخِ طریقت اور علمائے صوفیا نے تصوف میں کتابیں تصنیف کی ہیں اور اس کے معارف پر نہایت لطیف عبارات میں ربانی علم و بصیرت سے مضبوط براہین قائم کیے ہیں۔ اللہ ہی مدد دینے والا ہے۔
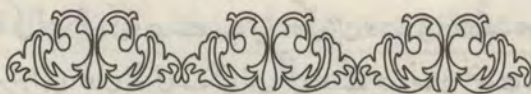
پہلا باب
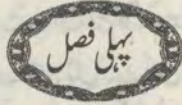
ثبوتِ علم:

علماء کی صفت میں ارشادِ الٰہی ہے: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے عالم لوگ ہی ڈرتے ہیں) پیغمبر ﷺ نے فرمایا: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَةٍ (ترجمہ: علم کی تلاش کرنا ہر مسلمان مرد، عورت پر فرض ہے) نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصِّيْنِ (ترجمہ: علم کو تلاش کرو اگرچہ وہ چین ہی میں ملے) اور یہ جان لو کہ علوم بہت ہیں اور انسان کی عمر تھوڑی ہے، اس لیے تمام علوم و فنون کا سیکھنا انسان پر فرض نہیں، مثلاً علم نجوم، حساب، طب، اور علم بدیع کی تمام صنائع بدائع وغیرہ کا پڑھنا کوئی ضروری نہیں، البتہ نجوم کا سیکھنا اس قدر ضروری ہے کہ جس سے رات میں اوقاتِ نماز معلوم ہو سکیں۔ اسی طرح بیماری سے بچنے کے لیے علم طب، وراثت کے مسائل سمجھنے کے لیے علم میراث اور حیض و عدت وغیرہ کے سمجھنے کے لیے علم فقہ، غرضیکہ علم کا سیکھنا اس قدر فرض ہے جس سے عمل درست ہو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو غیر مفید علم سیکھتے ہیں۔ ارشاد ہے: وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ۔ (ترجمہ: اور جو لوگ وہ علم سیکھتے ہیں جو انہیں نقصان دیتا ہے اور کوئی فائدہ نہیں دیتا ہے) اور رسول ﷺ نے بھی ایسے علم سے خدا کی پناہ مانگی ہے، فرمایا: اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ (ترجمہ: اے اللہ! میں اس علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ دے) پس تھوڑے علم کی مدد سے بہت سا عمل کرنا چاہیے اور ضروری ہے کہ علم کے ساتھ عمل بھی ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اَلْمُتَعَبِّدُ بِلَا فِقْهٍ كَالْحِمَارِ فِي الطَّاحُوْنَةِ (ترجمہ: عابد علم دین کے جانے بغیر خراس[1] کے گدھے جیسا ہے) آنحضرت ﷺ نے بے علم عابدوں کو خراس کے گدھے سے مشابہ فرمایا کہ وہ کتنا ہی گھومے، اپنے پہلے ہی قدم پر رہتا ہے اور آگے راستہ طے نہیں کر سکتا۔ میں نے عوام الناس کا ایک گروہ دیکھا ہے، جو علم کو عمل پر فضیلت دیتے ہیں اور دوسرا گروہ عمل کو علم پر، لیکن یہ دونوں امر باطل ہیں، اس لیے کہ علم کے بغیر عمل نہیں سمجھا جاتا بلکہ عمل اسی وقت ہوتا ہے جب علم اس کے ساتھ شامل ہوتا کہ انسان اس کی وجہ سے ثواب کا مستحق ہو سکے، جیسا کہ نماز کہ جب تک کہ انسان کو اپنے ارکانِ طہارت، پاک پانی کی پہچان، قبلہ کی شناخت، نیت کی کیفیت اور نماز کے ارکان کا علم نہ ہو، وہ نماز ہی نہیں ہوتی پس جب عمل درحقیقت علم ہی سے حاصل ہو سکتا ہے تو کس طرح جاہل عمل کو علم سے جدا کر سکتا ہے اور جو لوگ علم کو عمل پر فضیلت دیتے ہیں تو یہ بھی صحیح نہیں ہے، کیوں کہ عمل کے بغیر علم علم نہیں کہلاتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (ترجمہ: اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا گویا وہ اسے جانتے ہی نہیں) اس آیت میں اللہ نے بے عمل عالم کا نام عالموں سے نکال دیا ہے۔ اس لیے کہ علم کا سیکھنا اور اسے یاد کرنا، یہ سب امور عمل میں ہی شامل ہیں۔ اسی وجہ سے انسان کو اس پر ثواب ملتا ہے اور اگر عالم کا علم اس کے قول و فعل سے کوئی تعلق نہ رکھے تو اسے اس میں سے کچھ بھی ثواب نہیں ملتا۔ اس بات میں دو گروہ ہیں: اول وہ لوگ جو لوگوں کو علم کی بدولت بلند مرتبہ سمجھتے ہیں اور ان

---

[1] خراس: چکی، کولہو (فرہنگ عمید)

کے اعمال کا کوئی لحاظ نہیں رکھتے اور علم کی تہ تک نہ پہنچ کر عمل کو اس سے جدا کرتے ہیں۔ یہ لوگ نہ علم رکھتے ہیں نہ عمل ہی کرتے ہیں یہاں تک کہ جاہل اور بے وقوف یہی سمجھنے لگتا ہے کہ قول (علم) نہیں، عمل کی ضرورت ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ علم کی ضرورت ہے، عمل نہیں چاہیے۔ ابراہیم ادھم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک پتھر راستے میں پڑا دیکھا۔ اس پر لکھا تھا کہ مجھے اُلٹ کر پڑھ۔ پس میں نے اُس کو پلٹا اس پر لکھا تھا: اَنْتَ لَا تَعْمَلُ بِمَا تَعْلَمُ فَكَيْفَ تَطْلُبُ عِلْمَ مَالَا تَعْلَمُ (ترجمہ: تو جانی ہوئی چیز پر عمل نہیں کرتا پس تو کیسے اس چیز کو ڈھونڈتا ہے جسے تو نہیں جانتا) یعنی جس کو تو جانتا ہے، اس پر عمل کرتا کہ اس کی برکت سے نا معلوم کو معلوم کرے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: هِمَّةُ الْعُلَمَآءِ الدِّ رَايهُ وَهِمَّةُ السُّفَهَاءِ الرِّوَايَةُ (علماء کا کام علمی باتوں میں غور و خوض کرنا ہے اور جہلا کا کام ان باتوں کو نقل کرنا ہے) اس لیے کہ جہالت کے لوازم عالموں میں نہیں ہوتے اور جو لوگ علم سے مرتبہ اور دنیا کی عزت طلب کرتے ہیں وہ عالم نہیں ہوتے، کیونکہ مرتبہ اور دنیا کی عزت جہالت کے لوازم میں سے ہیں اور کوئی درجہ علم کے درجے سے زیادہ بلند نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اگر علم نہ ہو تو انسان کسی بھی لطیفۂ رحمانی کو پہچان نہیں سکتا اور جب علم موجود ہو تو وہ سب مقامات، مشاہدات اور مراتب کے مقابل ہوتا ہے، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

دوسری فصل
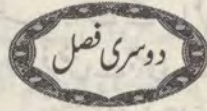
علم کی اقسام:

علم دو قسم کا ہے: ایک علم الٰہی، دوسرا علم مخلوق۔ بندے کا علم، علم الٰہی کے مقابلے میں لاشئے محض ہوتا ہے کیونکہ علم الٰہی اللہ کی صفت قدیم ہے، جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور اس کی صفتوں کے لیے انتہا نہیں اور ہمارا علم صفت ہے جو ہمارے ساتھ قائم ہے اور ہمارے اوصاف متناہی ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:- وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (ترجمہ: نہیں دیا گیا تمہیں علم مگر تھوڑا)۔ الغرض علم مدح (اچھائی بیان کرنا) کی صفتوں میں سے ہے اور اس کی تعریف معلوم چیز کا احاطہ کرنا اور اس کا بیان کرنا ہے اور علم کی نہایت عمدہ تعریف یہ ہے: اَلْعِلْمُ صِفَةٌ يَصِيْرُ الْجَاهِلُ بِهَا عَالِمًا (ترجمہ: علم ایک صفت ہے جس سے جاہل عالم ہو جاتا ہے) اور ارشادِ خداوندی ہے: وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ۔ (اللہ تعالیٰ کافروں کو (اپنے علم سے) گھیرے ہوئے ہے) یعنی کوئی شے اس کے علم سے باہر نہیں، نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (ترجمہ: اللہ ہر چیز کو جانتا ہے) اور اس کا علم ایک ہی ہے جس کے ذریعہ وہ سب موجودات اور معدومات کو جانتا ہے اور مخلوق میں کوئی اس کے ساتھ اس میں شریک نہیں اور علم الٰہی نہ قابل تجزیہ، نہ قابل تقسیم اور نہ ہی اس کی ذات سے جدا ہے اور اس کے علم کی دلیل اس کے فعل کی عمدہ ترتیب ہے کیونکہ فعل اپنی ترتیب و استحکام میں اپنے فاعل کے علم کا مرہون ہے۔ پس اُس کا علم جملہ اسرار پر حاوی اور ظاہری امور پر محیط ہے۔ طالبِ حق کو چاہیے کہ سب اعمال ایسے طور پر کرے گویا خدا اُسے اور اس کے افعال کو دیکھ رہا ہے، جیسا کہ وہ جانتا ہے کہ خدا سے افعال پوشیدہ نہیں۔

حکایت:

بیان کرتے ہیں کہ بصرہ کا ایک رئیس اپنے باغ میں گیا تو اس کی نظر کسان کی عورت پر پڑ گئی اور اس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو گیا، چنانچہ اس نے اس کے خاوند کو کسی کام پر بھیج دیا اور عورت سے کہا کہ "دروازے بند کر دو۔" عورت نے کہا: "سب دروازے بند کر سکتی ہوں مگر ایک دروازہ میں بند نہیں کر سکتی۔" اس نے کہا: "وہ کون سا دروازہ

ہے؟" عورت نے جواب دیا: "وہ دروازہ جو ہمارے اور خدا کے درمیان ہے۔" یہ سن کر وہ رئیس شرمندہ ہوا اور توبہ کی۔

حکایت:

حضرت حاتم اصم رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ میں نے چار علم اختیار کر کے عالم کے باقی تمام علوم سے نجات پائی ہے۔ لوگوں نے پوچھا: وہ کون سے چار علوم ہیں؟ آپ نے فرمایا: اول یہ کہ میں نے جان لیا ہے کہ میرا رزق مقدر ہو چکا ہے جس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی اس لیے زیادہ کی تلاش سے میں بے فکر ہو گیا ہوں، دوسرا یہ کہ میں نے جان لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر حق ہے جس کو سوائے میرے اور کوئی ادا نہیں کر سکتا، اس لیے میں اس کے ادا کرنے میں مشغول ہو گیا ہوں، تیسرا یہ کہ میں نے جان لیا ہے کہ میرا ایک تلاش کرنے والا ہے (یعنی موت) کہ میں اس سے بھاگ نہیں سکتا، اس لیے میں نے اس کا سامان کر لیا ہے۔ (نیک کام کرتا ہوں) اور چوتھا یہ کہ میں نے جان لیا ہے کہ میرا ایک مالک ہے جو میرے احوال سے واقف ہے، اس لیے میں نے اس سے شرم کی اور ناکردنی کاموں سے ہاتھ اٹھا لیا اور جب انسان یہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے تو وہ کوئی ایسا کام نہ کرے کہ قیامت کے روز اسے اس کے سامنے شرمسار ہونا پڑے۔

تیسری فصل
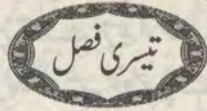
معرفت وشریعت:

انسان کو امورِ الٰہی اور خدا کی معرفت کا علم ہونا ضروری ہے۔ انسان پر مصلحت وقت کا علم بھی فرض ہے اور جو علم بوقت ضرورت اس کے کام آتا ہے، اس کا ظاہر و باطن دو قسم کا ہے: ایک علم اصول، دوسرا علم فروع۔ علم اصول کا ظاہر حکم شہادت ہے اور باطن معرفت الٰہی کی تحقیق، جبکہ علم فروع کا ظاہر معاملات دینی کو عمل میں لانا ہے اور اس کا باطن نیت کا صحیح کرنا ہے یعنی دل میں خالص لِوجہِ اللہ کام کرنے کا ارادہ، لیکن ان میں سے ہر ایک کا قیام دوسری قسم کے بغیر محال ہے۔ حقیقت کا ظاہر باطن کے بغیر منافقت ہے اور باطن ظاہر کے بغیر بے دینی ہے اور شریعت کا ظاہر باطن کے بغیر نقصان اور باطن بغیر ظاہر کے ہوس ہے۔ پس علم حقیقت کے تین ارکان ہوئے۔ اول: ذاتِ الٰہی اور اس کی وحدانیت اور اس سے تشبیہ کی نفی کا علم، دوم: صفاتِ الٰہی اور اس کے احکام کا علم، سوم: افعالِ الٰہی اور اُن کی حکمت کا علم۔

علم شریعت کے بھی تین ارکان ہیں:

(اوّل) علم کتابِ الٰہی

(دوم) علم سنتِ نبوی ﷺ

(سوم) علم اجماعِ اُمت

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے افعال کے ثابت کرنے کا علم ضروری ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (ترجمہ: جان لو کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے اور کوئی معبود نہیں) اور یہ قول فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ (ترجمہ: جان لو کہ اللہ ہی تمہارا مالک ہے) نیز یہ ارشاد الٰہی: اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ (ترجمہ: کیا آپ اپنے پروردگار کی طرف نہیں دیکھا کہ کس طرح اس نے سایے کو پھیلایا ہے) اور یہ قولِ الٰہی: اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ (ترجمہ: کیا وہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کیسا (عجیب الخلقت) پیدا کیا گیا ہے) اور ایسی ہی بہت سی آیتیں ہیں، جو افعالِ الٰہی میں غور وفکر کرنے پر دلالت کرتی ہیں تاکہ تم ان سے فاعل حقیقی کی

صفات کو پہچان سکو اور نیز رسول ﷺ نے فرمایا ہے: مَنْ عَلِمَ اَنَّ اللّٰهَ رَبُّهٗ وَاِنِّیْ نَبِیُّهٗ حَرَّمَ اللّٰهُ لَحْمَهٗ وَدَمَهٗ عَلَی النَّارِ (ترجمہ: جس نے یہ جان لیا کہ اللہ اس کا رب ہے اور میں اس کا نبی ہوں، اللہ نے اس کا گوشت اور خون آتش دوزخ پر حرام کر دیا ہے) لیکن علم ذاتِ الٰہی کی شرط یہ ہے کہ عاقل بالغ انسان یہ اچھی طرح جان لے کہ حق تعالیٰ بذات خود ہمیشہ سے تھا، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ نہ اس کی ابتدا ہے اور نہ انتہا، وہ کسی خاص مکان اور جہت میں نہیں اور اس کی ذات آفت (نقص) سے پاک ہے۔ مخلوق میں اس کی مانند کوئی نہیں اور نہ اس کے بیوی بچے ہیں اور جو کچھ تمہارے وہم و عقل میں متصور ہوتا ہے، وہ اُن سب کا پیدا کرنے والا، ان کا قائم رکھنے والا اور مالک ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (ترجمہ: کوئی چیز اس کی مانند نہیں اور وہ سب کچھ سنتا دیکھتا ہے) لیکن صفات الٰہی کے جاننے کی شرط ہے کہ اس کی صفات (حقیقیہ) اس کی ذات کے ساتھ موجود ہیں، نہ عین ذات ہیں اور نہ ہی غیر اور اس سے جدا ہیں (بلکہ لازم غیر منفک ہیں) جیسے علم و قدرت وحیات و ارادہ و سمع وبصر وکلام و بقا۔ چنانچہ ارشاد ہے: اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (ترجمہ: بلاشبہ وہ سینوں کے بھیدوں کو خوب جانتا ہے) اور فرمایا ہے: وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (ترجمہ: اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے مزید ارشاد ہے: هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (ترجمہ: اور وہ سب کچھ سنتا، دیکھتا ہے) نیز فرمایا ہے۔ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ (ترجمہ: وہ جو چاہے کرنے والا ہے) اور نیز فرمایا ہے: هُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (ترجمہ: وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے اس کے سوائے اور کوئی معبود نہیں) نیز ارشاد ہے: قَوْلُهُ الْحَقُّ ط وَلَهُ الْمُلْكُ (ترجمہ: اسی کا فرمان حق ہے اور اسی کی حکومت ہے)۔

لیکن اس کے افعال کے علم کے لیے صورت یا اس کے مطلب کے لیے یہ شرط ہے کہ تم جانو کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات اور ان کے افعال کا پیدا کرنے والا ہے اور تمام عالم (عدم سے) اس کے حکم سے موجود ہو گیا۔ وہ خیر و شر کا اندازہ کرنے والا اور نفع و ضرر کا خالق ہے۔ جیسا کہ خود ارشاد فرمایا ہے: اَللّٰهُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ (ترجمہ: اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے)۔ شریعت کے احکام کے اثبات کی دلیل یہ ہے کہ یقین جانو کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہمارے پاس اس کے رسول خارقِ عادت (خلاف عادت) معجزات لے کر آئے ہیں اور جو کچھ آنحضرت ﷺ نے پوشیدہ اور ظاہر امور کے متعلق ہمیں خبر دی۔ حق ہے۔ شریعت کا رکن اوّل کتابِ الٰہی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ (ترجمہ: اس کتاب میں محکم آیتیں ہیں، جن کا مطلب ظاہر ہے۔ وہی کتاب کا اصل ہیں) اور دوسرا رکن سنت نبوی ﷺ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ (ترجمہ: جو کچھ رسول ﷺ تمہیں دیں، وہ لے لو اور جس بات سے وہ تمہیں روکیں، اس سے رُک جاؤ) تیسرا رکن اجماع امت ہے، جیسا کہ رسول ﷺ نے فرمایا ہے: لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَةِ عَلَیْکُمْ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ۔ (ترجمہ: میری اُمت گمراہی پر متفق نہیں ہو گی۔ تم پر اہل حق کی سب سے بڑی جماعت کی پیروی لازم ہے)۔ الغرض حقیقت کے احکام اتنے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان سب کو جمع کرنا چاہے تو کر نہیں سکتا، کیونکہ خداوند تعالیٰ عزاسمہ، کے لطائف کی کوئی انتہا نہیں۔

چوتھی فصل

مذہب سوفسطائیہ:

جان لو کہ ملحدوں کا ایک گروہ (اللہ اُن پر لعنت کرے)، جنہیں سوفسطائیہ (ہر بات میں شک کرنے والے)

پانچویں فصل
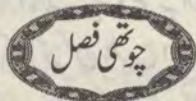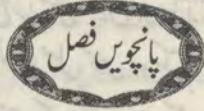
صوفیا کے اقوال:

محمد بن فضل بلخی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلْعِلْمُ ثَلَاثَۃٌ عِلْمٌ مِّنَ اللّٰہِ وَعِلْمٌ مَّعَ اللّٰہِ وَعِلْمٌ بِاللّٰہِ (ترجمہ: علم کی تین قسمیں ہیں: اوّل، وہ علم جو اللہ کی طرف سے ہو۔ دوم، وہ علم جو اللہ کی معیت میں حاصل ہو۔ سوم، وہ علم جو خود اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے متعلق ہو۔

علم باللہ وہ معرفتِ الٰہی ہے کہ تمام انبیاء و اولیاء نے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو اسی کے ذریعہ سے پہچانا ہے اور جب تک خود ذاتِ حق کی طرف سے اس کی پہچان کی توفیق انہیں نہیں ملی، انہوں نے اسے نہیں پہچانا، اس لیے کہ حصول علم کے تمام اسباب ذات و صفات حق تعالیٰ سے منقطع ہیں اور انسان کا علم معرفت حق تعالیٰ کا سبب نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کی معرفت کا سبب بھی خود اسی کی رہنمائی اور بندے کو آگاہ کرنا ہے۔ علم منِ اللہ علم شریعت ہے جو اس کی طرف سے ہمیں نیک اعمال کا حکم دیتا اور اُن کے بجالانے کو ہم پر لازم کرتا ہے اور علم مع اللہ طریق حق اور قربِ الٰہی کے مقامات اور اولیاء کے درجات بیان کرنے کا علم ہے۔ پس معرفت الٰہی شریعت کو قبول کیے بغیر اور شریعت پر عمل کیے بغیر صحیح نہیں ہوسکتی۔

ابوعلی ثقفی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلْعِلْمُ حیات القلب من الجهل و نورالعین من الظلمة (ترجمہ: علم جہالت کی موت سے دل کا زندہ ہونا اور کفر کی تاریکی سے ایمان کی آنکھ کا روشن ہونا ہے)۔ جس شخص کو معرفتِ الٰہی کا علم حاصل نہیں، اس کا دل جہالت کی وجہ سے مردہ ہے اور جسے شریعت کا علم حاصل نہیں، اس کا دل جہالت کی بیماری میں مبتلا ہے۔ پس کفار کا دل مردہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی ذات و صفات سے جاہل ہیں اور اہل غفلت کا دل بیمار ہے کہ وہ اس کے احکام (اوامر و نواہی) سے بے خبر ہیں۔

ابوبکر وراق ترمذی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: من اکتفی بالکلام من العلم دون الزهدِ فقد تزندق ومَنِ اکتفی بالفقه دون الورع فقد تفسّقَ (ترجمہ: جو شخص علم کلام (توحید الٰہی) سے محض اس کی عبارت پر اکتفا کرتا ہے اور اس کے اضداد سے منہ موڑ کر تقویٰ اختیار نہیں کرتا، وہ بے دین ہے اور جو شخص محض علم فقہ و شریعت پر بغیر پرہیزگاری کے اکتفا کرتا ہے، وہ فاسق ہو جاتا ہے)۔ مراد اس سے یہ ہے کہ بغیر عمل و مجاہدہ و کوشش صرف توحید الٰہی کا اقرار جبر[1] ہے اور حقیقی موحد کو لازم ہے کہ وہ قول میں جبری ہو (یعنی زبان سے کہے کہ انسان وہی کہہ سکتا ہے کہ جو اس کے لیے مقدر ہو چکا ہے) اور فعل میں قدری[2] ہو تا کہ اس کا طریقِ عمل جبر و قدر کے درمیان ہو جائے اور یہی قول اس قول کی حقیقت ہے جو کہ اس پیر نے فرمایا ہے (اس پر اللہ کی رحمت ہو)۔ التوحیدُ دُونَ الجبر و فوْق القدر (ترجمہ: توحید عقیدہ جبر سے نیچے اور عقیدۂ قدر سے اوپر (بین بین) ہے) پس جو شخص علم توحید سے بلاعمل صرف عبارت پر اکتفا کرتا ہے اور اس کے مخالف امور سے باز نہیں آتا، وہ ضرور بے دین ہو جاتا ہے لیکن فقہ میں ہر برائی سے پرہیز و احتیاط شرط ہے اور جو شخص ظاہری علم فقہ و شریعت بغیر پرہیزگاری کے حاصل کرتا، تاویلات کے جواز اور شبہات میں مشغول ہوتا اور مذہب کا لحاظ کیے بغیر آسانی حاصل کرنے کے لیے مجتہدین کے اجتہادوں کی پیروی

---

[1] جبر سے مراد یہ ہے کہ انسان کا ہر فعل خدا کی تقدیر کے ماتحت ہے۔

[2] قدری سے مراد وہ گروہ ہے جس کا عقیدہ ہے کہ ہر کام انسان اپنی قدرت سے کرتا ہے۔

کرتا ہے، وہ بہت جلد فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یہ سب باتیں غفلت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

شیخ المشائخ حضرت یحییٰ معاذ رازی رحمتہ اللہ علیہ نے کیا ہی اچھا فرمایا ہے: اجتنب صحبتة ثلاثة اصنافٍ من الناس العلماء الغافلين و الفقراء المداهنين و المتصَوَّفةِ الجاهلين (ترجمہ: تین قسم کے لوگوں کی صحبت سے اجتناب کرو۔ غافل عالموں، خوشامدی فقیروں اور جاہل صوفیوں کی صحبت سے)۔ غافل علماء وہ ہیں جنہوں نے دنیا کو دل کا قبلہ اور شریعت سے آسان چیزوں کو اختیار کر کے ظالم بادشاہوں کی پرستش کو اپنا وطیرہ اور ان کی درگاہ کو اپنی طواف گاہ بنا رکھا ہے اور لوگوں کی نظر میں وقعت حاصل کرنے کو اپنی محراب بنا کر غرور اور دانائی پر فریفتہ اور اپنے کلام کی باریکی میں مشغول ہو گئے ہیں اور ائمہ دین اور استادوں کے حق میں لعن طعن کی زبان دراز کر کے بزرگانِ دین کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ زیادتی اور مبالغہ میں اس حد تک پہنچ گئے ہیں تو ان کی نظر میں اس کا کچھ بھی وزن نہ ہوگا کیونکہ کینہ اور حسد کو انہوں نے اپنا مذہب بنا لیا ہے۔

الغرض یہ سب لوگ حقیقی عالم نہیں ہوتے اور علم ایک ایسی صفت ہے جس کی بدولت ہر قسم کی جہالت کی بات اس کے موصوف سے دور ہو جاتی ہے اور چاپلوس فقیر وہ ہیں کہ جب کوئی کام ان کی خواہش نفس کے مطابق کرے تو اگرچہ وہ فعل باطل ہی ہو، وہ اس کی مدح کریں اور جب کوئی شخص کوئی ایسا کام کرے جو ان کی خواہش کے مخالف ہو تو خواہ وہ فعل حق ہی ہو، وہ اس فعل کی وجہ سے اس کی مذمت کریں اور وہ لوگوں سے اپنے عمل اور برتاؤ کے باعث مرتبے کی طمع کریں اور خلق خدا کو باطل امور کی تلقین کریں اور جاہل صوفی وہ ہیں کہ نہ وہ کسی مرشد کی صحبت میں رہے، نہ کسی بزرگ سے ادب سیکھے، نہ زمانے کے مصائب جھیلے اور کور باطنی سے (فقیرانہ) نیلا لباس پہن کر اپنے آپ کو لوگوں کے درمیان ڈال دے اور ان کی صحبت میں بیٹھ کر اپنی بے عزتی پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور حماقت نے ان کو اس بات پر اُبھارا ہے کہ سب لوگوں کو اپنے جیسا سمجھتے ہیں اور اسی لیے حق و باطل میں تمیز کرنے کا طریق ان پر پوشیدہ رہتا ہے۔ پس ان تینوں گروہوں کا جو اس توفیق یافتہ پیر نے ذکر فرمایا ہے اور اپنے مرید کو ان کی صحبت سے اجتناب کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے دعوے میں جھوٹے اور اپنے طریق میں ناقص ہیں۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: عملت فی المجاهدة ثلثین سنة فما وجدت شيئًا اشد علی من العلم و متابعته (ترجمہ: میں نے تیس سال مجاہدہ کیا پس میں نے علم اور اس کے مطابق عمل کرنے سے اور کسی چیز کو اپنے لیے مشکل نہ پایا)۔ الغرض آگ پر قدم رکھنا طبیعت کے لیے علم کے مطابق چلنے سے زیادہ آسان ہے، پل صراط سے ہزار بار گزرنا جاہل کے نزدیک علم کا ایک مسئلہ سیکھنے سے زیادہ سہل ہے اور فاسق کے لیے دوزخ میں رہنا علم کے ایک مسئلے پر عمل کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔ پس تیرے لیے علم سیکھنا اور اس میں کمال حاصل کرنا لازم ہے اور بندے کے علم کا کمال بمقابلہ علم الٰہی جہل ہے اور تمہیں اس قدر جاننا چاہیے کہ تم کچھ نہیں جانتے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ بندگی کے علم کے سوائے کچھ نہیں جانتا اور بندگی (بندہ ہونا) خدا اور بندے کے درمیان سب سے بڑا حجاب ہے۔

اسی معنی میں کسی بزرگ نے فرمایا ہے:

العجز عن درك الادراكُ ادراكُ والوقف فی طريق الجهد اشراكُ

(ترجمہ: حقیقت الٰہی کے معلوم کرنے سے عاجز ہونا ہی اس کی حقیقت کا معلوم کرنا ہے اور جہالت کے

طریق میں ٹھہر جانا شرک ہے)۔

؎ تلاش یار میں نکلے چمن سے بو ہو کر ہوئے ہم آپ ہی گم محو جستجو ہو کر

یعنی جو عالم معرفت نہیں سیکھتا اور اپنی جہالت پر مصر ہوتا ہے، وہ مشرک ہے اور جو سیکھتا ہے اور کمال علم کی وجہ سے حق بات اس پر ظاہر ہو جاتی ہے اور علم کا غرور اس سے دور ہو جاتا ہے، وہ یہ جان لیتا ہے کہ اس کا علم معرفت الٰہی میں سوائے عاجزی کے اور کچھ نہیں، کیونکہ بندے کی وہمی معلومات کا حقائق معرفت کے بارے میں کوئی اعتبار نہیں ہوتا تو یہ عاجزی ہی اس کے لیے علم کی کنہہ دریافت کرنا ہے۔

دوسرا باب: فقر

پہلی فصل
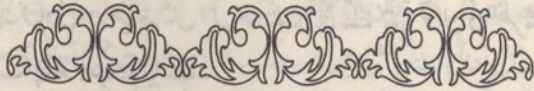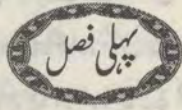
درویش و درویشی کی بزرگی:

جان لو کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں درویشی اور درویشوں کا بہت بڑا درجہ ہے۔ چنانچہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: (الصَّدَقٰتِ) لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِیۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِی الۡاَرۡضِ یَحۡسَبُهُمُ الۡجَاهِلُ اَغۡنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (ترجمہ: صدقات اُن فقیروں کا حق ہیں، جو اللہ کی راہ میں روک دیئے گئے ہیں کہ زمین میں چل پھر نہیں سکتے۔ جاہل ان کو ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے غنی سمجھتا ہے)۔ نیز فرمایا ہے: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبۡدًا مَّمۡلُوۡكًا لَّا یَقۡدِرُ عَلٰی شَیۡءٍ وَّمَنۡ رَّزَقۡنٰهُ مِنَّا رِزۡقًا حَسَنًا (ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے ایک غلام بندے کی، جو کچھ بھی نہیں کرسکتا اور اس شخص کی، جس کو اللہ کی طرف سے فراخ رزق ملا ہے، مثال بیان کی ہے)۔ اور مزید فرمایا ہے تَتَجَافٰی جُنُوۡبُهُمۡ عَنِ الۡمَضَاجِعِ یَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا (ترجمہ: ان کے پہلو خواب گاہوں سے الگ رہتے ہیں۔ وہ خوف اور اُمید کی حالت میں اپنے رب کو پکارتے ہیں)۔

رسول اللہ ﷺ نے فقر کو پسند کیا اور فرمایا: اللّٰھم احینی مسکیناً و امتنی مسکینا واحشرنی فی زمرة المساکین (ترجمہ: اے اللہ! مجھے مسکین زندہ رکھ اور مسکینی میں وفات دے اور قیامت کے دن مجھے مسکینوں کے گروہ میں اُٹھا) نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ادنوا منی احبائی فیقول الملٰئکة من احبائك فیقول اللّٰہ الفقراءُ وَالۡمَسَاکِیۡنُ (ترجمہ: اے میرے دوستو! مجھ سے قریب ہو جاؤ۔ فرشتے عرض کریں گے کہ تیرے دوست کون ہیں؟ تو اللہ فرمائے گا کہ فقیر اور مسکین) اور ایسی آیتیں اور حدیثیں بہت سی ہیں جس کی زیادہ شہرت کی وجہ سے اثباتِ فقر میں ان کے لکھنے کی ضرورت نہیں اور رسول اللہ ﷺ کے وقت میں کئی مہاجر فقیر تھے، جو حق تعالیٰ کی بندگی اور پیغمبر ﷺ کی صحبت اور متابعت کی خاطر مسجد نبوی ﷺ میں رہا کرتے تھے اور دنیا کے تمام اشغال اور بکھیڑوں کو چھوڑ رکھا تھا اور اپنی روزی کے بدلے میں اللہ تعالیٰ پر یقین اور بھروسا کیے ہوئے تھے، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کو ان کی صحبت اور ان کا حق ادا کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ (ترجمہ: اے نبی! ان لوگوں کو اپنے سے دُور نہ کیجیے، جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور اُس کی رضا مندی چاہتے ہیں) اور ارشاد ہے: وَلَا تَعۡدُ عَیۡنٰكَ عَنۡهُمۡ تُرِیۡدُ زِیۡنَةَ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا (ترجمہ: اے نبیؐ! آپ ان (عبادت گزار) فقراء سے نگاہیں نہ پھیریئے۔ کیا آپ دنیوی زندگی کی شان و شوکت چاہتے ہیں؟) یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ جہاں کہیں بھی ان میں سے کسی ایک کو دیکھ لیتے تو فرماتے: "میرے ماں باپ ان لوگوں پر فدا ہوں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے مجھ پر عتاب فرمایا۔" پس اللہ تعالیٰ نے فقر کو بہت بڑا مرتبہ دیا ہے اور فقراء کو اس کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے اس لیے کہ انہوں نے دنیا کے ظاہری اور باطنی اسباب کو ترک کر کے پورے طور پر اسباب کے پیدا کرنے والے (اللہ تعالیٰ) کی طرف رجوع کیا، یہاں تک کہ اُن کا فقر ان کے لیے فخر ہو گیا کہ اس کے

چلے جانے پر نالاں اور اس کے آنے پر خوش رہے اور اس سے بغلگیر ہوئے اور اس کے لوازم کے سوا باقی سب امور کو انہوں نے ذلیل سمجھا، لیکن فقر کی ایک رسم اور ایک حقیقت ہے۔ اس کی رسم (ظاہری علامت) مفلسی اور بے کسی ہے اور حقیقت ذاتِ حق کی طرف سے توجہ اور اس کی معرفت ہے۔ جس شخص نے فقر کی رسم کو دیکھ کر اس پر قناعت کی اور جب اس کا مقصود حاصل نہ ہوا تو حقیقت سے دُور بھاگا اور جس نے حقیقت کو پالیا اس نے موجودات سے منہ موڑ کر (کل ذاتِ خداوندی) کی رویت میں پورے طور پر فنا ہوا اور بقائے کل کی طرف پیش قدمی کی تو اس نے بفحوائے مَنْ لم یعرف سوی رسمه لم یسمع سوی اسمه (ترجمہ: جس نے فقر کی ظاہر علامت کے سوا کچھ نہ جانا اس نے سوائے اُس کے نام کے کچھ نہ سنا)۔

پس فقیر وہ ہے کہ اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور نہ کسی چیز سے اس کا نقصان ہو، نہ تو اسبابِ دنیوی کے موجود ہونے سے وہ غنی ہوتا ہے اور نہ ہونے سے اس کا محتاج رہتا ہے۔ اسباب کا ہونا نہ ہونا اس کے فقر کے نزدیک برابر ہے اور اگر ان اسباب کے نہ ہونے پر وہ زیادہ خوش ہو تو جائز ہے، اس لیے کہ مشائخ صوفیا نے فرمایا ہے کہ درویش جتنا تنگ دست ہوتا ہے، اتنا ہی وہ خوش حال ہوتا ہے کیوں کہ اسباب کا ہونا درویش کے لیے بہت برا ہے، یہاں تک کہ جتنا کسی چیز کو وہ خود اپنے پاس روک کے رکھتا ہے، اتنا ہی وہ خود مقید اور پابند رہتا ہے۔ پس اولیاء اللہ کی زندگی مخفی عنایات اور اسرار الٰہی کے ساتھ قربِ حق میں بہتر ہے نہ کہ دنیا کے اسباب کے ساتھ جو بے وفا اور بدکاروں کا گھر ہے، غرض دنیوی ساز و سامان رضائے الٰہی کے راستے سے روکنے والے ہیں۔

حکایت:

بیان کرتے ہیں کہ ایک درویش کی کسی بادشاہ سے ملاقات ہوگئی۔ بادشاہ نے درویش سے کہا کہ "کوئی چیز مانگ۔" درویش نے کہا کہ "میں اپنے غلاموں کے غلام سے کوئی چیز نہیں مانگتا۔" بادشاہ نے کہا: "وہ کیسے؟" درویش نے کہا: "میرے دو غلام ہیں، جو دونوں آپ کے مالک ہیں، ایک حرص دنیا، دوسرا آرزو۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اَلْفَقْرُ عِزٌّ لِاَهْلِهٖ (ترجمہ: فقر اہل فقر کے لیے عزت ہے) پس جو چیز ایک لائق شخص کے لیے عزت ہے، وہ نالائق کے لیے ذلت ہوتی ہے اور فقیر کی عزت یہ ہے کہ اس کے اعضاء لغزش سے اور اس کا حال خلل سے محفوظ ہو، نہ اس کا جسم معصیت اور لغزش سے آلودہ ہو اور نہ اس کی جان اور دل آفت رسیدہ ہو، اس لیے کہ اس کا ظاہر مال ظاہری نعمتوں میں مستغرق ہوتا ہے اور اس کا باطن (باطنی و روحانی) نعمتوں کا منبع، یہاں تک کہ اس کا نفس رُوحانی اور دل ربانی ہو جاتا ہے اور کائنات کا اس کے ساتھ کوئی واسطہ اور انسان کو اس سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اس لیے کہ وہ نہ خلقت سے تعلق اور لگاؤ کی وجہ سے فقیر ہوتا ہے اور نہ اس عالم کے املاک سے غنی ہوتا ہے، بلکہ دونوں جہاں اس کے فقر کی ترازو کے پلے میں مچھر کے پر کے برابر بھی وزن نہیں رکھتے، اس کی ایک سانس بھی دونوں جہاں میں نہیں سما سکتی۔

دوسری فصل
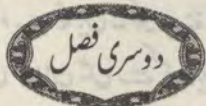
فقر و غنا کی فضیلت میں مشائخ کا اختلاف:

مشائخ صوفیا نے فقر و غنا کی فضیلت میں اختلاف کیا ہے کہ لوگوں کی ان دو صفتوں میں سے کون سی صفت زیادہ فضیلت رکھتی ہے، چونکہ خداوند تعالیٰ غنی حقیقی ہے اور اوصاف میں اسی کو کمال حاصل ہے، اس لیے یحییٰ بن معاذ

رازی رحمتہ اللہ علیہ، احمد بن الخوارزمی رحمتہ اللہ علیہ، حارث محاسبی رحمتہ اللہ علیہ، ابو العباس بن عطار رحمتہ اللہ علیہ، رُویم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ، ابو الحسن بن شمعون رحمتہ اللہ علیہ اور متاخرین میں سے شیخ المشائخ ابو سعید فضل اللہ بن محمد مہینی رحمتہ اللہ علیہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ غنا فقر سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے اور اس کی دلیل یہ بیان کرتے ہیں کہ غنا صفتِ الٰہی ہے (جو پاک اور بلند ہے) اور فقر کا اطلاق اس کی ذات پر جائز نہیں۔ پس کسی ولی میں وہ صفت جو بندے اور خدا کے درمیان مشترک ہو، اس صفت سے جس کا اطلاق خدا تعالیٰ پر جائز نہ ہو، زیادہ کامل ہوتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ اشتراک بندے اور خدا تعالیٰ میں فقط رسمی ہے، معنوی نہیں کیوں کہ معنوی اشتراک کے لیے باہمی مماثلت کی ضرورت ہے، چونکہ صفاتِ الٰہیہ قدیم اور صفاتِ مخلوق حادث (قابل تغیر) ہیں اس لیے یہ دلیل باطل ہے۔

میں علی بن عثمان جلابی (رحمتہ اللہ علیہ) کہتا ہوں کہ نام غنا صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لائق ہے اور مخلوق اس نام کی مستحق نہیں اور فقر کا نام خلقت کے لیے ہی سزاوار ہے اور حق تعالیٰ پر اس کا اطلاق جائز نہیں اور یہ جو مجازی طور پر کسی کو غنی کہا جاتا ہے، وہ حقیقی غنی جیسا نہیں ہو سکتا نیز اس سے واضح تر دلیل یہ ہے کہ ہماری غنا اسباب کے وجود پر مبنی ہے اور ہم ان اسباب کے قبول کرنے کی حالت میں مسبب ہیں اور حق تعالیٰ اسباب کا پیدا کرنے والا ہے اور اس کی غنا (حقیقی) ہے، اسباب پر موقوف نہیں پس صفت غنا میں بندہ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرکت جائز نہیں تو صفت میں کسی کا اس کے ساتھ اشتراک کیسے جائز ہوگا اور جب صفت میں اشتراک جائز نہیں تو اسم میں بھی روا نہیں۔ اب رہ گیا صرف نام رکھنا، سو نام ایک نشان ہوتا ہے خلقت کے درمیان اور اس کی کوئی حد نہیں۔

پس اللہ تعالیٰ کی غنا یہ ہے کہ اس کو کسی کی حاجت نہیں۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، نہ اس کی مراد کو کوئی ٹالنے والا ہے نہ اس کی قدرت کو کوئی روکنے والا ہے۔ وہ موجودات کے بدلنے اور اُن کے اضداد پیدا کرنے پر قادر ہے۔ ہمیشہ اس صفت غنا سے متصف ہے اور ہمیشہ اس سے متصف رہے گا لیکن مخلوق کی غنا اسباب زندگی کے حاصل ہو جانے یا خوشی میسر ہونے یا کسی آفت سے نجات پانے یا کسی چیز کے مشاہدے سے آرام پانے کی وجہ سے ہوا کرتی ہے اور یہ سب باتیں حادث و متغیر ہیں اور جستجو و حیرت کا سرمایہ اور عاجزی و خواری کا محل ہیں، پس غنا کا نام بندے کے لیے مجازی اور حق اور حق تعالیٰ کے واسطے حقیقی ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے: یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ (ترجمہ: اے لوگو! تم اللہ کی طرف محتاج ہو اور اللہ ہی بے نیاز سزاوار حمد و ثنا ہے) نیز اس نے فرمایا ہے: وَاللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (ترجمہ: اللہ ہی بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو)۔

عوام الناس کا ایک گروہ کہتا ہے کہ ہم دولت مند کو درویش پر فضیلت دیتے ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دونوں جہاں میں سعادت مند پیدا کیا ہے اور تونگری کا اس پر احسان فرمایا ہے۔ یہ لوگ غنا سے دنیا کی کثرت، بشری مقصود کا حاصل کرنا اور شہوت رانی مراد لیتے ہیں اور اس پر یہ دلیل لاتے ہیں کہ غنا پر اللہ تعالیٰ نے شکر کا حکم فرمایا ہے اور فقر پر صبر کا۔ پس صبر مصیبت میں ہوتا ہے اور شکر نعمتوں پر اور درحقیقت نعمتیں مصیبت سے افضل ہوتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ نعمت پر شکر کا حکم زیادتی نعمت کا سبب بنایا ہے اور فقر پر صبر کو قربِ الٰہی کی زیادتی کا سبب ٹھہرایا ہے چنانچہ فرمایا ہے: اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) اور شکر کو نعمت کی زیادتی کا سبب قرار دیکر فرمایا ہے: لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ (اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہارے لیے نعمت زیادہ کروں گا) جو شخص کسی نعمت پر جس کی اصل غفلت ہے، شکر کرے گا تو ہم اس کی غفلت پر اور زیادہ غفلت کر دیں گے اور جو شخص فقر میں

جس کی اصل مصیبت ہے، صبر کرے گا تو ہم اس کے قرب میں اور اضافہ کر دیں گے لیکن وہ غنا جسے مشائخ صوفیا فقر سے افضل غناء کہتے ہیں، وہ غنا جیسا کہ عوام الناس سمجھتے ہیں، نعمتوں کا پانا نہیں بلکہ وہ تو منعم حقیقی کو پالینا ہے پس منعم حقیقی کا پالینا اور چیز ہے اور غفلت کا پالینا (جو نعمت دنیوی کی اصل ہے) کچھ اور چیز۔

شیخ ابو سعیدؒ فرماتے ہیں: الفقرھو الغناءُ باللّٰه (ترجمہ: فقر اللہ تعالیٰ کے ساتھ غنی ہونا ہے) اس سے مراد مشاہدہ ذاتِ حق سے ہمیشہ کے لیے کشف حاصل کرنا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ کشف سے مشاہدۂ حق کرنے والے پر پھر حجاب کا آجانا ممکن ہے۔ پس اگر یہ حجاب مشاہدہ کرنے والے کو مشاہدۂ حق سے محجوب کر دے تو کیا وہ مشاہدے کا محتاج ہوگا یا نہیں؟ اگر وہ یہ کہیں کہ محتاج نہیں ہوگا تو یہ محال ہے اور اگر وہ یہ کہیں کہ وہ محتاج ہوگا تو ہم کہتے ہیں کہ جب اس کو احتیاج ہوئی تو غنا جاتا رہا (لہٰذا فقر کی یہ تعریف صحیح نہیں)۔ نیز غنا باللہ فقط اسی کو حاصل ہو سکتی ہے جس کی صفت کو بقا اور مراد کو دوام حاصل ہو اور انسانیت کے اوصاف پر غنا کا اطلاق صحیح نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس کی ذات خود غنا کے قابل نہیں اس لیے کہ بشریت کا وجود عین نیاز و احتیاج ہے اور احتیاج حدوث کی نشانی ہے، پس جس کی صفت باقی ہے وہی غنی ہو سکتا ہے اور جس کی صفت فانی ہے اس پر اسم کا اطلاق درست نہیں (چونکہ انسان کی صفتیں متغیر اور فانی ہیں اس لیے ہم اس کو غنی نہیں کہہ سکتے) پس اَلْغَنِیُّ مَنْ اَغْنَاہُ اللّٰہُ (ترجمہ: غنی وہی ہے جس کو اللہ غنی کرے) اس لیے کہ غَنِیٌ بِاللّٰہِ کی صورت میں بندہ فاعل ہوگا اور مَنْ اَغْنَاہُ اللّٰہُ کی صورت میں مفعول اور فاعل بذات خود قائم ہوتا ہے اور مفعول کا قیام فاعل کے ساتھ ہوتا ہے۔

پس پہلی صورت میں قائم بخود ہونا بشریت کی صفت کا ثابت کرنا ہوگا (جو صحیح نہیں) اور دوسری صورت میں قائم بحق ہونا بندے کی صفت کا محو کرنا ہوگا (جو بالکل صحیح ہے) اور میں علی بن عثمان جلابی، اللہ تعالیٰ مجھے توفیق دے یوں کہتا ہوں کہ جب عبودیت میں یہ بات درست ہو چکی ہے کہ غنا کا اطلاق درحقیقت صفت بقا پر بھی صحیح نہیں کیوں کہ آدمی کی صفت کا باقی رہنا دلائل مذکورہ سے علت کا محل اور آفت کا سبب ہوتا ہے اور صفت کا فنا ہونا خود غنا نہیں ہو سکتا کیوں کہ جو چیز باقی بذاتِ خود نہ ہو، اس کو کوئی نام نہیں دیتے۔ پس غنا کا نام فنا صفت رکھنا چاہیے اور جب صفت فانی ہوئی تو اسم کا محل بھی ساقط ہو گیا۔ غرض نہ صفت غنا ذات حق تعالیٰ سے متجاوز ہو سکتی ہے (اور نہ صفت فقر بندہ سے) آدمی پر نہ فقر کے اسم کا اطلاق ہو سکتا ہے نہ غنا کا، پھر تمام مشائخ صوفیا اور اکثر علماء کو غنا پر ترجیح دیتے ہیں اس لیے کہ کتاب اور سنت اس پر ناطق ہیں اور اُمت کے اکثر لوگ اس بات پر متفق ہیں۔

میں نے حکایات میں پڑھا ہے کہ ایک روز حضرت جنید اور ابن عطارحمۃ اللہ علیہم کے درمیان اسی مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی (کہ فقر افضل ہے کہ غنا)۔ ابن عطار رحمۃ اللہ علیہ نے اغنیا کو افضل قرار دیتے ہوئے یہ دلیل پیش کی کہ اللہ تعالیٰ ان سے بالمشافہ حساب لیں گے اور حساب لینا بے واسطہ کلام سنانا ہوتا ہے اور بے واسطہ ایک دوست کا دوسرے دوست پر عتاب ہوتا ہے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر اغنیا سے حساب لیں گے تو درویشوں سے عذر چاہیں گے اور عذر حساب سے افضل ہوتا ہے اور یہاں ایک عجیب لطیفہ ہے۔ ہم کہتے ہیں محبت میں عذر کرنا بیگانگی ہوتا ہے اور عتاب کرنا مخالفت، اور دوست ایسے مقام میں ہوتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں ان کے دوستانہ مراسم میں آفت اور مصیبت معلوم ہوتی ہیں کیوں کہ عذر کسی ایسی کوتاہی کی وجہ سے ہوتا ہے، جو اس سے دوست کے فرمان میں ہو جاتی ہے۔ جب دوست اس سے اپنا حق طلب کرتا ہے تو وہ اس سے عذر کرتا ہے اور عتاب ایسے قصور کے سبب سے ہوتا ہے، جو اس نے دوست کا

فرمان بجالانے میں کیا ہوتا ہے، تب دوست اس قصور پر اس کو عتاب کرتا ہے اور یہ دونوں امر محال ہیں۔

الغرض دونوں سے مطالبہ کیا جاتا ہے، فقراء سے صبر کا اور اغنیا سے شکر کا، اور دوستی میں نہ تو دوست دوست سے کچھ طلب کرتا ہے نہ دوست دوست کے فرمان سے منہ موڑتا ہے۔ کہتے ہیں: ظلم من سمیّ ابن آدم امیراً وقد سماہُ ربہٗ فقیراً (ترجمہ: ظلم کیا اس شخص نے جس نے ابن آدم کا نام امیر رکھا، حالانکہ اللہ نے اس کا نام فقیر رکھا ہے) یعنی جس کا نام خدا تعالیٰ نے فقیر رکھا ہے اگرچہ وہ امیر ہی ہو، وہ فقیر ہے اور ہلاک ہوا وہ شخص جس نے سمجھا کہ وہ امیر نہیں جب کہ اس کی نشست گاہ تخت و سریر ہے کیونکہ اغنیا صاحب صدقہ ہوتے ہیں اور فقرا صاحب صدق اور صاحب صدق ہرگز صاحب صدقہ کی طرح نہیں ہوتا (بلکہ درجے میں اس سے بڑھ کر ہوتا ہے)۔ پس حقیقت میں فقر ایوب، غنائے سلیمان کی طرح ہے اس لیے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کے لیے ان کے سخت صبر کی بدولت فرمایا: نِعْمَ الْعَبْدُ (ترجمہ: وہ بہت ہی اچھا بندہ ہے) اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے بھی ان کی حکومت کے راستی پر مبنی ہونے کے متعلق فرمایا: نِعْمَ الْعَبْدُ (ترجمہ: وہ بہت ہی اچھا بندہ ہے) پس جب رضائے الٰہی ہوگئی تو ان کے فقر کو ان کی غنا کی مانند کر دیا۔

حکایت:

(مصنفؒ رحمۃُ اللہ علیہ فرماتے ہیں) کہ میں نے استاد ابوالقاسم قشیری رحمۃُ اللہ علیہ کو کہتے سنا ہے کہ لوگوں نے فقر و غنا کے بارے میں کلام کیا ہے۔ ہر ایک نے اپنے لیے ایک بات اختیار کر لی ہے لیکن میں اس بات کو اختیار کرتا ہوں، جسے اللہ تعالیٰ میرے لیے پسند فرمائے اور مجھے اس میں محفوظ رکھے، اگر وہ مجھے دولت مند کردے تو غافل نہ رہوں اور اگر درویش بنادے تو حریص نہ رہوں، پس غنا نعمت ہے اور اس میں غفلت آفت ہے اور فقر نعمت ہے اور اس میں کفر و حرص ہلاک ہے اور فقر و غنا کے متعلق یہ تمام باتیں باوجود اختلاف روش کے سب اچھی ہیں، لیکن بغور دیکھا جائے تو فقر ماسوائے حق سے دل کا فارغ ہونا ہے اور غِنَا غَیْرُ اللّٰہِ (یعنی امور دنیوی میں دل کا مشغول ہونا)۔ جب ماسوائے اللہ سے فراغت حاصل ہوگئی تو فقر غنا سے بہتر ہوا اور غنا فقر سے کمتر۔ غنا کثرت سامان اور فقر قلت سامان کا نام نہیں اس لیے کہ سامان دنیا سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ جب طالب حق ملک کو ترک کر دے (اور یہ جان لے کہ یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی ہیں) تو شرکت درمیان سے اُٹھ گئی اور طالب دونوں ناموں سے فارغ ہوا۔

تیسری فصل
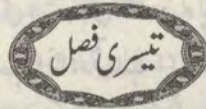
فقر و غنا کے متعلق مشائخ کے اقوال:

مشائخ طریقت میں سے ہر ایک نے فقر و غنا کے بارے میں اپنا اپنا خیال ظاہر فرمایا ہے اور میں حتیٰ الامکان ان کے اقوال اس کتاب میں بیان کروں گا انشاء اللہ۔

چنانچہ متاخرین میں سے ایک بزرگ فرماتے ہیں: لیس الفقیر من خلا من الزاد انما الفقیر من خلا من المراد (ترجمہ: فقیر وہ نہیں جس کا ہاتھ ساز و سامان دنیوی سے خالی ہو، بلکہ فقیر وہ ہے جس کی طبیعت مراد سے خالی ہو)۔ چنانچہ اگر اللہ تعالیٰ اسے مال دے اور اس کی مراد مال کی حفاظت ہو تو بھی وہ غنی ہے اور اگر اس کی مراد مال کا ترک کر دینا ہو تو بھی وہ غنی ہے۔ یہ دونوں باتیں غیر کی ملک میں تصرف کرنا ہیں اور فقر حفاظت و تصرف دونوں کا ترک کرنا ہے۔

یحییٰ بن معاذ رازی رَحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: علامته الفقر خوف الفقر۔ (ترجمہ: صحیح فقر کی علامت یہ ہے کہ بندہ کمال ولایت و قیام مشاہدہ کی صفت جاتے رہنے اور حق سے دور ہو جانے سے ڈرتا رہے) غرض اس کمال تک پہنچ جائے کہ اس کی علیحدگی سے ڈرتا ہے۔

روئم بن محمد رَحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ من نعت الفقر حفظ سر و صیانته نفسہٖ واداء فرائِضِہٖ۔ (ترجمہ: فقر کی تعریف یہ ہے کہ فقیر کا باطن اغراض نفسانی سے اور اس کا بدن آفت سے محفوظ ہو اور جو احکام اس پر فرض ہیں، برابر ادا ہوتے رہیں) چنانچہ جو کچھ باطن میں گزرے، اس کے اظہار میں مشغول نہ ہو اور واردات قلبی کا غلبہ اس کو حکم شریعت بجالانے سے نہ روکے اور یہ فی الحقیقت بشریت کے زائل ہونے کی علامت ہے کہ بندہ ہمہ تن حق کے موافق ہو جائے اور یہ بات بھی حق تعالیٰ کی توفیق سے حاصل ہوتی ہے۔

بشرحافی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: افضل المقامات اعتقاد الصبر علی الفقرالی القبر (ترجمہ: سب سے افضل مقام فقر پر قبر تک صبر کا اعتقاد کرنا ہے) یعنی درویشی پر ہمیشہ صبر کا اعتقاد کرنا بندے کے تمام مقامات قرب میں سے افضل مقام ہے۔ پس درویشی پر صبر کا اعتقاد کرنا، اعمال و افعال کی بربادی اور اوصاف کے فنا ہونے کی علامت ہے، لیکن اس قول کے ظاہری معنی فقر کو غنا پر فضیلت دینا اور اس بات کا اعتقاد کرنا ہے کہ فقر سے کبھی منہ نہیں موڑوں گا۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: الفقیر من لا یستغنی بشیئٍ دون اللّٰہ (ترجمہ: فقیر وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چیز سے بھی غنی نہیں ہوتا) یعنی فقیر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چیز سے آرام نہیں پاتا، اس لیے کہ اس کی ذات کے سوا اس کا کوئی مقصود اور مطلوب نہیں ہوتا۔

اس لفظ کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات کے سوا کسی اور چیز سے تونگری حاصل نہیں کر سکتا اور جب اس کو پالیا، تونگر ہوگیا۔ پس تیری ہستی حق تعالیٰ کے سوا ہے اور جب ماسویٰ اللہ (دنیا و مافیہا) کے ترک کئے بغیر تو تونگری حاصل نہیں کر سکتا تو خود تونگری کا حجاب ہوا اور جب تک تو راستے سے اُٹھ نہ جائے بھلا تو تونگر کب ہو سکتا ہے اور یہ بات اہل حقیقت کے نزدیک نہایت دقیق اور لطیف ہے اور اس قول کا حقیقی مطلب یہ ہے کہ اَلْفَقِیْرُ اَنْ لَّا یَسْتَغْنِیْ عَنْہُ (ترجمہ: فقیر کی شان یہ ہے کہ وہ ذات حق سے کبھی مستغنی نہ ہو) یعنی فقیر وہ ہے کہ اس کو کبھی غنا حاصل نہ ہو (بلکہ ہمیشہ ذاتِ حق کا محتاج ہو) اور یہ وہی بات ہے جو اس پیر یعنی عبداللہ انصاری ہروی رحمۃ اللہ علیہ نے کہی ہے کہ ہمارا غم ابدی ہے کیونکہ نہ تو ہماری ہمت کبھی مقصود کو پاتی ہے اور نہ دنیا اور آخرت میں ہماری کلیت (حقیقت نوعی جس سے مراد بشریت و انسانیت ہے) فنا ہوتی ہے، اس لیے کسی چیز کے پانے کے لیے ہم جنس ہونا لازم ہے اور ذات حق میں ہم جنس بشریت نہیں، اور اس کے ذکر سے رُوگردانی غفلت ہے اور درویش غافل نہیں ہوتا، پس یہ ایک دائمی مصیبت ہوگئی ہے اور کٹھن راستہ ہے، کیونکہ اس ذات سے دوستی ہے کہ نہ کوشش انسان کو اس کے دیدار کے لیے راستہ ہے اور نہ اس کا وصال خلقت کے مقدور میں ہے نہ ماسویٰ اللہ بقا اختیار کر سکتا ہے اور نہ بقائے ذات حق میں کوئی تغیر جائز ہے۔ فانی کبھی باقی نہیں ہو سکتا تا کہ (بوجہ مجانست) وصل حاصل ہو جائے اور نہ باقی فانی ہو سکتا ہے کہ قرب حاصل ہو جائے۔

غرض اولیاء اللہ کا کام سراسر رنج و محنت ہے۔ لوگوں نے دل کی تسلی کے لیے ایک مضمون بنا سنوار رکھا ہے اور جان کے آرام کے لیے مقامات اور منزلیں، اُن کے حصول کا طریقہ ظاہر کر کے عبارتیں اس کے اظہار کے لیے خود

بخود گھڑلی ہیں اور مقامات اپنے آپ وضع کر لیے ہیں، حالانکہ حق تعالیٰ مخلوق کے اوصاف واحوال سے منزہ ہے۔

ابو الحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: نعت الفقیر السکوت عند العدم والبدل عند الوجود وقال ایضا الاضطراب عند الوجود (ترجمہ: فقیر کی صفت یہ ہے کہ چیز کے نہ ہونے کی صورت میں خاموش رہے اور ہونے کی صورت میں اس کو خرچ کرے، نیز فرمایا کہ اس چیز کے موجود ہونے کے وقت بیقرار ہو) یعنی فقیر جب کوئی چیز نہ پائے تو خاموش رہے اور جب پائے تو دوسرے کو اس کا اپنے سے زیادہ مستحق سمجھے اور اس پر اس چیز کو خرچ کرے، پس وہ شخص جس کو خوراک مطلوب ہو، جب مطلوب اس کو نہ ملے تو دل اس کا مطمئن رہے اور جب مطلوب (خوراک) مل جائے تو جسے وہ اپنی نسبت اس کا زیادہ مستحق سمجھے، اسے دے دے۔

یہ بہت بڑا کام ہے اور اس قول کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ نعمتِ دنیا کے موجود نہ ہونے کی حالت میں اس کی تسلی اس کا راضی بر ضائے الٰہی ہونا ہے اور اس کے موجود ہونے کی حالت میں اس کا دوسروں پر خرچ کرنا محبت الٰہی ہے اس لیے کہ راضی کا مطلب ہے فرمانبرداری کا قبول کرنے والا اور فرمانبرداری قربِ الٰہی کی علامت ہے اور محبّ نعمت کو ترک کرنے والا ہوتا ہے اور نعمتِ خدا سے علیحدگی کا نشان ہے۔ دوسرے یہ کہ نعمتِ دنیا کے نہ ہونے کی صورت میں اس کی تسلی اس نعمت کے موجود ہونے کا انتظار ہے اور جب وہ نعمت موجود ہو جائے تو چونکہ وہ ذاتِ حق کا غیر ہے اور اس کو غیر اللہ کے ساتھ آرام نہیں اس لیے وہ اس کو ترک کردے۔ شیخ المشائخ ابوالقاسم جنید بن محمد الجنید رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کا مطلب بھی یہی ہے، جو انہوں نے فرمایا ہے: اَلْفَقْرُ خُلُوُّ الْقَلْبِ نَحنِ الْاَشْقَالِ (ترجمہ: فقر دل کا ماسوائے اللہ کی صورتوں سے خالی ہونا ہے) جب اس کا دل ماسوائے اللہ کی صورت سے خالی ہو تو ماسوا کو دل سے باہر نکالے بغیر اس کو کیا چارہ ہے۔

شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: الفقر بحر البلاءِ وَبلاءُ ہٗ کله عز (ترجمہ: درویشی مصیبت کا دریا ہے اور اس کی تمام مصیبتیں عزت ہیں) اور عزت فقر ہی کا حصہ ہے اس لیے کہ وہ عین بلا میں مبتلا ہوتا ہے اس کو غیر کی کیا خبر۔ یہاں تک کہ جب وہ بلا سے ہٹ کر بلا میں ڈالنے والے (ذاتِ حق) کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس وقت اس کی مصیبت اس کے لیے عزت بن جاتی ہے اور اس کی ساری عزت قربت، اور اس کی قربت محبت، اور اس کی محبت سب مشاہدہ بن جاتی ہے یہاں تک کہ طالب کا دماغ خیال کے غلبے سے دیدار کا محل ہو جاتا ہے کہ بغیر کان کے سنتا ہے۔ پس عزت والا وہ بندہ ہے جو دوست کی بلا کا بوجھ اٹھائے، کیونکہ بلا حقیقت میں عزت اور نعمت ذلت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ عزت وہ ہے جو بندے کو حضورِ حق میں حاضر کر دے اور ذلت وہ ہے جو اس کو حق سے غائب کر دے اور فقر کی بلا حضورِ حق کا نشان ہے اور غنا کی راحت اس سے دُوری کی علامت۔ پس حاضر بحضورِ الٰہی عزیز اور حق سے غائب ذلیل ہے اور وہ بلا جس کا مطلب مشاہدہ اور دیدارِ محبت ہو جس طرح بھی اس سے تعلق ہو، غنیمت ہے۔

جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یا معشر الفقراء انکم تعرفون باللّٰه و تکرمون للّٰه فانظر واکیف تکونو مع اللّٰه ذا خلوقم بہٖ (ترجمہ: اے گروہ فقراء! لوگ تمہیں اللہ کے واسطے سے پہچانتے ہیں اور اللہ ہی کے لیے تمہاری عزت کرتے ہیں۔ پس دھیان رکھو کہ اللہ کے ساتھ خلوت میں تم کیسے ہو؟) یعنی جب لوگ تمہیں درویش کہتے ہیں اور تمہارا حق ادا کرتے ہیں تو غور کرو کہ تم طریقِ درویشی کا حق کیوں کر ادا کرتے ہو؟ اور اگر لوگ تمہیں تمہارے دعوے کے خلاف کسی اور نام سے پکاریں تو ناپسندیدگی کا اظہار نہ کرو کیونکہ اس صورت میں تم نے بھی اپنے

دعویٰ کا حق ادا نہ کیا ہوگا، کیونکہ سب سے کمینہ وہ شخص ہے جسے لوگ اللہ کا بندہ سمجھیں اور وہ خود فی الواقعہ اس کا بندہ نہ ہو اور سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جسے لوگ اللہ کا بندہ سمجھیں اور خود فی الواقعہ اس کا بندہ ہو۔ اس شخص کی مثال جسے لوگ بندۂ خدا سمجھیں اور وہ خود بندۂ خدا نہ ہو، اس شخص کی سی ہے کہ طبیب ہونے کا دعویٰ کرے اور بیماروں کا علاج بھی کرے اور جب خود بیمار ہو جائے تو دوسرے طبیب کی اس کو حاجت ہو کہ وہ اس کا علاج کرے۔ اس شخص کی مثال جسے لوگ بندۂ خدا سمجھیں اور وہ خود واقعی بندۂ ہو، اس آدمی کی سی ہے جو طبیب ہونے کا دعویٰ کرے اور بیماروں کا علاج کرے اور جب خود بیمار ہو تو اسے کسی دوسرے طبیب کی ضرورت نہ ہو، وہ اپنا علاج خود جانتا ہو۔ اس کی مثال جسے لوگ بندۂ خدا نہ سمجھیں اور وہ خود فی الواقع بندۂ خدا ہو، اس شخص کی سی ہے کہ وہ طبیب ہے اور لوگوں کو اس کا علم نہیں اور وہ خود لوگوں میں مشغول ہونے سے فارغ ہے اور اپنے آپ کو موافق غذاؤں، فرحت دینے والے شربتوں اور معتدل ہواؤں سے اچھی طرح رکھتا ہے تاکہ بیمار نہ ہو جائے، حالانکہ لوگوں کی آنکھ اس کے حال سے بالکل بند ہے۔

بعض متاخرین نے فرمایا ہے: اَلْفَقْرُ عَدَمٌ بِلَا وُجُوْدٍ (ترجمہ: فقر عدم بلا وجود ہے)۔ اس قول کا مطلب بیان نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ معدوم کوئی چیز نہیں اور چیز کے سوا غیر چیز کی تعبیر نہیں کی جاسکتی، پس یہاں یہ صورت ہوگی کہ فقر کوئی چیز نہیں اور تمام اولیاء اللہ کی عبارتیں اور ان کا اجتماع کسی اصل پر مبنی نہیں کیوں کہ فقر اپنی ذات میں فانی اور معدوم ہے اور یہاں اس عبارت سے عین (ذات فقر) کا عدم مطلوب نہیں بلکہ اس عین کی آفت کا عدم مراد ہے اور آدمی کے تمام اوصاف آفت (باعث خرابی) ہیں۔ جب آفت کی نفی ہوئی تو صفت کا فنا ہونا حاصل ہوا اور صفت کا فنا ہو جانا واصل بحق ہونے کا سبب ہے اور عدم وصول الی اللہ کو اُن کے سامنے سے اُٹھا دیتا ہے اور ان کی روش کے مخالف کو نفی عین (ذات فقیر) معلوم ہوتی ہے اور انہیں ہلاک کر دیتی ہے۔

میں نے متکلمین کی ایک جماعت کو دیکھا ہے کہ وہ اس معنی کی باریکیوں کو نہ سمجھتے ہوئے اس پر ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بات معقول نہیں اور مدعیوں کا ایک ایسا گروہ بھی دیکھا ہے جو عقل نہ آنے والی اس بات کو قبول کر کے اس پر اعتماد کرتے ہیں، لیکن اصل حقیقت معلوم نہ کر کے یہ کہتے ہیں: اَلْفَقْرُ عَدَمٌ بِلَا وُجُوْدٍ (ترجمہ: فقر لاشئ محض ہے جس کا کوئی وجود نہیں)۔ یہ دونوں گروہ غلطی پر ہیں، ایک ان میں سے اپنی جہالت کی وجہ سے حق تعالیٰ کا منکر ہے اور دوسرے گروہ نے جہل کو حال بنالیا ہے اور اس حال میں جلوہ گر ہوا ہے۔

عبادات میں عدم و فنا سے مراد اس گروہ صوفیا کی عمدہ اور صفات محمودہ کی طلب میں برے اسباب اور بری صفات سے کنارہ کش ہونا ہے اور طلب کا سبب موجود ہوتے ہوئے عدم سے عدم معنی (عین و حقیقت) مراد نہیں۔ الغرض درویش فقر کے تمام معانی سے خالی اور تمام اسبابِ دینوی سے بالکل بیگانہ ہے، لیکن اس کے باوجود اسرارِ ربانی کی گزرگاہ ہے۔ جب تک اس کے خیال خود اس کے کسب سے سرزد ہوتے ہیں تو وہ اس کی طرف ہی منسوب کیے جاتے ہیں اور جب اس کے افعال کسب کے تعلق سے آزاد ہو جاتے ہیں تو اس کے فعل کی نسبت اس سے قطع ہو جاتی ہے۔ اس وقت جو حالت اس پر گزرتی ہے، وہ نہ اس کے ارادے سے آتی ہے اور نہ اس کے ارادے سے جاتی ہے۔ وہ کسی چیز کو نہ خود اپنے اوپر لاتا ہے اور نہ اپنے اوپر سے ہٹاتا ہے بلکہ اب حالات اس عین (ذات حق) کی طرف سے ہوتے ہیں جو اس کا پتہ دیتے ہیں۔

مصنف رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے متکلمین کا ایک گروہ دیکھا کہ عین فقر میں نفی وجود کا قائل تھا، جس

سے ان کا کامل نہ ہونا ظاہر ہوتا تھا اور یہ بات بہت ہی عجیب معلوم ہوتی ہے اور میرے خیال میں عین فقر میں فقر کی حقیقت کی نفی سے ان کی مراد صفت کی نفی معلوم ہوتی تھی اور اسی طرح حق و حقیقت کی طلب کی نفی کو وہ لوگ فقر و صفوت کہتے ہیں اور خواہش نفس کا اثبات ان کے نزدیک نفی کل ہے۔ ان میں سے ہر ایک شخص فقر کے حجابوں میں سے کہیں ایک درجے میں رُکا ہوا تھا، کیوں کہ یہی بات اس شخص کے لیے ولایت کی علامت تھی اور اس بات کی محبت اور اس کا قصد تمام غایتوں کی غایت یعنی ان کی "یہ محبت محل کمال" کی محبت ہے۔ پس اس بات کے طالب کے لیے اُن کے طریق پر چلنے، اُن کے مقامات طے کرنے اور ان کی عبارات کے سمجھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تاکہ وہ خواص کے محل میں عام نہ رہیں، کیونکہ جو عوام اصول کے متعلق کچھ نہیں جانتے ہیں، وہ اصول سے اعراض کرتے ہیں۔ جو عوام فروع سے (ناواقف) ہیں، وہ فروع سے رُوگردانی کرتے ہیں، جو شخص فروع کے بجالانے سے عاجز ہو، اس کا تعلق اصول سے ہوتا ہے لیکن جو اصول جاننے سے عاجز ہو تو کہیں بھی اس کو کوئی تعلق نہیں رہتا۔

یہ سب باتیں میں نے اس لیے بیان کی ہیں کہ تم ان حقائق کو اچھی طرح سمجھو، اُن کے تقاضے کے مطابق راہ چلو اور ان کی نگہداشت میں مشغول ہو جاؤ۔ اب میں اس گروہ کے چند اصول و رموز اور تصوف کے بارے میں ان کے بعض اشارات کی وضاحت کرتا ہوں، پھر مردانِ خدا کے نام اور مشائخ صوفیا کے مذاہب کا اختلاف اور اس کے بعد حقائق تصوف، معارفِ الٰہیہ، معاملاتِ شرعیہ اور اس کے بعد حتیٰ الامکان ان کے مقامات کے رموز و آداب بیان کروں گا تاکہ تم پر اور دوسرے پڑھنے والوں پر اس طریقِ تصوف کی حقیقت منکشف ہو جائے۔

تیسرا باب: تصوف

پہلی فصل
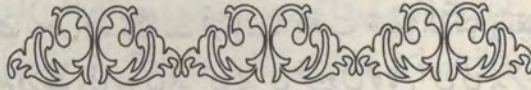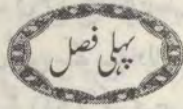
تصوف کے معانی:

اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَھُمُ الْجٰھِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰماً (ترجمہ: اللہ رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر تواضع سے چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے کلام کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں، سلام ہے)۔ رسول پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: مَنْ سَمِعَ صَوْتَ اَھْلِ التَّصَوُّفِ فَلاَ یُؤْمِنُ عَلٰی دُعَائِھِمْ کُتِبَ عِنْدَاللّٰہِ مِنَ الْغَافِلِیْنَ (ترجمہ: جو اہل تصوف کی آواز سنے اور ان کی پکار پر یقین نہ کرلے، وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں غافلوں میں لکھا جاتا ہے)۔

لوگوں نے اسم (تصوف) کی تحقیق میں بہت سے اقوال بیان کیے ہیں اور (اس موضوع پر متعدد) کتابیں لکھیں۔ ان میں سے ایک گروہ نے کہا ہے کہ صوفی کو صوفی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ صوف کا لباس پہنتا ہے، جبکہ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اسے صوفی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اصحابِ صفہ رضوان اللہ علیہم سے محبت کرتا ہے۔ ایک اور گروہ کا قول ہے کہ یہ اسم لفظ "صفا" سے مشتق ہے، الغرض لفظ تصوف کے معنی میں ہر شخص نے لطیف اشارات بیان کئے ہیں، لیکن بغور دیکھا جائے تو یہ سب لغوی تحقیق ہے، جس کا (تصوف کے) حقیقی معنی سے کوئی تعلق نہیں۔ صفائی سب امور میں محمود ہے اور اس کی ضد کدورت ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ذَھَبَ صَفْوُ الدُّنْیَا وَبَقِیَ کَدْرُھَا (ترجمہ: دنیا کی صفائی جاتی رہی اور اس کی کدورت باقی رہ گئی)۔ کسی چیز کی خوبیوں کا نام اس کی برگزیدگی اور عمدگی ہے اور اس کی خرابیوں کا نام اس کی کدورت اور برائی ہے، چونکہ اس حال (تصوف) والوں نے اپنے اخلاق و معاملات (ظاہری اطوار) کو درست کرلیا ہے اور طبیعت کی آفت (طبعی اور باطنی عیوب) سے بیزاری اختیار کرلی ہے، اس لیے ان لوگوں کو صوفی کہتے ہیں اور یہ اسم اس گروہ کا اسم علم ہے، اس لیے کہ ان لوگوں کا حصہ (حق) اس سے بہت بڑھ کر ہے کہ ان کے معاملات کو پوشیدہ رکھا جاسکے، یہاں تک کہ ان کے اسم کے لیے بھی کسی ایسے مادہ سے مشتق ہونا لازم ہے (کہ وصفی معنی پر دلالت کرے) اور اس زمانے میں حق تعالیٰ نے اکثر لوگوں کو اس حال (تصوف) اور اہل تصوف سے حجاب میں کر رکھا ہے اور اس حال کی عمدگی کو ان کے دلوں سے پوشیدہ کر دیا ہے، یہاں تک کہ اس گروہ کا خیال ہے کہ یہ کام محض مشاہدہ باطن کے بغیر ظاہر کی اصلاح ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ صوفی ایک اسم ہے جس کی کوئی حقیقت اور اصل نہیں یہاں تک کہ بے ہودہ لوگوں کو دیکھ کر علمائے ظاہر بیں نے بھی اس طریق (تصوف) کی اصلیت ہی کا انکار کر دیا ہے اور اس کے پردے ہی سے خوش ہو گئے ہیں۔ اس لیے عوام نے ان کی تقلید کی اور طلب صفائے باطن کا خیال دل سے بالکل مٹادیا اور سلف صالحین اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریق کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔

؎ اِنَّ الصَّفَا صِفَتُ الصِّدِّیْقِ   اِنْ اَدَرْتَ صُوْفِیًا عَلَی التَّحْقِیْقِ

(ترجمہ: اگر تم حقیقی صوفی بننا چاہتے ہو تو بلاشبہ صفائے باطن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی صفت ہے) کیونکہ صفائے باطن کا ایک اصل اور ایک فرع ہے۔ اس کا اصل اغیار سے دل کا منقطع ہونا ہے اور اس کی فرع دنیائے غدار

سے دل کا خالی ہونا ہے اور یہ دونوں امر حضرت صدیق اکبر ابوبکر عبداللہ ابن ابی قحافہ رضی اللہ عنہ کی صفات ہیں، اس لیے کہ وہ حضرت اہلِ طریقت کے امام تھے اور آپ کے دل کا غیر اللہ سے منقطع ہونا یوں تھا کہ جب تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم پیغمبر ﷺ کے حضرت معلے اور خطیرۂ قدس میں تشریف لے جانے (وفات پا جانے) سے شکستہ دل ہو رہے تھے، حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تلوار کھینچ کر فرما رہے تھے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ پیغمبر ﷺ وفات فرما گئے ہیں، میں اس کا سر کاٹ دوں گا۔ اس وقت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ باہر تشریف لائے اور با آواز بلند یہ فرمایا: اَلَا اِنَّ مَنْ عَبَدَ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدً قَدْمَاتَ وَمَنْ عَبَدَ رَبَّ مُحَمَّدٍ فَاِنَّهٗ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ (ترجمہ: خبردار لوگو! جو شخص محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا پس بلاشبہ آنخضرت ﷺ تو وفات پا گئے اور جو شخص آنحضور ﷺ کے رب کی عبادت کرتا تھا، تو وہ زندہ ہے اور کبھی نہیں مرے گا) پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِئِنْ مَّاتَ اَوْقُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِكُمْ (ترجمہ: محمد ﷺ اللہ کے ایک رسول ہی ہیں۔ آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں پس کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کئے جائیں تو تم دین سے پھر جاؤ گے؟) یعنی جس نے حضور ﷺ کو اپنا معبود سمجھ کر ان سے دل لگا رکھا تھا، اسے اب رنج و غم کے سوا کوئی چارہ نہیں کیوں کہ وہ معبود دنیا سے رحلت فرما گئے ہیں اور جس نے آپ کے پروردگار کو معبود سمجھ رکھا تھا، اسے کچھ فکر نہیں کیوں کہ وہ ہمیشہ زندہ ہے، جو کبھی نہیں مرے گا۔ غرض جو فانی چیز میں دل لگاتا ہے، وہ یقیناً فنا ہو جاتی ہے اور اس کے فنا ہو جانے سے اس کو رنج حاصل ہوتا ہے، لیکن جو شخص اپنی جان حضرت باقی سبحانہ، کے حوالے کر دیتا ہے تو جب اس کا نفس فنا ہو جاتا ہے (اس کا تعلق جسم سے منقطع ہو جاتا ہے) تو وہ بقائے دوام سے (بغیر تعلق جسم) باقی رہتا ہے۔ پس جس نے محمد ﷺ کے جسم اطہر کو انسانی (ظاہری) آنکھ سے دیکھا جب وہ (جسم اطہر) دُنیا سے اُٹھ گیا تو حضور ﷺ کی تعظیم بھی اس کے دل سے اُٹھ گئی اور جس نے حضور ﷺ کی روحِ اقدس کو حقیقت کی آنکھ سے دیکھا تو اس کے نزدیک حضور ﷺ کا دنیا سے چلے جانا اور یہاں رہنا دونوں یکساں ہیں کیوں کہ اس نے حالت بقا میں آپ کی بقا کو بواسطہ حق سبحانہ، اور حالت فنا میں آپ کی فنا کو منجانب اللہ ہی سمجھا اور اس نے مُحَوِّلْ یعنی تبدیل کئے ہوئے (جسم اطہر) سے منہ موڑ کر مُحَوِّلْ یعنی تبدیل کرنے والے کی طرف توجہ دی اور اکرام الٰہی کے مطابق آپ کی تعظیم کی، نہ کسی مخلوق میں دل لگایا نہ خلقت پر نگاہ ڈالی کیونکہ مَنْ نَظَرَ اِلَی الْخَلْقِ هَلَكَ وَمَنْ رَّجَعَ اِلَی الحقِ مَلَكَ (ترجمہ: جس نے خلقت کی طرف نگاہ ڈالی، وہ ہلاک ہو گیا اور جو حق کی طرف راجع ہوا، وہ فرشتہ بن گیا) یعنی خلق خدا پر نظر رکھنا، ہلاکت کا نشان اور حق کی طرف رجوع ہونا، فرشتہ ہونے کی علامت ہے۔

ان کے دل کا دنیائے غدار سے خالی ہونے کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ مال واسباب اور غلام وغیرہ ان کے پاس تھے، آپ نے سب راہِ حق میں دے دیئے اور ایک گدڑی پہن کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ حضرت نے پوچھا: مَاخَلَفْتَ لِعِیَالِكَ فَقَالَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (ترجمہ: تم نے اپنے مال واسباب میں سے بال بچوں کے لیے کیا کچھ پیچھے چھوڑا؟ تو انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول) یعنی اللہ کی محبت اور اس کے رسول کی متابعت جو دو بیش بہا خزانے ہیں۔ جب میرا دل دنیا کی عمدگی اور خوبی کے تعلق سے آزاد ہو گیا ہے تو اس کی کدورت سے بھی میں اس کو خالی کرتا ہوں اور یہی ایک سچے صوفی کی صفت ہوتی ہے۔ ان باتوں سے انکار کرنا حق سے انکار اور صریح مکابرہ (ایک دوسرے پر بڑائی ظاہر کرنا) ہے۔ میں کہہ آیا ہوں کہ صفا کدر کی ضد ہے اور کدر صفاتِ بشریہ میں سے ہے۔ پس درحقیقت صوفی وہ

ہے جو کدورت (بشری) سے آگے نکل کر صفائے حق کی طرف متوجہ ہو، چنانچہ یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال کی خوبیوں کے مشاہدے میں مستغرق ہونے کی وجہ سے مصر کی عورتوں کی بشریت ان پر غالب آگئی لیکن جب غلبے سے یہ بشریت (غیر بشریت) کے ساتھ لوٹ کر حد کمال پر جا پہنچی تو ان کی نگاہ بشریت سے گزر کر ان کی فنا پر آٹھہری اور بے اختیار پکار اُٹھیں۔ مَاهٰذَا بَشَرًا (ترجمہ: یہ تو کوئی انسان نہیں) نشانہ تو حضرت یوسف علیہ السلام کو بنایا اور حال اپنا بیان کیا اور اسی وجہ سے اسی طریقے کے مشائخ رحمہم اللہ نے فرمایا ہے: لَيْسَ الصَّفَا مِنْ صِفَاتِ الْبَشَرِ لِاَنَّ الْبَشَرَ مَدَرٌ وَالْمَدَرُ لَا يَخْلُوْ مِنَ الْكَدِرِ (ترجمہ: صفائے باطن بشریت کی صفات میں سے نہیں کیوں کہ بشر خاک کا ڈھیلا (پتلا) ہے اور خاک کا پتلا کدورت (تاریکی) سے خالی نہیں ہو سکتا) یعنی صفائے باطن جسم خاکی کی صفات میں سے نہیں کیوں کہ خاک کا دارو مدار صرف کدورت پر ہے اور بشر (جسم خاکی) کدورت سے نکل نہیں سکتا۔ پس صفائے باطن کی مثال افعال (جوارح) سے نہیں بیان کی جا سکتی اور نہ ریاضت و مجاہدات سے بشریت مٹ سکتی ہے، بلکہ صفائے باطن کی صفت کو انسان کے ظاہری افعال و احوال سے کوئی نسبت ہی نہیں اور نہ صفائے باطن کے اسم کا ظاہری اسماء اور القاب سے کوئی تعلق ہے۔ غرض یہ کہ اَلصَّفَا صِفَةُ الْاَحْبَابِ وَهُمْ شُمُوْسٌ بِلَا سَحَابٍ (ترجمہ: صفائے قلب اولیاء اللہ کی صفت ہے اور وہ لوگ سورج ہیں جن پر بادل کا پردہ نہیں پڑا)۔ چونکہ صفائی باطن دوستانِ الٰہی کی صفت ہے، اس لیے جو شخص اپنی صفت سے فانی اور دوستوں کی صفت سے باقی ہے، وہی دوست ہے اور ایسے دوستانِ حق کے حالات اہل حال (عارفانِ الٰہی) کے نزدیک آفتاب کی طرح روشن و عیاں ہیں، چنانچہ حبیب خدا محمد ﷺ سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک مرتبہ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کا حال پوچھا تو آپ نے فرمایا: عَبْدٌ نَوَّرَ اللّٰهُ قَلْبَهٗ بِالْاِيْمَانِ (ترجمہ: وہ ایک ایسا بندہ ہے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے نورِ ایمان سے منور کر دیا ہے) یہاں تک کہ اس کا چہرہ اس نور ایمان کی تاثیر سے چاند کی طرح روشن اور وہ خود نورِ ایمانی سے متشکل ہے اور کہتے ہیں کہ کسی شیخ طریقت کا یہ قول ہے: ضِيَاءُ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ اِذَا اشْتَرَكَا اُنْمُوْذَجٌ مِنْ صَفَا الْحُبِّ وَالتَّوْحِيْدِ اِذَا اشْتَبَكَا (ترجمہ: سورج اور چاند کا نور جب باہم مشترک (معجون کی طرح ملے جلے) ہوں تو وہ محبت و توحید الٰہی کی صفائی کا نمونہ ہیں، جبکہ دونوں باہم مل جائیں)۔

درحقیقت اللہ جبار کی محبت اور توحید کے سامنے سورج اور چاند کے نور کی کیا حقیقت ہے کہ اس کو اس نور کی طرف نسبت کریں، لیکن دنیا میں کوئی نور ان دونوروں سے جو آنکھوں کا نور ہیں، بڑھ کر ظاہر نہیں کیا۔ سورج اور چاند کے نور سے تو آسمان کو دیکھتے ہیں اور نورِ توحید سے امورِ عقبیٰ پر اطلاع پاتے ہیں۔ دنیا میں تمام مشائخ طریقت اس بات پر متفق ہیں کہ بندہ مقامات کی قید سے چھوٹ جائے اور احوال کی کدورت سے خالی اور تغیر و تبدل کے محل سے آزاد ہو کر تمام نیک اوصاف سے متصف ہو جائے اور پھر اپنی کسی اچھی صفت کی قید کا خیال نہ رکھے، نہ اس پر نگاہ ڈالے اور نہ ہی مغرور ہو بلکہ اس کا حال فہم و ادراک سے پوشیدہ ہو اور اس کا وقت شکوک و شبہات کے تصرف سے پاک ہو، تب اس کی حاضری حضرتِ حق سے منقطع نہیں ہوتی اور اس کے وجود کی بقا کے لیے اسبابِ ظاہری کی ضرورت نہیں رہتی۔ لِاَنَّ الصَّفَا حُضُوْرٌ بِلَا ذَهَابٍ وَّ وُجُوْدٌ بِلَا اَسْبَابٍ (ترجمہ: صفائے باطن بارگاہِ قدس میں ایسی حاضری ہے جس کو زوال نہیں اور ایسی ہستی[1] ہے جس کا قیام اسباب ظاہری پر موقوف نہیں) یعنی وہ ایسا حاضرِ بارگاہ قدس ہوتا ہے

[1] اگر وجود بضم واو لیا جائے تو یہی معنی ہیں اور اگر وجود بفتح واؤ پڑھا جائے تو اس کے معنی پالینا یعنی عرفان و عشق الٰہی حاصل کرنا ہوں گے اور مصنف نے یہی معنی اختیار کیے ہیں، جیسا کہ بعد میں اس کی شرح وَاجِدُ (ادراک کرنے والا) عارفِ حق کی ہے۔

جس کو غیبت نہیں ہوتی اور ایسا موجود ہوتا ہے جس کا وجود اسباب پر موقوف نہیں ہوتا یا وہ ایسا عارف یا عاشق الٰہی ہوتا ہے جس کا عرفان اور عشق اسباب پر موقوف نہیں ہوتا کیوں کہ جس پر غیبت طاری ہوئی، وہ حاضر نہیں ہوتا اور جس کے جذبۂ عشق وعرفان کا باعث کوئی ظاہری سبب ہو، وہ عارف و عاشق الٰہی نہیں ہوسکتا اور جب وہ اس درجے پر پہنچ جاتا ہے تو وہ دنیا و آخرت میں فانی ہو جاتا ہے، انسانیت کی رفتار و روش میں ربانی ہو جاتا ہے اور سونا اور مٹی کا ڈھیلا اس کے نزدیک یکساں ہو جاتا ہے، اس لیے احکام شریعت (جن کا بجالانا انسان پر فرض کیا گیا ہو) کی حفاظت و بجا آوری جو دوسرے لوگوں پر دُشوار ہوتی ہے، وہ اس پر آسان ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے پوچھا: كَيْفَ اَصْبَحْتَ يَا حَارِثَةُ قال اصبحتُ مومنا بالله حقا فقال انظر ماتقول يا حارثة ان لكل شيي حقيقة فما حقيقة ايمانك فقال عزلت نفسى وصرفتها عن الدنيا فاستوٰى عندى حجرها و ذهبها و فضتها و مدرها فاسهرت ليلى و اظمات نهارى حقے صرت كانى انظرانى عرش ربى بارِزاً و كانى انظرالى اهل لجنة يتزاورون فيها و كانى انظر الى اهل النّار يتصارعون وفى روايةٍ يتعاورون (الحديث)

(ترجمہ: اے حارثہ تو نے صبح کیسے کی؟ اس نے کہا: میں نے اس حال میں صبح کی کہ میں اللہ پر سچا ایمان رکھنے والا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اے حارثہ! جو بات تو کہہ رہا ہے، اس پر غور کر کیونکہ ہر چیز کی کوئی حقیقت ہوتی ہے۔ پس بتا تیرے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ اس نے عرض کیا کہ میں نے اپنے نفس کو دنیا سے الگ کرلیا اور اس سے ہٹا لیا ہے۔ اس لیے میرے نزدیک اس کے پتھر، سونا، چاندی اور مٹی کا ڈھیلا سب برابر ہیں۔ پس میں رات کو بیدار اور دن کو پیاسا رہا یہاں تک کہ میری یہ حالت ہوگئی گویا میں اپنے رب کے عرش کو کھلم کھلا دیکھ رہا ہوں اور اہل جنت کو دیکھتا ہوں کہ وہ وہاں آپس میں ملاقات کررہے ہیں اور اہل دوزخ کو دیکھتا ہوں کہ وہ آپس میں کشتی لڑ رہے (جھگڑ رہے) ہیں اور ایک روایت میں یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو شرمسار کر رہے ہیں۔ (الحدیث)

اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: عَرَفْتَ فَالْزِمْ (ترجمہ: تو نے اپنے رب کو خوب پہچانا۔ پس اس عرفان اور ایمان کو اپنے اوپر لازم کرلے)۔ صوفی نام ہے کاملوں کا اور محقق اولیاء اللہ کو اسی نام سے پکارتے ہیں اور ہمیشہ سے پکارتے آئے ہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں: من صفاه الحبُ فهو صافٍ ومن صفاه الحبيب فهو صوفى (ترجمہ: جسے محبت الٰہی صاف کردے، وہ صافی (صاف باطن) ہے اور جسے محبوب حقیقی (ذات حق تعالیٰ) صاف کردے، وہ صوفی ہے) یعنی جو شخص محبت الٰہی کی وجہ سے نفسانی خواہشات سے پاک ہو جاتا ہے، وہ صاف باطن ہوتا ہے اور جو شخص ذاتِ محبوبِ حقیقی میں مستغرق اور ماسوائے اللہ سے بیزار (فانی فی اللہ اور باقی باللہ) ہو جاتا ہے، وہ صوفی ہے۔ لغت کی رُو سے اس لفظ (تصوف) کا اشتقاق کسی مادہ سے بھی درست نہیں کیوں کہ یہ معنی (صوفی کی تعریف) اس سے کہیں بڑھ کر ہے کہ ان کی کوئی جنس (مادہ) ہو جس سے یہ معنی مشتق ہوں، اس لیے کہ اشتقاق مشتق اور مشتق منہ کے ہم جنس ہونے کو چاہتا ہے اور دنیا میں جو چیز بظاہر محسوس ہوتی ہے، وہ صفا کی ضد ہے لہٰذا کسی شے کو اس چیز کی ضد سے مشتق نہیں کہہ سکتے۔ پس اہل تصوف کے نزدیک اس کے معنی بالکل "اظہر من الشمس" ہیں اور اس کے بیان کرنے کے لیے عبارات و اشارات کی کوئی ضرورت نہیں۔

لان الصوفى ممنوع عن العبارة و الاشارة (ترجمہ: کیوں کہ صوفی کی حقیقت، عبارت و اشارے سے نہیں بتائی جاسکتی)۔ جب صوفی کی حقیقت کل عبارات سے ناممکن ہے، سارا عالم اس کی تعبیر کرنے سے عاجز ہو اور اس

کے معنی اوصاف کے حامل ہونے کی صورت میں اس کی حقیقت کو نہ جانے تو اس سے اس اسم کے لیے کیا خطرہ ہے۔ بہر حال ایسے لوگوں (جن کو صوفی کے اوصاف حاصل ہوں) کو اہل کمال صوفی کہتے ہیں اور ان سے تعلق رکھنے والوں کو متصوف کا نام دیتے ہیں۔ لفظ تصوف باب تفعل سے ہے اور باب تفعل عربی میں تکلف کا تقاضا کرتا ہے (یعنی وہ اصل صوفی نہیں ہوتے بلکہ بتکلف صوفی بنتے ہیں) اور یہ (متصوف) اصل (صوفی) کی فرع ہے اور اس معنی کا فرق لغت اور معنی کی رُو سے ظاہر ہے: الصفاء ولایته ولها ایته و روایته التصوف حکایته للصفا بلا شکایته (ترجمہ: پس صفائے قلب ولایت ہے، جس کی ایک علامت اور روایت ہے اور تصوف بلا شبہ صفائے باطن کی حکایت ہے) پس صفا کے معنی روشن اور ظاہر ہیں۔ تصوف اس معنی کی حکایت ہے اور صوفی لوگ اس مقام پر تین قسم کے ہوتے ہیں:

اول : صوفی
دوم : متصوف
سوم : مستصوف

صوفی وہ ہے جو اپنے آپ سے فانی اور حق تعالیٰ کے ساتھ باقی ہو اور طبعی تقاضوں کے قبضے سے رہائی پاکر باطن کی حقیقت کے ساتھ ملا ہوا ہو۔

متصوف وہ ہے جو مجاہدہ اور ریاضت سے اس درجہ (صوفی) کی تلاش میں منہمک ہو اور ہر معاملے میں صوفیا کرام کے طرزِ زندگی کو پیش نظر رکھتا ہو۔

مستصوف وہ ہے جو مال و دولت اور جاہ و ثروت کی حفاظت کے لیے اپنے آپ کو صوفیا کی مانند بنائے رکھنے میں مصروف ہو اور ان دونوں مراتب کی اسے خبر نہ ہو۔

مشائخ نے فرمایا ہے: المستصوف عنه الصوفية كالذباب و عند غير هم كا لدواب (ترجمہ: مستصوف صوفیا کے نزدیک مکھی کی طرح حقیر ہوتا ہے، اور جو کچھ وہ کرتا ہے وہ ان کے نزدیک حرص ہے) اور دوسرے لوگوں کے نزدیک حریص بھیڑیے کی طرح ہوتا ہے، جس کی تمام تگ و دو پھاڑنے اور مردار کھانے کے لیے ہوتی ہے۔ پس صوفی تو دراصل واصل بحق ہوتا ہے اور متصوف اصول طریقت پر چلنے والا، اور مستصوف بالکل بے ہودہ۔ جس کو وصل حق نصیب ہوا، وہ اپنے مقصود کے پالینے اور مراد پر پہنچ جانے کی وجہ سے مراد سے بے مراد اور مقصود سے بے مقصود ہوگیا اور جس کو طریقت کا اصل معلوم ہوکہ اس کے مطابق چلا، وہ طریقت کے اقوال پر قابو پا گیا اور اس کے اسرار و لطائف میں جاکر بس گیا۔ جسے واہیات باتیں نصیب ہوں، وہ ان سب مدراج سے محروم رہا اور فقط اسم کے دروازے پر بیٹھ گیا اور اسی میں اُلجھ کر حقیقت سے حجاب میں ہوگیا اور حجاب میں آجانے کی وجہ سے نہ اسے وصل حق نصیب ہوا، نہ اصول طریقت سے آگاہ رہا۔ مشائخ طریقت نے اس معنی کی تفصیل میں بہت سے رموز بیان کیے ہیں، جن کو مکمل طور پر احاطے میں لانا اگرچہ ممکن نہیں تاہم ان کے بعض رموز کو اس کتاب میں بیان کریں گے تاکہ تمہیں پورا فائدہ حاصل ہو۔

دوسری فصل
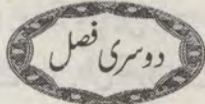
صوفیا کے نزدیک صوفی کے معنی:

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: الصوفی اذا نطق بان نطقهٗ من الحقائق وان سَكَتَ نَطَقَتْ عنه الجوارح بقطع العلائق (ترجمہ: صوفی جب بولتا ہے تو اس کا کلام اس کی حقیقت حال سے بالکل واضح ہو

جاتا ہے اور جب خاموش ہو جاتا ہے تو اس کے اعضاء اس کی طرف سے قطع تعلقات دنیوی کو بیان کرتے ہیں) یعنی جو کچھ وہ بیان کرتا ہے اس کا حال بالکل اس کے مطابق ہوتا ہے اور خاموشی کی صورت میں اس کا عمل اس کے دنیا سے قطع تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس کا قول صحیح اور اصول کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کا فعل خالص تجرد (دنیا سے کنارہ کشی) کو ظاہر کرتا ہے، جب وہ بولتا ہے تو اس کا قول بالکل حق ہوتا ہے اور جب خاموش ہوتا ہے تو اس کا فعل سراسر فقر ہوتا ہے۔

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں المتصوف نعت اقام العَبدُ فیه قیل نعت للعبد ام نعت للحق فَقَالَ نَعتَ الحَقُ حقیقة و نعت العدرسما (ترجمہ: تصوف ایک صفت ہے جس میں بندہ قائم ہے۔ کسی نے پوچھا کہ بندے کی صفت ہے یا خدا کی؟ آپ نے فرمایا: وہ حقیقت میں خدا کی صفت ہے اور ظاہر (رسم و رواج) میں بندے کی صفت ہے) یعنی درحقیقت تصوف بندے کی بشری صفت کے فنا ہونے کا تقاضا کرتا ہے اور بندے کی بشری صفت کا فنا ہونا خدا کی صفت کے باقی رہنے سے ہوتا ہے۔ پس یہ دراصل خدا کی صفت ہے، چونکہ بظاہر تصوف بندے کے ہمیشہ مجاہدہ و ریاضت کا تقاضا کرتا ہے اور ہمیشہ مجاہدہ کرنا بندے کی صفت ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ توحید کی حقیقت کے پیش نظر کسی بندے کے لیے یہ صفت درست نہیں ہوسکتی کیونکہ بندے کی صفت اس کے لیے ہمیشہ نہیں ہوتی اور بندے کی صفت سوائے اسم ظاہری کے نہیں ہوتی، اس لیے کہ مخلوق کی صفت کو کوئی بقا حاصل نہیں بلکہ وہ خدا ہی کی ملک و فعل ہوتی ہے۔ پس درحقیقت وہ صفتِ الٰہی ہوتی ہے، مثلاً خدا تعالیٰ نے بندے کو حکم دیا کہ روزہ رکھ اور روزہ رکھنے کی وجہ سے بندے کا نام صائم رکھا۔ پس ظاہر میں تو روزہ بندے کی صفت ہے لیکن حقیقت کے لحاظ سے یہ صفت الٰہی ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی میں ارشادِ الٰہی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی ہمیں خبر دی ہے۔ اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِی بِهٖ (ترجمہ: روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا) یعنی روزہ میری ملک ہے اس لیے کہ جتنے کام (دنیا میں) کئے جاتے ہیں، وہ سب دراصل اللہ کا فعل اور اس کی ملک ہیں اور لوگوں کا ان سب امور کو اپنی طرف منسوب کرنا ظاہری رواج اور مجاز کے طور پر ہے نہ کہ حقیقت کے طور پر۔

حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ تَرْكُ كُلِّ حَظٍّ لِلنَّفْسِ (ترجمہ: تصوف نفس کی ہر لذت کو چھوڑ دینا ہے) اور یہ دو قسم کا ہوتا ہے: اول، رسم اور دوم، حقیقت۔ اگر صوفی خود حظِ نفس کو چھوڑتا ہے تو حظِ نفس کا چھوڑنا بھی ایک حظ ہے اور یہ ترک حظ بطور رسم و رواج ہے۔ اگر حظِ نفس خود صوفی کو چھوڑ دے تو یہ اس حظِ نفس کا فنا ہونا ہے جس کا تعلق حقیقت مشاہدہ سے ہوتا ہے۔ یہ ترکِ بطور حقیقت کے ہے پس حظِ نفس کو ترک کرنا فعل بندہ ہے اور حظِ نفس کا فنا ہونا (حظِ نفس کا بندے کو چھوڑ دینا) خدا کا فعل ہے اور بندے کا فعل رسم و مجاز ہوتا ہے اور خدا کا فعل حقیقت۔ اس قول سے حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا قول جو اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے، خوب واضح ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلصُّوْفِیَّه هُمُ الَّذِیْنَ صَفَتْ اَرْوَاحُهُمْ فَصَارُوْا فِی الصَّفِّ الْاَوَّلِ بَیْنَ یَدَیِ الْحَقِّ (ترجمہ: صوفی وہ لوگ ہیں جن کی ارواح بشریت کی تاریکیوں اور نفسانی خواہشوں سے پاک صاف ہوگئی ہوں اور دنیا کی حرص و ہوا سے نجات پا کر حق تعالیٰ کے حضور صف اوّل میں کھڑے ہونے کی سعادت حاصل کر چکی ہوں) اور یہی حضرت فرماتے ہیں: اَلصُّوْفِیُّ الَّذِی لَا یَمْلِكُ وَلَا یُمْلَكُ (ترجمہ: صوفی وہ ہے کہ کوئی چیز اس کے ملک (قبضہ) میں نہ ہو اور نہ وہ کسی (غیر اللہ) کے ملک میں ہو) اور یہ عین فنا ہے کیونکہ جس کی صفت فانی ہے، وہ نہ کسی چیز کا مالک ہوتا ہے نہ مملوک، اس لیے کہ ملک کا اطلاق دنیا کے مال و متاع پر ہی ہوتا ہے

اور صوفی دنیا کے مال و متاع بلکہ عقبیٰ کی اکثر زینت میں بھی کسی چیز کو ملک نہیں بناتا تاکہ وہ کہیں اپنے نفس کی ملک اور حکم کے ماتحت نہ ہو جائے اور ایک اولوالعزم بادشاہ کی طرح اپنا ارادہ غیر اللہ سے منقطع کر لیتا ہے تاکہ لوگ اس کی بندگی کی حرص نہ کریں اور جو لوگ فنا کلی کے قائل ہیں، وہ اسی قول کو ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ ہم ان کی لغزش کے مقام کو انشاء اللہ تعالیٰ اس کتاب میں بیان کریں گے تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے۔

ابن جلا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ حَقِيقَةٌ لَا رَسَمَ لَهُ (ترجمہ: تصوف ایک ایسی حقیقت ہے جس کی ظاہری تعریف کوئی نہیں) اس لیے کہ ظاہری تعریف معاملات میں مخلوق خدا کا حصہ ہے اور اس کی حقیقت خدا کا خاصہ۔ جب تصوف مخلوق سے منہ پھیر لیتا ہے تو لامحالہ اس کی کوئی ظاہری تعریف نہ ہونی چاہیے۔ ابو عمرو دمشقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ رُؤْيَةُ الْكَوْنِ بِعَيْنِ النَّقْصِ بَلْ غَضُّ الطَّرْفِ عَنِ الْكَوْنِ (ترجمہ: تصوف موجودات کو نقصان کی آنکھ سے دیکھنا بلکہ آنکھ ان سے بند کر لینا ہے) یعنی موجودات کو دیکھے تو ناقص اور عیب دار، اور یہ صفت کے بقا کی دلیل ہے بلکہ آنکھ ان سے بند کر لے، یہ صفت کے فنا کی دلیل ہے کیوں کہ نظر تو موجود پر ہی ڈالی جا سکتی ہے، جب موجود ہی نہ ہو تو اس پر نظر بھی نہ رہے گی اور موجود سے آنکھ کو بند کر لینا، بصیرتِ ربانی کی بقا ہے یعنی جو اپنی ذات کو نہ دیکھے وہ حق تعالیٰ کو دیکھتا ہے کیوں کہ موجود کا طالب بھی ہوتا ہے اور اس کا کام اپنے ہی متعلق ہوتا ہے (یعنی وہ خود ہی طالب اور خود ہی مطلوب ہوتا ہے) اور اس کو ذات سے باہر کوئی راستہ نہیں ملتا۔ پس ایک شخص اپنے آپ کو دیکھتا ہے، لیکن ناقص نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھ اس کا حجاب ہوتی ہے اور باوجودیکہ وہ دیکھتا ہے لیکن اپنی ناقص بینائی کی وجہ سے حجاب میں ہوتا ہے اور جو شخص نہیں دیکھتا وہ اپنی بینائی کی وجہ سے حجاب میں نہیں رہتا اور یہ بات اہل تصوف دار بابِ طریقت کے نزدیک وہ مضبوط اصل ہے (جس پر تصوف کے اسرار و لطائف کی عمارت قائم ہے) جس کی شرح اور تفصیل کا یہ مقام نہیں۔

حضرت ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ شِرْكٌ لِاَنَّهُ صِيَانَةُ الْقَلْبِ مِنْ رُّؤْيَةِ الْغَيْرِ وَلَا غَيْرُهُ۔ (ترجمہ: تصوف شرک ہے کیوں کہ وہ دل کو غیر اللہ کے دیکھنے سے محفوظ رکھتا ہے، حالانکہ غیر اللہ کا وجود ہی نہیں) مطلب یہ کہ توحید الٰہی کے ثابت کرنے میں غیر کو دیکھنا شرک ہے اور جب دل میں غیر کی کوئی قیمت ہی نہ ہو تو دل کو غیر اللہ کے ذکر سے محفوظ کرنا کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے۔

حضرت حضری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ صَفَاءُ السِّرِّ مِنْ كُدُوْرَةِ الْمُخَالَفَةِ (ترجمہ: تصوف مخالف کی کدورت (آلودگی) سے باطن کو پاک کرنا ہے) مطلب یہ ہے کہ اپنے باطن کو مخالفِ حق (کفر و شرک کی آلودگیوں) سے محفوظ رکھے، اس لیے کہ دوستی موافقت کو کہتے ہیں اور موافقت مخالفت کی ضد ہے اور دوست کو دنیا میں دوست کے حکم کی اطاعت کے سوا کچھ پسند نہیں ہوتا اور جب مراد ہی ایک ہو تو اس کی مخالفت کہاں ممکن اور متصور ہو سکتی ہے۔

حضرت محمد بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ خُلُقٌ فَمَنْ زَادَ عَلَيْكَ فِي الْخُلُقِ زَادَ عَلَيْكَ فِي التَّصَوُّفُ (ترجمہ: تصوف خوش خلقی ہے، پس جو شخص خوش خلقی میں تجھ سے زیادہ ہے وہ تصوف میں بھی تجھ سے بڑھ کر ہے) یعنی تصوف نیک خو ہونا ہے، جو زیادہ نیک خو ہو وہ زیادہ صوفی ہے۔ خوش خلقی دو قسم کی ہوتی ہے: ایک خدا کے ساتھ، دوسری مخلوق کے ساتھ۔ خدا کے ساتھ خوش خلقی اس کی قضا پر راضی ہونا اور مخلوق کے ساتھ خوش خلقی خدا کے لیے ان کی صحبت کا بار اٹھانا (اور ان کے دوسرے حقوق کو ادا کرنا)

ہے۔ یہ دونوں صفتیں طالب کی ہیں (یعنی ان کا فائدہ طالب کو ہے)۔ اللہ کی صفت طالب کی رضا اور ناراضگی سے مستغنی ہونا ہے اور یہ دونوں اس کی وحدانیت کے پیش نظر ان سے متعلق ہیں۔

ابو محمد مرتعش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلصُّوْفِیُ لَا یَسْبِقُ هِمَّتُهٗ خُطْوَتَهٗ اَلْبَتَّةَ (ترجمہ: صوفی وہ ہے جس کا قصد اس کے قدم سے آگے نہ بڑھے) یعنی دونوں ایک ساتھ حاضر ہوں۔ دل وہاں حاضر ہو جہاں جسم حاضر ہو اور جسم وہاں حاضر ہو جہاں دل حاضر ہو، قول وہاں حاضر ہو جہاں قدم حاضر ہو اور قدم وہاں حاضر ہو جہاں قول حاضر ہو اور یہی دل کے حاضر ہونے کی نشانی ہے، بر خلاف اس قول کے جو کہتے ہیں کہ وہ اپنے آپ سے غائب اور اللہ کے سامنے حاضر ہے۔ ایسا نہیں بلکہ اللہ کے سامنے بھی حاضر اور اپنے سامنے بھی حاضر اور جمع الجمع سے مراد بھی یہی ہے اس لیے کہ جب تک وہ خود اپنے آپ کو دیکھتا ہے اپنی ذات سے غیبت نہیں ہوتی اور جب اپنے آپ کو دیکھنا اُٹھ گیا اور اپنے آپ سے غیبت ہو گئی تو لا محالہ حق کی حاضری (مشاہدہ حق) بلا غیبت حاصل ہو گئی اور اس معنی کی تائید شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے (ترجمہ: صوفی دونوں جہاں میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر اللہ کو نہیں دیکھتا) چونکہ سب مخلوقات میں بندے کی ہستی بھی غیر اللہ میں شامل ہے، اس لیے جب صوفی غیر اللہ کو نہیں دیکھتا اور اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھتا اور اپنی نفی اور اثبات کی حالت میں اپنی ذات سے بالکل فارغ ہو جاتا ہے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اَلتَّصَوُّفُ مَبْنِیٌّ عَلٰی ثَمَانِ خِصَالِ السَّخَاءِ وَالرَّضَاءِ وَالصَّبْرِ وَ الْاَشَارَةِ وَالْغُرْبَةِ وَ لَبْسِ الصُّوْفِ وَالسِّیَاحَةِ وَالْفَقْرِ اَمَّا السَّخَاءُ فَلِاِ بْرَاهِیْمَ وَاَمَّا الرَّضَاءُ فَلِاِ سْمَاعِیْلَ وَاَمَّا الصَّبْرُ فَلِاَ یُّوْبَ وَاَمَّا لْاِشَارَةُ فَلِزَکَرِیَّا وَاَمَّا الْغُرْبَةُ فَلِیَحْیٰی وَاَمَّا لَبْسُ الصُّوْفِ فَلِمُوْسٰی وَاَمَّا السِّیَاحَةُ فَلِعِیْسٰی وَاَمَّا الْفَقْرُ فَلِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَیْهِمْ اَجْمَعِیْنَ (ترجمہ: تصوف آٹھ خصلتوں پر مبنی ہے یعنی سخاوت و رضا و صبر و اشارہ و غربت و صوف پہننا و سیر فقر لیکن سخاوت، سو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اقتداء ہے اور وہ اس طرح کہ آپ نے راہ حق میں اپنے بیٹے کو فدا کر دیا اور رضا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اقتدا ہے کہ خدا کے حکم پر راضی ہو کر اپنی جانِ عزیز دے دی اور صبر حضرت ایوب علیہ السلام کا اتباع ہے کہ آپ نے کیڑوں کی مصیبت اور (غیرت الٰہی) پر صبر کیا اور اشارہ حضرت زکریا علیہ السلام کی پیروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا۔ (ترجمہ: آپ لوگوں سے تین دن صرف اشارے سے بات کریں گے)۔ نیز اس صورت میں فرمایا: حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے رب کو مخفی طور پر پکارا اور غربت سو حضرت یحییٰ علیہ اسلام کی پیروی ہے کہ وہ اپنے وطن میں رہ کر بھی بے وطن تھے اور اپنے رشتہ داروں سے بیگانہ رہے۔ سیاحت سو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اتباع ہے کہ ساری عمر تبلیغ حق کے لیے سیاحت کرتے رہے اور ایسے مجرد تھے کہ سوائے پیالے اور کنگھی کے کوئی چیز پاس نہ رکھتے تھے۔ جب انہوں نے ایک شخص کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پانی پیتے ہوئے دیکھا تو پیالے کو پھینک دیا اور جب کسی کو دیکھا کہ وہ انگلیوں سے بال سنوار رہا ہے تو کنگھی کو بھی پھینک دیا۔ صوف پہننا سو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اقتدا ہے کہ آپ اونی کپڑے کا لباس پہنتے تھے اور فقر سو محمد ﷺ کی اقتداء سے کہ جب اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کے تمام خزانوں کی کنجیاں حضور ﷺ کو سپرد کر کے فرمایا کہ آپ کوئی تکلیف نہ اٹھائیں اور ان خزانوں سے اپنی زینت (اسباب معاش) فرمائیں تو آنحضرت ﷺ نے عرض کیا کہ بارِ خدایا! مجھے ایک روز سیر کیجیو اور ایک روز بھوکا رکھیو اور یہی

اصول عمل اور بندگی کے لیے بہت اچھے ہیں)۔

حضرت خصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: (ترجمہ: صوفی اپنے عدم کے بعد موجود نہیں ہوتا اور نہ اپنے وجود کے بعد معلوم ہوتا ہے) یعنی جو کچھ وہ گم کرتا ہے، دوبارہ اس کو ہرگز نہیں پاتا اور جو کچھ وہ پالیتا ہے، ہرگز اس کو گم نہیں کرتا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس کا حق کو پالینا نہ پالینے میں کبھی تبدیل نہیں ہوتا اور اس کا اپنی ذات کو نہ پالینا کبھی پالینے میں تبدیل نہیں ہوتا، یہاں تک کہ اس کا اثبات بغیر نفی کے اور نفی بغیر اثبات کے ہو جاتا ہے۔ مراد اس عبارت سے یہ ہے کہ اس کی بشریت کا حال پورے طور پر اس سے ساقط ہو جائے اور جسمانی مشاہدات اس کے حق میں معدوم ہو جائیں اور اس کا تعلق جملہ موجدات سے منقطع ہو جائے۔ اس لیے کہ بشریت کا بھید اس شخص پر کھل جاتا ہے جو اپنے تمام پراگندہ اور متفرق خیالات کو اپنی ذات میں جمع کر دے اور اپنی ہی ذات سے قیام حاصل کرے اور یہ صورت اللہ تعالیٰ کے دو مقدس پیغمبروں میں ظاہر ہوئی۔ ایک موسیٰ علیہ السلام تھے کہ آپ کے وجود میں عدم نہ تھا، اس لیے آپ نے اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے ہوئے کہا تھا کہ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ (ترجمہ: اے میرے رب میرا سینہ کھول دے) دوسرے رسول اللہ ﷺ ہیں کہ آپ کے عدم مشاہدہ حق میں محویت کاملہ میں وجود (بےحضوری) نہ تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ سے فرمایا: اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ (ترجمہ: کیا ہم نے آپ کے لیے آپ کا سینہ نہیں کھول دیا)۔ ایک موسیٰ علیہ السلام نے اپنی آرائش چاہی اور زینت طلب کی اور دوسرے رسول اللہ ﷺ کو طلب و خواہش کے بغیر آراستہ کیا۔

علی بن بندار الصیرفی النیشاپوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ اِسْقَاطُ الرُّؤْیَۃِ لِلْحَقِّ ظَاهِرًا وَّ بَاطِنًا (ترجمہ: تصوف اپنے دیکھنے کو حق کے لیے ظاہر اور باطن کو چھوڑ دینا ہے) یعنی ظاہر و باطن میں اپنے آپ کو نہ دیکھے، صرف حق تعالیٰ کو دیکھے۔ چنانچہ اگر تو ظاہر حال پر نظر کرے گا تو ظاہر پر توفیق الٰہی کا نشان پائے گا اور جب غور سے دیکھے گا کہ ظاہر کے معاملات توفیق الٰہی کے مقابلے میں مچھر کے پر کے برابر بھی کوئی وزن نہیں رکھتے تو ظاہر کے معاملات کو ترک کر دے گا اور جب تو باطن کو دیکھے گا تو باطن پر تائید الٰہی کا نشان پائے گا۔ جب غور سے دیکھے گا کہ معاملاتِ باطن بھی تائید حق کے مقابلے میں ذرّہ برابر نہیں تو باطن کو بھی ترک کر دے گا، صرف حق کو دیکھے گا اور جب صرف حق تعالیٰ کو دیکھے گا تو پھر اپنے آپ کو نہ دیکھے گا۔

محمد بن احمد المکرّی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: التصوف استقامة الاحوال مع الحق (ترجمہ: یعنی تصوف کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ صوفی کے تمام حالات (ظاہری باطنی) حق تعالیٰ کے ساتھ وابستہ اور درست ہوں) یعنی صوفی کے حالات (مکاشفہ وغیرہ) اس کو اصلی حال (مشاہدہ حق) سے غیر کی طرف نہ پھیر دیں اور کجروی میں نہ ڈال دیں۔ اس لیے کہ جس شخص کا دل احوال کے پھیرنے والے (حق تعالیٰ) کا شکار ہو رہا ہے، اس کے حالات اسے درجہ استقامت (راست روی) سے نہیں گراتے اور دیدِ حق سے باز نہیں رکھتے۔
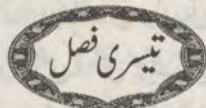
تصوف کے معاملات:

ابوحفص نیشاپوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ کُلُّهٗ اٰدَابٌ وَّلِکُلِّ وَقْتٍ اَدَبٌ وَّلِکُلِّ مَکَانٍ اَدَبٌ وَّبِکُلِّ حَالٍ اَدَبٌ فَمَنْ کَرَّمَ اٰدَابَ الْاَوْقَاتِ بَلَغَ مَبْلَغَ الرِّجَالِ وَمَنْ ضَیَّعَ الْاٰدَابَ فَهُوَ بَعِیْدٌ

مِنْ حَیْثُ یَظُنُّ الْقُرْبَ وَمَرْدُوْدٌ مِنْ حَیْثُ یَظُنُّ الْقَبُوْلَ۔ (ترجمہ: تصوف سب کا سب ادب ہے کہ ہر وقت و مقام و حال کے لیے ایک ادب ہو، جو شخص اوقات کے آداب بجالانے کو اپنے اوپر لازم کرلے، وہ مردانِ راہِ حق کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے اور جو آداب کو ضائع کردیتا ہے، وہ اس لحاظ سے کہ اپنے آپ کو قریب سمجھتا ہے، بعید ہوتا ہے اور اس حیثیت سے مردود ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو مقبول خیال کرتا ہے)۔ یہ مطلب ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ کے اس قول سے بالکل قریب ہے جو آپ نے فرمایا ہے: لَیْسَ التَّصَوُّفُ رُسُوْمًا وَلَا عُلُوْمًا وَ لٰکِنَّہٗ اَخْلَاقٌ (ترجمہ: تصوف صرف رسوم اور علوم کا نام نہیں، بلکہ وہ اخلاق حسنہ کا نام ہے) یعنی اگر تصوف کوئی رسم ہوتا تو مجاہدے سے حاصل ہوجاتا، اگر کوئی علم ہوتا تو وہ تعلیم سے حاصل ہوجاتا، وہ تو صرف اخلاق (آداب) کا نام ہے کہ جب تک اس کا حکم تو اپنے اندر نہ چاہے اور اس کے معاملات میں اپنی ذات سے درست نہ کرے اور اپنی ذات سے اس کا انصاف نہ دے تو وہ حاصل نہیں ہوتا اور رسوم و اخلاق کے درمیان فرق یہ ہے کہ رسم تکلف اور اسباب پر مبنی ہوتا ہے اور اس کا ظاہر باطن کے خلاف ہوتا ہے یعنی ایک بے حقیقت فعل ہوتا ہے، رہا خلق تو وہ بغیر تکلف اور اسباب کے نیک فعل ہوتا ہے۔ ایسے طور پر کہ اس کا ظاہر باطن کے موافق اور دعوے سے خالی ہو۔ حضرت مرتعش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ حُسْنُ الْخُلُقِ (ترجمہ: تصوف نیک خلق ہے) اور یہ تین طرح ہوتا ہے:

اوّل: نیک برتاؤ اللہ کے ساتھ اور یہ بغیر ریا کے اس کے احکام ادا کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

دوم: نیک برتاؤ خلقت کے ساتھ جو بزرگوں کی عزت، چھوٹوں پر شفقت، اپنے برابر کے لوگوں سے مساویانہ سلوک کرنے اور کسی لالچ کے بغیر سب کے ساتھ انصاف کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

سوم: نیک برتاؤ اپنے ساتھ جو خواہش نفس کی متابعت نہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

جو شخص اپنے آپ کو ان تینوں باتوں میں درست کرے، وہ نیک خلق ہوتا ہے اور یہ بات جو میں نے بیان کی ہے، وہ اس قول کے مطابق ہے کہ ایک شخص نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ "ہمیں پیغمبر ﷺ کے خلق کی نسبت بتائیے" تو آپ نے فرمایا کہ "قرآن پڑھو" خدائے تعالیٰ نے خود اس کے متعلق خبر دی اور فرمایا ہے: خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ (ترجمہ: آپ عفو اختیار کیجئے اور نیک امر کا حکم دیجیے اور جاہلوں سے اعراض کیجئے) نیز حضرت مرتعش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

هٰذَا مَذْهَبٌ کُلُّهٗ جِدٌّ فَلَا تَخْلِطُوْهُ بِشَیْءٍ مِنَ الْهَزْلِ (ترجمہ: یہ مذہب تصوف سب معقول ہے، اس میں بیہودہ بات نہ ملاؤ) یعنی رسمی صوفیوں کے معاملات میں نہ لپٹو اور ان کی پیروی کرنیوالوں سے بھاگو اور جب عوام نے اہل زمانہ میں سے رسمی صوفیوں کو دیکھا اور ان کا ناچنا، سرود کہنا، بادشاہوں کی درگاہوں میں (دنیوی مفاد کے لیے) جانا، دنیوی غرض اور خوراک کے لیے آپس میں جھگڑنا معلوم کیا تو تمام صوفیوں پر سے ہی بد اعتقاد ہوگئے اور کہنے لگے کہ طریقہ صوفیا کی اگر یہی حقیقت ہے تو پہلے صوفی بھی اسی طریق پر چلے ہوں گے۔ انہوں نے یہ معلوم نہ کیا کہ یہ زمانہ فترت (وہ زمانہ جس میں کوئی نبی نہ ہو) اور ابتلاء کا ہے۔ جب حرص بادشاہ کو ظلم میں، لالچ عالم کو بدکاری و زنا میں اور ریاکاری زاہد کو نفاق میں ڈال دیتی ہے تو خواہش نفس صوفی کو بھی ضرور ناچ کود میں ڈال دیتی ہے۔ جان لو کہ اگر اہلِ طریقہ تباہ ہوجائیں تو اصل طریقہ تباہ نہیں ہوسکتا اور جان لو کہ بیہودہ روش کے لوگوں میں سے اگر کوئی گمراہ اپنی بیہودہ روش کو شریفوں کی نیک و معقول روش میں پوشیدہ کردے تو اس سے ان شریفوں کی

معقول روش بیہودہ روش نہیں بن سکتی۔

حضرت ابوعلی قزوینی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ هُوَ الْاَخْلَاقُ الرَّضِيَّةُ۔ (ترجمہ: تصوف پسندیدہ اخلاق کو کہتے ہیں) اور اخلاق و افعال پسندیدہ یہ ہیں کہ بندہ تمام حالات میں خدا تعالیٰ سے خوش رہے اور اس کی رضا پر راضی ہو۔

ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ هُوَ الْحُرِّيَّةُ وَالْفُتُوَّةُ وَتَرْكُ التَّكَلُّفِ وَالسَّخَاءُ وَبَذْلُ الدُّنْيَا (ترجمہ: تصوف آزادی و جواں مردی و ترکِ تکلف و سخاوت و دنیا کا مال راہِ حق میں خرچ کرنا ہے) اور آزادی یہ ہے کہ بندہ خواہش نفس سے آزاد ہو جائے اور جواں مردی یہ ہے کہ جوان مردی کے دیکھنے سے کنارہ کش ہو جائے اور ترک تکلف یہ ہے کہ اپنے متعلقات اور نصیب میں کوشش نہ کرے اور سخاوت یہ کہ دنیا کو اہلِ دنیا کے لیے چھوڑ دے۔

اور ابوالحسن ابوشنجہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ اَلْيَوْمَ اِسْمٌ بِلَا حَقِيْقَة وَقَدْ كَانَ حَقِيْقَةً بِلَا اِسْمٍ (ترجمہ: آجکل تصوف صرف نام ہے اور کوئی حقیقت نہیں ہے اور پہلے زمانے میں حقیقت تھی، صرف نام نہ تھا) یعنی صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور سلف صالحین رحمہم اللہ کے زمانے میں صوفی نام تو کوئی نہ تھا، لیکن اس کے معنی ہر شخص میں موجود تھے اور اب صرف نام ہے اور معنی موجود نہیں یعنی اس زمانے میں معاملاتِ صوفیا معلوم تھے اور دعویٰ تصوف کو کوئی نہ جانتا تھا۔ اب تصوف کا دعویٰ تو عام طور پر معلوم ہے لیکن معاملاتِ تصوف کا کوئی پتہ نہیں۔

اب میں نے اس کتاب میں تصوف کے بارے میں مشائخ طریقت کے اقوال و ارشادات کی اس قدر تحقیق بیان کر دی ہے جس سے تم پر (اللہ تمہیں نیکی دے) اس طریق کی حقیقت کھل جائے گی اور اس طریق کے منکرین سے یہ پوچھ سکو گے کہ تصوف کے انکار سے تمہاری کیا مراد ہے؟ اگر صرف اسم تصوف کا انکار کرتے ہیں تو مضائقہ نہیں کیونکہ اپنے مسمّٰی سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ (ضروری نہیں کہ نام کے معنی نام والے میں پائے جائیں) اور اگر اصل تصوف کے معانی و معارف کا انکار کرتے ہیں تو یہ پیغمبر ﷺ کی پوری شریعت اور ان کی عمدہ خصلتوں کا انکار ہے (اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے اولیاء کی سی نیکی عطا فرمائے)۔ میں تمہیں اس کتاب میں وصیت کرتا ہوں، تم اس کی پوری رعایت کرنا اور اس میں انصاف کرنا، تصوف کا دعویٰ کم کرنا، اہلِ تصوف کے ساتھ نیک اعتقاد رکھنا اور توفیق ہر امر کی اللہ کے ہاں ہے۔
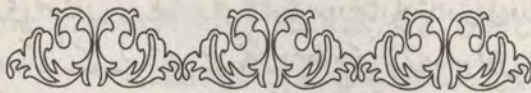
چوتھا باب

پہلی فصل

مرقعہ[1] پہننے کے بیان میں:

جان لو کہ صوفی لوگوں کا ظاہری نشان گدڑی پہننا ہے اور گدڑی پہننا سنت ہے کیونکہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا ہے: عَلَيْكُمْ بِلُبْسِ الصُّوفِ تَجِدُوْنَ حَلَاوَةَ الْإِيْمَانِ فِي قُلُوْبِكُمْ (ترجمہ: تم صوف پہننا اپنے اوپر لازم کرو، اس سے تم اپنے دلوں میں ایمان کی حلاوت پاؤ گے) اور ایک صحابی فرماتے ہیں: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَلْبُسُ الصُّوْفَ وَ يَرْكَبُ الْحِمَارَ (ترجمہ: نبی ﷺ صوف پہنتے تھے اور گدھے پر سواری فرماتے تھے)۔ ایک اور صحابی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: لَا تُضَيِّعِيْ الثَّوْبَ حَتّٰى تُرَقِّعِيْهِ (ترجمہ: کپڑے کو ضائع نہ کرو جب تک اس میں پیوند نہ لگاؤ)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نسبت مشہور ہے کہ آپ ایسی گدڑی پہنتے تھے جس میں تقریباً تیس پیوند لگے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے: بہترین لباس وہ ہے جو بہت ہی کم خرچ ہو۔ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت روایت ہے کہ آپ نے ایک ایسا کرتہ پہن رکھا تھا جس کی آستینیں ان کی انگلیوں کے برابر تھیں اور اگر کبھی لمبا کرتہ پہنتے تو آستینوں کا سرا پھاڑ دیتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کو خدا کی طرف سے کپڑا چھوٹا کرنے کا حکم آیا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ[2] (ترجمہ: اور اپنے کپڑوں کو پاک کرو)۔ حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ستر بدری اصحاب کو دیکھا ہے کہ سب کا لباس پشم کا تھا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تجرد (قطعِ تعلقاتِ دنیا) کی حالت میں اُونی لباس پہن رکھا تھا۔ حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ گدڑی پہنے ہوئے تھے جس میں کئی پیوند لگے ہوئے تھے۔

امیر المومنین حضرت عمر، امیر المومنین حضرت علی اور ہرم بن حیان رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت ہے کہ انہوں نے اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو دیکھا وہ پشم کا لباس پہنے ہوئے تھے جس پر پیوند لگے ہوئے تھے۔ حضرت حسن بصری، مالک بن دینار اور سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہم سب اُونی گدڑی پہنتے تھے اور امام ابو حنیفہ کوفی رضی اللہ عنہ کی نسبت روایت کرتے ہیں اور یہ روایت کتاب تاریخ مشائخ میں لکھی ہے جو حکیم ترمذی محمد بن علی کی تصنیف ہے کہ ابتدا میں آپ نے صوف پہن کر عزلت گزینی کا ارادہ کیا تھا یہاں تک کہ پیغمبر ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ”تمہیں لوگوں کے درمیان رہنا چاہیے کیوں کہ میری سنت کا احیاء تمہارے سبب سے ہی ہوگا۔“ تب سے آپ نے گوشہ نشینی کا خیال ترک کر دیا، لیکن پھر بھی کبھی ایسا لباس نہ پہنا جو زیادہ قیمتی ہوتا۔

حضرت داؤد رحمتہ اللہ علیہ جو ایک محقق صوفی گذرے ہیں، اُونی لباس پہنتے تھے۔ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمتہ اللہ علیہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے پاس گدڑی پہن کر آئے تو آپ کے دوستوں اور شاگردوں نے انہیں حقارت کی نظر

---

1. مرقعات، مرقعہ کی جمع ہے اور مرقعہ کھردرا اور پیوند لگے ہوئے کپڑوں کو کہتے ہیں۔
2. ای فقصر یعنی کوتاہ کرو۔

سے دیکھا۔ یہ دیکھ کر امام رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا: "سیدنا (ہمارے سردار) ابراہیم بن ادھم آئے ہیں۔" آپ کے شاگردوں نے کہا کہ "مسلمانوں کے رہنما اور امام کی زبان پر حق بات ہی آسکتی ہے، آخر ابراہیم کو یہ سرداری کیسے اور کہاں سے ملی؟" آپؒ نے فرمایا کہ "وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں اور ہم لوگ اپنے جسموں کی خدمت میں، تب وہ ہمارے سردار بن گئے۔" اب اگر اہل زمانہ میں سے بعض کے نزدیک گدڑی اور خرقہ پہننے سے مراد جاہ و جمال ہو اور اس کا باطن اس کے ظاہر حال کے مطابق نہ ہو تو بھی جائز ہے کہ لشکر میں جنگجو بہادر ایک ہی ہوتا ہے، اسی طرح تمام جماعتوں میں محقق اور اللہ والے تھوڑے ہی ہوا کرتے ہیں چونکہ وہ ایک حکم میں حقیقی صوفیوں سے مشابہت رکھتے ہیں، اس لیے وہ سب ان سے منسوب ہوتے ہیں۔ رسول ﷺ نے فرمایا ہے: مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ (ترجمہ: جس نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی، وہ انہی میں سے ہے) یعنی جو شخص قول و فعل میں یا اعتقاد میں کسی قوم سے مشابہت و مماثلت پیدا کرتا ہے وہ اسی قوم میں سے شمار ہوتا ہے لیکن ایک جماعت کی نظر ان لوگوں کی رسم اور ظاہری معاملات پر پڑتی ہے اور دوسری جماعت کی حقیقت شناس آنکھ اُن کے ہنر اور صفائی باطن کو دیکھتی ہے۔ الغرض جو شخص صوفی کی صحبت کا قصد کرتا ہے، اس کا حال چار باتوں سے باہر نہیں ہوتا۔ ایک گروہ کو باطن کی صفائی، دل کی روشنی، طبیعت کی پاکیزگی اور مزاج کا اعتدال اُن کی باطن کے اسرار کے ساتھ دکھائی دیتا ہے، چنانچہ وہ لوگ ان کا قرب اور اُن کی رفعت شان کو دیکھتے ہیں اور اس درجۂ عالیہ کی محبت انہیں دامن گیر ہو جاتی ہے۔ دوسرے گروہ کو جسم کی درستی، اوروں کی صفائی و تسلی اور سینے کی سلامتی ان صوفیائے کرام کے ظاہر حال کے ساتھ جلوہ نما نظر آتی ہے، چنانچہ وہ لوگ انکی شریعت پر عمل اور آداب اسلام کی حفاظت کرتے، ان کے حسن معاملات کو دیکھتے، ان کی صحبت کا قصد اور اپنے حال کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی ابتداء مجاہدہ اور حسن معاملہ سے ہوتی ہے۔

تیسرے گروہ کو مروت انسانی، عمدہ ہم نشینی اور حسن اخلاق ان صوفیا کی سیرت و کردار کی طرف متوجہ کرتے ہیں، چنانچہ وہ لوگ ان صوفیائے کرام کی ظاہر زندگی کو لوگوں سے عمدہ سلوک، بزرگوں کی عزت و احترام، چھوٹوں پر شفقت، ہمسروں سے نیک معاملے سے آراستہ اور نعمت دُنیا کی زیادتی کی طلب سے بے فکر اور قناعت پر خوش دیکھتے ہیں اور ان کی صحبت کا قصد کرتے ہوئے طلب دنیا کی تکلیف اور کوشش کا طریق اپنے اوپر آسان کر لیتے اور بافراغت اپنے آپ کو نیک بنا لیتے ہیں۔

چوتھے گروہ کو طبیعت کی سستی، نفس کی سرکشی اور مطلوبہ وسائل و ذرائع کے بغیر دنیا کی سرداری کی طلب اور بغیر فضیلت کے صدر نشینی کا قصد اور بغیر علم کے خاص و ممتاز بننے کی جستجو ان صوفیا کے احوال کی طرف متوجہ کرتی ہے اور وہ خیال کرتے ہیں کہ سوائے اس ظاہر حال کے اور کوئی دوسرا کام ضروری نہیں۔ تب وہ ان کی صحبت کا قصد کرتے ہیں اور وہ صوفیاء کرام خلق و مہربانی سے اس گروہ کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتے ہیں اور درگزر کے طور پر اُن سے زندگی بسر کرتے ہیں، اس لیے کہ ان کے دلوں میں حق کی بات کچھ بھی نہیں ہوتی اور ان کے جسموں پر طریقت کی طلب کی کوشش کا بھی کوئی نشان نہیں ہوتا۔ وہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کی ایسی ہی عزت و احترام کریں جیسی محقق صوفیوں کی اور ان سے ایسا خوف کھائیں جیسا کہ خاصانِ الٰہی سے کھاتے ہیں اور وہ ان صوفیاء کی صحبت اور ان کے تعلق سے یہ چاہتے ہیں کہ اپنی خرابیوں کو ان بزرگوں کی اصلاح میں چھپا دیں۔ وہ ان کا لباس پہن لیتے ہیں اور وہ بے عمل لباس ان کے جھوٹ، دھوکے اور فریب پر شور مچاتا ہے کہ یہ جھوٹ کی پوشاک اور حشر و نشر کے روز غرور و حسرت

کا لباس ہے، جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے: مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (ترجمہ: ان لوگوں کی مثال جن پر تورات پر عمل کرنے کا بار ڈالا گیا تھا پھر وہ اس بار کو اُٹھانہ سکے، اس گدھے کی سی ہے جو کتابیں اٹھائے ہوئے ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی مثال بہت بری ہے، جنہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا)۔ اس زمانے میں اس گروہ کے لوگ بہت ہیں۔ پس تم پر لازم ہے کہ جو کچھ تمہارے اختیار میں نہ ہو، اس کو لینے کا قصد نہ کرو کیوں کہ اگر تم ہزار بار بھی طریقت کے قبول کرنے کے لیے کہو گے تو ایسا نہیں ہوگا کہ ایک لحظے کیلئے بھی طریقت تمہیں قبول کرے۔ اس لیے کہ یہ کام گدڑی پہننے سے نہیں ہوتا، بلکہ عشق الٰہی کی سوزش سے ہوتا ہے۔ جب طریقت کسی شخص کی آشنا ہوتی ہے تو اس کی امیرانہ قبا بھی فقیرانہ گدڑی کی طرح ہو جاتی ہے اور جب وہ طریقت سے بیگانہ ہوتا ہے تو اسکی گدڑی قیامت کے روز بدبختی کا رقعہ اور شقاوت کا فرمان ہوتی ہے چنانچہ اس بزرگ پیر سے لوگوں نے پوچھا: لِمَ لَا تَلْبِسُ الْمَرَقَّعَةَ قَالَ مِنَ النِّفَاقِ اَنْ تَلْبِسَ لِبَاسَ الْفِتْيَانِ وَلَا تَدْخُلِ فِيْ حَمْلِ اَثْقَالِ الْفُتُوَّةِ (ترجمہ: آپ کیوں گدڑی نہیں پہنتے؟ تو انہوں نے فرمایا: یہ منافقت ہے کہ نوجوان مردوں کا لباس تو پہن لے اور جواں مردی کی اہم ذمہ داریوں کے بوجھ اُٹھانے کے لیے تیار نہ ہو، کیونکہ جواں مردوں کا لباس، جواں مردی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے بغیر پہننا منافقت ہے)۔ پس اگر یہ لباس اس لیے ہے کہ خدا تعالیٰ تجھے پہچان لے کہ تو اُس کا خاص بندہ ہے تو وہ بغیر لباس کے بھی ضرور پہچان لیتا ہے اور اگر اس لیے ہے کہ تو لوگوں پر ظاہر کرے کہ تو اللہ کا خاص بندہ ہے تو واقعی اگر تو اس کا بندہ ہے تو یہ ریا ہوگی اور اگر واقعی تو اس کا بندہ نہیں ہے تو کیا یہ منافقت نہ ہوگی؟ یہ راہ بہت کٹھن اور پرخطر ہے اور اہل معرفت الٰہی اس بات سے بالاتر ہیں کہ لباس سے شہرت حاصل کریں۔

اَلصَّفَا مِنَ اللّٰهِ اِنْعَامٌ وَّ اِكْرَامٌ وَّ الصُّوْفُ لِبَاسُ الْاَنْعَامِ (ترجمہ: صفائے قلب اللہ تعالیٰ کا انعام واکرام ہے اور صوف جانوروں کا لباس ہے) پس ظاہری شکل وصورت ایک حیلہ وریاکاری ہے۔ کچھ لوگ ظاہری صورت کی آراستگی کو قربِ الٰہی کے لیے ایک حیلہ وکوشش تصور کرتے ہیں اور صوفیا کا لباس پہن لیتے ہیں اور اپنے ظاہر کو بنا لیتے ہیں تاکہ ان بزرگوں میں شمار ہوں۔ اس طریقے کے مشائخ نے اپنے مریدوں کو گدڑیوں سے زیب وزینت دینے کا حکم دیا ہے اور خود بھی ایسا کیا ہے تاکہ لوگوں کے درمیان ممتاز بن جائیں اور سب لوگ اس کے محافظ بن جائیں اس طرح کہ اگر وہ ایک قدم بھی شریعت وطریقت سے انحراف کریں تو سب لوگ ان پر طعنہ وملامت کی زبان کھولیں اور اگر وہ چاہیں کہ اس صوفیانہ لباس میں گناہ کریں تو خلقت کی شرم سے ایسانہ کرسکیں۔

الغرض گدڑی اولیاء اللہ کی زینت ہے۔ عوام الناس اس سے عزیز اور خواص اس سے ذلیل ہو جاتے ہیں۔ عام لوگوں کی عزت یوں ہے کہ جب وہ گدڑی پہن لیتے ہیں تو لوگ ان کی عزت کرتے ہیں اور خاص لوگوں کی ذلت اس طرح ہے کہ جب وہ گدڑی پہنتے ہیں تو لوگ ان کی طرف عوام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اُن کو اس پر ملامت کرتے ہیں۔ پس اَلْمُرَقَّعَةُ لِبَاسُ النِّعَمِ لِلْعَوَامِ وَجَوْشَنُ الْبَلَاءِ الْخَوَاصِ (ترجمہ: گدڑی عوام کے لیے نعمت کا لباس اور خواص کے لیئے مصیبت کی زرّہ بکتر ہے)۔ اسی وجہ سے عوام اکثر اس کے لیے بہت بیقرار وپریشان ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب ان کا ہاتھ کسی دوسرے کام تک نہیں پہنچتا اور طلب جاہ کے لیے کوئی اور سبب نہیں پاتے تو فقیرانہ گدڑی کے ذریعے سے سرداری اور عزت وتوقیر طلب کرتے اور اسی کو نعمت دنیا کے جمع کرنے کا سبب بنا لیتے ہیں،

حالانکہ خاصانِ خدا دنیوی عزت و ثروت کے ترک کرنے کا حکم دیتے، ذلت کو عزت پر ترجیح دیتے اور مصیبت کو نعمت پر اختیار کرتے ہیں تاکہ ان کے لیے یہ مرقع (گدڑی) مصیبت ہو اور عوام کے لیے نعمت۔ اَلْمُرَقَّعَۃُ قَمِیْصُ الْوَفَاءِ لِاَھْلِ الصَّفَاءِ وَ سِرْ بَالُ السُّرُوْرِ لِاَ ھْلِ الْغُرُوْرِ (ترجمہ: گدڑی صفائے باطن والوں کے لیے وفا کی قمیص اور اہل غرور کے لیے خوشی کا کرتہ ہے) کیوں کہ اہل صفا اس کو پہن کر دونوں جہاں سے علیحدہ اور مرغوباتِ دُنیا سے الگ ہو جاتے ہیں اور اہل غرور اس کے پہننے سے حق سے حجاب میں ہوکر اصلاح حال سے باز رہتے ہیں۔ الغرض گدڑی سب کے لیے بہتری، امتیاز کا نشان اور کامیابی کا سبب ہے۔ سب کی مراد اس سے حاصل ہوتی ہے، اگر (صوفی) کے لیے صفائی باطن کا سبب ہے تو دوسرے (اہل دنیا) کے لیے عطائے نعمت کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح اگر ایک (اہل غرور) کے لیے اوپر کا پردہ (اوڑھنا) ہے تو دوسرے (اہل صفاء) کے لیے بچھونا (قرب الٰہی کا لباس) ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپس میں نیک صحبت کی وجہ سے سب کامیاب ہوں گے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: مَنْ اَحَبَّ قَوْمًا فَھُوَ مِنْھُمْ (ترجمہ: جس نے کسی قوم کو دوست رکھا، وہ انہیں میں سے ہوگیا)۔ ہر قوم کے دوست قیامت کے روز ان کے ساتھ اور ان کے گروہ میں ہوں گے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ تمہارا باطن تحقیق کی طلب کرے اور اسم ظاہر سے اعراض کرے۔ جو شخص اشیاء کے ظاہر پر کفایت کرتا ہے وہ تحقیق کو نہیں پہنچ سکتا اور یہ بھی جان لو کہ بشریت کا وجود ربوبیت کا حجاب ہے اور یہ حجاب احوال کی گردش اور مقامات تصوف میں مجاہدے کے بغیر دُور نہیں ہوسکتا اور صفائے باطن کا نام فنائے صفت ہے۔ جس کی صفت فانی ہو، اس کے لیے کوئی لباس اختیار کرنا محال ہے اور تکلف سے اپنی زینت کرنا یہ کوئی کمال نہیں ہے۔ پس جس شخص کی صفات کا فنا ہونا ظاہر ہو جائے اور طبیعت جسمانی کی خرابی اور آفات درمیان سے اُٹھ جائیں تو چاہے اس کو صوفی کہو یا کوئی اور نام رکھ لو، اس کے نزدیک دونوں برابر ہیں۔

دوسری فصل
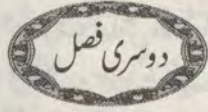
گدڑی پہننے کی شرطیں:

مرقعات کی شرطیں یہ ہیں: گدڑی ہلکے پن اور فقط آسانی کے پیش نظر پہنی جائے اور جب تک گدڑی کا کچھ اصل موجود ہو یعنی استعمال کے قابل ہو تو اُسے ہی کام میں لایا جائے اور جہاں سے پھٹ جائے وہاں ٹکڑا لگا دیا جائے۔ مشائخ طریقت رضی اللہ عنہم کے اس بارے میں دو قول ہیں:

ایک گروہ کہتا ہے کہ چیتھڑے کے سینے میں ترتیب کا لحاظ رکھنا شرط نہیں، بلکہ جہاں سے سوئی کا سرا باہر نکل آئے، اس کو باہر کھینچ لینا چاہیے۔ (یعنی جس طرح سی لیا جائے، ٹھیک ہے) اس میں تکلیف نہیں کرنی چاہیے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ چیتھڑے سینے میں ترتیب و سلیقہ ضروری ہے اور ترتیب کا لحاظ کرنا اور اس کے سیدھے ہونے میں تکلف کرنا فقر کے معاملات میں سے ہے اور معاملے کا صحیح ہونا اصل کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔ میں (علی بن عثمان جلابی) نے شیخ المشائخ ابو القاسم گرگانی رحمتہ اللہ علیہ سے طوس میں اس کے متعلق دریافت کیا کہ درویش کے لیے کم سے کم کس چیز کا ہونا لازم ہے، تاکہ وہ اس فقر کا مستحق ہو تو آپ نے فرمایا کہ وہ کم سے کم تین چیزیں ہیں:

اوّل : یہ کہ اس کو چیتھڑا سیدھا سینا معلوم ہو۔

دوم : سچی بات سننی جانتا ہو۔

سوم : صحیح طور پر پاؤں زمین پر رکھ سکے۔

اس وقت درویشوں کی ایک جماعت میرے ساتھ حاضر تھی۔ جب ہم لوگ گھر واپس پہنچے تو ہم میں سے ہر ایک شخص اس قول میں کچھ تصرف کر رہا تھا (اور اپنی اپنی پسند کے مطابق اس میں تاویل کرنے لگا)۔ جاہلوں کی ایک جماعت کو اس میں حرص پیدا ہوئی اور ان میں سے اکثر لوگ چیتھڑے کو سیدھا سینا اور پاؤں زمین پر مارنا (رقص کرنا) مراد لینے لگے اور ہر شخص یہی سمجھنے لگا کہ ہم طریقت کی باتیں سننا جانتے ہیں، چونکہ میری دلی توجہ شیخ کی طرف تھی، اس لیے آپ کی بات کو میں نے زمین پر پھینکنا نہ چاہا اور ان لوگوں سے کہا: آیئے ہم میں سے ہر ایک اس قول کے معنی کے متعلق کچھ بیان کرے، چنانچہ ہر ایک نے اپنے مفہوم کی صورت بیان کی۔ جب میری باری آئی تو میں نے کہا کہ چیتھڑے کا صحیح طور پر سینا یہ ہے کہ اس کو حقیقی فقر سے سیئں نہ کہ ظاہری زیب و زینت سے۔ جب تو چیتھڑے کو فقر کے ساتھ سیئے گا تو کچھ ٹیڑھا سیئے گا، وہ درست ہو گا اور درست بات سننا یہ ہے کہ اس کو حال کے ساتھ سنے نہ کہ قال کے ساتھ، اور اس کی حق و معقول بات سے تاویل کریں نہ بیہودہ بات سے اور اسے دل سے سمجھیں نہ کہ عقل سے اور زمین پر سیدھا پاؤں رکھنا یہ کہ جذبۂ محبت الٰہی سے پاؤں زمین پر رکھا جائے نہ لہو و رواج ظاہر سے۔ کسی شخص نے جب یہ بات شیخ المشائخ تک پہنچا دی تو آپ نے فرمایا: اَصَابَ عَلِیٌّ خَیرَ اللّٰہ (ترجمہ: علی نے سچ کہا، اللہ اسے نیکی دے)۔ پس گدڑی پہننے سے مراد اس گروہ صوفیا کے نزدیک دنیا کی محبت کم کرنا اور خدا تعالیٰ کے ساتھ سچا فقر حاصل کرنا ہے۔

آثارِ صحیحہ میں آیا ہے کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام گدڑی پہنے ہوئے تھے جب انہیں آسمان پر اُٹھا لے گئے اور ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کو اسی گدڑی کے ساتھ خواب میں دیکھا کہ اس کے ہر ایک چیتھڑے سے نور چمکتا تھا۔ میں نے پوچھا: "اے مسیح علیہ السلام! آپ کے لباس پر یہ انوار کیسے ہیں؟" تو آپ نے جواب دیا کہ "یہ میری مجبوری اور لاچاری کے نور ہیں کیونکہ اس گدڑی کا ایک چیتھڑا ایک ضرورت (مجبوری) سے سیا گیا۔ خداوند تعالیٰ نے ہر ایک تکلیف کو جو اس نے میرے دل کو پہنچائی ہے، ایک نور بنا دیا ہے۔" نیز میں نے اہل ملامت میں سے ایک بوڑھے کو ماوراء النہر میں دیکھا کہ جو چیز آدمی کے کھانے پینے کی ہے، وہ اسے استعمال نہ کرتا تھا۔ اس کی خوراک وہ چیزیں تھیں، جنہیں لوگ پھینک دیتے تھے جیسے باسی اور سڑی، کڑوا کدو اور خراب شدہ گاجر وغیرہ قسم کی چیزیں اور پوشاک ان چیتھڑوں سے بناتا تھا جو راستے میں سے اُٹھا کر اور دھو کر انہیں گدڑی کی صورت دے دیتا۔ میں نے سنا کہ مروالرّود میں ایک پیر مرد متاخرین اہلِ طریقت میں سے بہت قوی حال اور نیک سیرت تھا۔ بہت سے ردّی چیتھڑے جو اس کے مصلے اور ٹوپی پر لگے تھے، ان میں بچھونے بچے دے رکھے تھے اور میرے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے چھپن سال تک ایک ہی کپڑا پہنے رکھا تھا جس پر ہمیشہ چیتھڑے لگاتے رہتے تھے۔ عراقی لوگوں کی حکایات میں، میں نے دیکھا ہے کہ دو درویش تھے۔ ایک صاحبِ مشاہدہ اور دوسرے صاحبِ مجاہدہ۔ جو صاحبِ مشاہدہ تھے، وہ اپنی ساری عمر میں صرف وہی چیتھڑے پہنتے تھے جو درویشوں کی سماع کی حالت میں پھٹ جاتے تھے، اور جو صاحب مجاہدہ تھے، وہ صرف وہی ٹکڑے پہنتے تھے جو درویشوں کے استغفار[1] کرنے کی حالت میں اُن کے کپڑوں میں پھٹ جاتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کا ظاہر لباس اُن کے باطن کے لباس کے مطابق ہوتا تھا اور یہی بات فقر کے حال کی نگہداشت ہے۔ شیخ محمد بن خفیف رحمۃ اللہ علیہ نے بیس سال ایک کھردرا ٹاٹ پہنا تھا اور ہر سال چار چلے کھینچے تھے اور ہر چلے میں علومِ حقیقت کے رموزِ مخفیہ کے

[1] اللہ تعالیٰ سے بخشش کرنے کو استغفار کہتے ہیں۔

متعلق ایک تصنیف کرتے تھے۔ ان کے زمانے میں علمائے حق و طریقت کے محققین میں سے ایک بزرگ تھے، جو فارسی لباس میں بیٹھتے تھے۔ لوگ انہیں محمد بن زکریا کہتے تھے، وہ کبھی گدڑی نہ پہنتے تھے۔ لوگوں نے شیخ محمد رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا کہ "گدڑی پہننے کی کیا شرط ہے اور اس کا پہننا کس کے لیے مسلم ہے؟" تو انہوں نے جواب دیا کہ "گدڑی پہننے کی شرط وہ ہے، جو محمد بن زکریا سفید پیراہن میں بجالاتے ہیں اور ان کا پہننا بھی انہی کو مُسَلَّمْ ہے۔"
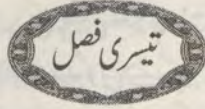
گدڑی فقیر کی پہچان نہیں

اہل تصوف کی عادت کو چھوڑ دینا طریقت کی شرط نہیں اور صوفیا جو اس حال میں پشم کا لباس کم پہنتے ہیں، اس کی دو وجوہ ہیں:

اوّل: اس لیے کہ پشم شور ناک[1] ہو گئی ہے یعنی جانوروں کے جا و بے جا بیٹھنے کی وجہ سے ناپاک ہے۔

دوم: اس لیے کہ بدعتیوں[2] کے ایک گروہ نے پشم کے لباس کو اپنا نشان بنا لیا ہے اور بدعتیوں کے شعار کے خلاف کرنا بشرطیکہ وہ سنت کے خلاف نہ ہو، بہت اچھا ہے لیکن گدڑی کے سینے میں تکلف اس لیے جائز رکھتے ہیں کہ ان صوفیا کا درجہ لوگوں میں بہت بزرگ ہے۔ ہر شخص نے اپنے آپ کو بظاہر انکی مانند بنا لیا ہے، گدڑی پہن لی ہے اور برے افعال اُن سے ظاہر ہوئے ہیں اور ان صوفیا کو اپنے مخالفین کی صورت سے رنج ہوتا ہے، اس لیے انہوں نے اپنے لیے ایک لباس تجویز کیا ہے کہ ان کے سوا کوئی دوسرا شخص اس کو سی نہیں سکتا اور اُسے ایک دوسرے کی پہچان کی علامت اور شعار بنا لیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک درویش کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہ ٹکڑا جو اس نے اپنی گدڑی میں سی رکھا تھا، اس کا خط غلط (دوسرے نسخہ میں خط چوڑا) لگا رکھا تھا۔ اس شیخ نے اس کو اپنے پاس سے جدا کر دیا۔ مطلب اس کا یہ تھا کہ اہل صفا[3] کی طبع نازک اور مزاج لطیف ہوتا ہے۔ طبیعت کی کجی انہیں اچھی معلوم نہیں ہوتی اور جس طرح ناموزوں شعر طبیعت کو اچھا معلوم نہیں ہوتا، اُسی طرح ناموزوں فعل بھی طبیعت قبول نہیں کرتی اور ایک گروہ صوفیا نے لباس کے ہونے یا نہ ہونے میں تکلف ہی نہیں کیا۔ اگر خدا تعالیٰ نے انہیں گدڑی دیدی تو انہوں نے پہن لی، قبادی تو وہ پہن لی اور اگر ننگا رکھا تو انہوں نے ننگا رہنا ہی پسند کیا اور میں (علی بن عثمان جلابی) نے اس طریقے کو پسند کیا ہے اور اسی کو اپنا شعار بنایا ہے۔ حکایات میں مروی ہے کہ جب احمد خصرویہ رحمتہ اللہ علیہ بایزید رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کے لیے تشریف لائے تو انہوں نے قبا[4] پہن رکھی تھی اور جب شاہ شجاع رحمتہ اللہ علیہ ابی حفص رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کو تشریف لائے تو وہ بھی قبا پہنے ہوئے تھے اور وہ ان کا متعین لباس تھا کیونکہ بعض اوقات وہ عبا[5] بھی رکھتے تھے اور کبھی پشمینہ کا لباس یا سفید پیراہن بھی پہنتے تھے، جیسا بھی مل جاتا پہن لیتے تھے کیونکہ وہ چیز جس سے آدمی کا نفس عادی ہو، اس عادت سے اس شخص کو اُلفت ہو جاتی ہے اور جب کسی چیز کی اس کو عادت ہو جاتی ہے تو وہ بار بار کرنے کی وجہ سے عادتِ طبعی ہو جاتی ہے تو وہ اس کے لیے حق سے حجاب بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

---

۱ شور ناک کے معنی خراب کے ہیں۔
۲ شریعت میں نئی اور بے اصل چیزوں کو رواج دینے والے کو بدعتی کہتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے ایسے شخص کو دوزخی قرار دیا ہے۔
۳ اہل طریقت ۴ امراء کا خاص لباس ۵ عبا، گدڑی اور فقراء کے لباس کو کہتے ہیں۔

خَیْرُ الصِّیَامِ صَوْمُ اَخِیْ دَاؤُدَ عَلَیْہِ السَّلَامُ (ترجمہ: بہترین روزہ[1] میرے بھائی داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: "یارسول اللہ ﷺ! وہ کیسا ہوتا ہے؟" تو آپ ﷺ نے فرمایا: "داؤد علیہ السلام ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار کرتے تھے" تاکہ نفس کو روزہ رکھنے یا افطار کرنے کی عادت نہ ہو جائے کہ اس کی وجہ سے حق سے حجاب ہو جائے اور اس بارے میں ابو حامد دوست مروزی رحمۃ اللہ علیہ کا حال بہت ٹھیک رہا ہے کہ اُن کے مرید انہیں کوئی لباس پہناتے تو وہ پہن لیتے اور جب اُن میں سے کسی مرید کو اس لباس کی حاجت ہوتی تو آپ کی فراغتِ قلبی[2] کی ٹوہ میں لگے رہتے۔ جب آپ دنیا وما فیہا سے خالی ہو جاتے، لباس اُن کے بدن سے اُتار لیتے۔ آپ نہ پہنانے والے سے کہتے کہ کیوں پہناتا ہے اور نہ اُتارنے والے سے کہتے کہ کیوں اُتارا ہے۔ ہمارے اس زمانے میں بھی ایک بزرگ غزنی میں ہیں (اللہ اس شہر کو آفات سے محفوظ رکھے) جن کا لقب مرید[3] رحمۃ اللہ علیہ ہے کہ وہ لباس پہننے میں پسند و امتیاز کو رَوا نہیں رکھتے اور اس مقام میں وہ نہایت درست ہیں۔ رہی یہ بات کہ صوفیا کے اکثر کپڑے نیلے ہوتے ہیں۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ان بزرگوں نے اپنے طریق کی بنیاد سیر و سیاحت پر رکھی ہے اور سفید لباس سفر میں اپنے حال پر نہیں رہتا، اس کا دھونا دشوار ہوتا ہے اور ہر شخص اس کی طمع بھی کر سکتا ہے (چرا لیتا ہے) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ نیلا لباس اہل ماتم و مصیبت اور غم زدہ لوگوں کا لباس ہے اور دنیا محنت کا گھر اور مصیبت کا پردہ سرا، غم کا گڑھا، جدائی کی کٹیا اور بلا کا گہوارہ ہے۔ جب حق کے طالب علموں نے اپنا دلی مقصود دنیا میں ہوتے نہ دیکھا تو نیلا لباس پہن لیا اور وصالِ محبوب کے سوگ میں بیٹھ گئے اور ایک دوسرے گروہ نے اپنے عمل میں کوتاہی اور خرابی اور زمانے میں تضیع اوقات کے سوا کچھ نہ دیکھا تو نیلا لباس پہن لیا، کیونکہ مقصود کا فوت ہونا موت سے زیادہ سخت ہے۔ اگر ایک نے اپنے کسی عزیز کی موت پر نیلا لباس پہن لیا تو دوسرے نے مقصود کے فوت ہو جانے پر نیلا لباس پہن لیا۔ علم ظاہر کے ایک جھوٹے مدعی نے کسی درویش سے پوچھا کہ "یہ نیلا لباس تو نے کیوں پہنا؟" تو اس نے جواب دیا کہ "پیغمبر ﷺ سے تین چیزیں دنیا میں باقی رہی ہیں:-

اول: فقر

دوم: علم

سوم: شمشیر

تلوار بادشاہوں کو ملی جنہوں نے اسے موقعہ پر استعمال نہ کیا، علم علماء نے اختیار کیا لیکن فقط اس کے سیکھنے پر اکتفا کیا اور اس پر عمل نہ کیا، فقر فقیروں کے گروہ نے اختیار کیا اور اس کو دولت دنیا جمع کرنے کا آلہ بنا لیا۔ میں نے ان تینوں گروہوں کی مصیبت پر نیلا لباس پہن لیا۔" حضرت مرتعش رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت روایت ہے کہ آپ بغداد کے کسی محلّہ سے گزر رہے تھے کہ آپ کو پیاس لگی۔ ایک دروازے پر آکر پانی مانگا تو ایک لڑکی لوٹا لے کر باہر نکلی۔ آپ نے اس سے پانی لے کر پی لیا۔ ناگاہ اس کے چہرے پر جب نگاہ ڈالی تو آپ کا دل ساقی[4] کے جمال کا شکار ہو گیا اور بزرگوں کے اس قول کے مطابق کُلِّیْ بِکُلِّكَ مَشْغُوْلٌ (ترجمہ: میرا سراپا تیرے سراپے میں مشغول ہے) آپ وہیں بیٹھ گئے۔ یہاں

---

۱ روزہ سے یہاں نفلی روزہ مراد ہے۔

۲ فراغتِ قلبی صوفیا کرامؒ کے نزدیک حالت جذب کا نام ہے یعنی مشاہدۂ حق کے وقت دل کا دنیا وما فیہا سے فارغ و بے خبر ہو جانا۔

۳ اللہ کی طرف سے توفیق و مدد پانے والے کو مرید کہتے ہیں۔ ۴ پلانے والا

تک کہ گھر والا آ گیا۔ آپ نے اس سے کہا: "جناب! دل پانی پینے کو بہت چاہتا تھا، مجھے آپ کے گھر سے ایک لڑکی نے پانی پلایا اور میرا دل لے لیا۔" گھر والے نے کہا: "وہ میری لڑکی ہے، میں اسے آپ کے نکاح میں دے دیتا ہوں۔" حضرت مرتعش رحمتہ اللہ علیہ بڑی خوشی سے گھر میں داخل ہوئے اور عقد باندھا۔ صاحب خانہ بغداد کے ایک دولت مند شخص تھے۔ انہوں نے آپ کو حمام میں بھیج کر عمدہ لباس پہنا دیا اور گدڑی اُتار لی۔ جب رات ہوئی تو حضرت مرتعش رحمتہ اللہ علیہ نماز کے لیے کھڑے ہوئے تاکہ اورادِ مقررہ ادا کریں اور ذکر الٰہی میں مشغول ہوں کہ اس اثناء میں آپ نے شور و غل مچا دیا۔ ھاتوا مُرَقَّعِیْ (ترجمہ: میری گدڑی لاؤ) لوگوں نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ تو آپ نے فرمایا کہ "میرے دل میں غیب سے آئی کہ تو نے ایک نظر ہمارے غیر پر ڈالی تو ہم نے نیکی کا لباس اور گدڑی تیرے ظاہر جسم سے اُتار لی، اگر تو دوسری دفعہ نظر غیر پر ڈالے گا تو محبت کا لباس بھی تیرے باطن پر سے اُتار لیں گے۔" وہ لباس جس کے پہننے سے خداوند تعالیٰ کی رضا جوئی اور اولیاء اللہ سے مناسبت پیدا کرنی ہو تو اس کے حقوق و آداب کا لحاظ کرتے ہوئے اگر تو زندگی بسر کر سکتا ہے تو لائق مبارک باد ہے ورنہ فقط اپنے دین کی حفاظت کرنی چاہیے اور اولیاء اللہ کے لباس میں خیانت روا نہ رکھنی چاہیے، کیونکہ حقیقی مسلمان بغیر کسی دوسرے دعوے کے جھوٹے ولی سے بہتر ہے۔ بہرحال گدڑی کا پہننا دو گروہوں کے لیے درست ہے: ایک تو دنیا سے قطع تعلق کرنیوالوں کے لیے، دوسرے مشاقانِ مولا کے لیے۔ مشائخ طریقت کی عادت یوں رہی ہے کہ جب کوئی مرید دنیوی تعلقات کو چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہوتا تو اس کو تین سال میں تین باتوں کی تعلیم دیتے، اگر وہ اس بات پر قیام کرتا تو اس کو مریدی کے لیے قبول کر لیتے، ورنہ کہہ دیتے کہ طریقت اس کو قبول نہیں کرتی۔ وہ تین باتیں یہ ہیں:

اول : ایک سال خدمتِ خلق کرنا

دوم : دوسرے سال خدمتِ حق

سوم : تیسرے سال اپنے دل کی نگرانی

خدمت خلق وہ اس وقت کر سکتا ہے کہ جب اپنے آپ کو خادموں میں رکھے اور تمام مخلوقات کو مخدوموں کے درجے پر یعنی بلا امتیاز سب کو اپنے سے بہتر جانے اور سب کی خدمت کو اپنے اوپر واجب سمجھے، نہ کہ اس طور پر کہ کوئی خدمت کرے اور اپنے آپ کو اس خدمت میں مخدوموں پر فضیلت دے اور یہ بات ایک ظاہر خسارہ[1] اور واضح عیب ہے اور زمانے کی تمام آفتوں میں سے ایک بڑی آفت ہے اور اللہ عزوجل کی خدمت اس وقت کر سکتا ہے کہ اپنی سب دنیا و آخرت کی لذتوں کو منقطع کر دے اور محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے اس کی پرستش کرے کیوں کہ جب تک آدمی اللہ کی کسی اور چیز کے لیے عبادت کرتا ہے، وہ اپنی ہی عبادت کرتا ہے نہ خدا کی اور اپنے دل کی نگرانی اس وقت کر سکتا ہے کہ اپنے دل کو فقط ذاتِ حق سے وابستہ کرے اور محبت الٰہی کی بارگاہ میں دنیا کے تمام تفکرات کو دور کر کے اپنے دل کو غفلت و معصیت کے موقعوں سے محفوظ رکھے۔ جب یہ تینوں شرطیں مرید میں پائی جائیں تب گدڑی کا پہننا حقیقی طور پر مسلم ہوتا ہے، نہ تقلید کے طور پر لیکن وہ گدڑی پہنانے والا (مرشد) جو مرید کو گدڑی پہناتا ہے وہ مستقیم الحال[2] ہونا چاہیے جو طریقت کے تمام نشیب و فراز سے گزرا ہو اور احوالِ طریقت کا ذوق چکھے ہوئے، اعمال شریعت کا مزہ پائے ہوئے، جلالِ الٰہی کا غلبہ اور جمالِ حق کا لطف دیکھے ہوئے ہو اور ضروری ہے کہ وہ اپنے مرید کے حال پر مطلع ہو کہ

---

[1] نقصان، زیاں　[2] یعنی طریقت کے تمام اسرار و رموز سے پوری واقفیت رکھتا ہو۔

انجام کار وہ کہاں پہنچے گا؟ واپس آنے والوں میں سے ہوگا، راستے میں ٹھہرنے والوں میں سے یا منزل مقصود پر پہنچنے والوں میں سے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ وہ مرید ایک دن طریقت سے واپس لوٹ آئیگا تو اسے کہہ دے کہ وہ اسے شروع ہی نہ کرے اور اگر وہ سلوکِ طریقت کے راستے میں ٹھہر جائے تو اُسے صحیح عمل کرنے کا حکم دے، اگر وہ منزل مقصود پر پہنچ جائے تو اس کی پرورش کرے اور اس طریق کے مشائخ دلوں کے طبیب ہوتے ہیں۔ جب طبیب مریض کی بیماری سے ناواقف ہو تو بیمار کو اپنے علاج سے ہلاک کر دے گا، اس لیے کہ وہ اس کی پرورش نہیں کر سکتا اور اس کے خطرے کے مقامات کو نہیں پہچانتا اور اس کی غذا و دوا اس کی بیماری کے خلاف تجویز کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اَلشَّیْخُ فِی قَوْمِہٖ کَالنَّبِیِّ فِیْ اُمَّتِہٖ (ترجمہ: شیخ اپنی قوم میں ایسا ہوتا ہے جیسے نبی اپنی اُمت میں) پس انبیاء جو بندوں کو حق کی طرف دعوت دیتے ہیں، بصیرتِ باطن سے دیتے ہیں اور ہر شخص کو اس بارے میں اپنے اپنے درجہ پر رکھتے ہیں پس شیخ کو بھی اپنے مریدوں کی تربیت بصیرتِ[1] باطن سے کرنی چاہیے اور ہر ایک کو اس کے موافق غذا و دوا دینی چاہیے تاکہ دعوت الی الحق کی مراد حاصل ہو۔ پس جب کوئی ولایت الٰہی کے کمال پر پہنچا ہوا مرشد اپنے مرید کی ان تین سالوں کی تادیب کے بعد تربیت کرے اور تین سال کی قابل ریاضت و مجاہدے کے بعد اس کو گدڑی پہنا دے تو درست ہے۔ گدڑی گویا کفن کا پہننا ہے کیوں کہ کفن کا پہننا زندگی کی لذتوں سے کنارہ کش ہو جانا ہے اور دل کو زندگی کی راحتوں سے بالکل پاک کر دینا ہے۔ جب وہ اپنی ساری عمر حق کے لیے وقف کردے اور پورے طور پر خواہشِ نفس سے بیزار ہو، اس وقت یہ مرشد اس کو اس خلعت اور نوازش سے عزت بخشے اور وہ مرید اس کے حق پر قیام کرے اور اس کا حق ادا کرنے میں پوری کوشش کرے اور اپنی نفسانی غرض کو اپنے اوپر حرام کرلے۔

گدڑی کے متعلق بزرگوں نے بہت سے اشارات بیان فرمائے ہیں۔ شیخ ابو عمر اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں ایک کتاب لکھی ہے اور عام صوفی لوگ اس بارے میں بہت مبالغہ کرتے ہیں۔ بہرصورت ہمارا مقصود کتاب سے ان اقوال کو نقل کرنا نہیں بلکہ طریقت کے مسائل کو کھول کر بیان کرنا، بلکہ طریقت کے مشکل مسائل کو کھول کر بیان کرنا ہے۔ یاد رکھیے کہ گدڑی کے متعلق بہترین اشارات یہ ہیں کہ گدڑی کا گلا صبر سے، اس کی دو آستینیں خوف و رجا سے، دو تریزیں قبض و بسط سے، کمر نفس کی مخالفت سے، اس کی کرسیاں صحت اور یقین سے اور اس کی فراویز اخلاص سے ہونی چاہیے اور اس سے بہتر اشارات یہ ہیں کہ گدڑی کا گلا اہل دنیا کی موانست کے فنا ہو جانے سے، دو آستینیں نفس کی حفاظت اور دل کی عصمت سے، دو تریزیں فقر و برگزیدگی سے، اس کی کمر مشاہدۂ حق میں محو ہو جانے سے، اس کی کرسی حضرت حق سبحانہٗ کے حضور اطمینان پانے سے اور اس کی فراویز محل وصل حق کے مقام میں قرار پکڑنے سے بنی ہونی چاہیے۔

جب باطن کے لیے تو نے ایسی گدڑی بنالی تو اپنے ظاہری بدن کے لیے بھی ایک گدڑی بنانی چاہیے اور میری اس بارے میں ایک علیحدہ کتاب ہے، جس کا نام اسرار[2] الخرق والمونات ہے۔ اس کا ایک نسخہ مرید کے پاس ہونا چاہیے۔ لیکن جب مرید نے یہ گدڑی پہن لی تو اگر وہ حال اور وجد کے غلبے میں اس گدڑی کو پھاڑ ڈالے تو وہ قابل تسلیم اور معذور سمجھا جائے گا اور اگر وہ اپنے اختیار طریقت کی شرط کو جانتے ہوئے اس کو پھاڑے تو اس کے لیے گدڑی رکھنا مسلم و ضروری نہیں۔ اگر وہ ایسے ہی رکھے جس طرح زمانے کے دوسرے گدڑی پوشوں میں سے کوئی رکھتا ہے تو وہ بھی

---

[1] دل کی بینائی، سمجھ بوجھ [2] یعنی حجاب و کشف

ان میں سے ایک ہو گا، جو ظاہر پر بغیر باطن کے کفایت کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کے لباس پھاڑنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب ان کا ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف انتقال ہوتا ہے تو وہ فوراً اس لباس سے اس مقام کے حصول کے شکریے میں باہر آتے ہیں اور گدڑی کے سوا دوسرے کپڑے فقط ایک مقام کا لباس ہوتے ہیں، غرضیکہ گدڑی طریقت، فقر وصفوت کے کل مقامات کا ایک جامع لباس ہے اور ان تمام مقامات سے باہر نکلنا ان سب مقامات سے بیزاری ظاہر کرنا ہے۔ اگرچہ یہ مقام اس مسئلے کو بیان کرنے کا نہیں بلکہ اس کو خرق اور کشف حجاب السماع کے باب میں بیان کرنا چاہیے، تاہم میں نے یہاں اتنا اشارہ اس لیے کر دیا کہ یہ لطیفہ فوت نہ ہو جائے اور اپنے محل پر انشاء اللہ اس امر کی پوری تفصیل بیان کر دوں گا۔ نیز مشائخ طریقت نے فرمایا ہے کہ گدڑی پہنانے والے (مرشد) کو حقیقت وطریقت میں ایسی قوت ہونی چاہیے کہ جب وہ (طریقت) سے بیگانہ شخص کو شفقت کی نگاہ سے دیکھے تو وہ (طریقت سے) آشنا ہو جائے اور جب وہ گدڑی ایک گنہگار کو پہناوے تو وہ اولیاء اللہ میں سے ہو جائے۔

ایک مرتبہ میں اپنے شیخ کے ہمراہ ملک آذربائیجان میں جارہا تھا کہ دو تین گدڑی پوشوں کو دیکھا کہ وہ گیہوں کے خرواڑ[1] پر کھڑے تھے۔ انہوں نے اپنی گدڑیوں کے پلے بچھا دیئے تو کسان نے اُن میں کچھ غلہ ڈال دیا۔ شیخ نے ان کی طرف دیکھ کر یہ آیت پڑھی: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (ترجمہ: یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے میں گمراہی خرید لی، پس ان کی تجارت کچھ نفع مند نہ ہوئی اور دراصل وہ ہدایت پانے والے نہ تھے) میں نے کہا: "اے شیخ! یہ لوگ کس بے حرمتی کی وجہ سے اس بلا میں مبتلا اور مخلوق کے سامنے رُسوا ہوئے ہیں۔" انہوں نے فرمایا کہ "ان کے پیروں کو مرید جمع کرنے کی حرص تھی اور انہیں دنیا جمع کرنے کی، اور کوئی حرص بھی دوسری حرص سے بہتر نہیں ہوتی اور بلا امر (شریعت) دعوت کرنا خواہش نفس کی پرورش کرنا ہے۔"

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ "میں نے باب الطلق پر ایک نہایت خوبصورت یہودی کو دیکھا۔ چنانچہ میں نے پروردگارِ عالم سے یہ دعا مانگی: بارِ خدایا! اس کو میرے پاس بھیج، تو نے اس کو کتنا خوبصورت پیدا کیا ہے۔ ابھی تھوڑی مدت بھی نہیں گزری تھی کہ وہ یہودی میرے پاس آکر کہنے لگا: اے شیخ! مجھے کلمۂ شہادت پڑھایئے۔ چنانچہ وہ مسلمان ہوا اور اسلام کا ایسا شیدا بنا کہ تھوڑے دنوں کے بعد اولیاء اللہ میں شمار ہونے لگا۔"
شیخ ابو علی سینا رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کہ گدڑی پہننا کس کے لیے جائز ہے؟ تو آپ نے فرمایا اس شخص کے لیے جو مملکتِ الٰہی کے تمام اسرار سے مطلع ہو۔ چنانچہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم اور حال جاری نہیں ہوتا مگر فاعلان قضا و قدر اسے اس سے آگاہ کر دیتے ہیں۔ پس گدڑی صالحین کا نشان، نیک لوگوں کی علامت اور فقراء و اہل تصوف کا لباس ہے اور فقر وصفوت کی حقیقت کے متعلق اس سے پیشتر کلام ہو چکا ہے، اگر کوئی شخص اولیاء اللہ کے لباس کو دنیا جمع کرنے کا ذریعہ اور اپنی خرابی کا پردہ بنالے تو ان کی وجہ سے اس لباس کے اہل (اصل صوفیاء) کو موردِ الزام ٹھہرانا مناسب نہیں اور اہل ہدایت کے لیے اتنا بیان کافی ہے، کیونکہ اگر میں اس کی شرح بیان کرنے لگوں تو اس کتاب کا جو مقصود ہے، وہ فوت ہو جائے گا اور توفیق قبضۂ قدرت الٰہی میں ہے۔

[1] ڈھیر

پانچواں باب

پہلی فصل
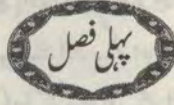
فقر و صِفُوَت[1] کی فضیلت میں اختلاف

علمائے طریقت کا فقر اور صِفُوَت کی تفصیل میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک فقر، صِفُوَت سے افضل ہے، جبکہ دوسرا گروہ صِفُوَت کو فقر سے بہتر سمجھتا ہے۔ جو لوگ فقر کو صِفُوَت پر ترجیح دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ فقر اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کا فنا اور فقراء کے باطن کے ماسوا سے بالکل منقطع ہو جاتا ہے۔ صِفُوَت اس کے مقامات میں ایک مقام ہے۔ جب فنا حاصل ہوگئی تو مقامات سب نابود ہوگئے اور یہ مسئلہ بھی فقر و غنا کی طرح ہے۔

قبل ازیں اس کے متعلق کلام ہو چکا ہے اور لوگ جو صِفُوَت کو ترجیح دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ فقر ایک موجود چیز ہے، جو اس قابل ہے کہ اس کا نام رکھا جائے۔ صِفُوَت تمام موجودات سے تعلق منقطع ہو جانے کو کہتے ہیں اور جملہ موجودات سے منقطع ہو جانا عین فنا ہے اور فقر عین بقا۔ پس فقر اولیاء اللہ کے مقامات میں سے ایک مقام کا نام ہے اور صِفُوَت ان کے کمالات میں سے ایک کمال ہے۔ اس کے متعلق اس زمانے میں کافی بحث ہو چکی ہے اور ہر شخص اس میں عجیب انداز میں پر تاویل کرتا اور ایک دوسرے کے سامنے نادر سے نادر باریکیاں پیش کرتا ہے۔ فقر و صِفُوَت کی تفصیل میں اختلاف واقع ہوا ہے لیکن یہ سب لسانی اور لفظی ہے، محض بیان و عبارت باتفاق مشائخ نہ فقر ہے اور نہ صِفُوَت۔ پس ان لوگوں نے صرف عبادت کو ایک مذہب بنا لیا اور طبیعت کو معانی کے ادراک سے خالی کرا لیا اور حق کی بات کو نیچے پھینک کر ہوائے نفس کی نفی کو نفی عین (ماسوائے اللہ) کہتے ہیں اور مقصود (نفسانی) کے اثبات کو عین (حق) جانتے ہیں۔ پس موجود و مفقود و منفی و مثبت سب اپنے نفس اور خواہش کے قیام کی وجہ سے وہ خود ہی ہیں۔ طریقت جھوٹے مدعیوں کی ایسی فضول باتوں سے پاک ہے۔

الغرض اولیاء ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں کوئی مقام باقی نہیں رہتا بلکہ سب درجات و مقامات فانی ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ عبارات و الفاظ اس غیر معین مقام اور اس کے اسرار و لطائف کے بیان کرنے سے عاجز ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہاں نہ پینا رہتا ہے نہ مزہ، نہ طمع اور نہ زور، نہ ہوشیاری نہ بے خودی۔ اس وقت ان اولیاء کو ایک چیز کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان معانی کو اس سے بیان کریں جو نہ اسم کے تحت آسکتے ہیں اور نہ صفت کے تحت۔ تب ہر شخص اس نام کو جو اُن کے نزدیک باعظمت ہوتا ہے، ان معانی پر چسپاں کر دیتا ہے، لہٰذا وہاں پر تقدیم و تاخیر جائز نہیں ہوتی کہ کوئی شخص یوں کہہ سکے کہ وہ مقدم ہے یا یہ مقدم، کیونکہ مقدم و مؤخر ہونا ان چیزوں میں ہوتا ہے جن کا نام ہوتا ہے۔

پس ایک گروہ کو فقر کا نام مقدم معلوم ہوا جو (دنیوی) آلائشوں کو دور کرنے اور (نفسانی) خرابیوں کو فنا کرنے کا آئینہ دار تھا اور ان کی مراد ان دو ناموں سے اس معنیٰ (حقیقت تصوف) کی علامت کا نشان ہے کہ عبارت اس کے بیان سے قاصر ہے۔ آپس میں یہ لوگ اس کے متعلق اشارے سے بات چیت کرتے تھے اور تمام علامتوں کے ساتھ انہوں نے اپنی ہستی کا کشف کیا۔ اس گروہ نے اس کے متعلق کچھ اختلاف نہیں کیا، خواہ اس معنیٰ کو فقر سے تعبیر

[1] برگزیدگی، انتخاب

کیا جائے یا صِفُوَتُ سے، البتہ اہل عبارت و اہل لغت نے جو ان معانی کی حقیقت سے بے خبر تھے، محض عبارت میں کلام کیا اور اسی میں اُلجھ کر رہ گئے۔

چنانچہ ان دوناموں میں سے ایک کو مقدم اور دوسرے کو مؤخر کردیا، حالانکہ یہ دونوں قول محض عبارت (لفظی) ہی تھے۔ پس گروہ (اولیاء) تو تحقیق معانی کی طرف گئے اور یہ گروہ (اہل لغت) عبارت (لفظی) کے اندھیرے میں رہ گئے۔ المختصر جب کسی شخص کو معنی (حقیقت تصوف) حاصل ہو اور پھر اسی حقیقت کو اپنے دل کا قبلہ (جہت توجہ) بنالے تو خواہ اس کو فقیر کہہ لیں خواہ صوفی، یہ دونوں اس حقیقت کے اضطراری نام ہیں جو اسم کے تحت نہیں آسکتی۔ یہ اختلاف ابوالحسن سمنون رحمۃ اللہ علیہ کے وقت سے جاری ہے کہ وہ جب ایسے مکاشفے[1] میں ہوتے جو بقا کے ساتھ تعلق رکھتا ہے تو فقر کو صِفُوَتُ پر مقدم رکھتے اور جب ایسے مقام مشاہدہ[2] میں ہوتے جو فنا کے ساتھ تعلق رکھتا ہے تو صِفُوَتُ کو فقر پر ترجیح دیتے۔ اربابِ حقیقت اس وقت آپ سے پوچھتے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ تو آپ فرماتے کہ جب طبیعت کو فنا میں پورا تنزل ہوتا ہے اور بقا کی جانب کامل بلندی تو اس وقت میں صِفُوَتُ کو فقر پر مقدم رکھتا ہوں، اور جب ایسے مقام میں ہوتا ہوں کہ اس کا تعلق بقا سے ہوتا ہے تو فقر کو صِفُوَتُ پر مقدم رکھتا ہوں، کیونکہ فقر بقا کا نام ہے اور صِفُوَتُ فنا کا، گویا میں اپنی ذات سے فنا و بقا کا دیکھنا فانی کردیتا ہوں تاکہ میری طبیعت فنا سے بھی فانی ہوجائے اور بقا سے بھی۔

یہ توجیہہ عبارت کے لحاظ سے تو بہت خوب ہے لیکن درحقیقت نہ فنا کو فنا ہے اور نہ بقا کو فنا، کیوں کہ جو باقی فنا پذیر ہے، وہ خود فانی ہے اور جو فانی کہ باقی رہنے والا ہے، وہ خود باقی ہے اور فنا ایک ایسا اسم ہے کہ اس میں مبالغہ محال ہے اس لیے کہ اگر کوئی یوں کہے کہ فنا فنا ہوجاتی ہے تو یہ بات اس معنی کے وجود کے اثر کی نفی میں مبالغہ ہے، کیونکہ فنا میں جب تک کوئی اثر باقی رہتا ہے تب تک وہ ابھی فنا نہیں ہوتا اور جب فنائے کلی حاصل ہوگئی تو فنا کی فنا ایسی بے معنی عبارت میں تعجب کے سوا اور کوئی چیز نہیں اور یہ عبارت بحث و تمحیص کے وقت اہل لغت کی فضول باتیں ہیں، اگرچہ کتاب فنا و بقا میں ہم نے بھی بچپنے اور علم کی ناپختگی کی وجہ سے اس انداز سے کچھ لکھا ہے لیکن اس کتاب میں کامل احتیاط سے انشاء اللہ اس کے احکام بیان کریں گے۔ علم طریقت میں فقر وصِفُوَتُ کا فرق یہی ہے جو بیان ہوچکا ہے لیکن صِفُوَتُ اور فقر معاملات دنیا میں دنیا سے علیحدگی اور اس سے خالی ہاتھ ہونے کے لحاظ سے بالکل جداگانہ چیز ہے اور اس کی حقیقت محتاجی اور مفلسی کی طرف رجوع کرتی ہے۔ مشائخ طریقت کا ایک گروہ کہتا ہے کہ فقیر (محتاج) مسکین سے بہتر ہے، اس لیے کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے:

(اَلصَّدَقَاتُ) لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ (ترجمہ: صدقات ان فقراء کا حق ہیں، جو اللہ کی راہ میں روک دیئے گئے ہیں کہ وہ زمین میں کسب معاش کے لیے نقل و حرکت نہیں کرسکتے)۔ اس وجہ سے کہ مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ سامان موجود ہو اور فقیر وہ ہے جو سامان معیشت کو بالکل ترک کردے۔ پس فقر عزت ہے اور مسکنت ذلت اور سامانِ معیشت رکھنے والا طریقت میں ذلیل ہوتا ہے، کیونکہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے:

تَعِسَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ[3] وَ تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ[4] وَ تَعِسَ عَبْدُ الْخَمِیْصَةِ وَ الْقَطِیْفَةِ (ترجمہ: ہلاکت ہو بندۂ دینار کو اور ہلاکت ہو بندۂ درہم کو اور ہلاکت ہو گلیم[5] سیاہ اور پھٹے لباس کے بندہ کو) اور سامانِ معیشت کا تارک عزیز

---

[1] حالت کشف [2] دیدارِ الٰہی کا مقام [3] اشرفی [4] روپیہ [5] گدڑی

ہوتا ہے کیونکہ صاحب سامانِ معیشت کا اعتماد سامانِ معیشت پر ہوتا ہے اور تارکِ سامانِ معیشت کا بھروسا اللہ تعالیٰ پر، اور جب صاحب سامان معیشت کو کوئی کام آپڑتا ہے تو وہ سامانِ معیشت ساتھ لے جاتا ہے۔

ایک گروہ نے کہا ہے کہ مسکین فقیر سے بہتر ہے کیونکہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اَللّٰھُمَّ اَحۡیِنِیۡ مِسۡکِیۡنًا وَ اَمِتۡنِیۡ مِسۡکِیۡنًا وَاحۡشُرۡنِی فِیۡ زُمۡرَۃِ الۡمَسَاکِیۡنَ (ترجمہ: اے اللہ! مجھے زندہ رکھ مسکین اور موت دے مسکین کی حالت میں اور قیامت کے دن مجھے اٹھا مسکینوں کے گروہ میں)۔

حضور ﷺ نے جب مسکین کا ذکر فرمایا تو اپنے لیے مسکینوں کی سی حیات و ممات و حشر[1] کی خواہش کی اور جب فقر کا ذکر کیا تو فرمایا: کَادَ الۡفَقۡرُ اَنۡ یَّکُوۡنَ کُفۡرًا (ترجمہ: قریب ہے کہ فقر کفر ہو جائے)۔ اس معنی کے لحاظ سے فقیر وہ ہے جو اسبابِ معیشت سے تعلق رکھتا ہو اور مسکین وہ ہے جو اسباب سے بالکل تعلق نہ رکھتا ہو اور شریعت میں ایک گروہ کے نزدیک مسکین صاحبِ کفاف[2] اور فقیر بالکل بے سامان ہوتا ہے، جبکہ دوسرے گروہ کے نزدیک فقیر صاحبِ کفاف اور مسکین بے سامان ہوتا ہے۔ پس اہل مقامات مسکین کو صوفی کہتے ہیں اور یہ اختلاف فقہا رحمتہ اللہ علیہ کے اختلاف سے قریب ہے، جن کے نزدیک فقیر مجرد[3] اور مسکین صاحبِ کفاف ہے۔ ان کے نزدیک فقر صِفُوَتُ سے بہتر ہے اور جس کے نزدیک مسکین مجرد اور فقر صاحب کفاف ہے، اس کے نزدیک صِفُوَتُ فقر سے بہتر ہے۔ یہ فقر اور صِفُوَتُ کے متعلق اختصار کے طور پر صوفیاء کے اختلاف ہیں، وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِالصَّوَابِ۔

[1] قیامت کے دن اُٹھنا [2] زادِ توشہ [3] تہی دست
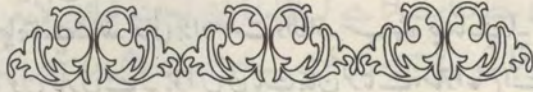
چھٹا باب

ملامت کا بیان

پہلی فصل
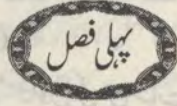
ملامت کی حقیقت

مشائخ طریقت میں سے ایک گروہ نے ملامت کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ملامت کو محبت (الٰہی) کے خالص ہونے میں بڑا اثر اور پورا دخل ہے اور اہل حق تمام عالم میں خلقت کی ملامت سے مخصوص ہیں۔ خصوصاً اس اُمت کے بزرگ اور خود رسول اللہ ﷺ جو اہل حق کے مقتدا، امام اور محبانِ الٰہی کے پیشرو تھے، جب تک برہانِ[1] حق کا آپ پر ظہور نہ ہوا اور وحی الٰہی آپ کو نہ آئی تھی، سب لوگوں کے نزدیک نیک نام، صادق اور امین تھے —— اور جب اللہ تعالیٰ نے خلعت محبوبیت (نبوت) سے آپ کو نوازا تو خلقت نے آپ پر زبانِ ملامت دراز کی۔ ایک گروہ نے کہا کہ وہ (رسول ﷺ) کاہن[2] ہے، ایک گروہ نے کہا کہ وہ شاعر ہے، ایک گروہ نے کہا کہ وہ دیوانہ ہے اور ایک گروہ نے کہا کہ جھوٹا ہے اور ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے ایمان داروں کی صفت میں فرمایا ہے: وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (ترجمہ: وہ ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، عطا کرتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑا وسعت والا اور سب کچھ جانتا ہے)۔

اللہ تعالیٰ کی سنت[3] یوں جاری ہے کہ جو اس کی بات بیان کرتا ہے، سارا عالم اسے ملامت کرنے لگ جاتا ہے اور خدا اس کے دل کو ان کی ملامت میں مشغول ہونے سے محفوظ رکھتا ہے، اور یہ غیرتِ الٰہی ہے کہ اپنے دوستوں کو غیر کی بری نظر سے محفوظ رکھتا ہے تاکہ کسی کی آنکھ ان کے اصلی جمال پر نہ پڑے اور اپنے دوستوں کو خود اپنی رویت (اپنے آپ کو بڑا سمجھنا) سے بھی بچاتا ہے تاکہ وہ خود نہ اپنا جمال دیکھیں، نہ اپنے آپ پر مغرور ہوں اور نہ غرور و تکبر کی خرابی میں پڑیں۔ پس اس لیے خلقت ان پر مقرر ہو جاتی ہے کہ زبانِ ملامت ان پر دراز کریں اور نفس[4] لوامہ کو ان کے اندر ودیعت کر دیا ہے تاکہ جو کچھ وہ کریں اس پر وہ ان کو ملامت کرتا رہے۔ اگر کچھ غلطی کریں تو غلطی پر اپنے آپ کو ملامت کریں اور اگر اچھا کریں تو اس میں کوتاہی پر اپنے آپ کو ملامت کریں اور راہِ حق تعالیٰ میں یہ ایک بڑی قوی اصل ہے، کیونکہ اس طریق میں اس بڑھ کر اور کوئی مہلک آفت نہیں کہ کوئی شخص اپنی ذات میں اوصاف و کمالات دیکھ کر مغرور ہو جائے۔

اصل غرور دو چیزوں سے پیدا ہوتا ہے: اوّل، خلقت کی تعریف اور مدح سے اور وہ یوں ہے کہ بندہ کا فعل مخلوق کو پسند آتا ہے۔ اس پر اس کی مدح و ثنا کرتے ہیں اور وہ اس پر مغرور ہو جاتا ہے یا وہ اپنے اس فعل سے مغرور ہو جاتا ہے جو سب کو پسند ہو اور اپنے آپ کو قابل سمجھتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے یہ راستہ اپنے دوستوں پر بند کر دیا ہے، یہاں تک کہ ان کے معاملات کو اگرچہ وہ نیک ہوں، لوگ پسند نہیں کرتے۔ اس لیے کہ انہوں نے

---

[1] نبوت اور پیغمبری [2] نجومی، جوتشی [3] طریقہ، دستور
[4] ضمیر باطن کی وہ مخفی قوت جو انسان کو ناجائز اور خلاف شریعت فعل کے ارتکاب پر ملامت کرے۔

حقیقت حال کو نہیں دیکھا، اگرچہ ان کی کوششیں راہِ طریقت میں بہت تھیں، مگر اللہ تعالیٰ کے ان دوستوں نے ان کو اپنی طاقت اور قوت سے خیال ہی نہیں کیا اور نہ ان کی وجہ سے اپنے آپ کو پسند کیا یہاں تک کہ فخر و غرور کرنے سے محفوظ رہے۔ پس جو شخص خدا کو پسند ہوتا ہے، مخلوق اسے پسند نہیں کرتی اور جو اپنے نزدیک برگزیدہ بنتا ہے، خدا تعالیٰ اس کو برگزیدہ نہیں کرتا۔ چنانچہ ابلیس کو جنوں نے پسند کیا اور فرشتوں نے بھی قبول کیا اور خود اس نے اپنے کو بھی پسند کیا چونکہ وہ پسندیدۂ حق نہ تھا، اس لیے ان کا پسند کرنا اس کے لیے لعنت کا پھل لایا، لیکن اس کے برعکس حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے پسند نہ کیا اور کہنے لگے: اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا (ترجمہ: کیا زمین میں تو اس کو (خلیفہ) بنائے گا جو اس میں فساد کرے گا؟) اور حضرت آدم علیہ السلام نے خود بھی اپنے آپ کو پسند نہ کیا اور کہا: رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا (ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا) لیکن آدم علیہ السلام پسندیدۂ حق تھے لہٰذا اللہ نے فرمایا: فَنَسِیَ وَلَمۡ نَجِدۡ لَهٗ عَزۡمًا (ترجمہ: وہ بھول گیا اور ہم نے اس کے لیے پختہ ارادہ نہ پایا) اس لیے ان کا اپنے آپ کو پسند نہ کرنا اور ملائکہ کا بھی ان کو پسند نہ کرنا آپ کے لیے رحمت کا پھل لایا تاکہ اہلِ عالم جان لیں کہ ہمارا (اللہ کا) مقبول مخلوق کے ہاں متروک اور مخلوق کا مقبول ہمارے (اللہ کے) ہاں متروک ہوتا ہے۔

اس لیے مخلوق خدا کی ملامت، دوستانِ حق کی علامت ہے کیوں کہ اس میں قبولیت کے آثار[1] ہیں اور اولیاء اللہ رحمہم اللہ کے نزدیک بھی کہ ملامت قرب حق کی علامت ہے اور جس طرح لوگ اپنی مقبولیت پر خوش ہوتے ہیں، اولیاء اللہ مخلوق کے ردّ کرنے پر خوش ہوتے ہیں۔ احادیث میں پیغمبر ﷺ سے مروی ہے اور آپؐ نے جبرئیل علیہ السلام سے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ اَوۡلِیَاءُ فِیۡ تَحۡتَ قَبَائِیۡ لَا یَعۡرِفُهُمۡ غَیۡرِیۡ اِلَّا اَوۡلِیَائِیۡ (ترجمہ: میرے دوست میری قبا کے نیچے ہیں، جن کو میرے اور میرے خاص دوستوں کے سوا کوئی نہیں پہچانتا)۔

دوسری فصل
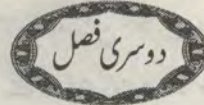
اسبابِ ملامت

اوّل: راست روی
دوم: خلاف ورزی کا ارادہ
سوم: ترکِ شریعت

راست روی پر ملامت کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص راست باز اور دین کی حفاظت اور ملامت شریعت کی رعایت کرتا ہے، لیکن لوگ اس کو پھر ملامت کرتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کی ملامت کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا اور سب سے فارغ (بے فکر) رہتا ہے۔

اور قصدِ خلاف ورزی پر ملامت کی صورت یہ ہے کہ جب کسی کو لوگوں میں بہت بڑا رُتبہ حاصل ہو جائے اور وہ ان لوگوں میں اچھی شہرت کا مالک بن جائے تو پھر اس کا دل رتبے کی رغبت کرے اور اس کی طبیعت لوگوں میں لگ جائے۔ بس خود وہ یہ چاہے کہ اپنے دل کو اُن سے بے تعلق کر دے اور خدا کی طرف مشغول ہو جائے تو وہ خواہ مخواہ ایسا کام کرے جو شریعت کے خلاف تو نہ ہو لیکن لوگ اس سے نفرت کریں اور اس پر ملامت کا راستہ اختیار کریں۔ یہ اس کی طرف سے لوگوں میں قصد ملامت کا راستہ ہے، جس کے باعث لوگ اس سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

[1] نشانیاں

اور ترک (متابعتِ شریعت) پر ملامت کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص کو طبعاً کفر و ضلالت[1] پسند آجائے اور اسی کی خاطر وہ شریعت اور اس کی متابعت ترک کر دے اور یوں کہے کہ یہ تو ملامت کا ایک طریقہ ہے جس کو میں نے اختیار کیا ہے اور یہ بھی اس کی طرف سے اپنے حق میں ملامت کا طریق ہے لیکن وہ شخص جس کا طریق دین میں راست روی کرنا، منافقت نہ کرنا اور ریاکاری کو ترک کرنا ہو، اسے لوگوں کی ملامت کا کوئی خوف نہیں۔ وہ سب حالات میں اپنے قاعدے پر ہوتا ہے لہٰذا اچھے برے جس نام سے بھی اسے پکاریں، اس کے لیے سب یکساں ہیں۔

حکایات میں میں نے دیکھا ہے کہ شیخ ابو طاہر حرمی رحمۃ اللہ علیہ ایک روز گدھے پر سوار بازار میں جا رہے تھے اور ایک مرید نے آپ کے گدھے کی باگ پکڑ رکھی تھی۔ ایک شخص نے آواز دی کہ "یہ بے دین پیر آیا ہے۔" اس نے جب یہ بات سنی تو غیرتِ ارادت کی وجہ سے اس شخص کو مارنے کا ارادہ کیا جس سے اہل بازار سب جھنجھلائے۔ شیخ نے مرید سے کہا کہ "اگر تو خاموش رہے اور اپنے ارادے سے باز آجائے تو میں تجھے ایک ایسی بات سکھاؤں گا کہ تو اُن کی تکلیف سے نجات پائے گا۔" مرید خاموش ہوگیا۔ جب اپنی جگہ پر پہنچے تو مرید سے کہا کہ "وہ صندوق اُٹھالا۔" وہ اُٹھا لایا۔ اس صندوق میں خطوط تھے۔ خطوں کی دراز باہر نکالی اور اس کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ "دیکھ ہر ایک شخص کی طرف سے میری طرف خطوط ہیں، جو انہوں نے میری طرف بھیجے ہیں۔ ایک نے مجھ سے شیخ السلام کے لقب سے خطاب کیا ہے اور ایک نے شیخ زکی اور ایک نے شیخ الحرمین کے نام سے اور یہ سب میرے القاب ہیں، نام نہیں۔ میں ان میں سے کسی ایک کے لائق بھی نہیں ہوں۔ ہر ایک نے اپنے اعتقاد کے مطابق میرا ایک لقب مقرر کیا ہے، اگر اس بیچارے نے بھی اپنے اعتقاد کے مطابق کوئی بات کہی اور میرا لقب مقرر کیا، تو تو نے اس پر یہ سب جھگڑا کیوں اٹھایا؟" لیکن جس شخص کا طریقہ یہ ہو کہ وہ ملامت کو قصداً اختیار کرے اور اپنی عزت و توقیر کو چھوڑ کر لوگوں کو خواہ مخواہ اپنے سے بیزار کرے، وہ یوں ہے کہ روایت کرتے ہیں کہ "امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ایک دن خلافت کے زمانے میں اپنے کھجوروں کے باغ سے آرہے تھے اور ایندھن کا گٹھا سر پر رکھا تھا، حالانکہ آپ کے چار سو غلام تھے۔ لوگوں نے پوچھا: "اے امیر المؤمنین! یہ کیا حال ہے؟" تو آپ نے فرمایا: اُرِیْدُ اَنْ اُجَرِّبَ نَفْسِیْ (ترجمہ: میں اپنے نفس کو آزمانا چاہتا ہوں) یعنی میرے پاس غلام تو ہیں جو یہ کام کر سکتے ہیں، لیکن میں اپنے نفس کا تجربہ کرنا چاہتا ہوں کہ خلقت کے نزدیک میرا مرتبہ اس کو کسی کام کے خود کرنے سے روک نہ سکے۔ یہ حکایت ملامت کے ثابت کرنے میں بالکل واضح ہے اور اسی سلسلے میں ایک حکایت حضرت امام ابی حنیفہ کوفی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کرتے ہیں اور اس کتاب میں جہاں آپ کا ذکر آیا ہے، وہاں اس حکایت کی تلاش کرنی چاہیے۔

بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ آپ سفر حجاز سے ایک شہر میں واپس آرہے تھے کہ شور و غل ہوا کہ بایزید تشریف لائے ہیں۔ شہر کے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بڑی عزت و احترام سے آپ کو شہر میں لائے، جس کی وجہ سے آپ ان لوگوں کی رعایت میں مشغول ہوگئے اور ان کی توجہ حق تعالیٰ سے ہٹ گئی اور پریشان ہوگئے۔ چنانچہ آپ بازار میں تشریف لائے اور ایک روٹی آستین سے نکالی اور کھانے لگے۔ اس پر سب لوگ آپ کے پاس سے ہٹ گئے اور آپ کو تنہا چھوڑ گئے۔ یہ واقعہ رمضان کا تھا اور آپ مسافر تھے۔ جو مرید آپ کے ہمراہ تھا، اس سے کہنے لگے کہ "تو نے دیکھا کہ ان کے نزدیک مسئلہ شریعت پر میں نے عمل نہیں کیا تو سب لوگ

[1] حق چھپانے کو کفر اور راہِ حق سے بھٹک جانے کو ضلالت کہتے ہیں۔

مجھے آزاد چھوڑ گئے"۔

میں علی بن عثمان جلابی کہتا ہوں کہ زمانے میں ملامت کے لیے ایسا فعل درکار تھا جو قابل نفرت اور بظاہر خلافِ عادت ہو۔ اب اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ لوگ اسے ملامت کریں تو اسے کہہ دو کہ جا کر دو رکعت نماز نفل لمبی ادا کرے یا دین پر پورے طور پر عمل کرے۔ سب لوگ یک لخت اسے منافق اور ریاکار کہیں گے لیکن وہ شخص جس کا طریق (حصول ملامت کے لیے) ترک شریعت ہو اور وہ شریعت کے خلاف کوئی امر اختیار کرے اور یوں کہے کہ میں یہ ملامت کا طریق اختیار کرتا ہوں تو اس کا یہ کام صریح گمراہی، بڑی خرابی اور ہوس دُنیا ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ ان کا مقصود لوگوں کی بے توجہی کی وجہ سے ان میں مقبول ہونا ہے، کیونکہ لوگوں کے رڈ ہو جانے کے لیے پہلے ضروری ہے کہ کوئی شخص لوگوں میں مقبول ہو تا کہ ان کے رڈ و انکار کا قصد کرے اور ایسا فعل عمل میں لائے کہ وہ اس کو رڈ کریں۔ بس غیر مقبول شخص کو رڈ کا تکلف کرنا اپنی قبولیت کے واسطے برا بہانہ ہوتا ہے۔

مجھے ایک دفعہ ان جھوٹے مدعیوں میں سے ایک کے ساتھ صحبت کا اتفاق ہوا۔ ایک دن اس نے خراب کام کیا اور اس کا عذر "ملامت" پیش کیا۔ ایک شخص نے اس سے کہا کہ یہ کچھ نہیں۔ میں نے اسے دیکھا کہ اس نے غصہ کیا۔ میں نے کہا: "اے زاہد! اگر تو ملامت کا دعویٰ کرتا ہے اور اس دعویٰ میں تو صحیح ہے تو اس جوان کا تیرے فعل سے انکار کرنا تیرے مذہب کی تاکید ہے (تو ملامت چاہتا تھا، اس نے ملامت کر دی) اور جب وہ اس طریق میں تیرے موافق ہے تو یہ جھگڑا کیسا؟ اور یہ غصہ کس لئے؟ تیرا یہ قصد ملامت کی نسبت دعوت سے زیادہ مشابہ ہے اور جو شخص لوگوں کو امر حق کی دعوت کرے، اس کے لئے قطعی دلیل کی ضرورت ہے اور اس کی قطعی دلیل سنت نبوی ﷺ کی حفاظت ہے اور جب میں دیکھتا ہوں کہ علانیہ ایک فریضہ ترک کر رہا ہے اور لوگوں کو اس کی دعوت دے رہا ہے تو تیرا یہ کام خلافِ اسلام ہے۔"

تیسری فصل
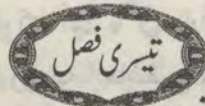
شیخ ابو حمدان رحمتہ اللہ علیہ کی ملامت کی حقیقت

جان لو کہ طریقت میں ملامت کو اپنے زمانے کے شیخ ابو حمدان قصاب رحمتہ اللہ علیہ نے رواج دیا ہے۔ ملامت کی حقیقت میں ان کے بہت سے عمدہ اقوال ہیں۔ لوگ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ہے: اَلْمَلَامَةُ تَرْكُ السَّلَامَةِ (ترجمہ: ملامت سلامتی کو ترک کرنا ہے) اور جب کوئی شخص اپنی سلامتی کو ترک کر دے اور مصائب کے لئے کمربستہ ہو جائے اور جلالِ الٰہی کے ظہور اور نیک انجام طلب کرنے کی اُمید پر اپنی دلچسپیوں اور راحتوں سے بیزاری اختیار کرے، یہاں تک کہ لوگوں کے رڈ و انکار کی وجہ سے لوگوں سے نا اُمید ہو جائے تب اس کی طبیعت ان لوگوں سے اُلفت و محبت قطع کر لیتی ہے اور وہ جتنا ان لوگوں سے قطع تعلق کرتا ہے، اتنا ہی حق تعالیٰ سے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ پس جس چیز کی طرف سب لوگوں کی توجہ ہوتی ہے اور اس میں ان کی سلامتی ہوتی ہے تو اہلِ ملامت اس چیز کی طرف سے پیٹھ موڑ لیتے ہیں۔ وہ اس سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں تا کہ اہل ملامت کا غم لوگوں کے غم کے خلاف اور ان کا قصد لوگوں کے مقاصد کے برعکس ہو۔ وہ اپنے اوصاف میں یکتا اور بے مثل ہوتے ہیں، جیسا کہ احمد بن ناتک رحمتہ اللہ علیہ حسین بن منصور رحمتہ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے ان سے پوچھا: مَنِ الصُّوْفِیُّ قَالَ وُحْدًا فِی الذَّاتِ (ترجمہ: صوفی کون ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: جو اپنی ذات میں یکتا ہو)۔

نیز ابو حمدان رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے ملامت کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ اس کا راستہ لوگوں پر دشوار اور مشکل ہے لیکن ہم کسی قدر اس کے متعلق بیان کرتے ہیں۔ رجاءُ المرجیّة[1] و خوف القدریّة[2] (ترجمہ: وہ ملامت فرقہ مرجیہ کی اُمید اور فرقہ قدریہ کا خوف ہے) یعنی فرقہ مرجیہ کی طرح بعض اُمورِ شریعت کی خلاف ورزی کے باوجود مغفرت کی اُمید رکھنا اور فرقہ قدریہ کی طرح عمل میں کوتاہی کی وجہ سے مغفرت کے متعلق ڈرتے رہنا، ملامتی صوفیوں کی صفت ہے اور اس میں ایک رمز ہے۔ وہ یہ کہ طبیعت (انسانی) درگاہِ الٰہی سے اس سے زیادہ کسی اور چیز کے سبب سے نفرت کرنے والی نہیں ہوئی جتنی کہ لوگوں کے نزدیک مرتبہ حاصل ہونے کی وجہ سے، اور انسان کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ کوئی اس کی تعریف کردے تو وہ اس کو دل و جان سے پسند کرے اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے دُور ہو جائے۔ پس ڈرنے والا ہمیشہ کوشش کرتا رہتا ہے کہ وہ خطرے کے محل سے دُور رہے اور اس کوشش میں طالب کو دو خطرے پیش آتے ہیں: ایک لوگوں کے حجاب کا خوف اور دوسرے اس فعل کا روکنا جس کی وجہ سے انہوں نے اسے گنہگار سمجھا اور اس پر ملامت کی۔ یہ نہ تو ان کے نزدیک مرتبہ حاصل کر کے آرام پانا ہے، نہ اس بات کا سامان ہے کہ ان کو اپنی ملامت سے گنہگار ٹھہرائے۔

پس ملامتی کے لئے چاہیے کہ پہلے اس امر کے متعلق جو لوگ اسے کہیں، دنیا و آخرت کا جھگڑا لوگوں سے منقطع کر دے بلکہ دل کی نجات کے لئے ایسا کام کرے جو شریعت میں نہ کبیرہ[3] ہو نہ صغیرہ[4] کہ لوگ اس کو ردّ کریں۔ یہاں تک کہ اس کا خوف معاملاتِ شریعت میں قدریوں کے خوف کی طرح اور ملامت کرنے والوں کے معاملے میں اس کی بخشش کی اُمید مرجیوں کی اُمید کی طرح ہو، اور حقیقت میں کسی چیز کی محبت ملامت سے بہتر نہیں ہوتی، اس لئے کہ دوست کی ملامت کا دوست کے دل پر اثر نہیں ہوتا اور دوست کا دوست کے کوچے کے سوا کہیں گزر نہیں ہوتا اور اغیار کا دوست کے دل میں خیال تک نہیں آتا، جیسے ایک عاشق صادق اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں: اجد الملامة فی هواك لذيذةً لانَّ الملامة روضة العاشقين و نذهة المحبين و راحة المشتاقين و سرور المريدين (ترجمہ: میں ملامت کو تیری محبت میں لذیذ محسوس کرتا ہوں، کیونکہ ملامت عاشقانِ الٰہی کا باغ، دوستانِ حق کی سیرگاہ، مشتاقانِ خدا کی راحت اور طالبان حق کی خوشی ہے)۔

دونوں عالم (جن و انس) میں صرف یہی ایک گروہ دل کی سلامتی کے لئے اپنے بدن کی ملامت اختیار کرنے سے مخصوص ہے اور مقرب و کروبی و رُوحانی لوگوں (فرشتوں) میں سے کسی کو یہ درجہ حاصل نہیں اور اس اُمت میں صوفیوں کے گروہ کے سوا جو دنیا سے قطع تعلق کے طریق پر چلتے ہیں۔ پہلی اُمتوں سے بھی جو زاہد و عابد و راغب و طالب حق ہوئے ہیں، وہ اس مرتبے کو نہیں پہنچے لیکن میرے نزدیک ملامت کی طلب عین ریا ہے اور ریا عین منافقت، کیوں کہ ریاکار بے تکلف ایسے راستہ پر چلتا ہے کہ لوگ اس کو قبول کریں اور ملامتی (صوفی) تکلف سے ایسی راہ پر چلتا ہے کہ لوگ اس کا ردّ و انکار کریں اور دونوں گروہ خلقت میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں اور اس سے باہر نہیں جاتے یہاں تک کہ

---

[1] جو لوگ عمل کئے بغیر اللہ تعالیٰ کی بخشش کی امید رکھتے ہیں انہیں فرقہ مرجیہ کہتے ہیں۔

[2] جو لوگ عمل ہی کو ذریعہ نجات سمجھتے ہیں اور مقدرات الٰہیہ سے انکار کرتے ہیں انہیں فرقہ قدریہ کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک جو لوگ انسان کو فاعل مختار سمجھتے ہیں اور تقدیر کا انکار کرتے ہیں، انہیں قدریہ کہتے ہیں۔

[3] وہ گناہ جو باقاعدہ توبہ کئے بغیر معاف نہیں ہو سکتا اُسے گناہ کبیرہ کہتے ہیں، جیسے زنا، چوری، فریب اور خیانت وغیرہ۔

[4] وہ گناہ جو نیکی کی بدولت بھی معاف ہو سکتا ہے، وہ گناہِ صغیرہ ہے۔

ایک گروہ (ریاکار) نے یہ عمل اختیار کیا ہے اور دوسرے گروہ (ملامتی صوفی) نے وہ عمل۔ حقیقی درویش کے دل میں تو لوگوں کی بات تک نہیں گزرتی، چونکہ اس کا دل لوگوں سے قطع تعلق کیے ہوتا ہے، اس لئے وہ اس بات سے فارغ ہوتا ہے اور کوئی چیز اس کو پابند نہیں کر سکتی۔

ایک مرتبہ مجھے ماوراء النہر کے ایک ملامتی سے صحبت کا اتفاق ہوا۔ جب صحبت سے خوش ہوا تو میں نے کہا: "اے بھائی! ان مکروہ افعال سے تیری کیا مراد ہے؟" اس نے جواب دیا کہ "لوگوں کو اپنی ذات میں فنا کر دینا۔" میں نے کہا: "خلقت تو بے شمار ہے اور تو وہ عمر، زمانہ اور درجہ حاصل نہیں کر سکے گا کہ لوگوں کو اپنے حال میں فنا کر دے، اس لئے تو اپنے آپ کو مخلوق میں فنا کر دے تاکہ اس گورکھ دھندے سے رہائی پائے۔" ایک گروہ وہ ہے کہ وہ خلقت میں مشغول ہوتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ خلقت ان میں مشغول ہے۔ پس کوئی شخص تجھے نہیں دیکھتا، تو اپنے آپ کو نہ دیکھ۔ جب تیری خرابی خود تیری آنکھ سے ہے تو تجھے غیر سے کیا کام؟ جسے شفا پرہیز سے طلب کرنی چاہیے مگر وہ دوا سے طلب کرتا ہے، وہ دانش مند نہیں اور ایک گروہ کسر نفس کے لئے اپنے نفس کو ملامتی بنا لیتا ہے، تاوقتیکہ لوگوں کے سامنے ذلت کی وجہ سے اس کا نفس مؤدب ہو جائے اور وہ اپنے نفس سے اپنا انصاف حاصل کرے کیونکہ ان کے نزدیک بہت اچھا وقت وہ ہوتا ہے کہ اپنے نفس کو ذلت اور مصیبت میں دیکھیں۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمتہ اللہ علیہ کی نسبت حکایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے آپ سے پوچھا کہ کیا کبھی آپ کو اپنی مراد بھی حاصل ہوئی؟ تو آپ نے فرمایا: "ہاں! دو دفعہ۔ ایک دفعہ تو میں کشتی میں تھا اور کوئی وہاں مجھے پہچانتا نہ تھا۔ میرا لباس پھٹی گدڑی تھی اور بال لمبے اور ایسی حالت تھی کہ کشتی والے سب مجھ پر ہنسی اور افسوس کرتے تھے۔ کشتی میں ہمارے ساتھ ایک شخص مسخرا تھا جو بار بار آتا اور میرے سر کے بال کھینچتا اور تمسخر کے طور پر مجھے ذلیل کرتا تھا اور میں اپنے آپ کو اس وقت بامراد محسوس کرتا اور اپنے نفس کی ذلت پر خوش ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ وہ خوشی انتہا کو پہنچ گئی۔ سبب یہ تھا کہ وہ مسخرا اُٹھا اور اس نے مجھ پر پیشاب کر دیا۔ دوسری مرتبہ سخت بارش میں میں ایک گاؤں میں پہنچا اور موسم کی سردی مجھ پر غالب ہو رہی تھی۔ میرے بدن کی گدڑی تر ہو رہی تھی۔ میں ایک مسجد میں چلا گیا۔ لوگوں نے مجھے وہاں نہ رہنے دیا، پھر دوسری اور تیسری مسجد میں گیا۔ وہاں بھی نہ رہنے دیا اور میں عاجز ہو گیا۔ سردی نے میرے دل پر غلبہ کیا تو میں حمام کی بھٹی میں گھس گیا اور اپنا دامن اس آگ پر تان دیا کہ اس کا دھواں نیچے سے ہو کر اوپر نکل آیا، میرا کپڑا اور منہ سیاہ ہو گیا۔ اس رات بھی میں اپنی مراد کو پہنچا۔"

خود مجھے (علی بن عثمان جلابی) کو ایک دفعہ ایک واقعہ پیش آیا تھا اور میں نے اس کے لئے اس اُمید پر بہت کوشش کی کہ وہ حل ہو جائے، مگر وہ حل نہ ہوا اور اس سے پہلے بھی مجھے اسی قسم کا مسئلہ پیش آیا تھا جس کے لئے میں شیخ بایزید رحمتہ اللہ علیہ کی قبر پر جا کر مجاور ہوا، تب وہ مسئلہ حل ہوا۔ اس دفعہ بھی میں نے وہاں کا قصد کیا اور تین مرتبہ آپ کی تربت پر جا کر مجاور ہوا کہ وہ حل ہو جائے، مگر حل نہ ہوا اور میں ہر روز تین دفعہ غسل اور تیس بار وضو کرتا تھا۔ اس امید پر کہ وہ مسئلہ حل ہو جائے لیکن وہ حل نہ ہوا اور میں وہاں سے اُٹھا اور سفر خراسان کا قصد کیا۔ دوران سفر ایک رات میں کمس نامی ایک گاؤں میں پہنچا جہاں ایک خانقاہ تھی۔ اس میں صوفی نما لوگوں کی ایک جماعت تھی۔ مجھ پر کھردری بوسیدہ گدڑی تھی اور اہل رسم (صوفیوں) کے سامان میں سے سوائے لاٹھی اور ٹاٹ کے میرے پاس کچھ نہ تھا۔ اس جماعت کی نگاہ میں میں سخت حقیر معلوم ہوا۔ کسی نے مجھے نہ پہچانا۔ وہ آپس میں رسم کے طور پر کہتے تھے کہ یہ شخص

ہماری جنس کا نہیں اور حق بات وہی تھی جو کہہ رہے تھے کہ میں ان کی جنس میں سے نہ تھا، لیکن اس رات مجھے وہاں مجبوراً رہنا تھا۔ مجھے تو انہوں نے ایک بالاخانے پر بٹھادیا اور خود مجھ سے اوپر والے بالاخانے پر چڑھ گئے۔ میں فرش پر بیٹھا تھا۔ انہوں نے سوکھی باسی سبز (پھپھوندی لگی ہوئی) روٹی میرے آگے رکھی اور جو کھانا وہ کھارہے تھے، اس کی خوشبو مجھے آرہی تھی اور وہ بالاخانے پر سے میرے ساتھ طنز آمیز باتیں کررہے تھے۔ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو اپنی خوشی طبعی اور میری حقارت کے لئے خربوزہ کھاکر اس کے چھلکے مجھ پر پھینکتے جاتے تھے اور میں دل میں کہتا تھا کہ بارِ خدایا! اگر یہ بات نہ ہوتی کہ وہ تیرے دوستوں کا لباس رکھتے ہیں، تو میں کبھی ان سے یہ ذلت نہ برداشت کرتا اور جس قدر ان کا طعنہ مجھ پر زیادہ ہوتا تھا، میں دل میں اس پر خوش ہوتا تھا یہاں تک کہ اس ذلت کا بار اُٹھانے سے وہ مشکل مسئلہ مجھ پر حل ہوگیا اور اسی وقت مجھے معلوم ہوگیا کہ مشائخ طریقت نے جاہلوں کو کیوں اپنے اندر گھسنے دیا اور کس لئے اُن کی ذلت کا بار اٹھاتے ہیں۔ پس ملامت کا احکام جن کو میں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی توفیق سے پوری تحقیق کے ساتھ دریافت کرکے بیان کیا، وہ یہی تھے۔
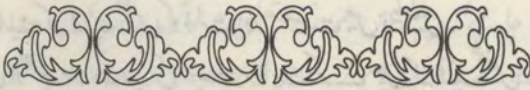
ساتواں باب

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے صوفیا کے امام

اب ہم صحابہ رضی اللہ عنہم سابقین اوّلین مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم میں سے ان اماموں کے بعض حالات بیان کرتے ہیں، جو انبیاء علیہم السلام کے بعد معاملات میں ان اہل تصوف کے پیش رو، انفاس میں ان کے پیشوا اور احوال میں اُن کے رہنما ہوئے ہیں تاکہ اگر اللہ کو منظور ہو تو تمہاری مراد کے ثابت کرنے کے لئے تاکید ہو جائے۔

پہلی فصل
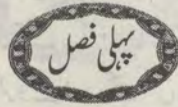
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

صحابہ رضوان اللہ علیہم میں سے اسلام کے شیخ، انبیاء علیہم السلام کے بعد بہترین خلق، رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ اول، مسلمانوں کے امام، اہلِ تجرید کے سردار، اربابِ تفرید کے بادشاہ، انسانی آفتوں سے دُور، امیر المومنین حضرت ابوبکر عبداللہ بن عثمان الصدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ جن کی کرامتیں مشہور اور معاملاتِ دین و حقائق شریعت میں خوراق اور دلیلیں واضح ہیں۔ تصوف کے بارے میں آپ کے کچھ حالات بیان کیے جاتے ہیں اور مشائخ طریقت آپ کی روایت و حکایت کے کم ہونے کی وجہ سے آپ کو اربابِ مشاہدہ کے سردار اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دین کے معاملات میں ان کی سختی اور شدت کی وجہ سے اہل مجاہدہ کے پیشوا مانتے ہیں۔

صحیح احادیث میں لکھا ہے اور اہل علم کے درمیان مشہور ہے کہ رات کے وقت جب حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نماز پڑھتے تو قرآن آہستہ پڑھتے اور حضرت عمرؓ بلند آواز سے پڑھتے۔ رسول ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم آہستہ کیوں پڑھتے ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ اسمع من اناجیه (ترجمہ: میں اس ذات کو سناتا ہوں جس سے میں راز کی بات کہہ سکتا ہوں) اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے غائب نہیں اور اس کی شنوائی کے نزدیک آہستہ اور زور سے بولنا دونوں برابر ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جب حضور ﷺ نے پوچھا تو انہوں نے عرض کیا کہ اوقظ الوستان اے النائم و اطرد الشیطان (ترجمہ: میں سوتے کو جگاتا ہوں اور شیطان کو ہٹاتا ہوں)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ بات آپ کے مجاہدے کا پتہ دیتی ہے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وہ بات ان کے مشاہدے کی خبر دیتی ہے اور مقام مجاہدہ مقام مشاہدہ کے مقابلے میں سمندر کے مقابلے میں ایک قطرہ کی حیثیت رکھتا ہے اور حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: هل انت الاحسنة من ابی بکر رضی اللّٰه عنه (ترجمہ: تیری حیثیت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نیکیوں کے مقابلے میں ایک نیکی اتنی ہے)۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حیثیت جن سے اسلام کی عزت ہے، حضرت ابوبکرؓ کی نیکیوں کے مقابلے میں ایک نیکی سے زیادہ نہیں تو غور کرو کہ اہل عالم کی آپ کے مقابلے میں کیا حقیقت ہے۔

آپ کی نسبت یہ مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: دارنا فانية واحوالنا عارية وانفا سنا معدودَة و کَسَلُنا موجودَةٌ (ترجمہ: ہمارے گھر فنا پذیر ہے اور ہمارے سب حالات مستعار[1] ہیں اور ہماری سانسیں گنتی کی اور ہماری

[1] عارضی، ناپائیدار

سستی (دین میں) موجود ہے)۔ پس فانی گھر کی آبادی جہالت ہے اور عارضی حال پر اعتماد کرنا بے وقوفی اور گنتی کی چند سانسوں پر دل لگانا غفلت اور دین میں سستی کو دین کہنا خسارا ہے کیونکہ جو چیز مستعار ہے، وہ واپس ہو جائے گی اور جو چیز گزرنے والی ہے، نہیں رہے گی اور جو گنتی میں آسکتی ہے، وہ ختم ہو جائے گی اور کاہلی کا کوئی علاج نہیں۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ہمیں بتادیا ہے کہ دنیا کی چیزیں ایسی نہیں ہیں کہ ان میں دل لگایا جائے کیوں کہ جب تو فانی چیز میں مشغول ہوگا تو باقی کی طرف سے حجاب میں جائے گا، چونکہ نفس اور دنیا طالب کے لئے حق تعالیٰ سے حجاب کا باعث ہیں، اس لئے اولیاء اللہ نے ان دونوں سے اعراض کیا ہے اور جب انہوں نے جان لیا کہ یہ سب مانگی ہوئی چیزیں ہیں اور مانگی ہوئی چیز دوسروں کی ملک ہوتی ہیں تو دوسروں کی ملک میں تصرف کرنے سے ہاتھ اُٹھالیا۔

نیز آپ کی نسبت روایت کرتے ہیں کہ آپ نے مناجات میں فرمایا: اللّٰھم ابسط لی الدنیا و زاھدنی عنھا۔ (ترجمہ: اے اللہ! میرے لئے دنیا فراخ کردے اور مجھے اس سے زاہد بنادے)۔ پہلے تو آپ نے فرمایا کہ دنیا مجھ پر فراخ کردے، پھر فرمایا کہ مجھے اس کی آفت سے محفوظ رکھ۔ اس میں ایک رمز ہے، وہ یہ کہ پہلے مجھے دنیا عطا فرما تاکہ اس کا شکریہ ادا کروں، پھر اس بات کی توفیق بخش کہ محض تیری خوشنودی کیلئے اس سے دستبردار ہو جاؤں اور رُوگردانی کروں تاکہ شکر اور فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا درجہ بھی حاصل کروں اور مقام صبر میں مجبور اور ناچار نہ ہوں بلکہ فقر مجھے باختیار خود حاصل ہو۔ آپ کا یہ قول اس دنیادار پیر کارڈ ہے، جس نے یہ کہا کہ جس کا فقر مجبوری سے ہے، وہ اس سے بہتر ہے جس نے اپنی مرضی سے فقر اختیار کیا، کیونکہ اگر فقر مجبوری سے ہے تو وہ شخص اس کا معمول ہے، اگر اختیار سے ہے تو فقر اس کا معمول ہے۔

پہلی صورت میں فقر ذاتی ہے اور دوسری صورت میں عارضی اور چونکہ پہلی صورت میں اس کے کسب و فعل کو فقر کے حاصل کرنے سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے وہ شخص اس سے بہتر ہے جو تکلف سے اپنے لئے فقر میں درجہ پیدا کرتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ فقر کا عمل اس وقت ظاہر ہوتا ہے کہ حالت غنا میں فقر کا ارادہ اس کے دل پر غالب ہو جائے اور اس شخص میں اتنا عمل کرے (اثر انداز ہو) کہ اسے آدم علیہ السلام اور اس کی اولاد کی محبوب چیز یعنی دنیا سے الگ تھلگ کردے، نہ اس وقت کہ فقر کی حالت میں دولت مندی کی خواہش اس کے دل پر غالب ہو کر اس قدر اس میں عمل و دخل کرے کہ اس کو درہم و دینار کے لئے ظالموں اور بادشاہوں کی درگاہ میں جانا پڑے۔ درحقیقت فقر کا عمل یہ ہے کہ وہ فنا چھوڑ کر فقر کو اختیار کرے، نہ یہ کہ فقر میں سرداری اور دنیا کی عزت و ثروت کی طلب کرے۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو انبیاء کرام صلوات اللہ علیہم اجمعین کے بعد سب مخلوق سے بلند مرتبہ ہیں، اختیاری فقر کو اضطراری اور جبری فقر پر ترجیح دیتے ہیں۔ پس یہ جائز نہیں کہ کوئی ان کا مقابلہ کرے۔ لہٰذا اس دنیادار پیر کا یہ قول کہ اضطراری فقر اختیاری فقر سے بہتر ہے، حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے اس فعل کے صریح منافی ہے اور جمہور مشائخ کا یہی مسلک ہے۔

امام زہری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب لوگوں نے آپ سے خلافت کی بیعت کی تو آپ نے منبر پر چڑھ کر خطبہ دیا اور اثناء خطبہ میں فرمایا: وَاللّٰہ ماکنت حریصاً علی الامارۃِ یومًا ولا لیلۃ ولا کنت فیھا راغباً ولا سئلتھا اللّٰہ قط سترا و علانیۃ ولا بی فی المّارۃ من راحۃ (ترجمہ: قسم اللہ کی میں نے تو نہ کسی دن اور نہ کسی رات خلافت کی حرص کی اور نہ مجھے اس کی خواہش تھی اور نہ میں نے کبھی اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ اور ظاہر

اس کی درخواست کی اور نہ مجھے خلافت میں کوئی خوشی ہے)۔ جب خدا تعالیٰ بندے کو کمالِ صدق پر پہنچا دیتا اور عزت کے مقام پر معزز و متمکن کر دیتا ہے تو وہ امر الٰہی کے وارد ہونے کا منتظر رہتا ہے کہ وہ امر کس طور پر آتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے مطابق ہو جاتا ہے اور اگر حکم آتا ہے کہ وہ فقیر ہو جائے تو فقیر ہو جاتا ہے۔ اگر حکم ہوتا ہے کہ امیر ہو جائے تو امیر ہو جاتا ہے۔ اس میں اپنی طرف سے کوئی تصرف نہیں کرتا۔ جیسا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ابتدا سے انتہا تک سوائے تعلیم امرِ حق کے، کوئی دوسری راہ اختیار نہیں کی، کیونکہ وہ تمام مسلمانوں کے عموماً اور اہل طریقت کے خصوصاً دینی امام اور پیشوا ہیں۔

دوسری فصل
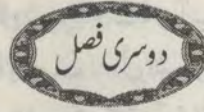
حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

آپ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے اہل ایمان کے سرلشکر، اہلِ احسان کے مقتدا، اہل تحقیق کے امام اور دریائے محبت الٰہی کے شناور حضرت ابوحفص عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہیں، جن کی کرامتیں مشہور اور دین میں دور رسی کی باتیں عام طور پر لوگوں میں مزکور ہیں اور وہ دینی امور میں دانش مندی اور سخت پابندی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ طریقت میں آپ کے نہایت لطیف اقوال اور باریک رموز ہیں۔ آپ ہی کے متعلق پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اَلْحَقُّ یَنْطِقُ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ (ترجمہ: حق تعالیٰ عمر کی زبان پر کلام کرتا ہے)۔ نیز آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: قَدْ کَانَ فِی الْاُمَمِ مُحَدَّثُوْنَ[1] فَاِنْ یَّکُ مِنْھُمْ فِیْ اُمَّتِیْ فَعُمَرُ (ترجمہ: پہلی اُمتوں میں محدث ہوئے اور اگر میری امت میں کوئی محدث ہے تو وہ عمر (رضی اللہ عنہ) ہیں) طریقت میں آپ کے بے شمار لطیف رموز ہیں، جن سب کو ہم اس کتاب میں شمار نہیں کر سکتے۔

روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: اَلْعُزْلَۃُ رَاحَۃٌ مِّنْ خُلَطَاءِ السُّوْءِ (ترجمہ: تنہائی برے ہم نشینوں سے راحت ہے) اور عزلت دو قسم کی ہوتی ہے:

اوّل: لوگوں سے اعراض کرنا

دوم: ان سے قطع تعلق کر لینا

لوگوں سے اعراض کرنے کا مطلب خالی جگہ اختیار کرنا، ہم جنسوں کی صحبت سے کنارہ کش ہونا، اپنے اعمال کی خرابیوں کے دیکھنے سے آرام پانا، لوگوں کے میل جول سے خلاصی طلب کرنا اور مخلوق خدا کو اپنی برائی سے محفوظ رکھنا ہے۔ لوگوں سے قطع تعلق دل سے ہوتا ہے اور دل کی صفت (کیفیت) کو بظاہر مخلوقات کی کسی چیز سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، حتیٰ کہ اس کا خیال اس کے دل میں غلبہ پائے۔ پس اس وقت وہ شخص اگرچہ بظاہر لوگوں کے درمیان ہی ہوتا ہے، مگر باطن میں ان سے الگ ہوتا ہے اور اس کا ارادہ ان سے بالکل علیحدہ۔ یہ مقام بہت بلند اور اونچا ہے اور دل کی یہ کیفیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں نسبتاً زیادہ صحیح اور درست پائی جاتی تھی، جنہوں نے تنہائی کو راحت فرمایا۔ حالانکہ آپ بظاہر لوگوں کے درمیان امارت اور خلافت کے فرائض کی بجا آوری میں مشغول رہا کرتے تھے اور یہ واضح دلیل ہے کہ

[1] محدث کے لفظی معنی حدیث بیان کرنے والے کے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں محدث وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ تجدید اور احیائے دین کے لئے مامور فرمائے۔ حضور اکرم ﷺ کی ایک حدیث کی رُو سے ہر صدی کے آغاز پر اللہ تعالیٰ اپنے دین کی تجدید و احیاء کے لئے اپنے کسی پاک بندے کو مامور فرماتا ہے۔

اہل باطن گو بظاہر مخلوق سے ملے جلے رہتے ہیں مگران کا دل حق تعالیٰ سے لگا رہتا ہے اور تمام حالات میں اسی کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور جتنا میل جول وہ لوگوں سے رکھتے ہیں، اسے وہ حق تعالیٰ کی طرف سے اپنے لئے ایک آفت سمجھتے ہیں اور اس سے اللہ تعالیٰ کی طرف بھاگتے ہیں، غرضیکہ دنیا دوستانِ حق کو کبھی مصفا معلوم نہیں ہوتی اور نہ اس کے حالات ان کے لیے خوشگوار ہوتے ہیں۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: دَارٌ اُسِّسَتْ عَلَى الْبُلُوٰی بِلَا بلُوٰی مُحَالٌ۔ (ترجمہ: جس مکان کی بنیاد مصیبت پر رکھی گئی ہو، اس کا مصیبت سے خالی ہونا محال ہے)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے خاص صحابہ رضوان اللہ علیہم میں سے تھے اور درگاہِ رب العزت میں آپ کے تمام افعال مقبول تھے، یہاں تک کہ آپ کے ابتدائے اسلام کے زمانے میں جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: یا محمّد قد استبشر اھل السماء باسلام عمر (ترجمہ: اے محمد ﷺ! آج اہل آسمان نے عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے پر خوشی کا اظہار کیا ہے)۔ پس یہ جماعت صوفیا گدڑی پہننے اور دین کے متعلق سختی کرنے میں آپ ہی کی اقتدا کرتی ہے، اس لئے کہ آپ تمام دینی اور دُنیوی اُمور میں سب اُمت کے امام ہیں۔

تیسری فصل
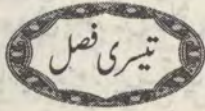
حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

صحابہ رضوان اللہ علیہم میں سے ایک ہیں۔ حیا کا خزانہ، اہل صفا میں سے زیادہ عبادت گزار، درگاہِ رضائے الٰہی سے تعلق رکھنے والے، حضرت مصطفےٰ ﷺ کے طریق سے آراستہ، حضرت ابو عمر عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ جن کی فضیلتیں تمام اُمور میں بالکل آشکار اور اوصاف ظاہر ہیں۔ حضرت عبداللہ بن ریاح و ابو قتادہ رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حرب[1] الدار کے روز ہم آپ کے پاس تھے۔ جب فسادی آپ کے دروازے پر جمع ہو گئے تو آپ کے غلاموں نے ہتھیار اُٹھا لیے۔ یہ دیکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "جو شخص ہتھیار نہ اُٹھائے، وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں آزاد ہے۔" ہم لوگ خوف کی وجہ سے جب باہر نکلے تو حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ ہمیں راستے میں ملے۔ چنانچہ ہم ان کے ساتھ واپس لوٹ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تاکہ معلوم کریں کہ حسن بن علی کرم اللہ وجہہ آپ کے پاس کس مقصد کی خاطر آ رہے ہیں۔ جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ اندر آئے تو سلام کے بعد پہلے آپ سے اس مصیبت پر افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا اور پھر یہ عرض کیا کہ "اے امیرالمومنین! آپ امام برحق ہیں۔ آپ کے حکم کے بغیر میں مسلمانوں پر تلوار نہیں کھینچ سکتا۔ اس لئے آپ مجھے حکم دیجئے تاکہ میں یہ مصیبت آپ سے ہٹا دوں" تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: یا ابن اخی ارجع و اجلس بیتك حتی یا تی اللّٰه بامره فلا حاجة لنا فی اهراق الدماءِ (ترجمہ: اے میرے بھائی کے لڑکے! واپس جا کر اپنے گھر میں بیٹھئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دے۔ ہمیں خون گرانے کی حاجت نہیں) اور یہ بات مقام خُلّت[2] میں بلا کے وارد ہونے کے وقت تسلیم و رضا کی علامت ہے۔

جیسا کہ نمرود (علیه اللعنته) نے آگ بھڑکائی اور ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق[3] کے پلڑے میں رکھا تو حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا: هل لك من حاجة (ترجمہ: کیا آپ کو کوئی حاجت ہے؟) تو آپ نے فرمایا: امّا الیك

[1] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکان کے محاصرہ اور ان کی شہادت کے واقعہ کو حرب الدار کہتے ہیں۔ [2] دوستی آزمانے کی جگہ
[3] منجنیق ایک آلہ ہے کہ توپ کی ایجاد سے قبل جس کے ذریعے بڑے بڑے بھاری پتھر پھینکے دیئے جاتے تھے۔

فلا (ترجمہ: تیری طرف مجھے کوئی حاجت نہیں) حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ سے پھر مدد طلب کیجیے تو آپ نے فرمایا: حَسْبِیْ سُوْءَ اِلٰی عِلْمُہٗ بِحَالِیْ۔ (ترجمہ: اس کا میرے حال کو جاننا میرے سوال کے لئے بس ہے) یعنی وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ مجھ پر کیا مصیبت آرہی ہے اور وہ میرے حال کو مجھ سے بہتر جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میری بہتری کس چیز میں ہے؟

پس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اس مقام پر بالکل وہی حیثیت تھی، جو حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی منجنیق میں تھی اور فسادیوں کا اجتماع بعینہ آتش نمرود اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے قائم مقام تھے لیکن دونوں حالتوں میں فرق یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس بلا میں نجات ہوئی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس مصیبت میں ہلاکت۔ ظاہر ہے کہ نجات کا تعلق بقا سے ہے اور ہلاکت کا فنا سے اور اس کے متعلق اس سے پیشتر ہم بیان کر چکے ہیں۔ پس صوفیا کی جماعت مال وجان کو راہِ مولا میں خرچ کرنے، اپنے تمام امور کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے اور عبادت میں اخلاص کے اندر آپ ہی کی اقتداء کرتی ہے۔ آپ درحقیقت شریعت وحقیقت میں سب کے امام برحق ہیں اور اس سے آپ کی محبت ظاہر ہے۔
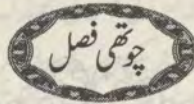
حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ:

آپ صحابہ رضوان اللہ علیہم میں سے ہیں۔ حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کے بھائی، دریائے بلا کے غریق، آتشِ ولایت کے حریق اور تمام اولیاء اللہ، برگزیدگان الٰہی کے پیشوا، ابوالحسن علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ۔ طریقت میں آپ کی شان بہت بڑی اور درجہ بہت بلند ہے۔ معرفت کی حقیقتوں کے اصول کی دقیق عبارات کے بیان کرنے میں آپ کو پورا حصہ حاصل تھا۔ یہاں تک کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ آپ کے حق میں فرماتے ہیں: شَیْخُنَا فِی الْاُصُوْلِ وَالْبَلَاءِ عَلِیُّ الْمُرْتَضٰی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ (ترجمہ: یعنی اصول معرفت میں اور شریعت مصطفویؐ کے تحفظ کی خاطر مصائب وآلام برداشت کرنے میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہمارے شیخ و مرشد ہیں) یعنی طریقت کے معاملات کے علم میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ، ہمارے امام ہیں، اس لئے طریقت کے علم کو اصل اصول کہتے ہیں اور طریقت کے معاملات سب مصیبت کو برداشت کرنا ہیں۔

روایت کرتے ہیں کہ کوئی شخص آپ کی خدمت میں آیا اور آپ سے عرض کیا: اے امیر المومنین! مجھے کوئی وصیت کیجئے تو آپ نے ارشاد فرمایا: لَا تَجْعَلَنَّ اَکْبَرَ شُغْلِكَ بِاَھْلِكَ وَ وَالِدِكَ فَاِنْ یَّكُ اَھْلُكَ وَ وَلَدُكَ مِنْ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ تَعَالٰی فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یضِیْعُ اَوْلِیَاءَ ہٗ لا وَاِنْ کَانُوْا اَعْدَاءَ اللّٰہِ فَمَا ھَمُّكَ وَ شُغْلُكَ لِاَعْدَاءِ اللّٰہِ تَعَالٰی (ترجمہ: تو اپنے بیوی بچوں میں مشغول ہونے کو اپنا سب سے بڑا شغل نہ بنانا، کیونکہ اگر تیرے بیوی بچے اللہ کے دوستوں میں سے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو کبھی ضائع نہیں کرتا اور اگر وہ اللہ کے دشمن ہیں تو تیرا اللہ کے دشمنوں کے لئے غم کھانا اور ان میں مشغول ہونا کسی طرح بھی جائز نہیں)۔

یاد رکھیئے کہ اس مسلے کا تعلق اللہ تعالیٰ کے سوا تمام مخلوقات سے قطع تعلق کر لینے سے ہے، کیونکہ وہ اپنے بندوں کو جیسا چاہتا ہے رکھتا ہے، بشرطیکہ تیرا یقین سچا ہو جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے، حضرت شعیب علیہ السلام کی لڑکی کو (جو آپ کی بیوی تھیں)، ایک سخت مشکل وقت میں تنہا چھوڑ کر خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ

السلام نے حضرت حاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کو لے جاکر بے آباد وادی میں خدا تعالیٰ کے حوالے کر دیا اور ان کو اپنا شغل نہ بنایا اور پورے طور پر اپنا دل حق تعالیٰ سے وابستہ کر دیا۔ یہاں تک کہ اپنے جملہ امور کو خدائے عزوجل کے سپرد کرنے کی وجہ سے اس بے مرادی کی حالت میں بھی ان کی دونوں جہانوں کی مرادیں حاصل ہوگئیں۔ یہ بات بالکل اسی قول کے مشابہ ہے جو حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہٗ نے اس سائل سے فرمایا تھا، جس نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ سب سے پاکیزہ عمل کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا تھا کہ غِنَاء الْقَلْبِ بِاللّٰہِ (ترجمہ: اللہ تعالیٰ سے مکمل تعلق پیدا کر کے غیر اللہ سے اپنے دل کو بے پروا بنا) اور جو دل خدا تعالیٰ کے ساتھ غنی ہے، دنیا کا نہ ہونا اس کو محتاج نہیں کر سکتا اور نہ اس کے ہونے سے وہ خوش ہوتا ہے اور اس قول کی حقیقت سمجھنے سے فقر اور صفت کا صحیح مفہوم بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے اور اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

پس اہلِ طریقت عبارات کی حقیقتوں، اشارات کی باریکیوں، دنیا و مافیہا سے علیحدگی اور تقدیر میں حق پر نظر رکھنے میں آپ ہی کی اقتدا کرتے ہیں اور آپ کے لطائف اس موضوع پر اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ شمار میں آسکیں، لیکن میرا طریق اس کتاب میں اختصار ہے، وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔
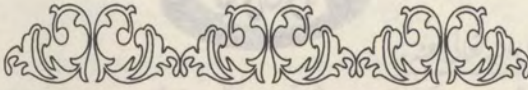
آٹھواں باب

اہل بیت رضوان اللہ علیہم میں سے اہل تصوف کے امام:

پیغمبر ﷺ کے اہل بیت جو دائمی تقدس و پاکیزگی سے مخصوص تھے، ان میں ہر ایک کو طریقت کی ان باتوں میں دسترس حاصل رہی ہے اور ان میں سب کے سب اہل طریقت کے پیشوا ہوئے ہیں اور میں انشاء اللہ تعالیٰ ان میں سے ایک گروہ کے حالات بیان کروں گا۔
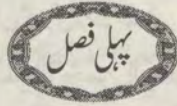
سیدنا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ ائمہ اہل بیت رضوان اللہ علیہم میں سے ہیں۔ حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کے جگر پارے، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے دل کے پھول اور حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی آنکھ کی ٹھنڈک، ابو محمد حسن بن علی کرم اللہ وجہہٗ۔ آپ کو طریقت میں نظر کامل اور اس مضمون (تصوف) کی عبارت کی باریکیوں کے بیان کرنے میں پورا حصہ حاصل تھا، یہاں تک کہ آپ نے اپنی وصیت میں فرمایا ہے: عَلَيْكُمْ بِحِفْظِ السَّرَائِرِ فَاِنَّ اللّٰهَ مُطَّلِعٌ عَلَى الضَّمَائِرِ (ترجمہ: تم پر اسرارِ باطن کی حفاظت لازم ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھیدوں سے آگاہ ہے) اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ بندے کو اسرارِ باطن کی حفاظت کا ایسا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ ظاہر احوال کی حفاظت کا۔ پس اسرارِ باطن کی حفاظت اغیار (ماسوائے اللہ) کی طرف توجہ نہ کرنا ہے اور احوال ظاہر کی حفاظت اللہ جبار کی مخالفت سے اپنی باگ کو موڑ لینا ہے۔

روایت کرتے ہیں کہ جب قدری لوگوں نے غلبہ کیا اور مذہب اعتزال جہاں میں پھیل گیا تو امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام حسن ابن علی کرم اللہ وجہہٗ کی طرف یہ خط لکھا:

(حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا خط حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے نام)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

اسلام علیکم یا ابن رسُول اللّٰہ وقُرّۃُ عینہٖ ورحمتہ اللّٰہ و برکاتہٗ

فانکم معاشر بنی ھاشم کا لفلك الجاریة فی بحر لجی و مصابیح الدّجیٰ واعلام الھدیٰ والائمّۃُ القادۃ الذیْن من تبعَھُم نجَا کسفینة نوح ن المشحونه التی یول الیھا المؤمنون و ینجد فیھا المستمسکون فمَا قولُكَ یا ابن رسُول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسَلّم عِنْدَ حیرتنا فی القدر و اختلافنا فی الاستطاعة لتعلمنا بما تا کد علیه رایُك فانکم ذرّیّة بعضھا مِن بعض بعلم اللّٰہ علّمتم وَھو الشاھد علیکم وانتم شھداء للّٰہِ علی النّاسِ۔

(ترجمہ: اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے۔ اے رسول اللہ ﷺ کے بیٹے اور آپؐ کی دونوں آنکھوں کی ٹھنڈک، آپ پر سلام، اس کی رحمتیں اور اسکی برکتیں ہوں۔ اس کے بعد اے گروہ بنی ہاشم! آپ لوگ سب ایک بحر مواج میں جاری کشتی کی طرح اندھیروں کے چراغ، ہدایت کے جھنڈے اور وہ رہنما و امام

ہیں کہ جو بھی ان کا اتباع کرے، وہ نجات پائے۔ نوح علیہ السلام کی آدمیوں سے بھری ہوئی کشتی کی طرح ہیں کہ جس کی طرف اہل ایمان رجوع کرتے اور اس سے سہارا لینے والے نجات پاتے ہیں۔

پس اے رسول اللہ ﷺ کے جگر گوشے! تقدیر کے متعلق ہماری حیرت اور استطاعت کے متعلق ہمارے اختلاف کے وقت آپ کیا فرماتے ہیں؟ تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ آپ کی رائے کس بات پر قائم ہے کیونکہ بلاشبہ آپ سب پشت در پشت انبیاء کرام کی اولاد ہیں۔ آپ کو علم الٰہی کی تعلیم دی گئی ہے اور وہی آپ کا محافظ اور نگہبان ہے اور آپ لوگ اللہ کی طرف سے لوگوں کے محافظ ہیں، ولسلام۔

جب یہ خطاب آپ کے پاس پہنچا تو آپ نے یوں جواب لکھا:

(امام حسن رضی اللہ عنہ کا جواب حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کے نام)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

امّا بعد فقد انتھی اِلَیَّ کتابُكَ عند حَیرتِك حیرت من زعمته من امتنا والذی علیه رائی ان من لم یؤ من بالقدر خیرہٖ وشرّہٖ مِن اللّٰه تعالیٰ فقد کفرَ وَمن حَمَلَ المعاصی علی اللّٰهِ فقد فجر ان اللّٰه لا یطاع باکراہ ولا یعصیٰ بغلبة ولا یمھل العباد فے ملکه لٰکنّهٗ المالك لما ملکھم والقادر علی ما علیه قَدّرھُم فان ائتمروا بالطّاعة لم یکن لھم صادا ولا لھم عنھا مانعًاوان اتوابا لمعصیة وَشاءَ اَنۡ یمن علیھم فیحول بینھم وبینما فعل وان لم نفعل فلیس حملھم علیھا اجبارا ولا الزامھم اکراھا ایاھا باحتجاجهٖ علیھم ان عرفھم وَمکنھم وجعل لھم السبیل انی اخذ مادعاھم الیه وترکِ مانَھٰنھُمۡ عنھا ولِلّٰهِ المحجته البالغته ولسّلام۔

(ترجمہ: شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ اس کے بعد آپ کا خط آپ کی اور ان لوگوں کی حیرانی کے متعلق جن کو آپ ہماری اُمت میں سے سمجھتے ہیں، میرے پاس پہنچ گیا اور میری رائے اس کے متعلق یہ ہے کہ جو شخص اس بات پر ایمان نہیں لاتا کہ ہر نیک و بد کی تقدیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، وہ کافر ہے اور جس نے معاصی کو اللہ پر تھوپا (ان کو اللہ کے ذمے لگایا)، وہ فاجر و گمراہ ہے۔ بلاشبہ نہ تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت جبر سے کی جاتی ہے، نہ اس کی نافرمانی زور سے کی جاتی ہے اور نہ ہی وہ اپنے بندوں کو اپنی حکومت میں مہلت دیتا ہے لیکن وہ ان سب چیزوں کا مالک ہے۔

پس اگر وہ فرمانبرداری کا قصد کریں تو وہ ان کو روکتا نہیں یا ان کو اس فرمانبرداری کرنے سے ہٹاتا نہیں اور اگر وہ نافرمانی کریں اور پھر ان پر احسان فرما کر اُن کے اور ان کی معصیت کے درمیان حائل ہو جائے تو کر سکتا ہے، اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس نے ان کو اس معصیت پر نہ مجبور کیا ہے اور نہ اس نے ان پر اس نافرمانی کا ارتکاب کرنا جبراً لازم کیا ہے۔ ان پر اپنی یہ حجت قائم کرنے کی وجہ سے کہ اس نے انہیں سب کچھ بتلا دیا تھا اور انہیں اس کے کرنے اور نہ کرنے کی قوت بخشی تھی اور ان کے لئے اس امر کے اختیار کرنے کی جس کی طرف انہیں دعوت دی تھی اور اس کے ترک کی جس سے اُن کو منع فرمایا تھا، آسانی پیدا کر دی تھی اور اللہ تعالیٰ کی دلیل غالب ہے، والسلام۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؓ نے جو اپنی اور ان لوگوں کی جنہیں آپ امت محمدیؐ میں سے سمجھتے ہیں، قدر کے متعلق حیرت و استعجاب کے بارے میں یہ لکھا تھا کہ اس مسئلے کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی تقدیر

(اندازہ) خیر و شر پر ایمان نہیں لاتا، وہ کافر ہے اور جو گناہ کو اس کے ذمے لگاتا ہے (اور کہتا ہے اس نے اس کے ارتکاب کرنے پر ہمیں مجبور کیا ہے) وہ فاجر و گمراہ ہے، یعنی تقدیر کا انکار اہل قدر کا مذہب ہے اور معاصی کو اللہ تعالیٰ کے ذمے لگانا اہل جبر کا طریق ہے۔

پس بندہ اللہ کی طرف سے استطاعت کے مطابق اپنے اعمال میں مختار ہے یعنی اسے اپنے افعال میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پورا پورا اختیار حاصل ہے اور ہمارا مذہب قدر و جبر کے درمیان ہے اور میرا مقصود اس خط کے نقل کرنے سے اگرچہ اتنا ہی تھا، لیکن میں نے وہ سارا خط نقل کیا کیوں کہ وہ بہت فصیح و بلیغ تھا اور یہ سب باتیں میں نے اس لئے بیان کی ہیں تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ حقائق معرفت اور اصول طریقت کے علم میں کتنے بلند درجے پر فائز تھے۔ امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ایسے بہت بلند پایہ امام باوجود اپنے تبحر و ہمہ دانی کے، علوم دین کے تمام ادق مسائل و اشارات میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع فرماتے تھے۔

حکایات سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایک اعرابی[1] جنگل سے حضرت حسن بن علی کرم اللہ وجہہ کے پاس آیا۔ اس وقت آپ کوفہ میں اپنے مکان کی دہلیز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے آتے ہی حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور آپ کے ماں باپ کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ آپ نے اُٹھ کر فرمایا: "اے اعرابی! شاید تو بھوکا پیاسا ہے یا تجھے کوئی مصیبت آپہنچی ہے، مجھے بتا تاکہ میں تیری امداد کروں" لیکن وہ گنوار برابر کہہ رہا تھا کہ آپ ایسے اور آپ کے ماں باپ ایسے ہیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے غلام سے فرمایا: "درہموں کی ایک تھیلی لاکر اس کو دے دو۔ اور پھر فرمایا: اے اعرابی! معاف کر گھر میں اس کے سوائے کچھ نہیں، ورنہ میں تجھ سے دریغ نہ رکھتا۔" جب اعرابی نے یہ بات سنی تو بے اختیار ہو کر کہنے لگا: "اَشْهَدُ اَنَّكَ اِبْنُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ واقعی رسول اللہ ﷺ کے بیٹے ہیں) اور میں تو یہاں آپ کا صبر و حمل آزمانے آیا تھا" اور یہ صفت فقط حقیقت شناس مشائخ کی ہے کہ لوگوں کی تعریف اور مذمت ان کے نزدیک برابر ہوتی ہے اور کسی کے برا کہنے سے کبھی ناراض نہیں ہوتے۔

دوسری فصل
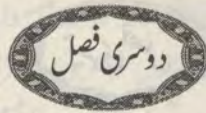
سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ ائمہ اہل بیت رضوان اللہ علیہم میں سے ہیں۔ شمع آل محمد ﷺ، تمام تعلقات دنیا سے مجرد، اپنے زمانے کے سردار، حضرت امام ابو عبد اللہ حسین رضی اللہ عنہ بن علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ۔ آپ زمانے کے محقق اولیاء اللہ میں سے تھے اور اہل صفائے بطن کے قبلہ، کربلا کے شہید اور اہل طریقت آپ کے حال و سیرت کی درستی پر متفق ہیں۔ اس لئے کہ جب تک حق ظاہر تھا آپ حق کے تابع رہے اور جب امر حق مغلوب ہو کر گم ہونے لگا تو آپ نے تلوار سونت لی اور جب تک اپنی عزیز جان اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان نہ کر دی، آرام نہ کیا۔ رسول ﷺ کی بہت سی علامات آپ میں موجود تھیں، جن میں آپ مخصوص تھے۔ چنانچہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ میں ایک روز پیغمبر ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو اپنی پشتِ مبارک پر بٹھا کر ایک رسا اپنے دہن مبارک میں پکڑا ہوا ہے۔ اس کے دونوں سرے امام حسین رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھمار کھے تھے اور وہ

[1] صحرائی بدو

آنحضرت کو چلا رہے تھے اور خود حضور ﷺ اپنے گھٹنوں کے بل چل رہے تھے۔ جب میں نے یہ بات دیکھی تو میں نے کہا: نِعْمَ الْجَمَلُ جَمَلُكَ يَا اَبَاعَبْدِ اللّٰهِ (ترجمہ: اے حسینؓ! آپ کا اونٹ بہت ہی اچھا ہے)۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نِعْمَ الرَّاكِبُ هُوَ يَا عُمَرُ (ترجمہ: اے عمرؓ! سوار بھی تو بہت اچھا ہے)۔

طریقت میں آپ کے بہت سے لطیف اور بے شمار رموز ہیں اور بہت سے عمدہ اور پرحکمت ارشادات ہیں۔ آپ ہی کا ایک ارشاد ہے: اَشْفَقُ الْاِخْوَانِ عَلَيْكَ دِيْنُكَ (ترجمہ: تجھ پر سب سے زیادہ شفقت کرنیوالا بھائی تیرا دین ہے) اس لئے کہ انسان کی نجات اُخروی دین کی متابعت میں اور اس کی ہلاکت دین کی مخالفت میں ہے۔ پس عقل مند وہ ہے کہ اپنے مہربانوں اور مشفق بھائیوں کا فرمانبردار رہے اور ان کی شفقت کو اپنے لئے مخصوص کرے اور انکی خلاف ورزی نہ کرے، اور بھائی وہ ہے جو نصیحت کرے اور شفقت کا دروازہ ان پر بند نہ کرے۔

ایک حکایت میں میں نے دیکھا ہے کہ ایک روز آپ کی خدمت میں کوئی شخص آیا اور عرض کیا: "اے رسول اللہ ﷺ کے بیٹے! میں ایک درویش آدمی ہوں اور عیال دار ہوں، ہمیں آج اپنی طرف سے کھانے پینے کے لئے کچھ عنایت فرمائیں۔" یہ سن کر حضرت امام حسینؓ نے فرمایا: "بیٹھ جاؤ! ہمارا روزینہ راستے میں آرہا ہے۔" ابھی کچھ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ لوگ امیر معاویہؓ کی طرف سے دیناروں کی پانچ تھیلیاں لے آئے کہ ہر ایک تھیلی میں ایک ہزار دینار تھا۔ ان لوگوں نے کہا کہ "امیر معاویہؓ آپ سے معافی مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس رقم کو حاجت مندوں کے مصرف میں صرف کیجیے اور اس کے بعد اس سے بہتر امداد کی جائے گی۔" امام علیہ السلام نے وہ پانچوں تھیلیاں اس درویش کو دے دیں اور اس سے معافی مانگی کہ "تجھے یہاں دیر تک بیٹھنا پڑا اور یہ بہت ہی بے قدر عطیہ ہے، جو تجھے ملا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ رقم اتنی قلیل ہے تو میں تجھے کبھی انتظار کے لئے نہ کہتا۔ ہمیں معذور سمجھو کہ ہم لوگ اہل مصیبت ہیں اور دنیا کی تمام راحتوں سے دستبردار اور اپنی مرادیں کھوئے ہوئے ہیں اور دوسرے کی مراد پوری کرنے کے لئے زندگی بسر کرتے ہیں۔" آپ کے اوصاف و مناقب اتنے زیادہ اور مشہور ہیں کہ اُمت میں سے کسی شخص پر بھی پوشیدہ نہیں۔

تیسری فصل
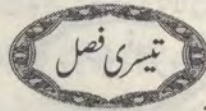
حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

آپ ائمہ اہل بیت رضوان اللہ علیہم میں سے ہیں، جو نبوت کے وارث اور اُمت کے چراغ، سید مظلوم اور امام مرحوم، عبادت کرنے والوں کی زینت اور اوتار کی شمع ابوالحسن علی زین العابدین بن حسینؓ بن علی کرم اللہ وجہہ۔ آپ اہلِ زمانہ میں سب سے زیادہ کریم اور عبادت گزار تھے اور آپ حقائق معرفت کے کھولنے اور دقائق طریقت کے بیان کرنے میں مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ آپ سے لوگوں نے پوچھا کہ زیادہ اور آخرت میں سب سے زیادہ سعادت مند کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: مَنْ اِذَا رَضِیَ لَمْ يَحْمِلْهُ رَضَاهُ عَلَى الْبَاطِلِ وَاِذَا سَخِطَ لَمْ يُخْرِجْهُ سَخَطُهُ مِنَ الْحَقِّ (ترجمہ: وہ شخص کہ جب راضی ہو تو اس کی خوشی اس کو باطل پر نہ اُبھارے اور جب ناراض ہو تو اس کا غصہ اسے حق سے باہر نہ نکال دے)۔ یہ بات مستقیم الحال لوگوں کے کامل اوصاف میں سے ہے، اس لیے کہ باطل پر راضی ہونا باطل ہوتا ہے اور غصے کی حالت میں حق سے دست بردار ہونا بھی باطل ہے اور مومن باطل کا مرتکب نہیں ہوتا۔

نیز آپ کی نسبت روایت کرتے ہیں کہ جب یزیدیوں نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو مع ان کے

فرزندوں اور عزیز و اقربا رضوان اللہ علیہم کے میدانِ کربلا میں شہید کر دیا اور حضرت زین العابدین کے سوائے کوئی باقی نہ رہا جو عورتوں پر نگران ہوتا، اس وقت آپ بیمار تھے اور حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ آپ کو علی اصغر کہتے تھے۔ جب ان کو بے کجاوہ اونٹوں پر سوار کر کے دمشق میں یزید بن معاویہ کے سامنے لائے، اخزاہُ اللہ تعالیٰ (اللہ تعالیٰ اسے رُسوا کرے) تو ایک شخص نے آپ سے عرض کیا: کَيْفَ اَصْبَحْتُمْ يَاعَلِيُّ وَيَا اَهْلَ بَيْتِ الرَّحْمَةِ قَالَ اَصْبَحْنَا مِنْ قَوْمِنَا بِمَنْزِلَةِقَوْمِ مُوْسٰى مِن اٰلِ فِرْعَوْنَ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاءَ هُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَ هُمْ فَلَا نَدْرِيْ صَبَاحَنَا مِنْ مَّسَاءِ نَا وَهٰذَا مِنْ حَقِيْقَتِهٖ بَلَائِنَا (ترجمہ: اے علیؓ اور اے اہل بیت رحمت! تم نے صبح کیسے کی؟ تو آپ نے فرمایا: ہم نے اپنی قوم کے ظلم سے بالکل ویسی ہی صبح کی جیسی قوم موسیٰ علیہ السلام نے قوم فرعون کے ظلم سے کی تھی کہ وہ ان کے بیٹوں کو ذبح کرتے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتے تھے، تاکہ انھیں غلام بنالیں۔ پس ہمیں نہ صبح کی پہچان ہے نہ شام کی، بس ہماری مصیبت کی حقیقت یہ ہے) اور ہم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اس کا شکر اور اس کی آزمائشوں پر صبر کرتے ہیں۔

اسی طرح آپ کی نسبت روایت ہے کہ ہشام بن عبدالملک بن مروان ایک مرتبہ حج کو آیا اور بیت اللہ کا طواف کر کے جب اس نے حجر اسود کو بوسہ دینا چاہا تو خلقت کے ہجوم کی وجہ سے اس کو حجر اسود کی طرف کوئی راستہ نہ ملا، تب منبر پر چڑھ کر اس نے خطبہ دیا۔ اسی اثنا میں حضرت زین العابدین بن الحسین بن علی رضوان اللہ علیہم اجمعین بیت الحرام میں داخل ہوئے۔ چاند سے مکھڑے پر نورانی رُخسار اور خوشبودار لباس کے ساتھ آپ نے بیت اللہ کا طواف کرنا شروع کیا۔ جب حجر اسود کے قریب پہنچے تو لوگوں نے آپ کی تعظیم کے لیے حجر اسود کی اطراف کو خالی کر دیا، یہاں تک کہ آپ نے بوسہ دیا۔ ایک شامی نے جب یہ ہیبت دیکھی تو ہشام بن عبدالملک سے کہا: "اے امیر المومنین! آپ کو تو لوگوں نے حجر اسود کی طرف راہ نہ دی، باوجودیکہ آپ امیر المومنین ہیں اور وہ جو بڑا خوبرو جوان تھا، جب وہ آیا تو سارے لوگ حجر اسود کے پاس سے ہٹ گئے اور اس کو اس جوان کے لیے خالی کر دیا۔" ہشام نے کہا کہ "میں اس کو نہیں جانتا کہ وہ کون ہے؟" اس بات سے اس کا مقصد یہ تھا کہ شام والے اس کو نہ پہچان سکیں، نہ اس سے محبت کریں اور نہ اس کی امارت و خلافت کی خواہش کریں۔ فرزدق شاعر وہاں کھڑا تھا۔ اس نے کہا: "میں اسے اچھی طرح پہچانتا ہوں۔" لوگوں نے کہا: "اے ابا فراس! (کنیت فرزدق) وہ کون ہے؟ ہمیں بتایئے کہ ہم نے بہت ہی بارُعب جوان دیکھا ہے۔" فرزدق نے کہا: "سنو میں اس کا حال، صفت اور نسب بتاتا ہوں۔" پس فرزدق نے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے:

هٰذَا الَّذِيْ تَعْرِفُ الْبَطْحَاءُ وِطَاتَهٗ
وَالْبَيْتُ يَعْرِفُهٗ وَالْحِلُّ وَالْحَرَمُ

هٰذَا ابْنُ فَاطِمَةَ اِنْ كُنْتَ جَاهِلَهٗ
وَبِجَدِّهٖ اَنْبِيَاءُ اللّٰهِ قَدْ خُتِمُ

هٰذَا اِبْنُ خَيْرِ عِبَادِ اللّٰهِ كُلِّهِمْ
هٰذَا التَّقِيُّ النَّقِيُّ الطَّاهِرُ الْعَلَمُ

يَنْشَقُّ نُوْرُالدُّجٰى عَنْ نُوْرِ طَلْعَتِهٖ
كَالشَّمْسِ يَنْجَابُ عَنْ اَشْرَاقِهَا الظُّلَمُ

يُغْضِي حَيَاءً وَيُغْضَى مِنْ مَّهَابَتِهِ
فَمَا يُكَلِّمُ اِلَّا حِيْنَ يَبْتَسِمُ
يَنْمِيْ اِلٰى ذُرْوَةِ الْعِزِّ الَّتِيْ قَصُرَتْ
عَنْ نَيْلِهَا عَرَبُ الْاِسْلَامِ وَالْعَجَمُ
اِذَا رَاٰتَهُ قُرَيْشٌ قَالَ قَائِلُهَا
اِلٰى مَكَارِمِ هٰذَا يَنْتَهِي الْكَرَمُ
مَنْ جَدُّهُ دَانَ فَضْلُ الْاَنْبِيَاءِ لَهُ
وَفَضْلُ اُمَّتِهِ دَانَتْ لَهُ الْاُمَمُ
يَكَادُ يُمْسِكُهُ عِرْفَانَ رَاحَتِهِ
رُكْنُ الْحَطِيْمِ اِذَا مَا جَاءَ يَسْتَلِمُ
فِيْ كَفِّهِ خَيْزُرٌ اَنْ رِيْحُهَا عَبِقٌ
مِنْ كَفِّ اَرْوَعَ فِيْ عِرْنِيْنِهِ شَمَمُ
مُشْتَقَّةٌ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ نَبْعَتُهُ
طَابَتْ عَنَاصِرُهُ وَالْخِيْمُ وَالشِّيَمُ
فَلَيْسَ قَوْلُكَ مَنْ هٰذَا؟ بِضَائِرِهِ
اَلْعَرَبُ تَعْرِفُ مَنْ اَنْكَرْتَ وَالْعَجَمُ
كِلْتَا يَدَيْهِ غِيَاثٌ عَمَّ نَفْعُهُمَا
تَسْتَوْكِفَانِ فَلَا يَعْرُوْهُمَا الْعَدَمُ
عَمَّ الْبَرِيَّةَ بِالْاِحْسَانِ فَانْقَشَعَتْ
عَنْهُ الْغِيَابَةُ وَالْاِمْلَاقُ وَالظُّلَمُ
لَا يَسْتَطِيْعُ جَوَادٌ بُعْدَ غَايَتِهِمْ
وَلَا يُدَانِيْهِمْ قَوْمٌ وَاِنْ كَرُمُوْا
هُمُ الْغُيُوْثُ اِذَا مَا اَزْمَةٌ اَزِمَتْ
وَالْاُسُدُ اُسْدُ الشَّرٰى وَالْبَاسُ مُحْتَدِمُ
سَهْلُ الْخَلِيْقَةِ لَا يُخْشٰى بَوَادِرُهُ
يُزِيْنُهُ اثْنَانِ حُسْنُ الْخُلْقِ وَالشِّيَمُ
مِنْ مَعْشَرٍ حُبُّهُمْ دِيْنٌ وَبُغْضُهُمُ
كُفْرٌ وَقُرْبُهُمْ مَنْجًا وَمُعْتَصَمُ
اِنْ عُدَّ اَهْلُ التُّقٰى كَانُوْا اَئِمَّتَهُمْ
اَوْقِيْلَ مَنْ خَيْرُ اَهْلِ الْاَرْضِ قِيْلَ هُمُ

لَا يَنقُصُ الْعُسْرِ بَسْطًا مِنْ اَكُفِّهِمُ
سَيَّانَ ذَالِكَ اَنْ اَثْرَوْا وَاِنْ عَدِمُوْا
اَللّٰهُ فَضَّلَهٗ قِدَمًا وَّ شَرَّفَهٗ
جَدٰى بِذَالِكَ فِيْ لَوْحٍ لَّهُ الْقَلَمْ
مُقَدَّمٌ بَعْدَ ذِكْرِ اللّٰهِ ذِكْرُهُمْ
فِيْ كُلِّ بَدْءٍ وَّ مَخْتُوْمٌ بِهٖ الْكَلِمْ
مَنْ يَّعْرِفُ اللّٰهَ يَعْرِفُ اَوَّلِيَّتَهٗ
وَالَّذِيْنَ مِنْ بَيْتٍ هٰذَانَا لَهُ الْاُمَمْ
اَیُّ الْقَبَائِلِ لَيْسَتْ فِيْ رِقَابِهِمْ
اِمَّا لَا بَاءِ هٰذَا اَوْلَهٗ نِعَمْ

(منظوم ترجمہ ابیاتِ مذکورہ بالا)

ہے یہ وہ پہچانے بطحا، خوب ہے جس کے قدم
خوب جانے جس کو بیت اللہ اور حلّ و حرم

فاطمہ کا لال ہے یہ، گر نہیں تو جانتا
جس کے نانا پاک پر ختم رسالت ہے رقم

سب جہاں میں بہتریں ہے، خلق کا بیٹا ہے یہ
یہ تقی ہے، پاک باطن اور بدن سب میں علم

نورِ پیشانی سے کِھلتی ہے اندھیروں کی کلی
جوں شعاعِ شمس سے پھٹ جائے ظلمت ایکدم

وہ حیا سے بند کر لیتا ہے آنکھ اور لوگ سب
رُعب سے وہ مسکرائے جب بھی بولے از کرم

ہے وہ اس درجہ پہ عزت کے جہاں پر پہنچنا
سب پہ ہے دشوار، قاصر ہیں عرب، سارے عجم

جب سے دیکھا ہے قریش مکہ نے، اک نے کہا
بس مکارم پر ہے اس کے منتہے سارا کرم

جس کے نانا سے بزرگی میں ہیں کمتر انبیاءؑ
اس کی اُمت سے بزرگی میں ہیں کمتر سب اُمم

ہے یہ ممکن تھام لے پہچان کر رُکنِ حطیم
ہاتھ کو اس کے جو رکھے چومنے کو واں قدم

ہاتھ میں اس کے چھڑی ہے بید کی خوشبوئے تیز
ہے وہ اک بارُعب جس کی ناک ہے ارفع اشم

اس کا پودا ہے رسول اللہؐ سے نکلا ہوا
پاک ہے اس کا بدن اور نیک سیرت، خوش شیم

پس یہ تیرا قول وہ ہے کون؟ کچھ نقصان نہیں
جس سے تو انجان ہے جانے اسے عرب و عجم

ہاتھ اس کے ہیں غیاث اور نفع اُن کا عام
ہیں ہمیشہ جاری اور طاری نہیں اُن پر عدم

عام ہے احسان اس کا خلق پر جس سے ہوا
دُرو رنج خلق اور افلاس اور جوروستم

ہے نہیں کوئی سخی پہنچے جو اُن کی حد کو
اور نہ کوئی قوم اُن تک پہنچے گو ہو محترم

قحط سالی جب پڑے بارانِ رحمت ہیں وہ سب
شیر ہیں جب جنگ کا میداں میں گڑ جائے عَلم

نرم خو ایسا ہے وہ غصہ ہے جس کا بے خطر
زینت اس کی نیک سیرت نیک خو سرتا قدم

اس گروہ میں سے ہے وہ جن کی محبت دین ہے
کفر اُن کی دُشمنی اور قرب ہے رَب کا کرم

اہل تقویٰ گر گنو، وہ ان کے سب ہوں گے امام
ہیں وہی گر پوچھو خیر الخلق اور اہل کرم

ہے برابر ہوں غنی وہ یا کہ ہوں محتاج وہ
مفلسی سے ہو نہیں سکتی سخاوت اُن کی کم

دی بزرگی اور شرافت اس کو پس اللہ نے
لوح پر جاری ہوا روزِ ازل یونہی قلم

ہے مقدم ذکرِ حق کے بعد اس کا ذکرِ خیر
ہر شروع میں اور اسی پر آکے ہوتا ہے وہ تَم

حق کو جو پہچانے اس کو بھی مقدم جانے ہے
دینِ حق سب نے اسی کے گھر سے پایا محترم

وہ قبیلہ کون سا ہے جس کی گردن میں نہ ہو
بارِ احسان اس کا یا اجداد کا بارِ کرم

اسی طرح فرزدق نے حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ کی مدح میں یہ چند اشعار پڑھے اور آپ اور اہل بیت پیغمبر ﷺ کی بہت تعریف کی۔ یہ سن کر ہشام اس پر بہت ناراض ہوا اور حکم دیا کہ اس کو مقام عسقان میں جو مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہے، قید کر دیں۔ جب یہ خبر لوگوں نے حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ تک پہنچا دی تو آپ نے اس کے پاس بارہ ہزار درہم لے جانے کا حکم دیا اور فرمایا: "اے ابو فراس! ہمیں معذور سمجھو کہ ہم لوگ امتحان میں ہیں اور اس سے زیادہ مال ہمارے پاس نہیں کہ تمہیں بھیج دیں۔" فرزدق نے وہ درہم واپس کر دیئے اور عرض کیا: "اے رسول خدا ﷺ کے بیٹے! میں نے روپے پیسے کے واسطے امیروں اور بادشاہوں کی شان میں بہت سے اشعار کہے ہیں اور ان کی مدحت سرائی میں جھوٹ اور مبالغے سے کام لیا کرتا تھا۔ یہ ابیات میں نے محض اللہ تعالیٰ اور فرزندانِ رسول ﷺ کی محبت میں ان جھوٹے مدعیوں کے کفارے کے طور پر کہے ہیں۔" جب یہ پیغام حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے پاس لے گئے تو آپ نے فرمایا: "یہ درہم اس کے پاس واپس لے جاؤ اور اسے کہو کہ اے ابا فراس! اگر تم ہم سے محبت کرتے ہو تو اس چیز کو پسند نہ کرو کہ ہم وہ چیز واپس لے لیں، جو ہم نے دے دی اور اپنے ملک سے نکال چکے ہیں۔" تب فرزدق نے وہ درہم قبول کر لیے۔ آپ کے مناقب و فضائل اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ ان کو جمع کر سکیں۔

چوتھی فصل
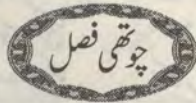
حضرت امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

آپ ائمہ اہل بیت رضوان اللہ علیہم میں سے ہیں۔ اہل علم پر حجت، اربابِ مشاہدہ کی دلیل، آلِ نبی ﷺ کے امام اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی نسل میں برگزیدہ۔ حضرت امام باقر ابو جعفر محمد بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم۔ کہتے ہیں کہ آپ کی کنیت ابو عبد اللہ اور لقب باقر تھا۔ آپ کتابِ الٰہی کے لطیف اشارات اور علومِ دینیہ کی باریکیاں بیان کرنے میں خاص درجہ رکھتے تھے۔ آپ کی کرامتیں اور خوارق[1] مشہور و معروف اور دلائل روشن ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ کسی خلیفہ نے قتل کے ارادے سے ان کے پاس آدمی بھیج کر اُنہیں بلایا۔ جب آپ تشریف لائے تو خلیفہ نے آپ سے فوراً معافی مانگ لی اور ہدیہ پیش کر کے کامل عزت و احترام کے ساتھ آپ کو رُخصت کیا۔ درباریوں نے پوچھا: "اے بادشاہ! آپ تو اُن کو قتل کرنا چاہتے تھے، لیکن ہم آپ کا ان کے ساتھ یہ سلوک دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟" بادشاہ نے کہا: "جب آپ میرے پاس تشریف لائے تو میں نے دیکھا کہ آپ کے دائیں بائیں دو شیر ہیں، جو مجھ سے کہتے ہیں کہ اگر تم ان کے قتل کا قصد کرو گے تو ہم تمہیں ہلاک کر دیں گے۔" اور آپ ہی کی نسبت روایت کرتے ہیں آپ نے اللہ تبارک و تعالیٰ کے اس قول: فَمَنْ يَّكْفُرْ

[1] خلافِ عادت

بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ (ترجمہ: پس جو شخص شیطان کا انکار کرے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے) کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: كُلُّ مَنْ شَغَلَكَ مِنْ مُطَالَعَةِ الْحَقِّ فَهُوَ طَاغُوْتُكَ (ترجمہ: جو چیز تجھے مطالعہ حق سے باز رکھے، وہ تیرا شیطان ہے)۔ اب تم غور کرو کہ کس چیز کی وجہ سے تم اللہ تعالیٰ سے بے تعلق اور حجاب میں ہو، جس کے سبب تم ذاتِ حق کا مشاہدہ کرنے سے عاجز ہو اور اگر اس حجاب کو ترک کر دو تو مکاشفۂ الٰہی میں پہنچ جاؤ اور حق سے محجوب اور ممنوع نہ رہو اور جو شخص مشاہدۂ حق سے روک دیا گیا ہے، اُسے قربِ حق کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے۔

آپ کے خاص ارادت مندوں میں سے ایک شخص روایت کرتے ہیں کہ جب رات کا ایک حصہ گزر جاتا اور آپ اوراد[1] سے فارغ ہو جاتے تو بلند آواز سے اپنی مناجات[2] میں یوں عرض کرتے:

"اے میرے معبود! اے میرے مولا! رات آگئی اور بادشاہوں کے عمل و دخل کی حکومت ختم ہو گئی اور ستارے سب آسمان پر نمودار ہو گئے اور سب لوگ سو کر معدوم[3] ہو گئے اور لوگوں کی زبان ساکت[4] ہو گئی اور ان کی آنکھ لگ گئی اور لوگ آدمیوں کے دروازے سے بھاگ گئے اور بنو اُمیہ[5] آرام پا گئے اور اپنی خواہشات کو انہوں نے چھپا دیا اور اپنے دروازے بند کر دیئے اور ان پر پہرے دار مقرر کر دیئے اور جو لوگ ان کی طرف حاجت رکھتے تھے، انہوں نے اپنی حاجتیں چھوڑ دیں۔ بارِ خدایا! لیکن تو زندہ ہے، ہمیشہ رہنے والا اور دیکھنے والا ہے، اُونگھ اور نیند تیری ذات پر طاری نہیں ہوتی اور جو شخص تجھے اس صفت کے ساتھ نہ پہچانے وہ کسی نعمت کے شایان نہیں۔ اے وہ ذات کہ کوئی چیز تجھے کسی کام کرنے سے روک نہیں سکتی اور تیری رحمت کے دروازے ہر اس شخص پر کھلے ہیں جو تجھے پکارتا ہے۔ اور تیرے خزانے ہر اس شخص پر فدا ہیں جو تیری حمد و ثنا کرتا ہے۔ تو وہ مالک ہے کہ سائل کو رّد کرنا تجھے زیبا نہیں۔ جو شخص مومنوں میں سے تیری درگاہ پر دعا کرتا ہے تو اُس کو زمین و آسمان کی خلقت میں سے کوئی بھی سوال کرنے سے روکنے والا نہیں۔ بارِ خدایا! جب ہم موت، قبر اور حساب کو یاد کرتے ہیں تو دنیا کی کسی چیز سے کیسے آرام پائیں اور جب ہم ملک الموت کو یاد کرتے ہیں تو اپنے دل کو دنیا کی نعمتوں میں کیسے لگائیں اور جب ہم اپنے نامۂ اعمال کو دیکھتے ہیں تو کیسے دنیا میں قرار پکڑیں۔ پس میں تجھ ہی سے سوال کرتا ہوں اس لیے کہ تجھے خوب جانتا ہوں اور تجھ ہی سے طلب کرتا ہوں، کیونکہ تجھے ہی پکارتا ہوں کہ موت کے وقت وہ راحت عطا کر جس میں عذاب نہ ہو اور حساب کے وقت وہ عیش ارزائی فرما جس میں کوئی تکلیف نہ ہو۔"

راوی کا بیان ہے کہ وہ یہ سب باتیں کہتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے، یہاں تک کہ ایک رات میں نے آپ سے عرض کیا کہ "اے میرے اور میرے باپ دادوں کے آقا! کب تک آپ گریہ زاری اور واویلا کریں گے؟" آپ نے فرمایا: "اے دوست! یعقوب علیہ السلام کا ایک یوسف علیہ السلام گم ہوا تو وہ اتنا روئے کہ ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں اور میں نے تو اٹھارہ اشخاص کو اپنے باپ سمیت یعنی امام حسین رضی اللہ عنہ اور دوسرے شہدائے کربلا کو گم کیا ہے۔ میں اُس سے تو کم نہیں ہوں گا کہ فراق میں آنکھیں سفید کر دوں۔" آپ کی یہ مناجات عربی زبان میں ہے جو بہت ہی بلیغ و فصیح ہے، لیکن طوالت کے خوف سے اس کے معانی میں نے فارسی میں بیان کر دیئے ہیں تاکہ عبارت مکرر نہ ہو۔ پھر انشاء اللہ کسی دوسرے مقام پر بیان کر دوں گا۔

---

[1] وظائف [2] ذکرِ الٰہی اور ان سے راز و نیاز کی باتیں [3] ناپید [4] ٹھہر گئی، چپ اور خاموش ہو گئی۔ [5] بنو امیہ مکہ معظمہ کا ایک مشہور خاندان ہے، جس نے خلافتِ راشدہ کی حکومت کی بنیاد رکھی۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت امیر معاویہؓ اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

پانچویں فصل
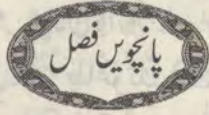
حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ ائمۂ اہل بیت رضوان اللہ علیہم میں سے ہیں۔ سنتِ نبوی ﷺ کی تلوار، طریقت کی زیبائش، معرفت کو بیان کرنے والے اور صفوت کو زینت دینے والے حضرت امام ابو محمد جعفر بن محمد بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ آپ نہایت بلند حال، نیک سیرت اور ظاہر و باطن میں آراستہ پیراستہ تھے۔ تمام علوم میں آپ کے بہت عمدہ اشارات ہیں اور کلام اللہ کی باریکی اور معانی طریقت سے واقف ہونے کی وجہ سے آپ مشائخ کے درمیان مشہور ہیں۔

طریقت کے موضوع پر آپ کی کئی مشہور کتابیں ہیں۔ آپ کی نسبت روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: مَنْ عَرَفَ اللّٰهَ اَعْرَضَ عَمَّنْ سِوَاهُ (ترجمہ: جس نے خدا تعالیٰ کو پہچان لیا، اس نے ماسوا اللہ سے منہ پھیر لیا) یعنی عارف الٰہی غیر اللہ سے اعراض[1] کرنے والا اور اسبابِ دُنیا سے قطع تعلق کرنے والا ہوتا ہے اس لیے کہ حق کی شناخت بالکل غیر اللہ کی قدیم شناخت ہے، کیونکہ غیر اللہ کی عدم شناخت اللہ تعالیٰ کی معرفت کی وجہ سے ہوتی ہے اور غیر اللہ کی معرفت اللہ کی عدم شناخت کے سبب سے۔ پس عارفِ حق خلقت سے الگ اور حق سے پیوستہ ہوتا ہے۔ غیر اللہ کی اس کے دل میں اتنی بھی قدر نہیں ہوتی کہ ان کی طرف وہ توجہ کرے اور ان کے موجود ہونے سے اس کو اتنا بھی خطرہ نہیں ہوتا کہ دل میں ان کے ذکر کو جگہ دے اور آپ سے یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: لَاتَصِحُّ الْعِبَادَةُ اِلَّا بِالتَّوْبَةِ لِاَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَدَّمَ التَّوْبَ عَلَى الْعِبَادَةِ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ (ترجمہ: عبادت سوائے توبہ کے درست نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کو عبادت پر مقدم فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے کہ توبہ کرنے والے عبادت کرنے والے ہیں)۔ اس لیے کہ یہ تو مقاماتِ طریقت کی ابتدا ہے اور عبودیت ان مقامات کی انتہا اور جب اللہ تعالیٰ نے گناہ گاروں کا ذکر فرمایا تو ان کو توبہ کا حکم دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا (ترجمہ: تم سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو) اور جب رسول اللہ ﷺ کا ذکر کیا تو عبودیت کے ساتھ یاد فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى (ترجمہ: پس وحی کی اپنے بندے کی طرف، جو وحی کی)۔

حکایت ہے کہ حضرت داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کے پاس آ کر عرض کیا: "اے رسولِ خدا ﷺ کے بیٹے! مجھے کوئی نصیحت کیجئے کہ میرا دل سیاہ ہو گیا ہے۔" تو آپ نے فرمایا: "اے ابو سلیمان! (کنیت[2] داؤد طائی) تو خود اپنے زمانے کا زاہد ہے، تجھے میری نصیحت کی کیا حاجت ہے؟" انہوں نے کہا: "اے فرزندِ پیغمبر ﷺ! آپ کو سب پر فضیلت ہے اور سب کو نصیحت کرنا آپ پر واجب ہے۔" آپ نے فرمایا: "اے ابو سلیمان! میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ قیامت میں میرے نانا پاک میرا پلہ پکڑ لیں کہ کیوں تو نے میری متابعت کا حق ادا نہیں کیا اور یہ فرض نسبی اور قومی شرافت پر منحصر نہیں بلکہ یہ اللہ کے حضور میں اچھے عمل پر موقوف ہے۔" حضرت داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ رونے لگے اور کہنے لگے: "بارِ خدایا! جس شخص کی طینت نبوت کے پانی سے گوندھی گئی ہے، اس کی طبیعت کی ترکیب برہان اور دلیل کے اُصولوں سے ہوئی ہے، اس کا نانا پاک رسول اللہ ﷺ اور ماں حضرت بتول (فاطمتہ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا) ہے۔ وہ اتنا

---

[1] منہ پھیرنا [2] وہ نام جس میں ماں باپ یا بیٹے بیٹی کی طرف نسبت پائی جائے، اسے کنیت کہتے ہیں۔

حیران و پریشان ہے تو بھلا داؤد کون ہے جو اپنے عمل پر مغرور ہو۔"

نیز آپ سے روایت ہے کہ ایک روز آپ اپنے غلاموں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ان سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے: "آؤ آپس میں یہ بیعت و عہد کرلیں کہ جو کوئی ہم میں سے نجات پا جائے، قیامت کے روز وہ سب کی شفاعت کرے۔" یہ سن کر انہوں نے عرض کیا: "اے رسول اللہ ﷺ کے بیٹے! آپ کو ہماری شفاعت کی کیا حاجت ہے کہ آپ کے نانا پاک ﷺ ساری خلقت کے شفیع ہیں۔" آپ نے فرمایا کہ "مجھے اپنے ان افعال کی وجہ سے شرم آتی ہے کہ میں اپنے نانا پاک ﷺ کے روئے مبارک کو دیکھوں" اور یہ سب باتیں نفس کے عیوب دیکھنے کی وجہ سے ہیں۔ یہ صفت اوصافِ کمال میں سے ہے اور تمام مقربانِ الٰہی انبیاء و اولیاء اس صفت سے متصف ہوئے۔

پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِعَبْدٍ خَیْرًا بَصَّرَہٗ بِعُیُوْبِ نَفْسِہٖ (ترجمہ: اللہ تعالیٰ جس بندے کو بھلائی عطا فرمانے کا ارادہ کرتا ہے، اسے اس کے نفس کے عیوب دکھا دیتا ہے) اور جو شخص تواضع سے سر نیچے جھکاتا ہے، اللہ تعالیٰ دونوں جہاں میں اس کا کام سنوار دیتا ہے اور اگر اہل بیت رضوان اللہ علیہم کے تمام مناقب[1] بیان کروں اور ہر ایک کے مناقب علیحدہ شمار کروں تو یہ کتاب اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ طریقت کے ارادت مندوں اور ان کے انکار کرنے والوں میں سے جن کی عقل کو ادراک[2] کا لباس حاصل ہے، ان کی ہدایت[3] کے لیے اہل بیت کا اتنا بیان کافی ہے۔ اب ہم اس کتاب میں رسولِ خدا ﷺ کے اصحابِ صفہ کا ذکر ایجاز اور اختصار کے طور پر لاتے ہیں اور ہم نے اس سے پہلے ایک کتاب تصنیف کی ہے اور اس کا نام "منہاج الدین" رکھا ہے۔ اس میں ہر ایک صاحب صفہ کے مناقب تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ یہاں صرف ان کے نام اور کنیتیں علیحدہ علیحدہ بیان کریں گے تاکہ تمہارا مقصد حاصل ہو۔ اللہ تمہیں عزت دے اور توفیق قبضۂ قدرت الٰہی میں ہے۔

---

[1] اوصاف و فضائل [2] پانا، سمجھ [3] رہنمائی
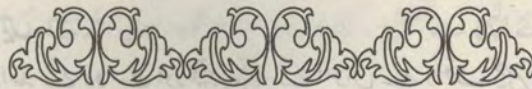
نواں باب

حضراتِ اہلِ صفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم

جان لو کہ اس بات پر ساری اُمت کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم میں سے کچھ اصحاب تھے جو ہمیشہ مسجد نبوی میں رہ کر عبادت کیا کرتے تھے اور دنیا سے دست بردار ہو کر روزی کمانے سے اعراض کر رکھا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے واسطے پیغمبر ﷺ سے خطاب کر کے فرمایا: وَلَاتَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ. (ترجمہ: ان لوگوں کو اپنے پاس سے نہ ہٹایئے جو صبح و شام اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں)۔ محض اس کی خوشنودی کے لیے اور کتاب الٰہی ان کے فضائل پر ناطق[1] ہے اور ان کے فضائل میں پیغمبر ﷺ کی بہت سی احادیث ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں اور ہم نے ان کا کچھ ذکر اس کتاب کے مقدمے میں بیان کر دیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ پیغمبر ﷺ سے روایت کرتے ہیں: وَقَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اَصْحَابِ الصُّفَّةِ فَرَاٰى فَقْرَهُمْ وَ جُهْدَهُمْ وَطِيْبَ قُلُوْبِهِمْ فَقَالَ اَبْشِرُوْا يَا اَصْحَابَ الصُّفَّةِ فَمَنْ بَقِيَ مِنْ اُمَّتِيْ عَلَى النَّعْتِ الَّذِيْ اَنْتُمْ عَلَيْهِ رَاضِيًا بِمَا فِيْهِ فَاِنَّهٗ مِنْ رُفَقَائِيْ فِي الْجَنَّةِ. (ترجمہ: رسول اللہ ﷺ اصحابِ صفہ کے پاس جا کر کھڑے ہوئے اور ان کی مفلسی، مجاہدہ اور ان کے دلوں کا اس حالت میں خوش ہونا دیکھا تو فرمایا: اے اصحابِ صفہ! تمھیں بشارت[2] ہے پس جو شخص میری اُمت میں سے اس صفت پر باقی رہے گا جس پر تم ہو بشرطیکہ تم اس حالت پر راضی ہو، وہ جنت میں میرے رفیقوں میں سے ہوگا)۔

ان اصحابِ صفہ میں سے ایک اللہ جبّار کی درگاہ کے منادی[3] اور حضرت محمد مختار ﷺ کے برگزیدہ حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ ہیں۔

دوسرے، خدائے واحد کے دوست اور پیغمبر ﷺ کے احوال سے واقف حضرت ابو عبد اللہ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہیں۔

تیسرے، مہاجرین و انصار رضوان اللہ علیہم کے سرلشکر اور اللہ غالب کی رضا کی طرف متوجہ حضرت ابو عبید اللہ بن عامر بن عبد اللہ الجراح رضی اللہ عنہ ہیں۔

چوتھے، اصحابِ صفہ میں برگزیدہ اور اہل صفوت کی زینت حضرت ابو الیقظان عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ ہیں۔

پانچویں، علم کا خزانہ اور حلم کا مخزن حضرت ابو مسعود عبد اللہ بن مسعود ہزمی رضی اللہ عنہ ہیں۔

چھٹے، درگاہِ رب العزت سے تمسک کرنے والے عیب و گناہ سے پاک حضرت عتبہ بن مسعود برادر عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔

ساتویں، طریق عزلت کے سالک اور عیوب اور ذلت کی باتوں سے اعراض کرنے والے حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ ہیں۔

آٹھویں، مقام تقویٰ کی دعوت کرنے والے، بلا اور مصیبت الٰہی پر راضی حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ ہیں۔

---

[1] گویا، شاہد [2] خوشخبری [3] اعلان کرنیوالا، موذن

نویں، رضائے الٰہی کی درگاہ کا قصد کرنے والے اور مقام فنا میں بارگاہِ بقاکے طالب حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ ہیں۔
دسویں، سعادت کے سیپ کے موتی اور دریائے قناعت کے تیراک حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ ہیں۔
گیارھویں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بن الخطاب کے بھائی، دونوں جہاں اور مخلوق سے بے نیاز حضرت زید بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔
بارھویں، طلبِ مشاہدات میں مجاہدوں کے مالک حضرت ابو کبشہ رضی اللہ عنہ، پیغمبر اسلام ﷺ کے غلام ہیں۔
تیرھویں، عزت والے، توبہ کرنے والے، ساری خلقت کو چھوڑ کر حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے حضرت ابو المرثد کنانہ بن الحصین العدوی رضی اللہ عنہ ہیں۔
چودھویں، طریق تواضع کو عبور کرنے والے حضرت سالم حذیفتہ الیمانی کے غلام رضی اللہ عنہ ہیں۔
پندرھویں، عذابِ آخرت سے ڈرنے والے اور مخالف شریعت سے بھاگنے والے حضرت عکاشہ بن المحصن رضی اللہ عنہ ہیں۔
سولھویں، مہاجرین و انصار کی زینت، بنی قار کے سردار حضرت مسعود بن ربیع القاری رضی اللہ عنہ ہیں۔
سترھویں، زُہد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے اور شوق میں حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے حضرت ابوذر جندب بن الجنادہ الغفاری رضی اللہ عنہ ہیں۔
اٹھارھویں، پیغمبر ﷺ کے انفاس کے محافظ اور خیرات کے شایاں، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔
اُنیسویں، استقامتِ دین میں ہمیشہ قائم اور متابعت شریعت میں راست رو حضرت صفوان بن بیضا رضی اللہ عنہ ہیں۔
بیسویں، صاحب ہمت، تہمت سے خالی حضرت ابو وردا عویمر بن عامر رضی اللہ عنہ ہیں۔
اکیسویں، درگاہ رجائے الٰہی سے تعلق رکھنے والے اور بارگاہِ رسول اللہ ﷺ کے برگزیدہ حضرت ابو لبانہ بن عبد لمنذر رضی اللہ عنہ ہیں۔
بائیسویں، بحر شرف کے پیراک اور توکل کے صدف کے موتی حضرت عبد اللہ بن بدر الجہنی رضی اللہ عنہ ہیں۔
اگر ہم ان سب اصحابِ صفہ کو بیان کریں تو کتاب طویل ہو جائے اور شیخ ابو عبد الرحمٰن محمد بن الحسین السلمی رضی اللہ عنہ طریقت اور کلام مشائخ کے نقل کرنے والے ہیں، انہوں نے اہل صفہ رضی اللہ عنہم کے احوال پر ایک بے نظیر تاریخ لکھی ہے اور ان کے مناقب، فضائل، نام اور کنیتیں اس میں بیان کی ہیں، لیکن انہوں نے مسطح بن عباد کو بھی منجملہ اصحابِ صفہ کہا ہے اور میں دل سے اس کو دوست نہیں رکھتا کیونکہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کی ابتدا اس نے کی تھی، لیکن ابوہریرہ و ثوبان و معاذ ابن الحارث و تائب ابن خلاب و ثابت و ابولیبر کعب ابن عمرو وہب بن مغفل و عبد اللہ بن انیس و حجاج بن عمر و الاسلمی رضی اللہ عنہم اجمعین، سب انہی اصحابِ صفہ میں سے ہوئے ہیں۔
کبھی کبھی کسی سبب سے دنیا کی دوسری خدمات میں شامل ہو جاتے تھے، لیکن سب ایک درجے میں تھے اور حقیقت میں وہ زمانہ خیر القرون کا زمانہ تھا اور جس درجے میں بھی وہ تھے، ہر زمانے سے بہترین اور فاضل ترین خلق تھے، اس لیے کہ خداوند تعالیٰ نے ان کو پیغمبر ﷺ کی صحبت کا شرف بخشا اور ان کے دلوں کو تمام عیوب سے محفوظ رکھا تھا، چنانچہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے:

خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ (اَلْحَدِيْث)۔ (ترجمہ: سب سے بہتر میرا زمانہ ہے، پھر وہ لوگ جو اُن کے بعد آنے والے ہیں، پھر وہ لوگ جو ان کے بعد آنے والے ہیں)۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ۔ (ترجمہ: ایمان میں سبقت کرنے والے پہلے مہاجرین، انصار اور وہ لوگ جنھوں نے خلوص کے ساتھ ان کا اتباع کیا)۔

اب ہم اس کتاب میں بعض تابعین رحمہم اللہ اجمعین کا ذکر کریں گے تاکہ پورا فائدہ حاصل ہو اور زمانے ایک دوسرے سے متصل ہو جائیں۔
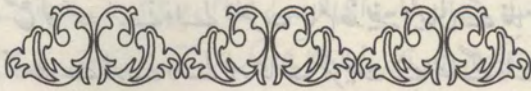
دسواں باب

تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے صوفیائے کرام
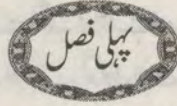
حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

آپ تابعین رضی اللہ عنہم میں سے ہیں۔ اُمت کے آفتاب اور دین و مذہب کی شمع حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ۔ آپ اہل تصوف کے نزدیک مشائخ کبار میں سے تھے اور زمانہ رسول ﷺ میں موجود تھے، مگر دو وجوہات کی بنا پر پیغمبر ﷺ کے دیدار کا شرف حاصل نہ کر سکے:

اوّل: حال (جذب) کے غلبے کی وجہ سے،

دوم: اپنی والدہ کا حق ادا کرنے کی وجہ سے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا تھا کہ "قبیلہ قرن کا ایک مرد ہے جس کا نام اویسؓ ہے، وہ قیامت کے روز ربیعہ و مضر کی بھیڑوں کے بالوں کے برابر میری اُمت کی شفاعت کرے گا۔" آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ اور علیؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ "تم اس کو دیکھو گے، وہ چھوٹے اور درمیانے قد کا لمبے بالوں والا آدمی ہے اور اس کے بائیں پہلو پر ایک درہم کے برابر سفید داغ ہے، جو چنبل کے سوا کسی اور چیز کا داغ نہیں اور ہاتھ کی ہتھیلی پر بھی ویسا ہی داغ ہے اور میری اُمت میں ربیعہ و مضر کی بکریوں کی تعداد کے برابر شفاعت کرے گا۔ جب تم دیکھو تو اس کو میرا سلام پہنچا دو اور اس سے کہو کہ میری اُمت کے لیے دعا کرے۔"

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد مکہ میں تشریف لائے اور امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ آپ کے ہمراہ تھے تو آپ نے خطبے میں فرمایا: یَا اَهْلَ نَجْدٍ قُوْمُوْ۔ (ترجمہ: اے اہل نجد! اُٹھو)۔ اہل نجد اُٹھے تو آپ نے ان سے پوچھا کہ "کیا کوئی شخص تمہارے درمیان قبیلہ قرن کا بھی ہے؟" انہوں نے جواب دیا: "ہاں۔" چنانچہ کچھ لوگوں کو آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے اویس قرنی رضی اللہ عنہ کا حال پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ "اویس نامی دیوانہ ہے کہ آبادی میں نہیں آتا اور نہ کسی شخص کے پاس بیٹھتا ہے اور جو کچھ لوگ کھاتے ہیں، وہ نہیں کھاتا، غم اور خوشی نہیں جانتا، جب لوگ ہنستے ہیں تو وہ روتا ہے، جب وہ روتے ہیں تو وہ ہنستا ہے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے کہا: "وہ تو ہمارے اونٹوں کے ساتھ جنگل میں ہے۔" ہر دو امیر (عمر علی رضی اللہ عنہما) اُٹھے اور ان کے پاس چلے گئے۔ آپ اس وقت نماز میں تھے۔ جب وہ فارغ ہوئے تو انہیں سلام کیا اور اپنے پہلو اور ہتھیلی کا نشان دکھایا تب ان کو درست پایا۔ پھر انہوں نے ان سے دعا کی درخواست کی، پیغمبر ﷺ کا سلام انہیں پہنچایا اور اُمت کے لیے دعا کرنے کے لیے فرمائش کی۔ یہ حضرات کچھ دیر ان کے پاس ٹھہرے۔ تب انہوں نے کہا: "آپ کو تکلیف ہوئی، اب واپس لوٹ جایئے کہ قیامت نزدیک ہے، تب ہماری وہاں ایسی ملاقات ہوگی کہ کبھی اس سے محروم نہ ہوں گے، کیونکہ میں سفر قیامت کا سامان کرنے میں مشغول ہوں۔" جب قبیلہ قرن کے لوگ واپس گئے تو ان کے دلوں میں اویس رضی اللہ عنہ کا مرتبہ اور عزت بڑھ گئی چنانچہ وہ وہاں سے کوفہ چلے آئے۔ ہرم بن حیان رضی اللہ عنہ

نے ایک روز ان کو دیکھا اور اس کے بعد کسی نے نہیں دیکھا۔ جب حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کے عہد خلافت میں فتنہ برپا ہوا، تب وہ وہاں آئے اور حضرت امیر المومنین کرم اللہ وجہہ کے ہمراہ جنگِ صفین کے روز آپ کے دشمنوں کے ساتھ لڑکر شہادت پائی۔ عَاشَ حَمِیْدًا وَمَاتَ شَھِیْدًا رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ۔ (ترجمہ: اللہ ان سے راضی ہو۔ زندہ رہے تو حمد کے لائق اور وفات پائی تو شہید)۔ آپ سے ہی روایت ہے: اَلسَّلَامَۃُ فِی الْوُحْدَۃِ۔ (ترجمہ: سلامتی تنہائی میں ہے)۔ اس لیے جس کا دل تنہا ہو، وہ غیر کے خیال سے الگ ہوتا ہے اور اپنے تمام احوال میں خلقت سے بے تعلق ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ سب آفات سے محفوظ رہتا ہے اور سب لوگوں سے منہ پھیر لیتا ہے لیکن اگر کوئی یہ خیال کرے کہ وحدت تنہا جینا ہے تو یہ محال ہے، کیونکہ جب تک شیطان کو کسی کے دل سے صحبت ہوتی ہے اور نفس (امارہ[1]) کا اس کے سینے میں غلبہ ہوتا ہے اور جب تک دنیا و آخرت کا فکر اور خلقت کا خیال ہوتا ہے، تب تک وحدت نہیں ہوتی اس لیے کہ خواہ کسی اصل چیز سے آرام ہو یا اس کے خیال سے، دونوں باتیں ایک ہی ہیں۔ پس جو شخص حقیقت میں وحید (تنہا) ہوتا ہے اگرچہ لوگوں سے صحبت رکھے، اس کی صحبت وحدت کی مزاحم نہیں ہوتی اور جو شخص لوگوں میں مشغول ہوتا ہے، گوشہ نشینی اس کی فراغت کا سبب نہیں ہوتی۔ پس لوگوں سے قطع تعلق محبت الٰہی کے بغیر نہیں ہوتا۔ جس کو واقعی اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے، لوگوں سے ظاہری میل جول اس کو کچھ نقصان نہیں دیتا اور جس کو لوگوں سے محبت ہو، اس کے دل پر محبت الٰہی کا گزر نہیں ہوتا اور نہ اس کی اسے کچھ خبر ہی ہوتی ہے۔ لِاَنَّ الْوُحْدَۃَ صِفَۃُ عَبْدٍ صَافٍ سَمِعَ قَوْلَہٗ تَعَالٰی اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ۔ (ترجمہ: کیونکہ تنہائی و دنیا سے حقیقی علیحدگی) ایک ایسے صاف باطن آدمی کی صفت ہے، جس نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول سن رکھا ہے (کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟)

دوسری فصل
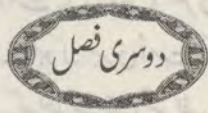
حضرت ہرم بن حیان رضی اللہ عنہ:

آپ تابعین رضی اللہ عنہ میں سے ہیں، صفائی باطن کی شمع اور وفائے عہد کی کان، حضرت ہرم بن حیان رضی اللہ عنہ۔ آپ طریقت کے بزرگوں میں سے تھے اور عمل میں پورا حصہ رکھتے تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت کا شرف پایا تھا۔ آپ نے حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کی زیارت کا قصد کیا۔ جب قبیلہ قرن کے پاس پہنچے تو وہ وہاں سے چلے گئے تھے۔ ناامید ہو کر آپ مکہ کی طرف آئے تو معلوم ہوا کہ وہ کوفہ میں رہتے ہیں۔ وہاں آئے تو ملاقات نہ ہوئی۔ کچھ مدت تک تو وہاں ٹھہرے۔ جب وہاں سے بصرہ آنا چاہا تو راستے میں دریائے فرات کے کنارے پر ان سے ملاقات ہوگئی جب کہ آپ وضو کر رہے تھے۔ انہوں نے گدڑی پہن رکھی تھی۔ اس وجہ سے ان کو پہچان لیا۔ جب انہوں نے دریا کے کنارے سے ذرا ہٹ کر بالوں کو کنگھی کی تو ہرم بن حیانؓ نے سامنے آکر ان کو سلام کیا۔ انہوں نے کہا: "اے ہرم بن حیانؓ! تم پر بھی سلام ہو۔" انہوں نے پوچھا: "آپ نے مجھے کس طرح پہچان لیا کہ میں ہرم ہوں؟" آپ نے جواب دیا: عَرَفَتْ رُوْحِیْ رُوْحَکَ۔ (ترجمہ: میری روح نے تمہاری روح کو پہچان لیا)۔ تھوڑی دیر بیٹھے، پھر ان کو رُخصت کر دیا۔ ہرم رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھ سے زیادہ تر باتیں ہر دو امیر (عمر و علی رضی اللہ عنہما) کے متعلق کرتے رہے۔ میرے پاس آپ نے ان دونوں سے روایت کی اور ان دونوں نے نبی ﷺ سے کہ آپ نے فرمایا

[1] انسان کی وہ مخفی قوت جو اسے بار بار گناہ کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَاتِ وَلِکُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰی فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوِامْرَاَۃٍ یَتَزَوَّجُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَا ھَاجَرَ اِلَیْہِ(الحدیث۔)
(ترجمہ: بلاشبہ اعمال کی صحت نیت پر موقوف ہے اور ہر شخص کو وہ ملتا ہے جو اس نے نیت کی۔ پس جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہے، اس کی ہجرت واقعی اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف ہے اور جس کی ہجرت دنیا کے لیے ہے کہ اس کو حاصل کرے یا کسی عورت کے لیے ہے کہ اس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی چیز کی طرف ہے، جس کے حاصل کرنے کے لیے اس نے ہجرت کی) پھر آپ نے مجھ سے کہا: عَلَیْكَ بِقَلْبِكَ (ترجمہ: تجھ پر اپنے دل کی حفاظت لازم ہے)۔ اس کلام کے دو معنی ہیں:

اوّل : یہ کہ مجاہدے میں اپنے دل کو حق کے تابع کر دے،

دوم : یہ کہ اپنے آپ کو دل کے تابع کر دے اور یہ دونوں اصل قوی ہیں۔ دل کو حق کے تابع کرنا حق تعالیٰ کے ارادت مندوں کا کام ہے کہ شہوتِ نفس کے غلبے اور خواہش نفس کی محبت سے اس کو خالی کر لیں، ناموافق خیالات آہستہ آہستہ دل سے دور کر دیں، اور صحت عمل اور امور طریقت کی نگہداشت کی تدبیر میں اپنی نظر کو آیات الٰہی میں لگا دیں تاکہ محبت حق کا محل ہو جائیں۔ اپنے آپ کو دل کے تابع کر دینا کاملوں کا کام ہے۔ حق تعالیٰ نے جن کے دلوں کو اپنے جمال کے نور سے منور کر دیا ہے اور ظاہر کے تمام اسباب و خلل سے ان کو نجات بخشی ہے اور اونچے درجے پر پہنچا کر قرب کی خلعت سے نوازا ہے اور اپنے الطاف سے ان پر تجلی فرما کر اپنے قرب و مشاہدہ سے محبت کی نظر ڈالی ہے۔ تب ان کے جسم کو دل کے موافق کر دیا ہے۔ پس وہ پہلا گروہ صاحبِ قلوب ہوتے ہیں اور یہ دوسرا گروہ مغلوب القلوب اور صاحب قلوب دلوں کے مالک اور باقی صفت ہوتے ہیں اور مغلوب القلوب فانی صفت، نیز اس مسئلے کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ہوتی ہے: اِلَّا عِبَادَكَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ (ترجمہ: مگر تیرے بندے اخلاص والے یا خالص کیے گئے)۔ اس میں قرائتیں ہیں۔ مخلصین بکسر لام و مخلصین بفتح لام، مخلص بکسر لام فاعل اور باقی صفت ہوتا ہے (خالص کیا گیا، چنا گیا)۔ یہ مسئلہ کسی دوسرے مقام پر انشاء اللہ اس سے زیادہ مفصل و مشرح بیان کروں گا۔ حقیقت میں وہ لوگ جو فانی صفت ہوتے ہیں، وہ زیادہ فضیلت والے ہوتے ہیں اور اپنے جسم کو دل کے موافق کر دیتے ہیں، کیونکہ ان کے دل حضرت حق کی تحویل[1] میں ہوتے ہیں اور اس کے مشاہدے میں بسے ہوئے رہتے ہیں، بہ نسبت اس گروہ کے جو باقی صفت ہوتے ہیں اور دل کو تکلف سے امر الٰہی کے موافق کرتے ہیں اور اس مسئلے کی بنیاد صحو[2] اور سکر[3] اور مشاہدہ اور مجاہدہ کے اصل پر ہے، واللہ اعلم۔

تیسری فصل
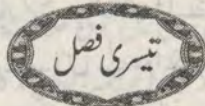
حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے ہیں۔ اہل زمانہ میں یکتا، ابو علی الحسن بن ابی الحسن البصری رضی اللہ عنہ اور ایک گروہ آپ کی کنیت ابو محمد بتلاتے ہیں جبکہ دوسرا گروہ ابو سعید۔ اہل طریقت کے نزدیک آپ کی بڑی قدر و مرتبہ ہے۔ علم معاملات میں آپ کے لطیف اشارات ہیں۔ حکایات میں میں نے پڑھا ہے کہ ایک اعرابی نے آپ کے پاس

---
[1] حوالہ، سپرد　[2] ہوشیاری　[3] بے ہوشی

آکر صبر کی حقیقت دریافت کی تو آپ نے فرمایا: "صبر دو قسم کا ہے:

اوّل: مصیبتوں اور تکلیفوں میں صبر کرنا،

دوم: ان امور سے باز رہنے پر صبر کرنا جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں باز رہنے کا حکم دیا ہے اور ان کی متابعت سے منع فرمایا ہے۔" اعرابی نے کہا: اَنْتَ زَاهِدٌ مَا رَأَيْتُ اَزْهَدَمِنْكَ۔ (ترجمہ: آپ زاہد ہیں، میں نے آپ سے بڑھ کر کوئی زاہد نہیں دیکھا)۔ امام حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا: "اے اعرابی! میرا زہد سب رغبت ہے اور میرا صبر بے قراری۔" یہ سن کر اعرابی نے کہا: "اس کلام کی تفسیر بیان کیجیے کیونکہ اس سے تو میرا اعتقاد متزلزل و پریشان ہوگیا ہے۔" آپ نے فرمایا: "میرا صبر مصیبت یا فرمانبرداری میں دوزخ سے میرے خوف کو ظاہر کرتا ہے اور یہ عین جزع[1] ہے اور دنیا سے میرا زہد[2] آخرت کی خواہش ہے اور یہ عین رغبت ہے۔ خوش نصیب ہے وہ شخص جو درمیان سے اپنا حصہ اٹھالے تاکہ اس کا صبر محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہو، نہ دوزخ کے عذاب سے بچنے کے لیے اور اس طرح بھی حق تعالیٰ کے لیے ہو، نہ بہشت میں پہنچنے کے لیے اور یہی اخلاص کی علامت ہے۔"

آپ سے یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہے: اِنَّ صُحْبَتَ الْاَشْرَارِ تُوْرِثُ سُوْءَ الظَّنِّ بِالْاَخْيَارِ (ترجمہ: شریر لوگوں کی صحبت نیک لوگوں کے ساتھ بدظنی پیدا کرتی ہے)۔ جو شخص اس گروہ کے برے لوگوں سے صحبت اختیار کرتا ہے، وہ اس گروہ کے نیک لوگوں سے بدگمان ہو جاتا ہے اور یہ بات بالکل متفق علیہ ہے اور اس زمانے کے لوگوں کے بالکل حسب حال ہے، جو سب حضرات حق تعالیٰ کے عزیزوں کے منکر ہیں اور ایسا اس لیے ہوا ہے کہ جب لوگ ان رسمی صوفیوں سے ملتے تو ان کے افعال کو خیانت پر، ان کی زبان کو جھوٹ اور غیبت پر، ان کے کانوں کو بے ہودہ اور فضول باتوں کے سننے پر، ان کی آنکھ کو لہو و شہوت اور ان کے ارادوں کو حرام و شبہ[3] حرام کے جمع کرنے پر مصروف دیکھتے ہیں تو خیال کرتے ہیں کہ تمام صوفیوں کا یہی معاملہ اور مذہب ہے، حالانکہ ایسا نہیں بلکہ ان کا فعل فرماں برداری ہے اور ان کی زبان کلام حق اور ثمرہ محبت الٰہی پر ناطق ہے اور ان کا بھید محبت الٰہی کا محل اور ان کا کان حقیقت میں سماع حق کا اور آنکھ مشاہدہ تجلیات اور ان کی ہمت رویت حق کا محل ہے۔ یہ سب اسرارِ الٰہی ہیں اور اگر کچھ لوگ ایسے پیدا ہوگئے ہیں جو جماعت صوفیا اور ان کی سیرت و کردار میں خیانت کرتے ہیں، لیکن ان خیانت کرنے والوں کی خیانت خود ان سے تعلق رکھتی ہے نہ کہ جہاں کے ان شرفا اور زمانے کے سادات کے ساتھ۔

پس جو شخص کسی قوم کے شریر لوگوں سے میل جول رکھتا ہے، وہ خود اس کی شرارت اور برائی ہے کیونکہ اگر اس میں کچھ بھلائی ہوتی تو وہ نیکیوں کی صحبت اختیار کرتا۔ پس ہر ایک شخص کو خود اپنے آپ کو ملامت کرنی چاہیے کہ وہ ایک نالائق اور ناموافق شخص سے صحبت اختیار کرتا ہے اور صوفیائے کرام کے منکر سب سے زیادہ شریر اور رذیل ہیں کہ ان کی صحبت رذیلوں اور شریروں سے ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اپنے نفس کی خواہش نہ پاکر ان کے منکر ہوگئے ہیں اور ان شریروں اور رذیلوں کی اقتدا کر کے ہلاک ہوگئے ہیں۔ برخلاف ان نیکوں اور عزیزانِ الٰہی کے، جنہوں نے ان صوفیا میں سے نیک لوگوں کو رضا کی آنکھ سے دیکھا اور ان کی صحبت کو جان و دل سے خریدا اور سارے جہاں میں سے ان بزرگوں کے طریق کو اختیار کر کے ان کی برکات سے دونوں جہاں کا مقصود پالیا اور سب سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ اسی معنی میں کسی بزرگ نے کہا ہے:

---

[1] بے قراری [2] دنیا سے بے تعلق ہونا [3] جس پر حرام کا گمان کیا جائے، جو حرام کے قریب ہو۔

؎ فَلَا تَحۡقِرَنۡ نَفۡسِیۡ وَاَنۡتَ حَبِیۡبُھَا　　فَکُلُّ امۡرِیٍٔ یَصۡبُوۡا اِلٰی فِیۡ مَنۡ یُجَالِسُ

(ترجمہ: پس میرے نفس کو حقیر نہ جان، درآنحالیکہ تو اس کا محبوب ہے کیونکہ ہر شخص اپنے ہم جنس کا مشتاق ہوتا ہے)۔

چوتھی فصل
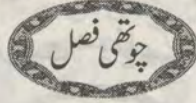
حضرت سعید ابن المسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ تابعین رضی اللہ عنہم میں سے ہیں۔ علما کے سردار اور فقیہوں کے فقیہہ، حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ، جن کی شان بہت بڑی، قدر بہت بلند، ان کا قول قابل عزت اور سینہ تعریف کے قابل تھا۔ علم فقہ و توحید و حقائق طریقت و تفسیر و شعر ولغت وغیرہ تمام فنون میں آپ کے مناقب بے شمار ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ بظاہر ہوشیار اور باطن میں پارسا تھے، نہ بظاہر پارسا اور باطن میں ہوشیار اور یہی طریق تمام مشائخ رضی اللہ عنہم کے نزدیک عمدہ اور قابل تعریف ہے۔ آپ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہے: اِرۡضَ بِالۡیَسِیۡرِ مِنَ الدُّنۡیَا مَعَ سَلَامَةِ دِیۡنِكَ كَمَا رَضِیَ قَوۡمٌ بِكَثِیۡرِهَا مَعَ ذَهَابِ دِیۡنِهِمۡ۔ (ترجمہ: تو اپنے دین کی سلامتی کے ساتھ تھوڑی سی دنیا پر راضی ہو، جس طرح کہ کچھ لوگ باوجود اپنے دین کے ضائع ہو جانے کے بہت سی دنیا پر راضی ہوئے ہیں) یعنی دین کی سلامتی کے ساتھ فقر وافلاس اس غنا اور دولت مندی سے بدرجہا بہتر ہے جس میں دین میں غفلت برتی جاتی ہو کیونکہ فقیر جب دل کو دیکھتا ہے تو زیادتی دنیا کا اندیشہ نہیں پاتا اور جب ہاتھ دیکھتا ہے تو قناعت پاتا ہے اور غنی جب دل کو دیکھتا ہے تو دنیا کی زیادتی میں مبتلا پاتا ہے اور جب ہاتھ دیکھتا ہے تو ناپاک دنیا پاتا ہے۔

پس اللہ کے دوستوں کا اس کی خداوندی پر بلا غفلت راضی ہونا خدا سے غافل لوگوں کی پر غرور دنیا پر راضی ہونے سے بہتر ہے، اور مصیبت پر حسرت و ندامت کے بغیر بسر کرنا اس نعمت سے کہیں زیادہ بہتر ہے جس کے ساتھ ذلت اور معصیت ہو۔ پس جب مصیبت آتی ہے تو غافل لوگ کہتے ہیں الحمد للہ کہ جسم پر نہیں آئی، لیکن دوستانِ الٰہی کہتے ہیں الحمد للہ کہ بدن پر آئی، میرے دین پر نہیں، کیونکہ اگر جسم پر مصیبت ہو اور دل میں بقا ہو تو مصیبت جسم کے لیے خوشی کا موجب ہو جاتی ہے اور جب دل غفلت میں ہو تو جسم اگرچہ نعمت میں ہو، وہ نعمت اس پر عذاب ہو جاتی ہے اور حقیقت میں تھوڑی دنیا پر راضی ہونا زیادہ دنیا پر راضی ہونے کے برابر ہے اور زیادہ دنیا پر راضی ہونا بھی تھوڑی دنیا پر راضی ہونے کے برابر ہے۔ دنیا تھوڑی بھی ویسی ہے جیسی بہت۔ نیز یہ بھی آپ سے روایت ہے کہ ایک روز آپ مکہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک آدمی نے آپ کی خدمت میں آکر کہا کہ "مجھے وہ حلال چیز بتائیے جس میں کوئی حرام نہ ہو اور وہ حرام جس میں کوئی حلال نہ ہو" تو آپ نے فرمایا: ذِكۡرُ اللّٰهِ حَلَالٌ لَیۡسَ فِیۡهِ حَرَامٌ وَذِكۡرُ غَیۡرِهٖ حَرَامٌ لَیۡسَ فِیۡهِ حَلَالٌ۔ (ترجمہ: فقط اللہ کا ذکر حلال ہے، جس میں کوئی حرام نہیں اور غیر اللہ کا ذکر حرام ہے، جس میں کوئی حلال نہیں) اس لیے کہ ذکر الٰہی میں نجات ہے اور ذکر غیر حق میں ہلاکت، اور توفیق قبضۂ الٰہی میں ہے۔

گیارہواں باب

تبع تابعین میں سے صوفیا کے امام رضی اللہ عنہم
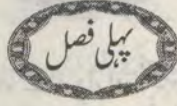
حضرت حبیب عجمی رحمتہ اللہ علیہ:

آپ تبع تابعین میں سے ہیں۔ طریقت کے بہادر اور شریعت میں مضبوط حضرت حبیب عجمی رحمتہ اللہ علیہ۔ آپ بہت بلند ہمت، صاحب عزت اور مردان خدا کے مراتب میں بہت بڑا درجہ رکھتے تھے۔ آپ کو شروع میں حضرت حسن بصریؒ کے ہاتھ پر توبہ نصیب ہوئی۔ آپ ابتدائے عمر میں لوگوں کو روپیہ سود پر دیا کرتے تھے اور ہر قسم کی برائی کا اِرتکاب کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے آپ کو سچی توبہ کی توفیق عطا فرمائی اور بارگاہِ رب العزت کی طرف رجوع کیا۔ عملِ طریقت اور اس کا ضروری علم حضرت حسن بصریؒ سے سیکھا۔ آپ کی زبان عجمی تھی اور عربی پر نہ چلتی تھی۔ خدا تعالیٰ نے آپ کو بہت سی کرامات کے ساتھ مخصوص فرمایا تھا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جو درجہ آپ کو حاصل تھا، وہ اس واقعے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ایک شام حضرت حسن بصریؒ آپ کے عبادت خانے کے دروازے پر پہنچے تو آپ اس وقت مغرب کی تکبیر کہہ کر نماز میں کھڑے ہو رہے تھے۔ حضرت حسن بصریؒ اندر داخل ہوئے اور آپ کی اقتدا نہ کی۔ اس لیے کہ آپ کی زبان عربی اور قرآن شریف کی قرأت پر اچھی طرح جاری نہ ہوتی تھی۔ جب وہ رات کو سوئے تو اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھ کر عرض کیا کہ "بارِ خدایا! تیری رضا کس چیز میں ہے؟" ارشاد ہوا کہ "اے حسن! میری رضا تجھے مل گئی تھی لیکن تو نے اس کی قدر نہ جانی۔" آپ نے عرض کیا: "اے اللہ! یہ کس طرح؟" فرمایا: "اگر گزشتہ رات تو حبیب کے پیچھے نماز پڑھ لیتا تو اس کی صحیح نیت تجھے اس کی عبارت (قرأت) کے انکار سے روکتی تو میں تجھ سے راضی ہوتا۔" صوفیا کے درمیان یہ بات مشہور ہے کہ حضرت حسن بصریؒ حجاج بن یوسف ثقفی کے لوگوں سے بھاگ کر آپ کے عبادت خانے میں گھس گئے۔ ان لوگوں نے آکر حضرت حبیب عجمی رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا کہ "حسن بصریؒ کہاں ہیں؟ آپ نے ان کو دیکھا ہے؟" آپ نے فرمایا: ہاں! ان لوگوں نے کہا: "وہ کہاں گئے؟" آپ نے فرمایا: "ابھی اس عبادت خانے میں داخل ہوئے ہیں۔" جب وہ لوگ اندر داخل ہوئے تو وہاں کسی کو نہ دیکھا۔ انہوں نے سمجھ کر کہ حبیب عجمی رحمتہ اللہ علیہ ان سے تمسخر کرتے ہیں، آپ سے سخت کلامی کی کہ تو نے جھوٹ بولا کہ وہ یہاں ہیں۔ آپ نے قسم کھائی کہ میں سچ کہتا ہوں۔ اسی طرح دو تین دفعہ وہ لوگ اندر گئے اور آپ کو نہ پایا تو واپس چلے گئے۔ تب حضرت حسن بصریؒ باہر آکر کہنے لگے کہ "اے حبیب! میں جانتا ہوں کہ تیری برکت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے ان پر ظاہر نہ فرمایا، لیکن یہ آپ نے کیوں فرمایا کہ وہ حسن (رحمتہ اللہ علیہ) یہیں ہے۔" آپ نے جواب دیا۔ "اے اُستاد! میرے سچ بولنے کی وجہ سے ہی انہوں نے آپ کو نہ دیکھا، اگر میں جھوٹ بولتا تو مجھے اور آپ دونوں کو رسوا کرتے۔" آپ کی اس قسم کی بہت سی کرامتیں ہیں۔ آپ کے متعلق مروی ہے کہ آپ سے کسی نے پوچھا کہ خدا کی رضا کس چیز میں ہے؟ تو آپ نے فرمایا: فِیْ قَلْبٍ لَیْسَ فِیْهِ غُبَارُ النِّفَاقِ (ترجمہ: خدا کی رضا اس دل میں ہے جس میں نفاق کا غبار

نہیں) اس لیے کہ منافقت، موافقت کی ضد ہے اور رضاعین موافقت ہے اور محبت کو نفاق سے کچھ واسطہ نہیں اور اس کا محل رضا ہے۔ پس رضا بقضا دوستانِ حق کی صفت ہے اور نفاق دشمنانِ حق کی۔ یہ مسئلہ بہت بڑا ہے جسے دوسرے مقام پر انشاء اللہ تعالیٰ ہم بیان کریں گے۔ توفیق قبضۂ الٰہی میں ہے اور اسی کی اعانت ہے۔

دوسری فصل
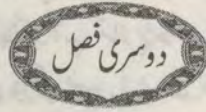
حضرت مالک بن دینار رحمتہ اللہ علیہ:

آپ تبع تابعین رحمتہ اللہ علیہم میں سے ہیں۔ اہل محبان الٰہی کے نقیب[1] اور تمام جن وانس کی زینت، حضرت مالک بن دینار رحمتہ اللہ علیہ۔ آپ حسن بصری کے محرم[2] اسرار اور اس طریقت کے بزرگوں میں سے ہوئے ہیں۔ آپ کی کرامتیں مشہور ہیں اور نفس کی ریاضتوں میں آپ کی خصلتیں لوگوں میں مذکور ہیں۔ آپ کے والد حضرت دینار غلام تھے اور حضرت مالک کی ولادت آپ کے والد کی غلامی کے زمانے میں ہوئی تھی اور آپ کی توبہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک رات آپ ایک جماعت کے ساتھ عیش وحرب میں مشغول تھے۔ جب لوگ سوگئے تو آپ کے باجے سے جو آپ بجارہے تھے، آواز آئی: یَا مَالِكُ مَا لَكَ اَنْ لَاتَتُوْبَ (ترجمہ: اے مالک! تجھے کیا ہوگیا کہ توبہ نہیں کرتا؟ چنانچہ آپ سب باتوں سے دست بردار ہوگئے اور حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں آکر سچی توبہ کی۔ آپ کا معاملہ اس حد تک پہنچ گیا کہ ایک دفعہ آپ کشتی پر سوار تھے کہ کسی سوداگر کا ایک قیمتی موتی کشتی میں غائب ہوگیا، چونکہ آپ سب لوگوں سے اجنبی تھے، اس لیے لوگوں نے موتی کے چرانے کی تہمت آپ پر لگائی۔ آپ نے اسی وقت آسمان کی طرف سر اٹھایا تو فوراً جتنی مچھلیاں پانی میں تھیں، باہر نکل آئیں اور ہر ایک نے ایک ایک موتی اپنے منہ میں لے رکھا تھا۔ آپ نے ان میں سے ایک مچھلی کے منہ سے ایک موتی لے کر اس شخص کو دے دیا اور اسی وقت کشتی سے اُترے اور پانی کی سطح پر قدم رکھ کر دریا پر چلنے لگے یہاں تک کہ کنارے پر پہنچ گئے۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایاہے: اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَیَّ الْاِخْلَاصُ فِی الْاَعْمَالِ۔ (ترجمہ: میرے نزدیک سب سے پسندیدہ عمل عملوں میں اخلاص ہے)۔ اس لیے کہ عمل اخلاص ہی سے عمل بنتا ہے۔ گویا اخلاص عمل کے لیے ایسا ہے جیسے روح جسم کے لیے۔ جس طرح جسم بلا روح ایک جماد[3] ہوتا ہے، اسی طرح اخلاص کے بغیر فضول ہے لیکن اخلاص منجملہ اعمال باطن کے ہے اور عبادت منجملہ اعمال ظاہر کے ہے اور ظاہر کے اعمال باطنی اعمال سے کمال حاصل کرتے ہیں اور اعمال باطن عمل ظاہر سے قیمت حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص ہزار سال تک بھی دل میں اخلاص (بے عمل) رکھے لیکن جب تک عملِ ظاہر اس کے اخلاص سے نہ ملے، وہ اخلاص نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص ہزار سال تک بظاہر عمل کرتا رہے لیکن جب تک اخلاص اس کے ظاہری عمل سے نہ ملے، اس کا وہ عمل عبادت میں شمار نہیں ہوتا۔

تیسری فصل
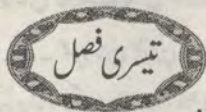
حضرت حبیب بن سلیم الراعی رحمتہ اللہ علیہ:

آپ تبع تابعین رحمہم اللہ میں سے ہیں۔ بہت بڑے فقیر اور سب اولیاء کے امیر حضرت ابوحلیم حبیب بن سلیم الراعی رحمتہ اللہ علیہ۔ مشائخ میں بڑا رُتبہ رکھتے ہیں اور تمام حالات میں آپ کے خوارق[4] اور دلائل بہت ہیں۔ آپ

[1] سردار، دوست [2] رازداں [3] پتھر [4] خلافِ عادت چیزیں

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھنے والے تھے۔ پیغمبر ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهِ۔ (ترجمہ: مومن کی صحیح نیت اس کے عمل سے بہتر ہے)۔ آپ بھیڑ بکریاں رکھتے تھے اور دریائے فرات کے کنارے پر قیام فرماتے۔ آپ کا طریقہ گوشہ نشینی تھا۔ ایک بزرگ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں آپ کے پاس سے گزرا۔ میں نے دیکھا کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں اور ایک بھیڑیا آپ کی بکریوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں اس پیر کی ضرور زیارت کروں گا کہ اس میں بزرگی کی بہت بڑی علامت دیکھتا ہوں۔ کچھ دیر میں منتظر رہا یہاں تک کہ آپ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے انہیں سلام کیا؟ آپ نے فرمایا: "اے لڑکے! کس کام کو آیا ہے؟" میں نے کہا: "آپ کی زیارت کو۔" انہوں نے فرمایا: "اللہ تجھے نیک کرے۔" میں نے کہا: "اے شیخ! ایک بھیڑیے کی بکریوں کے ساتھ موافقت کے کیا معنی؟" آپ نے فرمایا: "مطلب یہ ہے کہ بکریوں کا چرواہا حق تعالےٰ[1] سے موافقت رکھتا ہے۔" یہ کہہ کر آپ نے لکڑی کا ایک پیالہ ایک پتھر کے نیچے رکھا۔ میں نے دیکھا کہ اس سے دو چشمے پھوٹ نکلے۔ ایک دودھ کا، دوسرا شہد کا۔ فرمایا: "لو، پی لو۔" میں نے عرض کیا: "اے شیخ! یہ درجہ آپ نے کیسے حاصل کیا؟" آپ نے فرمایا: "حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی متابعت سے۔" پھر آپ نے فرمایا: "اے لڑکے! موسےٰ علیہ السلام کی قوم کے لئے باوجودیکہ وہ آپ کی مخالف تھی، پتھر سے پانی کا چشمہ جاری کیا گیا تھا حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت محمد ﷺ کے درجے پر نہ تھے۔ جب میں حضرت محمد ﷺ کی پیروی کرتا ہوں تو بھلا پتھر مجھے دودھ اور شہد کیوں نہ دے؟ جب کہ حضرت محمد ﷺ، حضرت موسےٰ علیہ السلام سے بدرجہا بہتر تھے۔" میں نے عرض کی کہ "مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔" آپ نے فرمایا: لَا تَجْعَلْ قَلْبَكَ صُنْدُوْقَ الْحِرْصِ وَ بَطْنَكَ وِعَاءَ الْحَرَامِ (ترجمہ: اپنے دل کو حرص دنیا کا صندوق اور اپنے پیٹ کو حرام کا برتن نہ بنا) کیونکہ لوگوں کی تباہی انہی دو چیزوں میں ہے اور ان کی نجات بھی انہی دو چیزوں کی حفاظت میں ہے۔ میرے شیخ ؒ نے آپ سے کئی روایتیں بیان فرمائی ہیں لیکن عدم فرصت کی وجہ سے میں اس سے زیادہ نہ لکھ سکا۔ ویسے بھی کیونکہ میری اکثر کتابیں غزنی میں رہ گئی ہیں (اللہ ان کو محفوظ رکھے) اور میں خود ملک ہندوستان میں شہر لہاور (لاہور) میں، جو نواحی[2] ملتان میں سے ہے اور بیگانے لوگوں کے درمیان رہ کر زندگی بسر کرتا ہوں اور آرام و تکلیف کی ہر حالت میں اللہ کا شکر ہے۔

چوتھی فصل
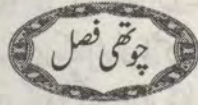
حضرت ابو حازم المدنی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت ابو حازم المدنی رحمۃ اللہ علیہ تبع تابعین رحمہم اللہ میں سے بہت بڑے بزرگ صالح اور بعض مشائخ طریقت کے پیشوا و امام تھے۔ آپ معاملات (طریقت) میں نصیب کامل اور بہت بڑے درجے کے مالک تھے اور فقر میں پکی ثابت قدمی اور مجاہدے میں کامل روش رکھتے تھے۔ عمرو بن عثمان مکی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے بتائے ہوئے اعمال و احکام کے بڑے سخت پابند تھے اور آپ کا کلام سب دلوں کو پسند اور مشائخ کی بہت سی کتابوں میں مشہور ہے۔ عمرو بن عثمان رحمۃ اللہ علیہ آپ سے روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے آپ (ابو حازمؒ) سے پوچھا کہ مَا مَالُكَ؟ (ترجمہ: آپ کا مال کیا ہے؟) تو انہوں نے فرمایا: اَلرِّضَاءُ عَنِ اللّٰهِ وَ الْغِنَاءُ عَنِ النَّاسِ۔ (ترجمہ: اللہ تعالیٰ سے ہر حال

[1] اطراف

میں راضی رہنا اور لوگوں سے بالکل بے نیاز) یعنی جو اللہ تعالےٰ[1] سے خوش ہو، وہ خلقت سے بے پروا ہوتا ہے اور ایک مردِ کامل کے لئے سب سے بڑا خزانہ رضائے الٰہی ہے اور اس میں خدائے عزوجل کے ساتھ غنی ہونے کا اشارہ ہے۔ پس جو شخص ذاتِ حق کی وجہ سے غنی ہوتا ہے، وہ غیر سے بے نیاز ہوتا ہے اور درگاہِ الٰہی کے سوا کسی اور کی طرف راستہ جانتا اور نہ کسی اور کا ذکر کرتا ہے اور ظاہر و باطن میں اسی کو پکارتا ہے۔

ایک شیخ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ سوئے ہوئے تھے۔ چنانچہ میں تھوڑی دیر ٹھہرا رہا۔ جب آپ بیدار ہوئے تو مجھے دیکھ کر فرمانے لگے کہ میں نے اس وقت پیغمبر ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آنحضرت ﷺ نے پیغام دے کر فرمایا ہے کہ "ماں[1] کے حق کی حفاظت کرنا حج ادا کرنے سے بہتر ہے، لوٹ جا اور اس کی دلجوئی کر۔" چنانچہ میں وہاں سے لوٹا اور حج کرنے کے لئے مکہ شریف نہ گیا۔ اس سے زیادہ میں نے کوئی بات آپ سے نہیں سنی۔

پانچویں فصل
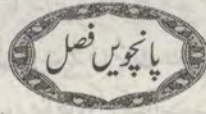
حضرت محمد بن واسع رحمتہ اللہ علیہ

آپ اہل مجاہدہ کو دعوت دینے والے، مشاہدے میں ہمیشہ قائم اور تبع تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کے زمانے میں کوئی بزرگ آپ کے برابر نہ تھا۔ بہت سے تابعین کی صحبت میں رہے اور مشائخ متقدمین کے ایک گروہ سے ملاقات کی تھی۔ آپ طریقت میں نصیب کامل رکھتے تھے اور طریقت کے متعلق آپ سے بہت اونچے خیالات اور کامل اشارات روایت ہوئے ہیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا ہے مَارَاَیْتُ شَیْئًا اِلَّا رَاَیْتُ اللّٰہَ فِیْہِ (ترجمہ: میں نے ہر ایک چیز میں اللہ ہی کو دیکھا ہے) اور یہ مقام مشاہدہ ہے کہ بندہ فاعل[2] حقیقی کی محبت سے غلبہ کی وجہ سے اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ جب اس فاعل حقیقی کے فعل میں غور سے دیکھتا ہے تو فعل نہیں (بلکہ صرف فاعل کو) دیکھتا ہے، جیسے کوئی شخص کسی تصویر کے دیکھنے سے صرف مصور ہی کو دیکھتا ہے۔ یہ قول درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ آپ نے چاند سورج اور ستارے کو دیکھ کر فرمایا: ھٰذَا رَبِّی (ترجمہ: یہی میرا رب ہے) اور یہ بات دراصل غلبۂ محبت الٰہی کی وجہ سے تھی کہ آپ جس چیز کو بھی دیکھتے، اپنے محبوب (ذاتِ حق) کی صفت پر دیکھتے تھے۔ اس لیے کہ جب دوستانِ حق نگاہ کرتے ہیں تو عالم کو اللہ تعالیٰ کے قہر سے مغلوب اور اس کے دبدبے کا قیدی دیکھتے ہیں اور موجودات کو اس کے فاعل حقیقی کی قدرت کے مقابلے میں لاشیٔ محض[3] اور پیدائش میں ممکن کو معدوم دیکھتے ہیں۔ جب شوق کی نگاہ سے اس میں دیکھتے ہیں تو مغلوب کو نہیں بلکہ غالب کو دیکھتے ہیں، مفعول کو نہیں بلکہ فاعل کو دیکھتے ہیں، مخلوق کو نہیں بلکہ خالق کو دیکھتے ہیں اور اس امر کو ہم بابِ مشاہدہ میں بیان کریں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔

اس مقام میں صوفیا کے ایک گروہ کو مغالطہ ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ نے یہ فرمایا ہے رَاَیْتُ اللّٰہَ فِیْہِ (ترجمہ: میں نے اس میں اللہ کو دیکھا)۔ یہ مکان تجزیہ[4] اور حلول کو چاہتا ہے اور یہ بات کفر محض ہے، کیونکہ مکان

---

[1] غالبًا اُن کی والدہ ان سے ناراض ہونگی۔ [2] اللہ تعالیٰ [3] جس کا کوئی وجود نہ ہو [4] مکان ثابت ہونے کی جگہ۔ وہ جگہ جہاں واقع ہو جانے سے کوئی چیز دوسری چیزوں سے ممتاز ہو جائے۔ تَجزِیَہ: جزء جزء ہونا، کسی شے کو اجزاء میں تقسیم کرنا۔ حُلُول: ایک چیز کا دوسری چیز میں اُترنا، سرایت کرنا۔

متمکن کی جنس ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس قول کی تقدیر اس طرح کرے کہ مکان مخلوق ہے تو متمکن بھی مخلوق ہونا چاہیے اور اگر یوں تقدیر کرے کہ متمکن[1] قدیم ہے تو مکان بھی قدیم ہونا چاہیے۔ اس قول میں دو فساد[2] لازم آتے ہیں، یا خلق کو قدیم کہنا پڑتا ہے یا خالق کو حادث[3] ماننا لازم آتا ہے اور یہ دونوں باتیں کفر ہیں، لیکن حقیقت ایسی نہیں بلکہ آپ کا اس طرح اشیاء کو دیکھنا، اشیاء میں آیات اور براہین الٰہی کے دیکھنے کے برابر ہے جو ہم نے پہلے بیان کیا ہے اور اس میں نہایت باریک رموز ہیں، جن کو ہم انشاء اللہ اپنی جگہ پر بیان کریں گے۔

چھٹی فصل
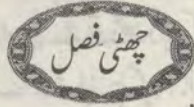
حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کوفی رضی اللہ عنہ:

آپ اماموں کے امام، اہل سنت والجماعت کے مقتدا و پیشوا، فقہا کے لیے باعث شرف اور علمائے محدثین کے لیے باعث عزت و احترام تھے۔ آپ تبع تابعین میں بہت بلند مرتبہ اور مجاہدہ و عبادت میں نہایت ثابت قدم ہوئے ہیں اور طریقت کے اصولوں میں آپ کی بہت بڑی شان ہے۔ شروع شروع میں آپ نے گوشہ نشینی کا ارادہ کیا اور لوگوں سے کنارہ کش ہو کر ان سے بالکل الگ رہنا چاہا، کیونکہ آپ نے دنیوی جاہ و ریاست کی خواہش سے اپنے دل کو پاک اور حق کے لیے اپنے دل کو اچھی طرح سنوار لیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک رات خواب میں دیکھا کہ آپ پیغمبر ﷺ کی ہڈیوں کو آنحضور ﷺ کی قبر مبارک میں اکٹھی کر رہے ہیں اور ان میں سے بعض کو چن رہے ہیں۔ یہ خوف زدہ ہو کر خواب سے بیدار ہوئے اور حضرت محمد بن سیرین رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں سے ایک کے پاس جا کر اس خواب کی تعبیر پوچھی تو انہوں نے فرمایا کہ آپ حضور ﷺ کے علم، آپ کی سنت کی حفاظت اور اس کی توسیع و اشاعت کی بدولت بڑے درجے پر پہنچیں گے۔ اس میں پوری مہارت حاصل کر کے صحیح کو ضعیف سے جدا کریں گے۔ دوسری دفعہ پھر پیغمبر ﷺ کو آپ نے خواب میں دیکھا تو حضور ﷺ نے آپ سے فرمایا: "اے ابو حنیفہ! تمہیں قضا و قدرِ الٰہی نے میری سنت کے زندہ کرنے کا سبب بنا دیا ہے، گوشہ نشینی کا ارادہ نہ کرو۔"

آپ مشائخ طریقت میں سے بہت سے بزرگوں مثلاً حضرت ابراہیم بن ادہم، فضیل بن عیاض، داؤد طائی، بشر حافی وغیرہ کے استاد ہوئے ہیں۔ علما میں یہ بات مشہور اور کتابوں میں لکھی ہوئی ہے کہ خلیفہ ابو جعفر منصور کے عہد میں اہل دربار نے تدبیر کی کہ چار اشخاص یعنی حضرت ابو حنیفہؒ، امام سفیانؒ ثوری، امام مسعر بنؒ[4] کدام اور قاضی شریح[5] رحمتہ اللہ علیہم میں سے ایک شخص کو قاضی مقرر کریں اور یہ چاروں امام اس وقت بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔ خلیفہ منصور نے ان سب کی طرف آدمی بھیجے کہ ان کو حاضر کریں۔ راستے میں جب وہ چاروں امام دربار کی طرف جا رہے تھے تو امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "میں ہر ایک کے لیے دربار جانے کے متعلق فراست سے ایک بات کہتا ہوں۔" انہوں نے فرمایا: "بہت بہتر۔" تب آپ نے فرمایا کہ "میں تو اس عہدۂ قضا کو ایک حیلہ بنا کر ہٹاؤں گا اور مسعر اپنے آپ کو دیوانہ بنائے گا اور سفیان بھاگ جائے گا اور شریح (شریک) قاضی ہوگا۔" چنانچہ حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ راستے میں موقع پا کر بھاگ گئے اور کشتی میں داخل ہو کر ان سے کہا کہ مجھے چھپا لو، میرا سر کاٹنا چاہتے ہیں۔ گویا آپ نے اس حدیث کی تاویل کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: مَنْ جُعِلَ قَاضِیًا

[1] متمکن: جو عدم کو قبول نہ کرے، ہمیشہ رہنے والا جگہ پکڑنے والا، قرار پکڑنے والا۔ [2] خرابی، بگاڑ [3] نو پیدا جو چیز نیست ہو سکے، ناپائیدار۔ [4] بعض کتابوں میں صلہ بن اشیم کا نام لکھا ہے۔ [5] شریک بن عبد اللہ

فَقَدْ ذُبِحَ بِغَيْرِ سِكِّيْنٍ (ترجمہ: جو قاضی بنایا گیا، بغیر چھری کے ذبح کیا گیا)۔ ملاح نے آپ کو چھپا دیا اور باقی ان تینوں اماموں کو خلیفہ منصورؒ کے سامنے لے گئے۔ خلیفہ نے سب سے پہلے امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے کہا کہ "آپ کو قاضی ہونا چاہیے۔" آپ نے فرمایا: "اے امیر! میں ایک عجمی ہوں، عرب نہیں بلکہ ان کے غلاموں میں سے ہوں۔ پس عرب کے سردار میرے حکم پر راضی نہ ہوں گے۔" خلیفہ ابو جعفر منصور نے کہا کہ "(قضا) کا نسب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے لیے علم کی ضرورت ہے اور آپ اس وقت کے تمام علما پر سبقت رکھتے ہیں۔" آپ نے فرمایا: "میں پھر بھی اس کام کے لائق نہیں اور اس قول میں جو میں نے کہا ہے کہ میں اس کام کے لائق نہیں، اگر میں سچا ہوں تو واقعی لائق نہیں ہوں اور اگر جھوٹا ہوں تو جھوٹا آدمی مسلمانوں کی قضاۃ کے لائق نہیں ہے اور آپ کو جو خلیفہ وقت ہیں، جھوٹا آدمی اپنا قاضی نہیں بنانا چاہیے اور نہ مسلمانوں کے خون، مال اور شرمگاہوں کے متعلق اس پر بھروسہ کرنا چاہیے۔" یہ بات کہہ کر آپ نے قضاۃ کی ذمہ داریوں سے رہائی حاصل کی۔

اس کے بعد مسعر رحمتہ اللہ علیہ پیش ہوئے۔ آپ پیش ہوتے ہی منصور کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے: "آپ کیسے ہیں؟ اور آپ کے لڑکوں اور جانوروں کا کیا حال ہے؟" منصور نے کہا: "اسے باہر نکال دو، یہ تو دیوانہ ہے۔" تب شریک سے کہا کہ آپ کو قضا کرنی چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ "میں سودائی مزاج کا آدمی ہوں، میرا دماغ ضعیف ہے، میں اس کی اہم ذمہ داریوں سے کما حقہ، عہدہ برآنہ ہو سکوں گا۔" منصور نے کہا: "آپ موافق شیروں[1] اور خوشبودار نبیذوں[2] سے اپنا علاج کیجئے تاکہ آپ کی عقل تیز اور محکم ہو جائے" اور قضا کا عہدہ ان کے سپرد کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا اور کبھی بھی آپ سے بات نہیں کی اور یہ بات دونوں معاملوں (ایک تو ہر ایک کے متعلق سچی فراست دوسرے صحت و سلامتی کی راہ پر چلنا اور خلقت کو اپنے سے دور ہٹانے اور ان کے نزدیک مرتبے پر غرور نہ کرنے) میں آپ کے کامل الحال ہونے کا ثبوت ہے اور آپ کی یہ حکایت ایک قوی دلیل ہے کہ لوگوں سے کنارہ کش ہونا صحت و سلامتی کا موجب ہے، لیکن آج عام علماء اس قسم کے معاملے سے منکر ہیں، اس لیے کہ خواہش نفس کو انہوں نے اختیار کر لیا اور راہِ حق سے بھاگ گئے ہیں اور انہوں نے اُمراء کی درگاہ کو اپنا قبلہ اور ظالموں کے درباروں کو اپنے لیے بیت المعمور کی طرح قابل تعظیم بنا لیا ہے۔ جو بات بھی ان کی خواہش نفس کے خلاف ہو، وہ اس سے انکار کر دیتے ہیں۔ ایک دفعہ غزنی میں (اللہ اس کو آفات سے محفوظ رکھے) ایک شخص نے جو امامت اور علم کا مدعی تھا، کہا کہ گدڑی پہننا بدعت ہے۔ میں نے کہا حشیشی[3] اور دیبقی جو بالکل ریشمی کپڑے ہیں، جن کا پہننا مردوں کے لیے حرام محض ہے۔ پھر منت و زاری کر کے ظالموں کے مال سے جو حرام مطلق ہے، حاصل کرنا اور بھی حرام ہے، تم اسے تو لے کر بے تکلف پہنتے ہو اور یہ نہیں کہتے کہ یہ بدعت ہے۔ بھلا ایک حلال کپڑے کو جو حلال روپے سے خریدا گیا ہو تم کیوں کہتے ہو کہ وہ بدعت ہے۔ اگر طبیعت کی سرکشی اور نفس کی گمراہی تم پر غالب نہ ہوتی تو تم کوئی پختہ بات کہتے، لیکن ریشمی کپڑا پہننا صرف عورتوں کے لیے حلال ہے اور مردوں پر حرام ہے، اگر ان دونوں باتوں کا اقرار کرو تو تم معذور ہو۔ ایسی ناانصافی سے تو اللہ کی پناہ!

امام حنیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نوفل بن حیان رضی اللہ عنہ نے وفات پائی تو میں نے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہے اور سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ حوض کے کنارے

---

[1] مقوی حلوہ [2] شربت انگور، پھلوں کا رس [3] حشیش۔ دیباء دیبق خالص ریشمی کپڑے۔

بالکل تیار کھڑے ہیں اور آپ کے دائیں بائیں مشائخ کھڑے ہیں۔ ان میں ایک بوڑھے کو دیکھا جن کی صورت نہایت نیک تھی۔ انہوں نے سر کے بال چھوڑ رکھے تھے اور اپنا رُخسار پیغمبر ﷺ کے رُخسارِ مبارک پر رکھا ہوا تھا۔ ان کے برابر میں نے نوفل کو کھڑے دیکھا، مجھے دیکھ کر وہ میری طرف آئے اور سلام کیا۔ میں نے کہا: "مجھے پانی دیجئے۔" انہوں نے کہا: "پیغمبر ﷺ سے اجازت چاہتا ہوں۔" حضور ﷺ نے انگلی مبارک سے اشارہ کر کے فرمایا کہ پلا دو۔ تو انہوں نے مجھے پانی دیا۔ میں نے اس میں سے خود بھی پیا اور اپنے ساتھیوں کو پلایا تو میں نے دیکھا کہ اس پیالے میں سے کچھ بھی کم نہ ہوا۔ میں نے پوچھا: "اے نوفل! پیغمبر ﷺ کی داہنی طرف وہ بوڑھا کون ہے؟" اس نے کہا: "حضرت ابراہیم خلیل صلوٰت اللہ علےٰ نبیّنا و علیہ اور آپ کی بائیں جانب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔" اسی طرح میں پوچھتا جاتا تھا اور وہ انگلی پر شمار کرتا جاتا تھا، یہاں تک کہ سترہ آدمیوں کی بابت میں نے دریافت کیا۔ جب میں بیدار ہوا تو ہاتھ پر سترہ کا عدد گرہ کیا ہوا تھا۔ حضرت یحییٰ بن معاذ رازیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ پیغمبر ﷺ کو خواب میں دیکھا تو آپ کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ! اَیْنَ اَطْلُبُکَ (ترجمہ: میں آپ کو کہاں تلاش کروں؟) تو آپ نے فرمایا: عِنْدَ عِلْمِ اَبِیْ حَنِیْفَہَ (ترجمہ: حضرت ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے علم میں) اور اللہ تعالےٰ آپ سے راضی ہو۔ طریقت اور پرہیزگاری میں آپ کے بہت سے بے شمار مناقب مشہور ہیں جن کے بیان کو یہ کتاب برداشت نہیں کرسکتی۔

میں علی بن عثمان جلابی (رحمۃ اللہ علیہ) ملک شام میں حضرت بلالؓ، مؤذن پیغمبر ﷺ کے روضۂ مبارک پر سو رہا تھا۔ میں نے خواب میں اپنے آپ کو مکہ معظّمہ میں دیکھا اور دیکھا کہ پیغمبر ﷺ بابِ بنی شیبہ مبارک سے اندر تشریف لائے اور ایک بوڑھے شخص کو اس طرح بغل میں لیے ہوئے تھے جس طرح بچوں کو شفقت سے بغل میں لیتے ہیں۔ میں فرطِ محبت سے دوڑ کر حضور ﷺ کے سامنے گیا اور آپ کے پاؤں مبارک کو بوسہ دیا اور تعجب سے سوچ رہا تھا کہ وہ بوڑھا کون ہے؟ کہ حضور ﷺ نے بطور معجزہ میرے دلی اندیشے پر اطلاع پا کر فرمایا کہ یہ شخص تیرا اور تیرے اہلِ ملک کا امام یعنی امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) ہے۔ مجھے اور میرے اہل شہر کو اس خواب سے بڑی بھاری اُمید ہوئی اور مجھ پر اس خواب سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو اوصافِ طبع سے فانی، احکامِ شرح سے باقی اور ان کے ساتھ قائم ہیں۔ دراصل آپ کو اوصافِ طبع سے نکال کر لے جانے والے پیغمبر ﷺ ہی ہیں اور وہ اگر خود اوصافِ طبع سے نکلتے تو باقی صفت ہوتے اور جو باقی بہ صفت ہوتا ہے، وہ یا تو فیصلے میں غلطی کرنے والا ہوتا ہے یا حق کو پہنچنے والا اور چونکہ آپ کو اوصافِ طبع سے نکال کر لے جانے والے خود پیغمبر ﷺ ہیں، اس لیے آپ فانی الصفہ ہیں اور پیغمبر ﷺ کی صفت بقا سے باقی و قائم ہیں اور جب پیغمبر ﷺ سے خطا نہیں ہوسکتی تو جو شخص آنحضرت ﷺ کے ساتھ قائم ہے، اس سے بھی خطا کا سرزد ہونا ناممکن ہے۔

کہتے ہیں کہ جب حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ نے علم حاصل کیا اور اپنے زمانے کے سردار اور مقتدا بن گئے تو حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں تشریف لا کر عرض کیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا: عَلَیْکَ بِالْعَمَلِ فَاِنَّ الْعِلْمَ بِلَا عَمَلٍ کَالْجَسَدِ بِلَا رُوْحٍ (ترجمہ: تجھ پر عمل کرنا واجب ہے کیونکہ علم بلا عمل ویسا ہی ہے جیسا کہ جسم بے روح) لیکن اے ابو سعید! میں تم پر قربان ہو جاؤں، جب تک علم عمل کے ساتھ نہ ملے، صاف نہیں ہوتا اور نہ زندگی میں خلوص کی کوئی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور جو شخص محض علم پر قناعت کرے وہ عالم نہیں ہوتا، کیونکہ عالم کو محض علم پر قناعت نہیں ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ علم عمل کا متقاضی ہوتا ہے جیسا کہ

ہدایت مجاہدہ کا تقاضا کرتی ہے اور جس طرح مشاہدہ بے مجاہدہ نہیں ہوسکتا، اسی طرح علم بغیر عمل کے بے فائدہ ہے۔ دراصل علم عمل کا اصل اور عمل علم کا نتیجہ ہے اور علم کی کشائش اور اس کا نفع علم ہی کی برکات سے ہوتا ہے اور جس طرح آفتاب کی روشنی عین آفتاب سے الگ نہیں کی جا سکتی، ٹھیک اسی طرح علم عمل سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور اس کتاب کے شروع میں علم کے متعلق مختصر طور پر بیان کر دیا ہے اور توفیق اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

ساتویں فصل
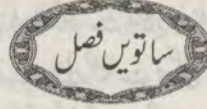
امام عبداللہ بن المبارک رضی اللہ عنہ

آپ زاہدوں کے سردار، اوتاد کے رہنما اور کبار تبع تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ بزرگانِ دین میں بڑے باحشمت، طریقت و شریعت کے تمام احوال و اقوال و اسباب کے عالم اور اپنے وقت کے زبردست امام تھے۔ آپ نے بہت سے مشائخ کا زمانہ پایا اور ان کی ہم نشینی کی۔ آپ کی تصنیفات علوم کے تمام شعبوں میں عام طور پر مذکور اور آپ کی کرامتیں مشہور ہیں اور آپ کی توبہ کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ایک کنیزک[1] پر فریفتہ ہوگئے تھے۔ ایک رات ہم جولیوں میں سے اُٹھے اور ایک ساتھی کو اپنے ساتھ لے جا کر معشوقہ کی دیوار کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ محبوبہ منڈیر پر نمودار ہوئی اور صبح تک دونوں ایک دوسرے کے مشاہدے میں محو کھڑے رہے۔ جب آپ نے نمازِ صبح کی اذان سنی تو خیال کیا کہ نمازِ عشا کی اذان ہے۔ جب دن روشن ہوا تو آپ کو معلوم ہوا کہ ساری رات تو محبوبہ کے مشاہدے میں محو ہو کر گزری ہے۔ اس بات پر ان کو ایک سخت تنبیہ حاصل ہوئی اور دل میں کہنے لگے: "اے مبارک کے بیٹے! تجھے شرم آنی چاہیے۔ آج ساری رات تو خواہش نفس کے لیے کھڑا رہا اور پھر بھی تو بزرگی چاہتا ہے اور اس کے برعکس اگر امام نماز میں ذرا لمبی سورت پڑھ لے تو تو دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اس دعویٰ (ہوائے نفس) کے مقابلے میں تیرے ایمان کا دعویٰ کہاں۔" چنانچہ آپ نے اسی وقت توبہ کی اور علم کی تلاش میں مشغول ہو گئے اور زہد و دیانت اختیار کی۔ آخر کار ایسے بلند درجہ ہوئے کہ ایک دفعہ آپ کی والدہ نے باغ میں جا کر کیا دیکھا کہ آپ سوئے ہوئے ہیں اور ایک بہت بڑا سانپ نازبو کی ٹہنی منہ میں لیے ہوئے آپ پر سے مکھیاں ہٹا رہا ہے۔ بعد ازاں مرو سے آپ نے کوچ کیا اور بغداد میں ایک مدت تک مشائخ کی صحبت میں رہے۔ اس کے بعد مکہ مکرمہ میں کچھ عرصہ قیام کیا اور پھر مرو واپس چلے آئے اور شہر کے تمام لوگوں نے آپ سے کامل محبت کا اظہار کیا اور آپ کے لیے مسند درس و مجلس مقرر کی۔ ان دنوں شہر کے آدھے لوگ تو حدیث کی متابعت کرتے تھے اور آدھے لوگ قیاس و رائے پر چلتے تھے۔ چنانچہ آج تک لوگ آپ کو رضی الفریقین (دونوں فریقوں میں مقبول) کہتے ہیں کیونکہ آپ ان ہر دو فریق کے موافق تھے اور ہر ایک نے آپ کے متعلق اپنے ہم مشرب ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ آپ نے وہاں دو مکان بنائے۔ ایک اہل حدیث کے لیے اور ایک اہل الرائے کے لیے، جو آج تک قائم ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد وہاں سے پھر حجاز واپس چلے گئے اور وہاں قیام کیا۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ نے عجائبات میں سے کیا کیا دیکھا؟ تو آپ نے فرمایا: میں نے ایک پادری کو دیکھا جو کثرت مجاہدہ سے لاغر اور خوف الٰہی سے خمیدہ[2] پشت ہو رہا تھا۔ میں نے اس

---

[1] لونڈی، چھوٹی لڑکی [2] کبڑا

سے پوچھا: یَا رَاهِبُ کَیْفَ (یُعْرَفُ) الطَّرِیْقُ اِلَی اللّٰہِ (ترجمہ: اے راہب! اللہ کی طرف راستہ کس طرح حاصل ہوتا ہے؟) فَقَالَ لَوْ عَرَفْتَ اللّٰہَ لَعَرَفْتَ الطَّرِیْقَ اِلَی اللّٰہِ (ترجمہ: اس نے کہا کہ اگر تو نے اللہ کو پہچان لیا تو ضرور اس کا راستہ بھی پہچان لیا)۔ پھر اس نے کہا: میں اس سے ڈرتا ہوں جس کو نہ جانتا ہوں، نہ پہچانتا ہوں اور تو اس کی نافرمانی کرتا ہے جسے تو اچھی طرح پہچانتا ہے، یعنی اللہ کی معرفت تو اس سے خوف کا تقاضا کرتی ہے لیکن میں تجھے اس سے بے خوف دیکھتا ہوں، حالانکہ اس کی ذات سے انکار جہالت کا مقتضی ہے اور میں اپنے آپ کو اس سے خائف پاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ بات میرے لیے نصیحت ہوگئی اور اس نے بہت سے ناکردنی[1] امور سے مجھے باز رکھا اور آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: اَلسُّکُوْنُ حَرَامٌ عَلٰی قَلْبِ اَوْلِیَائِہٖ (ترجمہ: اللہ کے دوستوں کے دل پر آرام حرام ہے) کیونکہ دنیا میں وہ حالت طلب میں بے قرار اور آخرت میں حالت خوشی میں بے چین رہتے ہیں۔ اس لیے دنیا میں تو حق تعالیٰ سے دُوری کی وجہ سے آرام ان کے لئے روا نہیں اور آخرت میں حضور حق تعالیٰ اور اس کے دیدار کی تجلی کی وجہ سے آرام ان کے لیے جائز نہیں۔ پس دنیا ان کے لیے آخرت اور آخرت دنیا کی طرح ہے، اس لیے کہ دلی تسکین دو چیزوں کا تقاضا کرتی ہے: مقصود کا پالینا، یا مراد سے غفلت اور اس کا پالینا دنیا و عقبیٰ میں جائز نہیں تاکہ دل محبت الٰہی کی خلش سے سکون پا جائے اور غفلت اس کے دوستوں پر حرام ہے تاکہ دل طلب الٰہی کی حرکات سے مطمئن ہو جائے اور اہل تحقیق کے طریق میں یہ ایک زبردست اور بنیادی چیز ہے، واللہ اعلم۔

آٹھویں فصل
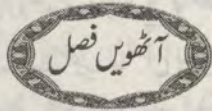
حضرت فضیل بن عیاض رضی اللہ عنہ

آپ اہلِ حق کے بادشاہ، بارگاہِ قربِ الٰہی کے منتخب ہیں۔ بزرگوں، درویشوں اور حقیقی صوفیائے کرام اور کبار تبع تابعین میں آپ کا شمار ہوتا ہے اور آپ کو طریقت کے معاملات اور حقائق میں بہت بڑا رُتبہ اور نصیب کامل حاصل ہے۔ آپ طریقت کے ان مشہور بزرگوں میں سے ہوئے ہیں، جن کی تمام فرقوں نے تعریف کی اور آپ کے تمام احوال صدق و اخلاص سے معمور ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ ابتدائے عمر میں ٹھگی اور مرو اور باورد کے درمیان رہزنی کیا کرتے تھے لیکن باوجود ان تمام باتوں کے ہر وقت نیکی کی طرف رغبت و میلان رکھتے تھے اور آپ کی طبیعت میں ہمیشہ جوانمردی اور ہمت مرکوز تھی۔ چنانچہ جس قافلے میں کوئی عورت ہوتی آپ اس کے پاس تک نہ پھٹکتے اور جس کا سرمایہ تھوڑا ہوتا اس کا سامان نہ چھینتے بلکہ ہر شخص کے پاس اس کے سرمایے سے کچھ چھوڑ دیتے۔ یہاں تک کہ ایک سوداگر مرو سے نکلا۔ اس سے لوگوں نے کہا: "بدرقہ[2] ساتھ لے جاؤ کیونکہ فضیل راستے میں ہے۔" اس نے کہا: "میں نے سنا ہے وہ خداترس آدمی ہے" چنانچہ اس نے ایک قاری کو اُجرت پر لیا اور اسے اونٹ پر بٹھا لیا۔ راستہ میں رات دن قرآن مجید پڑھتا رہا، یہاں تک کہ قافلہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں فضیل گھات لگائے ہوئے تھے تو اتفاق سے قاری یہ آیت پڑھ رہا تھا: اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ (ترجمہ: کیا ایمان والوں کے لیے وہ وقت قریب نہیں آیا کہ ان کے دل ذکر الٰہی کے لیے گڑگڑا جائیں)۔ یہ سن کر آپ کے دل پر رقت طاری ہوئی اور عنایت الٰہی نے آپ کے دل و جان پر قابو پا لیا اور آپ نے اس شغلِ رہزنی سے سچی توبہ کر لی اور جن لوگوں کا سامان

[1] نہ کرنے کے قابل [2] حفاظتی دستہ

آپ نے لوٹا تھا، ان سب کا مال واپس کر دیا۔ انہیں ہر طرح سے خوش کر دیا اور پھر مکہ مکرمہ میں جا کر ایک مدت تک وہاں قیام کیا۔ اس اثناء میں بعض اولیاء اللہ کی ملاقات سے بھی مشرف ہوئے۔ بعد ازاں کوفہ میں آ کر حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں رہے اور ان سے اکتسابِ علم کیا۔ آپ کی روایات بہت عالی اور اہل حدیث کے درمیان بے حد مقبول ہیں اور آپ کا کلام حقائق تصوف و معرفت میں بہت بلند ہے۔ اللہ آپ پر رحمت کرے۔

آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: مَنْ عَرَفَ اللّٰہَ حَقَّ مَعْرِفَتِہٖ عَبَدَہٗ بِکُلِّ طَاقَتِہٖ (ترجمہ: جس نے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا جیسا کہ اس کو پہچاننے کا حق ہے تو وہ اپنی پوری طاقت سے اس کی عبادت کرتا ہے) اس لیے کہ جو پہچانتا ہے، وہ اس کے انعام و احسان سے پہچانتا ہے اور اس کی مہربانی اور رحمت سے پہچانتا ہے اور جب پہچان لیتا ہے تو اس کو دوست بنالیتا ہے اور جب اس کو دوست بنالیتا ہے تو جہاں تک ہو سکے اس کی بندگی کرتا ہے کیونکہ دوستوں کا فرمان دشوار معلوم نہیں ہوتا۔ پس جس کی دوستی زیادہ ہوتی ہے اس کو عبادت پر حرص بھی زیادہ ہوتی ہے اور زیادہ محبت معرفت کے ذریعے ہی سے ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے روایت کی ہے کہ ایک رات پیغمبر ﷺ اٹھے اور میرے کمرے سے باہر کہیں چلے گئے۔ میں نے خیال کیا کہ شاید آپ کسی دوسری حرم کے حجرے میں تشریف لے گئے۔ چنانچہ میں اُٹھی اور آپ کے پیچھے تعاقب[1] میں چلی، یہاں تک کہ میں نے مسجد میں جا کر دیکھا کہ آپ نماز میں کھڑے رو رہے ہیں حتیٰ کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے آ کر نمازِ صبح کی اذان دی۔ جب نمازِ صبح ادا کر چکے تو حجرے میں تشریف لائے۔ میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ کے دونوں پاؤں مبارک سوجے ہوئے ہیں اور انگلیوں کے سرے پھٹے ہوئے ہیں اور زرد پانی ان سے جاری ہے۔ میں نے رو کر عرض کیا: "یارسول اللہ ﷺ! آپ کی تو اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دی گئی ہیں، آپ اپنے اوپر اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں؟ چھوڑیئے، یہ کام وہ شخص کرے جو اپنی عافیت سے امن میں نہ ہو۔" آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اے عائشہ! یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے اَفَلَا اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًا (ترجمہ: کیا میں اس کا شکرگزار بندہ نہ بنوں؟)" جب اس نے فضل و کرم فرما کر مجھے بخشش کی خوشخبری دے دی تو کیا مجھے بندگی نہ کرنی چاہیے اور اپنی طاقت کے مطابق شکر کر کے اس کی نعمت کا استقبال نہیں کرنا چاہیے؟ نیز آنحضور ﷺ نے شب معراج[2] میں پچاس نمازیں ادا فرمائیں اور ان کو گراں نہ سمجھا یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کہنے سے بارگاہِ رب العزت میں دوبارہ حاضر ہو کر پانچ نمازوں کا حکم لے کر واپس تشریف لائے۔ اس لئے کہ آپ کی طبیعت شریف میں فرمان الٰہی کی موافقت کے سوا کوئی چیز نہ تھی: لِاَنَّ الْمَحَبَّۃَ ھِیَ الْمُوَافَقَۃُ (ترجمہ: کیونکہ محبت دوست سے موافقت کا نام ہے) نیز آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: اَلدُّنْیَا دَارُ الْمَرْضٰی وَ النَّاسُ فِیْھَا کَالْمَجَانِیْنِ وَلِلْمَجَانِیْنِ فِیْ دَارِ الْمَرْضٰی الْغُلُّ وَ الْقَیْدُ (ترجمہ: دنیا بیماروں کی جگہ ہے اور لوگ اس میں بیماروں کی طرح ہیں اور دیوانوں کے لیے طوق اور بیڑیاں ہوتی ہیں) اور ہماری نفسانی خواہش ہمارے طوق[3] ہیں اور ہماری نافرمانی ہماری بیڑی ہے۔

فضل بن ربیع نے روایت کی ہے کہ میں خلیفہ ہارون الرشید کے ہمراہ مکہ مکرمہ گیا۔ جب ہم حج کر چکے تو خلیفہ نے مجھ سے فرمایا کہ "کیا اولیاء اللہ میں سے کوئی یہاں موجود ہیں تاکہ ہم ان کی زیارت کریں؟" میں نے کہا:

---

[1] پیچھا کرنا [2] وہ شب جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے لے کر بیت المقدس اور وہاں سے عرش معلیٰ تشریف لے گئے، شب معراج کہلاتی ہے۔ احادیث صحیحہ کی رُو سے یہ رات ۲۷ ویں رجب کی تھی۔ [3] گلے کا پھندا

"ہاں کیوں نہیں، عبدالرزاق صنعانی یہاں موجود ہیں۔" خلیفہ نے فرمایا: "مجھے ان کے پاس لے چلو۔" چنانچہ ہم ان کے پاس گئے اور کچھ دیر تک ان سے گفتگو کرتے رہے۔ جب ہم نے واپسی کا قصد کیا تو خلیفہ نے ارشاد کیا کہ "ان سے پوچھو کہ کیا ان پر کچھ قرضہ ہے؟" میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ہاں ہے۔ خلیفہ نے فرمایا کہ ان کا قرضہ ادا کر دینا اور وہاں سے نکل کر کہا: "اے فضل! میرا دل چاہتا ہے کہ ان سے زیادہ بزرگ آدمی کو دیکھوں۔" میں نے کہا کہ حضرت سفیان بن عینہ رضی اللہ عنہ بھی یہاں موجود ہیں تو آپ نے فرمایا کہ چلو ان کے پاس چلیں۔ ہم ان کے پاس گئے اور کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جب ہم نے واپس ہونے کا ارادہ کیا تو خلیفہ نے مجھے اشارہ کیا کہ ان سے ان کے قرضے کے بارے میں پوچھوں۔ میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا: "ہاں! میرے ذمے قرضہ ہے۔" خلیفہ نے حکم دیا تو ان کا قرضہ ادا کر دیا اور وہاں سے باہر نکل کر فرمایا: "اے فضل! ابھی تک میرا مقصود حاصل نہیں ہوا۔" میں نے کہا مجھے یاد آگیا کہ حضرت فضیل بن عیاض بھی یہاں موجود ہیں، چنانچہ میں خلیفہ کو ان کے پاس لے گیا۔ آپ اس وقت جھروکے میں بیٹھے قرآن کریم پڑھ رہے تھے۔ ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا تو آپ نے پوچھا: "کون ہے؟" میں نے جواب دیا کہ "امیر المومنین ہیں۔" آپ نے فرمایا: "ہمیں امیر المومنین سے کیا کام؟" میں نے کہا "سبحان اللہ! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: لَيْسَ لِلْعَبْدِ اَنْ يُذِلَّ نَفْسَهُ فِي طَاعَةِ اللهِ (ترجمہ: بندے کو جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اپنے نفس کو ذلیل کرے) قَالَ بَلٰى اَمَّا الرِّضَا عِزٌّ دَائِمٌ عِنْدَ اَهْلِهٖ (ترجمہ: آپ نے فرمایا ہاں، کیوں نہیں لیکن راضی بقضا اہل رضا کے نزدیک رضا ہمیشہ کی عزت ہے) تو اسے میرے ذلت سمجھتا ہے لیکن میں حکم الٰہی پر راضی ہونے کی وجہ سے اس کو اپنی عزت سمجھتا ہوں۔" اس کے بعد نیچے اتر آئے، دروازہ کھولا چراغ گل کر دیا اور ایک کونے میں کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ خلیفہ ہارون الرشید آپ کو مکان کے اندر تلاش کرنے لگے، یہاں تک کہ خلیفہ کا ہاتھ آپ سے ٹکرایا تو آپ نے فرمایا: "کاش! وہ ہاتھ جس سے زیادہ نرم میں نے کوئی ہاتھ نہیں دیکھا، اگر وہ عذاب الٰہی سے چھوٹ جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔"

یہ سن کر خلیفہ ہارون الرشید رونے لگے اور اتنے روئے کہ بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو فرمایا "اے فضیل! مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔" آپ نے فرمایا: "اے امیر المومنین! آپ کے دادا، رسول اللہ ﷺ کے چچا تھے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے ایک قوم پر امیر بنا دیجئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے آپ کے نفس کو آپ کے جسم پر امیر کر دیا، یعنی آپ کی ایک سانس عبادت الٰہی میں اس سے بہتر ہے کہ خلقت آپ کی فرماں برداری کرے۔ لِاَنَّ الْاِمَارَةَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ النَّدَامَةُ۔ (ترجمہ: کیونکہ امارت قیامت کے روز شرمندگی کا باعث ہو گی)۔" خلیفہ ہارون الرشید نے کہا: "کچھ اور نصیحت کیجئے" تو آپ نے فرمایا: "جب عمر بن عبدالعزیزؒ کو لوگوں نے خلافت پر مقرر کیا تو انہوں نے سالم بن عبداللہ، رجا بن حیات اور محمد بن کعب القرظی رضی اللہ عنہم کو بلا کر فرمایا کہ میں ان مصائب میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ ان سے نجات پانے کے لیے کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟ کیونکہ میں تو اس خلافت کو اپنے لیے ایک بڑی مصیبت سمجھتا ہوں اگرچہ لوگ اسے نعمت سمجھتے ہیں۔" چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا: "اگر آپ قیامت کے روز عذاب الٰہی سے نجات چاہتے ہیں تو بوڑھے مسلمانوں کو اپنے باپ کی طرح، ان کے جوانوں کو بھائیوں کی طرح اور ان کے لڑکوں کو اپنے بیٹوں کی طرح جانیئے۔ پھر ان سے ایسا برتاؤ کیجئے کہ گھر میں اپنے باپ بھائی اور بیٹے سے کیا کرتے ہیں۔ یہ سارا اسلامی ملک آپ کا گھر اور اس کے رہنے والے آپ کے اہل و عیال ہیں

زُرْاَبَاكَ وَ اَكْرِمْ اَخَاكَ وَ اَحْسِنْ عَلٰى وَلَدِكَ۔ (ترجمہ: اپنے باپ کی زیارت (خدمت) کرو اور اپنے بھائی کی عزت اور اپنے بیٹے سے بھلائی کر)۔" اس کے بعد حضرت فضیل رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اے امیر المومنین! میں ڈرتا ہوں کہ مبادا آپ کا یہ خوبصورت چہرہ آتشِ دوزخ میں گرفتار ہو جائے، اس لیے آپ خدا سے ڈریئے اور اس کا حق بہتر طور پر ادا کیجئے۔" اس کے بعد ہارون نے کہا کہ "کیا آپ پر کچھ قرضہ ہے؟" آپ نے جواب دیا کہ "ہاں خدا تعالیٰ کا قرض میری گردن پر ہے اور وہ اس کی بندگی ہے، اگر وہ مجھے اس کی بابت پکڑے تو مجھے یہ افسوس ہے۔" خلیفہ نے کہا کہ "لوگوں کا قرضہ پوچھتا ہوں۔" آپ نے جواب دیا کہ "اللہ عزوجل کی حمد[1] اور اس کا شکر ہے کہ اس کی بہت بہت نعمتیں مل رہی ہیں اور مجھے اس کی ذات سے کوئی شکوہ[2] نہیں جس میں اس کے بندوں سے کچھ مدد مانگوں۔" خلیفہ نے ایک ہزار دینار نکالے اور آپ کے سامنے رکھ کر کہا کہ اپنے کسی مصرف[3] میں صرف کیجئے۔ حضرت فضیل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "اے امیر المومنین! تو پھر میری یہ سب نصیحتیں آپ کے لیے کچھ بھی سود مند نہ ہوئیں اور یہیں آپ نے اور بے انصافی کو شروع کر دیا۔" خلیفہ نے پوچھا کہ "میں نے کیا ناانصافی کی؟" آپ نے فرمایا کہ "میں تو آپ کو نجات کی طرف بلاتا ہوں اور آپ مجھے بلا میں ڈالتے ہیں۔ یہ بے انصافی نہیں تو کیا ہے؟" یہ سن کر ہارون اور فضل دونوں آپ کے پاس سے روتے ہوئے نکلے۔" ہارون نے کہا: اے فضل بن ربیع! بادشاہ درحقیقت فضیل ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ دنیا اور اہل دینا سے اعراض کرتے ہیں۔ دنیا کی زیب و زینت کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور دنیاداروں کی محض دنیا کی وجہ سے کوئی خاطر تواضع نہیں کرتے" اور آپ کے مناقب اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ تحریر میں آسکیں، واللہ اعلم بالصواب۔

نویں فصل
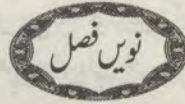
حضرت ذوالنون مصری رضی اللہ عنہ

آپ تحقیق و کرامت کی کشتی، شرفِ ولایت کا خزانہ اور بزرگ ترین تبع تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ ثوبی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کا نام ثوبان تھا اور اپنی قوم کے سرداروں اور طریقت کے ان بزرگوں اور باخبروں میں سے تھے، جو مصیبت اور ملامت کے طریقے پر چلتے تھے۔ اہل مصر عموماً آپ کے متعلق حیران اور آپ کے احوال کے منکر تھے اور مرنے تک کسی نے آپ کے حال و جمال کو نہیں پہچانا۔ کہتے ہیں کہ جس رات آپ نے دنیا سے رحلت کی، ستر اشخاص نے پیغمبر ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپ نے فرمایا: "اللہ کے دوست ذوالنون آیا چاہتے ہیں، ہم اس کے استقبال کے لیے کھڑے ہیں۔" یہ بھی روایت ہے کہ جب آپ کی وفات ہوئی تو لوگوں نے آپ کی پیشانی پر لکھا ہوا دیکھا هٰذَا حَبِيْبُ اللّٰهِ مَاتَ فِيْ حُبِّ اللّٰهِ قَتِيْلُ اللّٰهِ۔ (ترجمہ: یہ اللہ کا محبوب ہے، جو اللہ کی محبت میں شہید ہو کر مرا)۔ جب آپ کا جنازہ اٹھایا تو پرندے آپ کے جنازے پر جمع ہوئے اور پر سے پر ملا کر آپ کے جنازے پر سایہ ڈالا۔ یہ دیکھ کر اہل مصر سب اپنے کیے پر پشیمان ہوئے اور جو ستم آپ پر کیے تھے، ان سے توبہ کی۔ علوم کے حقائق بیان کرنے میں آپ کے بہت طریقے اور اچھے کلمات ہیں چنانچہ آپ فرماتے ہیں: اَلْعَارِفُ كُلَّ يَوْمٍ اَخْشَعُ لِاَنَّهٗ فِيْ كُلِّ سَاعَةٍ مِنَ الرَّبِّ اَقْرَبُ (ترجمہ: عارفِ الٰہی ہر روز زیادہ گڑگڑانے والا ہوتا ہے کیونکہ وہ ہر ساعت اپنے

[1] تعریف، ثنا، ستائش　[2] شکایت، گلہ　[3] خرچ کرنے کی جگہ

رب سے زیادہ قریب ہوتا ہے) اور جو شخص زیادہ نزدیک ہوتا ہے لامحالہ اس کی حیرت اور گڑاہٹ زیادہ ہوتی ہے، اس لیے کہ حق تعالےٰ کی سلطنت کی ہیبت سے وہ آگاہ ہوتا ہے اور جلال الٰہی اس کے دل پر غالب آتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس سے دُور دیکھتا ہے اور اس کے وصل کی کوئی صورت نہیں پاتا اس لیے کہ اس کا خشوع و خضوع (گڑ گڑانا) اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ صلوات اللہ علی نبینا و علیہ نے اللہ سے اپنے مکالمے[1] میں یوں کہا: یَا رَبِّ! اَیْنَ اَطْلُبُكَ (ترجمہ: اے میرے پروردگار! میں تجھے کہاں تلاش کروں؟) قَالَ عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ (ارشاد ہوا: ٹوٹے ہوئے دلوں میں جو نااُمید ہو چکے ہیں)۔ آپ نے عرض کیا: "بار خدایا! میرے دل سے بڑھ کر کوئی دل نااُمید اور شکستہ نہیں"۔ ارشاد ہوا کہ "پس میں بھی تیرے ٹوٹے ہوئے دل میں ہوں"۔ پس عاجزی اور خوفِ الٰہی کے بغیر معرفت کا دعویٰ کرنے والا جاہل ہے نہ کہ عارف۔ حقیقت میں معرفت کی سچی علامت، سچی ارادت (محبت حق) ہے اور سچی محبت الٰہی بندے کے تمام اسباب کو اور اللہ تعالےٰ کے سوا اس کے تمام رشتوں کو توڑنے والی ہے۔ چنانچہ حضرت ذوالنون رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: اَلصِّدْقُ سَيْفُ اللّٰهِ فِیْ اَرْضِهٖ مَا وُضِعَ عَلٰى شَیْءٍ اِلَّا قَطَعَهٗ (ترجمہ: سچائی اللہ کی زمین میں اس کی شمشیر ہے کہ جس چیز پر لگتی ہے اس کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے) اور سچائی اللہ تعالےٰ (سبب کے پیدا کرنے والے) کو دیکھنا ہے نہ کہ سبب کو، اور جب سبب کو دیکھا تو سچائی کا حکم ساقط ہو گا۔

میں نے حکایات میں دیکھا ہے کہ ایک روز آپ اپنے رفیقوں کے ساتھ کشتی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اتفاقاً سامنے سے ایک دوسری کشتی آرہی تھی، جس میں مصر کے کھیل کود والے لوگوں کا ایک گروہ بیٹھا ہوا تھا اور حسب معمول شرارتیں اور شوروغل کر رہے تھے۔ آپ کے مریدوں کو ان سے بہت نفرت ہوئی اور کہنے لگے: "اے شیخ! دعا کیجئے کہ ان سب کو اللہ تعالےٰ غرق کرے تاکہ ان کی نحوست لوگوں سے دُور ہو جائے" تو حضرت ذوالنون رحمۃ اللہ علیہ نے اٹھ کر ہاتھ کھڑے کیے اور دعا کی: "بار خدایا! جیسا کہ اس جماعت کو تو نے اس جہاں میں اچھی زندگی عطا فرمائی، ان کو اس جہان میں بھی اچھی زندگی مرحمت فرما۔" مرید آپ کے اس کلام کو سن کر بڑے متعجب ہوئے۔ جب وہ کشتی ذرا اور بھی نزدیک آئی اور ان لوگوں کی نظر حضرت ذوالنون رحمۃ اللہ علیہ پر پڑی تو وہ رونے لگے اور ساز سب توڑ ڈالے اور توبہ کر کے خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کیا۔ آپ نے اپنے مریدوں سے فرمایا کہ "آخرت کی اچھی زندگی دنیا کی توبہ ہے۔ تم نے دیکھ لیا کہ سب کی مراد حاصل ہوگئی۔ تم اور ان سب لوگوں نے اپنی مراد پالی اور کسی کو کوئی رنج نہ پہنچا۔" کلام اس پیر حقانی کا نہایت شفقت پر دلالت کرتا ہے اور اس میں آپ نے پیغمبر ﷺ کی اقتدا کی ہے کہ جس قدر کفار حضور ﷺ پر ظلم وستم کی زیادتی کرتے، آپ رنجیدہ اور خفا نہ ہوتے بلکہ فرماتے: اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (ترجمہ: اے اللہ میری قوم کو ہدایت فرما کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے)۔

نیز آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں بیت المقدس سے مصر کے ارادے سے آرہا تھا۔ راستے میں میں نے دُور سے دیکھا کہ ایک شخص آرہا ہے۔ میرے دل میں یہ بات آئی کہ یہ جو شخص آرہا ہے، میں اس سے ایک سوال کروں گا۔ جب وہ شخص میرے قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک بوڑھی عورت ہے، جس کے ہاتھ میں نوکدار لاٹھی ہے اور اونی جبہ پہنے ہوئے ہے۔ میں نے پوچھا: مِنْ اَیْنَ (ترجمہ: کہاں سے آرہی ہو؟) قَالَتْ مِنَ اللّٰهِ (ترجمہ: اس نے جواب دیا کہ اللہ کی طرف سے)۔ میرے پاس کچھ دینار تھے، میں نے وہ نکالے اور اسے دینے

[1] گفتگو، بات چیت

چاہے، لیکن اس نے ہاتھ ہلا کر کہا: ”اے ذوالنون! یہ خیال جو تو نے میرے متعلق کیا ہے، تیری عقل کی کمزوری کی وجہ سے ہے۔ میں تو خدا کا کام کرتی ہوں، نہ اس کے سوا کسی سے کچھ لیتی ہوں نہ اس کے سوا کسی کو پوجتی ہوں۔“ یہ بات کہہ کر وہ مجھ سے الگ ہوگئی۔ اس حکایت میں ایک لطیف رمز ہے کہ اس بڑھیا نے کہا کہ میں اس کے لیے کام کرتی ہوں اور یہ بات ذاتِ حق سے اس کی سچی محبت کی دلیل ہے کیونکہ عمل کرنے والے لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں:

(۱) ایک وہ شخص جو کام کرتا ہے تو سمجھتا ہے کہ وہ حق ذات کے لیے کرتا ہے، حالانکہ وہ یہ کام اپنی ہی لیے کرتا ہے اگرچہ اس کی خواہش نفسانی اس کام سے منقطع ہوتی ہے لیکن عالم عقبیٰ کے ثواب کی ہوس اس کو ضروری ہوتی ہے۔

(۲) دوسرا وہ شخص ہے کہ عالم عقبیٰ کے ثواب و عذاب کا ارادہ اور عالم دنیا کی ریاکاری اور دکھاوا اس کے عمل سے بالکل الگ ہوتا ہے اور وہ جو کچھ بھی کرتا ہے حکم الٰہی کی تعظیم کے لیے کرتا ہے اور محض حق تعالےٰ کی محبت ہی فرمان کی تعمیل میں اس کی اپنی غرض کو چھوڑنے کے متقاضی ہوتی ہے۔

پہلے گروہ کا خیال ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ دارالآخرت کے لیے کرتا ہے، وہ حق تعالےٰ ہی کے لیے ہے اور وہ جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی فرمانبرداری میں فرماں بردار کو اس سے بہت زیادہ حصہ ملتا ہے، جو نافرمانی کرنے میں کسی نافرمان شخص کو ملتا ہے، کیونکہ نافرمانی کی راحت ایک ساعت کے لیے ہوتی ہے اور فرمانبرداری کی راحت ہمیشہ کے لیے اور خدا تعالےٰ کو مخلوقات کے مجاہدے اور ریاضت سے نہ کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور نہ اس کے ترک کرنے سے اسے کوئی نقصان۔ اگر سب اہل عالم تصدیق حق میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مانند ہو جائیں تو اس کا نفع انہی کو ہوگا اور اگر وہ سب تکذیب حق میں فرعون بن جائیں تو اس کا نقصان بھی انہی کو ہوگا، چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (ترجمہ: اگر تم نیکی کرو تو اپنی جان کے لیے کرو گے، اگر برائی کرو تو بھی اپنے نفس کے لیے کرو گے) نیز اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۔ (ترجمہ: اور جو شخص دین میں کوشش کرتا ہے، وہ اپنی جان کے لیے کرتا ہے کیونکہ بلاشبہ اللہ تعالےٰ اہل عالم سے بالکل بے نیاز ہے) لوگ تو اپنے نیک اعمال کی بدولت اپنے لیے ابدی ملک یعنی جنت کی خواہش کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ میں یہ کام خدا کے لیے کرتا ہوں، لیکن اولیاء اللہ کا محبت الٰہی کے طریقے پر چلنا کچھ اور ہی چیز ہے کیونکہ وہ فرمان حق ادا کرنے میں دوست کے حکم کی تعمیل ہی کو مدنظر رکھتے ہیں اور کسی دوسری چیز کی طرف ان کی نگاہ ہی نہیں اُٹھتی اور اس کتاب میں اخلاص کے بارے میں انشاء اللہ بہت سی باتیں بیان کی جائیں گی۔

دسویں فصل
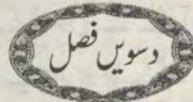
حضرت ابراہیم بن ادہم رضی اللہ عنہ:

آپ سرداروں کے سردار، بقائے الٰہی کے طریقے کے سالک، طریقت میں یکتائے روزگار، اپنے ہمسروں کے سردار اور حضرت خضر پیغمبر صلوٰت اللہ والسلام علی نبینا و علیہ کے مرید تھے۔ بہت سے قدمائے مشائخ سے ملاقات کی تھی اور ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی صحبت میں رہ کر علم حاصل کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ابتدائے حال میں آپ بلخ کے بادشاہ تھے۔ ایک روز آپ شکار میں اپنے لشکر سے جدا ہو کر ایک ہرن کے تعاقب میں دوڑے۔ خدا تعالےٰ نے اس ہرن کو

آپ سے بات کرنے کی توفیق بخشی اور نہایت فصیح زبان سے اس کی طرف دیکھ کر یوں کہا: اَلِهٰذَا خُلِقْتَ اَوْ بِهٰذَا اُمِرْتَ۔ (ترجمہ: کیا تم اسی کام کے لیے پیدا کیے گئے ہو یا اسی کا تمہیں حکم دیا گیا ہے؟) اس بات سے آپ اتنے متاثر ہوئے کہ فوراً اللہ کے حضور توبہ کی اور سب امورِ سلطنت کو ترک کر کے زہد[1] اور ورع کا طریقہ اختیار کر لیا اور پھر حضرت فضیل بن عیاض اور حضرت سفیان ثوری رحمہم اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی صحبت اختیار کی اور توبہ کرنے کے بعد ساری عمر اپنے کسبِ حلال کے سوا اور کچھ نہ کھایا۔ آپ کے معاملات بالکل آشکار اور آپ کی کرامتیں مشہور ہیں اور تصوف کے حقائق میں آپ کے عجیب کلمات اور بہت عمدہ رموز ہیں۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مَفَاتِحُ الْعُلُوْمِ اِبْرَاهِيْمُ۔ (ترجمہ: تمام علوم طریقت کی کنجی حضرت ابراہیم بن ادہم رحمتہ اللہ علیہ ہیں)۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے۔ اِتَّخِذِ اللّٰهَ صَاحِبًا وَّ ذَرِ النَّاسَ جَانِبًا۔ (ترجمہ: اللہ تعالیٰ کو اپنا دوست بنا اور لوگوں کو ایک طرف چھوڑ)۔ مطلب یہ ہے کہ جب بندے کی توجہ حق تعالیٰ کی طرف درست ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں وہ مخلص ہو تو پھر یہ توجہ مخلوقات سے اعراض کرنے کا تقاضا کرتی ہے، اس لیے کہ مخلوق کی صحبت کو حق تعالیٰ کی باتوں سے کچھ واسطہ نہیں۔ یاد رکھو کہ حق تعالیٰ کی طرف صحیح توجہ اس کے فرمان کے ادا کرنے میں مخلص ہونا ہے اور فرماں برداری میں اخلاص کا جذبہ خالص محبت ہی کی وجہ سے ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کی خالص محبت نفس اور اس کی خواہش کی دشمنی سے پیدا ہوتی ہے، کیونکہ جو شخص ہوائے نفسانی کا دلدادہ ہو، وہ خدا تعالیٰ سے دُور اور جدا ہوتا ہے اور جو ہوائے نفس سے قطع تعلق کر لیتا ہے، وہ حق تعالیٰ سے آرام پاتا ہے۔ پس اپنے حق میں سببِ مخلوق تو خود ہی ہے۔ جب تو اپنے آپ سے اعراض کرے گا تو ساری مخلوق سے اعراض کرے گا اور جو سب مخلوق سے اعراض کرنے کے باوجود اپنی ذات کی طرف توجہ کرے تو یہ صریح ظلم ہے، کیونکہ سب لوگ جس کام میں لگے ہوئے ہیں، حکم الٰہی اور اس کی تقدیر سے ہیں۔ تیرا معاملہ خود اپنے ساتھ ہے اور یاد رکھو کہ طالب حق کے لیے ظاہر و باطن کی استقامت دو چیزوں پر موقوف ہے۔ ایک پہچاننے کے قابل ہے اور دوسری کرنے کے، اور جو پہچاننے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ تمام خیر و شر میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو جانے۔ مطلب یہ کہ ساری دنیا میں حق تعالیٰ کی مشیت کے بغیر نہ کوئی متحرک ساکن ہو سکتا ہے اور نہ کوئی ساکن متحرک اور جو کرنے کے قابل ہے، وہ یہ ہے کہ احکام الٰہی کو بجا لائے، اعمال کو درست رکھے اور حلال و حرام کی تمیز کرے، کیونکہ کسی حال میں بھی تقدیر الٰہی ترکِ فرمان کے لیے حجت نہیں ہو سکتی۔ پس مخلوق سے اعراض کرنا اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنی ذات سے اعراض نہ ہو، اور جب تو اپنی ذات سے اعراض کرے گا تو سب مخلوق مراد حق کے حصول کے لئے آمادہ ہو جائے گی اور جب تو حق تعالیٰ کی طرف توجہ کرے گا تو تو امر حق کے قائم کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ پس مخلوق سے آرام پانے کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر حق کے سوا کسی اور چیز سے تو آرام پانا چاہے تو البتہ غیر سے تو آرام حاصل کر کیونکہ غیر سے آرام پانا توحید حق کو دیکھنا ہے اور اپنے ساتھ آرام تعطیل کو ثابت کرنا ہے اور یہی وجہ ہے کہ حضرت شیخ ابوالحسن سالیہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ مرید کو ولی کے حکم میں رہنا اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنے نفس کے حکم میں رہے۔ اس لیے کہ غیر کی صحبت خدا کے لیے ہوتی ہے اور اپنے نفس کی صحبت خواہش نفس کی پرورش کے لیے ہوتی ہے۔ اس معنی کے متعلق

---

[1] زہد: ترکِ دنیا۔ ورع: پرہیز گاری، خوفِ خدا

اس کتاب میں اپنی جگہ پر کلام کیا جائے گا۔

حضرت ابراہیم بن ادہم کی حکایت میں یوں بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب میں جنگل میں پہنچا تو ایک بوڑھے شخص نے آکر مجھ سے کہا کہ "اے ابراہیم! تجھے معلوم ہے کہ یہ کون سی جگہ ہے، جہاں تو بے سفر خرچ و سواری چلا جا رہا ہے؟" آپ فرماتے ہیں کہ میں نے جان لیا کہ وہ شیطان ہے۔ اس وقت چار دانگ چاندی کے میرے پاس تھے جو کوفہ میں ایک زنبیل بُن اور بیچ کر حاصل کیے تھے۔ میں نے وہ بھی جیب سے نکالے اور پھینک دیئے اور یہ مصمم عزم کیا کہ ہر میل پر چار سو رکعت نماز ادا کروں گا۔ چنانچہ چار سال تک میں اس جنگل میں رہا اور خداوند تعالےٰ وقت پر برابر روزی پہنچاتا رہا اور اس عرصے میں حضرت خضر علیہ السلام میرے ہمراہ رہے، جنہوں نے اللہ تعالےٰ کا اسم اعظم مجھے سکھایا۔ اس وقت سے میرا دل مخلوقات سے بالکل بے نیاز ہو گیا۔ ان کے علاوہ آپ کے بہت سے مناقب ہیں اور توفیق قبضہ قدرت الٰہی میں ہے۔
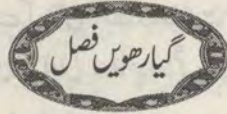
حضرت بشر حافی رضی اللہ عنہ:

آپ معرفت کے تخت، اہل عمل کے تاج اور بزرگ ترین تبع تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ مجاہدے میں بڑی شان اور معاملاتِ طریقت میں کامل نصیب رکھتے تھے۔ حضرت فُضیل بن عیاض رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت میں رہے اور اپنے ماموں علی بن حشرم رحمتہ اللہ علیہ کے مرید اور علم اصول و فروع کے معتبر عالم تھے۔ آپ کی توبہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک روز آپ مستی کی حالت میں کہیں جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک کاغذ کا ٹکڑا پایا، جس پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا ہوا تھا۔ اس کو آپ نے بڑی تعظیم سے اُٹھایا اور عطر لگا کر ایک پاک جگہ پر رکھ دیا۔ اسی رات آپ نے خداوند تعالےٰ کو خواب میں دیکھا اور آپ سے یوں ارشاد فرمایا: یَا بِشْرُ طَیَّبْتَ اِسْمِیْ فَبِعِزَّتِیْ لَاُطَیِّبَنَّ اسْمَكَ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ۔ (ترجمہ: اے بشر! تو نے میرے نام کو خوشبودار کیا۔ مجھے اپنی عزت کی قسم ہے کہ میں تیرے نام کو بھی دنیا و آخرت میں خوشبودار کروں گا) کہ جو کوئی تیرا نام سنے گا، اس کے دل کو راحت پہنچے گی۔ تب آپ نے توبہ کی اور زہد کا طریق اختیار کیا۔

کہتے ہیں کہ مشاہدہ حق میں غلبہ حال کی شدت کا یہ عالم تھا کہ کسی چیز کو کبھی اپنے پاؤں میں نہ پہنا۔ آپ سے لوگوں نے جب اس کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ زمین اللہ تعالیٰ کا فرش ہے اور میں اس بات کو جائز نہیں رکھتا کہ اس کے فرش پر ایسی حالت میں چلوں کہ میرے پاؤں اور اس کے فرش کے درمیان کوئی چیز حائل ہو اور یہ بات آپ کے عجیب معاملات میں سے ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ اپنی ہمت کو جمع کرنے میں جوتا بھی آپ کو حجاب معلوم ہوا۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: مَنْ اَرَادَ اَنْ یَکُوْنَ عَزِیْزًا فِی الدُّنْیَا وَ شَرِیْفًا فِی الْاٰخِرَۃِ فَلْیَجْتَنِبْ ثَلَاثًا لَا یَسْاَلُ اَحَدًا حَاجَۃً وَ لَا یَذْکُرُ اَحَدًا بِسُوْءٍ وَ لَا یُجِیْبُ اَحَدًا اِلٰی طَعَامِہٖ۔ (ترجمہ: جو شخص چاہے کہ دنیا میں عزیز اور آخرت میں شریف ہو، اسے تین باتوں سے پرہیز کرنی چاہیے:

(اول) کسی سے کوئی چیز نہ مانگے (دوم) کسی کو برائی سے یاد نہ کرے (سوم) کسی کی دعوتِ طعام قبول نہ کرے۔

لیکن جو شخص خدا کی راہ جانتا ہے، وہ مخلوق سے کوئی حاجت طلب نہیں کرتا کیونکہ مخلوق سے حاجت طلب کرنا عدم معرفت

کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ اگر قاضی[1] الحاجات کو وہ جانتا تو اپنے جیسی مخلوق سے حاجت طلب نہ کرتا لِاَنَّ اسْتِعَانَةَ الْمَخْلُوْقِ مِنَ الْمَخْلُوْقِ كَا سْتِعَانَةِ الْمَسْجُوْنِ مِنَ الْمَسْجُوْنِ۔ (ترجمہ: کیونکہ مخلوق کا مخلوق سے مدد مانگنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ قیدی کا قیدی سے مدد مانگنا) اور جو شخص کسی کو برا کہتا ہے سو اس کا یہ کام حکم خداوند تعالےٰ میں تصرف ہے، کیونکہ وہ شخص اور اس کا فعل دونوں خدا کی مخلوق ہیں اور جو خدا کی مخلوق کو رّد کرتا ہے، وہ خود خداتعالیٰ کو رّد کرتا ہے کہ جو فعل کو برا کہے گا، وہ فاعل کو بھی برا سمجھے گا، سوائے اس فعل کے جو اس نے خود فرمایا ہے کہ میری موافقت میں کفار کی مذمت کرو، لیکن یہ جو فرمایا ہے کہ کسی کے کھانے سے پرہیز کرو تو وہ اس لیے کہ اصل رازق خداتعالےٰ ہے۔ اگر مخلوق کو تیری روزی کا سبب بنادے تو تو اس سبب کو نہ دیکھ، بلکہ یہ جان لے کہ وہ تیری روزی دراصل خداتعالےٰ ہی نے تجھے پہنچادی نہ یہ کہ وہ اس کی ملکیت ہے، اور اگر وہ شخص یوں خیال کرے کہ وہ اس کی ملکیت ہے اور اسی وجہ سے وہ تجھ پر احسان کرتا ہے تو بے شک اس کی دعوت طعام کو قبول نہ کر کیونکہ روزی میں کسی کو کسی پر احسان نہیں ہے۔ اس وجہ سے کہ اہل سنت و جماعت کے نزدیک روزی غذا ہے اور معتزلہ[2] کے نزدیک ملکیت ہے۔ مخلوقات کی خداتعالےٰ بھی غذاوں سے پرورش کرتا ہے اور اس کی تاویل کی ایک اور وجہ بھی ہے، واللہ اعلم۔

بارہویں فصل
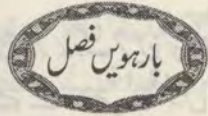
حضرت بایزید بسطامی رضی اللہ عنہ:

آپ معرفت کے آسمان اور محبت الٰہی کی کشتی ہیں، اور بزرگ ترین تبع تابعین میں گنے جاتے ہیں۔ مشائخ طریقت میں آپ کا حال سب سے بڑھ کر اور شان سب سے بڑی ہے یہاں تک کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: اَبَايَزِيْدَ مِنَّا بِمَنْزِلَةِ جِبْرَئِيْلَ مِنَ الْمَلٰئِكَةِ۔ (ترجمہ: بایزید رحمۃ اللہ علیہ کا ہم میں وہ درجہ ہے جو حضرت جبرئیل کا فرشتوں میں)۔ آپ کے دادا مجوسی تھے اور باپ بسطام کے بزرگوں میں سے تھے۔ پیغمبر ﷺ سے آپ نے بکثرت روایات بیان کی ہیں اور تصوف کے دس مشہور اماموں میں سے ایک آپ ہوئے ہیں۔ آپ سے پہلے اس علم تصوف کے حقائق سے استنباط کا اتنا ملکہ کسی کو حاصل نہیں ہوا تھا جتنا آپ کو حاصل ہوا۔ دراصل آپ تمام احوال میں علم دوست اور شریعت کی تعظیم کرنے والے تھے۔ برعکس ایک گروہ کے جو الحاد کی وجہ سے بناوٹی طور پر اپنے آپ کو آپ سے وابستہ کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ آپ کا ابتدائی زمانہ مجاہدے اور عملی ریاضت میں گزرا ہے۔

چنانچہ آپ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: عَمِلْتُ فِي الْمُجَاهَدَةِ ثَلَاثِيْنَ سَنَةً فَمَا وَجَدْتُ شَيْئًا اَشَدَّ عَلَيَّ مِنَ الْعِلْمِ وَ مُتَابَعَتِ وَلَوْلَا اخْتِلَافُ الْعُلَمَاءِ لَبَقِيْتُ وَ اخْتِلَافُ الْعُلَمَاءِ رَحْمَةٌ اِلَّا فِيْ تَجْرِيْدِ التَّوْحِيْدِ۔ (ترجمہ: میں نے تیس سال تک مجاہدہ کیا ہے۔ اس عرصے میں علم اور اس کی متابعت سے زیادہ سخت کوئی چیز مجھے معلوم نہ ہوئی اور اگر علماء کا اختلاف نہ ہوتا تو میں سب امور دین کے ادا کرنے سے قاصر رہ جاتا اور دین کا حق ادا نہ کرسکتا۔ لیکن خالص توحید الٰہی کے سوا سب امور میں علماء کا اختلاف رحمت ہے) اور درحقیقت ایسا ہی ہے کیونکہ طبیعت علم کی نسبت جہالت کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے اور جہالت میں بہت سے کام بغیر رنج

[1] حاجتوں کو پورا کرنے والا، حاجت روا۔ [2] معتزلہ وہ فرقہ ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ نیکی تو اللہ تعالیٰ کی طرف اور بدی خود بندے کی طرف سے ہوتی ہے اور مذہب کو عقل کے ماتحت بنائے۔

کے کر سکتے ہیں، لیکن علم میں ایک قدم بھی بغیر تکلیف کے نہیں رکھ سکتے۔ شریعت کا راستہ آخرت کے پل صراط سے زیادہ باریک اور پر خطر ہے پس تمام احوال میں تجھے ایسا ہونا چاہیے کہ اگر طریقت کے بلند احوال اور بزرگ مقامات سے تو رہ جائے تو شریعت کے میدان کی طرف توجہ دے، کیونکہ اگر تجھ سے دیگر سب مقامات جاتے بھی رہیں تو عمل ہی تیرے ساتھ رہ جائیں، اس لیے کہ مرید کے لیے سب سے بڑی آفت علم کا ترک کرنا ہے اور جھوٹے مدعیوں کے تمام دعوے شریعت پر عمل کرنے کے مقابلے میں بالکل ہیچ ہیں اور سب اہل زبان اس کے مقابلے سے عاری ہیں۔ نیز آپ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: اَلْجَنَّةُ لَا خَطَرَلَهَا اَهْلُ الْمَحَبَّةِ وَ اَهْلُ الْمَحَبَّةِ مَحْجُوْبُوْنَ بِمَحَبَّتِهِمْ۔ (ترجمہ: اہلِ محبت کے نزدیک جنت کی کچھ وقعت نہیں اور اہل محبت، محبت کی وجہ سے حجاب میں ہیں) اور محبتِ حق کے سوا کوئی چیز ان کے نزدیک پھٹک نہیں سکتی، یعنی بہشت اگرچہ اعلیٰ مقام ہے مگر پھر بھی مخلوق ہے اور محبت الٰہی کی صفت قدیم اور غیر مخلوق ہے۔ جو شخص غیر مخلوق کو چھوڑ کر مخلوق میں اٹک کر رہ جاتا ہے وہ کم مایہ اور بے قدر ہوتا ہے۔ پس مخلوق دوستانِ حق کے نزدیک کچھ وقعت نہیں رکھتی اور دوستانِ حق اس کی محبت میں محجوب ہیں۔ اس لیے کہ غیر کی محبت کا وجود دوئی کا تقاضا کرتا ہے اور اصلی توحید میں دوئی ناممکن ہے، کیونکہ اللہ کے دوستوں کا راستہ وحدانیت سے وحدانیت کی طرف ہوتا ہے۔ یہ بات محبت کے راستے میں محبت کی خرابی ہے کہ دوستی میں ایک مرید ہو دوسرا مراد۔ خواہ مرید حق تعالےٰ ہو اور مراد بندہ یا مراد حق تعالےٰ ہو اور مرید بندہ۔ اگر مرید حق تعالےٰ ہو اور مراد بندہ تو حق تعالےٰ کی مراد کے اندر بندے کی ہستی ثابت ہو گی اور اگر مرید بندہ ہو اور مراد حق تعالےٰ تو مخلوق کی طلب واردات کو اس کی طرف کوئی راستہ نہیں ہوتا (یعنی بندے کی طلب اور ارادت اس کو کبھی پا نہیں سکتی)۔ اب اس مقام پر محب میں وجود کی آفت دونوں حالتوں میں باقی رہے گی۔ پس محبّ کا بقائے محبت میں فنا ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ محبت کی بقا کی وجہ سے اس کو فنا حاصل ہو۔

نیز آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ "ایک مرتبہ میں مکہ مکرمہ گیا اور صرف خانہ کعبہ کو دیکھا تو میں نے کہا کہ حج مقبول نہیں ہے، کیونکہ اس قسم کے پتھر تو میں نے بہت دیکھے ہیں۔ دوسری مرتبہ گیا تو خانہ کعبہ کو بھی دیکھا اور مالک خانہ کعبہ کو بھی دیکھا تو میں نے کہا کہ ابھی توحید کی حقیقت حاصل نہیں ہوئی۔ تیسری مرتبہ گیا تو صاحب خانہ کعبہ یعنی اللہ تعالےٰ کو دیکھا اور خانہ کعبہ کو نہ دیکھا۔ تب میرے دل سے یہ آواز آئی کہ اے بایزید! اگر تم اپنے آپ کو نہ دیکھتا اور سارے جہاں کو دیکھتا تو مشرک نہ ہوتا اور جب تو سارے جہاں کو نہیں دیکھتا اور صرف اپنے آپ کو دیکھتا ہے تو تو مشرک ہے۔ اس وقت میں نے اپنی ہستی کو دیکھنے سے توبہ کی بلکہ توبہ سے بھی توبہ کر دی۔" یہ حکایت آپ کے حال کی صحت میں نہایت لطیف اور اہل حال کے لیے عمدہ نشان ہے۔

تیرہویں فصل
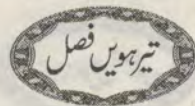
حضرت حارث بن اسد المحاسبی رضی اللہ عنہ:

آپ تمام فنون کے امام، جملہ شبہات کے پتہ لگانے والے اور بزرگ ترین تبع تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ علم طریقت کے اصول و فروع کے عالم اور اپنے وقت کے تمام اہل علم کے مرجع تھے۔ آپ نے اصول تصوف میں غائب نام کی ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کے علاوہ ہر شعبے میں آپ کی تصانیف بہت سی ہیں۔ آپ بلند حال، بزرگِ

ہمت اور اپنے زمانے میں بغداد کے شیخ المشائخ تھے۔ آپ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: اَلْعِلْمُ بِحَرَکَاتِ الْقُلُوْبِ فِیْ مُطَالَعَةِ الْعُیُوْبِ اَشْرَفُ مِنَ الْعَمَلِ بِحَرَکَاتِ الْجَوَارِحِ۔ (ترجمہ: اپنے عیوب کے مطالعہ میں دلوں کی حرکات کو جاننا، ہاتھ پاؤں سے عمل کرنے کی نسبت زیادہ شریف ہے)۔ مراد اس سے یہ ہے کہ علم محال کمال ہے اور جہل محل طلب اور علم درگاہ الٰہی میں جہالت سے بہتر ہے، کیونکہ علم آدمی کو کمال کے درجے تک پہنچا دیتا ہے اور جہل کو درگاہ کے اندر گھسنے نہیں دیتے۔ حقیقت میں علم عمل کی نسبت زیادہ بزرگ ہے اس لیے کہ خداوند تعالےٰ کو علم سے پہچان سکتے ہیں اور عمل سے اسے پا نہیں سکتے، اگر علم کے بغیر عمل کو اس کی درگاہ میں راستہ ہو تو نصارےٰ اور ان کی پادری اپنی سخت کوشش کی وجہ سے مشاہدہ الٰہی میں داخل ہو جاتے اور عام مومن حق سے دُور رہتے۔ پس عمل بندے کی صفت ہے اور علم اللہ کی۔ اس قول کے راویوں میں سے بعض کو غلطی واقع ہوئی ہے، چنانچہ دونوں جگہ لفظ عمل کی روایت کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں: اَلْعَمَلُ بِحَرَکَاتِ الْقُلُوْبِ اَشْرَفُ مِنَ الْعَمَلِ بِحَرَکَاتِ الْجَوَارِحِ۔ (ترجمہ: حرکاتِ دل سے عمل کرنا اعضا کی حرکات سے عمل کرنے کی نسبت زیادہ شریف ہے) حالانکہ یہ محال ہے کیونکہ بندے کا عمل فقط دل کی حرکات سے متعلق نہیں ہوتا۔ ہاں اگر اس سے تفکر اور احوالِ باطن کا ملاحظہ مراد ہو تو کچھ عجب نہیں، کیونکہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: تَفَکُّرُ سَاعَةٍ خَیْرٌ مِنْ عِبَادَةِ سِتِّیْنَ سَنَةً۔ (ترجمہ: ایک ساعت کے لیے دل میں غور و فکر کرنا ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے) اور اسی لحاظ سے فی الحقیقت دل کے اعمال اعضا کے اعمال سے زیادہ فضیلت رکھتے ہیں اور باطن کے احوال و افعال کی تاثیر حقیقت میں ظاہر کے اعمال سے زیادہ کامل ہوتی ہے اور اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ نَوْمُ الْعَالِمِ عِبَادَةٌ وَ سَهْرُ الْجَاهِلِ مَعْصِیَةٌ۔ (ترجمہ: عالم کی نیند عبادت ہوتی ہے اور جاہل کی بیداری نافرمانی) اس لیے کہ خواب اور بیداری میں عالم کا دل مغلوب ہوتا ہے اور جب دل مغلوب ہو تو بدن بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ پس دل کا غلبہ حق سے مغلوب ہونا، مجاہدے کی وجہ سے حرکات ظاہر پر نفس کے غلبے سے بہتر ہے۔

نیز آپ سے روایت ہے کہ ایک روز آپ نے ایک درویش سے کہا کُنْ لِلّٰهِ وَ اِلَّا فَلَا تَکُنْ۔ (ترجمہ: ہو تو اللہ کے لیے ورنہ کچھ بھی نہ ہو) یعنی حق تعالےٰ کے ساتھ باقی رہ یا اپنے وجود سے فانی ہو جا۔ مطلب یہ ہے کہ صفائے قلب سے اپنی خاطر جمع رکھیے یا فقر سے اپنے دل کو پریشان، یا تو اس صف سے متصف ہو تو حق تعالےٰ فرماتا ہے: اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (ترجمہ: آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو) یا اس صفت سے متصف ہو: هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا۔ (ترجمہ: انسان پر ایک وقت ایسا گزرا ہے کہ وہ کچھ بھی نہ تھا) یعنی عالم ہستی میں اس کا ذکر تک نہ تھا، لہٰذا اگر تو اپنی مرضی سے اللہ تعالےٰ کے لیے ہو جائے گا تو تیرا قیام بذات خود ہوگا اور اگر اپنی مرضی سے خدا کے لیے نہ ہوگا بلکہ خدا کی مرضی سے ہوگا تو تیرا قیام بحق تعالےٰ ہوگا اور یہ معنی بہت لطیف ہے، واللہ اعلم۔

چودھویں فصل
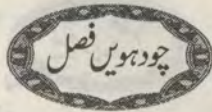
حضرت داوٗد طائی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ میں سے ایک، طلب جاہ نہ کرنے والے اور مخلوق سے قطع تعلق کرنے والے، حضرت ابو سلیمان داوٗد بن نصر الطائی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ مشائخ کبار و اہل تصوف کے سرداروں میں سے ہوئے اور اپنے زمانے میں بے نظیر تھے۔ حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد، حضرت فضیل و ابراہیم ادہم رحمتہ اللہ علیہم وغیرہ

کے ہم عصر تھے اور حضرت حبیب راعی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید خاص تھے۔ آپ تمام علوم میں کافی دست گاہ اور بلند درجہ رکھتے تھے، خصوصاً فقہ میں تمام فقہا کے سردار مانے جاتے تھے۔ آپ نے ریاست کو چھوڑ کر گوشہ نشینی اور زہد کا طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ آپ کے اوصافِ حمیدہ بہت ہیں اور آپ کی عمدہ خصلتیں زبان زدِ عام و خاص ہیں۔ آپ معاملاتِ طریقت کے عالم اور حقائق کے بیان کرنے میں بڑے کامل تھے۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے مرید سے فرمایا: اِنْ اَرَدْتَ السَّلَامَةُ سَلِّمْ عَلَى الدُّنْيَا وَ اِنْ اَرَدْتَ الْكَرَامَةَ كَبِّرْ عَلَى الْاٰخِرَةِ۔ (ترجمہ: اگر تو سلامتی چاہتا ہے تو دنیا کو سلامِ وداع کہہ دے اور اگر بزرگی چاہتا ہے تو آخرت پر تکبیر موت پڑھ دے) یعنی یہ دنیا و عقبیٰ دونوں محل حجاب ہیں اور ہر طرح کی فراغت ان ہی دو چیزوں سے وابستہ ہے۔ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ بدن سے فارغ ہو جائے اسے کہہ دو کہ دنیا سے اعراض کرے اور جو یہ چاہے کہ دل سے فارغ ہو، اسے چاہیے کہ عقبیٰ کی محبت اپنے دل سے نکال باہر کرے۔ حکایت میں آپ کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ آپ ہمیشہ امام محمد بن الحسن الشیبانی رحمتہ اللہ علیہ سے میل جول رکھتے اور امام ابو یوسف القاضی رحمتہ اللہ علیہ سے بے تعلق رہتے تھے۔ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ "دونوں صاحبِ علم اور بزرگ ہیں۔ آپ کیوں ایک کو عزیز رکھتے اور دوسرے کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے؟" تو آپ نے جواب دیا: "اس لیے کہ محمد بن الحسن رحمتہ اللہ علیہ دنیا اور اس کی تمام نعمتوں کو چھوڑ کر علم میں داخل ہوئے ہیں، لہٰذا آپ کا علم دین کی عزت اور دنیا کی ذلت کا باعث ہے اور ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ درویشی اور ذلت چھوڑ کر علم میں داخل ہوئے ہیں اور پھر علم کو اپنے رتبے اور عزت کا سبب بنا لیا ہے۔" پس حضرت امام محمد بن الحسن، حضرت ابو یوسف القاضی جیسے نہیں ہو سکتے بلکہ خلوص میں ان سے بڑھ کر ہیں۔ حضرت معروف کرخی رحمتہ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جس کی نظر میں دنیا اس قدر حقیر ہو جس قدر حضرت داؤد طائی کی نظر میں۔ غرضیکہ دنیا اور دنیا دار کی آپ کے نزدیک کچھ بھی قدر نہ تھی، لیکن فقراء کو آپ کمال عزت کی نظر سے دیکھتے تھے خواہ بظاہر وہ کتنے ہی خستہ حال ہوں اور آپ کے اوصاف حمیدہ بے شمار ہیں، واللہ اعلم۔

پندرہویں فصل
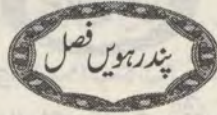
حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ میں سے ایک، اہل حقائق کے شیخ اور تمام تعلقاتِ دُنیوی سے بے نیاز، حضرت ابوالحسن سری بن مفلس السقطی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے ماموں تھے۔ تمام علوم ظاہری اور تصوف میں آپ کی بڑی شان ہے۔ آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مقاماتِ طریقت کی ترتیب اور احوالِ عارف کی بسط و وضاحت میں غور و خوض کیا۔ مشائخ عراق میں سے بہت سے بزرگ آپ کے مرید ہیں۔ آپ نے حضرت حبیب راعی رحمتہ اللہ علیہ کو دیکھا اور ان کی صحبت سے استفادہ کیا اور حضرت معروف کرخی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ آپ بغداد کے بازار میں کباڑی کی دُکان کیا کرتے تھے۔ جب بغداد کا بازار جل گیا لوگوں نے آپ سے کہا کہ "آپ کی دُکان جل گئی۔" یہ سن کر آپ نے فرمایا: "چلو اس کی فکر سے فارغ ہوا۔" جب لوگوں نے جا کر دیکھا تو آپ کی دُکان جلی نہ تھی بلکہ اس کی چاروں طرف کی سب دُکانیں جل گئی تھیں۔ جب آپ نے یہ دیکھا تو جو کچھ دُکان میں تھا، سب درویشوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کیا اور خود تصوف کا راستہ اختیار کر لیا۔ ایک دفعہ آپ سے لوگوں

نے دریافت کیا کہ "آپ کا ابتدائی حال کیسا تھا؟" تو آپ نے جواب دیا: "ایک دن حضرت حبیب راعی رحمۃ اللہ علیہ کا میری دُکان پر گزر ہوا۔ میں نے ان کو روٹی کے کچھ ٹکڑے دیئے کہ وہ درویشوں کو دے دیں تو انہوں نے میرے لیے یہ دعا کی: خَیَّرَكَ اللّٰہُ۔ (ترجمہ: اللہ تجھے نیکی دے) پس جس روز سے ان کانوں نے آپ کی یہ دعا سنی ہے، احوالِ دنیا کی بہتری مجھ سے جاتی رہی۔" نیز آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: اَللّٰھُمَّ لَوْ عَذَّبْتَنِیْ بِہٖ مِنْ شَیْءٍ فَلَا تُعَذِّبْنِیْ بِذُلِّ الْحِجَابِ۔ (ترجمہ: اے اللہ! اگر تو کسی چیز سے مجھے عذاب دے تو حجاب کی ذلت سے مجھے عذاب نہ دیجیو) اس لیے کہ جب میں تجھ سے حجاب میں نہ ہوں گا، تو ہر قسم کا عذاب و سختی تیرے ذکر و مشاہدے کی وجہ سے مجھ پر آسان ہو جائے گی اور جب تجھ سے حجاب میں ہوں گا تو دنیا کی نعمت بھی تجھ سے حجاب کی ذلت کی وجہ سے میری ہلاکت کا باعث ہو گی۔ پس وہ بلا جو بلا میں ڈالنے والے کے حضور میں ہو، وہ بلا نہیں بلکہ نعمت ہوتی ہے اور جو بلا میں ڈالنے والے سے حجاب کی صورت میں حاصل ہو، وہ بلا نہیں بلکہ ہلاکت ہوتی ہے۔ غرضیکہ دوزخ میں کوئی عذاب حجاب سے زیادہ سخت اور مشکل نہیں، کیونکہ اگر اہل دوزخ کو دوزخ میں خدا تعالےٰ کا کشف حاصل ہوتا تو گناہ گار مومنین کو کبھی بہشت یاد نہ آتی۔ اس لیے کہ دیدارِ الٰہی سے ان کی جان کو اتنی خوشی ہوتی کہ بدن کی مصیبت اور جسم کے عذاب کی ان کو خبر تک نہ ہوتی اور بہشت میں کوئی کشف دیدارِ حق سے بڑھ کر نہیں، اگر وہ بہشت کی نعمتیں بلکہ ان سے سوگنا زیادہ نعمتیں بھی ان کو حاصل ہوں لیکن وہ حق تعالےٰ کی دید سے حجاب میں ہوں تو ان کے دل اور ان کی جانیں ہلاک اور تباہ ہو جائیں۔ پس سنتِ الٰہی یوں واقع ہوئی ہے کہ وہ تمام احوال میں اپنے دوستوں کا دل اپنی ذات حق کی طرف بینا رکھتا ہے تاکہ تمام مشقت، محنت اور بشریت کی مصیبتیں اس کی وجہ سے برداشت کر سکیں، البتہ اس حال میں ان کی دُعا یوں ہوتی ہے کہ سارے عذاب تیرے حجاب کی نسبت ہمیں زیادہ پسندیدہ ہیں، کیونکہ جب ترا جمال ہمارے دلوں پر جلوہ نما ہو تو تمام مصیبتوں کا ہمیں اندیشہ نہیں، واللہ اعلم۔

سولھویں فصل
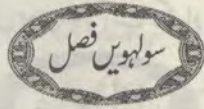
حضرت شقیق بن ابراہیم ازدی رحمۃ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ میں سے ایک، اہل بلا و مصیبت کے سر لشکر اور زہد و تقویٰ کا سرمایہ حضرت ابو علی شقیق بن ابراہیم الازدی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ قوم صوفیا کے درمیان معزز، ان کے مقتدا، تمام علوم شرعی اور معاملات طریقت وحقیقت کے معتبر عالم تھے۔ علم طریقت کے مختلف موضوعات پر آپ کی بہت سی تصانیف ہیں۔ آپ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے ہم صحبت تھے اور بہت سے مشائخ کبار کو دیکھا اور ان سے فیض پایا تھا۔ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جَعَلَ اللّٰہُ اَھْلَ طَاعَتِہٖ اَحْیَآءً فِیْ مَمَاتِھِمْ وَ اَھْلَ الْمَعَاصِیْ اَمْوَاتًا فِیْ حَیٰوتِھِمْ۔ (ترجمہ: اللہ تعالےٰ نے اپنے اطاعت گزار بندوں کو ان کی موت کے بعد بھی زیادہ کر دیا ہے اور نافرمان وگنہگار بندوں کو ان کی زندگی میں مردہ بنا دیا ہے) یعنی اللہ کا فرماں بردار اگرچہ مردہ ہو، زندہ ہوتا ہے کیونکہ فرشتے اس کی فرماں برداری پر ہمیشہ آفرین کرتے رہتے ہیں اور اس کا ثواب دائمی ہوتا ہے، پس وہ اپنی موت کے بعد بھی اپنی ہمیشہ رہنے والی جزا کے ساتھ باقی و زندہ رہتا ہے۔

آپ کی نسبت روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک بوڑھا آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا: "اے شیخ! میں بہت

گنہگار ہوں، چاہتا ہوں کہ توبہ کروں۔" آپ نے فرمایا: "تو بہت دیر بعد آیا۔" بوڑھے نے کہا: "نہیں، میں تو بہت جلد آیا ہوں۔" آپ نے فرمایا: "وہ کیسے؟" اس نے کہا کہ "جو شخص موت سے پہلے آجائے اگرچہ دیر بعد آئے، جلدی آیا ہوتا ہے۔" کہتے ہیں آپ کی توبہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک سال بلخ میں قحط پڑا اور لوگ ایک دوسرے کو کھانے لگے اور مسلمان بہت غمگین ہو رہے تھے۔ آپ نے ایک غلام کو دیکھا جو بازار میں ہنستا اور خوش ہو رہا تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا: "تو کیوں ہنستا ہے؟ تجھے شرم نہیں آتی کہ سب مسلمان تو غم واندوہ میں ہیں اور تو ایسی خوشی کر رہا ہے؟" اس نے کہا: "مجھے تو کچھ بھی غم نہیں، کیونکہ میں تو اس شخص کا غلام ہوں جس کی ملکیت میں ایک گاؤں ہے، اس نے میرے دل سے تمام تفکرات کو اُٹھا دیا ہے۔" حضرت شقیق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: "بارِ خدایا! یہ غلام اپنے اس مالک پر جو صرف ایک گاؤں کا مالک ہے، اتنا خوش ہو رہا ہے اور تو تو سارے جہاں کا مالک ہے اور ہماری روزی پہنچانے کا تو نے وعدہ کر رکھا ہے، پھر بھی ہم نے اپنے دل میں اس قدر غم کو جگہ دے رکھی ہے؟" یہ محسوس کرتے ہوئے آپ نے دنیا کا سب دھندا چھوڑ چھاڑ کر طریقت کا راستہ اختیار کر لیا۔ اس کے بعد کبھی روزی کا غم نہ کھایا۔ آپ ہمیشہ فخر کے طور پر کہا کرتے کہ میں ایک غلام کا شاگرد ہوں اور جو کچھ میں نے پایا ہے، اسی سے پایا ہے۔ آپ کا یہ ارشاد تواضع کی وجہ سے تھا۔ آپ کے مناقب بے شمار ہیں اور توفیق اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔

سترھویں فصل
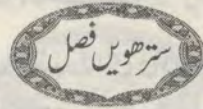
حضرت عبدالرحمٰن الدارانی رحمۃ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ میں سے ایک، اپنے وقت کے شیخ اور طریق حق کے مردِ یگانہ، حضرت ابو سلیمان عبدالرحمٰن بن عطیہ الدارانی رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ صوفیا میں بڑے معزز اور دلوں کی راحت کی وجہ سے صوفیا میں ایک خاص شہرت کے مالک تھے۔ آپ ظاہری اور باطنی علوم کے عالم متبحر اور نفس کی گھاتوں سے اچھی طرح خبردار تھے۔ معاملاتِ طریقت، دلوں کی ریاضت اور اعضا کی نگہداشت کے متعلق آپ کا کلام نہایت لطیف ہے۔ آپ سے روایت ہے: اِذَا غَلَبَ الرِّجَآءُ عَلَی الْخَوْفِ فَسَدَا الْوَقْتُ۔ (ترجمہ: جب اُمید خوف پر غالب ہو جائے تو عارف کا وقت و حال خراب ہو جاتا ہے) اس لیے کہ وقت سے مراد حال کی نگہداشت ہے۔ پس جب تک بندہ حال کی نگرانی کرتا رہتا ہے، خوف اس کے دل پر غالب رہتا ہے، جب خوف اُٹھ جاتا ہے تو وہ نگرانی احوال کو ترک کر دیتا ہے اور اس کا وقت خراب ہو جاتا ہے اور اگر خوف اس کی اُمید پر غلبہ کرے تو اس کی توحید باطل ہو جاتی ہے کیونکہ خوف کا غلبہ نااُمیدی سے ہوتا ہے اور حق تعالےٰ سے نااُمیدی کفر و شرک ہے۔ پس توحید کی حفاظت بندے کی اُمید کے صحیح ہونے پر منحصر ہے اور وقت کی نگہداشت اس کے خوف کی صحت پر۔ جب دونوں (یعنی رجا و خوف) برابر ہوں تو توحید اور وقت دونوں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ بندہ توحید کی نگہداشت کی وجہ سے مومن ہوتا ہے اور وقت کی نگرانی سے اس کا مطیع۔ رجا کا تعلق خالص مشاہدۂ حق سے ہے، جس میں کامل اضطراب ہوتا ہے اور مشاہدہ مجاہدے کی میراث یعنی ماحصل ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سب امیدیں نااُمیدی ہی سے پیدا ہوتی ہیں اور جو شخص اپنے اعمال میں اپنی کامیابی سے ناامید ہو جاتا ہے تو اس کی وہ ناامیدی اس کو کامیابی، نجات اور کرم الٰہی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اس کے چہرے پر خوشی کا دروازہ کھول دیتی ہے، اس کے دل کو طبیعت کی خرابیوں سے صاف کر دیتی

ہے اور اسرار الٰہی کے تمام دروازے اس پر کھل جاتے ہیں۔
حضرت احمد بن ابی الحواری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ایک رات میں خلوت میں نماز پڑھ رہا تھا تو اس میں مجھ بہت ہی راحت حاصل ہوئی۔ جب دوسرے روز میں نے حضرت ابو سلیمان رحمتہ اللہ علیہ سے اس بات کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم کمزور آدمی ہو، ابھی تک مخلوق تمہارے سامنے ہے اس لیے خلوت میں تمہارا حال اور ہے اور جلوت میں کچھ اور، حالانکہ دونوں جہاں میں کوئی چیز ایسی نہیں کہ بندے کو حق تعالےٰ سے روک سکے۔ تم نے دیکھا ہوگا جب دُلہن کو لوگوں کے رُوبرو دکھاتے ہیں تو اس لیے دکھاتے ہیں کہ سب لوگ اس کو دیکھ لیں تاکہ ان کے دیدار سے اس کی عزت بڑھ جائے، لیکن اسے خود ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ اس مقصود کے سوا وہ اپنے آپ کو دیکھے، تو اس صورت میں غیر کے دیدار سے اس کو ذلت ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر سب لوگ اللہ کے فرمانبردار کی فرمابرداری کی عزت دیکھیں تو اس فرمانبردار الٰہی کو اس سے کچھ نقصان نہیں پہنچتا، لیکن اگر وہ خود اپنی فرمانبرداری کو دیکھے تو ہلاک ہو جاتا ہے۔ اللہ اس سے پناہ میں رکھے۔

اٹھارہویں فصل
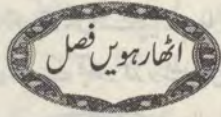
حضرت معروف کرخی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، رضائے الٰہی کی درگاہ سے تعلق رکھنے والے، حضرت علی بن موسےٰ الرضا رضی اللہ عنہ کے تربیت یافتہ، حضرت ابو محفوظ معروف بن فیروز الکرخی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ مشائخ مقتدمین اور ان کے سرداروں میں سے ہوئے ہیں۔ جوانمردی میں مشہور اور پرہیزگاری و رجوع الی اللہ میں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ ترتیب کے لحاظ سے آپ کا ذکر مقدم ہونا چاہیے تھا لیکن میں نے دو پہلے بزرگ مؤلفین کی موافقت سے کہ ان میں ایک صاحبِ نقل اور دوسرے صاحبِ تصرف ہیں، اس مقام پر درج کیا ہے۔ اوّل ان میں سے شیخ متبرک ابو عبدالرحمٰن اسلمی رحمتہ اللہ علیہ ہیں کہ ان کی کتاب میں یہی ترتیب ہے، اور دوسرے استاد ابوالقاسم القشیری رضی اللہ عنہ ہیں کہ ان کی کتاب کے شروع میں آپ کا ذکر اسی ترتیب سے آیا ہے۔ اس مقام پر میں نے اس لیے لکھ دیا ہے کہ آپ حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کے استاد اور حضرت داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید ہوئے ہیں۔ ابتدا میں آپ دین سے بیگانے تھے۔ حضرت علی بن موسیٰ الرضا رضی اللہ عنہ کے دستِ مبارک پر اسلام لائے اور ان کے نزدیک آپ بہت عزیز اور پسندیدہ تھے۔ آپ کے اوصافِ حمیدہ اور فضائل بہت ہیں اور علم کی تمام شاخوں میں آپ قوم صوفیا کے پیشوا ہوئے ہیں۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: لِلْفُتُوَّةِ ثَلٰثُ عَلَامَاتٌ وَفَاءٌ بِلَا خِلَافٍ وَ مَدْحٌ بِلَا جُوْدٍ وَ عَطَاءٌ بِلَا سُؤَالٍ: ترجمہ: (جوانمردی کی تین علامتیں ہیں:

اوّل: خلاف ورزی کے بغیر وعدہ پورا کرنا،

دوم: لالچ اور خواہش انعام کے بغیر مستحق کی تعریف کرنا اور

سوم: مانگے بغیر کسی محتاج کی امداد کرنا)

وفا بلا خلاف یہ ہے کہ بندہ عہد عبودیت میں اللہ کی مخالفت اور نافرمانی کو اپنے اوپر حرام کر دے، مدح بے جود یہ ہے کہ کسی سے بھلائی دیکھے بغیر اس کی مدح کرے اور عطا بے سوال یہ ہے کہ جب دولت ہو تو بخشش کرنے میں

اپنے پرائے کی تمیز نہ کرے اور جب کسی کا حال زار معلوم ہو تو سوال کیے بغیر اس کی امداد کرے اور یہ سب باتیں بظاہر اگرچہ مخلوقات کے درمیان وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ سب ان تین صفتوں سے عارضی طور پر متصف ہوتے ہیں، کیونکہ حقیقت میں یہ تینوں باتیں حق تعالےٰ کی صفت ہیں اور اپنے بندوں کے ذریعہ اسی کا فعل اور یہ اسی کی حقیقی صفت ہے اس لیے کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ عہد کرنے میں کوئی خلاف نہیں کرتا۔ بندہ کتنا ہی اپنے عہد کے وفا کرنے میں خلاف کرے، حق تعالےٰ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مہربانی کرتا ہے اور اس کے وفائے عہد کی بڑی علامت یہ ہے کہ ازل میں بندے کے نیک عمل کے بغیر اس کو پیدا کر کے مخاطب کیا اور آج دنیا میں اس کے برے اعمال کے باوجود اسے اپنی درگاہ سے نہیں ہٹاتا۔ غرض یہ کہ مدح بے جو اس کے سوا کوئی نہیں کرسکتا کیونکہ وہ بندے کے کسی فعل کا محتاج نہیں اور اس کے تھوڑے سے عمل پر بھی اس کی ثنا کرتا ہے اور عطائے بے سوال بھی اس کے سوا کوئی نہیں کرسکتا، اس لیے کہ وہ کریم ہے۔ ہر ایک کا حال جاننا اور ہر ایک کا مقصود بن مانگے پورا کرتا ہے۔ پس جب خدا تعالےٰ بندے پر کرم فرماتا اور اس کو بزرگ کر کے اپنے قرب سے اسے مخصوص کرلیتا ہے تو اس کے یہ تینوں معاملات درست فرماتا ہے اور پھر وہ بندہ کوشش سے اپنی طاقت کے مطابق مخلوق کے ساتھ یہی معاملہ کرتا ہے۔ اس وقت لوگ اس کا نام جوانمرد رکھتے ہیں اور جوانمردوں کے زمرے میں اس کا نام لکھ دیتے ہیں۔ یہ تینوں صفتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام میں بدرجہ کمال پائی جاتی تھیں اور میں انشاء اللہ ان کو اپنے موقع پر بیان کروں گا۔

اُنیسویں فصل
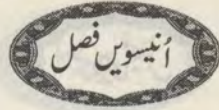
حضرت حاتم اصم رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، بندوں کی زینت اور اوتاد کا جمال حضرت ابو عبدالرحمٰن حاتم بن الاصم رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ بلخ کے باحشمت بزرگوں اور خراسان کے قدیم مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ حضرت شفیق رحمتہ اللہ علیہ کے مرید اور حضرت احمد خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ کے اُستادِ محترم ہوئے ہیں اور اپنے تمام حالات میں ابتدا سے لے کر انتہا تک صدق کے خلاف آپ نے ایک قدم بھی نہیں رکھا۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ صِدِّیْقُ زَمَانِنَا حَاتِمُ الْاَصَمُّ۔ (ترجمہ: ہمارے زمانے کے صدیق حضرت حاتم اصم ہیں)۔ نفس کی خرابیوں اور طبیعت کی سرکشیوں کے وقائق میں آپ کا کلام بہت بلند پایہ ہے اور علم طریقت میں آپ کی تصانیف مشہور ہیں۔ آپ سے روایت ہے:

اَلشَّهْوَةُ ثَلَاثَةٌ شَهْوَةٌ فِي الْاَكْلِ وَشَهْوَةٌ فِى الْكَلَامِ وَشَهْوَةٌ فِى النَّظَرِ۔

(ترجمہ: نفسی خواہش تین قسم کی ہے:

اوّل: خواہش کھانے میں (کھانے کی خواہش)

دوم: خواہش کلام میں (بات کرنے کی خواہش)

سوم: خواہش نظر میں (دیکھنے کی خواہش)

پس اللہ تعالےٰ پر بھروسہ کر کے حرام سے اپنے کھانے کی حفاظت کر، سچ بول کر اپنی زبان کی حفاظت کر اور مشاہدہ کائنات سے عبرت حاصل کر کے اپنی نگاہ کو محفوظ رکھ۔

پس جو شخص کھانے میں اللہ پر توکل کرے، وہ خواہش طعام سے چھوٹ جاتا ہے، جو شخص سچ بولے وہ

خواہش زبان سے بچ جاتا ہے، جو آنکھ سے امرحق کو دیکھے وہ خواہش نظر سے نجات پا جاتا ہے اور یہ یاد رکھو کہ توکل کی حقیقت امرحق کے جاننے سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ جو حق تعالےٰ کو صحیح طور پر جان لیتا ہے وہ اس کے روزی پہنچانے پر یقین کر لیتا ہے۔ پھر اپنے سچے علم کی وجہ سے اس کی عبادت کرتا ہے اور اپنی صحیح معرفت کی وجہ سے اس کی ذات و صفات پر غور کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا کھانا پینا سوائے محبت الٰہی کے اور کچھ نہیں ہوتا اور اس کی عبادت سوائے وجد[1] اور اس کی نظر سوائے مشاہدہ حق کے اور کچھ نہیں ہوتی۔ پس جب وہ حق تعالےٰ کو صحیح طور پر جان لیتا ہے تو حلال کھاتا، سچ بولتا اور تو اس کا ذکر کرتا ہے اور جب امرحق کو دیکھتا ہے تو اسی کو دیکھتا ہے اس لیے کہ اس کے دیئے ہوئے رزق کے اور اجازت کے بغیر کھانا حلال نہیں اور اس کے ذکر کے بغیر اور کسی کا ذکر صحیح نہیں اور اس کے جلال و جمال کے دیکھنے کے سوا اس کی موجودات پر نظر ڈالنا جائز نہیں اور جب تو اسی ذات حق سے کھانا حاصل کرے اور اسی کی اجازت سے کھائے تو خواہش نفس نہ ہوگی، جب تو اسی کی طرف سے کہے اور اسی کے حکم سے کہے تو وہ بھی خواہش نہ ہوگی اور جب تو اسی کے فعل یعنی مخلوقات کو دیکھے اور اس کے حکم سے دیکھے تو وہ خواہش نفس نہ ہوگی، لیکن جب تو اپنے نفس کی خواہش سے کھانا کھائے اگرچہ حلال ہی ہو، وہ خواہش نفس ہوگی اور جب تو خواہش نفس سے کچھ کہے گا اگرچہ ذکرحق ہو، وہ جھوٹ اور خواہش نفس ہوگی اور جب تو اپنی خواہش سے دیکھے گا، اگرچہ اس سے حق پر استدلال ہی کرے تو وہ بال اور خواہش نفس ہی ہوگی، واللہ اعلم۔

بیسویں فصل

امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمتہ اللہ علیہم میں سے ایک، امام مطلبی نبی ﷺ کے چچا شافع بن السائب کے بیٹے، ابوعبداللہ محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع بن السائب بن عبید بن یزید بن ہاشم بن عبدالمطلب بن عبد مناف القرشی الشافعی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ اپنے زمانے کے بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔ تمام علوم میں اپنے وقت کے امام اور جوانمردی و پرہیزگاری میں معروف تھے۔ آپ اوصافِ حمیدہ اور نہایت بلند پایہ کلام کے مالک ہیں۔ جب تک آپ مدینہ میں رہے، امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے استفادہ کرتے رہے۔ عراق تشریف لائے تو امام محمد بن الحسین الشیبانی رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت اختیار کی۔ آپ کی طبیعت ہمیشہ گوشہ نشینی کی طرف مائل رہی اور ہمیشہ طریق تصوف کی تحقیق و جستجو کرتے رہے، یہاں تک کہ ایک جماعت آپ کے گرد جمع ہوگئی اور آپ کی اقتدا کرنے لگی۔ امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ ان ہی لوگوں میں سے ایک تھے۔ اس کے بعد جاہ طلبی اور امامت کی کوشش میں مشغول ہوگئے، لیکن کچھ مدت کے بعد اس سے بھی باز رہے۔ غرض یہ ہے کہ تمام احوال میں آپ نہایت پسندیدہ عادتوں کے مالک تھے۔ ابتدا میں اہل تصوف کی طرف سے آپ کے دل میں کچھ سختی تھی، لیکن جب آپ نے حضرت سلیمان راعی رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور ان کا تقرب حاصل کیا تو اس کے بعد جہاں کہیں بھی آپ جاتے، حقیقتِ امر کے طالب رہتے۔

روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: اِذَا رَأَیْتَ الْعَالِمَ یَشْتَغِلُ بِالرُّخَصِ فَلَیْسَ یُجِیْئُ مِنْهُ شَیْئٌ (ترجمہ: جب تو کسی عالم کو دیکھے کہ وہ دینی امور میں آسانیاں پیدا کرنے میں مشغول ہے تو جان لے کہ اس سے کچھ بھی نہیں

[1] جذبۂ شوق، قلب کی ایک خاص کیفیت کا نام

ہوسکے گا) مطلب یہ ہے کہ علماء ہر قسم کے لوگوں کے پیشوا ہوتے ہیں اور یہ جائز نہیں کہ دین کے کسی امر میں کوئی ان سے آگے بڑھ کر قدم رکھ سکے۔ لہٰذا حق کا راستہ وہ اس وقت تک نہیں پا سکتا جب تک وہ اپنے جملہ اقوال و افعال میں کامل احتیاط اختیار نہ کرے اور علم میں جواز اور رُخصت طلب کرنا اس شخص کا کام ہے جو دین میں مجاہدے سے بھاگتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اپنے لیے تخفیف و آسانی پیدا کرے۔ پس علم دین میں آسانی طلب کرنا عوام کا درجہ ہے تاکہ شریعت کے دائرے سے باہر نہ ہو جائیں اور دین کے تقاضوں کو سختی سے پورا کرنا خاص لوگوں کا درجہ ہے تاکہ اس مجاہدے کا ثمرہ اپنے دل میں حاصل کریں۔ علما خواص ہیں اور جب خاص لوگ عام لوگوں کے درجے پر راضی ہو جائیں تو ان سے کسی چیز کی اُمید نہیں رکھنی چاہیے۔ دیگر یہ کہ رُخصت طلب کرنا فرمانِ الٰہی کو خفیف سمجھنا ہے، حالانکہ علماء اللہ کے دوست ہوتے ہیں اور دوست اپنے دوست کو کبھی حقیر نہیں سمجھتے اور اس کے فرمان کو ادنےٰ نہیں سمجھتے بلکہ اُسے بجا لانے میں پوری احتیاط کرتے ہیں۔ ایک شیخ روایت کرتے ہیں کہ میں نے ایک رات پیغمبر ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ میں نے عرض کیا: "یارسول اللہ ﷺ! میرے پاس آپ سے یہ روایت پہنچی ہے کہ زمین پر خدائے تعالےٰ کے اوتار اور اولیاء ہیں۔" حضور ﷺ نے فرمایا: "راوی نے تجھے صحیح خبر دی ہے۔" میں نے عرض کیا: "یارسول اللہ ﷺ! میں ان میں سے ایک ولی اللہ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔" آپ نے فرمایا کہ "محمد بن ادریس الشافعی ان میں سے ایک ہیں۔" اس کے علاوہ آپ کے اور بھی بہت سے اوصافِ حمیدہ ہیں۔

اکیسویں فصل
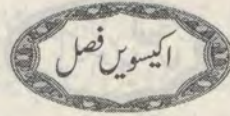
حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، سنت رسولؐ کو زندہ کرنے والے، اہل بدعت کو مٹانے والے حضرت ابو محمد احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ پرہیز گاری اور تقوےٰ کے ساتھ مخصوص اور پیغمبر ﷺ کی حدیث کے حافظ تھے۔ صوفیا اور علما دونوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے اور ہر طبقے کے لوگ آپ کو اپنے لیے بابرکت سمجھتے تھے۔ آپ بڑے بڑے مشائخ، مثلاً حضرت ذوالنون مصری و بشر حافی و سری سقطی اور معروف کرخی وغیرہ رحمہم اللہ تعالےٰ کی صحبت میں رہے۔ آپ کی کرامتیں نہایت ظاہر اور فراست بے حد صحیح تھی اور آج کل بعض مشبہین[1] جو کچھ آپ سے منسوب کرتے ہیں، وہ آپ پر افترا اور بہتان باندھتے ہیں۔ آپ ان سب باتوں سے بالکل بری ہیں۔ اصولِ دین میں آپ کا صحیح اعتقاد اور آپ کا مذہب تمام علما کو پسند ہے۔

بغداد میں جب معتزلہ نے غلبہ کیا تو انہوں نے باہمی مشورے سے یہ طے کیا کہ آپ کو قرآن کے مخلوق کہنے پر مجبور کرنا چاہیے۔ آپ بوڑھے اور کمزور تھے۔ آپ کے ہاتھ شکنجہ پر کس کر آپ کو ہزار تازیانے لگائے گئے تاکہ قرآن کو مخلوق کہیں، مگر آپ نے نہ کہا۔ کہتے ہیں کہ اس اثنا میں آپ کا ازار بند کھل گیا اور آپ کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک غیبی ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے آپ کا ازار بند باندھا۔ جب لوگوں نے یہ کرامت دیکھ لی تو آپ کو چھوڑ دیا، لیکن زخموں کی تاب نہ لا کر کچھ دنوں کے بعد آپ نے وفات پائی۔ آخری وقت میں کچھ لوگوں نے آپ کے پاس آکر کہا کہ "آپ ان لوگوں کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جنہوں نے آپ کو تازیانے لگائے؟"

[1] وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے لیے جسم ثابت کرتے ہیں۔

آپ نے فرمایا: "میں کیا کہوں؟ لوگوں نے تو اپنے زعم میں مجھے اللہ تعالے کی خوشنودی کے لیے مارا کہ میں گویا باطل پر ہوں اور وہ حق پر ہیں۔ میں محض اس زخم کی وجہ سے قیامت میں ان کے ساتھ جھگڑا نہیں کروں گا۔" مسائل دین میں آپ کا کلام بہت بلند ہے۔ جو شخص آپ سے کوئی مسئلہ پوچھتا، اگر وہ اعمال کے متعلق ہوتا تو جواب دے دیتے اور اگر حقائق طریقت کے متعلق ہوتا تو بشر حافی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس جا کر پوچھنے کی تاکید کرتے۔ چنانچہ ایک روز ایک شخص نے آکر پوچھا: مَا الْاِخْلَاصُ۔ (ترجمہ: اخلاص کیا ہے؟) قَالَ الْاِخْلَاصُ هُوَ الخلَاصُ مِنْ اٰفَاتَ الْاَعْمَالِ۔ (ترجمہ: آپ نے فرمایا: اخلاص اعمال کی خرابیوں سے نجات پانا ہے) یعنی تیرا عمل ریا و نقصان سے خالی ہو۔ اس نے پوچھا مَا التَّوَكُّلُ۔ (ترجمہ: توکل کیا چیز ہے؟) آپ نے جواب دیا اَلثِّقَةُ بِاللّٰهِ۔ (ترجمہ: اللہ پر بھروسہ کرنا) اس نے پوچھا مَا الرِّضَاءُ۔ (ترجمہ: رضا کیا ہے؟) آپ نے فرمایا: تَسْلِيْمُ الْاُمُوْرِ اِلَى اللّٰهِ۔ (ترجمہ: اپنے تمام اُمور خدا کے سپرد کر دینا) اس نے پوچھا مَا الْمَحَبَّةُ۔ (ترجمہ: محبت کیا ہے؟) تو آپ نے فرمایا: یہ بات بشر حافی رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھو، کیونکہ جب تک وہ زندہ ہیں، میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ امام احمد حنبل رحمتہ اللہ علیہ تمام احوال میں امتحان میں ڈالے گئے۔ زندگی میں معتزلہ نے اذیتیں دیں اور وفات کے بعد بعض لوگوں نے آپ پر قسم قسم کی تہمتیں لگائیں، حالانکہ آپ ان تمام تہمتوں سے پاک ہیں۔ یہاں تک کہ اہل سنت و جماعت نے آپ کے حال سے آنکھیں بند کر کے آپ کی طرف کچھ خلاف شرع باتیں منسوب کیں، واللہ اعلم۔

بائیسویں فصل
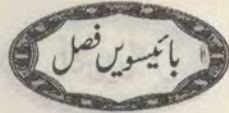
حضرت احمد بن الحواری رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ میں سے ایک، وقت کے چراغ، غضب الٰہی کی آفتوں سے آگاہ حضرت ابوالحسن احمد بن الحواری رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ شام کے اجل مشائخ میں شمار ہوتے ہیں اور سب کے ممدوح ہیں یہاں تک کہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا: اَحْمَدُ بْنُ الْحَوَارِيِّ رَيْحَانَةُ الشَّامِ۔ (ترجمہ: احمد بن الحواری رحمتہ اللہ علیہ شام کے ناز بو پھول ہیں)۔ علم طریقت کے فنون میں آپ کا کلام بہت بلند اور اشارات بہت لطیف ہیں۔ پیغمبر ﷺ سے آپ کی روایت کردہ احادیث سب کی سب صحیح ہیں اور طریقت میں آپ کا اتنا بلند درجہ تھا کہ وقت کے صوفیا اپنے واقعات میں آپ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ آپ حضرت ابو سلیمان دارانی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے اور حضرت ابو سفیان بن عینیہ و مردان بن معاویہ الفرازی رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت کے تربیت یافتہ اور سیاح ہونے کی وجہ سے ہر ایک بزرگ سے اکتسابِ فیض کیا تھا۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے کہا ہے: اَلدُّنْيَا مَزْبَلَةٌ وَ مَجْمَعُ الْكِلَابِ وَ اَقَلُّ مِنَ الْكِلَابِ مَنْ عَكَفَ عَلَيْهَا فَاِنَّ الْكَلْبَ يَاْخُذُ مِنْهَا حَاجَتَهٗ وَ يَنْصَرِفُ وَ الْمُحِبُّ لَهَا لَا يَزُوْلُ عَنْهَا وَ لَا يَتْرُكُهَا بِحَالٍ۔ (ترجمہ: دنیا کوڑے کرکٹ کا مقام ہے اور کتوں کے جمع ہونے کی جگہ ہے اور جو شخص ہمیشہ اسی پر گھر رہا، وہ کتوں سے بھی کم درجہ ہے کیونکہ کتا تو اس سے اپنی حاجت پوری کر کے واپس چلا جاتا ہے، لیکن دنیا سے محبت کرنے والا اس سے الگ نہیں ہوتا اور نہ کسی حال میں اس کو چھوڑتا ہے) یعنی آپ کے نزدیک دنیا اس حد تک حقیر تھی کہ آپ نے دنیا کو کوڑے سے تشبیہ دی اور اہل دنیا کو کتوں سے بھی کم درجہ شمار کیا ہے اور وجہ یہ بتائی کہ چونکہ کتا کوڑے سے اپنی حاجت پوری کر کے علیحدہ ہو جاتا ہے، لیکن اہل دنیا ہمیشہ اس کے

جمع کرنے کے خیال سے اس پر بیٹھے رہتے ہیں۔ اس لیے کتا اہل دنیا سے حرص میں کم تر اور وہ کتے سے درجہ میں کم تر ہوتے ہیں اور یہ بات آپ کے اہل دنیا سے قطع تعلق اور اعراض کی بڑی علامت ہے۔

دراصل اہل طریقت کے لیے دنیا و مافیہا سے قطع تعلق کر لینا ایک نہایت شاندار محل اور تر و تازہ باغ کی مانند ہے۔ ابتدائے عمر میں آپ علم کی تلاش میں لگ گئے اور اس کے حصول میں اتنی جدوجہد کی کہ اماموں کے درجے تک پہنچ گئے، لیکن آخر کار آپ نے اپنی کتابیں لے جا کر دریا برد کر دیں اور یوں فرمانے لگے: نِعْمَ الدَّلِیْلُ اَنْتَ وَاَمَّا الْاِشْتِغَالُ بِالدَّلِیْلِ بَعْدَ الْوُصُوْلِ مُحَالٌ۔ (ترجمہ: تم مقصود حاصل کرنے کی بڑی اچھی علمی دلیل و حجت ہو لیکن منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد دلیل کے ساتھ مشغول ہونا محال ہے) کیونکہ رہنما کی ضرورت اسی وقت تک ہوتی ہے کہ مرید راستے میں ہو۔ جب منزل مقصود کی پیشگاہ اور درگاہ نمودار ہو گئی تو پھر رہنما کی کیا قیمت ہوتی ہے اور مشائخ نے کہا کہ آپ کا یہ کلام حالت سکر میں صادر ہوا ہے اور جس نے یہ کہا ہے کہ وَصَلْتُ۔ (ترجمہ: میں واصل بحق ہو گیا) فَقَدْ ضَلَّ۔ (ترجمہ: پس وہ حق سے جدا ہو گیا ہے) کیونکہ منزل پر پہنچنا کام سے رُک جانا ہے۔ پس شغل، شغل ہوتا ہے اور فراغت، فراغت اور حق تک پہنچنے کا راستہ مشغولیت و فراغت دونوں ہی میں نہیں ہے، کیونکہ یہ شغل اور فراغت دونوں بندے کی صفات میں وصل حق تعالےٰ اور اس کی توجہ بندے کی بہبودی کے لیے اللہ تعالےٰ کا ازلی ارادہ ہے اور یہ بات بندے کی مشغولیت یا فراغت سے حاصل نہیں ہوتی۔ پس حق تعالےٰ تک پہنچنے کا کوئی اصول نہیں۔ پس حق تعالےٰ سے ملازمت یعنی اتصالِ قربت اور مجاورت یعنی نزدیکی کی نسبت جائز نہیں۔ اس کا وصل تو بندے کو فقط بزرگی عطا کرتا ہے اور اس کا ہجر بندے کو ذلیل کرتا ہے کیونکہ اس کی صفاتِ حقیقیہ میں تغیر روا نہیں۔

میں علی بن عثمان جلابی کہتا ہوں کہ اس کا احتمال ہے کہ اس بزرگ رہنما احمد بن الحواری رحمۃ اللہ علیہ کی لفظ وصول سے مراد راہِ حق تک پہنچنا ہو گا، نہ کہ ذاتِ حق تک پہنچنا۔ اس لیے کہ کتابوں میں وصول سے مراد راہِ حق ہی ہے کیونکہ جب راستہ ظاہر ہو جاتا ہے تو رہنما کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ جتنا کہ مقصود کے غائب ہونے کی صورت میں ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ جب راہِ حق مل گئی تو اس کا دکھانا لا حاصل ہو گیا اور جب معرفت حق کے صحیح طور پر بیان کرنے میں زبانیں عاجز ہیں تو کتابیں بدرجہ اولیٰ اس کام میں بے کار ہوں گی اور آپ کے سوا دوسرے مشائخ نے بھی ایسا ہی کیا ہے، مثلاً شیخ المشائخ ابو سعید فضل اللہ المیہنی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے بھی اپنی کتابیں پانی میں ڈال دی تھیں اور رسمی صوفیا کے ایک گروہ نے اپنی ناکامی، سستی اور جہالت کے باعث ان اسرار کی تقلید کی کیونکہ اس کام سے ان بزرگوں کی مراد ماسوا اللہ سے دل کو فارغ کرنے اور دنیا سے قطع تعلق کرنے اور اس سے توجہ ہٹانے کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ تاہم یہ بات سوائے حالتِ سکر اور غلبۂ جذب کے درست نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ جو شخص مقام مشاہدہ میں قیام پذیر ہو، اس کے مشاہدے میں دونوں جہاں کی کوئی چیز بھی حائل نہیں ہو سکتی۔ جب دل تعلقاتِ دُنیا سے منقطع ہو گیا تو کاغذ کے چند ٹکڑوں کی کیا وقعت رہ گئی؟ لیکن جس نے یہ کہا ہے کہ کتاب کو دھونے سے مراد معنوی مقصود پانے کے بعد الفاظ و عبارت کی نفی ہے تو جیسا کہ ہم نے کہا ہے اس صورت میں بہتر یہ ہے کہ عبارت خود زبان سے بھی دُور ہو جائے۔ اس لیے کہ کتاب میں عبارت لکھی ہوتی ہے اور زبان پر عبارت جاری ہوتی ہے اور ظاہر ہے ان میں سے کوئی عبارت بھی دوسری سے بہتر نہیں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احمد بن الحواری رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے حال کے غلبے میں کوئی شخص ان کے کلام کو سننے والا نہیں ملا۔ اس لیے انہوں نے اپنے حال کی شرح کاغذوں پر

لکھ دی ہے اور جب کاغذات بہت سے جمع ہو گئے اور کوئی قابل آدمی نہ ہوا کہ ان کو عام طور پر شائع کر دیتا تو انہوں نے سب کاغذات کو پانی میں ڈال دیا اور یوں فرمایا کہ گویا بہت اچھی دلیل ہے، لیکن چونکہ میری مراد تجھ سے حاصل ہو گئی، اس لیے اب تجھ سے مشغول ہونا بے فائدہ ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ آپ کے پاس کتابیں بہت سی جمع ہو گئی ہوں اور آپ کو اوراد اور معاملاتِ طریقت سے روکتی اور مشغول رکھتی ہوں، اس لیے آپ نے اس شغل کو اپنے سامنے سے اُٹھا دیا یعنی معنی مقصود کے لیے دل کی فراغت کی طلب میں عبارات کو ترک کر دیا۔ واللہ اعلم۔
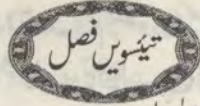
تیئسویں فصل

حضرت ابو حامد احمد بن خضرویہ البلخی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، جوانمردی کے سرلشکر اور خراسان کے آفتاب حضرت ابو حامد احمد بن خضرویہ البلخی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ اپنے وقت کے بلند حال بزرگ، صوفیا کے پیشوا اور خواص و عوام میں پسندیدہ تھے اور ملامت کے طریق پر چلتے اور سپاہیانہ لباس پہنتے تھے۔ آپ کی بیوی فاطمہ، اللہ ان پر رحم فرمائے، حاکم بلخ کی لڑکی تھیں اور طریقت میں بڑی شان رکھتی تھیں۔ جب انہوں نے سچے دل سے توبہ کرنے کا ارادہ کر لیا تو حضرت احمد بن خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ کے پاس یہ کہلا بھیجا کہ مجھ سے نکاح کرنے کے لیے میرے والد سے درخواست کیجئے۔ آپ نے قبول نہ کیا تو دوبارہ آدمی بھیج کر ان سے کہلوایا کہ "اے احمد! میں تو آپ کو اس سے زیادہ بہادر سمجھتی تھی کہ آپ حق کے راستے میں رہبر ہوں گے نہ کہ رہزن۔" چنانچہ آپ نے ان کے باپ کے پاس آدمی بھیج کر ان سے فاطمہ سے نکاح کرنے کی درخواست کی۔ ان کے باپ نے تبرک کے طور پر ان کا نکاح حضرت احمد بن خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ سے کر دیا۔ اسی طرح حضرت فاطمہ رحمتہ اللہ علیہ نے دنیا کا کام دھندا چھوڑ دیا اور حضرت احمد بن خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ گوشہ نشین ہو کر دائمی آرام پایا۔

ایک دفعہ ان کا ارادہ حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کا ہوا تو حضرت فاطمہ بھی ان کے ساتھ چلیں، جب حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ سامنے آئے تو حضرت فاطمہ نے اپنے منہ پر سے نقاب اُٹھا لیا اور آپ سے شوخی سے باتیں کرنے لگیں۔ حضرت احمد رحمتہ اللہ علیہ کو اس بات سے سخت تعجب ہوا اور دل میں سخت غیرت پیدا ہوئی اور کہنے لگے: "اے فاطمہ! بتاؤ حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے تم نے یہ گستاخی کیوں کی؟" حضرت فاطمہ نے جواب دیا کہ "آپ تو صرف میری طبیعت کے محرم ہیں اور حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ میری طریقت کے محرم ہیں، چنانچہ میں آپ کے ذریعہ خواہش نفس کی تسکین کرتی ہوں اور ان کے ذریعہ طمانیت روح اور تعلق باللہ حاصل کرتی ہوں۔" دلیل اس پر یہ ہے کہ بایزید میری صحبت سے بے نیاز ہیں اور آپ میری صحبت کے محتاج ہیں۔ چنانچہ آپ ہمیشہ حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ اسی طرح شوخی سے گفتگو کیا کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ ایک روز حضرت بایزید کی نظر فاطمہ رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھ پر پڑ گئی جس پر مہندی لگی تھی۔ آپ نے فرمایا: "اے فاطمہ! تم نے ہاتھ پر مہندی کس لیے لگائی ہے؟" فاطمہ نے کہا: "اے بایزید! اب تک کہ آپ نے میرے ہاتھ اور حنا کو نہیں دیکھا تھا، مجھے آپ سے گستاخانہ گفتگو کرنے میں بڑی خوشی حاصل ہوتی رہی، اب چونکہ آپ کی نظر میری آرائش پر پڑی تو آپ کی صحبت حرام ہو گئی۔" بعد ازاں وہ دونوں وہاں سے لوٹ کر نیشاپور میں رہنے لگے۔ وہاں کے مشائخ حضرت احمد رحمتہ اللہ علیہ سے بہت

خوش رہتے تھے جب حضرت یحییٰ بن معاذ اترازی رحمتہ اللہ علیہ نیشاپور میں آئے اور پھر وہاں سے بلخ جانے کا ارادہ فرمایا تو حضرت احمد رحمتہ اللہ علیہ نے ان کی دعوت کرنی چاہی۔ حضرت فاطمہؓ سے مشورہ کیا کہ حضرت یحییٰ رحمتہ اللہ علیہ کی دعوت کے لیے کیا چاہیے؟ انہوں نے کہا کہ اتنی گائیں اور بھیڑیں اور اتنی دیگر ضروری اشیا اور اتنی موم بتیاں اور عطر درکار ہیں اور ان کے علاوہ بیس گدھے ذبح کرنے چاہئیں۔ یہ سن کر حضرت احمد رحمتہ اللہ علیہ نے پوچھا کہ "گدھوں کے ذبح کرنے کا کیا مطلب؟" انہوں نے کہا کہ "جب کوئی شریف کسی شریف کے گھر مہمان آئے تو محلے کے کتوں کے لیے بھی اس میں کچھ حصہ ہونا چاہیے" اور ابویزید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا: مَنْ اَرَادَ اَنْ یَنْظُرَ اِلٰی رَجُلٍ مِنَ الرِّجَالِ مَخْبُوْءٍ تَحْتَ لِبَاسِ النِّسْوَانِ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی فَاطِمَةَ رَحْمَتُه اللّٰهِ عَلَیْهَا۔ (ترجمہ: جو شخص کسی مرد کو عورتوں کے لباس میں چھپا ہوا دیکھنا چاہے، اسے فاطمہ رحمتہ اللہ علیہا کی طرف نگاہ ڈالنا چاہیے) اور ابوحفص حداد رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لَوْلَا اَحْمَدُ بْنُ خِضْرُوْیَهَ مَاظَهَرَتِ الْفُتُوَّةُ۔ (ترجمہ: اگر احمد بن خضرویہ نہ ہوتے تو جوانمردی کبھی ظاہر نہ ہوتی)۔ غرض یہ کہ آپ کے جملہ ملفوظات بہت ہی پاکیزہ اور بلند مرتبہ ہیں۔ معاملاتِ طریقت کے ہر موضوع پر آپ کی کئی مشہور تصانیف ہیں اور آپ کے آداب اور نکتے حقائق کے بیان کرنے میں واضح ہیں۔ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: اَلطَّرِیْقُ وَاضِحٌ وَالْحَقُّ لَائِحٌ وَالرَّاعِیْ فَمَا اَسْمَعُ فَمَا التَّحَیُّرُ بَعْدَهَا اِلَّا مِنَ الْعَمٰی۔ (ترجمہ: راستہ واضح ہے اور حق روشن اور نگہبان بہت ہی اچھا سننے والا۔ پس اس کے بعد حیرانی صرف دل کے اندھے پن کی وجہ سے ہو سکتی ہے) یعنی راستہ ڈھونڈنا بالکل خطا ہے کیونکہ حق آفتاب کی طرح روشن ہے تو اپنی تلاش کر کہ کہاں ہے؟ جب تو اپنے آپ کو پالے گا تو راستے پر آجائے گا اس لیے کہ حق اس سے زیادہ روشن ہے کہ طالب اس کی طلب کرے۔ نیز آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: اُسْتُرْ عِزَّ فَقْرِكَ۔ (ترجمہ: اپنی درویشی کی عزت کو لوگوں سے پوشیدہ رکھ) یعنی لوگوں سے بیان نہ کر کہ میں درویش ہوں تاکہ تیرا بھید ظاہر نہ ہو جائے، کیونکہ یہ خدا تعالےٰ کی طرف سے بڑی بھاری کرامت ہے۔ نیز آپ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک درویش نے ماہِ رمضان میں ایک غنی کی دعوت کی اور اس کے گھر میں سوائے خشک روٹی کے اور کچھ نہ تھا۔ چنانچہ اس کے سامنے وہی پیش کی۔ جب دولت مند واپس ہوا تو ایک تھیلی روپوں کی بھیج دی۔ اس درویش نے وہ تھیلی اس کے پاس یہ کہہ کر واپس کر دی کہ یہ اس شخص کے لائق ہے، جو اپنے آپ کو تجھ جیسے شخص پر ظاہر کرے یا وہ دولتمندوں کو فقیری کی عزت کے لائق سمجھے کہ یہ بات اس کے فقیر کے صحیح ہونے کی علامت تھی، واللہ اعلم۔

چوبیسویں فصل
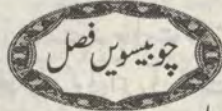
حضرت عسکری بن الحسین النسفی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، اللہ تعالےٰ پر بھروسا کرنے والوں کے پیشوا اور اہل زمانہ کے برگزیدہ حضرت ابوتراب عسکری بن الحسین النسفی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ خراسان کے بڑے مشائخ اور ان کے سرداروں میں سے تھے۔ جوانمردی، زہد و ورع میں بے مثل تھے۔ آپ کی بہت سی کرامتیں اور عجیب باتیں لوگوں میں مشہور ہیں، جو آپ سے جنگلوں میں جگہ جگہ دیکھنے میں آئی ہیں۔ آپ بڑے بڑے صوفی سیاحوں میں سے تھے اور جنگلوں میں بالکل تنہا زندگی بسر کرتے تھے۔ آپ کی وفات بھی جنگل میں ہوئی تھی۔ کئی سال کے بعد جب وہاں سے لوگوں کا

گزر ہوا تو دیکھا کہ آپ قبلہ رُو کھڑے ہیں اور فوت ہو کر وہیں خشک ہو گئے ہیں۔ مشکیزہ آگے رکھا ہے اور لاٹھی ہاتھ میں ہے۔ کوئی درندہ آپ کے پاس پھٹکا اور نہ آپ نیچے گرے۔ نیز روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: اَلْفَقِیْرُ قُوْتُہٗ مَا وَجَدَ وَ لِبَاسُہٗ مَا سَتَرَ وَ مَسْکَنُہٗ حَیْثُ نَزَلَ۔ (ترجمہ: فقیر کی خوراک وہ ہے، جو اس کو مل جائے اور اس کا لباس وہ ہے، جو اس کے بدن کو ڈھانپ لے اور اس کی قیام گاہ وہی ہے، جہاں وہ اُترے)۔ اس لیے کہ تینوں چیزوں میں تصرف کرنا غفلت ہے اور سب اہلِ عالم انہی تینوں چیزوں کی بلا میں مبتلا ہیں کیونکہ وہ ان تینوں چیزوں میں تکلف کرتے ہیں اور یہ بات تو مادی اور دنیوی معاملات کے لحاظ سے ہے۔ تحقیق کے لحاظ سے درویش کی غذا حالت وجد ہے اس کا لباس تقویٰ سے اور مسکن غیب ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا۔ (ترجمہ: اور یہ کہ اگر وہ لوگ طریق حق پر ثابت قدم ہو جاتے تو ہم انہیں کثیر پانی سے سیراب کرتے)۔ نیز ارشاد فرمایا: وَرِيْشًاؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌؕ (ترجمہ: اور ہم نے انہیں لباس عطا فرمایا اور تقوےٰ کا لباس بہت بہتر ہے)۔ نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اَلْفَقْرُ وَطَنُ الْغَیْبِ۔ (ترجمہ: فقر غیب کا وطن ہے)۔ پس جب اس کا کھانا پینا قربت ہو، اس کا لباس تقوےٰ اور مجاہدہ ہو، وطن غیب اور انتظار وصل ہو تو پھر فقر کا طریقہ بالکل واضح اور اس کے معاملات ظاہر ہیں اور یہ دراصل کمال کا درجہ ہے۔

پچیسویں فصل
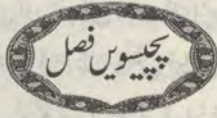
حضرت یحییٰ بن معاذ الرازی رحمۃ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے ایک، محبت و وفا کی زبان اور طریقت و ولایت کی زینت، حضرت ابوزکریا یحییٰ بن معاذ الرازی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ بہت بلند حال اور نیک سیرت بزرگ تھے۔ حق تعالیٰ سے اُمید رکھنے میں بہت ثابت قدم تھے یہاں تک کہ خضری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دو یحییٰ تھے۔ ایک انبیا میں گزرے ہیں اور دوسرے اولیا میں۔ حضرت یحییٰ بن زکریا علیٰ نبینا و علیہما السلام نے تو خوفِ الٰہی کا راستہ ایسے طور پر طے فرمایا کہ خوفِ الٰہی کے سب مدعی ان کے مقابلے میں اپنی فلاح سے نا اُمید ہو گئے اور حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ نے اُمید کا راستہ ایسے طور پر طے کیا ہے کہ اپنے مقابلے میں اللہ تعالیٰ سے اُمید کے تمام مدعیوں کے ہاتھ باندھ دیئے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت یحییٰ بن زکریا کا حال تو معلوم ہے، حضرت یحییٰ بن معاذ کا حال کیسا ہوا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ آپ سے نہ جاہلیت کا کام ہوا اور نہ کبیرہ گناہ کبھی صادر ہوا۔ آپ عمل اور مجاہدے میں اس قدر کوشش جائز رکھتے تھے کہ ہر کوئی اس کی طاقت نہ رکھتا تھا۔

آپ کے اصحاب میں سے ایک نے کہا: "اے شیخ! آپ کا مقام تو مقام رجاء ہے لیکن آپ کا عمل اللہ سے ڈرنے والوں کا سا ہے۔" آپ نے فرمایا: "اے بیٹا! جان لے کہ بندگی کا ترک کرنا گمراہی ہے اور خوف و رجاء ایمان کے دو ستون ہیں اور محال ہے کہ کوئی شخص ایمان کے ارکان میں سے کسی رُکن پر عمل کرنے کی وجہ سے گمراہی میں پڑے۔ اللہ سے ڈرنے والا شخص تو اللہ سے علیحدگی کے خوف سے عبادت کرتا ہے اور اللہ سے اُمید رکھنے والا اس کے وصل کی اُمید سے۔ جب تک عبادت موجود نہ ہو، تب تک نہ خوفِ الٰہی دُرست ہے نہ رجا بحق، اور جب عبادت حاصل ہو تو یہ خوف و رجاء سب صحیح ہو جاتا ہے اور جہاں عبادت کی ضرورت ہے وہاں صرف بیان کچھ سودمند نہیں۔

آپ کی تصانیف، نکتے اور اشارے بہت عجیب ہیں اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے بعد پہلا شخص جو مشائخ طریقت میں سے منبر[1] پر چڑھا، وہ آپ ہی تھے اور مجھے آپ کا کلام بہت ہی پسند ہے کیونکہ اس کے سننے سے طبیعت کو تازگی اور کانوں کو سرور حاصل ہوتا ہے اور اس کا مفہوم بہت لطیف اور عبارت بہت شستہ ہے۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: اَلدُّنْیَا دَارُالْاَشْغَالِ وَ الْاٰخِرَۃُ دَارُالْاَھْوَالِ وَلَایَزَالُ الْعَبْدُبَیْنَ الْاَشْغَالِ وَالْاَھْوَالِ حَتّٰی یَسْتَقِرَّبِہِ الْقَرَارُ اِمَّا اِلَی الْجَنَّۃِ وَ اِمَّا اِلَی النَّارِ۔ (ترجمہ: دنیا اعمال کا مقام ہے اور آخرت خوف و خطرہ کا گھر ہے اور بندہ ہمیشہ شغل و خوف دونوں کے درمیان رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ کسی ایک طرف پر قرار پکڑ تا ہے، یا تو بہشت کی طرف یا دوزخ کی طرف) خوش بخت ہے وہ دل جو دنیا کے دھندوں سے چھوٹ جائے اور عقبٰی کے خطرات سے بے خوف ہو جائے اور اپنا ارادہ دونوں عالم سے منقطع کر کے حق تعالےٰ سے اپنا رشتہ جوڑ لے اور آپ کا مذہب یہ تھا کہ غنا فقر سے افضل ہے۔ کہتے ہیں کہ جب رے میں آپ پر قرضہ بہت ہو گیا تو خراسان کا قصد کیا۔ جب بلخ پہنچے تو لوگوں نے آپ کو وہاں روک لیا، چنانچہ آپ نے وہاں قیام فرمایا اور ایک عرصے تک لوگوں کو وعظ و نصیحت کی۔ جب واپس جانے لگے تو لوگوں نے ایک لاکھ درہم آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ رقم لے کر جب آپ واپس گئے تو چوروں نے آپ کو راستے میں لوٹ لیا اور وہ سب روپے آپ سے چھین لیے اور آپ بالکل خالی ہاتھ نیشاپور آ گئے۔ وہاں آپ کی وفات ہوئی اور آپ تمام احوال میں لوگوں کے درمیان معزز اور وجیہہ تھے، واللہ اعلم۔

چھبیسویں فصل
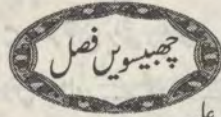
حضرت عمرو بن السالم نیشاپوری رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، مشائخ خراسان کے پیشوا اور اپنے وقت کے بے مثل بزرگ حضرت عمر ابو حفص عمرو بن السالم نیشاپوری الحدادی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ نہایت بزرگ اور بلند مرتبہ صوفیا میں شمار ہوتے تھے اور سب مشائخ کے ممدوح تھے۔ حضرت ابو عبداللہ لابیوردی رحمتہ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ اور حضرت احمد خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ کے رفیق تھے۔ شاہ شجاع ایسے شخص کرمان سے چل کر آپ کی زیارت کے لیے تشریف لائے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ بغداد میں مشائخ کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے لیکن آپ عربی بول نہ سکتے تھے۔ جب بغداد پہنچے تو آپ کے ارادت مندوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ یہ بہت بری بات ہے کہ خراسان کے شیخ الشیوخ کو ترجمان کی ضرورت ہو تاکہ وہ ان مشائخ کا کلام سمجھ سکیں۔ جب مسجد شونیزیہ میں آئے تو سب مشائخ بھی وہاں آ گئے اور حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ بھی ان کے ہمراہ تشریف لائے۔ آپ سے مشائخ نے سوال کیا: مَاالْفُتُوَّۃُ؟ (ترجمہ: جوانمردی کیا ہے؟) فرمایا کہ آپ لوگوں میں سے کوئی صاحب ابتدا کریں اور اس کے متعلق کوئی قول بیان کریں۔ چنانچہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا: اَلْفُتُوَّۃُ عِنْدِیْ تَرْکُ الرُّؤْیَۃِ وَ اِسْقَاطُ النِّسْبَۃِ۔ (ترجمہ: جوانمردی میرے نزدیک یہ ہے کہ تو جوانمردی کو نہ دیکھے اور جو کام کرے اس کو اپنی طرف نسبت نہ کرے کہ یہ کام میں کرتا ہوں)۔ حضرت ابو حفص رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا: مَا اَحْسَنَ مَا قَالَ الشَّیْخُ وَلٰکِنَّ الْفُتُوَّۃَ عِنْدِیْ اَدَاءُ الْاِنْصَافِ وَ تَرْکُ مُطَالَبَۃِ الْاِنْصَافِ۔ (ترجمہ: شیخ نے بہت اچھا فرمایا ہے، لیکن میرے نزدیک جوانمردی یہ ہے کہ اوروں سے انصاف کرے اور دوسروں سے انصاف

[1] طریقت کے مسائل و مقامات بیان کرنے کے لیے۔

کا مطالبہ نہ کرے)۔ تب حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "اے دوستو! اٹھو کہ حضرت ابو حفص جوانمردی میں آدم علیہ السلام اور آپ کی اولاد پر غلبہ پا گئے۔"

کہتے ہیں کہ آپ کی توبہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ آپ ایک کنیزک پر فریفتہ ہو گئے۔ لوگوں نے آپ سے کہا کہ نیشاپور کے شارستان[1] میں یہودی جادوگر رہتا ہے، تمہارے اس کام کا علاج اس کے پاس ہے۔ چنانچہ ابو حفص اس کے پاس گئے اور اپنا حال بیان کیا۔ یہودی نے کہا کہ "چالیس روز تک نہ نماز پڑھو نہ کوئی اچھا عمل کرو اور نہ نیک نیتی کا کوئی کام دل و زبان پر لاؤ تاکہ میرا جادو اثر کرے اور تیری مراد حاصل ہو۔" آپ نے ایسا ہی کیا۔ جب چالیس روز ہو چکے تو یہودی نے جادو کیا لیکن آپ کی مراد پوری نہ ہوئی۔ یہودی نے کہا کہ "ضرور تو نے اس عرصے میں کوئی نیک کام کیا ہے، سوچ لو۔" حضرت ابو حفصؒ نے کہا کہ "میں نہیں جانتا کہ نیک اعمال میں سے کوئی عمل میرے ظاہر و باطن سے سرزد ہوا ہو سوائے اس کام کے کہ میں ایک روز راستے میں چلا جا رہا تھا کہ ایک پتھر پڑا ہوا تھا، جسے میں نے راستے سے ہٹا دیا کہ کسی کے پاؤں کو ٹھوکر نہ لگے۔" تب یہودی نے کہا کہ "پھر تو اس خداوند کو آزردہ نہ کر جس کا چالیس روز تک تو نے فرمان ضائع کیا مگر اس نے تیرے اتنے سے رنج اٹھانے کو بھی ضائع نہیں فرمایا۔" آپ نے یہ سن کر اسی وقت توبہ کی اور وہ یہودی بھی مسلمان ہو گیا اور وہیں لوہار کا کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ نے باورہ جا کر ابو عبداللہ باوری رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کی اور آپ کے مرید ہو گئے اور کچھ عرصہ کے بعد آپ نیشاپور واپس آئے۔

کہتے ہیں کہ ایک روز ایک نابینا بازار میں قرآن پڑھ رہا تھا اور آپ اپنی دُکان پر بیٹھے کام کر رہے تھے۔ اس کی قرأت آپ پر غالب آئی کہ آپ پر وجد طاری ہوا اور بے خود ہو گئے اور ایسی حالت میں آگ کے اندر ہاتھ ڈال کر آہنگیر کے بغیر تپا ہوا لوہا بھٹی سے باہر نکال لیا۔ جب شاگرد نے آپ کو دیکھا تو بے ہوش ہو گیا۔ جب حضرت ابو حفص رحمۃ اللہ علیہ کو ہوش آیا تو آہنگری کا پیشہ چھوڑ دیا اور پھر کبھی اس کی طرف توجہ نہ دی۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: تَرَکْتُ الْعَمَلَ ثُمَّ رَجَعْتُ اِلَیْہِ ثُمَّ تَرَکَنِی الْعَمَلُ فَلَمْ اَرْجِعْ اِلَیْہِ۔ (ترجمہ: میں نے عمل چھوڑ دیا، پھر جب میں نے اس کی طرف رجوع کیا تو عمل نے خود ہی مجھے چھوڑ دیا۔ تو میں نے پھر کبھی اس کی طرف رجوع نہ کیا) اس لیے کہ جس چیز کا چھوڑنا بندے کے تکلف اور کسب سے ہو اس کا چھوڑنا اس کے کرنے سے بہتر نہیں ہوتا۔ اس بات کی صحت کی دلیل کہ تمام کسب آفات کا محل ہیں، یہ ہے کہ قدر و قیمت صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ بے تکلف غیب سے حاصل ہو اور جس محل میں ہو، بندے کا اختیار اس کے ساتھ متصل ہو اور حقیقت کا بھید اس سے زائل ہو جائے۔ پس کسی کام کے ترک کرنے اور اختیار کرنے کی نسبت بندے کی طرف درست نہیں۔ اس لیے کہ عطا و زوال خدا تعالےٰ کی طرف سے اور اس کی تقدیر سے ہے، جب عطائے الٰہی ہو گی تو اس کا اختیار کرنا بھی اسی کی طرف سے حاصل ہو گا، اور جب زوال آئے تو اس کا ترک کرنا بھی حق کی طرف سے حاصل ہو گا۔ جب بات ایسی ہے تو قدر و قیمت اس بات کی ہو گی جس کے ساتھ اخذ و ترک کا قیام ہے نہ اس بات کی کہ بندہ اپنے اجتہاد سے اس بات کے کرنے اور نہ کرنے والا ہو۔ پس اگر کوئی مرید بارگاہ حق میں مقبول بننے کے لیے ہزار سال تک کوشش کرے تو وہ ایسا نہیں ہو گا کہ حق تعالےٰ ایک لمحہ اس کے مقبول کرنے کے لیے نہ فرمائے۔ غرض یہ کہ دائمی اقبال ازلی قبولیت سے وابستہ ہے اور ہمیشہ کا سرور سعادتِ ازلی سے مربوط۔ بندے کو اپنی رہائی کی طرف عنایت الٰہی

[1] گردونواح، دیہات

کے سوا کوئی راستہ نہیں، لیکن باعزت وہ بندہ ہے کہ مسبب الاسباب اسے اسباب کا محتاج نہ رکھے۔
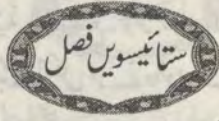
حضرت حمدون بن احمد القصار رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، اہل ملامت کے پیشوا اور ہر حالت میں راضی بقضا حضرت ابو صالح حمدون بن احمد بن عمارۃ القصار رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ قدیم پرہیز گار مشائخ میں سے ہوئے ہیں۔ فقہ اور شریعت کے دوسرے علوم میں اعلےٰ درجے پر پہنچے ہوئے تھے۔ حضرت امام ثوری رحمتہ اللہ علیہ کے طریق پر چلتے تھے اور طریقت میں ابوتراب نخشبی کے مرید تھے، پھر آپ کے حلقہ ارادت میں علی نصر آبادی رحمتہ اللہ علیہ ایسے بزرگ داخل ہوئے۔ معاملاتِ طریقت میں آپ بہت سے باریک رموز اور مجاہدات میں نہایت دقیق کلام کے حامل تھے۔ روایت ہے کہ جب علم میں آپ کی شان بہت بڑھ گئی تو نیشاپور کے امام اور بزرگ لوگوں نے "آپ سے کہا کہ آپ کو منبر پر چڑھ کر لوگوں کو نصیحت کرنی چاہیے تاکہ آپ کے کلام سے لوگوں کے دلوں کو فائدہ ہو۔" آپ نے فرمایا کہ "مجھے ابھی کلام کرنا جائز نہیں۔" لوگوں نے پوچھا: "کیوں؟" تو آپ نے فرمایا: "اس لیے کہ میرا دل ابھی تک دنیا اور اس کے مرتبے سے وابستہ ہے۔ اس سے کسی کو فائدہ نہ ہوگا اور نہ دلوں میں اثر کرے گا اور جو کلام دلوں میں موثر نہ ہو تو وہ علم کی توہین اور شریعت سے تمسخر ہے۔ کلام کرنا اس شخص کے لیے مسلم ہے جس کی خاموشی سے دین کو نقصان ہو اور جب وہ کلام کرے تو وہ نقصان اُٹھ جائے۔" آپ سے لوگوں نے پوچھا کہ "سلف صالحین کا کلام دلوں میں کیوں اتنا اثرتا ہے؟" تو آپ نے فرمایا: لِاَنَّهُمْ تَکَلَّمُوْا لِعِزِّ الْاِسْلَامِ وَ نَجَاتِ النُّفُوْسِ وَ رَضَاءِ الرَّحْمٰنِ وَ نَحْنُ نَکَلِّمُ لِعِزِّ النَّفْسِ وَ طَلَبِ الدُّنْیَا وَ قُبُوْلِ الْخَلْقِ۔ (ترجمہ: اس لیے کہ سَلَف صالحین اسلام کی عزت، جانوں کی نجات اور اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کے لیے کلام کرتے تھے اور ہم لوگ اپنے نفس کی عزت، طلب دنیا اور لوگوں میں مقبول ہونے کے لیے کلام کرتے ہیں)۔ پس جو شخص حق تعالےٰ کی مراد کے مطابق کلام کرے اور حق بیان کرے تو اس کے کلام میں زور اور رُعب ہوتا ہے اور شریروں پر اثر کرتا ہے اور جو شخص اپنی خواہش اور نفس کے مطابق کلام کرتا ہے، اس میں ذلت اور رُسوائی ہوتی ہے اور لوگوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور اس کا نہ بولنا اس کے بولنے سے بہتر ہے، اس لیے کہ مقصود عبادت والفاظ سے خود بیگانہ ہوتا ہے۔

اٹھائیسویں فصل
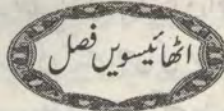
حضرت منصور بن عمار رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک شیخ، باوقار اور دلوں کے بھیدوں سے آگاہ، حضرت ابو السری منصور بن عمار رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ بزرگ ترین مشائخ میں گنے جاتے تھے اور اہل خراسان میں بے حد مقبول تھے۔ عراقی صوفیوں میں سے تھے۔ وعظ و نصیحت میں آپ کا کلام نہایت اچھا اور بیان بہت لطیف تھا۔ آپ لوگوں کو وعظ فرمایا کرتے تھے۔ نقلی و عقلی علوم کے بے بدل ماہر اور احکام و معاملات کے بے مثل عالم تھے۔ بعض صوفی لوگ آپ کے معاملے میں حد سے زیادہ مبالغہ کرتے ہیں۔ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: سُبْحَانَ مَنْ جَعَلَ قُلُوْبَ الْعَارِفِیْنَ

اَوْعِیَۃَ الذِّکْرِ وَ قُلُوْبَ الذَّاھِدِیْنَ اَوْعِیَۃَ التَّوَکُّلِ وَ قُلُوْبَ الْمُتَوَکِّلِیْنَ اَوْعِیَۃَ الرِّضَآءِ وَ قُلُوْبَ الْفُقَرَآءِ اَوْعِیَۃَ الْقَنَاعَۃِ وَ قُلُوْبَ اَھْلِ الدُّنْیَا اَوْعِیَۃَ الطَّمَعِ۔ (ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جس نے عارفوں کے دلوں کو اپنے ذکر کا محل، زاہدوں کے دلوں کو توکل کی جگہ، توکل کرنے والوں کے دلوں کو اپنی رضا کا مقام، فقیروں کے دلوں کو قناعت کی جگہ اور دنیا والوں کے دلوں کو لالچ کا محل بنادیا ہے)۔ اس میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کے بدن میں جو عضو اور قوتِ حاسہ پیدا کی ہے، اس میں ایک خاص بات اس عضو و قوت کے مناسب رکھ دی ہے چنانچہ ہاتھوں کو گرفت کا اور پاؤں کو چلنے کا، آنکھوں کو نظر کا، کانوں کو سننے کا اور زبان کو گویائی کا محل پیدا کیا ہے اور ان امور یعنی گرفت، چلنے اور نظر وغیرہ کے وجود و ظہور پذیر ہونے کے مقاصد میں کوئی زیادہ اختلاف نہیں ہوتا۔ پھر دلوں کو پیدا کیا تو ان میں سے ہر ایک دل میں اس کا خاصہ مختلف رکھا اور ہر ایک میں ارادہ مختلف اور خواہش علیحدہ رکھی، چنانچہ ایک دل کو تو معرفت الٰہی کا محل کردیا، دوسرے کو گمراہی کا مقام اور تیسرے کو قناعت کی جگہ اور اسی طرح دوسرے دلوں کو مختلف خواص کا محل کردیا اور حق یہ ہے کہ دلوں کے سوا اور کسی چیز میں حق تعالےٰ کا عجیب فعل زیادہ ظاہر نہیں۔ نیز روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: اَلنَّاسُ رَجُلَانِ عَارِفٌ بِنَفْسِہٖ فَشَغَلَہٗ فِی الْمُجَاھَدَۃِ الرِّیَاضَۃِ وَ عَارِفٌ بِرَبِّہٖ وَ شُغْلُہٗ بِخِدْمَتِہٖ وَ عِبَادَتِہٖ وَ مَرْضَاتِہٖ۔ (ترجمہ: لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک اپنے نفس کا عارف سو اس کا شغل مجاہدہ اور ریاضت ہوتا ہے، دوسرا حق تعالیٰ کا عارف سو اس کا شغل اللہ کی خدمت، اس کی عبادت اور اس کی رضاجوئی ہوتا ہے)۔ پس اپنے نفس کے عارفوں کی عبادت تو ریاضت ہوتی ہے اور عارفانِ حق کی عبادت رویت حق اور عارفِ نفس تو اس لیے عبادت کرتا ہے کہ کوئی درجہ پا جائے، لیکن عارفِ حق بلاغرض عبادت کرتا ہے کیونکہ درجہ تو اس کو ملا ہوا ہوتا ہے۔ پس دونوں مقامات میں بہت بڑا فرق ہے۔ ایک بندہ تو مجاہدے پر قائم ہوتا ہے اور دوسرا مشاہدے پر۔

نیز آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے۔ اَلنَّاسُ رَجُلَانِ مُفْتَقِرٌ اِلَی اللّٰہِ فَھُوَ فِی اَعْلَی الدَّرَجَاتِ عَلٰی لِسَانِ الشَّرِیْعَۃِ وَ الْاٰخَرُ لَا یَرَی الْاِفْتِقَارَ لِمَا عَلِمَ مِنْ فَرَاغِ اللّٰہِ مِنَ الْخَلْقِ وَ الرِّزْقِ وَالْاَجَلِ وَ الْحَیٰوۃِ وَ السَّعَادَۃِ وَ الشَّقَاوَۃِ فَھُوَ فِی افْتِقَارِہٖ اِلَیْہِ وَاسْتِغْنَائِہٖ بِہٖ عَنْ غَیْرِہٖ۔ (ترجمہ: لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک گروہ وہ ہے جو اللہ تعالےٰ کی طرف محتاج ہوتا ہے سو وہ ظاہر شریعت پر عمل کرنے کی وجہ سے نہایت اعلےٰ درجے پر فائز ہے، دوسرا گروہ اللہ تعالےٰ کی طرف اپنی احتیاج کو خیال میں نہیں لاتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالےٰ روزِ ازل سے اس کی پیدائش، رزق کی تقسیم، اس کی موت، سعادت و شقاوت کو مقرر کر کے فارغ ہو چکا ہے، اس لیے وہ اپنی زندگی کے تمام معاملات و واقعات میں تسلیم و رضا کا شیوہ اختیار کیے ہوئے ہے)۔ پس وہ پہلے گروہ کے لوگ ذاتِ حق کی طرف محتاج ہونے کی وجہ سے رویت تقدیر الٰہی سے حجاب میں ہوتے ہیں اور دوسرے گروہ کے لوگ ذاتِ حق کی طرف اپنی احتیاج کو ضروری خیال نہ کرنے کی وجہ سے تجلیاتِ حق کا مشاہدہ کرنے والے ہیں اور اسی کی وجہ سے ماسوا اللہ سے مستغنی ہوتے ہیں۔ پس ایک ان میں سے نعمت الٰہی حاصل کرتا ہے اور دوسرا خود منعم حقیقی کو پاتا ہے اور جو نعمت پاتا ہے، وہ نعمت کے دیکھنے کی وجہ سے اگرچہ غنی ہو، فقیر ہوتا ہے اور جو منعم حقیقی کا مشاہدہ کرتا ہے اگرچہ وہ فقیر ہو، غنی ہوتا ہے۔

انتیسویں فصل

حضرت احمد بن عاصم انطاکی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، اولیا کے ممدوح اور اہل رضا کے پیشوا حضرت ابو عبد اللہ احمد بن عاصم انطاکی رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ صوفیا کے بزرگوں اور ان کے سرداروں میں سے تھے۔ آپ علوم شریعت کے اصول و فروع اور معاملاتِ طریقت کے بڑے عالم تھے۔ آپ نے لمبی عمر پائی، قدیم مشائخ کی ہم نشینی اور اتباع تابعین سے ملاقات کی تھی، بشر حافی و سری سقطی رحمتہ اللہ علیہم کے ہم عصروں میں سے تھے، حضرت حارث محاسبی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے، حضرت فضیل رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کیے ہوئے اور ان کی صحبت کے فیض یافتہ تھے۔ سب لوگ آپ کی تعریف کرتے تھے اور صوفیا کرام کے مروجہ علوم میں آپ کا کلام بلند ہے اور لطیف اشارے نفع مند ہیں۔ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: اَنْفَعُ الْفَقْرِ مَا کُنْتَ بِہٖ مُتَجَمِّلًا وَ بِہٖ رَاضِیًا۔ (ترجمہ: سب سے زیادہ نفع بخش وہ فقر ہے کہ تو اس سے اپنے آپ کو آراستہ کرے اور اس پر راضی ہو) یعنی ساری مخلوق کا جمال تو اسباب کے ثابت کرنے سے ہوتا ہے اور فقر کا جمال اسباب کی نفی، مسبب کے ثابت کرنے، اس کی طرف متوجہ ہونے اور اس کے احکام پر راضی ہونے میں ہوتا ہے، اس لئے کہ فقر سبب کا فقدان ہوتا ہے اور غنا سبب کا موجود ہونا، فقر بے سبب خدا تعالےٰ کے ساتھ ہوتا ہے اور فقر با سبب اپنی ذات کے ساتھ ہوتا ہے۔ پس سبب حق سے حجاب کا محل ہے اور ترکِ اسباب کشف و مشاہدہ حق کا محل ہے اور دونوں جہاں کا جمال، مشاہدۂ حق اور اس کی رضا میں ہے اور سارے عالم کی ناراضگی حق تعالےٰ سے حجاب کی صورت میں ہے اور یہ ذکر و فقر کی تفصیل میں واضح طور پر بیان کیا جائے گا۔

تیسویں فصل

حضرت ابو محمد عبد اللہ بن خبیق رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، پرہیز گاری و تقوےٰ کے راستے پر چلنے والے اور زہد و ورع میں امت کے یحییٰ، حضرت ابو محمد عبد اللہ بن خبیق رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ دنیا سے بے تعلق اور تمام حالات میں کامل پرہیز گار صوفیا کرام میں آپ کا شمار ہوتا ہے اور آپ کی روایت کردہ سب احادیث صحیح اور عالی مرتبہ ہیں۔ فقہ، معرفت اور حقیقت میں آپ امام ثوری رحمتہ اللہ علیہ کے پیرو تھے اور آپ کے شاگرد اور اصحاب کو دیکھا اور ان کی صحبت سے فیض اٹھایا اور طریقت کے معاملات و مقالات میں آپ کا کلام نہایت لطیف ہے۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: مَنْ اَرَادَ اَنْ یَکُوْنَ حَیًّا فِیْ حَیٰوتِہٖ فَلَا یُسْکِنِ الطَّمَعَ فِیْ قَلْبِہٖ۔ (ترجمہ: جو شخص اپنی زندگی میں حقیقی طور پر زندہ رہنا چاہتا ہے، اسے اپنے دل میں طمع کو جگہ نہ دینی چاہیے) تاکہ وہ سختی و وبال سے آزاد ہو جائے، اس لیے کہ لالچی آدمی کے جذبات لالچ کی وجہ سے مردہ ہو جاتے ہیں۔ پس دل میں لالچ کی مثال ایسی ہے جیسے دل پر مہر لگی ہو اور مہر لگا ہوا دل لامحالہ مردہ ہوتا ہے۔ خوش بخت ہے وہ دل کہ ماسوائے اللہ سے مردہ اور حق تعالےٰ کے ساتھ زندہ ہو، کیونکہ اللہ تعالےٰ نے دل کے لیے ایک عزت اور ایک ذلت پیدا کی ہے۔ اپنے ذکر کو دل کی عزت اور لالچ کو اس کی ذلت بنا دیا ہے، چنانچہ آپ ہی فرماتے ہیں: خَلَقَ اللّٰہُ الْقُلُوْبَ مَسَاکِنَ الذِّکْرِ فَصَارَتْ مَسَاکِنَ الشَّھَوَاتِ

وَلَا یَمْحُوا الشَّهَوَاتِ مِنَ الْقُلُوْبِ اِلَّا خُوْفٌ مُزْعِجٌ اَوْ شَوْقٌ مُقْلِقٌ۔ (ترجمہ: اللہ تعالےٰ نے دلوں کو اپنے ذکر کا مسکن بنایا۔ پس وہ نفس کی صحبت کے باعث شہوات کا مسکن بن گئے اور شہوات کو دلوں سے یا تو بے قرار کرنے والا خوف ہی مٹا سکتا ہے یا بے آرام کرنے والا شوق)۔ پس شوق اور خوف ایمان کے دو ستون ہیں، جب دل ایمان کا محل ہو تو اس کے ساتھ قناعت اور ذکر الٰہی ہوتا ہے نہ کہ طمع اور غفلت۔ پس مومن کا دل لالچ اور شہوات کا تابع نہیں ہوتا کیونکہ طمع اور خواہش نفس وحشت کا نتیجہ ہوتے ہیں اور وحشت زدہ دل کو ایمان کی کچھ خبر نہیں ہوتی کیونکہ ایمان کو حق تعالےٰ سے انس ہوتا ہے اور غیر سے وحشت، چنانچہ بزرگوں نے کہا ہے کہ اُطَّمَاعُ مُسْتَوْحِشٌ مِنْهُ كُلُّ وَاحِدٍ۔ (ترجمہ: طمع کرنے والے سے ہر ایک وحشت اور نفرت کرتا ہے)۔
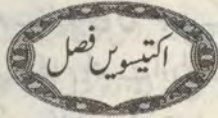
اکتیسویں فصل

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، طریقت میں شیخ المشائخ اور شریعت میں اماموں کے امام، حضرت ابوالقاسم جنید بن محمد بن جنید البغدادی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ اہل ظاہر و اربابِ قلوب میں یکساں طور پر مقبول تھے اور فنون علم کے کامل، فروع و اصول اور معاملات دین میں مفتی اور امام تھے۔ آپ امام ثوری رحمتہ اللہ علیہ کے اصحاب میں سے ہوئے ہیں۔ آپ کا کلام بہت بلند اور آپ کے احوال کامل ہیں یہاں تک کہ سب اہل طریقت آپ کی امامت پر متفق ہیں اور کسی مدعی اور متصرف کو آپ پر کوئی اعتراض نہیں۔ آپ حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کے جواہر زادہ اور مرید تھے۔ ایک روز حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کہ "کسی مرید کا درجہ اپنے پیر سے بلند ہو سکتا ہے؟" آپ نے فرمایا: "ہاں! اس کی دلیل بالکل واضح ہے۔ جنید رحمتہ اللہ علیہ کا درجہ میرے درجے سے اُونچا ہے۔" اور آپ کا قول تواضع کی وجہ سے تھا اور جو کچھ آپ نے فرمایا، وہ بصیرت سے فرمایا ہے ورنہ کوئی شخص اپنے سے اوپر نہیں دیکھ سکتا، دیکھنا نیچے سے تعلق رکھتا ہے اور آپ کا یہ قول اس امر کی واضح دلیل ہے کہ آپ نے جنید رحمتہ اللہ علیہ کو اپنے سے اوپر کے درجے میں دیکھا، جب دیکھا اگرچہ اپنے اوپر دیکھا لیکن وہ درجہ دراصل نیچے ہے اور یہ بات مشہور ہے کہ حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی میں مریدوں نے حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے کہا کہ "اے شیخ! ہمیں کوئی ایسی نصیحت فرمائیے جس سے ہمارے دلوں کو راحت ہو۔" آپ نے قبول نہ کیا اور فرمایا: "جب تک میرے شیخ (حضرت سری رحمتہ اللہ علیہ) موجود ہیں، میں کوئی نصیحت نہیں کر سکتا۔" یہاں تک کہ آپ ایک رات سو رہے تھے کہ پیغمبر ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے فرمایا: "اے جنید! لوگوں کو نصیحت کی بات کیا کرو کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کے کلام کو ایک عالم کی نجات کا سبب بنا دیا ہے۔" جب آپ بیدار ہوئے تو آپ کے دل میں خیال آیا کہ میرا درجہ شاید سری رحمتہ اللہ علیہ کے درجہ سے بڑھ گیا ہے تبھی تو حضور ﷺ نے مجھے وعظ کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ جب صبح ہوئی تو حضرت سری رحمتہ اللہ علیہ نے ایک آدمی بھیجا کہ جنید (رحمتہ اللہ علیہ) جب نماز ادا کرے تو اسے کہو کہ مریدوں کے کہنے سے تم نے انہیں کوئی نصیحت نہ کی اور مشائخ بغداد کی سفارش بھی تم نے رّد کر دی، میں نے پیغام بھیجا تب بھی تم نے وعظ و نصیحت کا سلسلہ جاری نہ کیا، اب پیغمبر ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے، ان کے حکم کی تعمیل تو ضرور کرنا چاہیے۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس ارشاد مرشد کے بعد وہ خیال میرے دماغ سے نکل گیا اور میں نے

جان لیا کہ حضرت سری رحمتہ اللہ علیہ تمام احوال میں میرے ظاہر و باطن سے آگاہ ہیں اور آپ کا درجہ میرے درجے سے بلند ہے، کیونکہ آپ میرے اسرار سے واقف ہیں اور میں آپ کے احوال سے بالکل بے خبر ہوں۔ چنانچہ میں نے آپ میں حاضر ہو کر اپنے خیال سے استغفار کیا اور پھر آپ سے پوچھا کہ آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا ہے۔ آپ نے فرمایا: "میں نے اللہ تعالےٰ کو خواب میں دیکھا کہ مجھے ارشاد فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو بھیجا ہے کہ وہ جنید (رحمتہ اللہ علیہ) سے ارشاد فرمائیں کہ وہ لوگوں کو نصیحت کریں تاکہ بغداد والوں کی مراد حاصل ہو۔"

اس حکایت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مرشد جس حالت میں ہوں، اپنے مریدوں کے حال سے آگاہ ہوتے ہیں۔ آپ کا کلام نہایت عالی اور آپ کے رموز بہت لطیف ہیں۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: كَلَامُ الْاَنْبِيَاءِ نَبَأٌ عَنِ الْحُضُوْرِ وَ كَلَامُ الصِّدِّيْقِيْنَ اِشَارَةٌ عَنِ الْمُشَاهَدَةِ۔ (ترجمہ: انبیاء کا کلام حضور رب العزت کی خبر دیتا ہے اور صدیقین کا کلام تجلیاتِ الٰہی کے مشاہدے کی طرف اشارہ کرتا ہے) اور ظاہر ہے کہ خبر کی صحت دیکھنے سے ہوتی ہے اور اشارے کی صحت سوچنے سے۔ نیز خبر اصل کے سوا نہیں دی جا سکتی اور اشارہ غیر کے سوا نہیں ہو سکتا۔ پس صدیقین کی نہایت کا کمال انبیاء کرام کے حال کی ابتدا ہوتا ہے۔ اس تحقیق سے نبی و ولی کے درمیان فرق اور انبیاء کی اولیاء پر فضیلت واضح ہوتی ہے اور وہ گروہ جو اولیا کو انبیائے کرام پر فضیلت میں مقدم سمجھتے ہیں، وہ بے دین ہیں۔ نیز آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں نے آرزو کی کہ ابلیس کو دیکھوں۔ ایک روز میں مسجد کے دروازے پر کھڑا تھا کہ ایک بڈھا آدمی دُور سے میری طرف آتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر میرے دل میں وحشت پیدا ہوئی۔ جب وہ میرے قریب پہنچا تو میں نے کہا: "اے بوڑھے! تو کون ہے کہ وحشت کی وجہ سے میری آنکھیں تجھے دیکھ نہیں سکتیں اور میرا دل خوف کی وجہ سے تیرا خیال نہیں کر سکتا۔" اس نے جواب دیا کہ "میں وہ ہوں جس کے دیکھنے کی تجھے آرزو تھی۔" میں نے کہا: "اے ملعون! آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے روک دیا تھا؟" اس نے کہا: اے جنید! تجھ ایسے خدا پرست کے دل میں یہ خیال کیونکر سمایا کہ میں اس کی ذات کے سوا کسی اور کو سجدہ کروں؟ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اس کی بات سے سخت متحیر ہوا اور کوئی جواب سمجھ میں نہ آسکا کہ ناگاہ میرے دل میں ندا آئی: قُلْ لَهُ كَذَبْتَ لَوْ كُنْتَ عَبْدًا مَامُوْرًا لَمَا خَرَجْتَ مِنْ اَمْرِهٖ اِلٰى نَهْيِهٖ فَسَمِعَ النِّدَآءَ مِنْ قَلْبِىْ فَصَاحَ وَ قَالَ اَحْرَقْتَنِىْ بِاللّٰهِ وَ غَابَ۔ (ترجمہ: اے جنید! اس سے کہو کہ تو جھوٹ کہتا ہے، اگر تو اللہ تعالےٰ کا فرمانبردار بندہ ہوتا تو اس کے حکم سے نکل کر اس کی نہی کے قریب بھی نہ پھٹکتا۔ پس اس نے میرے دل سے یہ ندا سنی اور چیخ مار کر کہنے لگا کہ "بخدا تو نے تو مجھے اللہ کی تائید سے جلا دیا" اور یہ کہہ کر غائب ہو گیا)۔

یہ حکایت شیطان سے آپ کی حفاظت اور عصمت کی دلیل ہے، اس لیے کہ خداوند تعالےٰ اپنے اولیاء کو تمام احوال میں شیطان کے تصرف اور وسوسوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ کی طرف سے ایک مرید کے دل میں رنج پیدا ہوا اور اس نے سمجھا کہ شاید وہ ایک درجہ پر پہنچ گیا ہے۔ اس لیے اس نے آپ سے رُوگردانی کر لی۔ ایک روز وہ مرید آپ کی آزمائش کرنے کے لیے آیا اور آپ اس کے احوال سے آگاہ ہونے کی وجہ سے اس کے آنے

کا مقصد فوراً سمجھ گئے، چنانچہ اس نے آپ سے کوئی سوال کیا تو آپ نے جواب دیا کہ "اس سوال کا جواب تو الفاظ میں چاہتا ہے یا معنی میں؟" اس نے کہا: "دونوں جواب چاہتا ہوں۔" تو آپ نے فرمایا: "اگر تو اس سوال کا جواب لفظوں میں چاہتا ہے تو یہ ہے کہ اگر خود تو نے تجربہ کیا ہوتا تو میرے آزمانے کی تجھے حاجت نہ ہوتی اور یہاں آزمائش کے لیے نہ آتا اور پھر اگر جواب معنوی چاہتا ہے تو یہ ہے کہ میں نے تجھے ولایت سے معزول کر دیا ہے۔" چنانچہ اسی وقت اس مرید کا منہ سیاہ ہو گیا اور چیخنے لگا کہ یقیناً راحت میرے دل سے چلی گئی ہے اور استغفار میں مشغول ہو گیا اور اس فضول خیال کو ترک کر دیا۔ تب حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے اس سے کہا: "کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء بھیدوں اور مخفی کیفیات کو بھی جانتے ہیں اور تو ان کی چوٹ کو برداشت نہ کر سکے گا۔" پھر آپ نے اس پر دم پھونکا اور وہ اچھا ہو گیا اور مشائخ کے معاملات میں تصرف کرنے سے توبہ کی۔

بتیسویں فصل

حضرت احمد بن محمد نوری رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، طریقت میں شیخ المشائخ اور شریعت میں اماموں کے امام، اہل تصوف کے بادشاہ، تکلف کی آفت سے بری، حضرت ابوالحسن احمد بن محمد الخراسانی النوری رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ کے معاملات بہت اچھے، کلمات بہت واضح اور مجاہدات کے آداب کے سخت پابند تھے۔ تصوف میں ایک خاص مسلک رکھتے تھے اور صوفیوں کا ایک گروہ جن کو نوری کہتے ہیں، وہ آپ کی پیروی کرتا ہے اور آپ سے عقیدت رکھتا ہے۔ یاد رکھو کہ صوفیوں کے تمام گروہ بارہ ہیں۔ جن میں دو گروہ مردود اور دس گروہ مقبول ہیں اور جو گروہ مقبول ہیں، وہ یہ ہیں:

اوّل	:	محاسبی	ششم	:	سہیلی
دوم	:	قصاری	ہفتم	:	حکیمی
سوم	:	طیفوری	ہشتم	:	خرازی
چہارم	:	جنیدی	نہم	:	خففی
پنجم	:	نوری	دہم	:	سیاری

یہ سب اہل تحقیق اور اہل سنت و جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن جو دو گروہ مردود ہیں، ان میں سے:

اوّل : حلولی ہیں کہ حلول و امتزاج کی طرف منسوب ہیں اور سالمی اور مشبہ ان سے تعلق رکھتے ہیں اور

دوم : حلاجی ہیں کہ انہوں نے شریعت کو ترک کر کے الحاد اختیار کر لیا اور مردود ہو گئے اور اباحی اور فارسی فرقے ان سے متعلق ہیں اور اسی کتاب میں ایک مستقل باب ان فرقوں کے متعلق لکھا جائے گا جن میں ان دس گروہوں کا باہمی اختلاف اور ان دو گروہوں کی مخالفت کا تفصیل سے ساتھ تذکرہ ہو گا تاکہ انشاء اللہ تعالےٰ تمہیں پورا فائدہ ہو، لیکن حضرت نوری رحمتہ اللہ علیہ کا طریقہ اُمورِ دین میں سستی اور چشم پوشی ترک کرنے اور ہمیشہ مجاہدہ کرنے کا طریقہ قابل تعریف ہے۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ کہتے ہیں: میں حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے پاس آیا اور میں نے دیکھا کہ آپ مسند ارشاد پر بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا: یَا اَبَا الْقَاسِمِ غَشَّیْتَهُمْ فَصَدَّ دُرُوْكَ وَ نَصَحْتُهُمْ فَرَمَوْنِیْ بِالْحِجَارَةِ۔ (ترجمہ: اے ابوالقاسم! آپ نے ان سے حق کو چھپا دیا تو انہوں نے آپ کو مسند

ارشاد پر بٹھا دیا اور میں نے انہیں نصیحت کی تو انہوں نے مجھ پر پتھر برسائے) اس لیے کہ دین میں لاپروائی کرنے کو خواہش نفس سے موافقت ہے اور نصیحت کو مخالف، اور یہ گروہ اس کا دشمن ہوتا ہے جو اس کی خواہش نفس کا مخالف ہو اور اس کا دوست ہوتا ہے جو اس کی خواہش کے مطابق ہو۔

ابوالحسن النوری رحمۃ اللہ علیہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے رفیق اور حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے اور آپ نے بہت سے مشائخ کو دیکھا اور ان کی صحبت سے فیض اٹھایا تھا اور احمد بن ابی الحوری رحمۃ اللہ علیہ کو بھی دیکھا تھا اور طریقت و تصوف میں آپ کے اشارات بہت لطیف اور اقوال بہت عمدہ ہیں اور تمام علوم میں آپ کے نکتے بہت بلند ہیں۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ: اَلْجَمْعُ بِالْحَقِّ تَفْرِقَةٌ عَنْ غَیْرِہٖ وَ التَّفْرِقَۃُ مِنْ غَیْرِہٖ جَمْعٌ بِہٖ۔ (ترجمہ: حق تعالےٰ سے وابستگی اس کے غیر سے علیحدگی ہے اور غیر اللہ سے علیحدہ ہونا حق تعالےٰ سے وابستگی ہے) یعنی جس کا تعلق حق تعالےٰ سے ہے، وہ اس کے غیر سے الگ ہے اور جو اس کے غیر سے الگ ہے، وہ اس سے وابستہ ہے۔ پس حق تعالےٰ سے اپنے آپ کو وابستہ کرنا، مخلوقات کے اندیشے سے جدا ہونا ہے۔ جب موجودات سے اعراض درست ہوگیا تو حق تعالےٰ کی طرف توجہ درست ہوگئی اور خلقت سے رُوگردانی ٹھیک ہوگئی کیونکہ اَلضِّدَّانِ لَایَجْتَمِعَانِ۔ (ترجمہ: دو ضدیں جمع نہیں ہوسکتیں)۔

میں نے حکایت میں پڑھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت نوری رحمۃ اللہ علیہ تین دن رات تک ایک جگہ کھڑے ہو کر زور زور سے ذکر الٰہی کرتے رہے۔ جب لوگوں نے حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا تو آپ اُٹھ کر اُن کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: "اے ابوالحسن! اگر تو جانتا ہے کہ اس کے سامنے شور و غوغا کچھ سود مند ہے تو بتا کہ میں بھی شور و غل کرنے لگوں اور اگر تجھے معلوم ہے کہ شور و غل کچھ سود مند نہیں تو دل کو رضا و تسلیم پر لگا تاکہ تیرا دل مطمئن ہو جائے۔" تب حضرت نوری رحمۃ اللہ علیہ نے شور کرنا چھوڑ دیا اور کہنے لگے: "اے ابوالقاسم! آپ ہمارے اچھے استاد اور ناصح ہیں۔" نیز آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: اَعَزُّ الْاَشْیَاءِ فِیْ زَمَانِنَا شَیْئَانِ عَالِمٌ یَعْمَلُ بِعِلْمِہٖ وَ عَارِفٌ یَنْطِقُ عَنْ حَقِیْقَتِہٖ۔ (ترجمہ: ہمارے زمانے میں دو چیزیں سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ ایک عالم جو اپنے علم کے مطابق عمل کرتا ہے اور دوسرا عارف جو اپنے حال کی حقیقت کے مطابق گفتگو کرتا ہے) یعنی ہمارے زمانے میں علم و معرفت دونوں عزیز ہیں، اس لیے کہ علم بے عمل خود نہیں ہوتا اور معرفت بلاحقیقت خود معرفت نہیں ہوتی اور اس رہنما (حضرت نوری رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنے زمانے کے متعلق یہ فرمایا ہے اور یہ دونوں چیزیں ہمیشہ ہی عزیز رہی ہیں اور اب بھی ہیں اور جو شخص عالم و عارف کی تلاش میں مشغول ہو، اس کا وقت پریشان ہوتا ہے اور مقصود نہیں پا سکتا۔ لہٰذا اسے خود اپنے آپ میں مشغول ہونا چاہیے تاکہ سارے اہل عالم کو عالم دیکھے اور اپنی ذات کو پہچاننے سے خداوند تعالےٰ کی طرف رجوع کرے تاکہ سب اہل عالم کو عارف دیکھے۔ اس لیے کہ عالم و عارف کمیاب ہوتا ہے اور کمیاب مشکل سے ملتا ہے اور جس چیز کے وجود کا پالینا ہی دشوار ہے، اس کی تلاش تضیع اوقات ہے بلکہ علم و معرفت اور عمل و حقیقت خود اپنی ذات ہی میں تلاش کرنا لازم ہے۔ نیز آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: مَنْ عَلِمَ الْاَشْیَاءَ بِاللّٰہِ فَرُجُوْعُہٗ فِی کُلِّ شَیْئٍ اِلَی اللّٰہِ۔ (ترجمہ: جس نے تمام اشیا کو اللہ کی وجہ سے جانا، وہ ہر چیز میں اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے) اس لیے کہ حکومت اور ملکیت کا قیام مالک کے ساتھ ہوتا ہے۔ پس آرام خالق کے دیکھنے سے ہو سکتا ہے نہ مخلوق کے دیکھنے میں، کیونکہ اگر اشیا کو افعال

کی علت جانے گا تو ہمیشہ مغموم رہے گا اور پھر ہر ایک چیز کی طرف رجوع کرنا اس کے لیے شرک ہو گا اور جب اشیا کو فعل کے اسباب سمجھے گا تو جان لے گا کہ سبب بذات خود قائم نہیں ہوتا بلکہ مسبب کے ساتھ قائم ہوتا ہے، پھر جب وہ مسبب الاسباب کی طرف رجوع کرے گا تو تعلقات دنیا سے نجات پا جائے گا۔

تینتیسویں فصل
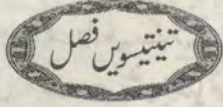
حضرت ابو سعید بن اسمٰعیل جری رحمتہ اللہ علیہ

آپ تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے سلف صالحین کے پیشوا اور ان کے سچے جانشین حضرت ابو سعید بن اسمٰعیل الجری رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ قدیم اور بلند مرتبہ صوفیا کرام میں سے ہوئے ہیں اور اپنے زمانے میں یگانہ اور ہر دلعزیز تھے۔ شروع میں آپ نے حضرت یحییٰ بن معاذ رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت سے فیض اُٹھایا۔ پھر ایک مدت تک حضرت شاہ شجاع کرمانی رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت میں رہے اور ان کے ہمراہ نیشاپور میں حضرت ابوحفص حداد رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کے لیے آئے تو ان کے پاس ٹھہرے اور باقی عمر اُن کی صحبت میں گزار دی۔ معتبر لوگ آپ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے کہا کہ بچپن میں میرا دل ہمیشہ ایک حقیقت کو تلاش کرتا اور اہل ظاہر سے نفرت کرتا تھا اور میں جانتا تھا کہ لامحالہ ظاہر کی طرح جس پر عام لوگ عمل پیرا ہیں، شریعت کا ایک باطن بھی ہے یہاں تک کہ میں نے مقصود پا لیا۔ چنانچہ ایک روز میں حضرت یحییٰ بن معاذ الرازی رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں پہنچ گیا اور وہ باطن میں نے دریافت کر لیا اور میرا مقصد حاصل ہو گیا، چنانچہ میں نے آپ کی صحبت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ شاہ شجاع رحمتہ اللہ علیہ کے پاس سے آئے اور انہوں نے آپ کا حال بیان کیا تو میرے دل میں ان کی زیارت کا شوق پیدا ہوا اور میں نے رے سے کرمان کا قصد کیا اور ان کی صحبت سے فیض حاصل کرنا چاہا مگر انہوں نے مجھے اجازت نہ دی اور فرمانے لگے کہ تیری طبیعت رجاء کی پروردہ ہے اور تو نے حضرت یحییٰ رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت حاصل کی ہے، جن کا مقام رجاء ہے اور جس نے یہ مشرب اختیار کر لیا ہو، اس سے طریقت پر چلنا ناممکن ہے اس لیے کہ رجاء کی تقلید کرنے کا نتیجہ کاہلی ہوتا ہے۔

حضرت سعید بن اسمٰعیل رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے بہت عاجزی اور زاری کی اور بیس روز تک آپ کی درگاہ پر حاضر ہوتا رہا۔ تب آپ نے اجازت دی اور صحبت کے لیے قبول فرمایا اور پھر ایک مدت تک آپ کی صحبت میں ہی رہا۔ آپ بڑے غیور آدمی تھے۔ ایک دفعہ آپ نے ابوحفص حداد رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کرنے کے لیے نیشاپور کا قصد کیا۔ میں بھی آپ کے ہمراہ نیشاپور میں آیا۔ جس روز حضرت ابوحفص رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کو دیکھا تو تعظیماً کھڑے ہو گئے اور آپ کے قریب آ کر کہا: وَجَدْتُ فِی الْقَبَاءِ مَا طَلَبْتُ فِی الْعُبَاءِ۔ (ترجمہ: میں نے قبا میں وہ سب کچھ پا لیا، جسے میں گدڑی میں تلاش کرتا تھا)۔ شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ ایک مدت تک وہاں رہے اور اس عرصے میں میری ساری دلی توجہ کو حضرت ابوحفص رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی طرف کر لیا، لیکن حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا رُعب مجھے ان کی خدمت میں مداومت کرنے سے روکتا تھا۔ ابوحفص رحمتہ اللہ علیہ دلی ارادت کو میرے اندر دیکھ رہے تھے اور میں خدائے عزوجل سے نہایت گڑگڑا کر چاہتا تھا کہ مجھے حضرت ابوحفص رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت کی کوئی صورت میسر آ جائے اور حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ بھی ناراض نہ ہوں۔ یہاں تک کہ جس روز حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے واپسی

کا ارادہ فرمایا تو میں نے بھی ان کے ہمراہ جانے کے لیے سفر کا لباس پہن لیا اور دل کو حضرت ابوحفص رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں چھوڑ دیا۔ حضرت ابوحفص رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے کہا: شاہ صاحب! صحبت کی خوشی کا لحاظ کرتے ہوئے اس لڑکے کو یہاں چھوڑ دیجئے کہ میرا دل اس سے بہت خوش ہوتا ہے۔ شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے میری طرف رُخ کر کے فرمایا: شیخ کی بات مان لو۔ چنانچہ آپ تشریف لے گئے اور میں وہیں رہ گیا یہاں تک کہ آپ کی صحبت میں میں نے عجیب و غریب احوال دیکھے۔

آپ کو مقام شفقت حاصل تھا، چنانچہ خداوند عزوجل نے مجھے تین رہنماؤں کی برکت سے تین مقاموں سے گزار دیا اور یہ تینوں مقام جن کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے، خود ان کے مقام تھے۔ مقام رجا حضرت یحییٰ رحمتہ اللہ علیہ، مقام غیرت حضرت شاہ شجاع رحمتہ اللہ علیہ اور مقام شفقت حضرت ابوحفص رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت میں حاصل ہوا، اور یہ بات جائز ہے کہ مرید پانچ یا چھ یا اس سے بھی زیادہ پیروں کی صحبت میں منزل پر پہنچ جائے اور ہر پیر سے اس کو ایک مقام کا کشف حاصل ہو جائے لیکن بہتر یہ ہوتا ہے کہ نہ تو پیروں کو اپنے مقام سے آلودہ کرے اور نہ ان کی نہایت کو اس مقام میں محدود کرے اور یوں کہے کہ ان کی صحبت سے مجھے یہ مقام نصیب ہوا اور ان کا درجہ اس سے اوپر تھا۔ ان کے پاس میرا اس سے زیادہ حصہ نہ تھا۔ یہ بات ادب سے زیادہ نزدیک ہے اس لیے کہ راہِ حق کے کاملوں کو مقام و احوال سے کچھ کام نہیں ہوتا۔ نیشاپور اور خراسان میں تصوف کے ظہور کا سبب آپ ہی تھے۔ آپ نے حضرت جنید و رویم و یوسف بن الحسین و محمد بن الفضل البلخی رحمہم اللہ کی صحبت کا فیض اٹھایا تھا اور مشائخ میں سے کسی شیخ نے اپنے پیروں کے دل سے وہ حصہ نہیں پایا تھا، جو آپ نے پایا تھا۔ اہل نیشاپور نے آپ کے لیے منبر رکھ دیا تھا اور وہ ان سے تصوف کی باتیں بیان کرتے تھے اور علم طریقت کے متعلق آپ کی بہت سی بلند پایہ کتابیں اور عمدہ ترین روایتیں موجود ہیں۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: حَقَّ لِمَنْ اَعَزَّهُ اللّٰهِ بِالْمَعْرِفَةِ اَنْ لَايُذِلَّهٗ بِالْمَعْصِيَتِ۔ (ترجمہ: جس کو اللہ تعالےٰ اپنی معرفت سے عزت بخشے، اس کو واجب اور سزاوار ہے کہ اپنے آپ کو اس کی نافرمانی سے ذلیل نہ کرے) اور نافرمانی سے بچنے کا تعلق بندے کے کسب سے ہے اور اس کا مجاہدہ ہمیشہ اُمورِ حق کی رعایت کرتا ہے اور اگر تم اس بات کا بھید جاننا چاہو تو سن لو کہ جب اللہ تعالےٰ کسی کو اپنی معرفت سے عزیز کر دے تو مناسب ہے کہ وہ معصیت سے اپنے آپ کو خوار نہ کرے، چونکہ معرفت اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور معصیت بندے کا فعل۔ اس لیے جس کو اللہ تعالیٰ کی عطا سے عزت ملے تو نامناسب ہے کہ وہ اپنے فعل سے ذلیل ہو۔ چنانچہ آدم صلوات اللہ تعالےٰ وسلامہ، علی نبینا و علیہ کو جو اللہ تعالےٰ نے اپنی معرفت سے عزت بخشی تو پھر ان کی لغزش سے ان کو ذلیل نہ فرمایا۔

چونتیسویں فصل
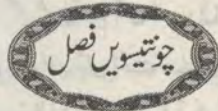
حضرت ابو عبداللہ احمد بن یحییٰ رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، معرفت کے سہیل اور محبت الٰہی کے قطب حضرت ابو عبداللہ احمد بن یحییٰ بن الجلال رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ اپنے وقت کے بلند مرتبہ بزرگ اور صوفیا کرام میں سے تھے۔ آپ ایک بہت ہی اچھے طریقے اور عمدہ ترین سیرت کے مالک تھے۔ آپ حضرت جنید، ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ کے ہم نشین تھے اور بڑے بڑے مشائخ کی ایک جماعت کو آپ نے دیکھا تھا اور حقائق اور طریقت کے بیان کرنے میں آپ کا کلام

عالی اور ارشاداتِ لطیف ہیں۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: هِمَّةُ الْعَارِفِ اِلٰى مَوْلَاهُ فَلَا يُطْعِفُ عَلٰى شَيْئٍ سِوَاهُ۔ (ترجمہ: عارف کی توجہ اپنے مولا کی طرف ہوتی ہے پس وہ اس کے سوا کسی چیز کی طرف رجوع نہیں کرتا اور متوجہ نہیں ہوتا) اس لیے کہ عارف کو معرفتِ الٰہی کے سوا اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ جب اس کے دل کا سرمایہ ہی معرفت الٰہی ہے تو اس کی توجہ کا مرکز بھی رویتِ حق ہی ہوتی ہے کیونکہ ہمتوں اور توجہ کی پریشانی کا نتیجہ غم ہوتا ہے اور غم بندے کو درگاہِ حق تک پہنچنے سے روک دیتا ہے۔ آپ سے حکایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہے کہ ایک روز میں نے ایک یہودی خوبصورت جوان کو دیکھا تو اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر میں متحیر رہ گیا اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا مجھ پر گزر ہوا۔ میں نے آپ سے کہا: "اے اُستاد! کیا اللہ تعالےٰ ایسے چہرے کو آگ میں جلائے گا؟" آپ نے مجھ سے فرمایا: "اے بیٹا! یہ تو نفس کا حقیر سا بازار ہے جو تجھے اس بات پر اُکسا رہا ہے۔ یہ عبرت کی دید نہیں کیونکہ اگر تو عالم کے ذرّات میں سے ہر ایک ذرّے میں عبرت سے دیکھے، ہر جگہ یہی عجوبہ موجود ہے، لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں تو صنعت الٰہی کی اس بے ادبی کے باعث کسی عذاب میں مبتلا نہ ہو جائے۔" چنانچہ جب حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے میرے پاس سے رُخ پھیرا تو اسی وقت قرآن کو بھول گیا اور پھر کئی سال تک میں اللہ تعالےٰ سے مدد مانگتا اور توبہ کرتا رہا، تب قرآن یاد آیا اور اب میں اس بات کی طاقت نہیں رکھتا کہ موجودات میں سے کسی چیز کی طرف توجہ کروں یا اشیائے عبرت پر نظر کرنے میں اپنا وقت ضائع کروں۔

پینتیسویں فصل
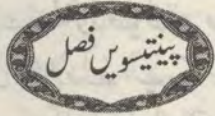
حضرت رویم بن احمد رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین میں سے ایک، اپنے زمانے کے تنہا امام حضرت ابو محمد رویم بن احمد رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ کا شمار بزرگ ترین مشائخ میں ہوتا ہے۔ آپ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے محرم راز اور ہم عصر اور حضرت داؤد کے مسلک پر چلنے والے تمام فقہا کے سردار تھے، غرضیکہ آپ اپنے زمانہ کے تمام مروجہ علوم میں اپنی مثال آپ تھے۔ خصوصاً علم تفسیر اور علم قرأت میں پوری دسترس رکھتے تھے۔ آپ کا حال بلند، مقام رفیع، آپ تجرید کے مردِ میدان اور تفرید کے مجاہد دوران تھے۔ آخری عمر میں آپ نے اپنے آپ کو دنیا داروں میں چھپا دیا تھا اور عہدہٴ قضا پر خلیفہ کے معتمد علیہ ہوگئے تھے، حالانکہ آپ کا درجہ اس سے کہیں زیادہ اونچا تھا کہ دنیا کے حجاب میں آجاتے۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ہم لوگ دُنیا سے فارغ ہونے کے باوجود اس میں مشغول ہیں، جبکہ رویم رحمتہ اللہ علیہ باوجود اس میں مشغول ہونے کے اس سے بالکل فارغ ہیں۔ علم طریقت میں آپ کی کئی ایک تصانیف ہیں، خصوصاً وہ کتاب جس کا نام "غلط الواجدین" رکھا ہے جو سماع کے متعلق ہے اور میں اسے بے حد پسند کرتا ہوں۔ روایت ہے کہ ایک روز کسی شخص نے آپ کے پاس آکر پوچھا کہ: كَيْفَ حَالُكَ؟ (ترجمہ: آپ کا کیا حال ہے؟) آپ نے فرمایا: كَيْفَ حَالُ مَنْ دِيْنُهٗ هَوَاهُ وَ هِمَّةُ دُنْيَاهُ لَيْسَ هُوَ بِصَالِحٍ تَقِيٍّ وَلَا بِعَارِفٍ نَقِيٍّ۔ (ترجمہ: اس شخص کا حال کیا ہوگا جس کا دین اس کی خواہش نفس ہے اور جس کا مقصود اس کی دنیا ہے، نہ تو وہ صالح متقی اور نہ ہی پاکیزہ عارف ہے)۔ اس سے آپ نے نفس کے عیوب کی طرف اشارہ فرمایا ہے اس لیے کہ دین نفس کے نزدیک خواہش نفس ہے اور نفس کی پیروی کرنے والوں نے نفس کی خواہش کا نام دین اور اس کی متابعت کا نام شریعت پر عمل کرنا رکھ لیا ہے۔ پس جو

شخص ان کے منشا کے مطابق چلے اگرچہ وہ بدعتی ہی ہو، ان کے نزدیک وہی دین دار ہوتا ہے اور یہ خرابی ہمارے زمانے میں عام طور پر پھیل رہی ہے۔ ایسے شخص کی صحبت سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں جس کی صفت یہ ہو۔ ممکن ہے اس رہنما نے سائل کے حال کی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہو، نیز یہ بھی جائز ہے کہ انہوں نے اس کو تو اپنے حال پر چھوڑ دیا ہو اور ان باتوں کی نصیحت و تادیب کی خاطر اپنی طرف منسوب کر کے فرمایا ہو، کیونکہ یہ بھی تبلیغ کا ایک طریقہ ہے، واللہ اعلم۔

چھتیسویں فصل
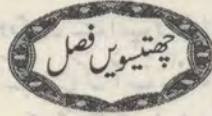
حضرت ابو یعقوب رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ میں سے ایک، نادر روزگار، بلند مرتبہ، حضرت ابو یعقوب یوسف بن حسین الرازی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ زمانے کے قدیم مشائخ اور بزرگ ترین اماموں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ نے بہت لمبی عمر پائی اور حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مشائخ کی خدمت میں رہے اور ان کی صحبت سے کسب فیض کیا ہے۔ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: اَذَلُّ النَّاسِ الْفَقِیْرُ الصَّمُوْعُ وَ الْمُحِبُّ لِمَحْبُوْبِہٖ۔ (ترجمہ: یعنی تمام لوگوں میں ذلیل ترین وہ درویش ہے جو راہ تصوف اختیار کرنے کے باوجود حریص اور جاہ طلب ہو) جیسا کہ تمام لوگوں میں شریف ترین وہ درویش ہوتا ہے جس نے اپنی تمام محبت کو محبوبِ حقیقی کے لیے خاص کر دیا ہو۔ یاد رکھو کہ دنیا کی حرص و آرزو درویش کو دونوں جہانوں میں رُسوا اور ذلیل بنا دیتی ہے کیونکہ درویش یوں بھی دنیا داروں کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتے اور جب وہ حرص کریں تو اور بھی ذلیل ہو جاتے ہیں۔ پس باعزت غنا رُسوا کن فقر سے بدرجہ بہتر ہے۔ نیز حرص و آز ایک درویش کو جھوٹ اور خلافِ شرع اُمور کے ارتکاب پر آمادہ کرتی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ متعصب لوگوں نے آپ کے عشق مذہب کی وجہ سے بلخ سے باہر نکال دیا تھا۔ چنانچہ آپ سمرقند چلے گئے اور ساری عمر عاشق اپنے محبوب کی نظر میں حقیر اور ذلیل ہوتا ہے اور وہ بھی اپنے محبوب کے مقابلے میں اپنے آپ کو نہایت ہی حقیر خیال کرتا ہے اور یہ سب حرص و طمع اور رغبت کا نتیجہ ہے۔ پس جب تک درویش اپنے دل کو اس حرص کی آلائشوں سے پاک صاف نہ کر لے، اس کی ذلت عزت سے تبدیل نہیں ہو سکتی چنانچہ بی بی زلیخا کو جب تک حضرت یوسف علیہ السلام کی حرص رہی، قدم قدم پر اسے ذلت اور رُسوائی کا سامنا کرنا پڑا اور جب اس نے طمع کو چھوڑ دیا اور اپنے دل سے ان کی حرص نکال دی تو اللہ تعالےٰ نے نہ صرف اسے حسن و جمال اور شباب عطا فرمایا، بلکہ ایک روایت کے مطابق اسے حضرت یوسف علیہ السلام کی زوجیت کی سعادت بھی نصیب ہوئی اور اس طرح اس کی تمام ذلت و رُسوائی عزت و توقیر بن گئی۔ دنیا کا دستور بھی کچھ ایسا ہی چلا آیا ہے کہ جس قدر محبّ اپنے محبوب کی طرف رغبت اختیار کرتا ہے، محبوب اس سے اعراض کرتا اور کامل بے اعتنائی سے پیش آتا ہے لیکن جب محبّ رغبت چھوڑ جاتا ہے اور فقط اس سے قلبی ربط و تعلق پر قناعت کر کے کامل طور پر بے نیاز ہو جاتا ہے تو محبوب مضطرب اور بے چین ہو کر اس کی طرف خواہ مخواہ متوجہ ہو جاتا ہے۔ حق یہ ہے کہ وصال کی طمع محبّ کے لیے موجب ذلت اور وصل کی طمع و آرزو نہ رکھنا موجب عزت ہے اور محبّ کی وہ محبت جس میں محبوب کے فراق و وصال کی گنجائش موجود ہو، خالص نہیں۔

سینتیسویں فصل
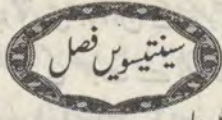
حضرت سمنون بن عبداللہ الخواص رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک ہیں۔ اہل محبت کے آفتاب اور اہل عمل کے پیشوا حضرت ابوالحسن سمنون بن عبداللہ الخواص رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ اپنے زمانے میں بے نظیر اور محبت الٰہی میں بلند شان رکھتے تھے۔ اس وقت کے تمام مشائخ آپ کی تعظیم کرتے تھے اور محبت سے آپ کو سمنون المحب کہہ کر پکارتے تھے لیکن ازراہِ عجز وانکسار انہوں نے اپنا نام سمنون الکذاب رکھا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ آپ نے غلام الخلیل نامی ایک شخص سے بہت تکلیفیں اُٹھائی تھیں۔ اس شخص نے خلیفہ وقت کے سامنے ان کے متعلق جھوٹی شہادتیں دی تھیں اور کچھ انہونی باتیں ان کی طرف منسوب کی تھیں، جس سے مشائخ بھی بہت رنجیدہ خاطر تھے۔ غلام الخلیل ایک ریاکار آدمی تھا مگر پارسائی اور تصوف کا دعوےٰ کیا کرتا تھا اور اپنے آپ کو درباریوں اور خلیفہ کی نظروں میں پارسا ثابت کر کے دین کو دنیا کے عوض بیچ رکھا تھا، جیسا کہ اس زمانہ میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں۔ پھر اہل دربار کے سامنے درویشوں کی برائیاں بیان کرنا اپنا مشغلہ بنا رکھا تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ لوگ ان سے الگ ہو جائیں اور کوئی ان سے برکت حاصل نہ کرے تاکہ خود اس کا مرتبہ قائم رہے۔ خوش بخت ہیں حضرت سمنون اور اس وقت کے دوسرے مشائخ رحمہم اللہ کہ ان کا ایسا دشمن صرف ایک ہی تھا حالانکہ اس زمانے میں تو ہر محقق کے مخالف ایسے لاکھوں غلام الخلیل موجود ہیں، لیکن کوئی خوف نہیں کرنا چاہیے کیونکہ مردار گدھوں ہی کے لائق ہے۔

کہتے ہیں کہ جب حضرت سمنون رحمتہ اللہ علیہ کا مرتبہ بغداد میں بہت بڑھ گیا اور ہر شخص آپ کے تقرب کا شائق ہونے لگا تو غلام الخلیل کو اس سے سخت رنج پہنچا چنانچہ اس نے آپ کو رنج پہنچانے اور بہتان تراشنے کے طریقے وضع کرنے شروع کر دیئے، یہاں تک کہ اس نے ایک عورت کو حضرت سمنون رحمتہ اللہ علیہ کے پاس بھیجا۔ جب اس کی نظر حضرت سمنون رحمتہ اللہ علیہ پر پڑی اور اس نے اپنے آپ کو نکاح کے لیے پیش کیا تو آپ نے اس بات سے انکار کیا۔ پھر وہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے پاس گئی۔ ان سے کہا کہ آپ حضرت سمنون رحمتہ اللہ علیہ سے کہیں کہ "میرے ساتھ نکاح کرنا قبول کریں۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سخت ناراض ہوئے اور اس کو جھڑک دیا۔ تب وہ عورت غلام الخلیل کے پاس آئی اور جیسے عورتیں تہمت لگایا کرتی ہیں، اس نے آپ پر ایک تہمت لگا دی اور اس غلام الخلیل نے اس عورت سے وہ تہمت اس طرح سنی جس طرح دشمن سنا کرتے ہیں اور حضرت سمنون رحمتہ اللہ علیہ کو برا بھلا کہنے لگا اور خلیفہ وقت کو آپ کے خلاف بھڑکایا یہاں تک کہ اس نے آپ کے قتل کا حکم دیا۔ جب جلاد کو لے آئے اور خلیفہ اس حکم کو دینا چاہتا تھا تو خلیفہ کی زبان بند ہوگئی۔ جب وہ اس رات کو سوگیا تو خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ "تیرے ملک کا زوال حضرت سمنون رحمتہ اللہ علیہ کی جان کے زوال کے ساتھ وابستہ ہے۔" دوسرے روز اس نے معافی مانگی اور عزت کے ساتھ آپ کو رُخصت کر دیا۔ محبت الٰہی کی حقیقت میں آپ کا کلام بلند پایہ اور اشارات نہایت باریک ہیں اور آپ کا وہ درجہ ہے کہ آپ ایک دفعہ جب حجاز سے آرہے تھے کہ اثنائے راہ میں اہل فید نے آپ سے عرض کیا کہ ہمیں کوئی نصیحت کی بات کہیے۔ آپ منبر پر چڑھ گئے اور کلام کر رہے تھے، لیکن دلچسپی سے کوئی سننے والا نہ تھا۔ چنانچہ ان سے بددل ہو کر قندیلوں کی طرف رُخ کر کے فرمایا: "لیکن تم سے کہتا ہوں۔" یہ کہتے ہی وہ سب

قندیلیں نیچے گر پڑیں اور چور چور ہو گئیں۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: لَا یُعَبَّرُ عَنْ شَیْئٍ اِلَّا بِمَا هُوَ اَرَقُّ مِنْهُ وَ لَا شَیْئًا اَرَقُّ مِنَ الْمُحَبَّةِ فَبِمَ یُعَبَّرُ عَنْهَا۔ (ترجمہ: کسی چیز کی تعبیر اسی چیز سے کی جا سکتی ہے جو اس سے زیادہ نازک ہو اور محبت سے بڑھ کر کوئی چیز نازک نہیں) پس اس کی کس چیز سے تعبیر کی جا سکے اور مراد اس سے یہ ہے کہ محبت کا اظہار الفاظ میں نہیں ہو سکتا اس لیے کہ بیان، بیان کرنے والے کی صفت ہے اور محبت، محبوب کی صفت۔ پس الفاظ سے اس کی حقیقت بیان نہیں کی جا سکتی، واللہ اعلم۔

اڑتیسویں فصل

حضرت شاہ شجاع کرمانی رحمۃ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، مشائخ کے بادشاہ حضرت ابو الفوارس شاہ شجاع الکرمانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ بادشاہوں کی اولاد میں سے تھے اور اپنے زمانے میں بے نظیر تھے۔ حضرت ابو تراب نخشبی سے مل کر ان کی صحبت سے فیض یاب ہوئے اور ان کا کچھ حال حضرت ابو عثمان حیری کے ذکر میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ علم تصوف میں آپ کے رسالے بہت مشہور ہیں اور ایک کتاب بھی تصنیف کی ہے، جس کو مراۃ الحکماء کہتے ہیں۔ آپ کا کلام بلند پایہ ہے اور آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: لِاَهْلِ الْفَضْلِ فَضْلٌ مَالَمْ يَرَوْهُ فَاِذَا رَاَوْهُ فَلَا فَضْلَ لَهُمْ وَ لِاَهْلِ الْوِلَايَةِ وَلَايَةٌ مَالَمْ يَرَوْهَا فَلَا فَاِذَا يَرَاهَا وَ لَا يَةَ لَهُمْ۔ (ترجمہ: اہل فضیلت کے لیے فضیلت ہے جب تک کہ وہ اس فضیلت کو نہ دیکھیں، پس جب وہ فضیلت کو دیکھیں تو انہیں کوئی فضیلت نہیں۔ اسی طرح ولایت اہل ولایت کے لیے ہے جب تک کہ وہ اس ولایت کو نہ دیکھیں، لیکن جب وہ ولایت کو دیکھیں تو انہیں کوئی ولایت نہیں) اور اس سے یہ مراد ہے کہ جہاں فضیلت اور ولایت ہوتی ہے، وہاں اس کو دیکھنا نہیں ہوتا اور جب دیکھنا حاصل ہو تو وہ فضیلت اور ولایت ساقط ہو جاتی ہے، اس لیے کہ فضیلت ایک ایسی صفت ہے جس میں فضیلت کو دیکھنا صحیح نہیں اور ولایت ایک ایسی صفت ہے جس میں ولایت کو دیکھنا صحیح نہیں، کیونکہ جب کوئی شخص یوں کہے کہ میں فاضل ہوں یا ولی ہوں تو وہ شخص نہ فاضل رہتا ہے اور نہ ولی۔ آپ کے آثار میں لکھا ہے کہ آپ چالیس سال تک نہ سوئے اور جب سوئے تو خداوند تعالےٰ کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا: "بارِ خدایا! میں تو تجھے رات کی بیداری میں طلب کرتا رہا ہوں۔" ارشاد ہوا: "اے شاہ! تو نے خواب میں انہی شب بیداریوں کی وجہ سے مجھے پا لیا، کیونکہ اگر تو ان راتوں میں سو جاتا تو آج مجھے نہ پاتا" واللہ اعلم۔

انتالیسویں فصل

حضرت عمرو بن عثمان المکی رحمۃ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمۃ اللہ علیہ میں سے ایک، دلوں کے سرور اور باطنوں کے نور، حضرت عمرو بن عثمان المکی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ اہل طریقت کے بزرگوں اور سرداروں میں سے تھے۔ علم طریقت کے حقائق میں آپ کی تصانیف مشہور ہیں اور اپنی ارادت کی نسبت حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی طرف کرتے تھے اور حضرت ابو سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا اور حضرت نباجی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ اصولِ طریقت میں آپ وقت کے امام تھے۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: لَا يَقَعُ عَلٰی كَيْفِيَّةِ الْوُجْدِ عِبَارَةٌ لِاَنَّهٗ سِرُّ اللّٰهِ عِنْدَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (ترجمہ: وجد کی

کیفیت الفاظ و عبارت سے بیان نہیں ہوسکتی، کیونکہ بندے کا تصرف اور تکلف اسرارِ ربانی سے بالکل منقطع ہوتا ہے) اور کہتے ہیں کہ جب حضرت عمرو بن عثمان رحمۃ اللہ علیہ اصفہان آئے تو ایک نوجوان آپ کی صحبت میں داخل ہو گیا حالانکہ اس کا باپ اسے آپ کی صحبت سے منع کرتا تھا، یہاں تک کہ وہ نوجوان بیمار ہو گیا اور کچھ عرصہ تک صاحب فراش رہا۔ ایک دن آپ ایک جماعت کے ہمراہ اس کی مزاج پرسی کے لیے تشریف لے گئے۔ اس نوجوان نے حضرت شیخ کی طرف اشارہ کیا کہ آپ قوال سے فرمائیے کہ وہ چند اشعار پڑھ کر سنائے۔ آپ نے قوال سے فرمایا تو اس نے یہ شعر پڑھا:

؎ مَالِیْ مَرِضْتُ فَلَمْ یَعُدْ فِیْ عَائِدٍ مِنْکُمْ وَ یَمْرِضُ عَبْدُکُمْ فَاَعُوْدُ

(ترجمہ: کیا وجہ ہے کہ میں بیمار ہوا تو کوئی بھی تمہاری طرف سے میری بیمار پرسی کے لیے نہیں آیا حالانکہ تمہارا غلام بھی بیمار ہو جائے تو میں اس کی بیمار پرسی کرتا ہوں)۔

بیمار نے جب یہ شعر سنا تو اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کی بیماری کا جوش اور غلبہ کم ہو گیا (یا اس کی بیماری کی شدت اور تکلیف کم ہو گئی) اور کہنے لگا: زدنی (میرے لیے کچھ زیادہ کیجیے) قوال نے دوسرا شعر پڑھا:

؎ وَاَشَدُّ مِنْ مَرَضِ عَلَیَّ صُدُوْدُکُمْ وَ صُدُوْدُ عَبْدِکُمْ عَلَیَّ شَدِیْدٌ

(ترجمہ: اور تمہارا مجھ سے رُکا رہنا میرے نزدیک میری بیماری سے زیادہ سخت ہے اور تمہارے غلام کا رُکا رہنا بھی مجھ پر دشوار ہے)۔

یہ سن کر بیمار اُٹھ کھڑا ہوا اور بیماری اس سے جاتی رہی۔ اس واقعہ کے بعد باپ نے اس کو حضرت عمرو بن عثمان بن رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں دے دیا اور اس کے دل میں جو اندیشہ تھا، اس سے توبہ کی اور سنا ہے کہ وہ نوجوان آپ کی صحبت کی برکت سے طریقت کے بزرگوں میں سے ایک بزرگ ہو گیا، واللہ اعلم۔

چالیسویں فصل
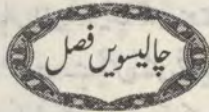
حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے ایک، دلوں کے مالک اور عیبوں کے مٹانے والے ابو محمد سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ اپنے وقت کے پیر تھے اور سب لوگ آپ کے عقیدت مند اور مداح تھے۔ آپ نے بہت ریاضتیں کیں اور آپ کے معاملات بہت اچھے ہیں۔ اخلاص میں اور افعال کے عیوب میں آپ کا کلام نہایت لطیف ہے۔ علماء ظاہر کہتے ہیں کہ ھُوَ جَمَعَ بَیْنَ الشَّرِیْعَۃِ وَ الْحَقِیْقَۃِ۔ (ترجمہ: آپ نے حقیقت اور شریعت کو باہم جمع کر دیا ہے) لیکن ان کی یہ بات غلط ہے کیونکہ کسی نے بھی حقیقت و شریعت میں فرق نہیں کیا ہے، پھر نہ تو شریعت حقیقت کے سوا ہے اور نہ حقیقت ہی شریعت سے علیحدہ، چونکہ عبارات سمجھنے میں بہت آسان ہیں اور طبعیتیں اچھی طرح سمجھ جاتی ہیں، لوگ اس لیے یہ بات کہتے ہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ نے حقیقت اور شریعت کو جمع کر دیا ہے تو محال ہے کہ اولیاء اللہ اس میں فرق کریں۔ اگر دونوں میں فرق موجود ہو تو لامحالہ ایک کو ردّ اور دوسری کو قبول کرنا پڑے گا، حالانکہ شریعت کا ردّ کرنا الحاد اور حقیقت کا ردّ کرنا شرک ہے، اور وہ فرق جو صوفیوں کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے، حقیقت میں فرق نہیں بلکہ وہ تو شریعت کے ذریعے حقیقت ہی کو ثابت کرنا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ حَقِیْقَۃٌ (ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، یہ حقیقت ہے) مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ شَرِیْعَۃٌ۔ (ترجمہ:

محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، یہ شریعت ہے) اگر کوئی شخص ایمان کی صحت کی حالت میں ان دونوں باتوں میں سے ایک کو دوسری سے جدا کرنا چاہے تو ایسا نہیں کرسکتا اور اس کی ایسی خواہش باطل ہے۔ غرض شریعت حقیقت کی اصل ہے اور حقیقت شریعت کی اصل الاصول یعنی توحید کی معرفت حقیقت ہے جو شریعت کے لیے بمنزلہ اصل الاصول کے ہے اور تمام اوامر ونواہی کی پیروی شریعت ہے، جو حقیقت تک پہنچنے کے لیے ایک ہی بنیادی ذریعہ ہے کیونکہ اس ذریعے کے بغیر حقیقت تک رسائی بالکل ناممکن ہے۔ اسی طرح فرمان کو قبول کرنا شریعت ہے۔ پس اہل ظاہر کی طبیعت جس چیز میں نہ لگے، اس سے انکار کردیتے ہیں، حالانکہ راہِ حق کے اصول میں سے کسی اصل کا انکار خطرناک ہوتا ہے اور ایمان کی نعمت پر اللہ تعالےٰ کا شکر بجالانا چاہیے۔

آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے۔ مَاطَلَعَتْ شَمْسٌ وَلَا غَرَبَتْ عَلٰی اَهْلِ الْاَرْضِ اِلَّا وَهُمْ جُهَّالٌ بِاللّٰهِ اِلَّا مَنْ يُؤْثِرُ اللّٰهَ عَلٰی نَفْسِهٖ وَرُوْحِهٖ وَدُنْيَاهُ وَاٰخِرَتِهٖ۔ (ترجمہ: طلوع نہیں ہوا سورج اور نہ وہ غروب ہوا اہل روئے زمین پر، مگر ایسی حالت میں کہ وہ سب اللہ تعالےٰ کی نسبت بالکل جاہل ہیں۔ سوائے اس شخص کے جس نے اللہ تعالےٰ کو اپنی جان، اپنی روح اور اپنی دنیا اور آخرت پر ترجیح دی) یعنی جو شخص اپنے نصیبۂ دنیا کے حاصل کرنے میں کوشش کرتا رہتا ہے اور اس کا یہ کام اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خداوند تعالےٰ کی نسبت بالکل جاہل ہے کیونکہ اس کی معرفت دنیا کی تدبیر کے چھوڑ دینے کا تقاضا کرتی ہے اور دنیا کی تدبیر کو چھوڑ دینا اپنے جملہ اُمور کو خدا تعالےٰ کے سپرد کردینا ہے اور دُنیوی اُمور میں تدبیر کو قائم رکھنا تقدیرِ الٰہی سے جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

اکتالیسویں فصل
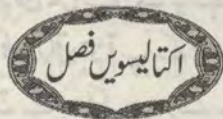
حضرت محمد بن فضل البلخی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، اہل حرمین کے برگزیدہ اور تمام مشائخ کی آنکھوں کی ٹھنڈک، حضرت ابوعبداللہ محمد بن فضل البلخی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ بڑے مشائخ میں سے تھے اور اہل عراق و خراسان کے پسندیدہ اور حضرت احمد بن خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ حضرت ابوعثمان حیری رحمتہ اللہ علیہ کو آپ سے بڑی محبت تھی۔ آپ کو وہیں گزار دی۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: اَعْرَفُ النَّاسِ بِاللّٰهِ اَشَدُّهُمْ مُجَاهَدَةً فِیْ اَوَامِرِهٖ وَاَتْبَعُهُمْ بِسُنَّةِ نَبِيِّهٖ۔ (ترجمہ: سب سے زیادہ عارف باللہ وہ ہے جو اس کے احکام بجالانے میں زیادہ کوشش کرنے والا اور اس کے نبی ﷺ کی سنت کی پیروی زیادہ کرنے والا ہو) اور ظاہر ہے کہ جو شخص حق سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے، وہ اس کا حکم بجالانے میں زیادہ حریص ہوتا ہے اور جو شخص اس سے زیادہ دور ہوتا ہے، وہ اس کے رسول ﷺ کی متابعت سے زیادہ رُوگرداں ہوتا ہے۔ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: عَجِبْتُ مِمَّنْ يَقْطَعُ الْبَوَادِیَ وَالْقِفَارَ وَالْمَفَاوِزَ حَتّٰی يَصِلَ اِلٰی بَيْتِهٖ وَحَرَمِهٖ لِاَنَّ فِيْهِ اٰثَارَ اَنْبِيَاءَ كَيْفَ لَايَقْطَعُ نَفْسَهٗ وَهَوَاهُ حَتّٰی يَصِلَ اِلٰی قَلْبِهٖ لِاَنَّ فِيْهِ اٰثَارَ مَوْلَاهُ۔ (ترجمہ: مجھے اس شخص پر تعجب ہے جو جنگل اور صحرا و دشت قطع کرکے اللہ کے گھر اور اس کے حرم پر پہنچتا ہے کیونکہ اس میں اس کے انبیاء کے آثار ہیں، مگر وہ کیوں نہیں اپنے نفس اور اس کی خواہش کو قطع کرکے اپنے دل میں پہنچتا کہ اس میں اس کے مولا (حق سبحانہ تعالےٰ) کے آثار موجود ہیں) یعنی دل جو اللہ تعالےٰ کی معرفت کا محل ہے، کعبہ سے جو عبادتِ الٰہی کی جہت ہے، زیادہ بزرگ ہے کیونکہ کعبہ تو وہ مقام ہے کہ عبادت میں ہمیشہ بندے کی نظر

اس پر جمی رہتی ہے اور دل وہ مقام ہے کہ ہمیشہ نظر حق اس پر پڑتی رہتی ہے۔ جہاں دل ہے وہاں میرا دوست ہے اور جہاں اس کا حکم ہے وہاں میرا مقصود ہے اور جہاں میرے انبیاء کے آثار ہیں وہاں میرے دوستوں کا قبلہ ہے، واللہ اعلم۔
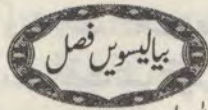
بیالیسویں فصل

حضرت ابو عبداللہ محمد بن علی الترمذی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ہیں۔ ایک شیخ بزرگ اور صفاتِ بشری سے فانی، حضرت ابو عبداللہ محمد بن علی الترمذی رحمتہ اللہ علیہ۔ آپ تمام علوم میں کامل اور امام تھے اور محققین مشائخ میں سے معاملاتِ طریقت میں آپ کی بہت سی تصنیفات ہیں اور ہر ایک کتاب میں، مثلاً "ختم الولایۃ و کتاب الحج و نوادر الاصول" اور ان کے علاوہ اور بہت سی کتابوں میں آپ کی کرامتیں ظاہر ہیں۔ میرے نزدیک آپ بہت باعظمت بزرگ ہیں، چنانچہ میرا دل پورے طور پر آپ پر فریفتہ ہے۔ میرے شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ محمد بن علی الترمذی رحمتہ اللہ علیہ وہ دُرِ یتیم ہیں کہ سارے عالم میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ علم ظاہر میں بھی آپ کی بہت سی کتابیں ہیں اور احادیث میں آپ کی اسناد بہت ہی عالی اور قابل اعتماد سمجھی جاتی ہیں۔ آپ نے قرآن کریم کی ایک تفسیر شروع کی تھی۔ عمر نے وفانہ کی کہ اس کو تمام کرتے۔ جتنا لکھ چکے، وہ اہل علم کے درمیان آج تک رائج ہے۔ آپ نے فقہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ایک خاص شاگرد سے پڑھی تھی۔ آپ کو ترمذ میں لوگ محمد حکیم کہتے ہیں اور ملک کے صوفیا کرام آپ کی اقتدا کرتے ہیں۔ آپ کے بے شمار مناقب و فضائل ہیں اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ نے حضرت خضر پیغمبر صلوات اللہ و سلامہ علی نبینا و علیہ سے صحبت کا فیض حاصل کیا تھا۔ ابو بکر وراق جو آپ کے مرید تھے، آپ سے روایت کرتے ہیں کہ ہر ایک شنبہ کو حضرت خضر علیہ السلام آپ کے پاس آتے تھے اور ایک دوسرے سے ظاہر و باطن کے پوشیدہ حقائق اور واقعات دریافت کرتے تھے۔ نیز آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: مَنْ جَهِلَ بِاَوْصَافِ الْعُبُوْدِيَّةِ فَهُوَ بِنُعُوْتِ الرُّبُوْبِيَّةِ اَجْهَلُ۔ (ترجمہ: جو شخص بندگی کے اوصاف یعنی علم شریعت سے جاہل ہو، وہ اوصافِ ربوبیت سے زیادہ جاہل ہوتا ہے)۔ وَ مَنْ لَمْ يَعْرِفْ طَرِيْقَ مَعْرِفَةِ النَّفْسِ لَمْ يَعْرِفْ طَرِيْقَ مَعْرِفَةِ الرَّبِّ لِاَنَّ الظَّاهِرَ مُتَعَلِّقٌ بِالْبَاطِنِ وَ التَّعَلُّقُ بِالظَّاهِرِ بِلَا بَاطِنٍ مُحَالٌ وَ دَعْوَى الْبَاطِنِ بِلَا ظَاهِرٍ مُحَالٌ فَمَعْرِفَةُ اَوْصَافِ الرُّبُوْبِيَّةِ فِيْ تَصْحِيْحِ اَرْكَانِ الْعُبُوْدِيَّةِ وَلَا يَصِحُّ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْاَدَبِ۔ (ترجمہ: اور جو معرفت نفس کا طریقہ نہیں جانتا، وہ معرفت الٰہی کا طریقہ بھی نہیں جان سکتا۔ کیونکہ ظاہر باطن سے تعلق رکھتا ہے اور ظاہر سے تعلق باطن کے بغیر محال ہے اور باطن کا دعوےٰ ظاہر کے بغیر محال ہے۔ پس اوصاف ربوبیت کی معرفت عبودیت کے ارکان و احکام کے صحیح طور پر بجا لانے میں ہے اور یہ واقعی ادب و احترام کے بغیر صحیح نہیں۔ یہ ایک بنیادی اور مفید ترین بات ہے جو اپنی جگہ پر انشاء اللہ پورے طور پر بیان کی جائے گی۔

تینتالیسویں فصل
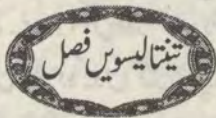
حضرت محمد بن عمر الوراق رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، اُمت کے زاہدوں کا شرف اور اہل فقر و صفا میں نہایت پاکیزہ

حضرت ابوبکر محمد بن عمر الوراق رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ بزرگ مشائخ اور زاہد بزرگوں میں سے ہوئے ہیں۔ آپ نے حضرت احمد بن خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ کو دیکھا تھا اور حضرت محمد علی الترمذی رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ آداب و معاملات میں آپ کی بہت سی کتابیں ہیں اور مشائخ آپ کو مؤدب الاولیاء کہتے ہیں۔ آپ خود حکایت کرتے ہیں کہ محمد بن عمر ترمذی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ مجھے لکھی ہوئی کتاب کے چند اجزا دے کر فرمایا کہ جا کر انہیں دریائے جیحون میں ڈال دو۔ مجھے میرے دل نے اجازت نہ دی اور میں نے ان کو گھر میں رکھ دیا اور ان کے پاس آکر کہہ دیا کہ میں نے وہ اجزاء دریا میں ڈال دیئے۔ آپ نے فرمایا: "تو نے کیا دیکھا؟" میں نے کہا: "میں نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔" آپ نے فرمایا: "تو نے پھر وہ اجزاء دریا میں نہیں ڈالے، واپس جا کر ان کو دریا میں ڈال دے۔" میں واپس لوٹا حالانکہ میرے دل میں اس کی دلیل کا وسوسہ پیدا ہو رہا تھا اور جب ان اجزا کو دریا میں ڈال دیا تو پانی دو ٹکڑے ہو گیا اور ایک صندوق نمودار ہوا، جس کا ڈھکن کھلا تھا۔ جب وہ اجزاء اس صندوق میں جا پڑے تو اس کا منہ بند ہو گیا۔ پھر پانی آپس میں مل گیا اور صندوق غائب ہو گیا۔ میں نے واپس آکر یہ سارا ماجرا بیان کر دیا تو آپ نے فرمایا: "اب تو نے وہ اجزاء ڈال دیئے ہیں۔" میں نے عرض کیا: "اے شیخ! اس بات کا بھید مجھے بتلایئے۔" آپ نے فرمایا: "میں نے طریقت کے اصول اور اس کے اسرار و رموز کی تشریح میں یہ کتاب تصنیف کی تھی، لیکن اس کا سمجھنا لوگوں کے لیے مشکل تھا، چنانچہ میرے بھائی حضرت خضر علیہ السلام نے مجھ سے یہ کتاب طلب کی اور اللہ نے اس دریا کو حکم دیا ہے کہ وہ ان اجزاء کو ان تک پہنچا دے۔"

نیز ابو وراق سے روایت ہے آپ نے فرمایا ہے: اَلنَّاسُ ثَلَاثَۃٌ اَلْعُلَمَاءُ وَ الْاُمَرَاءُ وَ الْفُقَرَاءُ فَاِذَا فَسَدَ الْعُلَمَاءُ فَسَدَ الطَّاعَۃُ وَ الشَّرِیْعَۃُ وَ اِذَا فَسَدَ الْاُمَرَاءُ فَسَدَ الْمَعَاشُ وَ اِذَا فَسَدَ الْفُقَرَاءُ فَسَدَ الْاَخْلَاقُ۔ (ترجمہ: لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں: عالم[۱]، فقیر[۲] اور امیر[۳]۔ پس جب عالم لوگ بگڑ جاتے ہیں تو عبادتِ الٰہی اور شریعت کے امور میں بگاڑ پڑ جاتا ہے، جب امیر بگڑ جاتے ہیں تو انتظام معاش بگڑ جاتا ہے اور جب فقیر بگڑ جاتے ہیں تو سب اخلاق بگڑ جاتے ہیں)۔ پس امراؤ سلاطین کی تباہی تو ظلم و ستم سے ہوتی ہے، علماء کی خرابی طمع اور لالچ سے، فقرا کی بربادی جاہ طلب سے اور جب تک بادشاہ علما سے رُوگردانی نہیں کرتے، تباہ نہیں ہوتے اور جب تک فقراء جاہ طلبی نہیں کرتے، برباد نہیں ہوتے اور جب تک علما بادشاہوں کی صحبت اختیار نہیں کرتے، خراب نہیں ہوتے اس لیے کہ بادشاہوں کا ظلم بے علمی کی وجہ سے ہوتا ہے اور علما کی طمع بد دیانتی کی وجہ سے ہوتی ہے اور فقرا کی ریا اللہ پر توکل نہ کرنے کی وجہ سے ہے۔ پس بے علم بادشاہ، بے پرہیز عالم اور بے توکل فقیر شیطان کا ہم نشین ہوتا ہے اور ساری مخلوق کا بگاڑ ان تین گروہوں کے بگاڑ سے وابستہ ہے، واللہ اعلم بالصواب۔
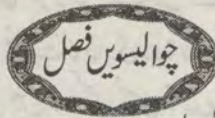
چوالیسویں فصل

حضرت ابوسعید احمد بن عیسیٰ الخزاز رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، رضا و توکل والوں کی کشتی اور طریقہ فنا کو طے کرنے والے حضرت ابو سعید احمد بن عیسیٰ الخزاز رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ ارادت مندوں کے حالات کے شاہد اور طالبان حق کے اوقات کی دلیل تھے۔

آپ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے فنا و بقا کے طریقہ کی وضاحت کی اور اس کے اصول و ضوابط متعین فرمائے۔ آپ کے مناقب، ریاضت و مجاہدہ، بصیرت افروز نکات و اشارات اور معاملات طریقت پر گراں قدر تصانیف بے حد مشہور ہیں۔ آپ نے حضرت ذوالنون مصری، حضرت بشر حافی اور حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہم کی زیارت کا شرف حاصل کیا اور انہیں کی صحبت بابرکت سے رُوحانی فیوض کا اکتساب کیا۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے پیغمبر ﷺ کے اس قول کے متعلق کہ: جُبِلَتِ الْقُلُوْبُ عَلٰی حُبِّ مَنْ اَحْسَنَ اِلَیْهَا۔ (ترجمہ: دل فطری طور پر اس شخص سے محبت کرتے ہیں جو ان سے نیکی کرے) ارشاد فرمایا ہے: وَاعَجَبًا مِمَّنْ لَمْ یَرَمُحْسِنًا غَیْرَ اللّٰهِ کَیْفَ لَایَمِیْلُ بِکُلِّیَّةِ اِلَی اللّٰهِ۔ (ترجمہ: اس شخص پر تعجب ہے جس نے اللہ کے سوا تو کسی اور کو حقیقی محسن نہیں دیکھا لیکن پھر بھی وہ پورے طور پر اس کی طرف راغب نہیں ہوتا) اس لیے کہ احسان درحقیقت وہ ہے جو مخلوقات کا حقیقی مالک کرے، کیونکہ احسان اس شخص سے نیکی کرنا ہے جو اس کی نیکی کا محتاج ہو اور جو شخص اپنے اوپر کسی غیر کا احسان پاتا ہے، وہ دوسرے شخص سے کس طرح احسان کرسکتا ہے۔ پس دنیا میں سب حکومت اور ملکیت اللہ عزوجل ہی کی ہے اور وہ ایسی ذات ہے جو غیر سے بالکل بے نیاز ہے اس لیے اصل احسان اسی کا ہے۔ پس جب اولیاء اللہ نے اس بات کو اچھی طرح جان لیا اور اپنے منعم و محسن کے انعام و احسان کو دیکھا تو ان کے دل پورے طور پر اس محسن حقیقی کی محبت کے اسیر ہو گئے اور ماسوا اللہ سے انہوں نے منہ موڑ لیا۔

پنتالیسویں فصل
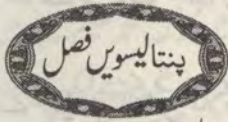
حضرت ابوالحسن علی بن محمد الاصفہانی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے ایک، اربابِ تحقیق کی دلیل اور مریدوں کے رہنما حضرت ابوالحسن علی بن محمد الاصفہانی ہیں اور بعض نے آپ کا نام علی بن سہل الاصفہانی رحمتہ اللہ علیہ بتایا۔ آپ بڑے بلند مرتبہ مشائخ صوفیا میں سے گزرے ہیں۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کی طرف نہایت لطیف خطوط لکھے ہیں۔ آپ کا درجہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمرو بن عثمان مکی رحمتہ اللہ علیہ آپ کی زیارت کے لیے اصفہان تشریف لے گئے تھے۔ آپ حضرت ابوتراب نخشی رحمتہ اللہ علیہ کے ہم صحبت اور حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے رفیق تھے۔ آپ تصوف میں نہایت پسندیدہ طریق کے ساتھ مخصوص ہیں اور رضا و ریاضت سے آراستہ اور فتنہ و آفت کے تصرف سے بالکل محفوظ تھے۔ آپ حقائق و معاملات کے بیان کرنے میں اچھی زبان اور دقائق و اشارات تصوف کے متعلق لطیف بیان رکھتے تھے۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے کہا ہے: اَلْحُضُوْرُ اَفْضَلُ مِنَ الْیَقِیْنِ لِاَنَّ الْحُضُوْرَ وَطَنَاتٌ وَالْیَقِیْنَ خَطَرَاتٌ۔ (ترجمہ: بارگاہ قدس میں ہر وقت حاضر رہنا ذات حق کے یقین سے افضل ہے کیونکہ بارگاہ قدس میں ہمیشہ کی حاضری گویا کہ وطن گزینی ہے جس پر غفلت کا طاری ہونا روا نہیں اور ذات حق کا یقین گویا دل میں گزرنے والی چیزوں میں سے ہے، جو کبھی دل میں آ جاتی ہیں اور کبھی نہیں آتیں۔ پس حاضران بارگاہِ قدس عین بارگاہِ حق میں مقیم ہوتے ہیں اور ذاتِ حق کا یقین کرنے والے بارگاہ قدس کے دروازے پر کھڑے ہوتے ہیں اور غیب و حضور کے متعلق ایک مستقل باب اس کتاب میں انشاء اللہ آئے گا۔ نیز آپ نے فرمایا ہے: مِنْ وَقْتِ اٰدَمَ اِلٰی قِیَامِ السَّاعَةِ اُنَاسٌ یَقُوْلُوْنَ الْقَلْبُ الْقَلْبُ وَ اَنَا اُحِبُّ اَرٰیٔ رَجُلًا یَصِفُ اَیْشَ الْقَلْبِ فَلَا اَرٰی۔ (ترجمہ: آدم علیہ السلام

کے عہد سے لوگ آج تک دل دل کہتے چلے آئے ہیں، چنانچہ میں ایسے آدمی کو دیکھنا چاہتا ہوں جو بیان کرے کہ دل کیا چیز ہے اور اس کے مخفی واردات و کیفیات کا عارفانہ انکشاف کرے، لیکن ہنوز میں ایسے آدمی کو پا نہ سکا)۔ عام لوگ اس گوشت کے ٹکڑے کو دل کہتے ہیں، حالانکہ وہ تو دیوانوں اور مغلوب العقل بچوں اور حیوانوں کو بھی حاصل ہوتا ہے، لیکن وہ باوجود اس گوشت کے پارے کے بے دل ہی ہوتے ہیں۔ پس دل کیا چیز ہے کہ جس کی نسبت میں سوائے الفاظ و عبارت کے اور کچھ نہیں سنتا، لہٰذا اگر عقل کو دل کہوں تو بھی دل نہیں، علم کو دل کہوں تو وہ بھی دل نہیں۔ الغرض حق کے تمام مشاہدات کا تعلق دل سے ہے اور اسی تعلق سے دل کی ماہیت تھوڑی سی سمجھ میں آسکتی ہے، ورنہ عبارت اور الفاظ کے سوا اسے سمجھنے کے لیے اور کوئی ذریعہ نہیں۔

چھیالیسویں فصل
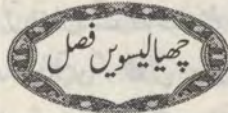
حضرت ابوالحسن محمد اسمٰعیل خیر النساج رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، اہل تسلیم کے رہنما اور طریق محبت الٰہی میں ثابت قدم، حضرت ابوالحسن محمد بن اسمٰعیل خیر النساج رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ اپنے زمانے کے بزرگ مشائخ میں سے تھے اور معاملات اور نصائح میں آپ کا بیان بہت عمدہ اور عبارت بہت مہذب تھی۔ آپ کو بہت لمبی عمر ملی تھی اور حضرت شبلی و ابراہیم خواص رحمہما اللہ دونوں نے آپ کی مجلس میں توبہ کی تھی۔ آپ نے حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ کو حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے پاس بھیج دیا تھا۔ آپ حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے اور حضرت جنید و ابوالحسن نوری رحمہما اللہ کے ہم عصروں میں سے تھے۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک محترم تھے اور حضرت ابو حمزہ بغدادی رحمتہ اللہ علیہ آپ کا بہت احترام کرتے تھے۔

روایت ہے کہ آپ کو جو خیر النساج کہتے تھے، اس کا سبب یہ تھا کہ ایک مرتبہ آپ نے اپنے وطن سے سامرہ چلے گئے تو حج کے ارادے سے آپ کا گزر کوفہ سے ہوا۔ شہر کے دروازہ پر ایک ریشم باف نے آپ کو پکڑ لیا کہ تو میرا غلام ہے اور تیرا نام خیر ہے، لہٰذا میں تجھے یہاں سے ہرگز جانے نہیں دیتا۔ آپ نے اس بات کو حق تعالےٰ کی طرف سے سمجھا اور اس آدمی کی مخالفت نہ کی بلکہ کچھ مدت تک اس کا کام کرتے رہے۔ جب وہ شخص آپ کو یا خیر کہہ کر پکارا کرتا تو حضرت شیخ اس کو لبیک کہہ کر جواب دیتے۔ یہاں تک کہ وہ شخص اپنے کیے پر پشیمان ہوا اور آپ سے کہنے لگا: "آپ جائیے کیونکہ میں نے غلطی کی تھی، آپ میرے غلام نہیں۔" آپ چلے گئے اور مکہ شریف پہنچ گئے اور اس درجہ پر پہنچے کہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "خیر ہم سے اچھے ہیں۔" آپ اس بات کو پسند کرتے تھے کہ لوگ آپ کو خیر کہہ کر پکاریں اور فرماتے ہیں کہ یہ بات روا نہیں کہ جب ایک مسلمان نے میرا نام خیر رکھا تو میں اس کو بدل دوں۔ کہتے ہیں کہ جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو وہ نماز شام کا وقت تھا۔ جب موت کی بے ہوشی سے آپ کو ذرا ہوش آیا تو ملک الموت کی طرف نگاہ ڈال کر فرمایا: قِفْ عَافَاكَ اللّٰهُ فَاِنَّمَا اَنْتَ عَبْدٌ مَّامُوْرٌ وَّاَنَا عَبْدٌ مَّامُوْرٌ وَ مَا اَنْتَ بِهٖ لَا يَفُوْتُكَ وَ مَا اُمِرْتُ بِهٖ فَهُوَ شَيْءٌ يَفُوْتُنِيْ فَدَعْنِيْ اَمْضِ فِيْمَا اُمِرْتُ بِهٖ ثُمَّ امْضِ بِمَا اُمِرْتَ بِهٖ۔ (ترجمہ: ٹھہر جا! اللہ تجھے معاف کرے تو بھی خدا کا ایک ایسا بندہ ہے جس کو ایک کام کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور میں بھی خدا کا ایک ایسا بندہ ہوں جس کو ایک کام کرنے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن جس بات کا تجھے حکم دیا

گیا ہے، وہ تجھ سے فوت نہیں ہو رہی ہے اور جس بات کا مجھے حکم دیا گیا ہے وہ مجھ سے فوت ہو رہی ہے، پس مجھے تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دے کہ میں وہ کام کروں جس کا مجھے حکم دیا گیا ہے پھر تو وہ امر بجا لا جس کا تجھے حکم دیا گیا ہے) پھر آپ نے پانی منگوایا اور وضو کر کے نماز شام ادا کی اور جان دے دی۔ اسی رات لوگوں نے آپ کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے کیا سلوک فرمایا؟ تو آپ نے جواب دیا: لَا تَسْأَلْنِیْ عَنْ هٰذَا وَ لٰکِنِّیْ اسْتَرَحْتُ مِنْ دُنْیَاکُمْ۔ (ترجمہ: تم مجھ سے ایسا سوال نہ کرو، البتہ میں نے تمہاری دنیا سے نجات پا کر آرام حاصل کر لیا ہے)۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے اپنی مجلس میں فرمایا: شَرَحَ اللّٰهُ صُدُوْرَ الْمُتَّقِیْنَ بِنُوْرِ الْیَقِیْنِ وَ کَشَفَ بَصَائِرَ الْمُؤْمِنِیْنَ بِنُوْرِ حَقَائِقِ الْاِیْمَانِ۔ (ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے متقی لوگوں کے سینوں کو نور یقین سے کھول دیا اور اہل یقین کے دلوں کی آنکھیں حقائق ایمان کے نور سے منور فرمائیں) کیونکہ متقی شخص کو یقین کے سوا چارہ نہیں کہ اس کا دل نور یقین سے جلا پاتا ہے اور اہل یقین کو حقائق ایمان کے سوا چارہ نہیں کہ ان کی عقل کی آنکھیں نورِ ایمان سے روشن ہیں، پس جہاں ایمان ہوتا ہے وہاں یقین بھی ہوتا ہے اور جہاں یقین ہوتا ہے وہاں تقویٰ بھی۔ اس لیے کہ وہ ایک دوسرے کا ذریعہ ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے تابع، واللہ اعلم۔

سینتالیسویں فصل
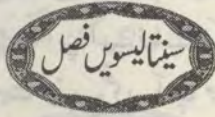
حضرت ابوحمزہ سانی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم تعالیٰ میں سے ایک، زمانے کو حق کی طرف بلانے والے اور اپنے عہد کے یگانہ حضرت ابوحمزہ خراسانی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ خراسان کے قدیم مشائخ میں سے ہوئے ہیں۔ آپ حضرت ابوتراب رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت کے پروردہ تھے اور حضرت خراز رحمتہ اللہ علیہ کو دیکھا تھا اور توکل میں پورا درجہ رکھتے تھے۔ آپ کے متعلق یہ حکایت مشہور ہے کہ آپ ایک روز چلے جا رہے تھے کہ کنویں میں گر پڑے اور تین روز اس کنویں میں رہے۔ اتنے میں سیاحوں کا ایک گروہ آ پہنچا تو آپ نے اپنے دل میں کہا کہ ان لوگوں کو آواز دوں کہ مجھے یہاں سے نکال لیں، مگر ساتھ ہی خیال پیدا ہوا کہ یہ بات اچھی نہیں کہ غیر اللہ سے مدد مانگوں اور یہ شکایت ہوگی کہ اگر میں ان سے کہوں کہ میرے مولا نے مجھے کنویں میں ڈال دیا ہے، اب تم مجھے باہر نکالو۔ کہتے ہیں کہ وہ لوگ نزدیک آئے اور کنویں کو دیکھا کہ راہ میں کھلا منہ اور بغیر آڑ کے ہے۔ آپس میں کہنے لگے کہ آؤ ثواب کے لیے کنویں کا منہ ڈھانپ دیں تاکہ کوئی شخص اس میں گر نہ پڑے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ دیکھ کر میرے دل میں اس بات سے اضطراب پیدا ہوا اور میں اپنی جان سے نااُمید ہو گیا۔ جب وہ لوگ کنویں کا سر ڈھانک کر واپس چلے گئے تو میں نے خدا کی جناب میں عاجزی سے دعا کی اور دل میں موت کی ٹھان لی اور سب مخلوق سے نااُمید ہو گیا۔ جب رات ہو گئی تو کنویں کے اوپر میں نے ایک جنبش سی سنی۔ میں نے اچھی طرح سے جو غور کیا تو دیکھا کہ کسی نے کنویں کا منہ کھول دیا اور اژدہا جیسا بہت بڑا جانور دیکھا جس نے اپنی دم نیچے لٹکا دی۔ میں نے سمجھا کہ میری نجات کے لیے اسے خدا تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ میں اس کی دم سے چمٹ گیا تو اس نے مجھے اوپر کھینچ لیا۔ اتنے میں ایک ہاتف غیب نے آواز دی کہ اے اباحمزہ! تیری نجات بہت اچھی ہے کہ ایک ہلاک کرنے والے جانور کے ذریعے ہم نے تجھے تباہی سے نجات دی۔ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ غریب کون ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: اَلْمُسْتَوْحِشُ مِنَ الْاُلْفِ۔ (ترجمہ: جو دنیا و مافیہا کی اُلفت سے وحشت اختیار کرے) یعنی جسے

دنیا کی تمام چیزوں حتیٰ کہ اپنی ذات کی محبت سے وحشت ہو، وہ غریب ہوتا ہے، اس لئے کہ درویش کا وطن دنیا و عقبیٰ نہیں ہوتا اور اپنے دائمی وطن کے سوا کسی اور چیز سے وحشت ہوتی ہے۔ جب اس کی الفت تمام عالم سے منقطع ہو جائے تو وہ سب چیزوں سے وحشت اختیار کرتا ہے، پھر وہ غریب ہوتا ہے اور یہ درجہ بہت بلند ہے، واللہ اعلم۔

اڑتالیسویں فصل

حضرت ابو العباس احمد بن مسروق رحمۃ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، فرمانِ الٰہی کے مطابق مریدوں کو حق کی دعوت دینے والے، حضرت ابو العباس احمد بن مسروق رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ خراسان کے بزرگوں اور بڑے صوفیا میں سے ہوئے ہیں اور تمام اولیاء اللہ کے اتفاق سے آپ اوتاد الارض میں سے تھے اور آپ کو قطب المدار یہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ صحبت رہی تھی۔ ایک مرتبہ آپ سے لوگوں نے پوچھا کہ ہمیں بتایئے کہ اس وقت کے قطب کون ہیں؟ تو آپ نے اس بات کو ظاہر تو نہ کیا، لیکن اشارتاً بتایا کہ جنید رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ نے چالیس صاحب قدر اولیاء کی خدمت کی تھی اور ان سے فائدہ اٹھایا تھا۔ علوم ظاہر و باطن میں آپ شہسوار تھے اور آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: مَنْ کَانَ سُرُوْرُہٗ بِغَیْرِ الْحَقِّ فَسُرُوْرُہٗ یُوْرِثُ الْھُمُوْمَ وَ مَنْ لَمْ یَکُنْ اُنْسُہٗ فِیْ خِدْمَتِہٖ رَبِّہٖ فَاُنْسُہٗ یُوْرِثُ الْوُحْشَۃَ۔ (ترجمہ: وہ شخص جس کی خوشی غیر اللہ سے ہو، اسی کی خوشی غم و اندوہ پیدا کرتی ہے اور وہ شخص جس کی محبت اپنے رب کی خدمت سے نہ ہو، اس کی محبت وحشت پیدا کرتی ہے) یعنی جو کچھ بھی اللہ کے سوا ہے وہ فانی ہے، پس جو شخص فانی چیز سے خوش ہوتا ہے تو جب وہ فنا ہو جاتی ہے تو غمگین ہو جاتا ہے اور حق کی خدمت و عبادت کے سوا سب عبث ہے۔ جب بندے پر مخلوقات کا حقیر و ہیچ ہونا ظاہر ہو جاتا ہے تو اس کی مخلوقات سے سب محبت وحشت ہو جاتی ہے۔ پس عالم کا یہ سارا غم اور وحشت غیر اللہ کے دیکھنے میں ہے، واللہ اعلم۔

اُنچاسویں فصل

حضرت ابو عبد اللہ ابن محمد اسمٰعیل المغربی رحمۃ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، متوکلین کے اُستاد اور محققین کے شیخ حضرت ابو عبد اللہ ابن محمد اسمٰعیل المغربی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ وقت کے بزرگوں اور سرداروں میں سے ہوئے ہیں اور اپنے زمانے میں استادوں کے مقبول اور مریدوں پر شفقت کرنے والے تھے۔ حضرت ابراہیم خواص اور حضرت ابراہیم شیبان رحمۃ اللہ علیہ آپ کے مرید ہوئے ہیں۔ طریقت میں آپ کا کلام اور آپ کے دلائل بہت بلند اور واضح ہیں۔ آپ دنیا سے علیحدہ رہنے میں بڑے ثابت قدم تھے۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: مَا رَاَیْتُ اَنْصَفَ مِنَ الدُّنْیَا اِنْ خَدَمْتَھَا خَدَمَتْکَ وَ اِنْ تَرَکْتَھَا تَرَکَتْکَ۔ (ترجمہ: میں نے دنیا سے بڑھ کر کسی چیز کو انصاف کرنے والا نہیں دیکھا کہ اگر اس کی خدمت کرے تو وہ تیری خدمت کرتی ہے اور اگر تو اس کو چھوڑ دے تو وہ تجھے چھوڑ دیتی ہے) یعنی جب تک تو اس کو طلب کرتا ہے، وہ تجھے طلب کرتی ہے اور جب تو اس سے اعراض کر کے طلب الٰہی کرتا ہے تو وہ تجھ سے بھاگ جاتی ہے اور اس کے تفکرات تیرے دل سے دور ہو جاتے ہیں۔ پس جو شخص سچے طور پر دنیا سے اعراض کرے،

وہ اس کے شر سے محفوظ ہو جاتا اور اس کی مصیبت سے چھوٹ جاتا ہے، واللہ اعلم۔

پچاسویں فصل
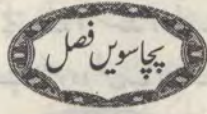
حضرت ابوالحسن علی بن الجرجانی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمتہ اللہ علیہ میں سے ایک، زمانے کے پیر اور اپنے زمانے میں یگانہ حضرت ابوالحسن بن علی الجرجانی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ اپنے زمانے کے بے مثال بزرگ تھے۔ آپ کی تصانیف بہت ہیں، جو طریقت کے معاملات اور نفس کی خرابیوں کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ آپ محمد بن علی ترمذی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید اور حضرت ابوبکر وراق رحمتہ اللہ علیہ کے ہم عصر تھے۔ حضرت ابراہیم سمرقندی رحمتہ اللہ علیہ آپ ہی کے مرید تھے۔ روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ نے فرمایا: اَلْخَلْقُ كُلُّهُمْ فِىْ مَيَادِيْنِ الْغَفْلَةِ يَرْكُضُوْنَ وَ عَلَى الظُّنُوْنِ يَعْتَمِدُوْنَ عِنْدَهُمْ اَنَّهُمْ فِى الْحَقِيْقَةِ يَنْقَلِبُوْنَ وَ عَنِ الْمُكَاشَفَةِ يَنْطِقُوْنَ۔ (ترجمہ: لوگ سب غفلت کے میدانوں میں گھوڑے دوڑا رہے ہیں اور شکوک پر اعتماد کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ وہی درحقیقت دنیا میں ایک حالت سے دوسری میں آتے جاتے ہیں اور وہی ہیں جو مکاشفے سے گفتگو کرتے ہیں)۔ اس رہنما کا اشارہ طبیعت کے غرور اور نفس کی سرکشی کی طرف ہے جیسا کہ ایک جاہل آدمی اپنے جہل کا ہی معتقد ہوتا ہے اور جاہل صوفی تو اور بھی اپنی جہالت کا معتقد ہوتا ہے، چنانچہ ان صوفیا میں سے صاحبِ علم صوفی لوگوں میں زیادہ عزیز و محترم ہوتا ہے اور ان میں سے جاہل سب سے زیادہ ذلیل ہوتے ہیں، اس لیے کہ ان صاحبِ علم صوفیا کو حقیقت حاصل ہوتی ہے نہ غرور، لیکن ان میں سے جاہلوں کو غرور ہوتا ہے اور حقیقت حاصل نہیں ہوتی، وہ میدان غفلت میں چرتے پھرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ وہ مکاشفہ ہے۔ اس لیے کہ غرور آدمی کے سر سے باہر نہیں نکلتا مگر اسی صورت میں کہ وہ جلال یا جمال حق کو نہ دیکھ لے، کیونکہ اس کے جمال کے ظاہر ہونے کی صورت میں سب اسی کو دیکھتے ہیں اور ان کا غرور فنا ہو جاتا ہے اور اس حق سبحانہ کے جلال کے ظہور کی صورت میں وہ اپنے آپ کو نہیں دیکھتے اور ان کا غرور سر نہیں اٹھا سکتا۔

اکیاونویں فصل
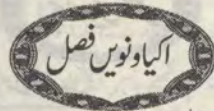
حضرت ابو محمد احمد بن الحسین الحریری رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے ایک، علومِ طریقت کو پھیلانے والے اور رسومِ طریقت کے مقرر کرنے والے، حضرت ابو محمد احمد بن الحسین الحریری رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے راز داروں میں سے تھے اور حضرت سہلؒ بن عبداللہ کی صحبت بھی پائی۔ تمام علوم ظاہری و باطنی سے باخبر، فقہ میں وقت کے امام اور اصولِ فقہ میں کامل مہارت رکھتے تھے، بلکہ طریق تصوف میں تو اس درجے پر فائز تھے کہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے آپ سے فرمایا کہ میرے مریدوں کو ادب سکھایئے اور انہیں ریاضت کی تاکید فرمایئے۔ آپ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ اور جانشین ہوئے۔ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: دَوَامُ الْاِيْمَانِ وَ قِوَامُ الْاَدْيَانِ وَ صَلَاحُ الْاَبْدَانِ فِىْ ثَلَاثَةِ خِصَالٍ اَلْاِكْتِفَاءِ وَالْاِتِّقَاءِ وَالْاِحْتِمَاءِ فَمَنِ اكْتَفٰى بِاللّٰهِ صَلُحَتْ سَرِيْرَتُهٗ وَ مَنِ اتَّقٰى مَا يَنْهَاهُ اللّٰهُ عَنْهُ اسْتَقَامَتْ سِيْرَتُهٗ وَ مَنِ احْتَمٰى مَالَمْ يُوَافِقْهُ ارْتَاضَتْ طَبِيْعَتُهٗ فَثَمَرَةُ الْاِكْتِفَاءِ

صُفُوا الْمَعْرِفَۃِ وَ عَافِیَۃُ الْاِتِّقَاءِ حُسْنُ الْخَلِیقَۃِ وَ غَایَۃُ الْاِحْتِمَاءِ اعْتِدَالُ الطَّبِیْعَتِہ۔ (ترجمہ: ایمان کا ہمیشہ رہنا، دین کا انتظام اور بدنوں کی درستی تین باتوں پر منحصر ہے۔ اللہ تعالےٰ پر اکتفا کرنے، ممنوعات سے بچنے اور نامناسب اُمور سے پرہیز کرنے پر منحصر ہے۔ پس جس نے اللہ تعالےٰ پر اکتفا کیا، اس کا باطن درست ہوگیا اور جو شخص ان باتوں سے بچتا رہا جن سے اللہ تعالےٰ نے منع فرمایا ہے، اس کی سیرت نیک ہوگئی اور جس نے غیر مناسب غذاؤں سے پرہیز کیا، اس کی طبیعت اعتدال پر آگئی) پس اللہ تعالےٰ پر اکتفا کرنے کا ثمرہ معرفت الٰہی کی صفائی ہے اور منع کیے ہوئے امور سے پرہیز کرنے کا انجام خوش خلقی ہے اور نامناسب اغذیہ سے پرہیز کرنے کا نتیجہ طبیعت کا معتدل ہونا ہے) یعنی جو شخص سب امور میں خدا کو کافی سمجھ کر اس پر بھروسا کرتا ہے، اس کی معرفت بالکل مصفا ہوتی ہے اور جو معاملات میں تقویٰ اختیار کرتا ہے، اس کا خلق دنیا اور آخرت میں نیک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پیغمبر ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: مَنْ کَثُرَ صَلَاتُہٗ بِاللَّیْلِ حَسُنَ وَجْھُہٗ بِالنَّھَارِ۔ (ترجمہ: جس کی نماز رات کے وقت زیادہ ہوتی ہے، اس کا چہرہ دن کے وقت زیادہ باجمال ہوتا ہے)۔ ایک دوسری حدیث شریف میں ہے کہ قیامت میں متقی لوگ ایسے طور پر آئیں گے کہ وُجُوْھُھُمْ نُوْرٌ عَلٰی مَنَابِرَ مِنْ نُوْرٍ۔ (ترجمہ: ان کے چہرے منور ہوں گے اور وہ نور کے منبروں پر بیٹھے ہوئے ہوں گے) اور جو شخص غیر مناسب اغذیہ سے پرہیز کا طریق اختیار کرے گا، اس کا بدن بیماری اور نفس شہوت سے محفوظ رہے گا اور یہ بات نہایت ہی جامع، عمدہ اور سننے کے قابل ہے، واللہ اعلم۔
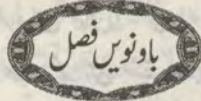
باونویں فصل

حضرت ابو العباس احمد بن محمد بن سہل الآملی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ہوئے۔ ظریفوں کے شیخ اور اہلِ صفا کے پیشوا، حضرت ابو العباس احمد بن محمد بن سہل الآملی رحمتہ اللہ علیہ، آپ بزرگ مشائخ اور باحشمت لوگوں میں سے ہوئے ہیں اور ہمیشہ اپنے ہم عصروں میں محترم رہے۔ علم تفسیر اور قرأت کے عالم تھے اور قرآن کے لطائف بیان کرنا آپ ہی کا حصہ تھا۔ آپ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے بڑے مریدوں میں سے تھے اور حضرت ابراہیم بارستانی رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت حاصل کی تھی۔ حضرت ابو سعید خراز رحمتہ اللہ علیہ آپ کی بڑی عزت کرتے تھے اور آپ کے سوائے کسی کو تصوف میں تسلیم نہ کرتے تھے۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: اَلسُّکُوْنُ اِلٰی مَالُوْفَاتِ الطَّبَائِعِ یَقْطَعُ صَاحِبَھَا عَنْ بُلُوْغِ دَرَجَاتِ الْحَقَائِقِ۔ (ترجمہ: ان چیزوں سے آرام پانا جس سے طبیعتوں کو اُلفت ہو، انسان کو حقائق کے درجوں پر پہنچنے سے روک دیتا ہے) یعنی جو شخص طبیعت کے مرغوبات سے آرام حاصل کرتا ہے، وہ حقیقت پر پہنچنے سے رہ جاتا ہے، اس لیے کہ طبیعتیں نفس کے اسباب اور آلات ہیں اور نفس حق سے حجاب میں ہے اور حقیقت محل کشف و مشاہدہ ہے۔ کوئی مرید جو حق سے حجاب میں ہو اور مرغوبات طبع سے آرام پاتا ہو، وہ کبھی مشاہدہ حق کرنے والے انسان جیسا نہیں ہو سکتا۔ پس حقائق کا معلوم کرنا کشف کا محل ہوتا ہے، جو طبیعت کی مرغوب چیزوں سے اعراض کرنے سے وابستہ ہے، اس لیے کہ طبائع کی الفت دو چیزوں سے ہوتی ہے، ایک دنیا اور دنیا کی چیزوں سے، دوسرے آخرت اور اس کے احوال سے۔ وہ دنیا سے اُلفت کرتا ہے ہم جنس ہونے کی وجہ سے اور عقبےٰ سے اُلفت کرتا ہے اپنے زعم باطل کی وجہ سے۔ وہ نہ تو اس کی جنس ہے اور نہ اس کی حقیقت ہی معلوم ہے۔ اس عقبیٰ سے اس کی

اُلفت زعم باطل ہی کی وجہ سے ہے، کیونکہ اگر وہ اس عالم عقبیٰ کی حقیقت کو اچھی طرح پہچان لیتا تو اس عالم ناسوت سے قطع تعلق کر لیتا اور جب اس عالم سے قطع تعلق کر لیتا تو طبیعت کی حکومت ختم ہو جاتی، تب حقائق کا مشاہدہ ہوتا کیونکہ وہ عالم عقبیٰ طبیعت کے ساتھ سوائے طبیعت کے فنا ہو جانے کے اور کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ لِاَنَّ فِیْهَا مَا لَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ۔ (ترجمہ: کیونکہ اس عالم عقبیٰ میں وہ نعمتیں ہیں، جن کا انسان کے دل پر گزر تک بھی نہیں ہوا) دل میں گزر اس وجہ سے نہیں کہ اس کا راستہ پر خطر ہے اور وہ چیز زیادہ وقعت نہیں رکھتی جو خاطر میں آ جائے۔ غرض یہ کہ جب عقبیٰ کی حقیقت کی معرفت سے وہم عاجز ہے تو طبیعت کو اس کی اصلی حقیقت سے کس طرح اُلفت ہو سکتی ہے۔ پس یہ بات درست ہوگئی کہ طبیعت کی اُلفت عقبیٰ کے ساتھ ایک خیال باطل ہے، واللہ اعلم۔
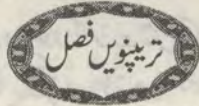
ترپنویں فصل

حضرت ابوالمغیث الحسین بن منصور الحلاج رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے ایک، عالم معنی میں ڈوبے ہوئے اور اپنے دعوے میں ہلاک شدہ، حضرت ابوالمغیث الحسین بن منصور الحلاج رحمتہ اللہ علیہ۔ آپ طریقت کے مشتاقوں اور مستوں میں سے تھے۔ آپ کا حال قوی اور ہمت عالی تھی۔ مشائخ طریقت آپ کے بارے میں مختلف ہیں۔ آپ صوفیا کے ایک گروہ کے نزدیک تو مردود ہیں اور دوسرے گروہ کے نزدیک مقبول، مثلاً عمرو بن عثمان المکیؒ، ابو یعقوب یزجوریؒ، ابوایوب اقطعؒ اور علی بن سہل اصفہانیؒ وغیرہ نے ان کو رد کر دیا ہے اور ابن عطارؒ محمد بن حنیفؒ، ابوالقاسم نصر آبادیؒ اور سب متاخرین رحمہم اللہ نے ان کو قبول کیا ہے اور پھر ایک جماعت نے آپ کے معاملے میں توقف کیا ہے، مثلاً حضرت جنید، شبلی، حریری، حصری، وغیرہم رحمہم اللہ جبکہ ایک دوسرے گروہ نے آپ کو جادو اور اس کے اسباب سے منسوب کیا ہے، لیکن ہمارے زمانے میں شیخ المشائخ ابو سعید ابوالخیر، شیخ ابوالقاسم گرگانی اور شیخ ابوالعباس شقانی رحمہم اللہ نے آپ کے معاملہ کو راز میں رکھا ہے۔ ویسے ان کے نزدیک وہ بزرگ ہی تھے اور قابل احترام، لیکن استاد ابوالقاسم قشیری رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اگر وہ اہل معانی و حقیقت میں سے ایک بزرگ ہوئے ہیں تو لوگوں کے ترک کرنے سے وہ ترک و مردود ہرگز نہیں ہو سکتے اور اگر وہ طریقت میں متروک اور حق تعالیٰ کی طرف سے مردود ہوئے ہیں تو لوگوں کے قبول کرنے سے وہ مقبول نہیں ہو سکتے۔ ہم آپ کے معاملے کو حق تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں، البتہ جس قدر کہ حق کا نشان ہم نے آپ میں پایا ہے، آپ کو بزرگ سمجھتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ تمام مشائخ کرام میں سے سوائے معدودے چند لوگوں کے، آپ کے کمال فضیلت، حال کی صفائی اور کثرت اجتہاد و ریاضت کا کوئی منکر نہیں۔

اس کتاب میں آپ کا ذکر درج نہ کرنا دیانت کے خلاف ہوتا، کیونکہ بعض اہل ظاہر ان کی تکفیر کرتے ہیں اور ان کی بزرگی اور ولایت کا انکار کرتے ہوئے آپ کے حالات کو عذر، حیلہ اور جادو سے منسوب کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ حسین بن منصور حلاج دراصل بغداد کا وہ ملحد و بے دین ہے جو محمد بن زکریا کا استاد اور ابو سعید قرمطی کا رفیق تھا، حالانکہ حسین جن کے معاملے میں مشائخ کے درمیان اختلاف ہے، وہ فارسی النسل اور بیضا کے رہنے والے ہیں اور مشائخ کا ان کو رد اور ترک کرنا ان کے دین اور مذہب میں طعن کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے عجیب و غریب حالات کی وجہ سے ہے، چنانچہ پہلے وہ سہل بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ ان کی اجازت لیے

بغیر ان کے پاس سے چلے گئے اور عمرو بن عثمان رحمتہ اللہ علیہ سے تعلق پیدا کیا اور پھر ان کے پاس سے بھی بلا اجازت چلے گئے اور حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے تعلق پیدا کرنا چاہا۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے ان کو قبول نہ کیا، اسی سبب سے وقت کے سب مشائخ نے ان کو چھوڑ دیا۔ پس وہ عمل میں متروک ہیں نہ کہ اصل طریقت میں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا: اَنَا وَ الْحَلَّاجُ فِیْ شَیْءٍ وَّاحِدٍ فَخَلَّصَنِیْ جُنُوْنِیْ وَ اَهْلَكَهٗ عَقْلُهٗ۔ (ترجمہ: میں اور حلاج ایک ہی حالت میں ہیں، پس مجھے تو میرے جنوں نے چھوڑ دیا اور اسے اس کی عقل نے ہلاک کر دیا)۔ اگر وہ دین میں مطعون ہوتے تو شبلی رحمتہ اللہ علیہ یوں نہ کہتے کہ میں اور حلاج ایک ہی حالت میں ہیں اور حضرت حنیف رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: هُوَ عَالِمٌ رَبَّانِیٌّ۔ (ترجمہ: وہ عالم ربانی ہے) آپ کی بزرگی اور فضیلت پر اور بھی بہت سے شواہد ہیں۔ پس بعض مشائخ کی نارضامندی اور ان کی نافرمانی پھل لائی اور طریقت میں لوگوں کی نظر میں مطعون و متروک بنے۔ آپ کی تصانیف بہت ہیں۔ اصول و فروع میں آپ کے رموز اور آپ کا کلام مہذب ہے۔

میں نے جو علی بن عثمان جلابی ہوں، آپ کی تصنیفات کے پچاس نسخے بغداد اور ان کے گرد و نواح میں دیکھے اور بعض نسخے خوزستان، فارس اور خراسان میں۔ ان میں ہر قسم کی باتیں پائیں جیسا کہ ابتدا میں مریدوں پر ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ ان میں سے بعض تو بہت قوی ہیں اور بعض بہت ضعیف، بعض زیادہ آسان اور بعض بڑی مشکل۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی شخص پر حق تعالیٰ کی طرف سے کوئی بات ظاہر ہوتی ہے تو وہ اسے اپنی قوتِ حال کے اندازے کے مطابق لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے اور ایسا کرنے میں حق تعالےٰ اس کی مدد فرماتا ہے، لیکن اگر کسی کلام کا مفہوم جلدی جلدی بیان کرنے کی وجہ سے یا بیان کرنے والے کے تحیر و تعجب کی وجہ سے پیچیدہ ہو جائے تو اس وقت کے بعض لوگوں میں جہالت کی وجہ سے اس کے سننے سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور بعض لوگوں کی عقل اس کے سمجھنے سے عاجز ہو جاتی ہے اور یہ کہتے ہیں کہ یہ کلام تو بہت ہی بلند ہے۔ غرضیکہ ایک گروہ اپنی جہالت کی وجہ سے اس کا انکار کر دیتا ہے اور دوسرا اگروہ بھی جہالت ہی کی وجہ سے اس کا قرار کرنے لگتا ہے، چنانچہ ایک کا انکار دوسرے کے اقرار کی مانند ہے، لیکن جب اہل تحقیق و بصیرت غور کرتے ہیں تو نہ تو وہ اس کی عبارت میں اُلجھتے ہیں اور نہ اس کے تعجب سے متعجب ہوتے ہیں، بلکہ وہ اس کی مدح و ذم اور اقرار و انکار دونوں ہی سے ایک طرف ہو جاتے ہیں اور وہ لوگ جو اس جوانمرد یعنی حسین بن منصور الحلاج رحمتہ اللہ علیہ کے عجیب و غریب حالات کو سحر سے منسوب کرتے ہیں، سخت غلطی پر ہیں۔ اس لیے کہ اہل سنت و جماعت کے نزدیک سحر کا وجود کرامت کی طرح حق ہے۔ فرق یہ ہے کہ حالت ہوش میں سحر کا ظاہر کرنا کمال کفر ہے اور مستی میں کرامت کا ظاہر کرنا کمال معرفت ہے، کیونکہ جادو خداوند تعالےٰ کے غضب کا نتیجہ ہے اور کرامت اس کی رضامندی کی دلیل ہے۔ میں اس بات کو متعلقہ باب میں اس سے زیادہ مفصل اور مشرح بیان کروں گا اور اہل سنت و جماعت کے اہل بصیرت لوگ کے اتفاق سے کوئی مسلمان خسارہ اٹھانے والا جادوگر نہیں ہوسکتا اور نہ کوئی کافر صاحب کرامت ہوسکتا ہے کیونکہ ضدیں آپس میں جمع نہیں ہوسکتیں۔

حسین بن منصور الحلاج رحمتہ اللہ علیہ جب تک زندہ رہے، نیکی کے لباس میں رہے مثلاً اچھی نمازیں پڑھتے رہے، بہت ذکر الٰہی و مناجات کرتے رہے، ہمیشہ روزے رکھتے رہے، اللہ کی نہایت ہی پاکیزہ حمد و ثنا کرتے رہے اور توحید الٰہی میں عمدہ نکات بیان فرماتے رہے۔ اگر آپ کے افعال سحر پر مبنی ہوتے تو یہ سب نیک امور آپ سے محال ہوتے۔ پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ افعال کرامت تھی اور سوائے محقق ولی کے کسی کو یہ حاصل نہیں ہوتی۔ بعض

اربابِ حقیقت آپ کے اس نظریے کے پیشِ نظر کہ امت، خدا اور بندہ باہم مل کر ایک وحدت بن جاتے ہیں، آپ کو قابل قبول نہیں سمجھتے، لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان بزرگوں کی یہ تشنیع آپ کی عبارت ہی میں ہے نہ کہ معنی میں، کیونکہ مغلوب الحال شخص کے لیے ممکن نہیں کہ حال کے غلبے میں اس کی عبارت صحیح ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ اس عبارت سے ایسی صورت پیدا کر دے کہ وہ محض اس جہالت کے باعث اس کا انکار کر دیں، حالانکہ ان کا یہ انکار خود ان کے قصور فہم کی طرف راجع ہوگا نہ اس معنی کی طرف، لیکن میں نے بغداد اور اس کے نواح میں ملحدین کے ایک گروہ کو دیکھا کہ وہ ان سے محبت کا دعویٰ کرتے، ان کے کلام کو اپنی بے دینی کی حجت قرار دیتے، اپنا نام حلاجی رکھتے اور ان کے معاملے میں بہت مبالغہ کرتے تھے، جیسا کہ رافضی لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی محبت میں کیا کرتے ہیں اور میں انشاء اللہ تعالےٰ ان کے کلمات کے ردّ میں اور ان فرقوں کے بیان میں ایک مستقل باب لاؤں گا۔ الغرض آپ کا کلام اقتدا کے لائق نہیں۔ اس لیے کہ آپ اپنے حال میں مغلوب ہوئے ہیں۔ اپنے آپ پر قابو رکھنے والے نہ تھے اور اس شخص کے کلام کی اقتدا کی جاتی ہے، جو اپنے حال پر قابو پائے ہوئے ہو۔ پس اللہ کا شکر ہے کہ میرے دل میں آپ کی عزت ہے، لیکن آپ کا طریق کسی اصل پر صحیح اور نہ ہی آپ کا حال کسی محل پر قائم ہے اور آپ کے احوال میں بظاہر فتنہ بہت ہے۔ مجھے اپنے مکاشفات کی ابتدا میں ان کی نسبت بہت سی دلیلیں ملی ہیں اور اس سے پیشتر میں نے ان کے کلام کی شرح میں ایک کتاب لکھی ہے، جس میں دلائل اور براہین سے آپ کے کلام کی بلندی اور ان کے حال کی صحت کو ثابت کیا ہے۔

اس کے علاوہ میں نے اپنی دوسری کتاب "منہاج الدین" میں، جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے، ان کے احوال کی ابتدا و انتہا کو بیان کیا ہے اور یہاں پر بھی اختصار کے طور پر کچھ اتنا بیان کر دیا۔ پس وہ طریق جس کے اصل کو اتنے اعتراضات کے ساتھ یا اعتراضات سے اتنے احتراز کے ساتھ ثابت کرنا پڑے، اس سے کیونکر تعلق پیدا کیا جائے اور کیسے اس کی پیروی کی جائے کیونکہ خواہش نفس کو سچائی ہرگز موافق نہیں آتی۔ اس لیے وہ حق سے انحراف کے طریقے کی کوئی بات تلاش کرتی رہتی ہے کہ اس سے لپٹ جائے۔ آپ سے روایت ہے کہ اَلْاَلسِنۃُ مُسْتَنْطِقَاتٌ تَحْتَ نُطْقِھَا مُسْتَھْلِکَاتٌ صَامِتَاتٌ۔ (ترجمہ: زبانیں بولتی ہیں، لیکن ان کے بولے ہوئے الفاظ میں بعض ہلاک کرنے والے مخفی اور خاموش الفاظ بھی ہوتے ہیں) یعنی الفاظ اور عبارتیں سب باعث خرابی ہیں اور حقیقت کے بیان کرنے میں بالکل بیکار ہیں، کیونکہ جب معنی حاصل ہو جائے تو پھر وہ عبارت کی وجہ سے گم نہیں ہو سکتا اور اگر وہ گم ہو جائے تو عبارت کی وجہ سے پھر پیدا نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ طالب اپنے زعم باطل میں کسی عبارت کو غلط معنی پہناتا ہے اور پھر سمجھتا ہے کہ یہی حقیقی معنی ہیں اور اس طرح ہلاک ہو جاتا ہے، واللہ اعلم۔
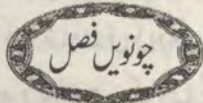
چونویں فصل

حضرت ابو اسحاق ابراہیم بن احمد الخواص رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، متوکلین کے سرلشکر اور اہل تسلیم کے پیشوا، حضرت ابو اسحاق ابراہیم بن احمد الخواص رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ توکل میں آپ بہت زیادہ شان و منزلت رکھتے اور بہت سے مشائخ کو پایا تھا۔ آپ کی کرامتیں بہت ہیں اور معاملاتِ طریقت میں آپ کی بہت سی عمدہ اور قابل دید تصانیف ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہے: اَلْعِلْمُ کُلُّہٗ فِی کَلِمَتَیْنِ لَا تَتَکَلَّفُ فِیْمَا کُفِیْتَ وَلَا تُضَیِّعُ مَا اسْتُکْفِیْتَ۔ (ترجمہ: علم دو کلمات

میں جمع ہے، ایک تو یہ ہے کہ تو اس بات میں تکلف نہ کرے جس کا اللہ نے تیرے حق میں فیصلہ کر دیا، دوسرا یہ کہ تو اس بات کو ضائع نہ کرے جس کا تجھے ادا کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے) یعنی تجھ پر اس کا ادا کرنا لازم قرار دیا گیا ہے اور تو اس کا ضامن بنایا کہ دنیا و آخرت میں تجھے نیکی کی توفیق حاصل ہو۔ اس کلام سے مراد یہ ہے کہ تو اپنی قسمت بدلنے کی کوشش نہ کر، کیونکہ قسمت کا لکھا ہوا تیری کوشش و تکلف سے بدل نہیں سکتا اور امر الٰہی بجا لانے میں کوتاہی نہ کر کیونکہ ترکِ فرمان تیرے لیے عذاب کا سبب ہوگا۔ ایک دفعہ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ "عجائبات میں سے آپ نے کیا دیکھا؟" آپ نے فرمایا: "عجائبات تو بہت دیکھے لیکن اس سے بڑھ کر کوئی بات عجیب نہ تھی کہ خضر علیہ السلام نے مجھ سے صحبت میں رہنے کی درخواست کی، مگر میں نے اس کو قبول نہ کیا۔" لوگوں نے پوچھا: کیوں؟ تو آپ نے فرمایا: "اس لیے نہیں کہ میں آپ سے کوئی بہتر رفیق طلب کرتا تھا بلکہ اس لیے کہ میں ڈرتا تھا کہ حق تعالےٰ کو چھوڑ کر آپ پر اعتماد کرنا پڑے گا، یوں آپ کی صحبت میرے توکل کو نقصان دے گی اور نفل کو اختیار کر کے فریضے سے باز رہ جاؤں گا" اور ظاہر ہے کہ یہ بات آپ کے کمال پر دلالت کرتی ہے۔

پچپنویں فصل

حضرت ابو حمزہ بغدادی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، عزت کے سراپردہ اور اہل یقین کی بنیاد، حضرت ابو حمزہ بغدادی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ علماء متکلمین اور مشائخ عظام کے سردار، حضرت حارث محاسبی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت کے پروردہ اور حضرت نوری و خیر النساج رحمہما اللہ کے ہم عصر تھے۔ بڑے بڑے باحشمت مشائخ کی صحبت سے اکتسابِ فیض کیا تھا اور بغداد کی مسجد رصافہ میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔ علم تفسیر اور تجوید کے بہت بڑے عالم تھے۔ پیغمبر ﷺ کی حدیث میں آپ کی روایت کردہ احادیث بہت مستند اور بلند مرتبہ سمجھی جاتی ہیں۔ آپ وہ تھے جنہوں نے حضرت نوری کی مصیبت کے واقعہ میں ان کا ساتھ دیا تھا چنانچہ اللہ تعالےٰ نے ان سب کو نجات دی۔ اس حکایت کو حضرت نوری رحمتہ اللہ علیہ کے مذہب کی شرح میں انشاء اللہ بیان کروں گا۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: اِذَا سَلِمَتْ مِنْكَ نَفْسُكَ فَقَدْ اَدَّيْتَ حَقَّهَا وَ اِذَا سَلِمَ مِنْكَ الْخَلْقُ فَقَضَيْتَ حُقُوْقَهُمْ۔ (ترجمہ: جب تجھ سے تیری ذات سلامت رہے تو تو نے اس کا حق ادا کر دیا اور جب تجھ سے لوگ سلامت رہے تو تو نے ان کے حقوق ادا کر دیئے) یعنی حقوق دو ہیں: ایک تیرے نفس کا حق، دوسرا لوگوں کا حق۔ جب تو اپنے نفس کو گناہ سے روکے اور عقبیٰ کی سلامتی کا طریقہ طلب کرے، تو تو نے اپنے نفس کا حق ادا کر دیا اور جب لوگوں کو اپنی برائی سے محفوظ کر دے اور ان کی برائی نہ چاہے، تو تو نے ان کا حق ادا کر دیا، کوشش کر کہ خود تجھے لوگوں سے اور لوگوں کو تجھ سے کوئی برائی نہ پہنچے، بعد ازاں اللہ تعالےٰ کے حق ادا کرنے میں مشغول ہو، واللہ اعلم۔

چھپنویں فصل

حضرت ابو بکر محمد بن موسیٰ الواسطی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، اپنے فن میں امام، بلند حال اور لطیف کلام، حضرت ابو بکر محمد بن

موسیٰ الواسطی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ مشائخ کے نزدیک قابل ستائش تھے۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے قدیم اصحاب میں سے تھے۔ آپ کی عبارت بہت مشکل ہوتی تھی اور اہل ظاہر کی آنکھ میں نہ جچتی تھی۔ آپ کسی شہر میں زیادہ دیر نہ ٹھہر پاتے تھے اور کسی شہر میں آرام نہیں پکڑتے تھے۔ جب آپ مرو میں آئے تو اہل مرو لطافت طبیعت کی وجہ سے نیک سیرت تھے۔ انہوں نے کمال عزت واحترام سے آپ کو قبول کیا اور آپ کا کلام سنا، چنانچہ آپ نے اپنی عمر وہاں گزار دی۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: اَلذَّاکِرُوْنَ فِی ذِکْرِہٖ اَکْثَرُ غَفْلَۃٍ مِنَ النَّاسِیْنَ لِذِکْرِہٖ۔ (ترجمہ: اہل ذکر کو اس کے ذکر میں ان لوگوں سے زیادہ غفلت ہوتی ہے جو اس کے ذکر کو فراموش کر دیتے ہیں) اس لیے کہ جب اس کو یاد رکھے اور اس کے ذکر کو فراموش کر دے، تو کوئی نقصان نہیں۔ ہاں نقصان اس میں ہے کہ اس کا ذکر تو کرے مگر اس کی ذات کو فراموش کر دے کیونکہ اس صورت میں ذکر بے حضور ہوگا۔ پس اللہ تعالیٰ سے رُوگردانی اس کے ذکر کے باوجود جو غرور پیدا کرے، غفلت سے زیادہ نزدیک ہے بمقابلہ اس رُوگردانی کے جو کسی غرور و پندار کے بغیر ہو کیونکہ اسے بھلا دینے والے کو غیبت اور فراموشی کے وقت اس کی حضوری کا کوئی گھمنڈ نہیں ہوتا مگر اس کا ذکر کرنے والے کو غیبت میں ذکر کرتے وقت اس کی حضوری کا گھمنڈ ہوتا ہے۔ پس حضوری کے بغیر حضوری کا زعم اس غیبت کے مقابلہ میں جس میں کوئی زعم نہ ہو، ایک صریح غفلت ہے کیونکہ طالبانِ حق کی ہلاکت اس کے زعم باطل ہی کی وجہ سے ہے، اس لیے کہ جہاں باطل زعم کا غلبہ ہو، وہاں مقصود کم ہاتھ آتا ہے اور یہ یاد رہے کہ طالبانِ حق کا زعم درحقیقت عقل کی تہمت سے ہے اور عقل عموماً ہمت سے حاصل ہوتی ہے اور ہمت کو تکبر اور بڑائی کے ساتھ کوئی لگاؤ نہیں۔ خلاصہ یہ کہ ذکر یا تو غیبت میں ہوتا ہے یا حضور میں۔ اگر ذاکر اپنے آپ سے غائب و بے خبر ہو مگر حق تعالیٰ کے حضور حاضر تو پھر اس کا ذکر ذکر نہیں، مشاہدہ ہوتا ہے اور اگر حق تعالیٰ سے غائب اور اپنے آپ سے باخبر ہو تو وہ ذکر نہیں، بلکہ غیبت ہے اور غیبت دراصل غفلت ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، واللہ اعلم۔
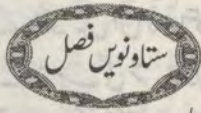
ستاونویں فصل

حضرت ابوبکر دُلف بن جحدار شبلی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے ایک، احوال کی تسلی اور مقال کی کشتی حضرت ابوبکر دُلف بن جحدار رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ بزرگ اور مشہور مشائخ میں سے گنے جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ کے تعلق میں آپ کی زندگی نہایت اچھی اور پاکیزہ رہی ہے۔ معاملاتِ طریقت میں آپ کے اشارات بہت لطیف اور عمدہ ہیں، چنانچہ متاخرین میں سے ایک بزرگ فرماتے ہیں: ثَلَاثَۃٌ مِنْ عَجَائِبِ الدُّنْیَا اِشَارَاتُہٗ شِبْلِیٍ وَ نِکَتُ مُرْتَعِشٍ وَ حِکَایَاتُ جَعْفَر۔ (ترجمہ: تین چیزیں دنیا کے عجائبات میں سے ہیں: حضرت ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ کے اشارات، حضرت مرتعش رحمتہ اللہ علیہ کے نکتے اور حضرت جعفر رحمتہ اللہ علیہ کی حکایتیں)۔ آپ اپنے وقت کے بزرگ صوفیا اور اہل طریقت کے سرداروں میں سے ایک تھے۔ ابتدا میں خلیفہ وقت کے دربانوں کے سردار تھے۔ حضرت خیر النساج رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت میں توبہ کی اور حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید ہوئے۔ ان کے علاوہ وقت کے دوسرے بہت سے مشائخ کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے قول: قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِہِمْ۔ (ترجمہ

اہل ایمان سے کہہ دیجئے کہ اپنی آنکھیں نیچی کرلیں) کے معنی میں فرمایا ہے: اَیْ اَبْصَارُ الرُّؤُسِ عَنِ الْمُحَارِمِ وَ اَبْصَارُ الْقُلُوْبِ عَنْ مَّاسِوَی اللّٰہِ۔ (ترجمہ: یعنی سروں کی آنکھوں کو حرام باتوں سے محفوظ رکھیں اور دلوں کی آنکھوں کو ماسوئ اللہ کے خیال کرنے سے بچائیں) پس شہوت نفس کی پیروی کرنا اور غیر محرم کو نظر شہوت سے دیکھنا، خدا سے غفلت کی وجہ سے ہوتا ہے اور بڑی مصیبت اہل غفلت کے لیے یہ بھی ہے کہ وہ اپنے عیوب سے جاہل ہوتے ہیں اور جو یہاں دنیا میں جاہل ہو، وہ وہاں آخرت میں بھی جاہل ہوتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: وَ مَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی (ترجمہ: جو اس دنیا میں اندھا ہے، وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا)۔ درحقیقت جب تک اللہ تعالیٰ کسی کے دل سے شہوت کا ارادہ نہ نکال دے، سر کی آنکھ اس کی تباہ کاریوں سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ آپ ہی سے روایت ہے کہ آپ ایک روز بازار گئے تو کچھ لوگوں نے آپ کو دیکھ لیا اور کہا: هٰذَا مَجْنُوْنٌ۔ (ترجمہ: یہ شخص دیوانہ ہے) آپ نے فرمایا: اَنَا عِنْدَکُمْ مَجْنُوْنٌ وَ اَنْتُمْ عِنْدِیْ اَصِحَّاءُ فَزَادَنِیَ اللّٰہُ فِیْ جُنُوْنِیْ وَزَادَ فِیْ صِحَّتِکُمْ۔ (ترجمہ: میں تمہارے نزدیک دیوانہ ہوں اور تم میرے نزدیک باہوش ہو۔ پس خدا تعالیٰ میری دیوانگی اور تمہاری ہوشیاری بڑھا دے) یعنی میری دیوانگی شدتِ محبت کی وجہ سے ہے اور تمہاری ہوشیاری غفلت کے غلبے کی وجہ سے ہے۔ پس میں چاہتا ہوں کہ خدا میری دیوانگی زیادہ کرے تاکہ میرا قرب اور بھی بڑھے اور تمہاری ہوشیاری زیادہ کردے تاکہ حق سے تمہاری دُوری اور بھی بڑھ جائے۔ آپ کا یہ قول غیرت کی وجہ سے تھا کہ باوجود مسلمان ہونے کے لوگ اس قدر جاہل کیوں ہیں کہ محبت الٰہی اور دیوانے پن میں فرق نہیں کرسکتے، واللہ اعلم۔

اٹھاونویں فصل
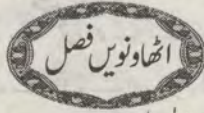
حضرت ابو محمد بن جعفر بن نصیر الخالدی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے ایک، اولیاء کرامؒ کے احوال و اقوال کو لطیف اور عمدہ اسلوب سے بیان کرنے والے حضرت ابو محمد جعفر بن نصیر الخالدی رحمتہ اللہ علیہ بھی ہیں۔ آپ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے بڑے اور قدیم اصحاب میں سے ہوئے ہیں۔ علم تصوف کے فنون میں بہت بڑے فاضل اور مشائخ کے کلام کے حافظ اور ان کے حقوق کی رعایت کرنے والے تھے۔ ہر فن میں آپ کا کلام بلند مرتبہ اور عمدہ خیال کیا جاتا ہے۔ آپ نے ہر مسلے میں نفس کی رعونت کو ترک کرنے کے لیے حکایتیں بیان کی ہیں اور ان کو کسی اور کی طرف منسوب کیا ہے۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے۔ اَلتَّوَکُّلُ اسْتِوَاءُ الْقَلْبِ عِنْدَ الْوُجُوْدِ وَ الْعَدَمِ۔ (ترجمہ: توکل رزق کے ہونے اور نہ ہونے کے وقت دل کا برابر ایک حال پر رہنا ہے) یعنی رزق کے موجود ہونے پر خوش ہو اور اس کے موجود نہ ہونے پر غمگین، کیونکہ جسم اللہ تعالیٰ کی ملک ہے اس لیے اس کی پرورش اور اس کی ہلاکت کے لیے اللہ تعالیٰ تجھ سے زیادہ حقدار ہے، جیسا چاہے اس کو رکھے، تو اس کے درمیان دخل نہ دے اور ملک کو مالک کے سپرد کر دے اور اس میں اپنا تصرف ترک کردے۔ حضرت ابو محمد بن جعفر رحمتہ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ میں ایک روز حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ کو بخار ہے۔ میں نے عرض کیا کہ "اے استاد! اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ آپ کو عافیت عطا فرمائے۔" آپ نے فرمایا: "کل میں دعا کر رہا تھا کہ میرے دل میں یہ آواز آئی کہ جسم ہماری ملکیت ہے، ہم چاہیں تو تندرست کردیں اور چاہیں تو بیمار کردیں، تو کون ہے جو ہمارے اور ہماری

ملک کے درمیان دخل دے اور تو اپنا تصرف ترک کر دے تاکہ تو تابعدار ہو جائے۔" واللہ اعلم۔

اُنسٹھویں فصل

حضرت ابو علی محمد بن القاسم الرودباری رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، قابل تعریف اور سخاوت کے معدن، حضرت ابو علی محمد بن قاسم رودباری رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ بہت بڑے جوانمرد، صوفی اور بزرگ تھے، ایک شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور معاملاتِ طریقت کے فنون میں بڑی شان کے مالک تھے۔ آپ کی کرامتیں اور اوصاف بہت ہیں اور طریقت کے وقائع بیان کرنے میں آپ کا کلام بہت ہی لطیف ہے۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: اَلْمُرِیْدُ لَایُرِیْدُ لِنَفْسِہٖ اِلَّا مَا اَرَادَ اللّٰہُ لَہٗ وَ الْمُرَادُ لَایُرِیْدُ مِنَ الْکَوْنَیْنِ شَیْئًا غَیْرَہٗ۔ (ترجمہ: مرید وہ شخص ہے جو اپنے نفس کے لیے وہی بات چاہے جس کو اللہ اس کے لیے چاہے اور مراد وہ شخص ہے کہ دونوں جہاں میں سے حق تعالےٰ کے سوا کسی چیز کو نہ چاہے) پس وہ اپنے ارادے سے ارادۂ حق پر راضی ہو تاکہ وہ مرید ہو اور عاشق الٰہی کا تو کوئی ارادہ ہی نہیں ہو سکتا، تاکہ وہ حق تعالےٰ کی مراد ہو جائے۔ اس لیے کہ جو شخص خدا تعالےٰ کو چاہتا ہے، وہ اس بات کے سوا اور کچھ نہیں چاہے گا کہ جو خدا چاہے، وہ بھی وہی چاہے اور وہ شخص جسے خدا چاہے، وہ سوائے حق تعالےٰ کے کچھ نہ چاہے گا۔ پس ارادۂ الٰہی پر راضی ہونا طالب حق کے مقامات کی ابتدا ہے اور حق تعالٰی سے محبت طالب الٰہی کے احوال کی انتہا ہے اور ابتدائی مقامات کا تعلق عبودیت کے متحقق ہونے سے ہے اور انتہائی درجات کا حصول فقط تائید ربانی سے ہوتا ہے اور جب ایسا ہو تو مرید کا قیام اپنی ذات سے ہوتا ہے اور مراد کا قیام حق تعالےٰ سے، واللہ اعلم۔

ساٹھویں فصل

حضرت ابوالعباس المہدی السیاری رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، توحید الٰہی کا خزانہ اور اس کی یکتائی کی طرف رہبری فرمانے والے، حضرت ابو العباس مہدی سیاری رحمتہ اللہ علیہ بھی ہیں۔ آپ وقت کے بہت بڑے امام، علوم ظاہر اور حقائق معرفت کے متجر عالم اور حضرت ابوبکر واسطی رحمتہ اللہ علیہ اور بہت سے دیگر مشائخ کرام کی صحبت کے تربیت یافتہ تھے۔ صوفیائے کرام میں آپ بہت ہی ظریف طبع، زاہد اور زمانے کے شدائد کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے والے تھے۔ آپ کا کلام عالی اور تصنیف بہت قابل تعریف ہے۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: اَلتَّوْحِیْدُ اَنْ لَایَخْطُرَ بِقَلْبِکَ مَادُوْنَہٗ۔ (ترجمہ: توحید الٰہی یہ ہے کہ تیرے دل میں حق تعالےٰ کے سوا کسی چیز کا گزر نہ ہو) یعنی تیرے دل میں نہ مخلوقات کا اور نہ ہی تیرے اپنے معاملے کی صحت و صفائی کا کوئی خیال گزرے، کیونکہ غیر کا خیال حق تعالیٰ کے غیر کا اثبات ہے، جس سے توحید کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور جب غیر اللہ ثابت ہو گیا تو توحید کا حکم ساقط ہو گیا۔ آپ مرو کے ایک بہت بڑے متمول اور علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے حتیٰ کہ اہل مرو میں سے کوئی شخص بھی مرتبے میں آپ کے خاندان پر فوقیت نہیں رکھتا تھا۔ آپ نے اپنے والد سے بہت میراث پائی تھی، لیکن آپ نے وہ سب مال و دولت دے کر پیغمبر ﷺ کے دو موئے مبارک خرید لیے۔ خدا تعالےٰ نے آپ کو ان دو بالوں میں برکت سے

توبہ کی توفیق عطا فرمائی اور آپ حضرت ابو بکر واسطی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں داخل ہو گئے اور اس درجے پر پہنچے کہ صوفیوں کے ایک گروہ کے امام ہو گئے۔ جب آپ دنیا سے رُخصت ہونے لگے تو وصیت فرمائی کہ ان موئے مبارک کو میرے منہ میں رکھ دیں۔ آپ کی قبر مرو میں مرجع خاص وعام ہے اور اس سچے عاشق رسول کے توسط سے اللہ تعالیٰ سے اپنی اپنی مرادیں حاصل کرتے ہیں۔

اکسٹھویں فصل
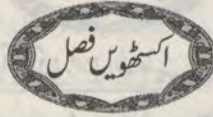
حضرت ابو عبداللہ محمد خفیف رحمۃ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، تصوف میں اپنے حال کے مالک اور تصرف و تکلف سے بے نیاز حضرت ابو عبداللہ محمد بن خفیف رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ اپنے زمانے میں تمام علوم کے امام ہوئے ہیں اور مجاہدات میں آپ کی شان بہت بلند ہے۔ حقائق کے بیان کرنے میں آپ کا بیان شافی اور بہت ہی روح پرور ہے۔ آپ کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی نہایت پُر مسرت اور خوشگوار گزری ہے۔ حضرت ابن عطاد، حضرت شبلی اور حضرت حسین بن منصور رحمہم اللہ تعالےٰ اور ان کے علاوہ دوسرے بزرگوں کو آپ نے پایا تھا اور مکہ مکرمہ میں حضرت یعقوب نہر جوری رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت سے بھی استفادہ کیا تھا۔ مجرد ہونے کے باوجود بہت اچھے اور پاکیزہ سفر کیے تھے۔ آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، لیکن جب اللہ تعالےٰ نے آپ کو توبہ کی توفیق مرحمت فرمائی تو آپ نے دنیا سے اعراض کیا۔ اہل معانی کے دلوں میں آپ کی عظمت بہت ہے۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: اَلتَّوْحِیْدُ الْاِعْرَاضُ عَنِ الطَّبِیْعَۃِ۔ (ترجمہ: توحید طبیعت سے اعراض کرنا ہے) اس لیے کہ تمام طبیعتیں اللہ کی نعمتوں سے محجوب اور اندھی ہوتی ہیں۔ پس جب تک طبیعت سے رُوگردانی نہ ہو، حق کی طرف توجہ نہیں ہو سکتی اور طبیعت کی پیروی کرنے والا توحید کی حقیقت سے حجاب میں ہوتا ہے اور جب تو نے طبیعت کی خرابی کو دیکھ لیا تو توحید کی حقیقت کو پا گیا۔ آپ کی کرامتیں اور دلیلیں بہت سی ہیں، واللہ اعلم۔

باسٹھویں فصل

حضرت ابوعثمان سعید بن سلام المغربی رحمۃ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، سیاست کی تلوار، سعادت کے آفتاب، حضرت ابو عثمان سعید بن سلام مغربی رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ اپنے حال پر قابو رکھنے والے بزرگوں میں سے ہوئے۔ آپ تمام ظاہری اور باطنی علوم میں کافی دسترس رکھتے تھے اور طریقت میں ریاستِ ریاضت و ثابت قدمی کے مالک تھے۔ نفس کی خرابیوں کے دیکھنے میں آپ کی بہت سی کرامتیں اور عمدہ دلیلیں ہیں۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: مَنْ اٰثَرَ صُحْبَۃَ الْاَغْنِیَاءِ عَلٰی مُجَالَسَۃِ الْفُقَرَاءِ ابْتَلَاہُ اللّٰہُ بِمَوْتِ الْقَلْبِ۔ (ترجمہ: جس نے درویشوں کی ہم نشینی پر دولت مندوں کی صحبت کو ترجیح دی، خدائے تعالےٰ اس کو دل کی موت میں مبتلا کر دیتا ہے) یعنی اللہ تعالےٰ اس شخص کو موت میں مبتلا کر دیتا ہے اور اس کے دل کو نورِ معرفت سے بیگانہ بنا دیتا ہے، جو درویشوں کے پاس بیٹھنا چھوڑ کر دولت مندوں کی صحبت اختیار کرے۔ کیونکہ جب وہ شخص درویشوں کی ہم نشینی چھوڑ کر دولت مندوں کی صحبت میں داخل ہو جاتا ہے تو اس کا

دل حاجت کی موت سے مرجاتا ہے اور اس کا جسم غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پس جب درویشوں کی ہم نشینی سے اعراض کرنے کا نتیجہ دل کی موت ہے، تو ان کی صحبت سے اعراض کرنا کیسا ہو گا؟ ان کلمات سے صحبت و مجالست کے درمیان فرق ظاہر ہو گیا، واللہ اعلم بالصواب۔

ترییسٹھویں فصل
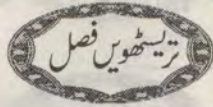
حضرت ابو القاسم ابراہیم محمد بن محمود نصر آبادی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، صوفیوں کی صفِ اوّل کے جنگجو بہادر اور عارفوں کے احوال کے بیان کرنے والے حضرت ابو القاسم ابراہیم بن محمد محمود نصر آبادی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ تصوف میں بہت ہی عالی مقام اور بلند مرتبہ ہیں۔ آپ ایسے تھے جیسے نیشاپور میں خوازم شاہ اور حمویہ میں شاہ پور۔ فرق تھا تو یہ کہ عالم اسباب ان بادشاہوں کا درجہ اور عزت دنیا میں تھی اور آپ کی عزت اور درجہ آخرت میں۔ آپ کا کلام عجیب اور کرامتیں بہت بزرگ ہیں۔ آپ حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید اور اہل خراسان کے متاخرین صوفیا کے استاد تھے۔ آپ کے زمانے میں کوئی شخص آپ کی مثال نہ تھا۔ طریقت کے فنون میں آپ اہل زمانہ میں سے زیادہ عالم اور متورع تھے۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: اَنْتَ بَیْنَ النِّسْبَتَیْنِ نِسْبَۃٌ اِلَی اٰدَمَ وَ نِسْبَۃٌ اِلَی الْحَقِّ فَاِذَا انْتَسَبْتَ اِلٰی اٰدَمَ دَخَلْتَ فِیْ مَیَا دِیْنِ الشَّھَوَاتِ وَ مَوَاضِعِ الْاٰفَاتِ وَ الزَّلَّاتِ وَ ھِیَ نِسْبَۃٌ تُحَقِّقُ الْبَشَرِیَّۃَ لِقَوْلِہٖ تَعَالٰی اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلاً وَاِذَا انْتَسَبْتَ اِلَی الْحَقِّ دَخَلْتَ فِیْ مَقَامَاتِ الْکَشْفِ وَ الْبَرَاھِیْنَ وَ الْعِصْمَتِ وَ الْوَلَایَۃِ وَ ھِیَ نِسْبَۃٌ تُحَقِّقُ الْعُبُوْدِیَّۃَ لِقَوْلِہٖ تَعَالٰی وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا۔ (ترجمہ: تو دو نسبتوں کے درمیان ہے۔ ایک نسبت آدم علیہ السلام کی طرف اور دوسری حق تعالیٰ کی طرف۔ پس جب تو آدم علیہ السلام کی طرف منسوب ہو گا تو خواہشاتِ نفسانی کے میدانوں، خرابیوں اور لغزشوں کے مقاموں میں داخل ہو گا۔ یہ نسبت تیری بشریت کو ثابت کرتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ وہ انسان بڑا ظالم جاہل تھا، اور جب تو حق تعالےٰ کی طرف نسبت پیدا کرے گا تو مکاشفہ دلائل پاک دامنی اور ولایت کے مقامات میں داخل ہو گا اور یہ نسبت تیری عبودیت کو ثابت کرتی ہے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے کہ اللہ کے بندے" ہیں جو زمین پر انکسار سے چلتے ہیں۔ آدم علیہ السلام کا تعلق تو بندوں سے قیامت میں منقطع ہو جائے گا لیکن حق تعالیٰ سے عبودیت کا تعلق ہمیشہ قائم رہے گا، اس میں تغیر و تبدل روا نہیں۔ جب بندہ اپنے آپ کو اپنی طرف یا آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کرے تو اس کا کمال یہ ہے کہ یوں کہے: انی ظلمت نفسی۔ (ترجمہ: بے شک میں نے اپنی جان پر ظلم کیا) اور جب بندہ اپنے آپ کو حق کی طرف منسوب کرے تو پھر وہ یہ درجہ پاتا ہے۔ جیسا کہ حق تعالےٰ فرمایا ہے یٰعِبَادِ لَاخَوْفٌ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ۔ (ترجمہ: اے میرے بندو! آج تم پر کوئی خوف نہیں) واللہ اعلم۔
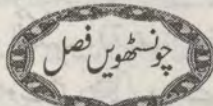
چونسٹھویں فصل

حضرت ابو الحسن علی بن ابراہیم الحصری رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، حق کے طریق پر چلنے والوں کے دل، سردار اور حق کی تحقیق کرنے

والوں کی جانوں کا جمال، حضرت ابوالحسن علی بن ابراہیم الحصری رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ بارگاہِ رب العزت کے باحشمت بزرگوں اور بڑے صوفی اماموں میں سے ہوئے ہیں۔ آپ اپنے زمانے میں بے نظیر تھے۔ تمام معارف میں آپ کا کلام بہت بلند اور عبارات بہت اچھی ہیں۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: دَعُوْنِیْ فِیْ بَلَائِیْ هَاتُوْا مَالَکُمْ اَلَسْتُمْ مِنْ اَوْلَادِ اٰدَمَ الَّذِیْ خَلَقَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی بِیَدِهٖ وَ نَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُوْحٍ اَسْجَدَلَهٗ مَلٰئِکَتَهٗ ثُمَّ اَمَرَهٗ بِاَمْرٍ فَخَالَفَهٗ فَاِذَا کَانَ اَوَّلُ الدَّنِّ دُرْدِیًّا فَکَیْفَ کَانَ اٰخِرُهٗ۔ (ترجمہ: مجھے میری بلا میں چھوڑ دیجئے۔ لاؤ جو تمہارے پاس ہے۔کیا تم آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے نہیں ہو، جسے اللہ نے خود اپنے دستِ قدرت سے پیدا فرمایا اور پیدا کردہ رُوح اس میں پھونک دی اور فرشتوں کو اسے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ پھر اسے بھی ایک بات کا حکم دیا تو اس نے اس کی مخالفت کی۔ پس جب مٹکے کی پہلی شراب ہی تلچھٹ ہو تو بتاؤ اس کا اخیر کیا ہوگا؟) یعنی جب آدمی کو اس کی حالت پر چھوڑ دیں تو وہ ہمہ تن مخالفت بن جاتا ہے اور جب اللہ تعالےٰ کی عنایت اس میں شامل حال ہو جائے تو ہمہ تن محبت بن جاتا ہے، لہٰذا تم عنایت الٰہی کی خوبی کا خیال کیا کرو اور اپنی بد معاملگی کا اس سے مقابلہ کرو اور عمر کو اسی میں گزار دو۔ نیکی کی توفیق اللہ کے قبضے میں ہے۔

یہ بعض متقدمین صوفیا اور ان کے پیشواؤں کا ذکر ہے اگر میں ان سب کا ذکر اس کتاب میں کرتا یا ان کے احوال کی شرح لکھتا اور ان کی حکایات کو درج کرتا تو اصل مقصود فوت ہو جاتا اور کتاب طویل ہو جاتی۔ اب میں متاخرین صوفیا کے ایک گروہ کے احوال صوفیائے متقدمین کے احوال کے بعد بیان کرتا ہوں اور توفیق اللہ کے قبضے میں ہے۔
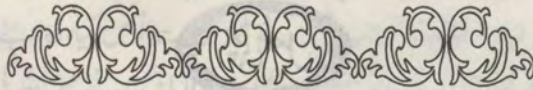
بارھواں باب

صوفیائے متاخرین کے اماموں کے بیان میں

اللہ تمہیں نیکی دے جان لو کہ ہمارے زمانے میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا ہے جو ریاضت و مجاہدہ کیے بغیر ہی فضیلت و بزرگی کی خواہش رکھتے ہیں اور سب اہل طریقت کو اپنے جیسا سمجھتے ہیں، لیکن جب یہ لوگ پہلے بزرگوں کی باتیں سنتے، ان کی بزرگی دیکھتے، ان کے معاملات کو پڑھتے اور پھر اپنے اندر نگاہ ڈال کر اپنے آپ کو ان صفات سے دُور پاتے ہیں تو اس خواہش کو ترک کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی طرح نہیں ہیں، نہ بن سکتے ہیں اور نہ ہی ہمارے زمانے میں ایسے لوگ موجود ہیں، حالانکہ ان کا یہ قول غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ زمین کو بے حجت کبھی نہیں چھوڑتا، یعنی اُمت محمدیہ کو اپنے دوستوں کے بغیر کبھی نہیں رہنے دیتا اور ہر زمانے میں خدا کے نیک بندے موجود رہتے ہیں، چنانچہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے لَایَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ عَلَی الْخَیْرِ وَ الْحَقِّ حَتّٰی یَقُوْمَ السَّاعَةُ۔ (ترجمہ: میری اُمت میں ایک گروہ ہمیشہ نیکی اور حق پر قائم رہے گا، یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے)۔ نیز فرمایا: لَایَزَالُ فِیْ اُمَّتِیْ اَرْبَعُوْنَ عَلٰی خُلُقِ اِبْرَاهِیْمَ۔ (ترجمہ: ہمیشہ میری اُمت میں چالیس آدمی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خلق پر قائم رہیں گے) اور ایک گروہ تو ان لوگوں میں سے جن کا ابھی اس جگہ ذکر کریں گے، گزر چکا اور اپنی روح کو راحت اور آرام پہنچا چکا ہے اور دوسرا گروہ ان میں سے ابھی تک زندہ ہے۔ اللہ تعالےٰ ان سے اور سب مسلمان مردوں اور عورتوں سے راضی ہو۔

پہلی فصل
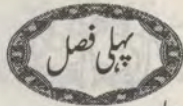
حضرت ابوالعباس احمد بن قصاب رحمۃ اللہ علیہ

متاخرین صوفیا رحمہم اللہ تعالےٰ میں سے ایک، طریق ولایت کی رونق، جماعت اہل ہدایت کا جمال، حضرت ابوالعباس احمد بن قصاب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ نے ماوراء النہر کے متقدمین صوفیا کو دیکھا اور ان کی صحبت سے فیض اُٹھایا تھا۔ آپ بلند عالی، سچی فراست اور کثرت دلائل و کرامات میں بہت مشہور و معروف تھے۔ حضرت ابوعبداللہ خیاطی رحمۃ اللہ علیہ جو طبرستان کے امام تھے، آپ کے متعلق فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کے احسانات میں سے سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ کسی شخص کو تعلیم حاصل کیے بغیر ذہنی طور پر ایسا کر دے کہ جب ہمیں دین کے اصول اور توحید کی دقیق باتوں میں کوئی مشکل پیش آئے تو ہم اس سے پوچھیں اور وہ حضرت ابوالعباس قصاب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ آپ بالکل اُمی تھے، لیکن اس کے باوجود علم تصوف اور اصول دین میں آپ کا کلام اور آپ کے نکتے بہت ہی بلند تھے۔ آپ ابتدا و انتہا میں عالی حال و نیک سیرت تھے اور آپ کی بہت سی حکایات میں نے سنی ہیں، لیکن اس کتاب میں میں نے اختصار کو اختیار کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک لڑکا بھاری بوجھ سے لدے ہوئے اُونٹ کی مہار پکڑے ہوئے شہر آمل کے بازار میں چلا جا رہا تھا۔ وہاں ہمیشہ کیچڑ رہتا تھا۔ اُونٹ کا پاؤں پھسل گیا اور اتفاق سے زمین پر گر کر اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ لوگوں نے اس کی پیٹھ پر سے بوجھ اُتارنے کا ارادہ کیا اور لڑکا مدد کے لیے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ اتفاق سے شیخ ابوالعباس رحمۃ اللہ علیہ کا وہاں سے گزر ہوا۔ آپ نے فرمایا: "کیا ہوا ہے؟" لوگوں نے کہا: "اونٹ کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔" یہ سن کر آپ نے

مہار تھامی اور آسمان کہ سب کا قبلہ دُعا ہے، کی طرف سر اٹھا کر دعا کی۔ "بار خدایا! اس اُونٹ کی ٹانگ درست فرما دے۔ اگر تو درست نہیں کرنا چاہتا تو پھر اس لڑکے کے رونے سے قصاب کے دل کو تو نے کیوں بے قرار کر دیا ہے؟" یہ کہنا تھا کہ اسی وقت اُونٹ اٹھ کھڑا ہوا اور چلنے لگا۔ نیز آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تمام اہل عالم کو خواہ مخواہ اللہ کی تقدیر پر راضی رہنا چاہیے، ورنہ وہ رنج میں رہیں گے، کیونکہ اگر تو اس کی تقدیر پر راضی ہوگا تو بلا کی حالت میں بلا میں ڈالنے والے کو دیکھے گا اور پھر تجھ کو بلا سے کوئی رنج نہیں ہوگا اور اگر تقدیر الٰہی پر راضی نہ ہوگا تو بلا ضرور آئے گی اور تو رنجیدہ خاطر ہوگا۔ خداوند تعالے' ہماری رضا مندی اور نارضا مندی سے اپنی مقررہ تقدیر کو نہیں بدلتا۔ پس ہمارا اس کے حکم پر راضی ہونا ہماری راحت کا سبب ہے۔ پس جو شخص اس کے حکم پر راضی رہتا ہے، اس کا دل آرام پاتا ہے اور جو شخص اس کے حکم سے اعراض کرتا ہے، تو تقدیر کے وارد ہونے پر رنجیدہ ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

دوسری فصل

حضرت ابوعلی بن حسن بن محمد الدقاق رحمتہ اللہ علیہ

متاخرین صوفیا رحمہم اللہ میں سے ایک، مریدوں کا بیان اور محققین کی برہان حضرت علی بن حسن بن محمد الدقاق رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ اپنے فن کے امام اور اپنے زمانے میں بے نظیر تھے۔ راہِ حق کے بیان کرنے میں آپ کا بیان بالکل واضح اور زبان فصیح تھی۔ بہت سے مشائخ کو آپ نے دیکھا اور ان کی صحبت حاصل کی تھی۔ حضرت نصر اللہ آبادی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے اور اکثر وعظ فرمایا کرتے تھے۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: مَنْ اَنَسَ بِغَيْرِهٖ ضَعُفَ فِيْ حَالِهٖ وَ مِنْ غَيْرِهٖ كَذَبَ فِيْ مَقَالِهٖ۔ (ترجمہ: جس نے غیر حق سے اُنس کیا، وہ اپنے حال میں ضعیف رہ گیا۔ جس نے اللہ کے سوا کسی اور کا ذکر کیا، اس نے اپنی گفتگو میں جھوٹ بولا) جس نے غیر اللہ کی طرف سے کوئی کلام کیا، اس نے اپنے کلام میں جھوٹ بولا، اس لیے کہ ماسوائے اللہ سے اُنس کرنا معرفت حق کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے اور حق تعالیٰ سے اُنس کرنا غیر سے وحشت کرنا ہے اور غیر سے وحشت کرنے والا شخص غیر کی طرف سے نہیں بول سکتا۔ میں نے ایک بزرگ سے سنا کہ انہوں نے فرمایا کہ ایک روز میں ان کی مجلس میں آیا کہ آپ سے متوکلین کے حال کے متعلق پوچھوں۔ آپ نے اس وقت بہت ہی عمدہ دستار پہن رکھی تھی۔ میرے دل میں اس کی خواہش پیدا ہوئی۔ میں نے کہا اَيُّهَا الْاُسْتَاذُ مَا التَّوَكُّلُ۔ (ترجمہ: اے مرشد! توکل کیا ہوتا ہے؟) آپ نے فرمایا: "توکل یہ ہے کہ تو لوگوں کی دستار کی طمع نہ کرے۔" یہ بات کہہ آپ نے اپنی دستار اُتار کر میرے سامنے رکھ دی، واللہ اعلم۔

تیسری فصل

حضرت ابوالحسن بن احمد الخرقانی رحمتہ اللہ علیہ

متاخرین رحمہم اللہ میں سے ایک، اہلِ زمانہ کا شرف اور اپنے زمانے میں یکتا حضرت ابوالحسن علی بن احمد خرقانی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ مشائخ مقتدمین میں سے بہت بڑے بزرگ ہوئے ہیں اور اپنے وقت میں سب اولیاء اللہ کے نزدیک ممدوح تھے۔ حضرت شیخ ابوسعید رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کی زیارت کا قصد فرمایا اور ان کے ساتھ گفتگو کی اور ہر فن میں آپ کا کلام نہایت عمدہ ولطیف پایا۔ جب وہ واپس جانے لگے تھے تو آپ نے فرمایا "کہ میں نے آپ کو اپنی

خلافت کے لیے چن لیا ہے۔" میں نے حسن مودب سے سنا ہے، جو حضرت شیخ ابوسعید کے خادم تھے کہ جب حضرت شیخ ابوسعیدؒ آپ کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے کوئی کلام نہیں کیا اور سنتے رہے اور آپ کے کلام کے جواب کے سوا کوئی بات نہیں کہی۔ میں نے ان سے کہا: "اے شیخ آپ کس لیے خاموش ہو گئے تھے؟" تو آپ نے فرمایا کہ "ایک وقت میں ایک ہی باتیں کرنے والا کافی ہے اور میں نے حضرت استاد ابوالقاسم قشیری رحمتہ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب میں ولایت خرقان میں داخل ہوا تو پھر کامل حضرت خرقانی رحمتہ اللہ علیہ کی حشمت و دبدبہ کی وجہ سے میری ساری فصاحت جاتی رہی اور مجھے بیان کرنے کی طاقت نہ رہی۔ میں نے خیال کیا کہ شاید میں اپنی ولایت سے معزول ہوگیا۔" روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ راستے دو ہی ہیں: ایک راستہ گمراہی کا اور دوسرا راستہ ہدایت کا۔ ایک راستہ تو گمراہی کا ہے جو خود بندے کا اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور دوسرا ہدایت کا جو اللہ تعالےٰ کا بندے کی طرف ہے۔ پس وہ بندہ جو یہ کہتا ہے کہ میں خود اللہ تعالےٰ تک پہنچ گیا، وہ حقیقت میں نہیں پہنچا اور اگر یہ کہے کہ مجھے خود اللہ تعالیٰ نے اپنے تک پہنچا دیا تو وہ فی الحقیقت واصل بحق ہوگیا، کیونکہ پہنچنا یہاں نہ پہنچنا ہے اور نہ پہنچنا پہنچنا، واللہ اعلم۔
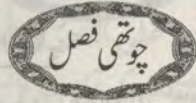
چوتھی فصل

حضرت ابو عبداللہ محمد بن علی المعروف بالداغستانی مقیم بہ بسطام رحمتہ اللہ علیہ

متاخرین رحمہم اللہ میں سے ایک، اپنے وقت کے بادشاہ اور مطالب و معانی بیان کرنے میں یکتا حضرت ابوعبداللہ محمد بن علی المعروف بالداغستانی مقیم بہ بسطام رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ تمام علوم ظاہری و باطنی کے متبحر عالم اور درگاہِ حق کے باحشمت بزرگوں میں سے تھے۔ آپ کا کلام بہت ہی مہذب اور اشارات بہت ہی لطیف ہیں۔ حضرت شیخ سہلکی رحمتہ اللہ علیہ کہ اس مسلک کے امام اور بڑے نیک خلق بزرگ تھے، ان سے میں نے آپ کے کلام کی کچھ باتیں سنی ہیں، جو بہت عالی اور پسندیدہ ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ فرماتے ہیں: اَلتَّوْحِیْدُ عَنْكَ مَوْجُوْدٌ وَّاَنْتَ فِی التَّوْحِیْدِ مَفْقُوْدٌ (ترجمہ: توحید تو تجھ سے درست ہے لیکن تو خود توحید میں گم ہے) یعنی درست نہیں ہے، اس لیے کہ تو مقتضائے توحید کما حقہ، پورا نہیں کرتا اور توحید میں ادنےٰ درجہ یہ ہے کہ ملک میں تو اپنا تصرف چھوڑ دے اور اپنے تمام معاملات کو اللہ عزوجل کے سپرد کر دے۔ حضرت شیخ سہلکی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ایک دفعہ بسطام میں ٹڈی دل آ گیا اور سب درخت اور کھیتیاں ان کی کثرت سے سیاہ ہوگئیں، چنانچہ لوگوں نے واویلا شروع کر دیا۔ شیخ نے مجھ سے پوچھا: "یہ کیا معاملہ ہے؟" میں نے کہا: "ٹڈی دل آ گیا ہے اور لوگ اس کی وجہ سے بہت پریشان ہو رہے ہیں۔" یہ سن کر شیخ اُٹھ کر کوٹھے پر چڑھ گئے اور آسمان کی طرف منہ کیا۔ اسی وقت سب ٹڈی دل چلا گیا حتیٰ کہ عصر کی نماز تک ایک دانہ بھی نہ رہا اور کسی کا ایک پتا تک نقصان نہ ہوا، واللہ اعلم۔

پانچویں فصل
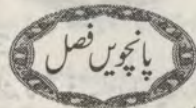
حضرت ابوسعید فضل بن محمد المہنی رحمتہ اللہ علیہ

متاخرین صوفیا رحمہم اللہ میں سے ایک، عاشقانِ الٰہی کے شہنشاہ اور صوفیوں کے بادشاہوں کے بادشاہ حضرت ابوسعید فضل اللہ بن محمد المہنی رحمتہ اللہ علیہ۔ آپ طریقت کے سلطان اور سب اہل زمانہ آپ کے تابع فرمان تھے۔ کچھ

لوگ آپ کے حسن و جمال کے گرویدہ اور حسن اعتقاد کے قائل تھے اور بعض آپ کے زبردست قول حال سے مرعوب تھے۔ آپ تمام علوم ظاہری و باطنی کے متبحر عالم تھے اور باطنی روحانی کوائف و اسرار سے آگاہ۔ اس کے علاوہ آپ کی کرامتیں، آثار اور دلیلیں بہت تھیں، چنانچہ آج تک عالم میں آپ کے نشانات ظاہر ہیں۔ ابتدائے حال میں آپ علم حاصل کرنے کے شوق میں میہنہ سے سرخس آئے اور حضرت ابو علی زاہد رحمتہ اللہ علیہ سے تعلق قائم کیا۔ ایک دن میں تین روز کا سبق لیتے اور وہ تین روز عبادت میں گزارتے، یہاں تک کہ امام ابو علی زاہد رحمتہ اللہ علیہ آپ میں رشد و سعادت کے آثار دیکھ کر آپ کا احترام کرنے لگے۔ کہتے ہیں کہ ان دنوں سرخس کے حاکم شیخ ابوالفضل حسن رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ ایک روز ابو سعید سرخس کی ندی کے کنارے جا رہے تھے کہ شیخ ابوالفضل حسن رحمتہ اللہ علیہ نے سامنے جا کر پوچھا: "اے ابو سعید! تیرا راستہ یہ نہیں جو تو چل رہا ہے، اپنے راستے پر چل۔" چنانچہ شیخ نے انہیں سے رشتۂ طریقت استوار کیا اور وہاں سے اپنی جگہ تشریف لے آئے اور ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہو گئے یہاں تک کہ حق تعالٰی نے آپ پر ہدایت کا دروازہ کھول دیا اور اعلیٰ درجے پر پہنچا دیا۔

میں نے شیخ ابومسلم فارسی رحمتہ اللہ علیہ سے سنا کہ وہ فرماتے ہیں مجھے آپ سے ہمیشہ کچھ جھگڑا رہا کرتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے آپ کی زیارت کا قصد کیا۔ اس وقت میرے بدن پر ایک گدڑی تھی جو میل سے چمڑے کی طرح ہو گئی تھی۔ جب میں اسے اوڑھ کر آپ کے پاس آیا تو دیکھا کہ آپ تخت پر بیٹھے ہیں اور مصر کے دیبقی لباس زیب تن کیے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ شخص باوجود ان دُنیوی تعلقات کے فقیری کا مدعی ہے اور میں باوجود تعلقاتِ دُنیا سے علیحدگی کے فقیری کا دعوےٰ کرتا ہوں، میری اس سے کیسے موافقت ہوسکتی ہے؟ آپ نے میرے اس خیال سے آگاہ ہو کر سر اُٹھا کر فرمایا: اے ابومسلم! فِیْ اَیِّ دِیْوَانٍ وَجَدْتَ مَنْ کَانَ قَلْبُہٗ قَائِمًا فِیْ مُشَاھَدَۃِ الْحَقِّ یَقَعُ عَلَیْہِ اِسْمُ الْفَقِیْرِ۔ (ترجمہ: تو نے کس دیوان میں دیکھا ہے کہ جس کا دل مشاہدۂ حق میں قائم ہو، اس پر فقیر کا نام واقع ہوتا ہے) یعنی اصحابِ مشاہدہ حق تعالٰی کے ساتھ غنی ہوتے ہیں اور فقراء اربابِ مجاہدہ ہوتے ہیں۔ شیخ ابومسلم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے اس خیال سے بہت پشمان ہوا اور اپنے برے خیال سے توبہ کی۔ آپ ہی سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: اَلتَّصَوُّفُ قِیَامُ الْقَلْبِ مَعَ اللّٰہِ بِلَاوَاسِطَۃٍ۔ (ترجمہ: تصوف دل کا حق تعالٰی کے ساتھ بلاواسطہ قائم ہونا ہے) اور یہ بھی مشاہدے کی طرف اشارہ ہے اور مشاہدہ محبت کا غلبہ رویت حق کے شوق میں صفت کا مستغرق ہونا اور بقائے حق سے صفت کا فنا ہونا ہے۔ کتاب الحج میں مشاہدہ اور اس کے وجود کے متعلق انشاء اللہ میں ایک مستقل باب لکھوں گا۔ ایک دفعہ نیشاپور سے آپ نے طوس کا قصد کیا۔ راستے میں ایک دشوار گزار گھاٹی میں بہت سردی تھی۔ آپ کے پاؤں موزوں میں بھی سردی محسوس کرتے تھے۔ آپ کے ہمراہی ایک درویش نے کہا کہ میں نے خیال کیا کہ اپنی چادر دو ٹکڑے کر کے آپ کے پاؤں میں لپیٹ دوں، مگر میرے دل نے نہ چاہا کیونکہ چادر بہت عمدہ تھی۔ جب ہم طوس میں آئے تو مجلس میں میں نے آپ سے سوال کیا: "اے شیخ! وسوسہ شیطانی اور الہام کے درمیان کیا فرق ہے؟" آپ نے فرمایا کہ "الہام تو یہ ہے کہ جس نے تیرے دل میں یہ آرزو پیدا کی کہ چادر پھاڑ کر ابو سعید کے پاؤں کے گرد لپیٹے تاکہ وہ سردی سے محفوظ ہو جائیں اور شیطانی وسوسہ یہ ہے کہ جس نے تجھے اس نیک کام سے باز رکھا۔" اس قسم کی بکثرت باتیں آپ سے ظہور میں آئی ہیں، جنہیں ہم بخوف طوالت چھوڑ دیتے ہیں، واللہ اعلم۔

چھٹی فصل
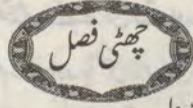
حضرت ابوالفضل محمد بن الحسن ختلی رحمتہ اللہ علیہ

متاخرین رحمہم اللہ میں سے ایک، اوتاد کی زینت اور عابدوں کے شیخ حضرت ابوالفضل محمد بن الحسن ختلی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ طریقت میں میں آپ کی اقتدا کرتا ہوں۔ آپ علم تفسیر اور حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ تصوف میں حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا مذہب رکھتے تھے۔ حضرت حصری رحمتہ اللہ علیہ کے مرید اور راز دار اور ابو عمر قزوینی اور حضرت ابوالحسن بن سالبہ رحمہما اللہ کے ہم عصر۔ آپ پورے ساٹھ سال تک سچی گوشہ نشینی کی وجہ سے پہاڑوں میں بھاگتے پھرے، خلقت سے کنارہ کش رہے اور زیادہ تر کوہ لگام میں قیام رکھتے تھے۔ اچھی عمر پائی تھی۔ آپ کی کرامتیں اور دلیلیں بہت سی ہیں۔ آپ صوفیانہ رسم و لباس کے پابند نہ تھے بلکہ اہل رسم کے ساتھ بہت سختی سے پیش آتے تھے۔ میں نے آپ سے زیادہ باہیبت آدمی کوئی نہیں دیکھا۔ آپ ہی سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: اَلدُّنْیَا یَوْمٌ وَّلَنَا فِیْھَا صَوْمٌ۔ (ترجمہ: دنیا دن ہے اور ہم اس میں روزہ دار ہیں) یعنی ہم اس سے کچھ حصہ نہیں لیتے، نہ اس کی قید میں پھنستے ہیں، اس لیے کہ ہم نے اس کی خرابی کو دیکھ لیا اور اس کے حجابوں سے واقفیت حاصل کر کے اس سے اعراض کر لیا ہے۔ ایک دفعہ میں ان کے ہاتھ دُھلا رہا تھا کہ میرے دل میں خیال آیا کہ جب تمام کام تقدیر اور قسمت پر موقوف ہیں تو آزاد لوگ کرامت کی اُمید پر کیوں اپنے آپ کو پیروں کا غلام بناتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: "اے بیٹا! جو کچھ تو نے خیال کیا، وہ مجھے معلوم ہو گیا۔ جان لے کہ ہر حکم کا ایک سبب ہے۔ جب خدا تعالےٰ چاہتا ہے کہ کسی عام بچے کو تخت و تاج کا مالک بنادے تو پہلے اس کو توبہ کی توفیق بخشتا ہے اور اپنے کسی دوست کی خدمت میں بھیج دیتا ہے تاکہ اس کی یہ خدمت اس کی کرامت کا سبب ہو جائے۔" ایسے ہی بہت سے لطائف ہر روز آپ سے ہم پر ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ جس روز آپ کی وفات ہوئی، آپ بیت الجن میں تھے اور وہ بانیان اور دمشق کے درمیان ایک گھاٹی کے پاس ایک گاؤں ہے۔ آپ نے میری گود میں سر رکھا ہوا تھا اور میرے دل میں لوگوں کی عادت کے مطابق ایک سچے دوست کی جدائی کا بہت رنج تھا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا: "اے بیٹا! میں اعتقاد کا ایک مسئلہ تجھے بتاتا ہوں، اگر تو اپنے آپ کو اس کے مطابق کر لے گا تو سب رنجوں سے چھوٹ جائے گا۔ جان لے کہ سب مقامات و حالات میں خدا تعالےٰ ہی نیک و بد پیدا کرتا ہے۔ اس لیے تجھے اس کے فعل پر نہ کوئی جھگڑا کرنا چاہیے اور نہ دل میں رنج کرنا چاہیے۔" اور اس کے سوا کوئی لمبی وصیت نہ فرمائی اور جان دے دی، واللہ اعلم۔

ساتویں فصل
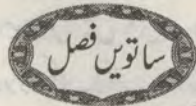
حضرت ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری رحمتہ اللہ علیہ

متاخرین رحمہم اللہ میں سے ایک، اسلام کی زینت اور مسلمانوں کے بزرگ رہنما حضرت ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن قشیری رحمتہ اللہ علیہ۔ آپ اپنے زمانے کے بے مثل اور بلند مرتبہ بزرگ تھے۔ آپ کا حال آپ کی فضیلتیں اہل زمانہ کو معلوم ہیں۔ ہر فن میں آپ کے لطیف اقوال اور محققانہ تصنیفات موجود ہیں۔ خدائے تعالےٰ نے آپ کے حال اور زبان کو فضول باتوں سے محفوظ رکھا تھا۔ ایک دفعہ میں نے سنا کہ آپ فرمارہے ہیں مَثَلُ التَّصَوُّفِ کَعِلَّۃِ

البِرْسَام اَوَّلُهٗ هِذْيَانٌ وَ اٰخِرُهٗ سُكُوْتٌ وَ اِذَا تَمَكَّنَ خَرَسٌ۔ (ترجمہ: تصوف کی مثال برسام کی بیماری جیسی ہے کہ اس کی ابتدا بکواس اور انتہا خاموشی ہے اور جب مضبوط ہو گئی تو بالکل گونگا ہو گیا ہے) پس صفوت کے دو رُخ ہیں: ایک وجد اور دوسری نمود۔ نمود مبتدیوں کے لیے ہے اور وجد منتہی لوگوں کے لیے ہے اور وجد میں وجد کو بیان کرنا محال ہے۔ پس جب تک طالب حق ہوتے ہیں، اپنے قصد کی بلندی کی وجہ سے ناطق ہوتے ہیں اور ہمت و نطق میں اہل آرزو کو ان کا نطق ہذیان معلوم ہوتا ہے اور جب وہ انتہا کو پہنچ جاتے ہیں تو سب باتوں سے چھوٹ جاتے ہیں حتیٰ کہ ان کو بیان کرنے اور اشارہ کرنے کی بھی طاقت نہیں رہتی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مبتدی تھے، آپ کی سب ہمت فقط رویتِ حق تھی، چنانچہ آپ نے اسی قصد کو بیان کرتے ہوئے عرض کیا: رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ۔ (ترجمہ: اے رب! مجھے اپنا دیدار عطا فرما تا کہ میں تیری ذات کو دیکھوں) آپ کا اپنے ارادے کو یوں بیان کرنا مقصود کے نہ پانے کی وجہ سے ہذیان اور بے فائدہ معلوم ہوا اور ہمارے رسول ﷺ چونکہ منتہی اور متمکن تھے، اس لیے جب آپ کی ذات ہمت کے مقام پر پہنچی تو آپ کی ہمت فانی ہو گئی اور آپ نے فرمایا: لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْكَ (ترجمہ: میں تیری ثنا نہیں کرسکتا) یہ منزل بہت بلند اور مقام عالی ہے، واللہ اعلم۔

آٹھویں فصل

حضرت ابوالعباس احمد بن محمد الاشقانی رحمۃ اللہ علیہ

متاخرین رحمہم اللہ میں سے ایک، اپنے وقت میں طریقت کے منفرد امام، حضرت ابوالعباس احمد بن محمد اشقانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ علم اصول و فروع کی تمام انواع میں امام تھے۔ سب طریقت کے تمام مطالب و معانی میں کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ بہت سے مشائخ کو آپ نے دیکھا تھا، بڑے جلیل القدر اہل تصوف میں سے تھے اور اپنے راستے کو مغلق عبارت میں فنا سے تعبیر کرتے تھے اور اسی عبارت میں آپ مخصوص تھے۔ میں نے جاہلوں کے ایک گروہ کو دیکھا کہ وہ آپ کے اس بیان کی تقلید کرتے تھے اور آپ کے مشکل اور مبہم کلمات کو اختیار کر رکھا تھا۔ تقلید تو معنی میں بھی اچھی نہیں ہوتی، بھلا عبارت کی تقلید کیسے درست ہوسکتی ہے۔ مجھے آپ سے بہت انس تھا۔ آپ کو مجھ پر سچی شفقت تھی اور بعض علوم میں آپ میرے اُستاد بھی تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی گروہ میں سے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا کہ اس کے نزدیک آپ سے زیادہ شرع کی تعظیم ہو۔ آپ نے کل مخلوقات سے قطع تعلق کیا ہوا تھا۔ علم اصول میں آپ کی عبارات کی دقت کی وجہ سے محقق امام کے سوا کسی اور کو آپ سے فائدہ نہیں ہوتا تھا اور آپ کی طبیعت ہمیشہ دنیا و عقبیٰ سے متنفر رہتی تھی۔ آپ ہر وقت جوش میں یہی فرمایا کرتے تھے کہ اَشْتَهِیْ عَدَمًا لَّا وُجُوْدَ لَهٗ۔ (ترجمہ: میں وہ عدم چاہتا ہوں جس کے لیے کبھی وجود نہ ہو) اور فارسی میں فرمایا کرتے تھے کہ آدمی کو جیسا ہونا چاہیے، ہو نہیں سکتا اور مجھے بھی جیسا ہونا چاہیے، نہیں ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ نہیں ہو گا اور وہ بات جو میرے لیے ہونی چاہیے، وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ مجھے اس عدم میں لے جائے، جس کے لیے کبھی وجود نہ ہو اس لیے کہ یہ جو کچھ مقامات و کرامات ہیں، یہ سب حجاب و بلا کا محل ہیں اور آدمی اپنے حجاب کا عاشق ہو گیا ہے۔ دیدارِ الٰہی میں بندے کی نیستی حق سے حجاب کی صورت میں آرام سے بہتر ہے اور چونکہ حق جل و علےٰ ایسی ہستی ہے کہ جس پر عدم جائز نہیں، اس لیے اگر میں اس ملک میں نیست ہو جاؤں تو کیا نقصان ہے، کیونکہ اس نیستی کو کبھی ہستی نہ ہو گی اور فنا کی صحت میں یہ اصل بہت قوی ہے، واللہ اعلم۔

نویں فصل

حضرت ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ گرگانی رحمتہ اللہ علیہ

متاخرین رحمہم اللہ میں سے ایک، زمانے کے قطب اور اپنے زمانے میں یکتا حضرت ابوالقاسم بن علی عبداللہ گرگانی رحمتہ اللہ علیہ۔ اللہ آپ سے راضی ہو اور آپ کو بھی راضی کرے اور ہمیں اور سب مسلمانوں کو آپ کی بقاء نفع بخشے۔ آپ اپنے وقت میں بے نظیر اور اپنے زمانے میں بے بدل بزرگ تھے اور آپ کے حال کی ابتدا رُوحانی اعتبار سے بہت اچھی اور بلند ہے۔ طریقت کی خاطر آپ نے کئی کٹھن سفر سخت شرائط کے ساتھ کیے تھے۔ اس وقت تمام اولیاء و صلحا کے دل آپ کی طرف متوجہ تھے اور سب طالبانِ حق کا اعتقاد آپ پر تھا۔ آپ مریدوں کی اُلجھنیں دور کرنے کے لیے ایک ظاہر نشان اور تمام اقسام علوم کے عالم تھے۔ آپ کے مریدوں میں سے ہر ایک زمانے کا سردار ہوا ہے اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء قوم کے پیشوا ہوں گے، انشاء اللہ تعالے۔

غرضیکہ آپ لسان الوقت اور مستجاب الدعا تھے کہ جو فرماتے تھے، وہی ہو جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوعلی ابوالفضل بن محمد الفارندی ابقاہ اللہ، جنہوں نے تمام مخلوق سے اعراض کر کے اپنا حصہ اس بزرگ کے حق میں چھوڑ دیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سردار کی زبانِ حال کی برکت سے سردار بنا دیا ہے۔ ایک دن میں حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور اپنے احوال و مشاہدات آپ کی خدمت میں عرض کر رہا تھا تاکہ آپ کے ذریعے کھوٹے کھرے کی پرکھ ہو جائے کیونکہ آپ وقت کے بہترین نقاد اور کھرا کرنے والے ہیں۔ آپ رحمتہ اللہ علیہ ان باتوں کو بڑی حرمت کے ساتھ سن رہے تھے اور مجھے بچپن کا غرور اور جوانی کی حدت ان باتوں کے ذکر پر اکسا رہے تھے کہ شاید حضرت شیخ کو ابتدا میں اس کوچے سے گزر ہی نہیں ہوا کہ آپ میرے حق میں اتنی عاجزی اور انکسار ظاہر فرما رہے ہیں۔ آپ نے میرے باطن میں یہ خیال دیکھ کر فرمایا: "اے دوست! جان لے کہ میری یہ عاجزی نہ تیرے لیے ہے اور نہ تیرے حال کے لیے کہ اصول کا تبدیل کرنا محال ہے، بلکہ یہ گڑگڑاہٹ میں احوال کے تبدیل کرنے والے مریدوں کو آدابِ صحبت سکھانے کی خاطر کرتا ہوں اور یہ سب طالبانِ حق کے لیے عام ہے۔ نہ خاص تیرے لیے۔" جب میں نے یہ بات سنی تو میں حیران رہ گیا اور آپ نے مجھے دیکھ کر فرمایا: "اے بیٹا! آدمی کو طریقت میں اس سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا کہ جب پیر کسی کو طریقت سے وابستہ کرتے ہیں تو اسے طریقت کے حاصل کر لینے کا غرور پیچھے دھکیل دیتا ہے اور جب اسے طریقت سے معزول کر دیتے ہیں تو وہ اپنے غرور (زعم باطل) کے بیان کرنے میں بھی بند ہو جاتا ہے۔" پس اس کا ماسویٰ اللہ کی نفی کرنا اور ذاتِ حق کا ثابت کرنا بلکہ اپنا عدم و وجود دونوں زعم باطل ہوتے ہیں اور آدمی زعم باطل کی قید سے کبھی نہیں چھوٹتا۔ اس کو چاہیے کہ عبودیت کی درگاہ کو لازم پکڑے اور تمام تعلقات کو سوائے بندگی و فرمانبرداری کے، اپنے سے دُور کر دے اور اس واقعہ کے بعد مجھے آپ سے بہت اسرار معلوم ہوئے اور اگر آپ کی کرامات کے اظہار میں مشغول ہو جاؤں تو اصل مقصود کے بیان کرنے سے قاصر رہ جاؤں گا۔

دسویں فصل

حضرت ابواحمد المظفر بن حمدان رحمتہ اللہ علیہ

متاخرین رحمہم اللہ میں سے ایک ہیں، اولیاء کے رئیس اور اہل صفوت کے ناصح حضرت ابواحمد المظفر بن حمدان

رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے آپ پر مسند ریاست کا طریقت کا دروازہ کھول دیا اور کرامت کا تاج آپ کے سر پر رکھ دیا۔ فنا و بقا کے متعلق آپ کا بیان بہت اچھا اور تعبیر بہت بلند تھی۔ شیخ المشائخ حضرت ابو سعید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ہم بندگی کی راہ سے درگاہِ حق میں پہنچے ہیں اور خواجہ مظفرؒ خداوندی کی راہ سے، یعنی ہم نے مجاہدے سے مشاہدۂ حق حاصل کیا ہے اور آپ مشاہدۂ حق سے مجاہدے کی طرف آئے ہیں۔ میں نے انہی خواجہ مظفر سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جو کچھ دوسرے بزرگوں کو وادیوں اور جنگلوں کے قطع کرنے سے ملا ہے، وہ مجھے مسند اور بالانشینی کے درمیان مل گیا ہے۔ جو لوگ اہل رعونت ہیں، وہ آپ کے اس قول کو خالی دعوےٰ پر محمول کرتے ہیں۔ یہ ان کا قصور فہم ہے کیونکہ اہل معنی کا اپنے حال سے خبر دینا کسی حالت میں بھی خالی خولی دعوےٰ نہیں ہوا کرتا اور آج تک آپ کے نیک اخلاق باقی ہیں۔ بزرگوار خواجہ احمد سلمہ اللہ نے فرمایا کہ ایک روز میں آپ کی خدمت میں آیا۔ اس وقت نیشاپور کے مدعیوں میں سے ایک شخص آپ کے پاس بیٹھا تھا اور وہ اپنے بیان میں کہہ رہا تھا کہ طالب پہلے فانی ہو جائے تب باقی ہوتا ہے۔ خواجہ مظفر نے فرمایا کہ فنا پر بقا کیسے متصور ہو سکتی ہے کیونکہ فنا سے مراد نیستی ہے اور بقا کا اشارہ ہستی کی طرف ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک دوسری بات کی نفی کرنے والی ہے۔ پس فنا معلوم ہے لیکن جب یہ فنا نیست ہے۔ پس اگر یہ ہست ہو جائے وہ عین نہیں ہو گی بلکہ کوئی اور ہی کوئی چیز ہو گی اور جائز نہیں کہ ذاتیں یعنی اصل اشیاء فنا ہو جائیں لیکن صفت اور سبب کا فنا ہونا جائز ہے۔ پس جب سبب و صفت فنا ہو جائے تو موصوف و مسبب رہ جاتا ہے، کیونکہ اس کی ذات پر فنا درست نہیں ہوتی۔

میں علی بن عثمان جلابی کہتا ہوں کہ حضرت خواجہ مظفر رحمتہ اللہ علیہ کی عبارت تو مجھے بعینہ یاد نہیں لیکن مطلب ان کا یہی تھا جو میں نے اس عبارت میں بیان کر دیا اور اس عبارت کی مراد مزید واضح کر دیتا ہوں تاکہ زیادہ عام فہم ہو جائے۔ پس اس سے مراد یہ ہے کہ بندے کا اختیار اس کی صفت ہے اور وہ اپنے اختیار کی وجہ سے حق تعالےٰ کے اختیار سے حجاب میں ہے۔ پس بندے کی صفت حق تعالےٰ سے اس کا حجاب ہے اور لامحالہ اختیارِ حق ازلی[1] ہے اور اختیارِ بندہ حادث[2] اور ازلی پر فنا روا نہیں اور جب اختیار حق تعالےٰ بندے کے حق میں بقا پالے تو لامحالہ خود اس بندے کا اختیار فانی ہو گا اور تصرف منقطع ہو جائے گا، واللہ اعلم۔ ایک روز میں موسم گرما میں آپ کے پاس سفر کا لباس پہنے تھکا ماندہ حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا: ''اے ابوالحسن! مجھے بتاؤ اس وقت تمہارا ارادہ کیا ہے؟'' میں نے عرض کیا: ''اس وقت مجھے سماع کی ضرورت ہے۔'' آپ نے اسی وقت آدمی بھیج کر ایک قوال اور اہل عشرت[3] کی ایک جماعت کو بلایا اور ابتدا ہی میں مجھے بچپن کے جوش و ارادے اور سوزشِ محبت کی قوت نے ان کے کلمات سننے میں بے قرار کر دیا۔ جب کچھ وقت گزر گیا اور اس آفت کا جوش و غلبہ مجھ پر کسی قدر کم ہوا تو آپ نے مجھ سے فرمایا کہ ''یہ سماع تیرے لیے کیسا رہا؟'' میں نے کہا: ''اے شیخ! میں بہت خوش ہوا۔'' آپ نے فرمایا: ''ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ راگ اور کوے کی آواز تیرے لیے یکساں ہو گی، کیونکہ سماع کی قوت اسی وقت ہوتی ہے کہ مشاہدہ حق نہ ہو، جب مشاہدہ حاصل ہو جائے تو سماع کی قوت معدوم ہو جاتی ہے۔ دیکھو اس سماع کو اپنی عادت نہ بنا لینا کہ یہ طبیعت ثانیہ ہو جائے اور اس کی وجہ سے تم اصل مقصود سے باز رہ جاؤ۔'' واللہ اعلم بالصواب۔

---

[1] قدیم، جو فنا کو قبول نہ کرے۔ [2] نو پیدا، فنا کو قبول کرنے والا [3] اصحاب ذوق و سماع

تیرھواں باب

متاخرینِ صوفیا کرام کا مختصر حال

اگر میں ان سب صوفیا کرام کا حال اس کتاب میں بیان کروں، جو مختلف شہروں میں اللہ تعالےٰ کے بندوں کی اصلاح کرنے میں مشغول ہیں تو یہ کتاب طویل ہو جائے گی اور اگر بعض صوفیا کا حال چھوڑ دوں تو کتاب کا مقصد پورا نہ ہوگا۔ بنا بریں میں اہل رسوم کو چھوڑ کر اپنے عہد کے فقط ان صوفیا اور مشائخ کے مختصر حالات اس کتاب میں درج کرتا ہوں، جوار بابِ معانی اور محرم اسرارِ ربانی ہیں تاکہ اگر خدا کو منظور ہو تو اپنی مراد کے حصول سے زیادہ قریب ہو جاؤں۔ (چنانچہ ان کے نام یہ ہیں):

۱۔ متاخرین صوفیا اہل شام و عراق

۱۔ شیخ زکی بن العلاؒ۔ آپ اپنے وقت کے بزرگ مشائخ اور سرداروں میں سے تھے۔ میں نے آپ کو آتش محبت کے شعلوں میں سے ایک شعلے کی طرح پایا ہے۔ آپ کی کرامتیں اور دلیلیں ظاہر تھیں۔

۲۔ شیخ بزرگوار ابوجعفر محمد بن المصباح الصیدلانیؒ۔ آپ اہل تصرف کے رئیسوں میں سے تھے۔ تحقیق معارف میں آپ کو کافی دسترس حاصل تھی۔ زبان بہت اچھی تھی اور حسین بن منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ میں نے آپ کی بعض تصانیف آپ ہی سے پڑھی تھیں۔

۳۔ ابوالقاسم سدسی رحمتہ اللہ علیہ۔ آپ بڑے با مجاہدہ پیر اور نیک حال بزرگ تھے۔ درویشوں کے محافظ اور ان کے حق میں بہت اچھا اعتقاد رکھتے تھے۔

۲۔ متاخرین اہل فارس

۱۔ شیخ الشیوخ بوالحسن بن سالبہؒ۔ تصوف میں نہایت فصیح زبان اور توحید میں آپ کا بیان نہایت واضح ہے۔ آپ کے اقوال معروف و مشہور ہیں۔

۲۔ شیخ مرشد ابواسحاق بن شہریارؒ۔ آپ باحشمت صوفیا میں سے تھے اور پورا پورا انتظامی ملکہ رکھتے تھے۔

۳۔ شیخ طریقت ابوالحسن علی بکرانؒ صوفی بزرگوں میں سے تھے۔

۴۔ شیخ ابومسلم ہرویؒ نادر الوقت اور نیک حال بزرگ تھے۔

۵۔ شیخ ابوالفتح اپنے والد کے نیک لڑکے اور بلند درجات کے اُمیدوار تھے۔

۶۔ شیخ ابوطالبؒ۔ آپ کلماتِ حق کے گرفتار تھے اور ان میں سے ایک شیخ الشیوخ ابواسحاق ہیں، جنہیں میں نے نہیں دیکھا ہے۔

۳۔ صوفیائے اہل قہستان و آذر بائیجان و طبرستان

۱۔ شیخ شفیق فرخ معروف بہ اخی زنجانیؒ۔ آپ بہت نیک سیرت اور پسندیدہ طریقت بزرگ تھے۔

۲۔ شیخ وندری ہیں، جو اس گروہ کے بزرگوں میں سے ہوئے ہیں۔ آپ کے نیک کام بہت ہیں۔
۳۔ پادشاہ تائبؒ۔ آپ راہِ حق میں بہت بہت تیز گام بزرگ تھے۔
۴۔ شیخ ابو عبداللہ جنیدیؒ۔ آپ بڑے نرم دل اور محترم بزرگ تھے۔
۵۔ شیخؒ ابو طاہر مکشوف اپنے وقت کے بڑے بزرگوں میں سے تھے۔
۶۔ خواجہ حسین سمنانیؒ۔ محبتِ حق میں گرفتار اور سعادت کے اُمیدوار بزرگوار تھے۔
۷۔ شیخ سہلکیؒ بڑے درویش صوفیوں میں سے تھے۔
۸۔ احمد پسر شیخ خرقانیؒ۔ اپنے باپ کے نیک جانشین تھے۔
۹۔ ادیب گندمی۔ آپ زمانے کے سرداروں میں سے ہوئے ہیں۔

۴۔ اہل کرامان میں سے صوفیائے متاخرین

۱۔ خواجہ علی الحسن السیر کائیؒ۔ وقت کے سیاح ہوئے ہیں اور بہت اچھے سفر کیے ہیں۔
۲۔ حکیم پسر خواجہ علیؒ ایک نادر بزرگ ہیں۔
۳۔ شیخ محمد بن سلمہؒ۔ وقت کے بزرگوں میں سے ہوئے ہیں، علاوہ ازیں اللہ عزوجل کے اولیاء میں سے بزرگ پوشیدہ ہوئے ہیں اور کچھ جوان اور نوخیز اُمیدوار بھی ہیں۔

۵۔ اہل خراسان کے متاخرین صوفیا

۱۔ شیخ مجتہد ابو العباس وامغانیؒ۔ آپ کا وقت خوش اور زندگی خوب تھی۔
۲۔ خواجہ ابو جعفر محمد بن علی الجوینیؒ۔ آپ اس گروہ کے بزرگوں اور محققین میں سے ہوئے ہیں۔
۳۔ خواجہ ابو جعفر ترشیرازیؒ۔ آپ وقت کے عزیزوں میں سے تھے۔
۴۔ خواجہ محمود نیشاپوریؒ وقت کے پیشوا تھے۔ آپ کی زبان طریقت کے بیان میں بہت اچھی تھی۔
۵۔ شیخ محمد معشوقؒ۔ آپ کی زندگی اور وقت بہت اچھا تھا۔ آپ عشق الٰہی کی چنگاری، نیک باطن، خوش و خرم رہنما تھے۔
۶۔ خواجہ رشید پسر شیخ ابو سعیدؒ۔ اُمید ہے کہ آپ قوم کے پیشوا اور دلوں کے قبلہ ہوں گے۔
۷۔ خواجہ احمد خادی سرختیؒ۔ آپ وقت کے مردِ میدان ہوئے ہیں اور ایک مدت تک میرے رفیق رہے ہیں۔ میں نے آپ کی بہت سی عجیب باتیں دیکھی ہیں۔ آپ صوفی جوانمردوں میں سے ایک ہیں۔
۸۔ شیخ احمدؒ نجار سمرقندی، جو مرو میں مقیم تھے اور اپنے زمانے کے بادشاہ تصوف تھے۔
۹۔ شیخ ابو الحسن علی بن علی الاسودؒ۔ آپ اپنے باپ کے سچے جانشین اور علو ہمت و صدق و فراست میں اپنے زمانے میں یگانہ تھے۔

اب اگر اہلِ خراسان میں سے سب بزرگوں کو شمار کروں تو کتاب طویل ہو جائے گی۔ میں نے تین سو صوفی مرد خراسان میں ایسے دیکھے ہیں کہ ہر ایک ان میں سے ایک خاص مشرب رکھتا تھا اور ان میں سے

ایک شخص بھی سارے عالم کے لیے کافی تھا۔ یہ سب اس لیے ہے کہ محبتِ الٰہی کا آفتاب اور طریقت کا اقبال خراسان کے آسمان سے جلوہ تاباں کرتا رہا ہے۔

۶۔ اہل ماوراء النہر میں سے صوفیائے متاخرین

۱۔ خواجہ امامؒ۔ آپ خواص و عوام میں مقبول تھے۔
۲۔ ابو جعفر محمد الحسینؒ حرمی۔ آپ کلماتِ حق کے سننے والے اور محبت حق میں گرفتار مرد تھے۔ آپ کی ہمت عالی اور وقت صاف تھا اور درگاہِ حق کے طالبان پر کامل شفقت رکھتے تھے۔
۳۔ خواجہ فقیہہ ابو محمد بالغزیؒ ہیں جو اپنے اصحاب میں نہایت باعزت تھے۔ آپ کا حال بہت اچھا اور معاملات بہت قوی تھے۔
۴۔ احمد ابلانیؒ جو وقت کے شیخ، زمانے کے بزرگ اور رسوم و عادات کے تارک تھے۔
۵۔ خواجہ عارفؒ ہیں جو وقت کے یگانہ اور اپنے زمانے میں بے نظیر تھے۔
۶۔ علی بن اسحاقؒ ہیں، جو اپنے زمانے کے سردار اور باحشمت بزرگ تھے۔ آپ کی زبان بہت اچھی تھی۔
یہ نام صوفیا کے اور اہل حقیقت کے اس گروہ کے ہیں جن کو میں نے دیکھا ہے اور ہر ایک کے مقام کو میں نے معلوم کیا ہے اور یہ سب بزرگ اہلِ تحقیق میں سے ہوئے ہیں۔

۷۔ اہل غزنی میں سے متاخرین صوفیا

۱۔ شیخ عارف ابوالفضل بن الاسدیؒ۔ اپنے زمانے میں صاحب انصاف اور بڑے بزرگ رہنما ہوئے ہیں۔ آپ کی دلیلیں ظاہر اور آپ کی کرامتیں روشن ہیں۔ آپ آتش محبت الٰہی کا ایک شعلہ تھے اور اپنے زمانے میں بالکل گمنام تھے۔
۲۔ شیخ علائق اسمٰعیل الشاشؒ۔ آپ دنیا سے کنارہ کش اور باحشمت رہنما تھے اور سلامتی کے طریق پر چلتے تھے۔
۳۔ شیخ سالار طبریؒ صوفی علماء میں سے تھے اور طریقت میں بہت اچھے حال کے مالک تھے۔
۴۔ شیخ ابو عبداللہ محمد بن الحکیم المعروف بہ مریدؒ ہیں۔ آپ بڑے ہوشیار، اسرار کے معدن اور درگاہِ حق کے مستوں میں سے تھے اور طریقت میں ثانی نہ رکھتے تھے۔ آپ کا حال لوگوں سے پوشیدہ تھا۔ آپ کی دلیلیں ظاہر، کرامتیں روشن اور صحبت میں آپ کا حال دیدار سے بہتر تھا۔
۵۔ شیخ سعید بن ابی سعیدؒ جو سب سے زیادہ محترم بزرگ ہیں۔ آپ پیغمبر ﷺ کی حدیث کے حافظ تھے۔ عمر بہت طویل پائی تھی اور بہت سے مشائخ کو دیکھا تھا۔ آپ بہت قوی حال اور باخبر بزرگ تھے۔ اپنا بھید کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے۔
۶۔ خواجہ بزرگوار ابوالعلاء عبدالرحیم بن احمد السعدیؒ ہیں۔ آپ حرمت و وقار کی بنیاد، قوم کے عزیز اور وقت کے سردار تھے۔ میرا دل آپ سے بہت خوش ہے۔ آپ کا وقت مہذب، حال اچھا اور تمام علوم سے واقف تھے۔
۷۔ شیخ یگانہ قسورۃ بن محمد الجردیزیؒ۔ آپ اہل طریقت سے پوری شفقت رکھتے تھے اور ہر ایک دل میں آپ

کی بہت عزت ہے۔ آپ نے بہت سے مشائخ کو دیکھا ہے اور عوام اور اس شہر کے علماء کے اعتقادات کے مطابق میں بہتر اُمید رکھتا ہوں کہ آپ کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوں گے کہ ہمیں ان سے اعتقاد ہو گا اور یہ پراگندہ حال لوگوں کا گروہ جو اس شہر میں راہ پا گئے ہیں اور انہوں نے اس طریق کی صورت کو قبیح کر دیا ہے، وہ اس شہر سے مٹ جائیں گے اور یہ شہر اولیاء اور بزرگوں کی قیام گاہ بن جائے گا۔

اب ہم ان فرقوں کا مذاہب کے فرق بیان کریں گے، واللہ اعلم بالصواب۔

چودھواں باب

صوفیا کے فرقوں کا باہمی فرق

اس سے پہلے حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں نے ضمناً بیان کیا تھا کہ صوفیوں کے بارہ گروہ ہیں۔ دو گروہ ان میں سے مردود اور دس گروہ مقبول ہیں۔ ان دس گروہوں میں سے ایک گروہ کا عمل اور طریقہ مجاہدات میں اچھا ہے اور ان کے آداب مشاہدات میں بھی بہت ہی عمدہ ہیں، اگرچہ یہ گروہ مجاہدات، معاملات اور ریاضات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن شریعت و توحید کے اصول و فروع میں سب موافق ہیں چنانچہ حضرت بایزیدؒ نے فرمایا ہے: اِخْتِلَافُ الْعُلَمَاءِ رَحْمَةٌ اِلَّا فِی تَجْرِیْدِ التَّوحِیْدِ۔ (ترجمہ: سوائے توحید خالص کے علماء کا باہمی اختلاف رحمت ہے) اور اسی حکم کے موافق ایک حدیث بھی مشہور ہے۔ غرض یہ کہ تصوف کی حقیقت حقیقی، مجازی اور رسمی طور پر ان مختلف مشائخ کے حالات میں کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہے۔ میں اختصار و ایجاز کے طور پر ان مشائخ کے کلام کو تصوف کے بیان میں تقسیم کر دیتا ہوں اور اہل مذہب ہر ایک کے لیے عزت کا مقام متعین کرتا ہوں تاکہ طالبِ حقیقی کو اس کا علم حاصل ہو جائے اور علماء کے لیے ہتھیار، مریدوں کے لیے نیکی اور عاشقانِ الٰہی کے لیے کامیابی اور عقل مندوں اور صاحب مروّت لوگوں کے لیے تنبیہ اور خود میرے لیے دو جہاں کا ثواب ہو اور توفیق اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

پہلی فصل
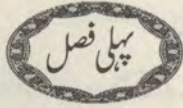
فرقۂ محاسبیہ اور ان کے متعلقہ اُمور

محاسبی فرقہ کے لوگ حضرت ابوعبداللہ حارث بن الاسد محاسبی رضی اللہ عنہ سے نسبت رکھتے ہیں اور آپ تمام اہل زمانہ کے اتفاق سے مقبول و مقتولِ نفس بزرگ تھے۔ علم اصول و فروع اور حقائق کے عالم بے بدل تھے۔ آپ کا کلام ظاہری و باطنی عمل کی صحت کے ساتھ ساتھ خالص توحید سے متعلق تھا اور طریقت میں آپ کی نادر بات یہ ہے کہ وہ رضا کو طریقت کے مقامات میں سے کوئی مقام شمار نہیں کرتے تھے اور آپ کے بعد اس قول کو اہل خراسان نے لے لیا اور اسی پر عمل پیرا ہے۔ صوفیان کرام کہتے ہیں کہ رضا منجملہ مقامات کے ہے اور یہ توکل کی انتہا ہے اور آج تک یہ اختلاف ان دونوں گروہوں میں چلا آ رہا ہے۔ اب اللہ تعالےٰ نے چاہا تو ہم اس قول کو بیان کرتے ہیں، لیکن ان مذاہب کے بیان میں مناسب ہے کہ پہلے ہم رضا کی حقیقت بیان کریں، اس کی اقسام لکھیں اور پھر حال و مقام کی حقیقت اور ان کے فرق کو بیان کریں۔

پہلی بحث

رضا کی حقیقت

جاننا چاہیے کہ کتاب اور سنت رضا کے اثبات پر ناطق ہیں اور اُمت کا اس بات پر اتفاق ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ۔ (ترجمہ: اللہ تعالےٰ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے) نیز فرمایا ہے: لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْیُبَا یِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ (ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ مومنین سے راضی

ہوا، جب وہ آپ (ﷺ) سے اس درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے) اور پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: ذَاقَ طُعْمَ الْاِیْمَانِ مَنْ رَضِیَ بِاللّٰہِ رَبًّا۔ (ترجمہ: ایمان کا مزہ اس نے چکھا، جو اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر راضی ہوا)۔

رضا کی قسمیں

رضا دو قسم کی ہوتی ہے: (اول) خداوند تعالےٰ کا بندہ سے راضی ہونا (دوم) بندہ کا خدا تعالیٰ سے راضی ہونا۔ رضائے الٰہی کی حقیقت بندہ کے لیے ثواب و نعمت و کرامت عطا کرنے کا ارادہ کرنا ہے اور رضائے بندہ کی حقیقت خدا تعالیٰ کے فرمان پر ثابت قدم ہونا اور اس کے حکم کی تعمیل کے لیے سر تسلیم خم کر دینا ہے۔ پس رضائے الٰہی رضائے بندہ پر مقدم ہے، کیونکہ جب تک توفیق الٰہی نہ ہو، بندہ اس کے حکم کی تعمیل نہیں کرسکتا اور نہ اس کے حکم پر ثابت قدم رہ سکتا ہے اس لیے کہ بندے کی رضا، رضائے حق تعالیٰ سے وابستہ ہے اور اس کا قیام اس کی ذات سے ہے۔ فی الجملہ بندے کی رضا یہ ہے کہ اس کا دل قضائے الٰہی کی دونوں طرفوں سے، خواہ قضائے منع ہو خواہ قضائے عطا ہو، یکساں طور پر مطمئن اور راضی ہو اور اس کا باطن احوال کے دیکھنے سے، خواہ وہ جمالی ہوں خواہ جلالی، مستقیم اور قائم ہو۔ چنانچہ اگر قضائے الٰہی کسی چیز کے عطا نہ کرنے پر ٹھہر جائے یا اس کے عطا کرنے پر سبقت کرے تو بندے کی رضا میں دونوں باتیں مساوی ہوں (یعنی اس کا دل دونوں حالتوں میں برابر راضی رہے) اور اگر ہیبت و جلالِ الٰہی سے وہ جل جائے یا نور و لطفِ جمالِ حق سے روشن ہو جائے تو یہ روشن ہونا اور جلنا اس کے نزدیک یکساں ہو، کیونکہ وہ اس وقت حق کا مشاہدہ کرنے والا ہے اور جو کچھ اس کی ذات سے مشاہدہ میں آئے، اس کے لیے وہی بہتر ہے۔

چنانچہ حضرت امیر المومنین حسین بن علی کرم اللہ وجہما سے لوگوں نے حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کے اس قول کے متعلق پوچھا جو انہوں نے کہا ہے کہ اَلْفَقْرُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنَ الْغِنَاءِ وَ السُّقْمُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنَ الصِّحَۃِ۔ (ترجمہ: فقیری میرے نزدیک دولت مندی سے اور بیماری، تندرستی سے بہتر ہے) تو امام علیہ السلام نے فرمایا: رَحِمَ اللّٰہُ اَبَاذَرٍّ اَمَّا اَنَا فَاَقُوْلُ مَنْ اَشْرَفَ عَلٰی حُسْنِ اخْتِیَارِ اللّٰہِ لَہٗ لَمْ یَتَمَنَّ غَیْرَ مَا اخْتَارَ اللّٰہُ لَہٗ۔ (ترجمہ: اللہ تعالےٰ ابوذر پر رحم فرمائے لیکن میں تو کہتا ہوں کہ جس نے اپنے متعلق حق تعالیٰ کے اختیار کی خوبی کو آنکھ اٹھا کر دیکھ لیا ہے، وہ اس امر کے سوا جو اللہ تعالےٰ نے اس کے لیے اختیار فرمایا ہے، کسی اور امر کی تمنا ہی نہیں کرتا) اور جب بندے نے حق تعالیٰ کے اختیار کو مدنظر رکھا اور اپنے اختیار سے اعراض کیا تو وہ سب غم و اندوہ سے چھوٹ گیا اور یہ بات حق سے دُوری کی صورت میں درست نہیں ہوتی کیونکہ اس کے لیے حضورِ حق کی ضرورت ہے: لِاَنَّ الرِّضَا لِلْاَحْزَانِ نَافِیَۃٌ وَّلِلْغَفْلَۃِ مُعَالِجَۃٌ شَافِیَۃٌ۔ (ترجمہ: کیونکہ رضا بقضائے الٰہی غموں کو دُور کرنے والی اور غفلت کا شافی علاج ہے) یعنی رضا بقضائے الٰہی آدمی کو غموں سے رہائی دلاتی ہے، غفلت کے پنجے سے چھڑاتی ہے، غیر کا خیال دل سے دُور کرتی اور مصیبتوں کے بند سے آزاد کرا دیتی ہے کیونکہ رضا کی صفت رہائی دلانا ہے، لیکن رضا کی اصل حقیقت یہ ہے کہ بندہ اس بات پر یقین رکھے کہ کسی چیز کا دینا اور نہ دینا اللہ تعالےٰ کی مشیت و ارادے سے ہے اور اس بات کا بھی اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالےٰ سب احوال میں اس کو دیکھتا ہے اور ایسے اعتقاد رکھنے والے اہل رضا چار گروہ میں منقسم ہیں:

۱۔ وہ جو معرفت الٰہی پر راضی ہیں،

۲۔ وہ جو دنیا کی آسائشوں اور گوناگوں نعمتوں پر راضی ہیں،

۳۔ وہ جو دنیا کی آزمائشوں اور مصائب و آلام پر راضی ہیں، اور

۴۔ وہ جو ہمہ وقت حق تعالےٰ کی محبت اور دیدار میں مست رہتے ہیں۔

پس جو شخص عطا کرنے والے کو ملحوظ خاطر رکھنے کی وجہ سے عطا کو دیکھتا ہے، وہ اس کو سچے دل سے قبول کر لیتا ہے اور جب سچے دل سے قبول کر لیتا ہے تو تکلیف اور مصیبت اس کے دل سے دور ہو جاتی ہے اور جو شخص عطا کو ملحوظ رکھ کر عطا کرنے والے کو دیکھتا ہے، وہ عطا میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے اور بڑی تکلیف سے رضا کے راستے پر چلتا ہے کیونکہ تکلیف میں جو کچھ ہے، وہ رنج و مشقت ہی ہے اور معرفت اس وقت حقیقت کی صورت اختیار کرتی ہے جب بندہ معرفت کی وجہ سے حق تعالےٰ کا مشاہدہ کرنے والا ہو اور اگر معرفت اس کے لیے حق تعالےٰ سے رُکاوٹ اور حجاب کا باعث ہو تو وہ معرفت ناشناسائی ہوتی ہے اور وہ نعمت عذاب اور وہ عطا پردہ ہو جاتی ہے۔

وہ شخص جو خدا تعالےٰ سے دنیا پر راضی ہوتا ہے، وہ خسارے میں رہتا ہے اور اس کی یہ رضا آتش دوزخ کا موجب ہو جاتی ہے، اس لیے کہ پوری کی پوری دنیا بھی اس لائق نہیں کہ دل اس سے لگایا جائے یا اس کے غم کا بار دل پر ڈالا جائے۔ نعمت اس وقت نعمت ہوتی ہے کہ انعام کرنے والے کی طرف رہنمائی کرے اور جب وہ منعم ہی سے باعث حجاب ہو تو پھر وہ نعمت بلا ہو جاتی ہے اور وہ شخص جو خدائے تعالیٰ سے بلا پر راضی ہوتا ہے، وہ وہ شخص ہے جو بلا میں بھی بلا نازل کرنے والے کو دیکھے اور اس بلا کی تکلیف کو (بلائیں ڈالنے والے کے) مشاہدہ سے برداشت کر سکے، کیونکہ بلا کی تکلیف مشاہدے کی خوشی میں تکلیف ہی نہیں رہتی اور وہ شخص جو حق تعالےٰ سے برگزیدگی پر راضی ہوتا ہے، وہ عاشق الٰہی ہے کہ رضا و غضب میں اس کی ہستی عارضی ہوتی ہے اور اس کا دل معرفت رب العزت کے سوا اور کسی کی فرودگاہ نہیں ہوتا اور اس کے بطن کا خیمہ انس الٰہی کے باغ کے سوائے کہیں نہیں ہوتا۔ یہ دربارِ حق کے وہ مقرب ہیں جو ماسوااللہ سے غائب اور خلقت سے بیگانہ، عرش کے مکین، پیکر نورانی، حق کے موحد، خلقت سے جدا، مقامات و احوال کی حدود سے نکلے ہوئے، باطن کو مخلوق سے روکے ہوئے، حق کی محبت میں کمر باندھے ہوئے، اللہ تعالےٰ کے لطف و کرم کے لیے سرتاسر انتظار بنے بیٹھے ہیں، چنانچہ اللہ تعالےٰ نے ان کے متعلق ارشاد فرمایا ہے: لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا وَّ لَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا۔ (ترجمہ: وہ اپنے نفسوں کے لیے نہ تو نفع اور نقصان کے مالک ہیں اور نہ موت و حیات اور نہ دوبارہ اٹھائے جانے کا اختیار رکھتے ہیں) پس اللہ تعالےٰ کے سوا کسی اور چیز کے لیے رضا خسارہ ہے اور رضا باعث رضوان الٰہی ہے، اس لیے کہ غیر سے راضی ہونا بڑی ہلاکت ہے اور حق تعالےٰ پر راضی ہونا صریح سعادت ہے، جس سے آخرت کی عافیت ملتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: مَنْ لَّمْ يَرْضَ بِاللّٰهِ وَبِقَضَائِهٖ شَغَلَ قَلْبَهٗ وَ تَعَبَ بَدَنَهٗ (ترجمہ: جو شخص اللہ تعالےٰ اور اس کی قضا پر راضی نہیں تو وہ اپنے دل کو اسباب میں مشغول رکھتا ہے اور اپنے جسم کو ان اسباب کی تلاش کی وجہ سے رنج میں ڈالتا ہے)۔

دوسری بحث

رضا کے متعلق مشائخ کے اقوال

حدیث میں آیا ہے کہ حضرت موسےٰ علیہ السلام نے دعا کی: اَللّٰهُمَّ دُلَّنِيْ عَلٰى عَمَلٍ اِذَا عَمِلْتُ رَضِيْتَ عَنِّيْ۔ (ترجمہ: اے اللہ! مجھے ایسا عمل بتا دے جس کے کرنے سے تو مجھ سے راضی ہو جائے) فَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى

اِنَّكَ لَاتَطِيْقُ ذَالِكَ يٰمُوْسٰى فَخَرَّ مُوْسٰى سَاجِدًا مُتَضَرِّعًا فَاُوْحِىَ اللّٰهُ اِلَيْهِ يَا ابْنَ عِمْرَانِ رِضَائِىْ فِىْ رُضَاءِ كَ بِقَضَائِىْ۔ (ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! تو اس بات کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔ پس موسیٰ علیہ السلام سجدے میں گر کر گریہ و زاری کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی کہ عمران کے بیٹے! میری رضا میری قضا پر تیرے راضی ہونے میں ہے) مطلب یہ کہ جب بندہ قضائے الٰہی پر راضی ہو جائے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے۔

حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ زہد زیادہ فضیلت والا ہے یا رضا؟ حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اَلرِّضَاءُ اَفْضَلُ مِنَ الزُّهْدِ لِاَنَّ الرَّاضِىَ لَا يَتَمَنّٰى فَوْقَ مَنْزِلَتِهٖ۔ (ترجمہ: رضا زہد سے افضل ہے، کیونکہ راضی بقضا اپنی منزل سے اوپر کسی اور بات کی تمنا نہیں کرتا ہے اور زاہد تمنا کرتا ہے) یعنی زہد کی منزل کے بعد اور بھی منزل ہوتی ہے جس کی زاہد تمنا کرتا ہے اور رضا کے اوپر اور کوئی نہیں کہ راضی بقضا اس کی تمنا کرے۔ پس پیش گاہ درگاہ سے افضل ہے اور یہ حکایت حضرت محاسبی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی صحت پر دلیلِ واضح ہے کہ رضا منجملہ احوال و موہبات الٰہیہ سے ہے۔ اس کا حصول کسب و محنت سے ممکن نہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ راضی کی کوئی تمنا نہیں ہوتی۔ پیغمبر ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے دعا میں سوال کیا: اَسْئَلُكَ الرِّضَا بَعْدَ الْقَضَاءِ۔ (ترجمہ: اے اللہ! میں قضا کے آ جانے پر تجھ سے تیری رضا کی درخواست کرتا ہوں) یعنی مجھے وہ حالت عطا کر جب تیری طرف سے کوئی قضا آئے تو وہ مجھے راضی برضا پائے اور یہ بات صحیح ہوگئی کہ رضا قضا کے وارد ہونے سے پہلے درست نہیں کیونکہ قضا کے آنے سے پہلے رضا کو قبول کر لینے کے لیے عزم تو ہوتا ہے مگر خود رضا نہیں ہوتی۔ رضا کیا ہے؟ دل کا اللہ تعالیٰ کی اس ازلی اختیار کو دیکھ لینا ہے جو اسے اپنے بندے پر حاصل ہے۔

حضرت ابوالعباس بن عطار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلرِّضَا نَظَرُ الْقَلْبِ اِلٰى قَدِيْمِ اخْتِيَارِ اللّٰهِ لِلْعَبْدِ یعنی جو مصیبت اس پر پہنچے جان لے کہ وہ خداوند تعالیٰ کا میرے حق میں ازلی ارادہ اور حکم ہے، اس پر بے چین نہ ہو، خوشدل رہے اور حضرت حارث محاسبیؒ صاحبِ طریقہ فرماتے ہیں: اَلرِّضَاءُ سُكُوْنُ الْقَلْبِ تَحْتَ مَجَارِىْ الْاَحْكَامِ۔ (ترجمہ: رضا احکام الٰہی کے جاری ہونے پر دل کا ساکن اور مطمئن رہنا ہے) اور اس بارے میں آپ کا یہ نظریہ بہت عمدہ ہے، اس لیے کہ سکون و اطمینانِ قلب بندے کی محنت اور کسب سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ حق تعالیٰ کی موہبات سے ہے اور اس بات پر دلیل ہے کہ رضا احوال میں سے ہے نہ مقامات میں سے۔ کہتے ہیں کہ عتبۃ الغلام رحمۃ اللہ علیہ رات بھر نہ سوئے اور صبح تک یہ کہتے رہے۔ اِنْ تُعَذِّبْنِىْ فَاَنَالَكَ مُحِبٌّ وَ اِنْ تَرْحَمْنِىْ فَاَنَالَكَ مُحِبٌّ۔ (ترجمہ: اے اللہ! اگر تو مجھے عذاب دے تو بھی میں تجھ سے محبت کرتا ہوں اور اگر تو مجھ پر رحم کرے تو بھی میں تجھ سے محبت کرتا ہوں) یعنی عذاب کی تکلیف اور آرام کی لذت جسم پر ہوتی ہے اور محبت کی بے قراری دل میں ہوتی ہے اور ظاہری تکلیف اس محبت کو کچھ نقصان نہیں دیتی۔ یہ بات بعینہٖ حضرت محاسبیؒ کے قول کی تائید ہے کیونکہ رضا محبت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس طرح محبت کرنے والا اس بات پر راضی ہوتا ہے جو محبوب کرے، اگر محبوب اس کو عذاب میں رکھے تو وہ باوجود دوستی کے محبوب سے حجاب میں نہیں ہوتا، بلکہ خوش ہوتا ہے اور اگر وہ اس کو نعمت میں رکھے تو بھی دوستی کی وجہ سے اس محبوب سے حجاب میں نہیں ہوتا اور اپنے اختیار کو حق تعالیٰ کے اختیار کے مقابلے میں ہیچ سمجھتا ہے۔

حضرت ابو عثمان حیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مُنْذُ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً مَا اَقَامَنِىَ اللّٰهُ فِىْ حَالٍ فَكَرِهْتُهٗ وَ

مَا نَقَلَنِیْ اِلٰی غَیْرِہٖ فَسَخِطْتُہٗ۔ (ترجمہ: چالیس سال سے اللہ تعالےٰ نے مجھے جس حال میں رکھا میں نے اس کو ناپسند نہیں کیا اور اگر اس حال سے کسی اور حال میں تبدیل کیا تو بھی میں نے برا نہیں مانا)۔ یہ بات رضا کے دوام اور محبت الٰہی کے کمال کی طرف اشارہ ہے۔

حکایات میں مشہور ہے کہ ایک درویش، جو تیرنا نہیں جانتا تھا دریائے دجلہ میں گر پڑا۔ کنارے پر سے ایک شخص نے پوچھا کہ "کیا تو چاہتا ہے کہ میں کسی شخص کو آگاہ کردوں تاکہ وہ تجھے باہر نکال دے؟" اس نے کہا: "نہیں۔" اس آدمی سے کہا: "کیا تو چاہتا ہے کہ غرق ہو جائے؟" درویش نے کہا: "نہیں۔" اس آدمی نے کہا: "پھر تو کیا چاہتا ہے؟" درویش نے کہا: "جو خدا چاہتا ہے۔" رضا کے متعلق مشائخ کرام کی بہت سی حکیمانہ باتیں ہیں۔ الفاظ گو ان کے مختلف ہیں لیکن بنیادی باتیں یہی دو ہیں جو میں نے بیان کر دیں۔ ہاں میں یہاں پھر مناسب سمجھتا ہوں کہ حال و مقام میں فرق بیان کر کے ان کی حدود متعین کر دوں تاکہ تمہیں اور دوسرے پڑھنے والوں کو ان کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے، وباللہ التوفیق۔

تیسری بحث

مقام و حال کے درمیان فرق

جاننا چاہیے کہ حال و مقام دو لفظ صوفیا کے ہاں زیادہ مستعمل ہیں اور اکثر ان کے بیانات میں اکثر دیکھے جاتے ہیں، گو یہ مقام ان الفاظ و اصطلاحات کی تشریح اور توضیح کا نہ تھا مگر پھر بھی چونکہ تصوف کے طالبوں کے لیے ان کا سمجھنا ضروری ہے، اس لیے ضرورتاً ان کی توضیح یہاں کی جارہی ہے، وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

علم تصوف کے لیے گو یہ باب ان کی تعریف بیان کرنے کا محل نہیں، لیکن یہاں ان کا جتلا دینا بھی بے حد ضروری ہے اور نیک بات کی توفیق، مدد اور غلطی سے بچانا اللہ کے قبضہ میں ہے۔

مقام کی تحقیق

جان لو کہ عام طور پر مقام میم کی پیش کے ساتھ "کھڑے ہونے" اور مقام میم کے زبر کے ساتھ "کھڑے ہونے کی جگہ" کو کہتے ہیں، حالانکہ ان الفاظ کے یہ معنی اور تحقیق قطعاً غلط ہے اس لیے کہ مقام عربی کا لفظ ہے اور عربی میں مقام میم کی پیش کے ساتھ قائم ہونے اور قائم ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں اور مقام میم کے زبر کے ساتھ قیام کرنے اور قیام کرنے کی جگہ کے معنوں میں مستعمل ہے، لیکن تصوف کی اصطلاح میں مقام میم کے زبر کے ساتھ بندے کا راہِ حق میں قیام کرنے، اس کے حق ادا کرنے اور اس کی رعایت کو ملحوظ رکھنے کو کہتے ہیں تاکہ اس مقام کا کمال حاصل کرلے۔ پس تصوف کے مقام میں سب سے پہلا مقام توبہ[1]، دوسرا انابت[2]، تیسرا زہد[3] اور چوتھا توکل[4] ہے اور ایسے ہی دوسرے مقام ہیں، پس صوفی کو جائز نہیں کہ سچی توبہ کیے بغیر انابت کا دعویٰ کرے اور سچی انابت کے بغیر زہد کا اور زہد کے بغیر توکل کا۔ خدا تعالےٰ نے ہمیں جبرئیل علیہ السلام کی نسبت خبر دی کہ انہوں نے کہا ہے: وَمَا مِنَّا اِلَّا لَہٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ۔ (ترجمہ: ہم میں سے ہر ایک کا ایک معین مقام ہے)۔

حال کی تحقیق

حال وہ کیفیت ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے دل پر طاری ہوتی ہے۔ جب وہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو اپنی

---

[1] توبہ: ترکِ گناہ [2] انابت: اللہ کی طرف رجوع کرنا [3] زہد: ترکِ دنیا [4] توکل: اللہ تعالیٰ پر بھروسا

کوشش سے اس کو ہٹا نہیں سکتے اور جب وہ چلی جاتی ہے تو تکلف اور کوشش سے اسے حاصل نہیں کر سکتے۔ پس مقام سے مراد راستہ اور مجاہدہ کے محل میں طالب کے قیام اور عمل کے مطابق بارگاہِ حق میں اس کا درجہ ہے اور حال سے مراد بندے کے دل میں مجاہدات کے تعلق کے بغیر اللہ تعالےٰ کے فضل اور لطف کا طاری ہونا ہے۔ اس لیے کہ مقام منجملہ اعمال ہے اور حال منجملہ افضال کے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مقام بندے کے اعمال سے متعلق ہے اور حال اللہ تعالےٰ کے فضل سے تعلق رکھتا ہے، جس میں کسی کوشش اور عمل کو دخل نہیں۔ پس صاحبِ مقام اپنے مجاہدے کے ساتھ قائم ہوتا ہے اور صاحبِ حال اپنی صفات سے فانی ہوتا ہے بلکہ اس کا قیام اسی وہبی کیفیت کے ساتھ ہوتا ہے، جو اللہ تعالےٰ اس کے دل میں پیدا کر دیتا ہے۔

مشائخ رحمہم اللہ کا اس بارے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ تو حال کے دوام کو جائز رکھتا ہے اور دوسرا گروہ اس کے دوام کو جائز نہیں رکھتا۔ حضرت محاسبی رحمتہ اللہ علیہ دوام حال کو روا سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محبت، شوق، قبض، بسط یہ سب احوال ہیں، اگر ان کا دوام روا نہ ہو تو محبّ محبّ ہو اور نہ مشتاق مشتاق اور جب تک یہ حال بندے کی صفت نہ ہو جائے، تب تک حال کے نام کا اطلاق اس پر نہیں اور یہی وجہ ہے کہ آپ رضا کو منجملہ احوال کہتے ہیں اور جو کچھ ابو عثمان حیری رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ مُنْذُاَرْ بَعِیْنَ سَنَۃً مَا اَقَامَنِیَ اللّٰہُ عَلٰی حَالٍ فَکَرِھْتُہٗ۔ اس کا اشارہ بھی اسی بات کی طرف ہے اور دوسرا گروہ حال کے دوام کو جائز نہیں سمجھتا، چنانچہ ان میں سے حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلْاَحْوَالُ کَالْبُرُوْقِ فَاِنْ بَقِیَتْ فَحَدِیْثُ النَّفْسِ (ترجمہ: احوال بجلیوں کی طرح ہوتے ہیں کہ جنہیں دوام نہیں ہوتا پس اگر وہ باقی رہ جائیں تو وہ نفس کی بات اور طبیعت کی ہوس ہے)۔ ایک گروہ اس کے متعلق یوں کہتا ہے کہ اَلْاَحْوَالُ کَاِسْمِھَا یعنی اَنَّھَا لَمَّا تَحَلُّ بِالْقَلْبِ تَزُوْلُ (ترجمہ: احوال اپنے نام کی طرح ہوتے ہیں یعنی جب وہ دل پر طاری ہوتا ہے تو جھٹ زوال پذیر ہو جاتے ہیں) کیونکہ لغت میں حال وہ عارضی کیفیت ہے جو دل پر طاری ہو اور جلدی زوال پذیر ہو جائے اور جو کیفیت باقی رہ جائے، وہ صفت ہوتی ہے اور صفت کا قیام موصوف کے ساتھ ہوتا ہے اور اس بات میں موصوف کا صفت سے زیادہ کامل ہونا لازم آتا ہے اور یہ محال ہے، کیونکہ موصوف کا کمال اس کی ذاتی صفات کو بروئے کار لانے کی وجہ سے ہوتا ہے اور صفات ذاتیہ کو بروئے کار لانا فضل ولطف الٰہی پر موقوف ہوتا ہے اور فضل و لطف عارضی اور وہبی کیفیت ہے نہ صفت، اور یہ صفات آتی جاتی رہتی ہیں۔

یہ فرق یہاں اس لیے بیان کر دیا ہے کہ صوفیا کی عبارات میں اور اس کتاب میں جہاں حال اور مقام کے الفاظ آجائیں تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اِن سے کیا مراد ہے؟ فی الجملہ یہ اچھی طرح جان لو کہ رضا مقاماتِ سلوک کی انتہا اور احوال کی ابتدا ہے اور یہ وہ محل ہے کہ اس کی ایک طرف کسب و مجاہدہ اور دوسری طرف محبت و غلبۂ اشتیاق ہے اور اس سے بالاتر کوئی اور مقام نہیں اور یہاں آکر انسان کے تمام مجاہدات ختم ہو جاتے ہیں۔ پس اس کی ابتدا تو بندے کے کسب و ریاضت سے ہوتی ہے اور انتہا اللہ تعالےٰ کے فضل و انعام پر۔ اب یہاں یہ احتمال پیدا ہو سکتا ہے کہ سالک نے رضا کی ابتدا میں جب خود اپنی طرف دیکھا ہو تو سمجھا ہو کہ رضا بھی ایک مقام ہے اور جب اس نے اپنی رضا کی انتہا میں حق تعالیٰ کی طرف دیکھا ہو تو کہہ دیا ہو کہ رضا تو حال ہے۔ حضرت محاسبی رحمتہ اللہ علیہ کا مذہب تصوف کے اصول میں یہی ہے۔ باقی طریقت کے معاملات میں انہوں نے اس سے کوئی اختلاف نہیں کیا، البتہ جن عبارات اور معاملات میں خطا کا وہم ہوتا ہے، گو ان کی اصل درست ہی ہو، آپ مریدوں کو ان سے منع کرتے تھے۔ چنانچہ ایک روز

ابوحمزہ بغدادی رحمتہ اللہ علیہ جو آپ کے مرید تھے، آپ کے پاس آئے اور وہ سماع سننے والے صاحب کمال مرد تھے۔ حضرت محاسبی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک شاہ مرغ رکھا ہوا تھا، جو بانگ دیا کرتا تھا۔ اس وقت اس مرغ نے بانگ دی۔ ابوحمزہ نے نعرہ مارا تو حضرت محاسبی سخت ناراض ہوئے اور چاہا کہ چھری سے مرغ کو ذبح کر دیں مگر مریدوں نے ہاتھ پاؤں پڑ کر مرغ کو تو بچالیا مگر آپ نے ابوحمزہ سے سخت غصہ میں فرمایا: ''اے مردود! تو کافر ہو گیا، دوبارہ اسلام لا۔'' مریدوں نے عرض کیا: ''اے شیخ! ہم سب تو اس کو خاص اولیاء اللہ اور موحدین میں سے جانتے ہیں، شیخ کو اس کے اسلام کے متعلق یہ تردد کس وجہ سے پیدا ہوا؟'' آپ نے فرمایا: ''مجھے اس کے اسلام کے متعلق کوئی تردد نہیں اور اس میں بظاہر سوائے خوبی کے اور کچھ نہیں اور اس کے باطن کو بھی میں توحید میں غرق دیکھتا ہوں لیکن اسے ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو حلولیوں[1] کے خیال سے مشابہ ہو اور ان کی باتوں کا اس کے عمل میں کوئی نشان ظاہر ہو کہ ایک مرغ جو عقل نہیں رکھتا اور اپنی طبعی عادت اور خواہش کے مطابق بانگ دیتا ہے، اسے اس کی آواز سے ناحق سماع کی حالت کیوں پیدا ہوتی ہے؟'' باوجودیکہ خداوند تعالے قابل تجزیہ وتقسیم نہیں کہ اس کا کچھ اس مرغ میں حلول کر گیا ہو اور عارف اس کو خدا کی آواز تصور کر کے وجد میں آجائے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے دوستوں کو اس کے کلام کے سوا کسی چیز سے آرام نہیں اور نہ اس کے اسلام کے سوا کسی چیز سے ان کو وقت و حال حاصل ہوتا ہے اور نہ حق تعالے اشیا میں حلول اور نزول فرماتا ہے اور نہ قدیم کا اشیائے حادثہ کے ساتھ اتحاد[2] اور امتزاج[3] جائز ہے۔ جب اس وقت ابوحمزہؓ نے شیخ کی نظر دیکھی تو کہنے لگا: ''اے شیخ! اگرچہ میں اصل میں یہی ہوں، لیکن چونکہ میرا فعل ایک گمراہ قوم کے فعل سے مشابہ تھا اس لیے میں نے اس سے توبہ کر لی اور باز آیا۔'' اسی قسم کی عجیب باتیں آپ سے مشہور ہیں جنہیں میں نے مختصر طور پر بیان کر دیا ہے اور یہ طریق بہت ہی قابل ستائش ہے، جس میں ہوشیاری اور صحو کو چھوڑے بغیر سلامتی اور سلامتی ہی ہے اور یہی کامل سلامتی کی راہ ہے، کیونکہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يَقِفَنَّ مَوَاقِفَ التُّهَمِ۔ (ترجمہ: جو شخص تم میں سے اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، وہ تہمت کے مقام پر نہ کھڑا ہو)۔

میں علی بن عثمان جلابی ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے اس بات کی درخواست کرتا ہوں کہ مجھے ایسا ہی عمل نصیب فرمائے لیکن یہ بات زمانے کے رسمی صوفیوں کی صحبت میں درست نہیں آسکتی، کیونکہ اگر توریا اور معصیت میں ان کی موافقت نہ کرے تو وہ تیرے دشمن ہو جائیں گے۔ پس جہالت سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، واللہ اعلم۔
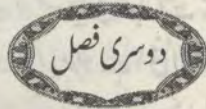
فرقۂ قصاریہ

قصاری لوگ حضرت ابی الصالح بن حمدون بن حمارہ قصار رحمتہ اللہ علیہ سے محبت رکھتے ہیں۔ آپ بزرگ علماء اور طریقت کے سرداروں میں سے ہوئے ہیں۔ آپ کا طریقت ملامت کا تھا۔ آپ ان تمام اسباب وعوامل کے قائل تھے، جن سے ملامت کا نشر و اظہار ہو۔ معاملاتِ طریقت کے بیان کرنے میں آپ کا کلام بہت عالی ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ تیرے متعلق اللہ تعالیٰ کا علم خلقت سے اچھا ہونا چاہیے یعنی خلوت میں خدا تعالیٰ کے ساتھ تیرا معاملہ اس سے بہتر ہونا چاہیے، جو ظاہر میں تیرا خلقت کے ساتھ ہے کیونکہ تیرے دل کا مخلوق میں مشغول ہونا حق تعالیٰ سے

[1] جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا اپنی مخلوق میں حلول کرتا ہے، انہیں حلولی کہتے ہیں۔ [2] ایک ہو جانا۔ [3] باہم مل جانا

حجاب اعظم ہے۔ کتابِ ہذا کی ابتدا میں ملامت کے باب میں میں نے آپ کے احوال اور حکایتیں بیان کر دی ہیں۔ اس لیے ترکِ طوالت کے لیے اس پر اختصار کیا ہے۔

آپ کی نادر حکایتوں میں سے ایک یہ ہے کہ آپ فرماتے ہیں: ایک روز میں نیشاپور کی نہر حیرہ کے کنارے چلا جا رہا تھا کہ نوح نامی ایک رہزن سے ملاقات ہوئی، جو جوانمردی میں بڑا مشہور تھا اور نیشاپور کے سب عیار اس کے حکم میں تھے۔ میں نے اس سے پوچھا: "اے نوح! جوانمردی کیا چیز ہے؟" اس نے جواب دیا: "میری جوانمردی پوچھتے ہو یا اپنی؟" میں نے کہا: "دونوں کی بابت بتاؤ۔" تب اس نے کہا کہ "میری جوانمردی تو یہ ہے کہ میں چوغہ اُتار کر گدڑی پہن لوں اور ان کا عمل اختیار کر لوں تاکہ حقیقی صوفی بن جاؤں اور پھر حق تعالیٰ کی شرم سے اس گدڑی میں گناہ سے پرہیز کروں۔ آپ کی جوانمردی یہ ہے کہ آپ گدڑی اُتار دیں تاکہ مخلوق آپ کے لیے باعث فتنہ نہ ہو۔ پس میری جوانمردی تو ظاہر میں شریعت کی حفاظت کرنا ہوگی اور آپ کی جوانمردی باطن میں حقیقت کی حفاظت کرنا ہوگی" اور دیکھا جائے تو یہ ایک سب سے بڑی حقیقت ہے، واللہ اعلم۔
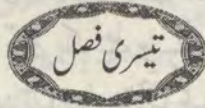
فرقۂ طیفوریہ

یہ گروہ حضرت بایزید طیفور بن عیسیٰ بن سروشان بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے محبت وعقیدت رکھتا ہے۔ آپ طریقت میں بڑے سردار اور بزرگ صوفیوں میں سے ہوئے ہیں اور آپ کا طریقہ غلبہ، شوق اور جذب و مستی تھا اور شوق الٰہی کا جذبہ اور اس کی محبت میں مدہوشی آدمی کی اکتساب کردہ محبت کی قسم سے نہیں، اور جو چیز انسان کے دائرہ کسب سے خارج ہو، اُس کا دعویٰ کرنا باطل اور اس کی تقلید محال ہے۔ سکر ہوشیاری کی صفت نہیں ہوسکتی اور نہ آدمی کو اپنے اندر حالت سکر پیدا کرنے کی طاقت ہی ہے۔ مجذوب مغلوب ہوتا ہے، اسے خلقت کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی کہ اوصاف میں سے کسی وصف میں اس کا تکلف ظاہر ہو۔

مشائخ طریقت اس بات پر متفق ہیں کہ مستقیم الحال صوفی کے سوا جو احوال کے دورے سے گزر چکا ہو، کسی اور کی اقتدا دُرست نہیں اور اہل طریقت کا ایک گروہ اس بات کو جائز قرار دیتا ہے کہ کوئی شخص تکلف سے غلبہ عشق الٰہی اور جذب محبت حق کی راہ اختیار کرے کیونکہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اِبْكُوا فَاِنْ لَّمْ تَبْكُوْ فَتَبَاكَوْا (ترجمہ: گریہ وزاری کرو اور اگر تم خود بخود گریہ وزاری نہیں کرسکتے تو تکلف سے رونی صورت بناؤ) اور اس کی دو صورتیں ہیں: (اوّل) اپنے آپ کو کسی قوم سے مشابہ کرنا محض ریاکاری کے لیے تو یہ صریح شرک ہے، (دوم) اپنے آپ کو ان سے اس لیے مشابہ کرنا کہ شاید حق تعالیٰ اس کو بھی اسی درجے پر پہنچا دے، جس پر وہ لوگ ہیں تاکہ وہ پیغمبر ﷺ کے اس فعل کے موافق ہو جو آپ نے فرمایا ہے۔ مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔ (ترجمہ: جو کسی قوم سے مشابہت پیدا کرتا ہے، وہ ان ہی میں سے ہے) پس راہ طریقت میں جو اقسام مجاہدات پیش کرتے ہیں وہ ان کو عمل میں لایا کرے اور درگاہِ حق سے اُمیدوار رہے، شاید حق تعالےٰ اس کو بھی اس پر معافی کی تحقیق کا دروازہ کھول دے کیونکہ مشائخ رحمھم اللہ میں سے ایک بزرگ نے فرمایا ہے: اَلْمُشَاهِدَاتُ مَوَارِيثُ الْمُجَاهِدَاتِ۔ (ترجمہ: مشاہدے مجاہدوں کی میراثیں اور نتائج ہیں)۔ میں کہتا ہوں کہ مجاہدے تمام امور میں اچھے ہوتے ہیں لیکن سکر اور غلبہ محبت کسب کے تحت نہیں آتے کہ مجاہدات سے

ان کو حاصل کر سکیں اور نہ مجاہدات غلبہ اور سکر کے حاصل ہونے کی علت ہو سکتے ہیں، کیونکہ مجاہدات حالت صحو میں ہی کر سکتے ہیں اور صاحب صحو کا رُخ سکر کے قبول کرنے کی طرف نہیں ہوتا، لہٰذا فقط مجاہدے اور ریاضت سے غلبۂ شوق اور جذب و مستی کو حاصل کرنا محال ہے۔ اب میں سکر اور صحو کی حقیقت اور اس میں مشائخ کے اختلاف کو بیان کرتا ہوں تاکہ اللہ کو منظور ہو تو یہ اشکال اٹھ جائے۔

سکر و صحو کی حقیقت

جان لو! اللہ تمہیں سعادت مند کرے کہ سکر و غلبہ، مدہوشی اور جذب، مستی کو کہتے ہیں جس سے مراد اربابِ معانی کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی محبت کا غلبہ ہے۔ صحو ہوشیاری سے مراد مقصود کا حاصل کرنا ہے اور ان کے متعلق اہل معانی کے بہت سے اقوال ہیں۔ ایک گروہ سکر کو صحو پر فضیلت دیتا ہے اور دوسرا گروہ صحو کو سکر پر فوقیت دیتا ہے اور جو لوگ سکر کو صحو پر ترجیح دیتے ہیں وہ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے پیرو ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صحو آدمیت کی صفت کے معتدل اور مستحکم ہونے کی صورت میں متصور ہوسکتا ہے اور وہ حق تعالیٰ سے حجابِ اعظم ہے۔ سکر آفت کے زوال، صفت بشریہ کے کم ہونے، اپنے اختیار و تدبیر کے چلے جانے اور ان معانی اور قویٰ کی بقا کی وجہ سے جو اس کے وجود میں اس کی جنس بشریت کے خلاف موجود ہیں اور اپنے حق میں تصرف کے فنا ہو جانے پر متصور ہو سکتا ہے اور یہ حال زیادہ اچھا اور کامل معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام حالت صحو میں تھے۔ آپ سے ایک فعل سرزد ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو خود ان کی طرف ہی منسوب کر کے فرمایا: وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ (ترجمہ: اور حضرت داؤد علیہ السلام نے کافر بادشاہ جالوت کو قتل کیا) اور ہمارے پیغمبر ﷺ حالت سکر میں تھے۔ آپ سے اس حالت میں ایک فعل ظہور پذیر ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف منسوب کر کے فرمایا: وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ (ترجمہ: اور جب آپ نے کفارِ مکہ پر خاک کی مٹھی پھینکی تو وہ دراصل آپ نے نہیں پھینکی تھی بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی) پس حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت بنی کریم ﷺ میں بڑا فرق ہے، کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام تو اپنی ذات کے ساتھ قائم اور اپنی صفات کے ساتھ ثابت تھے، تو ان کو تو کرامت کے طور پر فرمایا کہ اس نے کیا اور حضرت نبی کریم ﷺ جو حق تعالیٰ کے ساتھ قائم اور اپنی صفات سے فانی تھے، ان کے متعلق فرمایا کہ جو کچھ کیا ہم نے کیا۔ پس بندے کے فعل کو حق تعالیٰ سے منسوب کرنا، خود حق تعالیٰ کے فعل کو بندے کی طرف منسوب کرنے سے بہتر ہے کیونکہ جب حق تعالیٰ کا فعل بندے سے منسوب ہوتا ہے تو وہ بندہ اپنی ذات سے قائم ہوتا ہے جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کو، کہ جب ان کی نظر ایسی جگہ پڑی کہ جہاں نہ چاہیے تھی یعنی اوریا کی عورت پر، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ ہوئی اور جب بندہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہوتا ہے تو صورت اس کے برعکس ہوتی ہے، چنانچہ جب جناب رسول خدا ﷺ کی نظر پڑ گئی تو زیدؓ کی عورت ان پر حرام ہو گئی، اس لیے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی نظر محل صحو میں تھی اور آنحضور ﷺ کی نظر محل سکر میں تھی اور وہ جو لوگ جو صحو کو سکر پر ترجیح دیتے ہیں، وہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے پیرو ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ محل سکر محل آفت ہے، اس لیے کہ وہ احوال کی پریشانی، صحت کے جاتے رہنے اور اپنے حال پر قابو نہ رہنے کا باعث ہے اور جب تمام امور کی اصلی بنیاد طالب ہے، اپنے فنا کی وجہ سے، بقا کی وجہ سے یا محویت کی رو سے یا اپنے

آپ کو ثابت کرنے کی رو سے ہی ہے، جب وہ خود ہی صحیح الحال نہ ہوگا تو تحقیق کا فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اہل حق کا دل تمام موجودات ثابتہ سے مجرد ہونا چاہیے اور ایک نابینا شخص کو اشیاء کے تعلق سے نہ کوئی راحت ہوتی ہے اور نہ ان کی خرابی سے اس کو خلاصی ملتی ہے۔ لوگوں کا حق تعالیٰ کو چھوڑ کر اشیاء میں الجھے رہنا اس لیے ہے کہ وہ اشیاء کو جیسی کہ وہ ہیں، نہیں دیکھتے اور اگر وہ ان کی حقیقت کو پالیں تو ان کی قید سے چھوٹ جائیں۔

صحیح طور پر دیکھنا دو طرح سے ہوتا ہے: ایک تو یہ کہ کسی چیز کو دیکھنے والا آنکھ سے اس کو دیکھے اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس کی فنا کو دیکھے۔ اگر آنکھ سے بقا کو دیکھے تو سب اشیاء کو اپنی بقا میں ناقص پائے گا کیونکہ وہ ان کو بقا کی حالت میں ان کو بذات خود قائم نہیں دیکھے گا اور اگر آنکھ سے فنا کو دیکھے گا تو سب موجودات کو بقائے حق تعالیٰ کے مقابلے میں فانی پائے گا اور یہ دونوں صفتیں اس کو موجودات سے اعراض کرنے پر مجبور کریں گی۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے فرمایا: اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْاَشْیَاءَ کَمَا ھِیَ۔ (ترجمہ: اے اللہ! ہمیں اشیاء جیسی کہ وہ حقیقت میں ہیں، دکھادے) اس لیے کہ جس نے اشیاء کو کماھی دیکھ لیا، وہ آرام پا گیا اور یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا ہے کہ فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ (آنکھوں والو! عبرت پکڑو) جب تک اشیاء کو جیسی کہ وہ ہیں نہ دیکھیں گے، وہ عبرت نہیں پکڑیں گے۔ پس یہ سب باتیں صحو کے حال کے سوا درست نہیں ہوسکتیں اور اہل سکر کو اِن امور کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حالت سکر میں تھے، اس لیے جلالِ الٰہی کی ایک تجلی برداشت نہ کر سکے اور بے ہوش ہو گئے، جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے وَخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا (ترجمہ: حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے) اور ہمارے رسول ﷺ چونکہ حالت صحو میں تھے اس لیے مکہ مکرمہ سے مقام قابِ قوسین تک علی بن تجلی الٰہی میں چلے گئے اور ہر وقت زیادہ ہوشیار اور زیادہ بیدار رہے، واللہ اعلم۔

؎ شَرِبْتَ الرَّاحَ کَاْسًا بَعْدَ کَاْسٍ　　فَمَا نَفِذَ الشَّرَابُ وَمَا رَوِیْتُ

(میں نے متواتر پیالے پر پیالہ شراب پی　　پس نہ تو شراب ختم ہوئی اور نہ میں سیراب ہوا)

اور میرے مرشد نے فرمایا ہے (آپ جنیدی مذہب رکھتے تھے) کہ سکر بچوں کے کھیل کا میدان ہے اور صحو مردوں کے فنا کا مقام۔

میں علی بن عثمان جلابی رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے موافق کہتا ہوں کہ صاحب سکر کا کمال صحو میں ہوتا ہے اور صحو میں کمتر درجہ بشریت کے دور ہو جانے کو دیکھ لینا ہے پس وہ صحو جو خرابی کو ظاہر کرے، اس سکر سے بہتر ہے جو عین خرابی ہے۔ حضرت ابو عثمان مغربی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ آپ نے ابتدائے حال میں بیس سال تک جنگلوں میں ایسی گوشہ نشینی فرمائی کہ آدمی کی آہٹ تک نہ سنی، یہاں تک کہ تکلیف کی وجہ سے آپ کا جسم گھل گیا اور آپ کی آنکھیں کثرت ریاضت و بیداری کے باعث اندر گھس گئیں اور آدمیوں کی صورت نہ رہی۔ بیس سال کے بعد حق تعالےٰ نے فرمایا کہ خلقت کی صحبت اختیار کرو۔ آپ نے دل میں کہا کہ پہلے اللہ والوں اور اللہ کے گھر کے مجاوروں کی صحبت اختیار کروں تاکہ زیادہ برکت ہو، چنانچہ مکہ مکرمہ کا قصد کیا۔ مشائخ ان کے آنے سے پہلے باخبر تھے، وہ آپ کے استقبال کے لیے باہر نکلے اور ان کو ایسی حالت میں پایا کہ صورت بدلی ہوئی اور بدن میں سوائے ہڈیوں کے کچھ نہ رہا تھا۔ آپ سے کہنے لگے: "اے ابوعثمان! بیس سال آپ نے ایسی حالت میں زندگی بسر کی کہ آدم اور ان کی اولاد آپ کا حال معلوم کرنے سے عاجز آ گئی۔ ہمیں بتایئے آپ کیوں گئے، کیا دیکھا، کیا حاصل کیا اور کیوں واپس

آئے؟" آپ نے فرمایا: "میں سکر کی وجہ سے گیا، سکر کی آفت کو دیکھا، مقصود سے نا اُمیدی حاصل کی اور ہار کر واپس آ گیا۔" سب مشائخ نے فرمایا: "اے ابوعثمان! آپ نے صحو وسکر کی حقیقت جیسی کہ چاہیے، تحقیق فرمالی ہے اور آپ کے بعد کسی شخص کو حق نہیں پہنچتا کہ صحو وسکر کے متعلق وہ کچھ تجویز کرے اور سکر کی حالت کو کھول کر بیان کر دیا ہے۔" پس سکر سرتا سرگمان فنا ہے، بقائے صفت کے ساتھ، یہ حجاب ہے اور صحو سرتا سر دیدار بقا ہے، صفت کے فنا ہونے کی حالت میں اور عین کشف و مشاہدہ ہے اور فی الجملہ اگر کسی شخص کو یہ خیال ہو کہ سکر صحو کی نسبت فنا سے زیادہ قریب ہے، تو یہ محال ہے کیونکہ سکر صحو کی صفت پر ایک زائد صفت ہے۔ جب تک بندے کے اوصاف بڑھتے رہتے ہیں وہ بے خبر ہوتا ہے اور جب وہ صورت گھٹنے لگتی ہے تو اس وقت طالبوں کو اس سے مقصود کی اُمید ہو جاتی ہے۔ پس صحو وسکر میں ان کے حال کی غایت یہی ہے اور حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ سے جو مغلوب احوال تھے، حکایت کرتے ہیں کہ یحییٰ بن معاذؒ نے آپ کو خط لکھا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ جو محبت الٰہی کے سمندر سے ایک قطرہ پی کر ہی مست ہو گیا، تو حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں لکھا کہ آپ اس شخص کے متعلق کیا فرماتے ہیں کہ سارے جہاں کے دریا محبت کی شراب بن جائیں اور وہ ان سب کو پی جائے، لیکن پھر بھی پیاس سے چلاتا رہے؟ لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ نے سکر سے مراد لی ہے اور بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے صحو کی طرف اشارہ فرمایا ہے لیکن معاملہ اس کے برخلاف ہے، کیونکہ صاحب صحو وہ ہوتا ہے جو ایک قطرۂ شراب کی بھی طاقت نہیں رکھتا اور صاحب سکر وہ ہے جو مستی میں سب کچھ پی جائے اور ابھی اس کو اور ضرورت ہو، اس لیے کہ شراب سکر کا آلہ ہے اور جنس ہم جنس سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ صحو اس کی ضد ہے اور اس کو شراب پینے سے آرام نہیں ملتا، لیکن سکر دو قسم کا ہے:

(اوّل) دوستی کی شراب سے، (دوم) عشق کے پیالے سے

اور دوستی کا سکر کسی سبب کو چاہتا ہے اور وہ سب نعمت کا دیکھنا ہے اور عشق کا سکر کسی سبب اور علت کی بجائے منعم کو دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ پس جو شخص نعمت کو دیکھتا ہے وہ اپنی ذات سے دیکھتا اور خود اپنے آپ کو دیکھتا ہے اور جو منعم کو دیکھتا ہے وہ اس کے ذریعے سے دیکھتا ہے، اپنی ہستی کو نہیں دیکھتا۔ وہ اگرچہ سکر میں ہو، اس کا سکر صحو ہوتا ہے۔ اسی طرح صحو بھی دو قسم کا ہوتا ہے:

(اوّل) صحو غفلت پر ہوتا ہے، (دوم) محبت پر

جو صحو غفلت پر ہوتا ہے، وہ حجابِ اعظم ہے اور جو صحو محبت پر ہوتا ہے، وہ زیادہ واضح ہے پس جو صحو غفلت سے ملا ہوا ہو اگرچہ وہ صحو ہے، سکر ہوتا ہے اور جو سکر محبت سے ملا ہوا ہو اگرچہ وہ سکر ہے، صحو ہوتا ہے۔ جب اصل مستحکم ہو تو صحو سکر ہوگا اور سکر صحو اور جب اصل مضبوط نہ ہو تو دونوں بے فائدہ ہیں۔ حاصل یہ کہ صحو وسکر مردانِ حق کے راستے میں علل کے اختلاف کے باعث مختلف ہوتے ہیں اور جب حقیقت کی سلطنت اپنا جمال دکھاتی ہے تو صحو وسکر دونوں طفیلی معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ان دونوں کے اطراف ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ ایک کی نہایت دوسرے کی ابتدا ہے اور ظاہر ہے کہ ابتداء انتہا سوائے باہمی تفرقے کے متصور نہیں ہو سکتی اور جس چیز کی نسبت تفرقے کی طرف ہو، وہ چیز حکم میں متساوی ہوتی ہے اور جمع کرنا تفرقوں کو مٹا دینا ہے۔ غرض یہ کہ جب تک طالب کو مشاہدہ حق، جو دراصل مقصود بالذات ہے حاصل نہ ہو، تب تک سکر وصحو دو مختلف چیزیں ہیں کہ ایک کی انتہا دوسرے کی ابتدا ہوتی ہے اور دونوں مساوی طور پر بے سود ہیں اور جب اصل مقصود حاصل ہو جائے تو دونوں میں غایت کے اعتبار سے

کوئی فرق نہیں بلکہ دونوں مفید ہیں۔ کسی شاعر نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے

اِذَ طَلَعَ الصَّبَاحُ بِنَجْمِ رَاحٍ تُسَاوِی فِیْہِ سُکْرَانٌ وَصَاحٍ

(جب صبح خوشی کے ستارے کے ساتھ طلوع ہو تو اس وقت مست و ہوشیار دنوں مساوی ہوتے ہیں)۔

کہتے ہیں کہ سرخس میں دو بزرگ تھے۔ ایک لقمانؒ، دوسرے ابو الفضل حسنؒ۔ ایک دن لقمان ابو الفضلؒ کے پاس آئے تو دیکھا ان کے ہاتھ میں ایک جزو ہے۔ پوچھا: "اے ابو الفضلؒ! جزو میں کیا تلاش کرتے ہو؟" انہوں نے جواب دیا: "وہی جو تم اس کو ترک کرنے میں ڈھونڈتے ہو۔" انہوں نے پوچھا: "تو یہ اختلاف کیوں ہے؟" آپ نے جواب دیا کہ "اختلاف تو تمھیں دکھائی دیتا ہے کہ تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ کیا ڈھونڈتے ہو؟ مستی سے ہوشیار ہو اور ہوشیاری سے بیدار ہوتا کہ یہ اختلاف اُٹھ جائے اور تم یہ جان لو کہ میں اور آپ کیا ڈھونڈتے ہیں؟" پس طیفوریوں کا جنیدیوں سے یہی اختلاف تھا جو میں نے بیان کر دیا ہے اور مطلق معاملات میں بایزید طیفور رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب لوگوں کی صحبت کو ترک کرنا اور گوشہ گزینی کو اختیار کرنا ہے اور مریدوں کو آپ بس یہی فرماتے ہیں اگر کسی کو میسر آجائے تو یہ طریق بہت اچھا اور یہ سیرت بہت عمدہ ہے۔
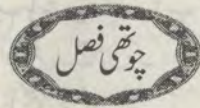
فرقۂ جنیدیہ

فرقہ جنیدیہ کے پیرو حضرت ابو القاسمؒ جنید بن محمد سے محبت کرتے ہیں۔ اپنے وقت میں ان کو لوگ طاؤس العلماء کہتے تھے۔ آپ صوفیا کے ایک گروہ کے سردار اور ان کے اماموں کے امام تھے۔ آپ کا طریقہ طیفوریوں کے برعکس صحو پر مبنی ہے، جن کا اختلاف پہلے بیان کر دیا گیا ہے۔ صوفیا کے تمام مذاہب میں زیادہ مشہور و معروف آپ کا ہی مذہب ہے اور تمام مشائخ جنیدی مذہب کے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ طریقت کے معاملات میں اگرچہ ان کے کلمات میں بہت اختلاف ہے، لیکن میں نے طوالت کے خوف سے اسی پر اختصار کیا ہے اور توفیق اللہ کے قبضے میں ہے۔ اگر کسی شخص کو اس سے زیادہ حال معلوم کرنے کی ضرورت ہو تو ان کے مذہب سے متعلق دوسری کتابوں کو پڑھ لے تاکہ اسے اس سے زیادہ حقیقت معلوم ہو جائے کیونکہ میں نے اس کتاب میں اختصار کو اختیار کیا ہے۔ حکایات میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ جب حسین بن منصور احمد رحمۃ اللہ علیہ غلبۂ محبت الٰہی میں عمرو بن عثمان رحمۃ اللہ علیہ سے بیزار ہو کر حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے تو آپ نے ان سے فرمایا کہ "تم عمرو کو چھوڑ کر میرے پاس کیوں آئے؟" انہوں نے جواب دیا: "اس لیے کہ شیخ کی صحبت اختیار کروں۔" آپ نے فرمایا: "ہم مجنوؤں کی صحبت پسند نہیں کرتے، صحبت کے لیے صحت دماغ کی ضرورت ہے کیونکہ جب تم باوجود جذب و مستی کی آفت کے مصاحبت کرو گے تو ایسا ہی ہوگا، جیسا کہ تم نے سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ اور عمرو بن عثمان رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ کیا۔" انہوں نے کہا: اَیُّھَا الشَّیْخُ اَلصَّحُوْدَ السُّکْرُ صِفْتَانِ لِلْعَبْدِ وَمَا رَامَ الْعَبْدُ مَحْجُوْبًا مِنْ رَّبِّہٖ حتّٰی فَنٰی اَوْصَافَہٗ (ترجمہ: اے شیخ! صحو اور سکر بندے کی دو صفتیں ہیں اور بندہ ہمیشہ خدا سے حجاب میں ہوتا ہے حتی کہ اس کے اوصاف فنا ہو جائیں)

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یَا اِبْنَ الْمَنْصُوْرِ اَخْطَاتَ فِی الصَّحْوِ والسُّکْرِلَاَنَّ الصَّحْوِ بِلَاَ خِلَافِ عِبَادَۃٌ عن صِحَّۃِ حَالِ الْعَبدِ مَعَ الْحَقِّ وذٰلِکَ لَایَدْ خُلُ تَحْتَ صِفَۃِ الْعَبْدِ وَ اکْتِسَابِ الْخَلْقِ وَانَا

اَرٰی یا ابْنَ مَنْصُوْرٍ فی کَلَامِکَ فُضُولاً کَثِیْراً وَ عِبَارَاتٍ لَا طَائِلَ تَحْتَھَا۔ (ترجمہ: اے منصور کے بیٹے! تو نے صحو اور سکر کے سمجھنے میں غلطی کی ہے، کیونکہ صحو بغیر اختلاف کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کے صحیح حال سے عبارت ہے اور یہ بات بندے کی صفت اور خلق کے کسب کے تحت داخل نہیں۔ اے منصور کے بیٹے! علاوہ ازیں میں تیرے کلام میں بہت سی فضول باتیں اور بے قاعدہ عبارتیں بھی پاتا ہوں، واللہ اعلم۔

پانچویں فصل
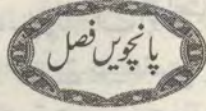
فرقۂ نوریہ

نوری فرقے کے لوگ حضرت ابوالحسن احمد نور نوری رحمۃ اللہ علیہ سے محبت و عقیدت کا دعویٰ کرتے ہیں اور آپ علمائے صوفیاء کے سرداروں میں سے ایک سردار تھے اور نودو نام سے زیادہ مشہور تھے۔ صوفیائے کرام میں روشن اوصاف اور قاطع دلیلوں کے ساتھ آپ کا ذکر ہوتا ہے۔ تصوف میں آپ کا مذہب نہایت پسندیدہ ہے اور اصول بے حد عمدہ، نیز آپ کا مذہب صفوت کو فقر پر فضیلت دینا ہے۔ طریقت میں آپ کا عمل حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے موافق ہے اور آپ کے طریقہ کی نادر باتوں میں سے ایک بات یہ ہے کہ آپ صحبت میں اپنے رفیق کے حق کو اپنے حق پر ترجیح دیتے ہیں اور صحبت بے ایثار کو حرام سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ درویشوں کے لیے صحبت فرض اور گوشہ نشینی ناپسندیدہ ہے اور رفیق کے حقوق کو اپنے حقوق پر ترجیح دینا بھی فرض ہے۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: اِیَّاکُمْ وَالْعُزْلَةَ فَاِنَّ الْعُزْلَةَ مُقَارَنَةُ الشَّیْطَانِ وَعَلَیْکُمْ بِالصُّحْبَةِ فَاِنَّ الصُّحْبَةَ رَضَاعُ الرَّحْمٰنِ۔ (ترجمہ: گوشہ نشینی سے بچو کیونکہ گوشہ گزینی شیطان کی ہم نشینی ہے اور تم پر صحبت اختیار کرنا لازم ہے، کیونکہ صحبت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے)۔ اب میں ایثار کی حقیقت بیان کرتا ہوں اور جب صحبت و عزلت کے باب میں پہنچوں گا تو انشاء اللہ اس جگہ ان کے اسرار و رموز کو کامل وضاحت سے بیان کروں گا تاکہ عوام و خواص سب اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

ایثار کی حقیقت

قرآن عزیز میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (ترجمہ: وہ فقراء صحابہ کرام اپنے نفسوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انہیں اس کی حاجت ہو)۔ اس آیت کا نزول خصوصاً فقراء صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں ہوا ہے۔ ایثار کی حقیقت یہ ہے کہ صحبت و رفاقت میں اپنے ساتھی اور دوست کے حق کا خیال رکھے، اپنا حصہ اسے دے دے اور دوست کے آرام کے لیے خود تکلیف اٹھائے۔ لِاَنَّ الْاِیْثَارَ الْقِیَامُ بِمُعَاوَنَةِ الاغْیَارِ مَعَ الْاِشْتِغَالِ بِمَا اَمَرَهُ الْجَبَّارُ لِرَسُوْلِهِ الْمُخْتَارِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ۔ (ترجمہ: کیونکہ ایثار دوسروں کی مدد کرنا اور ساتھ ہی اس امر میں مشغول ہونا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: درگزر اختیار کیجئے اور نیکی کا حکم دیجیے اور جاہلوں سے اعراض فرمائیے)۔ ایثار کی حقیقت اس سے زیادہ آداب صحبت کے بیان میں مفصل بیان ہوگی۔ یہاں اس آیت کریمہ میں ایثار کی طرف اشارہ ہے اور یہ ایثار دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو صحبت میں جیسا کہ اس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے اور دوسرے محبت میں، اور رفیق کے لیے ایثار کرنے میں سب خوشی اور راحت ہی ہوتی ہے۔

حکایات میں یہ بات مشہور ہے کہ جب غلام الخلیل نے اس گروہ کے ساتھ اپنی عداوت ظاہر کی، ہر ایک سے دشمنی کا اظہار کیا اور سرکاری آدمی حضرت نوری و حضرت رقام و حضرت ابو حمزہ رحمہم اللہ کو پکڑ کر دارالخلافہ میں لے لیے اور غلام الخلیل نے کہہ دیا کہ "یہ لوگ بے حقیقت اور بے دین ہیں، اگر امیر المومنین نے ان کے قتل کا حکم فرمایا تو بے دینی کی جڑ کٹ جائے گی کیونکہ سب بے دینوں کے سرغنہ یہی لوگ ہیں اور جس کے ہاتھ سے یہ نیکی ہو، میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے لیے بہت بڑے اجر کا ضامن ہوں۔" چنانچہ خلیفہ نے اسی وقت ان کی گردنیں اُڑا دینے کا حکم دے دیا، جلاد آگیا اور تینوں کے ہاتھ باندھ کر جب جلاد نے حضرت رقامؒ کے قتل کرنے کا قصد کیا تو حضرت نوریؒ اُٹھ کر بڑی خوشی اور خرمی سے حضرت رقامؒ کی جگہ پر جلاد کے سامنے جا بیٹھے۔ لوگوں کو بڑا تعجب ہوا۔ جلاد نے آپ سے کہا: "اے جوانمرد! یہ تلوار ایسی چیز نہیں ہے کہ کوئی ایسی رغبت سے اس کے سامنے آجائے جیسا کہ تم آگئے ہو، حالانکہ ابھی تک تمہاری باری نہیں آئی۔" آپ نے فرمایا: "ہاں یہ صحیح ہے کہ میری باری نہیں، لیکن میرا طریق ایثار پر مبنی ہے اور دنیا میں عزیز ترین چیز زندگی ہے، لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ یہ چند سانس بھی ان بھائیوں کے کام میں صرف کروں، کیونکہ دنیا کا ہر ایک سانس میرے نزدیک آخرت کے ہزار سال سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ یہ دنیا عمل کا گھر ہے اور آخرت کا ثواب، اور ثواب خدمت کرنے پر ہی حاصل کرتے ہیں۔" جب قاصد نے یہ خبر خلیفہ کو پہنچا دی تو خلیفہ آپ کی طبیعت کی رقت اور آپ کے کلام کی باریکی کی وجہ سے سخت متعجب ہوا اور آدمی بھیج کر حکم دیا کہ ان لوگوں کے معاملے میں سردست توقف کیا جائے۔ ابوالعباس علی اس وقت قاضی القضاۃ تھے۔ چنانچہ ان کا معاملہ آپ کے سپرد کر دیا گیا۔ وہ ان تینوں حضرات کو اپنے گھر لے گئے اور جو کچھ ان حضرات سے شریعت و حقیقت کے احکام کے متعلق دریافت کیا، اس میں ان کو درست پایا۔ وہ اپنی غفلت کی وجہ سے ان کے حال سے سخت پریشان و پشیمان ہوئے۔ اس پر حضرت نوری نے یہ سب کچھ تو پوچھا مگر پوچھنے کی بات نہ پوچھی۔ فَإِنَّ لِلّٰہِ عِبَادًا یَاکُلُوْنَ بِا للّٰہِ وَ یَشْرَبُوْنَ بِاللّٰہِ وَیَلْبَسُوْنَ بِاللّٰہِ وَیَقُوْلُوْنَ بِاللّٰہِ۔ (ترجمہ: پس بے شبہ اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں کہ ان کا کھانا پینا بیٹھا اور بولنا سب اللہ کے ساتھ ہے) کیونکہ ان کا قیام و قعود و نطق و حرکت و سکون سب اللہ کے ساتھ ہے، اسی کے ساتھ وہ زندہ ہیں اور اسی کے مشاہدے سے ان کی بقا ہے کہ اگر لحظہ بھر مشاہدہ ان کے حال سے منقطع ہوجائے تو ان کے وجود میں شور برپا ہو۔ قاضی صاحب آپ کے کلام کی دقت اور آپ کے حال کی صحت پر بڑے متعجب ہوئے اور خلیفہ کو لکھ دیا کہ "اگر یہ لوگ ملحد ہیں تو فَمَنِ الْمُوَحِّدُ فِی الْعَالَمِ۔ (ترجمہ: پھر جہان میں موحد کون ہے؟) میں گواہی دیتا اور حکم کرتا ہوں کہ اگر یہ لوگ بے دین ہیں تو پھر روئے زمین پر کوئی موحد نہیں۔" خلیفہ نے ان حضرات کو بلا کر فرمایا: "کوئی حاجت طلب کرو۔" انہوں نے فرمایا: "ہمیں آپ سے صرف یہ حاجت ہے کہ آپ ہمیں بالکل فراموش کر دیجئے، نہ ہمیں اپنے قبول سے اپنے مقرب بنائیے اور نہ اپنے ہجر سے راندۂ درگاہ کیجئے کیونکہ آپ کا ہمیں چھوڑ دینا بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ آپ کا ہمیں قبول کرنا اور آپ کا قبول کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ رد کر دینا۔" خلیفہ رو پڑا اور عزت و احترام سے ان کو واپس کر دیا۔

حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو ایک دفعہ مچھلی کی خواہش ہوئی۔ سارے شہر میں تلاش کرنے پر نہ ملی۔ اتفاق سے کچھ دنوں کے بعد مجھے ایک مچھلی دستیاب ہوئی، جسے پکا کر میں نے ان کے سامنے پیش کیا۔ مچھلی دیکھنے سے ان کے چہرے پر خوشی کے آثار ظاہر ہوئے۔ اسی وقت

ایک سائل دروازے پر آگیا، تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ مچھلی اس سائل کو دے دو۔ غلام نے عرض کیا کہ ہم اس کی بجائے سائل کو کوئی اور چیز دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اے غلام! سائل کی آمد سے اب اس کا کھانا مجھ پر حرام ہے اور میں نے اسے اپنے دل سے نکال دیا ہے، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث سنی ہے:

اَیُّمَا امْرَءٍ یَشْتَھِیْ شَھْوَۃً فَرَدَّ شَھْوَتَہٗ وَاٰثَرَ الاٰخَرَ علی نَفْسِہٖ غُفِرَلَہٗ۔

(ترجمہ: جو شخص کسی چیز کی خواہش کرے، جب مل جائے تو اس کو ترک کر دے اور دوسرے شخص کو اپنے آپ پر ترجیح دے تو اللہ تعالیٰ اس کو بخش دیتا ہے)۔

حکایات میں میں نے دیکھا ہے کہ ایک دفعہ دس درویش جنگل میں جاتے جاتے راستہ بھول گئے اور انہیں پیاس لگی۔ ان کے پاس پانی کا ایک پیالہ تھا، جسے وہ ایک دوسرے پر ایثار کرتے رہے۔ بالآخر ان میں سے کسی نے بھی نہ پیا۔ یہاں تک کہ ایک شخص کے سوا سب پیاس کی وجہ سے مر گئے۔ اس نے کہا: "جب میں نے دیکھا کہ سب مر گئے ہیں تو میں نے وہ پانی پی لیا اور اس کی قوت سے میں چل کر راستے پر واپس آگیا"۔ ایک شخص نے اسے کہا کہ "اگر تو بھی نہ پیتا تو اچھا ہوتا"۔ اس نے جواب دیا: "اے فلانے! میں نے شریعت کا حکم ایسا ہی سمجھا ہے کہ اگر میں نہ پیتا تو اپنے نفس کا قاتل ہوتا اور اس کی وجہ سے مواخذہ کیا جاتا"۔ اس شخص نے کہا: "تو کیا وہ سب اپنے نفس کے قاتل ہوئے ہیں؟" اس نے کہا: "کہ نہیں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک اس لیے نہیں پیتا تھا کہ دوسرا پیئے۔ جب وہ سب ایک دوسرے کی موافقت سے ہلاک ہوگئے اور میں رہ گیا تو لامحالہ شرعاً مجھ پر واجب ہوا کہ میں وہ پانی پی کر اپنی جان بچالوں۔" اسی طرح ہجرت کی رات جب حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ پیغمبر ﷺ کے بستر پر سوئے اور آنحضور ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مکہ مکرمہ سے نکل کر غارِ ثور میں تشریف لے گئے اور اس رات کفارِ مکہ نے پیغمبر ﷺ کے قتل کا ارادہ کر لیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل اور حضرت میکائیل علیہما السلام سے فرمایا کہ "میں نے تم دونوں کے درمیان مواخاۃ[1] قائم کر دی ہے اور ایک کی زندگی دوسرے سے دراز کر دی ہے۔ تم دونوں میں کون ایسا ہے جو اپنی زندگی اپنے بھائی پر ایثار کر کے اپنی موت اختیار کرے؟" دونوں نے اپنی زندگی کو ترجیح دی۔ تب اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل و حضرت میکائیل (علیہم السلام) سے فرمایا کہ "تم اپنے اوپر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شرافت اور بزرگی کو دیکھو کہ میں نے ان کے اور اپنے رسول ﷺ کے درمیان اخوت قائم کر دی تو انہوں نے اپنے قتل اور موت کو ترجیح دی اور پیغمبر ﷺ کی جگہ جا سوئے اور اپنی جان آپ پر فدا کرنے کے لیے آمادہ ہوگئے اور اپنی زندگی حضور کے سپرد کر دی۔ اب تم دونوں زمین پر جا کر آپ کو دشمنوں سے محفوظ رکھو۔" تب حضرت میکائل اور جبرئیل علیہم السلام آئے۔ ایک ان کے سرہانے بیٹھ گیا اور دوسرا ان کی پائنتی۔ حضرت جبرئیل نے کہا: بَخٍ بَخٍ من مِثْلُكَ یَا اِبْنِ اَبِیْ طَالِبٍ اَنَّ اللّٰہَ یُبَاھِیْ بِكَ عَلٰی مَلَائِكَتِہٖ۔ (ترجمہ: اے ابن ابی طالب! خوش ہو جایئے۔ آپ جیسا کون ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کے سامنے آپ پر فخر کرتا ہے) اور آپ میٹھی نیند کے مزے لے رہے تھے اور خطرے سے بے پرواتھے۔ اس وقت آپ کی شان میں یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَہُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ۔ (ترجمہ: اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنے نفس کو بیچ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے)۔

---

[1] بھائی چارہ

جب جنگ اُحد کی مصیبت سے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی آزمائش کی تو انصار کے نیک لوگوں میں سے ایک عورت کہتی ہے کہ میں تھوڑا سا پینے کا پانی لے کر اُحد کی طرف نکلی تا کہ مجاہدوں میں سے کسی کے پاس لے جاؤں۔ میں نے میدان جنگ میں بزرگ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک کو دیکھا کہ زخمی پڑے ہیں اور سانس گن رہے ہیں۔ انہوں نے میری طرف اشارہ کیا کہ پانی مجھے دو۔ میں وہ پانی انہیں دینے لگی کہ ایک دوسرے زخمی کی آواز آئی "پانی پانی۔" انہوں نے جب یہ آواز سنی تو فرمایا کہ پہلے ان کے پاس لے جاؤ۔ جب میں اس کے پاس لے گئی تو اتنے میں قریب سے ایک تیسرے زخمی کی آواز آئی "پانی پانی۔" یہ سن کر اس صحابی نے بھی پانی نہ پیا اور فرمایا کہ پہلے اس کے پاس لے جاؤ۔ اسی طرح میں پورے سات زخمیوں کے پاس پانی لے کر گئی، مگر ہر ایک نے دوسرے کی آواز سن کر پانی چھوڑ دیا اور پہلے نے دوسرے کو پلانے کی تلقین کی۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ بالآخر جب میں ساتویں زخمی کے پاس پہنچی تو وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی جان دے چکا تھا۔ جب میں دوسرے کے پاس لوٹ کر آئی تو وہ بھی رُخصت ہو چکا تھا اور اسی طرح میں باری باری سب کے پاس پہنچی اور وہ سب کے سب یکے بعد دیگرے اس جہاں سے رُخصت ہو چکے تھے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ط۔ (ترجمہ: اور وہ دوسروں کو اپنے نفسوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انہیں اس کی حاجت ہو)۔

اسی طرح بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا، جس نے مسلسل چار سو سال عبادت کی تھی۔ ایک دن اس نے عرض کیا: "بارِ خدایا! اگر تو ان پہاڑوں کو پیدا نہ کرتا تو تیرے بندوں کے لیے چلنا اور سیاحت کرنا آسان ہو جاتا۔" اس وقت کے پیغمبر صلوات اللہ علیہ کو فرمانِ الٰہی ہوا کہ "اس عابد سے کہہ دیں کہ ہمارے ملک میں تصرف کرنے سے تجھے کیا کام؟ اب جو تو نے تصرف کیا تو تیرا نام میں نے سعادتمندوں کے دیوان سے مٹا دیا اور بدبختوں کے دیوان میں لکھ دیا۔" یہ سن کر عابد کے دل میں خوشی پیدا ہوئی اور فوراً خداوند تعالیٰ کے لیے سجدہ شکر بجالایا۔ اس وقت کے پیغمبر نے فرمایا: "اے فلانے! بدبختی پر سجدہ شکر کیسا؟" اس نے جواب دیا کہ "میرا شکر بدبختی پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ میرا نام اس کے دیوانوں میں سے کسی دیوان میں تو ہے، لیکن اے اللہ کے پیغمبر! میری ایک حاجت ہے۔" انہوں نے فرمایا: "بتا، تاکہ اللہ سے بیان کروں۔" اس نے عرض کیا کہ "آپ اللہ سے عرض کیجئے کہ اب جو تو مجھے دوزخ میں بھیجتا ہے تو مجھے ایسا کر دے کہ سب گنہگاروں کی جگہ میں ہی گھیر لوں تا کہ وہ سب بہشت میں چلے جائیں۔" حکم ہوا کہ اس بندے سے کہہ دیجئے کہ "تیرا یہ امتحان تیری رُسوائی کے لیے نہ تھا بلکہ مخلوق میں تجھے ظاہر کرنا مقصود تھا۔ پس قیامت میں تو جس کی شفاعت کرے گا، وہ سب بہشت میں ہوں گے۔" میں نے حضرت احمد حماد سرخسیؒ سے دریافت کیا کہ آپ کی توبہ کی ابتدا کیسے ہوئی؟ تو آپ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں اپنے اونٹوں کو لے کر سرخس کے جنگل میں چلا گیا۔ کچھ مدت وہاں رہا اور میں ہمیشہ اس بات کو پسند کرتا تھا کہ میں خود تو بھوکا رہوں اور اپنا حصہ دوسرے کو دے دوں اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول میرے دل میں تازہ رہتا تھا کہ اس نے فرمایا ہے: وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔ (ترجمہ: اور وہ دوسروں کو اپنے نفسوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود ان کو حاجت ہو) اور اس گروہ کے ساتھ میں بڑا اعتقاد رکھتا تھا۔ چنانچہ ایک روز بھوکا شیر جنگل سے آیا اور اس نے میرے اونٹوں میں سے ایک کو مار ڈالا اور پھر بلندی پر چڑھ کر چنگھاڑا اور جتنے درندے آس پاس تھے، اس کی آواز سن کر اس کے پاس جمع ہو گئے۔ پھر اس نے آ کر اونٹ کو پھاڑ ڈالا، خود کچھ نہ کھایا اور بلندی پر چڑھ گیا اور وہ درندے لومڑی، گیدڑ، بھیڑیا وغیرہ سب اس میں سے کھانے لگے، اور شیر وہیں

ٹھہرا رہا۔ یہاں تک کہ وہ سب سیر ہو کر لوٹ گئے۔ تب اس نے قصد کیا کہ تھوڑا سا اس میں سے خود کھائے کہ ایک لنگڑی لومڑی دُور سے نمودار ہوئی۔ شیر اور بلندی پر چڑھ گیا۔ یہاں تک کہ وہ لومڑی جتنا کھا سکی کھا کر واپس چلی گئی۔ اب شیر نے آکر تھوڑا سا کھالیا۔ میں دُور سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جب وہ واپس لوٹا تو فصیح زبان میں مجھے کہنے لگا "اے احمد! لقمے کا ایثار تو کتے بھی کر لیا کرتے ہیں، مردانِ خدا تو اپنی جان اور زندگانی ایثار کیا کرتے تھے۔" جب میں نے یہ دلیل دیکھ لی تو تمام اشغال دنیا سے ہاتھ اٹھالیا۔ میری توبہ کی ابتدا یہ تھی۔

حضرت ابوجعفر خلدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ خلوت میں درگاہِ الٰہی میں مناجات کر رہے تھے۔ میں جا کر آپ کی مناجات ایسے طور پر سننے لگا کہ آپ کو معلوم نہ ہو۔ آپ نہایت اضطراب میں فرمارہے تھے: "بارِ خدایا! اہل دوزخ کو تو عذاب دے گا اور وہ سب تیرے علم، قدرت اور ارادے سے تیرے ہی پیدا کیے ہوئے ہیں اور اگر دوزخ کو تو آدمیوں سے بھرنا ہی چاہتا ہے تو تو اس بات پر قادر ہے کہ اس دوزخ اور اس کے تمام طبقات کو مجھ سے بھر دے اور ان کو بہشت میں بھیج دے۔" ابوجعفر فرماتے ہیں کہ میں آپ کے معاملے میں متحیر ہو گیا۔ کچھ دنوں کے بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی آنے والا آکر کہتا تھا کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "ابوالحسنؒ سے کہہ دو کہ ہم نے تمہیں اس شفقت اور تعظیم کی وجہ سے بخش دیا ہے، جو تمہیں ہم سے اور ہمارے بندوں سے ہے۔" آپ کو نوری اس لیے کہتے تھے کہ تاریک مکان میں جب آپ کلام کرتے تو آپ کے نورِ باطن کی وجہ سے مکان روشن ہو جاتا اور دوسرے یہ کہ نورِ حق تعالیٰ سے آپ اپنے مریدوں کے اسرار معلوم کر لیتے تھے۔ یہاں تک کہ جنیدؒ نے فرمایا کہ ابوالحسنؒ دلوں کے جاسوس ہیں۔ یہی آپ کے مذہب کی بڑی خصوصیت ہے اور اہل بصیرت کے نزدیک اپنی عزیز ترین چیز کا دوسروں کی خاطر چھوڑ دینا ایک قوی دلیل اور امرِ عظیم ہے کیونکہ کسی آدمی کے لیے اپنی روح کو خرچ کرنے اور اپنے محبوب سے ہاتھ اٹھا لینے سے بڑھ کر کوئی چیز سخت نہیں اور اللہ عزوجل نے تمام نیکیوں کی کنجی اپنی محبوب چیز کے خرچ کرنے میں رکھی ہے، چنانچہ فرمایا ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ (ترجمہ: اور جب تک تم اللہ کی راہ میں وہ چیز خرچ نہ کرو جس سے تم محبت رکھتے ہو، تب تک تم ہرگز نیکی حاصل نہیں کر سکو گے) جب کسی کی جان ہی اللہ کی راہ میں خرچ ہو جائے تو مال و منال اور خرقہ و لقمہ کیا وقعت رکھتا ہے؟ اس طریقے کا اصل یہ ہے کہ ایک شخص حضرت رویم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا کہ مجھے کوئی وصیت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا: يُبُنَيَّ لَيْسَ الْاَمْرُ غَيْرَ بَذْلِ الرُّوْحِ اِنْ قَدَرْتَ عَلٰى ذَالِكَ وَ اِلَّا فَلَا تَشْتَغِلُ بِتُرَّهَاتِ الصُّوْفِيَّةِ۔ (اے بیٹا! تصوف درحقیقت اللہ کی راہ میں جان خرچ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں، اگر تو کر سکے تو فبہا ورنہ صوفیوں کی فضول باتوں میں مشغول نہ ہو، کیونکہ جو کچھ اس کے سوا ہے وہ سب فضول باتیں ہیں)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ط بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ (ترجمہ: جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہوئے، ان کو مردے نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اللہ کے ہاں انہیں رزق دیا جاتا ہے)۔ نیز فرمایا: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ط بَلْ اَحْيَآءٌ (ترجمہ: جو لوگ اللہ کے راستے میں شہید ہوتے ہیں انہیں مردے نہ کہو، بلکہ وہ تو زندہ ہیں)۔

پس یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے حکم اور اس کے دوستوں کی متابعت میں اپنی جان کو صرف کرنے اور اپنا حصہ چھوڑ دینے کی وجہ سے قربِ حق میں دائمی زندگانی حاصل کرتے ہیں۔ ایثار و اختیار سب بظاہر تفرقہ ہیں مگر حقیقت میں جمع، اگر انہیں جدا جدا سمجھا جائے اور ایک ہی سمجھا جائے تو عین ایثار جو اپنے حصے کو چھوڑ دینا ہے، وہی اصل نصیب

ہو جاتا ہے اور جب تک طالب کی روش اپنے کسب سے متعلق رہتی ہے، اس کی ہلاکت کا باعث بنی رہتی ہے اور جب کشش الٰہی اس پر اپنی حکومت ظاہر کرتی ہے تو اس کے احوال اور افعال سب پریشان ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ اس کو بیان کی طاقت رہتی ہے اور نہ اس کی حالت کا کوئی نام ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس نام سے پکارے یا اس سے کچھ تعبیر کرے یا کسی چیز کو اس کے حوالے کرے اور اس کے معنی کے متعلق حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

غِبْتُ عَنِّی فَمَا اُحِسُّ بِنَفْسِیْ وَتَلَاشَتْ بِہٖ صِفَاتِی الْمُوْصُوْفَہٗ
فَاِنِّی الْیَوْمَ غَائِبٌ عَنْ جَمِیْعٍ لَیْسَ اِلَّا الْعِبَارَۃُ اللَّهْفَهُ

(ترجمہ: میں اپنے آپ سے غائب ہو گیا ہوں۔ پس مجھے اپنی ذات کا بھی احساس نہیں اور اس کی وجہ سے میری سب صفات معلومہ لاشے محض ہو گئیں۔ پس میں آج سب اشیاء سے غائب ہوں، سوائے پریشان عبارت کے اور کچھ نہیں رہا)۔

چھٹی فصل
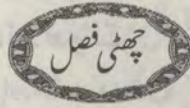
فرقۂ سہیلیہ

فرقۂ سہیلیہ کے بزرگ حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ سے محبت رکھتے ہیں اور آپ اہلِ تصوف کے باحشمت بزرگوں اور انکے سرداروں میں سے ہوئے ہیں، چنانچہ ان کا ذکر گزر چکا ہے۔ فی الجملہ آپ اپنے وقت کے بادشاہ اور طریقت میں اہل حل و عقد میں سے تھے۔ آپ کی دلیلیں بہت واضح تھیں کہ ان کے بیانات سمجھنے سے عقل عاجز ہے۔ تصوف میں آپ کا طریق سخت محنت اور نفس کا جہاد و ریاضت ہے۔ آپ اپنے مریدوں کو مجاہدے کے ذریعہ کمال کے درجے پر پہنچا دیتے تھے۔ حکایات میں مشہور ہے کہ آپ نے ایک مرید سے فرمایا کہ کوشش کر یہاں تک کہ ایک روز دن بھر تو اللہ اللہ ہی کہتا رہے اور اسی طرح دوسرے اور تیسرے روز بھی۔ جب اسے اس کی عادت ہوگئی تو فرمایا: اب راتوں کو بھی ساتھ شامل کر۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا، یہاں تک کہ وہ ایسا ہو گیا کہ اگر اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا تو خواب میں بھی وہی کہتا۔ یہ اس کی طبعی عادت ہوگئی۔ تب آپ نے فرمایا: اب اس سے باز آجا اور دوست کے خیال میں مشغول ہو جا۔ یہاں تک کہ اس کی حالت ایسی ہوگئی کہ وہ سارا وقت اسی میں مستغرق ہو گیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ وہ گھر کے اندر تھا کہ ایک لکڑی ہوا سے اندر آپڑی اور سر پر پڑی کہ سر پھٹ گیا اور خون کے قطرے جو اس کے سر سے زمین پر پڑتے تھے، ان سے اللہ اللہ لکھا ہوا ظاہر ہوتا تھا۔ مجاہدات و ریاضات کے ذریعے مریدوں کی پرورش سہیلیوں کا طریق، درویشوں کی خدمت اور ان کی حرمت حمدونیوں کا طریق اور باطن کا مراقبہ جنیدیوں کا طریقہ تھا لیکن ریاضت و مجاہدہ سب نفس کے لیے فائدہ مند نہیں ہوتا مگر نفس کی شناخت اور اس کی حقیقت بیان کرتا ہوں تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے، پھر مجاہدات کے متعلق معلوم ہو جائے، پھر مجاہدات کے متعلق صوفیا کے مذاہب اور ان کے احکام لکھوں گا تاکہ طالب معرفت پر یہ دونوں باتیں ظاہر ہو جائیں اور توفیق اللہ کے قبضے میں ہے۔

پہلی بحث

نفس کی حقیقت

جاننا چاہیے کہ نفس لغت کی رُو سے کسی چیز کا وجود اور اس کی حقیقت اور ذات ہے، لیکن لوگ اپنی عبارات میں اس کے کئی معانی لیتے ہیں جو آپس میں مختلف اور ایک دوسرے کی ضد ہیں، مثلاً کوئی اسے رُوح کہتا ہے تو کوئی مروّت اور

جوانمردی، یا ایک اسے جسم کہتا ہے تو دوسرا خون مگر صوفیا کے نزدیک ان معنوں میں سے کوئی بھی معنی مراد نہیں بلکہ وہ اسے شر کا منبع اور برائی کا رہنما کہتے ہیں اور اس پر ان سب کا اتفاق ہے لیکن ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ ایک عین چیز ہے، جو جسم میں ویسے ہی ودیعت کی گئی ہے جیسے روح۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ زندگی کی طرح جسم کی ایک صفت ہے مگر بایں ہمہ اس بات پر سب متفق ہیں کہ کمینے اخلاق اور برے افعال کا اظہار اسی کے سبب ہوتا ہے۔ ان کی دو قسمیں ہیں: اوّل، معاصی یعنی برے افعال اور دوسرے، رذی اخلاق مثلاً تکبر، حسد، بخل، کینہ اور غصہ وغیرہ شریعت و عقل میں ناپسندیدہ امور، پس ریاضت و مجاہدہ سے ان برے اوصاف کو اپنے سے دفع کیا جاتا ہے۔ گناہ اوصافِ ظاہری میں سے ہیں اور برے اخلاق اوصافِ باطنیہ میں سے اور ریاضت افعال ظاہری میں سے ہے اور توبہ اوصاف باطن میں سے۔ پس جو ردی اوصاف باطن میں پیدا ہوتے ہیں، وہ ظاہر کے اچھے اوصاف سے پاک ہو جاتے ہیں اور جو بد افعال ظاہر میں پیدا ہوتے ہیں، وہ باطن کے پسندیدہ اوصاف سے دُور ہو جاتے ہیں اور نفس و روح دونوں جسم اعیانِ لطیفہ[1] (غیر محسوسہ) میں سے ہیں جیسا کہ عالم میں شیاطین اور ملائکہ اور بہشت و دوزخ، لیکن ان ہر دو میں سے ایک روح محل خیر ہے اور دوسرا نفس محل شر۔ جس طرح محسوسات میں سے آنکھ محل نظر ہے اور کان محل شنوائی اور زبان محل ذوق، ایسے ہی دوسرے اعیانِ محسوسہ اور اوصاف اور اعراض ہیں جو آدمی کے جسم میں ودیعت کیے گئے ہیں۔ پس اس نفس کی خواہشات کی مخالفت تمام عبارات کا اصل اور مجاہدات کا کمال ہے اور بندہ سوائے مخالفت نفس کے حق تعالیٰ کی طرف راہ نہیں پاسکتا اس لیے کہ نفس کی موافقت بندے کی ہلاکت اور اس کی مخالفت بندے کی نجات کا باعث ہے۔ خدا تعالیٰ نے اس کی مخالفت کا حکم دیا ہے اور اس کے خلاف کوشش کرنے والوں کی تعریف اور اس کی موافقت کرنے والوں کی مذمت فرمائی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝۔ (ترجمہ: اور جس نے نفس کو خواہش سے باز رکھا پس اس کا ٹھکانہ جنت ہے) اور فرمایا ہے: اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ۔ (ترجمہ: پس کیا جب کبھی کوئی رسول ایسے احکام اللہ کی طرف سے لے کر تمہارے پاس آیا، جن کو تمہارے نفس نہیں چاہتے تو تم اکڑ بیٹھے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف صدیق علیہ السلام کی طرف سے ہمیں خبر دے کر فرمایا ہے: وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ (ترجمہ: اور میں اپنے نفس کو گناہ سے بری نہیں کرتا کیونکہ بلاشبہ نفس برائی کا بہت حکم دینے والا ہے بجز اس صورت کے کہ میرا پروردگار رحم فرمائے اور اس کی پیروی سے بچائے) اور پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا بَصَّرَهٗ بِعُيُوْبِ نَفْسِهٖ۔ (ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے بھلائی کرنا چاہتا ہے تو اس کو اپنے نفس کے عیوب دکھا دیتا ہے)۔

روایات میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی کر کے فرمایا: يَادَاوٗدُ! عَادِ نَفْسَكَ فَاِنَّ وُدِّيْ فِيْ عَدَاوَتِهَا۔ (ترجمہ: اے داود! اپنے نفس سے عداوت رکھ کیونکہ میری محبت اس کی عداوت میں ہے)۔ پس یہ سب اُمور جو ہم نے بیان کیے ہیں، اوصاف و اعراض ہیں اور ظاہر ہے کہ صفت کو ایک موصوف چاہیے جس کے ساتھ وہ قائم ہو، اس لیے کہ صفت قائم بخود نہیں ہوتی اور اس صفت کی معرفت سارے جسم کی شناخت کے سوا حاصل نہیں ہوسکتی۔ جسم کی شناخت کا طریق انسانیت کے اوصاف اور اس کا بھید بیان کرنے میں ہے

---

[1] اعیان لطیفہ لطائف ستہ میں سے ہے یعنی ان چھ لطائف میں سے جن کے نام یہ ہیں: نفس، قلب، روح، سر، خفی، اخفی اور یہ تمام عالم امر سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرا عالم، عالم خالق ہے جو محسوسات کا عالم اور مادی دنیا کہلاتا ہے۔

اور انسانیت کی حقیقت میں لوگوں نے کلام کیا ہے کہ انسانیت کس چیز کا نام ہے؟ اور کس چیز کے لائق ہے؟ اس کا علم سب طالبانِ حق پر فرض ہے، اس لیے کہ جو شخص اپنی حقیقت سے جاہل ہے، وہ غیر کی حقیقت سے زیادہ جاہل ہے، چونکہ بندے کو اللہ تعالیٰ کی معرفت کا حکم دیا گیا ہے تو اس کو پہلے اپنی معرفت بھی ضرور حاصل ہونی چاہیے تاکہ وہ اپنے حدوث کے صحیح ہونے سے اللہ تعالیٰ کے (قدیم ہونے) کو پہچان لے اور اپنی فنا سے حق تعالیٰ کی بقا کو معلوم کر لے اور کتاب اللہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کی صفت اپنی ذات سے جاہل ہونا بیان کی ہے اور فرمایا ہے: وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ط (ترجمہ: اور دین ابراہیم سے سوائے اس شخص کے جو اپنی ذات سے جاہل ہے، کون رُوگردانی کر سکتا ہے)؟ اور ایک بزرگ نے فرمایا ہے کہ مَنْ جَهِلَ نَفْسَهٗ فَهُوَ بِالْغَيْرِ اَجْهَلُ۔ (ترجمہ: جو اپنے نفس سے جاہل ہے، وہ غیر کی حقیقت سے زیادہ جاہل ہے) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فقد عَرَفَ رَبَّهٗ۔ (ترجمہ: جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا)۔ اَيْ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ بِالْفَنَاءِ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ بِالْبَقَاءِ۔ (ترجمہ: یعنی جس نے اپنے آپ کو فنا سے پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو بقا سے پہچان لیا) وَيُقَالُ من عَرَفَ نَفْسَهٗ بِالذُّلِّ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ بِالْعِزِّ (ترجمہ: اور بعض کہتے ہیں جس نے اپنے نفس کو ذلت سے پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو عزت سے پہچان لیا) وَيُقَالُ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ بِالْعُبُوْدِيَّةِ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ بالرَّبُوْبِيَّةِ۔ (ترجمہ: اور بعض کہتے ہیں جس نے اپنے نفس کو بندگی سے پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو ربوبیت سے پہچان لیا) پس جو شخص اپنے آپ کو نہیں پہچانتا، وہ کل کی معرفت سے حجاب میں رہتا ہے اور ان سب سے مراد انسانیت کی غایت ہے اور اہل قبلہ میں سے بعض لوگوں کا انسان کی حقیقت میں اختلاف ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ انسان سوائے روح کے اور کچھ نہیں، یہ جسم اس کی زرہ اور ڈھانچا ہے اور اس کی جگہ اور ٹھکانا ہے تاکہ وہ طبیعتوں کے خلل سے محفوظ اور آزاد رہے اور حس اور عقل اس کی صفت ہے لیکن یہ قول باطل ہے، اس لیے کہ یہ روح جب اس جسم سے جدا ہو جاتی ہے تو بھی اس کو انسان ہی کہتے ہیں اور یہ اسم انسان پر سے اُٹھ نہیں سکتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ جب اس میں جان ہوتی ہے تو اس کو زندہ انسان کہتے ہیں اور جب بے جان ہو جاتا ہے تو مردہ انسان کہلاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جان تو حیوان کے جسم میں بھی ودیعت کی گئی ہے، مگر اس کو انسان نہیں کہتے اور اگر انسانیت کا سبب روح ہی ہوتا تو چاہیے تھا کہ جس میں جان ہوتی، اس پر حکم انسانیت صحیح ہوتا۔ پس ان کے قول کے باطل ہونے پر دلیل قائم ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ انسان کا یہ اسم روح و جسم دونوں پر ایک ساتھ واقع ہوتا ہے، لہٰذا جب ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائے تو یہ اسم اس سے ساقط ہو جاتا ہے، چنانچہ گھوڑے پر جب دو رنگ سیاہ و سفید جمع ہو جاتے ہیں تو اس کو ابلق کہتے ہیں۔ جب وہ رنگ ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں تو ایک کو سیاہ اور دوسرے کو سفید کہتے ہیں، لیکن یہ قول بھی اللہ تعالیٰ کے اس قول سے باطل ہے جو اس نے فرمایا ہے: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا۔ (ترجمہ: زمانے میں سے ایک وقت انسان پر ایسا آچکا ہے کہ اس کا کچھ ذکر بھی نہ تھا) اس آیت شریفہ میں انسان کی مٹی کو بغیر جان کے انسان فرمایا کہ ابھی تک جان اس کے قالب میں نہ ملی تھی۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ انسان ایک جز ولایتجزیٰ[1] ہے اور اس کا محل دل ہے کہ آدمی کے تمام اوصاف کی بنیاد وہی ہے، لیکن یہ قول بھی صحیح نہیں کیوں کہ اگر ایک آدمی کو قتل کر کے اس میں سے دل باہر نکال لیں

[1] ایک ایسا چھوٹے سے چھوٹا جزو جس کا تجزیہ نہ ہو سکے۔

تو بھی انسانیت کا اسم اس سے نہیں گرتا اور جان سے پہلے بالاتفاق آدمی کے جسم کے دل نہ تھا اور صوفی مدعیوں کے ایک گروہ کو اس معنی میں غلطی واقع ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کھانے پینے والا محل تغیر نہیں بلکہ وہ سر الٰہی ہے اور یہ جسم اس کی پوشش ہے اور وہ طبیعت کے امتزاج اور روح و جسم کے اتحاد میں ودیعت کیا گیا ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ سب کے اتفاق سے عقل مندوں، دیوانوں اور کافروں کا نام انسان ہی ہے اور اس سر الٰہی کی کوئی بات ان میں موجود نہیں اور وہ سب تغیر پذیر اور کھانے پینے والے ہی ہیں اور آدمی کے جسم اور وجود میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کو انسان کہیں اور نہ اس جسم کے معدوم ہونے کے بعد ہی کوئی ایسی چیز ہے جسے انسان کہا جائے اور خدائے عزوجل نے تمام مادوں کو جو اس نے ہمارے اندر ترکیب دیئے ہیں 'انسان کہا ہے۔ بغیر ان معنوں کے جو بعض آدمیوں میں پائے نہیں جاتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ ۞ ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ نُطۡفَةً فِىۡ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ ۞ ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَةَ مُضۡغَةً فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ‌ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ۔ (ترجمہ: ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے خلاصے سے، ہم نے بنایا اسے نطفہ ایک مضبوط قرار گاہ (رحم) میں، پھر ہم نے نطفہ کو خون بستہ بنایا، پھر خون بستہ کو گوشت کا لوتھڑا اور لوتھڑے کو ہڈیاں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا اور پھر اسے اور ہی مخلوق یعنی انسان کامل بنا دیا بس بابرکت ہے اللہ سب سے اچھا بنانے والا)۔ پس اللہ عزوجل کے قول کے مطابق جو سب سے زیادہ سچا ہے، مٹی کی یہ خاص صورت اپنی زیبائی اور تغیرات کے ساتھ انسان ہے۔ چنانچہ اہل سنت کا ایک گروہ کہتا ہے کہ انسان ایک جاندار کا نام ہے جس کی صورت اس صفت کے ساتھ معلوم ہے کہ موت بھی اسم انسان کو اس سے جدا نہیں کر سکتی، جب تک ظاہر و باطن میں کسی صورت سے وابستہ ہے اور اس جسم سے موسوم ہے۔ صورت معلوم سے مراد ظاہر میں تندرست اور بیمار ہونا ہے اور باطن میں جسم کا مجنون یا عاقل کے نام سے موسوم ہونا ہے اور بالاتفاق جو انسان زیادہ صحیح ہے، وہ پیدائش میں زیادہ کامل ہے۔

پس جاننا چاہیے کہ انسان کی ترکیب محققین کے نزدیک تین باتوں سے کامل ہوتی ہے: ایک روح، دوسرے نفس، تیسرے جسم اور ان میں سے ہر ایک چیز کے لیے ایک صفت ہے، جو اس کے ساتھ قائم ہے، چنانچہ روح کی صفت عقل ہے اور نفس کی صفت خواہش اور جسم کی صفت حس ہے اور آدمی نمونہ ہے کل عالم کا اور عالم نام ہے دو جہاں کا۔ چنانچہ انسان میں دونوں کا نشان موجود ہے۔ عالم ظاہر کا نشان پانی، آگ، مٹی اور ہوا ہے اور اس کی ترکیب کی وجہ سے بلغم، خون، صفراء و سودا سے ہے۔ عالم باطن کا نشان بہشت اور دوزخ و عرصات ہے، چنانچہ جان لطافت کی وجہ سے بہشت ہے اور نفس خرابی و وحشت کی وجہ سے دوزخ ہے اور جسم بجائے عرصات یعنی میدان قیامت کے ہے اور ان دونوں چیزوں کا جمال، قہر اور باہمی انس سے ہے۔ پس بہشت رضا کی تاثیر ہے اور دوزخ اس کے غضب کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح مومن کی روح معرفت الٰہی کی راحت سے ہے اور اس کا نفس گمراہی کے حجاب سے اور جب تک قیامت میں مومن دوزخ سے خلاصی نہ پائے گا، بہشت میں نہیں پہنچے گا اور رویت حق کی حقیقت اور خالص محبت الٰہی نہیں پا سکے گا۔ اسی طرح بندہ دنیا میں جب تک نفس سے نجات حاصل نہیں کرتا اور حق کی محبت تک نہیں پہنچتا، جس کی اصل اور بنیاد روح ہے تب تک وہ قربِ الٰہی اور معرفت حق کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ پس جو شخص دنیا میں حق سبحانہ کو پہچان لے اور دوسروں سے اعراض کرے اور شریعت کے راستے پر قائم ہو، وہ قیامت میں دوزخ اور پل صراط کو نہیں دیکھے گا۔ الغرض مومن کی روح اس کو بہشت کی طرف دعوت دینے والی ہے، کیونکہ دنیا میں بہشت کا نمونہ وہی ہے اور

اس کا نفس اس کو دوزخ کی طرف بلانے والا ہے، کیونکہ دنیا میں دوزخ کا نمونہ وہی ہے اور اس روح کی مدبر کامل عقل ہے اور نفس کی رہبر ناقص خواہش، اور عقل کی تدبیر حق ہے اور خواہش کی تدبیر خطا۔ اس لیے طالبانِ حق کو لازم ہے کہ ہمیشہ نفس کی مخالفت کے طریق پر چلیں تاکہ اس کے خلاف روح و عقل کی مدد کرسکیں، جو سرِ الٰہی کا محل ہے۔

دوسری بحث

نفس کے بارے میں مشائخ کے اقوال

نفس کے بارے میں مشائخ کے اقوال یہ ہیں: حضرت ذوالنون قدس سرہٗ فرماتے ہیں: اَشَدُّ الْحِجَابِ رُؤْیَةُ النَّفْسِ وَتَدْبِیْرُھَا۔ (ترجمہ: نفس اور اس کی تدبیر کو مدنظر رکھنا سخت ترین حجاب ہے) کیونکہ اس کی متابعت حق عزوجل کی مخالفت ہے اور حق کی مخالفت سب سے بڑا حجاب ہے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلنَّفْسُ صِفَةٌ لَا تَسْکُنُ اِلَّا بِالْبَاطِلِ۔ (ترجمہ: نفس ایک ایسی صفت ہے جو صرف باطل سے ہی تسکین پاتی ہے) یعنی وہ کبھی حق کے راستے پر نہیں چلتا۔ حضرت محمد بن علی ترمذی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: تُرِیْدُ اَنْ تَعْرِفَ الْحَقَّ مَعَ بُصَاءِ نَفْسِكَ فِیْكَ وَنَفْسُكَ لَا تَعْرِفُ نَفْسَھَا فَکَیْفَ تَعْرِفُ غَیْرَھَا (ترجمہ: تو چاہتا ہے کہ خدا کو پہچانے، حالانکہ تیرا نفس تیرے اندر باقی ہے اور نفس اپنے آپ کو نہیں پہچانتا تو وہ غیر کو کیسے پہچانے گا؟) یعنی نفس اپنی بقا کی حالت میں اپنے آپ سے حجاب میں ہے تو بھلا حق کا مشاہدہ اس کو کیسے ہوسکتا ہے؟ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں: اَسَاسُ الْکُفْرِ قِیَامُكَ عَلٰی مُرَادِ نَفْسِكَ۔ (ترجمہ: تیرا اپنے نفس کی مراد پر قائم ہونا ہی کفر کی بنیاد ہے) کیونکہ نفس کو اسلام سے کوئی قرابت نہیں، اس لیے وہ ہمیشہ اسلام سے اعراض کی کوشش کرے گا اور اسلام سے اعراض کرنے والا منکر ہوتا ہے اور منکرِ حق سے بیگانہ ہوتا ہے۔ حضرت ابوسلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں: اَلنَّفْسُ خَائِنَةٌ مَانِعَةٌ وَاَفْضَلُ الْاَعْمَالِ خَلَافُھَا۔ (ترجمہ: نفس امانت میں خیانت کرنے والا اور حق کی رضا جوئی سے منع کرنے والا ہے اور سب سے افضل عمل اس کی مخالفت ہے) اس لیے کہ امانت میں خیانت بیگانگی ہے اور رضائے حق کو ترک کرنا گمراہی ہے، غرضیکہ نفس کے متعلق مشائخ کرام کے اقوال و ارشادات اتنے زیادہ ہیں جن کا احاطہ ممکن نہیں، اس لیے میں بخوف طوالت انہیں چھوڑ دیتا ہوں اور حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ کا مذہب بیان کرتا ہوں، جس میں مجاہدۂ نفس اور اس کی ریاضت کا ذکر ہے اور ساتھ ہی اس کی حقیقت کی وضاحت بھی ہے۔

تیسری بحث

مجاہدۂ نفس

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا وَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْمُجَاھِدُ مَنْ جَاھَدَ نَفْسَہٗ فِی اللّٰہِ۔ (ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وہ لوگ جنھوں نے کوشش کی ہمارے دین میں، ہم ان کو اپنے راستے دکھاتے ہیں، اور نبی ﷺ نے فرمایا ہے: مجاہدہ وہ ہے جس نے اللہ کے لیے اپنے نفس سے جہاد کیا)۔ نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: رَجَعْنَا مِنَ الْجِھَادِ الْاَصْغَرِ اِلَی الْجِھَادِ الْاَکْبَرِ۔ قِیْلَ مَا الْجِھَادُ الْاَکْبَرُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اَلَاوَھِیَ مُجَاھَدَةُ النَّفْسِ۔ (ترجمہ: ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹے، عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ! جہادِ اکبر کیا ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا: سنو! وہ مجاہدۂ نفس ہے) اور رسول اللہ ﷺ نے

مجاہدۂ نفس کو جہاد پر فضیلت دی ہے، اس لیے کہ اس کی تکلیف زیادہ ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جہاد خواہش نفس کا ہٹانا ہے اور مجاہدہ اس کا مغلوب کرنا ہے۔ پس اللہ تمہیں بزرگی دے، تمہیں جاننا چاہیے کہ نفس کا مجاہدہ اور اس کو اپنے قابو میں کرنا بالکل واضح اور ظاہر ہے کہ تمام ادیان اور مذاہب کے لوگوں میں پسندیدہ ہے اور اہل طریقت خاص طور پر اس پر رعایت کرتے ہیں اور یہ عبارت ان کے خاص و عام میں جاری و مستعمل ہے اور اس کے متعلق مشائخ کے بہت سے کلمات اور رموز ہیں، خصوصاً حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ اس اصل میں بہت غلو کرتے ہیں اور مجاہدات و ریاضت میں آپ کے دلائل بہت ہیں۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنے آپ کو اس بات کا عادی بنا رکھا تھا کہ پندرہ روز کے بعد ایک دفعہ کھانا کھاتے تھے اور اس تھوڑے سے کھانے پر لمبی عمر گزار دی۔

سب محققین نے مجاہدات و ریاضت کی رُوحانی اہمیت کو ثابت کیا ہے اور ان کو مشاہدۂ حق کا سبب بتایا ہے لیکن سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ نے مجاہدے کو مشاہدۂ حق کی علت قرار دیا ہے اور حصولِ مقصود کے لیے مجاہدے کی بہت بڑی تاثیر بیان کی ہے۔ آپ طلب حق میں دنیا کی زندگی کو حصول مراد کی خاطر عقبیٰ کی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ وہ زندگی (عقبیٰ) اس زندگی (دنیا) کا ثمرہ ہے، جب تو دنیا میں خدمت کرے گا تو وہاں قربت حاصل کرے گا اور قربت بے عمل میسر نہیں ہوسکتی، ضرور ہے کہ حق کے حصول کی علت بندے کا مجاہدہ ہو جو وہ اسی کی توفیق سے کرتا ہے۔ فرماتے ہیں: اَلْمُشَاهَدَاتُ مَوَارِيْثُ الْمُجَاهِدَاتِ (ترجمہ: مشاہدے مجاہدوں کی میراثیں یعنی نتائج ہیں)۔ دوسرے مشائخ کہتے ہیں کہ حق تک پہنچنے کی کوئی علت نہیں کیونکہ جو بھی حق تعالیٰ تک پہنچا، وہ اس کے فضل سے پہنچا اور اس کے فضل کو بندے کے فعلوں سے کیا کام، پس مجاہدہ نفس کی درستی کے لیے ہے نہ کہ قرب کے حصول کے لیے کیونکہ مجاہدے کا رجوع بندے کی طرف ہوتا ہے اور مشاہدہ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اس لیے محال ہے کہ مجاہدہ مشاہدہ کی علت ہو یا مشاہدے مجادلے کا آلہ ہو اور حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ کی دلیل کی بنیاد اللہ عزوجل کا یہ قول ہے: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ (ترجمہ: جو لوگ ہمارے لیے مجاہدہ کرتے ہیں، ہم ان کو اپنے تک پہنچنے کے راستے دکھا دیتے ہیں)۔ نیز تمام انبیاء کا بھیجا جانا اور شریعت کا ثابت کرنا، کتابوں کا نازل ہونا اور تکلیف کے سب احکام مجاہدہ ہیں، اگر مجاہدہ مشاہدہ کی علت نہ ہوتا تو ان سب کا حکم باطل ہو جاتا ہے نیز دنیا و عقبیٰ کے تمام احوال حکمتوں اور علتوں کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں، اگر علتوں کی نفی کر دیں تو شریعت اور رسم سب اٹھ جائے، نہ اصل میں تکلیف کا ثابت کرنا درست ہو نہ فرع میں۔ کھانا پیٹ بھرنے کے لیے اور کپڑا سردی ہٹانے کے لیے علت ہے اور یہ علت کی نفی کل امور کے بیکار کرنے کا سبب ہے۔ پس افعال میں اسباب کا اعتبار کرنا تو توحید میں داخل ہے اور اس کو ہٹا دینا نظام عالم کا تعطل ہے۔

مشاہدات میں اس امر کی دلیلیں موجود ہیں اور مشاہدے کا انکار کرنا کھلم کھلا مکابرہ ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ سرکش گھوڑے کو ریاضت سے حیوانی صفت سے نکال کر انسانی صفت میں لے آتے ہیں اور حیوانی اوصاف کو اس میں بدل دیتے ہیں، یہاں تک کہ وہ چابک کو زمین سے اٹھا کر دے دیتا ہے اور گیند کو ہاتھ سے پھیر دیتا ہے اور اسی طرح بے عقل عجمی لڑکے کو ریاضت سے عربی زبان بولنے والا بنا دیتے ہیں اور اسکی طبعی مادری گویائی کو اس کے اندر تبدیل کر دیتے ہیں اور وحشی جانور کو ریاضت کے اس درجے پر پہنچا دیتے ہیں کہ جب اس کو چھوڑ دیں تو چلا جاتا ہے اور بلائیں تو واپس آجاتا ہے۔ قید کی تکلیف اسے آزادی اور چھوٹ جانے سے زیادہ محبوب ہوتی ہے اور ایک ناپاک کتے کو مجاہدے

سے اس محل پر پہنچادیتے ہیں کہ اس کا مارا ہوا جانور حلال ہو جاتا ہے، حالانکہ بے مجاہدہ اور ریاضت نہ پائے ہوئے کتے کا مارا ہوا حرام ہو جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ پس، شرع اور رسم سب کا مدار مجاہدے پر ہے اور رسول اللہ ﷺ نے قربِ حق، حصولِ مقصود، امن، عاقبت وعصمت کے محقق ہونے کی حالت میں بھی لمبی بھوکوں اور صوم وصال کی بیداریوں سے اتنا مجاہدہ کیا ہے کہ آپ کو فرمانِ الٰہی ہوا۔ طٰهٰ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى۔ (ترجمہ: اے محمد ﷺ! ہم نے قرآن آپ پر اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ اس کی وجہ سے رنج اٹھائیں)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت خود اینٹیں اٹھاتے تھے اور میں دیکھتا تھا کہ آپ کو تکلیف ہوتی تھی۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ) وہ اینٹ مجھے دے دیجیے کہ میں آپ کی جگہ کام کروں۔ آپ نے فرمایا: یَا اَبَا هُرَيۡرَةَ خُذۡ غَيۡرَهَا فَاِنَّهٗ لَاعَيۡشَ اِلَّاعَيۡشُ الۡاٰخِرَةِ۔ (ترجمہ: اے ابوہریرہؓ! تو دوسری اینٹ لے لے کیونکہ اچھی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے) یعنی آخرت ہی عیش کا مکان ہے اور دنیا تو رنج ومصیبت کا گھر ہے۔

حضرت حیان بن خارجہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ آپ غزا کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: اِبۡدَاۡ بِنَفۡسِكَ فَجَاهِدۡنَا وَابۡدَاۡ بِنَفۡسِكَ فَاغۡزِهَا۔ (ترجمہ: جہاد اپنے نفس سے شروع کر اور غزا بھی اپنے نفس سے شروع کر): فَاِنَّكَ اِنۡ قُتِلۡتَ فَارًّا بَعَثَكَ اللّٰهُ فَارًّا وَاِنۡ قُتِلۡتَ مُرَاءِ يًا بَعَثَكَ اللّٰهُ مُرَاءِ يًا وَاِنۡ صَابِرًا مُحۡتَسِبًا بَعَثَكَ اللّٰهُ صَابِرً اللّٰه مُحۡتَسِبًا۔ (پس اگر تو بھاگتے ہوئے قتل کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ تمہیں قیامت میں بھاگتا ہوا اٹھائے گا، اگر تو ریاکاری کرتے ہوئے قتل کیا جائے گا تو اللہ تجھے ریاکار اٹھائے گا اور اگر ثواب کی نیت سے صبر کرتے ہوئے قتل کیا جائے گا تو اللہ تجھے صابر اور ثواب کی نیت کرنے والا اٹھائے گا) پس جس قدر معانی کے بیان کرنے میں عبارات کی ترکیب اور تالیف کو اثر ہے، اتنا ہی اصل معارف تک پہنچنے میں مجاہدات کی تالیف وترکیب کو اثر ہے۔ کوئی بیان عبارت اور اس کی تالیف کے بغیر درست نہیں ہو سکتا، تو معارف تک پہنچنا بھی بغیر مجاہدہ اور اس کی ترکیب کے درست نہیں ہو سکتا، اور جو خلاف دعویٰ کرے، خطاکار ہے کیونکہ عالم اور اس کے حدوث کو ثابت کرنا معرفت خالق کی دلیل ہے اور نفس اور اس کے مجاہدے کی معرفت وصل حق کی دلیل ہے اور دوسرے گروہ کی یہ دلیل ہے کہ یہ آیت تفسیر میں مقدوم ومؤخر ہے، چنانچہ وَالَّذِيۡنَ جَاهَدُوۡافِيۡنَا لَنَهۡدِيَنَّهُمۡ سُبُلَنَا (ترجمہ: جنھوں نے ہمارے دین میں مجاہدہ کیا، ہم ان کو اپنے راستے دکھا دیتے ہیں) دراصل یوں ہے: وَالَّذِيۡنَ هَدَيۡنَاهُمۡ سُبُلَنَا جَاهَدُوۡافِيۡنَا۔ (جن کو ہم نے اپنے راستوں کی ہدایت کی انہوں نے ہمارے لیے مجاہدہ کیا) اور رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا ہے: لَمۡ يُنۡجِ اَحَدُكُمۡ بِعَمَلِهٖ قِيۡلَ لَهٗ وَاَنۡتَ يَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ۔ قَالَ وَلَا اَنَا اِلَّا اَنۡ يَّتَغَمَّدَ فِى اللّٰهِ بِرَحۡمَتِهٖ۔ (ترجمہ: تم میں سے کوئی شخص بھی صرف اپنے عمل سے نجات نہیں پائے گا۔ کسی نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ بھی نجات نہیں پاسکیں گے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: میں بھی نجات نہیں پاسکوں گا، مگر اسی صورت میں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت میں چھپالے) پس مجاہدہ بندے کا فعل ہے اور یہ محال ہے کہ اس کا فعل اسی کی نجات کی علت ہو۔ پس خلاصی اور نجات مشیت الٰہی سے متعلق ہے نہ کہ مجاہدے سے، کیونکہ ارشادِ الٰہی ہے: فَمَنۡ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنۡ يَّهۡدِيَهٗ يَشۡرَحۡ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ ۚ وَمَنۡ يُّرِدۡ اَنۡ يُّضِلَّهٗ يَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا۔ (ترجمہ: پس جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت کرنا چاہتا ہے، اس کا سینہ اسلام کو قبول کرنے کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہ رکھنا چاہتا ہے اس کا سینہ تنگ اور سخت کر دیتا ہے) نیز فرمایا: تُؤۡتِى الۡمُلۡكَ مَنۡ تَشَآءُ

وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ (ترجمہ: اے اللہ! تو جسے چاہتا ہے، بادشاہی دے دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے، بادشاہی چھین لیتا ہے)۔ اس آیت کریمہ سے بھی اہلِ عالم کے ہر فعل میں اللہ تعالیٰ کی مشیت واضح ہوتی ہے، لہٰذا اگر مجاہدہ وصول الی الحق کی علت ہوتا تو ابلیس مردود نہ ہوتا اور اگر مجاہدے کا ترک کرنا راندۂ درگاہ ہونے کی علت ہوتا تو آدم علیہ السلام ہرگز مقبول و برگزیدہ نہ ہوتے، پس ثابت ہوا کہ فلاح و نجات کے لیے فقط عنایت الٰہی کی سبقت درکار ہے نہ کہ مجاہدے کی کثرت، کیونکہ جو شخص زیادہ مجاہدہ کرنے والا ہے، وہ اپنی کثرتِ مجاہدہ سے اللہ تعالیٰ کے قہر و مواخذہ سے بے خوف نہیں ہوسکتا بلکہ جس پر عنایت حق زیادہ ہے، وہ حق سے زیادہ نزدیک ہے، غرضیکہ ایک تو عبادت خانے میں عبادت کرتا ہوا حق تعالیٰ سے دور ہے اور دوسرا خرابات میں نافرمانی کرتا ہوا حق سے نزدیک ہوسکتا ہے۔ سب امور سے اشرف ایمان ہے۔ ایک لڑکا جو ابھی مکلّف نہیں، وہ مسلمان کہلاتا ہے اور دیوانوں کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ پس جب سب سے زیادہ بخششوں کے لیے مجاہدہ علت نہیں تو جو بخششیں ان سے کم ہیں، وہ بھی علت کی محتاج نہیں ہونگی۔

میں علی بن عثمان جلابی کہتا ہوں کہ یہ اختلاف صرف عبارات میں ہے، معنی میں نہیں اس لیے کہ ایک تو کہتا ہے مَنْ طَلَبَ وَجَدَ (جس ڈھونڈا پالیا) اور دوسرا کہتا ہے مَنْ وَجَدَ طَلَبَ۔ (جس نے پالیا، طلب کیا) پالینے کا سبب طلب کرنا اور طلب کرنے کا سبب پالینا ہے۔ ایک تو مجاہدہ کرتا ہے کہ مشاہدہ پالے اور دوسرا مشاہدہ کرتا ہے کہ مجاہدہ پالے اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ مجاہدہ مشاہدے کے لیے بالکل ویسا ہی ہے جیسا عبادت کے لیے توفیق اور بخشش الٰہی، پس جیسے بلا توفیق الٰہی بندگی کا حاصل ہونا محال ہے، ویسے ہی بندگی کے بغیر توفیق کا حاصل ہونا بھی محال ہے اور جس طرح مشاہدہ بغیر مجاہدے کے حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح مجاہدہ بھی بغیر مشاہدے کے محال ہے پس جمال الٰہی کی شعاع درکار ہے تاکہ وہ بندے کو مجاہدے کی طرف رہنمائی کرے اور جب جمال حق کی تجلیات مجاہدے کے لیے علت ہوں تو مجاہدے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہوگی لیکن وہ بات جو حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب حجت میں پیش کرتے ہیں کہ جو شخص مجاہدے کو ثابت نہیں کرتا اور اس کی شرعی اہمیت سے انکار کرتا ہے، وہ تمام انبیا، کتابوں اور شریعتوں کے وارد ہونے کا منکر ہے کیونکہ تکلیف شرعی کا مدار مجاہدے پر ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ مدار تکلیف فقط ہدایت الٰہی پر سمجھا جائے کیونکہ مجاہدہ اثبات حجت کے لیے ہے نہ کہ وصول الی اللہ کے لیے، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے: وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ۔ (ترجمہ: اور اگر ہم ان کی طرف فرشتوں کو بھیجتے اور ان سے مردے کلام کرتے اور اگر ہم ان کی راہ میں پڑنے والی ہر چیز کو زندہ کر کے اُٹھا کھڑا کرتے تو بھی وہ ایمان نہ لاتے مگر اسی صورت میں کہ اللہ چاہتا، لیکن ان میں سے اکثر اس بات کو نہیں جانتے) کیونکہ یہاں ایمان کی علت فقط مشیت الٰہی کو قرار دیا ہے، نہ دلائل کے دیکھنے کو اور نہ ان کے مجاہدات کو۔ نیز فرمایا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (ترجمہ: بلاشبہ جو لوگ کافر ہیں، آپ کا انھیں ڈرانا یا نہ ڈرانا ان کے لیے برابر ہے۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے) یعنی حجت کا ظاہر کرنا، دلائل کا پیش کرنا، انہیں احوال قیامت سے ڈرانا اور ان کو چھوڑ دینا ان کے لیے برابر ہے، وہ ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ ان کے دلوں پر ازلی بدبختی کی مہر لگی ہوئی ہے۔

پس انبیاء کا آنا، کتب الٰہیہ کا نازل ہونا، شریعتوں کا ثبوت اور ان پر ایمان لانا یہ سب اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے اسباب ہیں نہ کہ اس تک پہنچنے کی علت، کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تو عدل و فضل حق سے حق تعالیٰ تک پہنچ

گئے اور ابوجہل عدل سے اللہ تعالیٰ کے فضل کے بغیر حق تک پہنچنے سے رہ گیا۔ پس وصول کی علت عین وصول ہے نہ وصول کی طلب، کیونکہ اگر طالب اور مطلوب دونوں ایک ہوتے تو طالب واجد (پانے والا) ہوتا اور جب واجد ہوتا تو طالب نہ ہوتا کیونکہ پہنچا ہوا آرام یافتہ ہوتا ہے اور طالب پر آرام درست نہیں ہوتا۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: مَنِ اسْتَوٰی یَوْمَاہُ فَھُوَ مَغْبُوْنٌ۔ (ترجمہ: جس کے دو دن برابر ہوں، وہ نقصان میں ہے) یعنی طالبانِ حق میں سے جس شخص کے دو دن برابر ہوں، وہ نقصان میں ہے کیونکہ ضرورت ہے کہ اس کا ہر روز پہلے سے بہتر ہو اور طالبانِ حق کا درجہ ہے، پھر فرمایا ہے اِسْتَقِیْمُوْا وَلَنْ تَحْصُوْا۔ (ترجمہ: ثابت قدم رہو اور تم ہرگز اُبھارے نہیں جاؤ گے) یعنی ایک حال پر رہو گے۔ پس مجاہدہ اور ریاضت کو صوفیا نے بالاتفاق سبب تو قرار دیا ہے لیکن یہ فقط اثبات حجت اور اجر و ثواب کے لیے ہے، مشاہدہ حق کے لیے علت نہیں، کیونکہ مجاہدہ اور ریاضت بندے کے افعال ہیں اور مشاہدۂ حق عطیہ خداوندی ہے جو بندے کے کسی فعل کا مرہون نہیں۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ گھوڑے کو مجاہدے سے دوسری صفت میں تبدیل کر لیتے ہیں، سو جاننا چاہیے کہ گھوڑے میں ایک پوشیدہ صفت ہوتی ہے جس کے اظہار کیلیے مجاہدہ سبب ہے کیونکہ جب تک گھوڑا ریاضت حاصل نہیں کر لیتا، وہ صفت ظاہر نہیں ہوتی اور گدھے میں چونکہ وہ صفت نہیں ہوتی، لہٰذا وہ کبھی گھوڑا نہیں ہو سکتا چنانچہ گھوڑے کو مجاہدے سے گدھا بنا سکتے ہیں نہ گدھے کو ریاضت سے گھوڑا، اس لیے کہ یہ اصل کا تبدیل کرنا ہے اور کسی چیز کی اصل بدلی نہیں جا سکتی۔ پس حضرت حق سبحانہٗ تعالیٰ کے بارے میں اس امر کو ثابت کرنا کہ بندہ مجاہدے سے اللہ تک پہنچ سکتا ہے، محال ہے۔ حضرت سہل تستری رحمتہ اللہ علیہ پر اس قسم کا مجاہدہ وقوع پذیر ہوتا تھا کہ آپ اس سے آزاد ہوتے تھے اور اس مجاہدہ کے بیان کرتے وقت عبارت کی حقیقت سے آپ الگ ہوتے۔ نہ ان لوگوں کی طرح ہوتے تھے جنھوں نے ان کی عبارت کو بغیر عمل کا مذہب قرار دیا ہے اور محال ہے کہ جو کچھ عمل میں آتا ہے، وہ سب عبارت میں بھی آ جائے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اہل طریقت کے نزدیک بالاتفاق مجاہدہ و ریاضت ثابت ہے لیکن اس کو وصول الی اللہ کی علت قرار دینا غلط ہے۔ پس جو شخص مجاہدے کی نفی کرتا ہے اس کی مراد عین مجاہدے کی نفی نہیں بلکہ مجاہدے کو مدار وصول سمجھنے اور محل قدس میں اپنے افعال پر مغرور ہونے کی نفی ہے کیونکہ مجاہدہ بندے کا فعل ہوتا ہے اور مشاہدہ عطیہ الٰہی اور جب تک عطائے الٰہی نہ ہو، بندے کا فعل کچھ قیمت نہیں رکھتا۔ میری جان کیا خود تیرا دل نہیں گھبراتا کہ تو اپنے آپ کو تو اتنی آرائش (اہمیت) دے اور اللہ تعالیٰ کے فضل کو نہ دیکھے اور اپنے فعل کی تعریف میں اتنی باتیں بناتا چلا جائے۔ پس دوستانِ حق کا مجاہدہ ان کے اختیار کے بغیر فعل حق ہوتا ہے اور وہ محبت الٰہی سے مقہور اور شوقِ الٰہی میں پگھل جاتے ہیں اور ان کا یہ پگھل جانا عین نوازش الٰہی ہے۔ غافلوں کا مجاہدہ خود ان کے اختیار سے ان کا فعل ہوتا ہے اور وہ سراسر پریشانی اور پراگندگی ہے اور پرگندہ دل خرابی سے مزید پراگندہ ہوتا ہے۔ پس جہاں تک ہو سکے اس کے کسی فعل کا ذکر نہ کرو اور کسی صفت میں نفس کی متابعت نہ کرو کیونکہ تمہاری خودی کا وجود ہی تمہارا حجاب ہے، اگر ایک فعل سے حجاب ہوتا تو دوسرے فعل سے حجاب اُٹھ جاتا ہے لیکن جب تمھاری ہستی ہی حجاب ہے تو جب تک تم پورے طور فنا نہ ہو جاؤ، بقا کے قابل نہیں ہو سکتے: لِاَنَّ النَّفْسَ کَلْبٌ بَاغٍ وَجِلْدُ الْکَلْبِ لَا یَطْھُرُ اِلَّا بِالدِّبَاغِ۔ (ترجمہ: کیونکہ نفس امارہ ایک سرکش کتا ہے اور کتے کا چمڑہ سوائے دباغت کے پاک نہیں ہو سکتا)۔ حکایت میں مشہور ہے کہ ایک مرتبہ حسین بن منصورؒ کوفہ میں محمد بن الحسین علوی کے مکان پر اترے ہوئے تھے۔ اتفاق سے حضرت ابراہیمؒ

خواص بھی ان دنوں کوفہ تشریف لائے، جب ان کی آمد کی خبر سنی تو ان کے پاس گئے۔ حضرت حسینؒ بن منصور نے حضرت ابراہیمؒ سے پوچھا کہ چالیس سال سے جو آپ نے یہ طریق اختیار کر رکھا ہے تو اس سے آپ کو کیا چیز حاصل ہوئی؟ انہوں نے فرمایا: مجھے توکل حاصل ہوا۔ تب حضرت حسین بن منصور نے کہا: نَسِیْتَ عُمُرَكَ فِیْ عِمْرَانِ بَاطِنِكَ فَاَیْنَ الْفَنَاءُ فِی التَّوْحِیْدِ۔ (ترجمہ: تو نے اپنی عمر کو اپنے باطن کے آباد کرنے میں فنا کر دیا، پس توحید میں فنا کہاں؟) یعنی توکل سے مراد اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دینا اور اس پر بھروسا کرنے سے اپنے باطن کی درستی کرنا ہے اور جب کوئی شخص ایک عمر باطن کی درستی پر خرچ کرے تو ایک اور عمر چاہیے تاکہ ظاہر کی درستی میں خرچ کی جائے اور اس طرح یہ دونوں عمریں بھی ضائع کر کے وہ اپنے اندر حق کا کوئی اثر نہیں پائے گا۔ حضرت شیخ بو علی سیاہ مروزی رحمتہ اللہ علیہ سے حکایت ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ میں نے نفس کو اپنی شکل میں دیکھا، جسے ایک شخص نے بالوں سے پکڑ کر میرے حوالے کر دیا کیونکہ اس شخص نے اس کو بالوں سے ہی پکڑا ہوا تھا اور اسی طرح میرے ہاتھ میں دے دیا تھا، میں نے اس کو ایک درخت سے باندھ دیا اور اس کے مار ڈالنے کا قصد کیا۔ اس نے مجھ سے کہا: "اے بو علی! تو تکلیف نہ اُٹھا کیونکہ میں خدا کا پیدا کیا ہوا لشکر ہوں، تو مجھے کم نہیں کر سکتا۔ حضرت محمد علیان نسوی رحمتہ اللہ علیہ جو حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے بڑے بزرگ اصحاب میں سے تھے، سے روایت ہے جو فرماتے ہیں کہ میں ابتدائے حال ہی سے نفس کی برائیوں سے واقف تھا اور اس کی چالوں کو جانتے ہوئے اس سے سخت دشمنی رکھتا تھے۔ ایک روز کوئی چیز لومڑی کے بچے جیسی میرے حلق سے باہر نکلی اور خدائے تعالیٰ کے فضل سے میں نے جان لیا کہ یہ نفس امارہ ہے۔ میں اسے پاؤں کے نیچے ڈال کر روندنے لگا، مگر روندنے سے وہ اور بڑا ہوتا جاتا تھا۔ اور جتنی لاتیں لگاتا تھا، وہ بڑا ہوتا جاتا تھا۔ میں نے پوچھا: "اے فلاں! سب چیزیں تو تکلیف اور چوٹ سے ہلاک ہو جاتی ہیں اور تو ہے کہ بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟" اس نے جواب دیا کہ "میری پیدائش ہی الٹی ہے، جس چیز سے سب چیزوں کو تکلیف ہوتی ہے، وہ میرے لیے راحت ہے اور جو اور اشیا کے لیے باعث راحت ہے، وہ میرے لیے باعث رنج ہے۔" شیخ ابو العباس اشتانی رحمتہ اللہ علیہ جو وقت کے امام تھے، نے فرمایا کہ ایک روز میں گھر میں داخل ہوا تو میں نے ایک زرد کتا دیکھا جو میری جگہ پر سو رہا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید محلے کا کوئی کتا اندر گھس آیا ہے، اس لیے میں نے اسے نکالنے کا ارادہ کیا تو وہ میرے دامن میں گھس کر غائب ہو گیا۔

حضرت شیخ ابو القاسم گرگانی رحمتہ اللہ علیہ جو اس وقت کے قطب اور مدار علیہ ہیں (اللہ ان کو باقی رکھے) نے اپنی ابتدائے حال کا حوالہ دے کر فرمایا کہ میں نے اپنے نفس کو ایک سانپ کی صورت میں دیکھا۔ ایک درویش نے کہا ہے کہ میں نے اسے ایک چوہے کی شکل میں دیکھا اور اس سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ میں غافلوں کی ہلاکت ہوں کہ ان کو شر اور برائی کی دعوت دیتا ہوں اور دوستانِ حق کی نجات کا سبب ہوں، اگرچہ میرا وجود باعث خرابی ہے، پھر بھی اگر میں ان کے ساتھ نہ ہوتا تو وہ اپنی پاکی پر مغرور ہو جاتے اور اپنے افعال پر تکبر کرتے کیونکہ جب وہ اپنے دل کی طہارت، باطن کی صفائی، ولایت کے نور اور بندگی پر اپنی ثابت قدمی کو دیکھتے ہیں تو خواہش نفس کی وجہ سے ان میں ایک قسم کا غرور پیدا ہو جاتا ہے اور پھر جب وہ مجھے اپنے دونوں پہلوؤں کے درمیان دیکھتے ہیں تو ان کے وہ سارے عیب پاک ہو جاتے ہیں۔ یہ سب حکایات اس بات کی دلیل ہیں کہ نفس ایک شے قائم بذاتِ خود ہے نہ صفت، اور اس کی صفت موجود ہے اور ہم اس کے اوصاف کو علانیہ دیکھتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اَعْدٰی

عَدُوِّكَ نَفْسَكَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْكَ۔ (ترجمہ: تیرا سب سے بڑا دشمن خود تیرا نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے)۔ پس جب اس کی معرفت حاصل ہو جائے تو تو جان لے گا کہ ریاضت سے اس کو قابو میں لا سکتے ہیں، لیکن اس کا اصل اور اس کی ماہیت بالکل فنا نہیں ہو سکتی اور جب اس کی شناخت درست ہو جائے تو طالب اگر اس پر قابو رکھنے والا ہے تو اس کے اپنے اندر باقی رہنے میں کوئی خوف نہیں ہوتا۔ لِاَنَّ النَّفْسَ کَلْبٌ نَبَّاحٌ وَ اِمْسَاكُ الْکَلْبِ بَعْدَ الرِّیَاضَةِ مُبَاحٌ۔ (ترجمہ: کیونکہ نفس ایک بھونکنے والا کتا ہے اور کتے کو شکار کی ریاضت کرا لینے کے بعد اپنے پاس رکھ لینا مباح[1] ہے)۔ پس نفس کے مجاہدات اس کے اوصاف فنا کر دینے کے لیے ہوتے ہیں نہ کہ اس کی اصل ذات کو فنا کرنے کے لیے۔ اس کے متعلق مشائخ کے اور بھی بہت سے اقوال ہیں لیکن میں نے کتاب کے طویل ہو جانے کے خوف سے ان ہی اقوال پر اکتفا کیا ہے۔ اب ان شاٗاللہ ہویٰ (خواہش نفس) کی حقیقت اور شہوت کے ترک کرنے کے متعلق کلام شروع کرتا ہوں اور توفیق قبضۂ الٰہی میں ہے۔

چوتھی بحث

ہویٰ کی حقیقت

جاننا چاہیے کہ ہویٰ صوفیا کے ایک گروہ کے نزدیک نفس کے اوصاف میں سے ایک صفت ہے۔ ایک دوسرے گروہ کے نزدیک نفس طبیعت کے ارادے ہی کا نام ہے۔ جس طرح عقل روح کی مدبر ہے اسی طرح طبیعت نفس کی مدبر اور اس میں متصرف ہے اور جس روح کو اپنے جسم میں عقل سے قوت نہیں ملتی، وہ ناقص ہے۔ اسی طرح جس نفس کو ہویٰ سے قوت نہیں ملتی، وہ بھی ناقص ہے۔ پس روح کا نقصان قرب حق کا نقصان ہے اور نفس کا ناقص ہونا عین قرب حق کا سبب ہے اور ہمیشہ بندے کو دو چیزوں کی طرف سے بلاوا ملتا رہتا ہے۔ ایک عقل کی طرف سے اور دوسرے ہویٰ کی طرف سے مگر، جو شخص عقل کی دعوت کا اتباع کرتا ہے، وہ ایمان پر پہنچ جاتا ہے اور جو ہویٰ کی دعوت کا تابع ہوتا ہے، وہ گمراہی اور انکارِ حق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پس ہویٰ حجاب اور موجب گمراہی ہے اور مریدوں کی پستی اور حق سے اعراض کا محل ہے، اس لیے بندہ اس کی مخالفت کرنے پر مامور اور اس کے اتباع سے روکا گیا ہے: لِاَنَّ مَنْ رَکِبَهَا هَلَكَ وَمَنْ خَالَفَهَا مَلَكَ۔ (ترجمہ: کیونکہ جو شخص ہوائے نفس پر سوار ہوا، وہ ہلاک ہو گیا اور جس نے اس کی مخالفت کی، وہ فرشتہ ہو گیا) چنانچہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی ۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی (ترجمہ: لیکن جو شخص اپنے رب کے حضور میں مجرمانہ حیثیت سے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اپنے نفس کو خواہش سے روک دیا، بلاشبہ اس کا ٹھکانا جنت ہے)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اَخْوَفُ مَا اَخَافُ عَلٰی اُمَّتِیْ اِتِّبَاعُ الْهَوٰی وَطُوْلُ الْاَمَلِ۔ (ترجمہ: سب سے زیادہ خوفناک چیز جس سے میں اپنی امت کے متعلق ڈرتا ہوں، وہ خواہش نفس کی پیروی اور لمبی آرزو ہے) اور اللہ تعالیٰ کے اس قول: اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ۔ (ترجمہ: دیکھو جس نے اپنے نفس کی خواہش کو اپنا معبود ٹھہرا لیا) کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرتے ہیں: ای الهویٰ الها معبودا۔ (ترجمہ: یعنی جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود ٹھہرا لیا) پس وہ شخص مستحق ہلاکت ہے، جس نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر خواہش نفس کو اپنا معبود بنایا اور دن رات اس کی دلجوئی کرتا رہا۔ ہوائے نفس کی دو قسمیں ہیں: (اوّل) لذت و شہوت کی خواہش، (دوم) خلقت میں مرتبہ اور ریاست کی خواہش۔

---

[1] جائز جس کا کرنا نہ کرنا دونوں برابر ہیں۔

جو شخص لذت و شہوت کا خواہش مند ہو، وہ میخانوں میں ہوتا ہے اور لوگ اس کے فتنے سے امن میں رہتے ہیں اور جو شخص جاہ و مرتبے کا تابع ہے، وہ عبادت خانوں اور خانقاہوں میں رہا کرتا ہے اور خلقت کے لیے باعث فتنہ ہوتا ہے کہ خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور لوگوں کو بھی گمراہی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ پس خواہش نفس کی متابعت سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ پس جس کی کل حرکات خواہش نفس سے ہوں اور وہ اس کی متابعت پر راضی ہو، وہ حق تعالیٰ سے دُور ہوتا ہے، اگرچہ مسجد میں وہ تمھارے ساتھ ہو اور وہ شخص جس کو خواہش نفس سے بیزاری ہو اور وہ اس کی متابعت سے گریز کرے، وہ حق تعالیٰ سے نزدیک ہوتا ہے، اگرچہ وہ بت خانے میں ہو۔

حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے سنا کہ ملک روم میں ایک پادری ستر سال سے ترکِ دنیا کر کے کلیسا میں بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ رہبانیت[1] کی شرط تو چالیس سال ہے، یہ شخص کس مذہب کے مطابق ستر سال تک کلیسا میں آرام کیے ہوئے ہے؟ چنانچہ میں نے اس کو دیکھنے کا رادہ کیا۔ جب میں اس کے نزدیک پہنچا تو کھڑکی کھول کر مجھ سے کہنے لگا: "اے ابراہیم! مجھے معلوم ہو گیا ہے جس مطلب کے لیے تو یہاں آیا ہے، میں یہاں ستر سال سے رہبانیت کے لیے نہیں بیٹھا ہوں بلکہ میرے پاس ایک کتا ہے جو حرص سے بپھرا ہوا ہے۔ میں اس لیے کلیسا میں بیٹھا ہوں کہ کتے کی نگرانی کروں اور اس کا شر لوگوں سے دفع کروں، ورنہ میں وہ نہیں ہوں جیسا کہ تو نے خیال کیا ہے۔" ابراہیم کہتے ہیں کہ جب میں نے اس سے یہ بات سُنی تو کہا: "بارِ خدایا! تو قادر ہے کہ ایک گمراہ بندے کو بھی عین گمراہی میں نیکی کا راستہ بتا دیتا ہے اور سیدھی راہ دکھلا دیتا ہے۔" اس نے کہا: "اے ابراہیم! کب تک تو لوگوں کی تلاش کرے گا؟ جا اپنے آپ کی طلب کر، جب تو نے پا لیا تو اپنی نگہبانی کر، کیونکہ نفس کی خواہش ہر روز تین سو ساٹھ معبودوں کا لباس پہنتی اور بندے کو گمراہی کی دعوت دیتی ہے۔"

حاصل کلام یہ ہے کہ شیطان کو بندے کے دل اور باطن میں اس وقت تک گھسنے کی مجال نہیں جب تک کہ اس کو نافرمانی کی خواہش پیدا نہ ہو اور جب خواہش کا مادہ اس میں ظاہر ہو جاتا ہے تو شیطان اس کو لے لیتا ہے اور اس کو آراستہ کر کے اس کے دل کے سامنے پیش کرتا ہے، اسی کو وسوسہ کہتے ہیں۔ پس گناہ اور نافرمانی کی ابتدا خواہش نفس سے ہوتی ہے اور حدیث میں آیا ہے: اَلْبَادِیُ اَظْلَمُ (پہل کرنے والا زیادہ ظالم ہے) اور یہی مطلب اللہ تعالیٰ کے اس قول کا ہے جب کہ اس نے شیطان کے اس قول کے جواب میں کہ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ (پس تیری عزت کی قسم! میں تیرے سب بندوں کو البتہ گمراہ کروں گا) اس پر اللہ پاک نے فرمایا: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ۔ (بلاشبہ فرماں بردار بندوں پر تیرا کچھ زور نہیں چلے گا)۔ پس شیطان ہی درحقیقت بندے کا نفس اور اس کی خواہش ہے اور اسی وجہ سے پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ غَلَبَهٗ شَیْطَانُهٗ اِلَّا عُمَرَ فَاِنَّهٗ غَلَبَ شَیْطَانَهٗ۔ (ترجمہ: کوئی آدمی نہیں کہ اس کا شیطان یعنی خواہش نفس اس پر غالب نہ ہو سوائے عمر (رضی اللہ عنہ) کے، کہ وہ اپنے شیطان پر غالب ہیں)۔ پس ہوائے نفس آدم علیہ السلام کی سرشت اور بنی آدم کی جان کی راحت ہے، چنانچہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: اَلْهَوٰی وَالشَّهْوَةُ مَعْجُوْنَتَیْنِ بِطِیْنَةِ ابْنِ اٰدَمَ۔ (ترجمہ: خواہش نفس اور شہوت ابن آدم کی سرشت میں رکھ دی گئی ہیں)۔ خواہش کا چھوڑ دینا بندے کو امیر کر دیتا ہے اور اس کی پیروی کرنا امیر کو اسیر بنا دیتا ہے چنانچہ حضرت زلیخا نے جب خواہش نفس کی پیروی کی تو باوجود امیر و باعزت ہونے کے، اسیر ہو گئیں اور حضرت یوسف علیہ السلام نے جب ہوائے نفس کو ترک کر دیا تو امیر ہو گئے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے ایک دفعہ لوگوں نے پوچھا

[1] ترک دُنیا

کہ: مَا الْوُصُلُ قَالَ تَرْکُ اِرْتِکَابِ الْھَوٰی (ترجمہ: وصل حق کیا چیز ہے؟ تو فرمایا خواہش نفس کی پیروی کا ترک کرنا) پس جو شخص چاہتا ہے کہ وصل حق سے مکرم ہو، اسے چاہیے کہ اپنے نفس کی خواہش کی پیروی نہ کرے کیونکہ بندہ ہوائے نفس کی مخالفت سے بڑھ کر کسی اور عبادت سے قربِ حق حاصل نہیں کر سکتا، اس لیے کہ بندے کے لیے ہوائے نفس کے خلاف کرنا پہاڑ کو ناخن سے کھودنے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔

حکایات میں ہے کہ حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا: "میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ ہوا میں اُڑ رہا تھا۔ میں نے پوچھا: یہ درجہ تو نے کس طرح پایا؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے خواہش نفس کی پیروی نہیں کی، اس لیے ہوا پر سوار اُڑا پھر رہا ہوں۔" حضرت محمد بن الفضل بلخی رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس شخص پر تعجب ہے جو اپنی خواہش نفس سے اللہ کے گھر جاتا ہے اور اس کی زیارت کرتا ہے، کیوں ہوائے نفس کی مخالفت نہیں کرتا کہ حق تک پہنچ جائے اور اس کا دیدار حاصل کرے، لیکن یہ اچھی طرح یاد رہے کہ نفس کی سب سے زیادہ ظاہر صفت شہوت ہے اور شہوت ایک کیفیت ہے جو آدمی کے اجزا میں پھیلی ہوئی ہے اور تمام حواس[1] اس کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں، لہٰذا بندہ ان سب کی نگرانی کرنے پر مکلف اور مامور ہے اور ہر ایک حس کے فعل سے اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہے۔ چنانچہ آنکھ کی شہوت دیکھنا، کان کی شہوت سننا، ناک کی شہوت سونگھنا، زبان کی شہوت بولنا، تالو کی شہوت چکھنا، جسم کی شہوت چھونا اور گھسنا اور قلب و دماغ کی شہوت سوچنا ہے۔ پس طالب کو چاہیے کہ اپنا نگہبان اور حاکم ہو اور رات دن اسی میں لگائے تاکہ ہوائے نفس کے ان اسباب کو جو حواس میں پیدا ہوتے ہیں، اپنے سے دُور کر دے اور خدائے تعالیٰ سے درخواست کرے کہ وہ اس کو ایسا بنا دے کہ یہ خواہش اس کے باطن سے دفع ہو جائے کیونکہ جو شخص شہوت کے کسی ایک جزو میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے، وہ تمام معارف سے حجاب میں ہو جاتا ہے۔ پس اگر بندہ تکلف سے اس کو اپنے سے دور کرے تو اس کا رنج طویل ہو جائے گا کیونکہ اس قسم کی خواہشات کا وجود متواتر اور پے در پے ہوتا ہے، لہٰذا بہتر طریقہ یہ ہے کہ اسے خدا ہی کے حوالے کر دے تاکہ مراد حاصل ہو جائے۔

حضرت بوعلی سیاہ مروزی رحمتہ اللہ علیہ سے حکایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: میں حمام میں گیا ہوا تھا اور سنت کے مطابق استرے سے زیر ناف بال صاف کر رہا تھا کہ اچانک جی میں آیا، اے ابوعلی! اس عضو کو جو چشمۂ شہوت ہے اور تجھے اتنی آفتوں میں مبتلا کر رکھتا ہے، کیوں نہ اپنے سے علیحدہ کر دے تاکہ شہوت سے باز رہے۔ میرے باطن میں ندا ہوئی کہ اے ابوعلی! تو ہمارے ملک میں تصرف کرتا ہے؟ حالانکہ ہماری طرف سے بدن کی ساخت و زیبائش کے لیے کوئی عضو دوسرے عضو سے زیادہ موزوں اور مناسب نہیں، ہمیں اپنی عزت کی قسم ہے اگر تو اس عضو کو اپنے سے جدا کر دے تو ہم اس کی جگہ تیرے ہر بال میں سوگنا زیادہ شہوت اور خواہش پیدا کر دیں گے۔ اسی کے متعلق کسی کا شعر ہے:

ـــہ تَبْتَغِی الْاِحْسَانَ دَعْ اِحْسَانَکَ   اُتْرُکْ بِخَشُوِ اللّٰہِ رَیْحَانَکَ

(ترجمہ: تو احسان (نیکی کرنا) چاہتا ہے تو اپنا احسان چھوڑ دے، اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی کھجور کے بدلے اپنے ناز بو کو چھوڑ دے)۔

بندے کو اپنا وجود خراب کرنے میں تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں، لیکن اپنی کسی صفت کی تبدیلی کرنے میں اپنی قوت و طاقت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے امر کی تسلیم کے بعد تصرف اور کسب کا حق حاصل

[1] حاسہ کی جمع، کسی چیز کو محسوس کرنے کی قوت

ہے۔ دراصل جب مرتبۂ تسلیم حاصل ہوگیا تو عصمت الٰہی حاصل ہوگئی اور بندہ اللہ کی عصمت و تائید سے ہی تمام آفات سے محفوظ ہوسکتا ہے نہ کہ مجاہدہ ریاضت سے: لِاَنَّ نَفْیَ الذُّبَابِ بِالْمُکِنَّةِ اَلْیَسُرُ مِنْ نَّفْیِهٖ بِالْمِذَبَّةِ (کیونکہ مکھیوں کو دُور کرنا ڈھانکنے والی چیز سے مگس ران کے ذریعہ ہٹانے کی نسبت زیادہ آسان ہے)۔ پس حفظ الٰہی تمام خرابیوں کو دُور کرنے والی اور تمام عیوب کو مٹانے والی ہے اور کسی صفت میں بھی بندے کو حق تعالیٰ کے ساتھ مشارکت نہیں، چنانچہ خود اس نے فرمایا ہے کہ اس کے ملک میں کسی کو تصرف کرنے کا حق نہیں اور جب تک عصمت الٰہی مقدر میں نہ ہو، بندہ اپنی کوشش سے کسی چیز سے رُک نہیں سکتا کیونکہ کوشش بخت اور نصیبے کے بغیر مفید نہیں اور جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بخت نصیب نہ ہو، کوشش کارآمد نہ ہوگی۔ صرف کوشش اس کے لیے مفید نہیں ہوسکتی اور محض کوشش سے بندگی کی طاقت ساقط ہوجاتی ہے کیونکہ بندے کی تمام کوششیں دو ہی طرح کی ہوتی ہیں، یا تو وہ کوشش کرتا ہے کہ تقدیر الٰہی بدل جائے یا خود تقدیر کے خلاف کوئی چیز کسب کرتا ہے اور یہ دونوں جائز نہیں، کیونکہ تقدیر کوشش سے بدل نہیں سکتی اور نہ کوئی کام تقدیر کے بغیر ہوسکتا ہے۔ روایت ہے کہ حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ بیمار ہوگئے۔ ایک طبیب نے آپ کے پاس آکر کہا کہ پرہیز کیجیے۔ آپ نے فرمایا: کس چیز سے پرہیز کروں؟ کیا اس چیز سے جو میرے مقدر میں نہیں؟ اگر پرہیز مقدر سے کرنا چاہیں تو وہ نہیں کرسکتے اور اگر پرہیز اس چیز سے کرنا ہے، جو مقدر نہیں تو ایسی چیز تو وہ خود ہی مجھے نہیں دیں گے۔ اس سے پرہیز ہی کیا؟ کیونکہ مشاہدے مجاہدہ سے حاصل نہیں ہوتا۔ میں اس مسئلے کو انشاء اللہ تعالیٰ پوری احتیاط سے کسی دوسری جگہ بیان کروں گا۔

ساتویں فصل
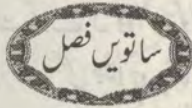
فرقۂ حکیمیہ

فرقۂ حکیمیہ کے پیرو حضرت ابی عبداللہ محمد بن علی الحکیم ترمذی رحمتہ اللہ علیہ سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔ آپ تمام علوم ظاہری و باطنی میں اپنے وقت کے آئمہ میں سے تھے۔ آپ کی تصانیف بہت ہیں۔ آپ کے کلام اور طریق کی بنیاد دلالت پر ہے اور آپ ولایت کی حقیقت، اولیا کے درجات اور ان کی ترتیب کی رعایت کے متعلق بیان فرماتے ہیں اور وہ علیحدہ ایک ناپیدا کنار سمندر ہے جس میں بے شمار عجائبات ہیں۔ آپ کے مذہب کو سمجھنے کے لیے ابتداً یہ جاننا ضروری ہے کہ خداوند تعالیٰ کے بہت سے اولیاء ہیں، جن کو اس نے اپنی مخلوق میں سے چن لیا ہے، ان کے ارادے کو دنیا کے تمام تعلقات سے قطع کرلیا ہے اور نفس و ہویٰ کے مقتضیات سے آزاد کرلیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو ایک درجے پر قائم فرما دیا اور اپنے اسرار و معارف کا دروازہ ان پر کھول دیا ہے، چونکہ ولایت کے متعلق بہت سے امور ہیں اور سب تشریح طلب ہیں، لیکن میں بخوف طوالت یہاں صرف چند اصول بیان کرتا ہوں تاکہ لوگوں کو ولایت کی عظمت و شان کا علم ہوسکے اور اس ضمن میں دوسرے حضرات کے اقوال اور اولیائے کرام کے اوصاف کا ذکر بھی آجائے گا (ان شاً اللہ تعالیٰ)۔

پہلی بحث

ولایت کا ثابت کرنا

جاننا چاہیے کہ تصوف و معرفت کے طریق کی بنیاد دراصل اصول ولایت اور اس کے ثابت کرنے پر قائم ہے اور تمام مشائخ اس کے اثبات میں گو متفق ہیں، تاہم ہر ایک نے ولایت کا مفہوم مختلف عبارات میں بیان کیا ہے

اور حضرت محمد بن علی الحکیم ترمذی رحمتہ اللہ علیہ ولایت کو طریقت اور حقیقت پر محمول کرنے میں مخصوص ہیں، لیکن ولایت بفتح واؤ لغت میں تصرف کرنا ہے اور ولایت بکسر واؤ امارت (امیر ہونا) ہے اور یہ دونوں فعل ولی کے مصدر ہیں۔ جب ایسا ہے تو ضروری ہے کہ یہ دو لغت ہوں جیسا کہ دلالت دال کے زبر کے ساتھ بتانا اور دلالت دال کے زیر کے ساتھ "ناز کرنا" کے معنوں میں مستعمل ہے۔ نیز ولایت معنی ربوبیت بھی آتا ہے اور انھی معنی کی طرف اللہ تعالیٰ کا یہ قول اشارہ کرتا ہے: هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ۔ (ترجمہ: وہاں قیامت میں ربوبیت اللہ برحق کے لیے ہے) کہ کفار اس سے محبت کریں گے اور اس کے گرویدہ ہوں گے اور اپنے مزعومہ معبودوں سے بیزاری ظاہر کریں گے۔

نیز ولایت کے معنی محبت بھی ہے کیونکہ وَلِیّ" بروزن فَعِیلٌ" کبھی کبھی مفعول کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ پس اس قاعدے کی رُو سے ولی وہ ہے جس کے ساتھ محبت کی گئی ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ۔ (وہ نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو خود اس کے افعال و اوصاف کی بناء پر نہیں چھوڑ تا بلکہ اس کو اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ولی بروزن فعیل مبالغہ کا صیغہ ہو اور فاعل کے معنوں میں مستعمل ہو، کیونکہ بندہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اور اس کی بندگی اور دیگر حقوق کے ادا کرنے پر مداومت کرتا اور اس کے غیر سے منہ موڑتا ہے۔ چنانچہ بندہ مرید اور اللہ تعالیٰ مراد ہوتا ہے اور یہ سب باتیں محبت اور نفرت کی حق تعالیٰ کی طرف سے حق تعالیٰ کے ساتھ روا ہیں اور جو باتیں اللہ کی طرف سے بندے کے ساتھ روا ہیں، وہ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کا ناصر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر ﷺ کے صحابہ کے ساتھ نصرت کا وعدہ فرمایا ہے: اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔ (سو بلاشبہ اللہ کی نصرت قریب ہے) نیز فرمایا: وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (بلاشبہ کافروں کا کوئی ناصر و مددگار نہیں) جب وہ کافروں کا مددگار نہیں تو لامحالہ مومنوں کا ناصر و مددگار ہے کہ ان کی عقل کو اپنی صریح نشانیوں سے، ان کے دلوں کو اسرار و معارف کے کشف سے مدد دیتا ہے۔ اسی طرح انہیں نفس و شیطان کی مخالفت اور اپنے احکام پر چلنے کی توفیق سے نواز تا ہے اور یہ بھی روا ہے کہ وہ ان کو اپنی دوستی سے مخصوص کر کے اپنی عداوت اور دشمنی سے بچائے رکھے، چنانچہ اس نے فرمایا ہے: يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ (اللہ تعالیٰ مومنوں کو دوست رکھتا ہے اور وہ اسے دوست رکھتے ہیں) تاکہ وہ اس سے اس کی وجہ سے محبت کریں اور مخلوق کی محبت سے منہ موڑلیں۔ یہاں تک کہ وہ بھی ان کا ولی اور دوست ہو جائے اور باقی مومن بھی اس کے اولیاء ہوں اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ ایک شخص کو اپنی بندگی پر قائم رکھنے کے لیے ولایت عطا کرے اور اسے اپنی حفاظت و عصمت میں محفوظ رکھے تاکہ وہ مومن اس کی بندگی پر قائم رہے اور اس کی مخالفت سے پرہیز کرے اور شیطان اس کی آہٹ سے بھاگ جائے، اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ ایک شخص کو اس لیے ولایت عطا کرے کہ ملک کا انتظام اس کے سپرد ہو، اس کی دعا مستجاب اور اس کے اقوال مقبول ہوں، چنانچہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ ذِيْ طِمْرَيْنِ لَا يُعْبَاُ بِهٖ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ۔ (ترجمہ: کبھی ایک پراگندہ بالوں والا، غبار آلود پھٹی چادروں والا شخص، جس کی کوئی پروا نہیں کرتا اگر وہ کسی امر میں اللہ کی قسم کھائے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا فرماتا ہے)۔ یہ بات مشہور ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں دریائے نیل کا پانی اپنی عادت کے مطابق ٹھہر گیا، کیونکہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ ہر سال جب دریائے نیل میں پانی رُک جاتا تو ایک لونڈی آراستہ کر کے اس میں ڈال دی جاتی، تب پانی جاری ہو جاتا۔ جب حضرت عمرؓ کو اس قبیح رسم کا علم ہوا تو انہوں نے ایک کاغذ پر یہ لکھا اور دریائے نیل میں ڈلوادیا۔ الفاظ

یہ تھے کہ "اے نیل! اگر تو خدا کے حکم سے رُکا ہے تو رُکا رہ اور اگر کوئی اور بات ہے تو اللہ کے حکم سے جاری ہو جا۔" چنانچہ خط کے ڈالتے ہی پانی جاری ہو گیا۔ یہ حقیقی امارت ہے، پس میری مراد ولایت اور اس کے ثابت کرنے سے یہ ہے کہ تم جان لو کہ ولی کا نام اس شخص کے لیے جائز ہے کہ ولی کے اوصاف اس میں موجود ہوں اور وہ ظاہر و باطن میں اللہ تعالیٰ کا دوست اور اس کے جملہ احکام کا پابند ہو۔ اسی موضوع پر پہلے بھی مشائخ کرام نے بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اب میں ان حضرت (محمد بن علی الحکیمؒ) کی عبارت کو لکھ دیتا ہوں، جیسا کہ میرا ان پر اعتقاد ہے تاکہ اگر اللہ کو منظور ہو تو تمہیں اور ان کو جو طالبانِ طریقت ہیں، اس سے بہت فائدے حاصل ہوں۔

دوسری بحث

لفظ "ولی" کی مزید تشریح

جاننا چاہیے کہ لفظ ولی لوگوں میں عام طور پر مشہور ہے اور کتاب وسنت بھی اس پر ناطق ہے، چنانچہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (سنو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غم کریں گے) نیز ارشاد ہے: نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ۔ (ہم ہی تم مومنین کے مددگار ہیں دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی) اور ایک دوسری جگہ فرمایا: اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا دوست ہے) پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ لَعِبَادًا يَغْبِطُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ وَالشُّهَدَاءُ قِيْلَ مَنْ هُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صِفْهُمْ لَنَا لَعَلَّنَا نُحِبُّهُمْ۔ قَالَ قَوْمٌ تَحَابُّوْا بِرُوْحِ اللّٰهِ مِنْ غَيْرِ اَمْوَالٍ وَلَا اِكْتِسَابٍ وَجُوْهُهُمْ نُوْرٌ عَلٰى مَنَابِرَ مِنْ نُوْرٍ لَّا يَخَافُوْنَ اِذَا خَافَ النَّاسُ وَلَا يَحْزَنُوْنَ اِذَا حَزِنَ النَّاسُ ثُمَّ قَلَا اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (سنو اللہ کے بندوں میں سے بعض وہ بندے ہیں کہ نبی اور شہید بھی ان پر رشک کرتے ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! وہ کون لوگ ہیں؟ ہمیں ان کا حال بتائیے تاکہ ہم ان سے محبت کریں۔ آپؐ نے فرمایا: وہ لوگ ہیں جو بغیر مال اور تکلف کے محض اللہ کی وحی کے مطابق آپس میں محبت کرتے ہیں۔ ان کے چہرے نورانی ہوں گے اور وہ خود نور کے منبروں پر بیٹھے ہوں گے۔ انہیں کوئی خوف نہیں ہوگا جب کہ لوگ خوفزدہ ہوں گے اور نہ وہ غمگین ہوں گے جب کہ اور لوگ غمزدہ ہوں گے۔ پھر حضور ﷺ نے آیت پڑھی: اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ (سنو بے شک اللہ تعالیٰ کے اولیاء پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غم کریں گے) نیز پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ اٰذٰى وَلِيًّا فَقَدْ اسْتَحَلَّ مُحَارَبَتِىْ۔ (جس نے ولی کو اذیت پہنچائی، اس نے میرے ساتھ جنگ کرنے کو حلال سمجھا)۔ مراد اس حدیث سے یہ ہے کہ اللہ کے اولیاء جن کو اس نے اپنی دوستی اور ولایت کے لیے مخصوص فرمالیا ہے، وہ اس کے ملک کے مالک ہیں اور ان کو اپنی محبت کے لیے مخلوقات میں چن کر اپنے فعل کے اظہار کا نشان بنادیا اور قسم قسم کی کرامات سے مخصوص اور طبیعت کی خرابیوں کو ان سے بالکل پاک کر دیا اور نفس کی متابعت سے چھڑا دیا ہے۔ پس ان کا مقصود اس کی ذات کے سوا اور کچھ نہیں اور نہ سوائے اس کے کسی اور سے ان کو اُنس ہے۔ ہم سے پہلے گذشتہ زمانوں میں بھی ہوئے ہیں اور اب بھی ہیں اور اس کے بعد قیامت تک موجود رہیں گے، اس لیے کہ خداوند تعالیٰ نے اس کی اُمت کو تمام سابقہ اُمتوں پر شرف عطا فرما کر یہ ذمہ لیا ہے کہ شریعت محمدی ﷺ کو ہمیشہ محفوظ رکھوں گا اور جب کہ نقلی و عقلی دلیلیں اور حجتیں آج بھی علماء کے درمیان موجود ہیں، تو ضرور ہے کہ اولیاء و خاصانِ الٰہی کے درمیان عینی دلائل بھی موجود ہوں اور ہمارے اس

مسلک کے دو گروہ مخالف ہیں۔ ایک معتزلہ، دوسرے عام خشویہ بلکہ معتزلہ تو گرویدگانِ حق یعنی اولیاء اللہ میں سے ایک ولی کو دوسرے ولی پر تخصیص و ترجیح کا انکار کرتے ہیں یعنی سب اولیاء کو برابر جانتے ہیں، حالانکہ ولی کی تخصیص کی نفی، نبی کی تخصیص کی نفی ہوتی ہے کیونکہ جس طرح انبیاء میں سے بعض نبی خاص ہوتے ہیں، اسی طرح ولیوں میں بھی بعض ولی خاص درجہ رکھتے ہیں اور جو ولیوں میں تخصیص کا قائل نہیں، وہ نبیوں میں تخصیص کا قائل نہیں ہوگا اور یہ کفر ہے اور عام خشویہ اولیاء میں بعض کی تخصیص کو جائز رکھتے ہیں، لیکن وہ کہتے ہیں کہ ایسے خاص اولیاء اللہ پہلے ہو گزرے ہیں، آج نہیں حالانکہ انکار ماضی و مستقبل دونوں برابر ہوتے ہیں، اس لیے کہ ایک طرف کا انکار دوسری طرف کے انکار سے زیادہ برا نہیں ہوتا۔

پس خدا تعالیٰ نے نبی ﷺ کی برہان کو آج تک باقی رکھا ہے اور اولیاء کو اس کے اظہار کا سبب بنادیا ہے تاکہ ہمیشہ حق کے نشانات اور حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کی سچائی کی دلیل قائم رہے اور ایسے خاص اولیاء کو عالم کا متصرف کر دیا ہے، یہاں تک کہ وہ تنہا اللہ تعالیٰ کی بات کے لیے وقف ہوگئے ہیں اور نفس کی متابعت کا راستہ ان پر بند ہو گیا ہے تاکہ آسمان سے بارش ان کے قدموں کی برکت سے نازل ہو، ان کے احوال کی صفائی کی وجہ سے زمین سے نباتات اُگے اور مسلمان ان کی دعا و توجہ سے کفار پر نصرت حاصل کریں اور یہ چار ہزار ہیں جو پوشیدہ رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے اور اپنے حال کی خوبی بھی نہیں جانتے اور تمام حالات میں خود اپنی ذات اور خلقت سے چھپے رہتے ہیں۔ اس کے متعلق حدیثیں وارد ہوئی ہیں اور اولیاء اللہ کا کلام اس پر ناطق ہے اور مجھے خود الحمدللہ اس کے متعلق خبر ملی ہے۔ جو لوگ عالم میں اہل تصرف اور درگاہِ حق کے سرلشکر ہیں، وہ تین سو ہیں جن کو اخیار کہتے ہیں، چالیس دوسرے ہیں جنھیں ابدال کہتے ہیں، سات اور ہیں جنھیں ابرار بولتے ہیں، چار دوسرے ہیں جنھیں اوتاد کہتے ہیں، تین اور ہیں جن کو نقیب کہتے ہیں اور ایک اور ہے جسے غوث اور قطب کہتے ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ کاموں میں ایک دوسرے کے اذن کے محتاج ہوتے ہیں اور اس بات پر اخبار مروّجہ ناطق ہیں اور تمام اہل سنت اس بات کی صحت پر متفق ہیں۔ اس مقام پر اس امر کی شرح و تفصیل مقصود نہیں اور یہاں اس امر کے متعلق جو میں نے کہا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اولیاء جو ایک دوسرے کو پہچانتے نہیں کہ ان میں سے ہر ایک ولی ہے۔ عوام اس پر جو اعتراض کرتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ اس صورت میں تو ضروری ہے کہ وہ اپنی عاقبت سے امن میں ہوں، مگر یہ محال ہے کہ ولایت کی معرفت عاقبت سے امن میں ہونے کا اقتضا کرے کیونکہ جس طرح یہ جائز ہے مومن اپنے ایمان کو پہچاننے والا ہو اور وہ عاقبت سے بے خوف نہ ہو، اسی طرح جائز ہے کہ ولی اپنی ولایت کو پہچانتا ہو اور عاقبت سے بے خوف نہ ہو، لیکن یہ روا ہے کہ کرامت کے طور پر حق تعالیٰ ولی کو اس کے حال کی صحت کی وجہ سے اسے عاقبت اور دشمن کی مخالفت سے بے خوف کر دے اور اس مقام پر مشائخ کے درمیان اختلاف ہے اور میں نے اختلاف کا سبب ظاہر کر دیا ہے کہ ان چار ہزار میں سے جو مخفی ہیں بھی ہیں، وہ اپنی ولایت کو جاننا جائز نہیں رکھتے اور جو لوگ اس گروہ کے علاوہ ہیں، اس بات کو جائز سمجھتے ہیں۔ نیز بہت سے فقہا اِس گروہ کے موافق ہیں اور بہت سے اُس گروہ کے موافق اور متکلمین میں سے بھی بعض پہلے گروہ کے موافق ہیں اور بعض پچھلے کے۔

استاد ابو اسحٰق اسفرائنی رحمتہ اللہ علیہ اور متقدمین کی ایک جماعت اس بات پر ہیں کہ ولی اپنے آپ کو نہیں پہچانتا کہ وہ ولی ہے۔ استاد ابوبکر بن فواک رحمتہ اللہ علیہ اور متقدمین کی ایک دوسری جماعت اس بات پر ہیں کہ ولی اپنے آپ کو

پہچانتا ہے کہ وہ ولی ہے۔ پس ہم پہلے گروہ سے پوچھتے ہیں کہ اس کو ان کی ولایت کی معرفت میں کیا نقصان اور ہرج نظر آتا ہے؟ اگر وہ یہ جواب دیں کہ جب وہ یہ بات جان لے گا کہ میں ولی ہوں تو اپنے آپ پر مغرور ہو جائے گا۔ تو ہم کہتے ہیں کہ ولایت کی شرط حق کی نگہداشت ہے۔ پس جو شخص آفت سے محفوظ ہو، وہ مغرور کیسے ہوسکتا ہے؟ اور یہ بات تو بالکل عامیانہ ہے کہ جب کسی ولی سے خلافِ عادت چیزوں کا ظہور ہو، جسے عرف میں کرامت کہتے ہیں، تو وہ انہیں دیکھتے ہوئے بھی یہ نہ سمجھ سکے کہ میں ولی ہوں اور یہ خوارق میری ہی کرامتیں ہیں۔ بعض عوام اِس گروہ کی پیروی کرتے اور بعض اُس گروہ کی، لیکن عوام کی باتوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ معتزلہ تخصیص و کرامت کے بالکل منکر ہیں اور ولایت کی حقیقت کرامت و تخصیص ہی ہوتی ہے، لیکن معتزلہ کہتے ہیں کہ سب مسلمان جب فرمانبردار ہوں، اولیاء الٰہی ہیں اور جو شخص ایمان کے تمام تقاضوں کو پورا کرے، صفات حق و رویت الٰہی کا منکر ہو، فاسق مومن کو ہمیشہ دوزخ میں رہنے کو روا رکھے، بغیر رسولوں کے آنے اور کتب الٰہیہ کے نازل ہونے کے محض عقل پر تکلیف کے جواز کا اقرار کرے، وہ ولی ہوتا ہے لیکن شیطان کا ولی، نہ کہ خدا کا ولی اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ولایت کے لیے کرامت شرط ہوتی تو سب مسلمانوں کو کرامت حاصل ہونی چاہیے تھی کیونکہ وہ سب ایمان میں مشترک ہیں اور جب اصل میں مشترک ہیں تو چاہیے کہ فرع میں بھی مشترک ہوں۔ پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ پھر جائز ہے کہ مومن کافر دونوں کو کرامت حاصل ہوں، اسی طرح کہ جب کسی کو سفر میں بھوک لگ رہی ہو تو اچانک کوئی میزبان نمودار ہو جائے یا کوئی تھک گیا ہو اور کوئی اس کو سواری کے جانور پر بٹھالے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ بات جائز ہوتی کہ کوئی شخص ایک رات میں ایک طویل مسافت طے کر لیتا تو یہ بات پیغمبر ﷺ کو اس وقت بھی حاصل ہوتی جب کہ آنخضرت ﷺ نے مکہ مکرمہ کا قصد فرمایا تھا، حالانکہ خداوند جل و علا نے ارشاد فرمایا ہے: وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ۔ (ترجمہ: وہ چارپائے تمھارے بوجھ اٹھا کر اس شہر کی طرف لے جاتے ہیں جہاں تم بدقت تمام پہنچ سکتے ہو) میں کہتا ہوں کہ یہ قول باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آنخضور ﷺ کی نسبت فرمایا ہے کہ: سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ۔ (ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے (حضرت رسول کریم ﷺ) کو ایک رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) کی طرف جس کی اطراف کو ہم نے برکت دی، سیر کرائی) اور پہلی آیت میں بوجھوں میں چارپایوں پر اٹھانے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے مکہ چل کر جانے کا مطلب یہ ہے کہ کرامات خاص ہیں نہ عام، لہٰذا اگر وہ لوگ سب کرامات سے تھوڑے وقت میں ایک طویل مسافت طے کر کے مکہ چلے جاتے تو کرامات عام ہو جاتیں اور ایمان غیبی عینی ہو جاتا اور ایمان غیبی کے تمام احکام اُٹھ جاتے، اس لیے فرمانبردار اور نافرمان آدمی کا ایمان ایک عام ایمان ہے، خاص نہیں اور ولایت کا ایمان خاص اور ولایت کا محل خاص۔ پس خدا تعالیٰ نے ایمان بالغیب کے عام حکم کے تحت اور اسے ثابت کرنے کے لیے ایک طرف تو پیغمبر ﷺ کو صحابہ کرام کے ساتھ چارپایوں پر بوجھ لاد کر لے جانے کا حکم فرمایا تو دوسری طرف معجزہ اور کرامت کو ثابت کرنے کے لیے پیغمبر ﷺ کو ایک رات میں مکہ مکرمہ سے بیت المقدس اور وہاں سے مقامِ قابِ قوسین تک پہنچادیا، تو ابھی رات بہت باقی تھی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ایمان کے حکم میں آپ عام کے ساتھ عام تھے اور کرامت و معجزہ کے حکم میں خاص کے ساتھ خاص تھے۔ پس ولایت و کرامت کے ساتھ بعض بندوں کی تخصیص کی نفی کرنا کھلا مکابرہ اور کفر ہے، جس

طرح کہ بادشاہ کی درگاہ پر دربان، حاجب و وزیر وغیرہ سبھی ہوتے ہیں اگرچہ وہ سب خدمت کے حکم میں یکساں ہوتے ہیں، لیکن ہر ایک کا مرتبہ جدا ہے۔ پس اسی طرح اگرچہ ایمان دار ہونے کی حیثیت سے سب مسلمان یکساں ہوتے ہیں لیکن ایک گناہ گار ہوتا ہے اور دوسرا فرمانبردار، ایک عالم تو دوسرا جاہل، ایک عابد دوسرا تارکِ عمل۔ پس یہ بات ثابت ہوئی کہ بندوں میں ایک دوسرے کی فضیلت و تخصیص کا انکار کرنا گویا سب معانی کا انکار کرنا ہے جو موجب کفر ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

تیسری بحث

ولایت کی تحقیق میں مشائخ کے رموز

ولایت کے بیان کی تحقیق میں مشائخ کرام کے بہت ہی عمدہ اور لطیف رموز ہیں اور جہاں تک ممکن ہے، میں ان کے چیدہ چیدہ رموز میں سے چند یہاں درج کرتا ہوں تاکہ اگر اللہ چاہے تو ان سے تمہیں پورا فائدہ حاصل ہو۔ ابوعلی جرجانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلْوَلِیُّ هُوَ الْفَانِیْ فِیْ حَالِهٖ وَالْبَاقِیْ فِیْ مُشَاهِدَةِ الْحَقِّ۔ لَمْ یَکُنْ لَهٗ عَنْ نَفْسِهٖ اَخْبَارٌ وَلَامَعَ غَیْرِ اللّٰهِ قَرَارٌ (ترجمہ: ولی وہ ہے جو اپنے حال میں فانی اور مشاہدہ حق تعالیٰ میں باقی ہو، نہ اپنی ذات کی نسبت وہ کچھ خبر دے سکے اور نہ غیر اللہ کے ساتھ اسے آرام ہو) کیونکہ بندے کا خبر دینا درست نہیں ہوگا اور اسی طرح جب وہ غیر حق سے آرام ہی نہیں پاتا تو وہ کیسے اسے اپنے حال کی نسبت خبر دے، اس لیے کہ محبوب کے حال سے غیر کو خبر دینا محبوب کے بھید کو ظاہر کرنا ہے اور حبیب کے بھید کو غیر پر ظاہر کرنا محال ہے، نیز مشاہدہ حق میں غیر کو دیکھنا محال ہے اور جب غیر کو دیکھنا نہ ہوگا تو خلقت سے آرام پانا کیسے ممکن ہوگا۔

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں: اَلْوَلِیُّ اَنْ لَّایَکُوْنَ لَهٗ خَوْفٌ لِاَنَّ الْخَوْفَ تَرَقُّبُ مَکْرُوْهٍ یَحُلُّ فِی الْمُسْتَقْبِلِ وَانْتِظَارُ الْمَحْبُوْبِ یَفُوْتُ فِی الْمُسْتَنَافِفِ وَالْوَلِیُّ اِبْنُ وَقْتِهٖ لَیْسَ لَهٗ وَقْتٌ مُسْتَقْبِلٌ فَیَخَافُ شَیْئًا وَکَمَا لَاخَوْفَ لَهٗ لَارَجَاءَ لَهٗ لِاَنَّ الرَّجَاءَ اِنْتِظَارُ مَحْبُوْبٍ یَحْمِلُ اَوْمَکْرُوْهٍ یَکْشِفُ وَذٰلِکَ فِی الثَّانِیْ مِنَ الْوَقْتِ وَکَذٰلِکَ لَاحُزْنَ لِاَنَّ الْحُزْنَ مِنْ حُزُوْنَةِ الْوَقْتِ وَمَنْ کَانَ فِیْ ضِیَاءِ الرِّضَاءِ وَنُوْرِ الشُّکْرِ وَرَوْضَةِ الْمُوَافِقَةِ فَاَنّٰی یَکُوْنُ لَهٗ حُزْنٌ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (ترجمہ: ولی وہ ہے کہ اس کو کوئی خوف نہ ہو، کیونکہ خوف زمانۂ مستقبل میں کسی تکلیف کے آنے یا کسی محبوب ترین چیز کے فوت ہو جانے سے لاحق ہوتا ہے اور ولی اپنے موجودہ وقت کا پابند ہوتا ہے۔ اس کا زمانۂ مستقبل کوئی نہیں کہ وہ اس میں کسی چیز سے ڈرے اور جس طرح اسے خوف نہیں اسی طرح اسے کوئی اُمید بھی نہیں کیونکہ اُمید مستقبل میں کسی محبوب چیز کے حاصل ہونے یا تکلیف کے دور ہونے کا انتظار ہوتا ہے اور یہ بھی دوسرے آنے والے وقت میں ہوتا ہے اور ایسے ہی اسے کوئی غم بھی نہیں ہوتا، کیونکہ غم وقت کی سختی، ناسازگاری اور کدورت سے پیدا ہوتا ہے اور جو شخص رضائے الٰہی کی روشنی، شکر کے نور اور موافقت کے باغ میں ہو، اسے غم کیسے ہوسکتا ہے؟ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے: اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ (الخ) (ترجمہ: سنو اللہ کے اولیاء کو نہ کوئی خوف ہوتا ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں) لیکن عوام کو اس قول سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جب ولی کو نہ خوف و امید ہو اور نہ غم تو وہ ضرور اپنی عاقبت سے مطمئن ہوگا، حالانکہ اسے امن بھی حاصل نہیں ہوتا کیونکہ امن غیب کے نہ دیکھنے اور موجودہ وقت سے اعراض کرنے کی

وجہ سے ہوتا ہے اور یہ ان لوگوں کی صفت ہے جو اپنی بشریت کو دیکھتے اور کسی صفت سے آرام نہیں پاتے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خوف و اُمید و امن و غم نفس سے تعلق رکھتے ہیں اور جب نفس فانی ہوگیا تو رضائے الٰہی بندے کی صفت ہوگئی اور جب رضائے الٰہی حاصل ہوگئی تو سب احوال حالات کے تبدیل کرنے والے اللہ تعالیٰ کی رویت و مشاہدہ میں درست ہوگئے اور اپنے احوال سے اعراض ظاہر ہوگیا، تب ولایت دل پر ظہور پذیر ہوگئی اور اس کی حقیقت باطن پر واضح ہوگئی۔

حضرت ابو عثمان مغربی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلْوَلِیُّ قَدْ یَکُوْنَ مَشْهُوْرًا وَلَایَکُوْنُ مَفْتُوْنًا (ترجمہ: ولی لوگوں میں مشہور تو ہوتا ہے لیکن مفتون[1] نہیں ہوتا)۔ اور دوسرے صاحب فرماتے ہیں: اَلْوَلِیُّ قَدْ یَکُوْنُ مَسْتُوْرًا وَّلَا یَکُوْنُ مَشْهُوْرًا (ترجمہ: ولی پوشیدہ ہوتا ہے اور عام لوگوں میں مشہور نہیں ہوتا)۔ یہ بات کہ ولی مشہور نہیں ہوتا کیونکہ اس کی شہرت میں فتنہ ہوتا ہے، اس کے جواب میں حضرت ابو عثمان رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر کوئی سچا ولی لوگوں میں شہرت پائے تو اس پر کوئی حرج نہیں، کیونکہ فتنہ جھوٹ میں ہوتا ہے اور جھوٹا ولی نہیں ہوسکتا اور نہ کرامت کا اظہار جھوٹے کے ہاتھ پر ممکن ہے۔ پس ایسی صورت میں چاہیے کہ فتنہ اس کے حال سے ساقط ہو جائے۔ دراصل ان دونوں اقوال کا تعلق اس اختلاف سے ہے کہ ولی اپنے آپ کو نہیں پہچانتا کہ وہ ولی ہے کیونکہ اگر پہچان لے تو وہ مشہور ہو جائے اور اگر نہ پہچانے تو فتنے میں ڈالا جائے اور اس کی شرح بہت طویل ہے۔ میں نے حکایت میں دیکھا ہے کہ حضرت ابراہیم ادہم رحمتہ اللہ علیہ نے ایک آدمی سے فرمایا کہ کیا تو چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء میں سے ایک ولی تو ہو جائے۔ اس نے کہا: ہاں، میں چاہتا ہوں۔ تو آپ نے فرمایا: لَاتَرْغَبْ فِیْ شَیْئٍ مِنَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَفَرِّغْ نَفْسَكَ لِلّٰهِ وَاَقْبِلْ بِوَجْهِكَ عَلَیْهِ (ترجمہ: دنیا و آخرت کی کسی چیز کی رغبت نہ کر، اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل خالی کر دے اور اپنی توجہ حق تعالیٰ کی طرف لگا دے) کیونکہ دنیا کی طرف رغبت کرنا، اللہ تعالیٰ سے منہ موڑ کر ایک فانی چیز کی طرف رغبت کرنا ہے اور عقبیٰ کی طرف رغبت کرنا مولیٰ سے منہ موڑ کر ایک باقی چیز کی طرف رغبت کرنا ہے اور جب فانی چیز کی طرف سے اعراض ہوگا تو فانی چیز فنا ہو جائے گی اور وہ اعراض کرنا بھی فنا ہو جائے گا اور جب باقی چیز کی طرف سے اعراض ہوگا تو بقا پر فنا روا نہیں، پس اس کے اعراض پر بھی فنا روا نہ ہوگی۔ فائدہ اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دنیا و عقبیٰ کے بدلے ہرگز نہ چھوڑے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی دوستی کے لیے فارغ کر دے اور دنیا و عقبیٰ کو اپنے دل میں کوئی راہ نہ دے اور اپنی دلی توجہ حق تعالیٰ کی طرف رکھے۔ جب یہ اوصاف تیرے اندر موجود ہوں گے تو تو ولی ہو جائے گا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ سے ایک دفعہ لوگوں نے پوچھا کہ ولی کسے کہتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: اَلْوَلِیُّ هُوَ الصَّابِرُ تَحْتَ الْاَمْرِ وَالنَّهْیِ۔ (ترجمہ: ولی وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے امر و نہی پر صابر ہو) اس لیے کہ جس کے دل میں محبت الٰہی زیادہ ہو، اللہ تعالیٰ کا حکم اس کے دل پر زیادہ باعظمت ہوتا ہے اور اس کی منع کردہ چیزوں سے وہ زیادہ دور ہوتا ہے۔ نیز آپ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ایک دفعہ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ فلاں شہر میں ایک ولی ہے۔ میں اُٹھا اور اس کی زیارت کا قصد کیا جب میں اس کی مسجد میں پہنچا تو وہ اپنے گھر سے باہر نکلا اور مسجد میں قبلہ کی طرف تھوک دیا۔ یہ دیکھ کر میں اسے سلام کیے بغیر وہاں سے واپس آیا اور میں نے دل میں کہا کہ ولی کو چاہیے کہ اپنے اوپر شریعت کی حفاظت لازم کرے تاکہ اللہ تعالیٰ اس کے حال کو اپنی نگاہ میں رکھے۔ اگر یہ آدمی ولی ہوتا تو حرمت

[1] مفتون، فتنے میں ڈالا ہوا

قبلہ کو محفوظ رکھتے ہوئے اس کی طرف تھوک نہ پھینکتا اور صحت کرامت کے پیش نظر اس کے حق کی رعایت کرتا۔ آپ نے فرمایا کہ اسی رات میں نے پیغمبر ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: "اے بایزید! جو عمل تو نے کیا، اس عمل کی برکتیں تیرے اندر پہنچ گئیں۔" دوسرے روز میں اس درجے پر پہنچ گیا جس پر تم مجھے دیکھتے ہو۔ میں نے سنا ہے کہ کوئی شخص حضرت ابوسعیدؒ کے پاس آیا اور پہلے بایاں پاؤں اس نے مسجد میں رکھا۔ یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا کہ "اس کو واپس بھیج دو کیونکہ جو شخص خانہ خدا میں اندر آنا نہیں جانتا، وہ ہمیں نہیں چاہیے۔" ملحدین[1] میں سے ایک گروہ نے (اللہ ان پر لعنت کرے) اس بزرگِ طریق سے کسی طرح تعلق پیدا کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ریاضت و مجاہدہ اتنا چاہیے کہ بالآخر بندہ ولی ہو جائے اور جب وہ ولی ہو گیا تو عمل کی ضرورت نہ رہی اور یہ کھلی گمراہی ہے۔ حق تعالیٰ کے راستے میں کوئی ایسا مقام نہیں کہ جہاں اعمال کے ارکان میں سے کوئی رُکن اٹھ جائے اور اس کی ضرورت نہ رہے۔ میں اپنے مقام پر انشاء اللہ اس کی پوری شرح بیان کروں گا۔

چوتھی بحث

کرامت کا ثابت کرنا

جاننا چاہیے کہ سچے ولی سے کرامت کا ظہور جائز ہے۔ تمام اہل سنت و جماعت اس پر متفق ہیں اور عقل کی رُو سے بھی یہ بات محال نہیں کیونکہ اس قسم کی بات خداوند تعالیٰ کی قدرت میں ہے، نہ شریعت اصول میں سے کسی اصل کے منافی ہے اور لوگوں کے باطل خیالات اور اوہام کی وجہ سے معجزے اور کرامت سے ارادت دُور نہیں ہوسکتی۔ کرامت ولی کی صداقت کی علامت ہوتی ہے اور اس کا ظہور جھوٹے سے جائز نہیں۔ بجز اس کے کہ اس کے دعویٰ کے جھوٹا ہونے کی علامت ہو گی۔ کرامت وہ خلافِ عادت قول یا فعل ہے جو کسی نیک آدمی سے تکلیف شرعی کی موجودگی میں سرزد ہوتا ہے اور جو شخص حق تعالیٰ کے جتلانے سے صدق کو کذب سے جدا کرے تو وہ بھی ولی ہوتا ہے۔ اہل سنت و جماعت کا ایک گروہ کہتا ہے کہ کرامت درست ہے لیکن حد معجزے تک نہیں مثلاً، دعا کا قبول ہونا، اس سے مراد کا حاصل ہونا اور اس قسم کے دوسرے افعال کا ظہور جو عادت کے خلاف ہوں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ تمھیں کسی ولی صادق کے ذریعہ کسی خلافِ عادت فعل کے ظہور میں تکلیف شرعی کے موجود ہوتے ہوئے کیا قباحت نظر آتی ہے؟ اگر وہ کہیں کہ یہ کام خدا تعالیٰ کی قدرت میں نہیں تو یہ صریح گمراہی ہے اور اگر وہ کہیں کہ مقدور تو ہے لیکن ایک ولی صادق کے ہاتھ پر کسی خلاف عادتِ امر کا ظاہر ہونا نبوت کا باطل کرنا ہے اور انبیاء کی تخصیص کی نفی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی محال ہے کیونکہ ولی کرامت سے مخصوص ہوتا ہے اور نبی معجزے سے۔ وَالْمُعْجِزَةُ لَمْ تَكُنْ مُعْجِزَةً بِعَيْنِهَا اِنَّمَا كَانَتْ مُعْجِزَةً لِحُصُوْلِهَا وَمِنْ شَرْطِهَا اِقْتِرَانُ دَعْوَالنُّبُوَّةِ بِهَا فَالْمُعْجِزَاتُ تَخْتَصُّ لِلْاَنْبِيَاءِ وَالْكَرَامَاتُ تَكُوْنُ لِلْاَوْلِيَاءِ۔ (ترجمہ: اور معجزہ بعینہٖ معجزہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ حاصل ہونے کی وجہ سے ہی ہوتا ہے اور اس کی شرط یہ ہے کہ نبوت کا دعویٰ بھی اس کے ساتھ شامل ہو۔ پس معجزات انبیاء کے لیے مختص ہیں اور کرامات اولیاء کے ساتھ) اور جب ولی ولی ہو اور نبی نبی تو ان کے درمیان کوئی شبہ نہیں ہوتا کہ اس سے بچنا پڑے اور انبیاء علیہم السلام کے مرتبے کا شرف رُتبے کی بلندی اور عصمت کی صفائی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ نہ محض معجزہ یعنی خلاف عادت امور و افعال کے ظاہر کرنے سے اور سب کے اتفاق سے انبیاء کے تمام معجزات خلاف عادت ہوتے ہیں اور اصل اعجاز

---

[1] بے دین

میں تمام معجزے مساوی ہوتے ہیں، لیکن درجات میں ایک کو دوسرے پر فضیلت ہوتی ہے اور جب یہ جائز ہے کہ خلافِ عادت افعال کے ظاہر کرنے کے باوجود ان کو ایک دوسرے پر فضیلت ہو تو کیوں جائز نہیں کہ ولی کو بھی کرامت اور خلافِ عادت فعل کے ظاہر کرنے کی قدرت خاص ہو اور انبیاء کو ان اولیاء سے زیادہ فضیلت ہو اور جب وہاں خلافِ عادت فعل ایک دوسرے پر ان کی فضیلت اور تخصیص کا باعث نہیں ہوتا تو یہاں بھی فعل خلاف عادت ایک ولی کو دوسرے ولی پر تخصیص کا سبب نہیں ہوتا اور نہ وہ ان کے ساتھ برابر ہوتے ہیں۔ جس عقلمند کو یہ دلیل معلوم ہو جائیگی، اس کے دل سے یہ شبہ اُٹھ جائے گا۔ اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ ولی کو خلاف عادت کرامت حاصل ہو تو وہ نبوت کا دعویٰ کریگا تو اس کا یہ خیال بالکل محال ہے کیونکہ ولایت کی شرط سچ بولنا ہے اور حقیقت کے خلاف کسی بات کا دعویٰ جھوٹ ہوتا ہے اور جھوٹا ولی نہیں ہو سکتا اور اگر ولی نبوت کا دعویٰ کرے تو وہ معجزے میں نکتہ چینی کرتا ہے اور یہ کفر ہے۔ دوسرے یہ کہ کرامت سوائے مومن فرمانبردار کے کسی اور کو حاصل نہیں ہوتی اور جھوٹ نافرمانی ہے نہ کہ فرمانبرداری، اور جب ولی کی کرامت نبی کی حجت کے ثابت کرنے کے لیے ہوتی ہے تو طعن کرنے سے کرامت و معجزے کے درمیان کوئی شبہ نہیں پڑتا، کیونکہ پیغمبر ﷺ معجزے کے ثابت کرنے سے اپنی نبوت کو ثابت فرماتے ہیں اور ولی کرامت سے آپ کی نبوت کو بھی ثابت کرتا ہے اور اپنی ولایت کی بھی تصدیق کرتا ہے۔

پس سچا ولی وہی بات کہتا ہے جو ایک سچا نبی کہتا ہے اور ولی کی کرامت نبی کا عین معجزہ ہوتی ہے۔ ایک مومن کو ولی کی کرامت دیکھنے سے نبی کی صداقت پر زیادہ یقین ہو جاتا ہے نہ کہ اس میں کوئی شبہ پیدا ہو جاتا ہے، کیونکہ ان کے دعویٰ میں کوئی تضاد نہیں ہوتا کہ ایک دوسرے کی نفی کرے بلکہ کسی ولی کا دعویٰ بعینہٖ نبی کے دعویٰ کی دلیل ہوتا ہے، جیسا کہ شریعت میں جب وارثوں کا ایک گروہ دعویٰ میں متفق ہو تو جب ایک حجت ثابت ہو جائے گی تو اس کی حجت دوسروں کی بھی حجت ہوگی کیونکہ وہ سب دعویٰ میں متفق ہیں۔ جب دعویٰ میں تضاد ہوگا تو اس وقت ایک کی حجت دوسروں کی حجت نہ ہوگی۔ پس جب نبی معجزے سے اپنی نبوت کے صحیح ہونے کا مدعی ہو اور ولی اس کے دعویٰ میں اس کی تصدیق کرے تو اس شبے کا ثابت ہونا محال ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

پانچویں بحث

معجزہ اور کرامت میں فرق

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ جھوٹے کے ہاتھ پر معجزہ و کرامت کا ظہور محال ہے تو لامحالہ معجزہ و کرامت میں بھی فرق زیادہ واضح ہونا چاہیے تاکہ وہ اچھی طرح معلوم ہو جائے۔ سو جاننا چاہیے کہ معجزات کی شرط تو ان کو ظاہر کرنا ہے اور کرامات کی شرط ان کو چھپانا ہے کیونکہ معجزے کا فائدہ تو غیر کو پہنچتا ہے اور کرامت صرف صاحب کرامت کے لیے ہوتی ہے۔ نیز صاحب معجزہ (نبی) قطعی طور پر جانتا ہے کہ یہ عین معجزہ ہے اور ولی قطعی طور پر نہیں جانتا کہ یہ کرامت ہے یا استدراج، علاوہ ازیں نبی حکم الٰہی سے شرع میں تصرف کرتا ہے اور اس کے حکم سے اوامر و نواہی کو ترتیب دیتا ہے۔ ولی کو شریعت کے معاملے میں نبی کے احکام کو تسلیم و قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں ہوتا اس لیے کہ کسی طرح سے بھی ولی کی کرامت نبی کی شریعت کی مخالف نہیں ہوسکتی اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جب تو نے کہا کہ معجزہ ایک خلاف عادت فعل ہے اور نبی کی صداقت کی دلیل پھر اس خلافِ عادت فعل کو غیر نبی کے لیے بھی جائز رکھتا ہے تو

وہ فعل عادت کے موافق ہو جائے گا اور اس صورت میں تو اثبات کرامت کی یہ دلیل اثباتِ معجزہ کی دلیل کو باطل ٹھہرائے گی، تو میں جواب دوں گا کہ امر واقعہ میں ایسا نہیں ہے جیسا کہ تو نے خیال کیا ہے کیونکہ اعجاز خلقت کی عادت کے خلاف ہوتا ہے۔ لہٰذا ولی کی کرامت عین معجزہ ہی ہوتی ہے اور وہی دلیل ظاہر کرتی ہے جو معجزۂ نبی نے ظاہر کی ہے۔ پس اعجاز اعجاز کو باطل کرنے والا نہیں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو مکہ میں جب کافروں نے سولی پر چڑھا دیا تو رسول اللہ ﷺ مدینہ میں مسجد نبویؐ کے اندر بیٹھے ہوئے اس کو دیکھ رہے تھے اور کافر ان سے جو سلوک کر رہے تھے آنحضور ﷺ اس کو اپنے اصحاب سے بیان فرما رہے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے حضرت خبیبؓ کی آنکھ پر سے حجاب ہٹا دیا یہاں تک کہ انہوں نے بھی پیغمبر ﷺ کو دیکھ لیا اور آپ کو سلام کیا۔ خداوند تعالےٰ نے ان کا سلام پیغمبر ﷺ کے گوشِ مبارک تک پہنچا دیا اور حضور ﷺ کا جواب ان کو سنوا دیا۔ آپ نے خبیبؓ کے لیے دُعا کی، یہاں تک کہ ان کا رُخ قبلہ کی طرف واصل بحق ہو کر ہو گیا۔ پس ظاہر ہے کہ پیغمبر ﷺ کا ان کو مدینہ سے دیکھ لینا حالانکہ وہ اس وقت مکہ میں تھے، ایک فعل خلافِ عادت اور معجزہ تھا اور حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کا پیغمبر ﷺ کو مکہ سے دیکھ لینا ان کی کرامت تھی، اس لیے کہ سب کے اتفاق سے غائب کو دیکھ لینا خلاف عادت ہوتا ہے۔ پس غیبت زمان اور غیبت مکان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا۔ حضرت خبیبؓ کی کرامت پیغمبر ﷺ سے غیبت مکان کی حالت میں اور اولیا متاخرین کی کرامت حضور ﷺ سے غیبت زمان کی حالت میں دونوں برابر ہیں اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کرامت کا معجزے کی ضد ہونا محال ہے کیونکہ کرامت صاحب معجزہ کی تصدیق کے سوا کسی اور صورت میں ثابت نہیں ہوسکتی، اور نہ تصدیق کرنے والے اطاعت گزار مومن کے سوا کسی اور کے ہاتھ پر ظاہر ہوسکتی ہے کیونکہ اُمت کی کرامتیں سراسر پیغمبر ﷺ کے معجزے ہوتے ہیں، اس لیے کہ پیغمبر ﷺ کی شریعت باقی ہے، لہٰذا اس کی حجت کا باقی رہنا بھی ضروری ہے۔ پس اولیاء اللہ رسولوں کی رسالت کی صداقت پر گواہ ہوتے ہیں اور یہ جائز نہیں کہ دینِ رسول سے بیگانہ کسی شخص کے ہاتھ پر کرامت ظاہر ہو۔

اس معنی کی تائید میں حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں اپنی عادت کے مطابق تنہا جنگل میں جا رہا تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک گوشے میں سے ایک آدمی اٹھا اور اس نے مجھ سے مصاحبت کی درخواست کی۔ میں نے اس پر نگاہ ڈالی تو اس کے دیکھنے سے مجھے نفرت سی ہوئی۔ میں نے کہا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے کہا: "اے ابراہیم! رنجیدہ خاطر نہ ہو جائیے، میں نصاریٰ اور ان کے پادریوں میں سے ہوں اور آپ کی صحبت کی اُمید پر ملک روم کے دور دراز شہروں سے آیا ہوں۔" آپ نے فرمایا کہ جب مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ ایک اجنبی ہے تو میرا دل مطمئن ہو گیا۔ اس کی صحبت اور اس کے حق رفاقت کو ادا کرنے کے لیے بخوشی تیار ہو گیا۔ میں نے کہا: "اے نصاریٰ کے راہب! میرے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ تمہیں اس جنگل میں رنج پہنچے۔" اس نے جواب دیا: "اے ابراہیم! عالم میں تیری اتنی شہرت ہے اور تو ابھی تک کھانے پینے کا ہی غم رکھتا ہے۔" میں نے اس کی اس خوش دلی سے تعجب کیا اور اس بات کا تجربہ کرنے کے لیے کہ وہ اپنے دعوےٰ میں کہاں تک سچا ہے اور کس درجہ میں ہے، اس کو اپنی صحبت میں قبول کر لیا۔ جب ہم سات رات دن تک چلتے رہے تو ہمیں پیاس لگی اور وہ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: "اے ابراہیم! عالم میں تیری اتنی شہرت ہے اور تجھ کو اللہ تعالےٰ کی جناب میں بے تکلفی اور ناز حاصل ہے۔ کوئی کرامت دکھا کہ مجھ میں پیاس کے مارے چلنے کی طاقت نہیں رہی۔" آپ فرماتے ہیں کہ میں نے زمین پر سر

رکھ کر دعا کی کہ "بارِ خدایا! مجھے اس کافر کے سامنے ذلیل نہ کیجیو، کیونکہ اسے عین بیگانگی میں مجھ پر حسن ظن اور نیک خیال ہے۔ کیا بات ہے اگر تو اس کافر کے ظن کو میرے متعلق صحیح کر دے۔" آپ فرماتے ہیں کہ جب میں نے سر اٹھایا تو ایک طبق دیکھا، جس میں دو روٹیاں اور دو پیالے شربت کے رکھے ہیں۔ ہم وہ کھا پی کر وہاں سے چلے۔ جب سات روز اور گزر گئے تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھے بھی اس نصرانی کا تجربہ کرنا چاہیے تاکہ پیشتر اس کے کہ وہ کسی بات میں امتحان کرے اور میرے ساتھ معارضہ کرے، وہ خود اپنی ذلت کو دیکھ لے۔ میں نے کہا: "اے نصرانی راہب! آج تیری باری ہے۔ لا دکھا جو کچھ تیرے پاس اپنی ریاضت کا ثمر ہے۔" اس نے بھی زمین پر سر رکھ کر کچھ کہا تو ایک طبق نمودار ہوا جس پر چار روٹیاں اور چار پیالے شربت کے رکھے تھے۔ مجھے اس بات سے سخت تعجب ہوا اور دل میں رنج پیدا ہوا۔ میں نے اپنی حالت سے نااُمید ہو کر جی میں کہا کہ میں تو اس سے ہرگز نہیں کھاؤں گا کیونکہ یہ کافر کے لیے ظاہر ہوا ہے اور یہ یقیناً غیر اللہ کی طرف سے امداد ہے پس میں یہ کب کھا سکتا ہوں؟ اس نے مجھ سے کہا: "اے ابراہیم! کھا لیجئے۔" میں نے کہا: "میں تو نہیں کھاؤں گا۔" اس نے پوچھا: "کیوں؟" میں نے جواب دیا کہ "تو اس بات کا اہل نہیں اور یہ کرامت تیرے حال کے مناسب نہیں اور میں تیرے اس کام میں متعجب ہوں۔ اگر اس کو کرامت پر محمول کرتا ہوں تو کرامت کا ظہور کافر سے روا نہیں اور اگر کہوں کہ معونت ہے تو مدعی کو شبہ ہوگا کہ جب اللہ بغیر اسلام قبول کیے اس کی مدد فرما رہا ہے تو پھر اسے اسلام کیوں نہ قبول کرنا چاہیے۔" اس نے مجھ سے کہا: "اے ابراہیم! کھا لیجئے آپ کو دو باتوں کی بشارت ہو۔ ایک تو میرے اسلام لانے کی اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ۔ (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد مصطفےٰ ﷺ اس کے بندے اور اس کے سچے رسول ہیں) اور دوسرے اس بات کی کہ تیرا اللہ کے نزدیک بہت بڑا رُتبہ ہے۔" میں نے پوچھا: "یہ کیونکر؟" اس نے جواب دیا: "اس طرح کہ درحقیقت ہمیں رُوحانی کشف اور کرامت حاصل نہیں ہوسکتی۔ میں نے آپ کی شرم اور توسط سے سرزمین پر رکھ کر دعا کی کہ بار خدایا! اگر محمد ﷺ کا دین برحق ہے اور تجھے پسند ہے تو مجھے دو روٹیاں اور دو پیالے شربت عطا کر اور اگر ابراہیم خواص تیرا ولی ہے تو مجھے دو روٹیاں اور دو پیالے شربت کے اور مرحمت فرما۔ جب میں نے سر اٹھایا تو یہ طبق حاضر پایا۔" پھر حضرت ابراہیم نے الحمد اللہ پڑھ کر اس میں سے کھا لیا اور وہ جوانمرد راہب دین اسلام کے بزرگوں میں سے ایک بزرگ ہو گیا اور یہ عین معجزۂ نبی ہے، جس میں کرامت ملی ہوئی ہے اور یہ بہت ہی نادر ہے کہ نبی کی غیر موجودگی میں غیر نبی کی دلیل ظاہر ہو۔ ولی کے سامنے غیر ولی کو ولی کی کرامت نصیب ہو اور درحقیقت ولایت کی انتہا نبوت کی ابتدا کے بغیر نہیں ہوتی اور وہ راہب فرعون کے جادوگروں کی طرح مخفی اولیاء میں سے تھا۔

پس حضرت ابراہیم خواصؒ نے نبی کے معجزے کی سچائی ثابت کر دی اور وہ دوسرا شخص نبوت کی سچائی بھی طلب کرتا تھا اور ولایت کی عزت بھی۔ خدا تعالیٰ نے اپنے حسن عنایت ازلی سے اس کا مقصود حاصل کرا دیا اور یہ کرامت و اعجاز میں ظاہر فرق ہے اور اس کے متعلق کلام بہت ہے مگر یہ کتاب اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ کرامت کا اظہار اولیا پر ایک دوسری کرامت ہے، لیکن اس کی شرط اس کا مخفی رکھنا ہے نہ کہ تکلف سے اس کو ظاہر کرنا۔ میرے شیخؒ نے فرمایا ہے کہ اگر ولی ولایت کو ظاہر کرے اور اس کا دعویٰ کرے تو اس کے حال کی صحت کو کچھ نقصان نہیں دیتا بشرطیکہ اظہار میں عجز و انکسار ہو لیکن اس کے ظاہر کرنے میں تکلف کرنا سرکشی ہے، واللہ اعلم۔

چھٹی بحث

مدعی الوہیت کے ہاتھ پر خرقِ عادت کا اظہار

تمام مشائخ طریقت اور اہلِ سنت و جماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ معجزہ اور کرامت کی طرف خلافِ عادت فعل کا ظہور کسی کافر کے ہاتھ پر بھی ہو سکتا ہے، جب کہ اس فعل کے ظہور میں شبہ کے اسباب بالکل پائے نہ جائیں اور کسی کو اس کے جھوٹ ہونے میں شک نہ ہو، لیکن اس خارقِ عادت فعل کا ظہور درحقیقت اس کافر کے جھوٹ پر دلالت کرتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ فرعون نے چار سو سال عمر پائی۔ اتنے عرصہ میں اسے کوئی بیماری نہ ہوئی اور پانی اس کے پیچھے اوپر کو چڑھتا تھا۔ جب وہ کھڑا ہو جاتا تو پانی بھی ٹھہر جاتا اور جب وہ چلتا تو پانی بھی چلنے لگتا تھا، لیکن اس سب باتوں کے باوجود اس نے خدائی کا جو دعوےٰ کیا، عقلمندوں کو اس دعویٰ کے جھوٹ ہونے میں کوئی شبہ و شک نہیں ہوا کیونکہ عقلمند اس بات کو مان لینے پر مجبور ہیں کہ خداوند عزّ اسمہ، مرکب اور مجسم نہیں۔ اگر ایسے افعال اور بھی بہت سے اس سے ظاہر ہوتے تو بھی عاقل کو اس کے دعوےٰ کے جھوٹ ہونے پر شک نہ ہوتا اور وہ خلافِ عادت اُمور پر جو باغ ارم کے مالک شداد اور بادشاہ نمرود کی نسبت بیان کیے جاتے ہیں، ان کو اسی پر قیاس کرنا چاہیے۔

ویسے ہی مخبر صادق حضرت رسول ﷺ نے ہمیں خبر دی ہے کہ آخر زمانے میں دجال ظاہر ہوگا اور وہ خدائی کا دعویٰ کرے گا اور دو پہاڑ اس کے دائیں بائیں چلتے ہوں گے۔ دائیں طرف نعمت کا اور بائیں طرف عذاب و سزا کا اور وہ لوگوں کو اپنی طرف دعوت دے گا اور جو شخص اسے نہ مانے گا، اسے وہ عذاب دے گا اور خداوند تعالےٰ اس کی گمراہی کی وجہ سے لوگوں کو مارے گا اور زندہ کرے گا اور تمام جہان میں اس کا حکم مطلق پھیلا دیا جائے گا اور اگر اس کی بجائے سو گنا افعال خلافِ عادت اس دجال سے ظاہر ہوں تو بھی عاقل کو ان کے جھوٹ بولنے میں کوئی شبہ نہیں ہوگا کیونکہ عقلمند آدمی کو ضرور معلوم ہوگا کہ خدا نہ تو گدھے پر سوار ہوتا ہے، نہ تغیر و تبدل پذیر اور اندھا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی سب خارقِ عادت باتوں پر استدراج[1] کا حکم لگایا جائے گا اور یہ بھی جائز ہے کہ رسالت کے جھوٹے مدعی کے ہاتھ پر کوئی فعل خارقِ عادت ظاہر ہو، جو اس کے جھوٹ کی دلیل ہو، جیسا کہ سچے (نبی) کے ہاتھ پر اس کی صداقت کی علامت ہوتی ہے لیکن یہ روا نہیں کہ کوئی ایسا فعل ظاہر ہو جس میں کسی کو کوئی شبہ واقع ہو اور جب شبے کا ثابت ہونا جائز ہو تو جھوٹے کو سچے اور سچے کو جھوٹے سے الگ پہچان سکتے ہیں۔ اس وقت طالب نہیں جانتا کہ کس کی تصدیق کرے اور کس کی تکذیب۔ اس وقت نبوت کا حکم اسی سبب سے بالکل باطل ہو جاتا ہے اور روا ہے کہ ولایت کے مدعی کے ہاتھ پر کرامت کی قسم کی کوئی چیز ظاہر ہو جو دین میں درست ہو اگرچہ اس کا عمل اچھا نہ ہو۔ اس لیے کہ وہ اس سے رسول کی صداقت ثابت کرتا ہے اور اللہ کا فضل ظاہر کرتا ہے نہ کہ اس فعل کو جو اپنی قدرت اور طاقت کی طرف نسبت کرتا ہے اور جو شخص اصل ایمان میں بغیر دلیل کے سچا ہوتا ہے، وہ تمام احوال میں ولی کے اعتقاد کے وصف ہی کی وجہ سے ہوتا ہے اگرچہ اس کے اعمال اس کے اعتقاد کے موافق نہ ہوں۔ بایں ہمہ ولایت کا دعویٰ نہ ہونے کی وجہ سے اس کے منافی نہیں جیسا کہ ایمان کا دعویٰ اس کے منافی نہیں کیونکہ کرامت اور ولایت اللہ تعالیٰ کی بخششوں میں سے ہے نہ کہ بندے کے کسبوں میں سے۔ پس بندے کا کسب ہدایت اور بخشش خداوندی کے لیے علت

---

[1] وہ خلافِ عادت اُمور جو کسی کافر یا بے دین کے ہاتھ پر ظاہر ہو جائیں۔

نہیں ہو سکتا۔ ہاں اس سے پہلے میں نے کہہ دیا ہے کہ اولیاء معصوم نہیں ہوتے کیونکہ عصمت نبوت کی شرط ہے، لیکن وہ ایسے گناہ سے ضرور محفوظ ہوتے ہیں کہ اس کا وجود ولایت کی نفی کا اقتضا کرے اور ولایت کی نفی اس چیز سے ہوتی ہے جو ایمان کی نفی کرے۔ پس ایسی چیز کے ارتکاب سے بندہ مرتد ہوتا ہے، نافرمان نہیں اور یہی مذہب حضرت محمد بن علی حکیم ترمذی و جنید و بوالحسن نوری وحاسب محاسبی رحمہم اللہ اور ان کے علاوہ اور بہت سے اہل حقائق کا ہے، لیکن اہل معاملات، مثلاً حضرت سہل بن عبداللہ تستری، ابوسلیمان دارانی اور ابو حمدون قصار رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ ولایت کی شرط، بندگی پر ہمیشہ قائم رہنا ہے اور جب کبیرہ گناہ اس سے سرزد ہوتا ہے تو ولایت سے معزول ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے میں کہہ چکا ہوں کہ اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ بندہ کبیرہ گناہ کی وجہ سے ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ پس کوئی ولایت دوسری ولایت سے بہتر نہیں اور چونکہ ولایت معرفت جو تمام کرامتوں کا اصل اور سرچشمہ ہے محض معصیت کی وجہ سے ساقط نہیں ہوتی تو محال ہے کہ جو ولایت شرف و کرامت میں اس سے کم درجہ کی ہے، وہ معصیت سے زائل ہو جائے اور اس مسئلے میں مشائخ کرام کا بہت اختلاف ہے اور میرا مقصود یہاں سب کو ثابت کرنا نہیں، لیکن سب سے ضروری اور اہم چیز اس باب کی معرفت میں یہ ہے کہ تمہیں اس بات کا یقینی علم ہونا چاہیے کہ یہ سب کرامت ولی سے کس حال میں واقع ہوتی ہے۔ حالت صحو میں یا حالت سکر میں؟ حال کے غلبے میں یا حال پر قابو ہونے کی صورت میں؟

میں صحو و سکر کی شرح حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ کے ذکر میں بیان کر چکا ہوں اور حضرت بایزیدؒ و ذوالنون مصریؒ و محمد بن خفیفؒ وحسین بن منصورؒ و یحییٰ ابن معاذ رازیؒ رحمہم اللہ اور ایک جماعتِ صوفیا اس پر متفق ہیں کہ کرامت کا ظہور ولی سے سوائے حالت سکر کے اور کسی حال میں نہیں ہوتا اور جو حالت صحو میں ہو، وہ معجزہ انبیاء ہوتا ہے۔ یہ ان مشائخ کے مذہب میں معجزہ وکرامت کے درمیان واضح فرق ہے کہ کرامات کا اظہار ولی سے اس کے سکر کی حالت میں ہوتا ہے، کیونکہ وہ مغلوب الحال ہوتا ہے اور اس کے لیے کوئی دعوت نہیں ہوتی اور معجزے کا ظہور نبی سے حالت صحو میں ہوتا ہے کیونکہ وہ تحدی کرتا ہے اور لوگوں کو اس کے معارضہ کے لیے بلاتا ہے۔ صاحب معجزہ کو حکم الٰہی کی دونوں طرفوں میں سے کسی ایک کے کرنے کا اختیار دیا جاتا ہے یعنی ضرورت کے موقع پر اس کو ظاہر کرنا یا اس کو مخفی رکھنا لیکن اولیاء کو یہ بات حاصل نہیں ہوتی کیونکہ ان کو کرامت میں اختیار نہیں ہوتا۔ ولی کبھی کرامت چاہتا ہے تو ظاہر نہیں ہوتی اور کبھی نہیں چاہتا تو ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ ولی لوگوں کو دعوت دینے کے لیے مبعوث نہیں ہوتا کہ اس کا حال اوصاف کے باقی رہنے کے ساتھ منسوب ہو کیونکہ وہ تو پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کا حال صفت کے فنا ہونے سے موصوف ہوتا ہے، پس نبی صاحب شریعت ہوتا ہے اور ولی صاحب سر۔ پس ضروری ہے کہ کرامت سوائے وحشت، غیبت اور مدہوشی کی حالت کے کسی اور حالت میں ظاہر نہ ہو اور اس کا سب تصرف حق تعالےٰ کے تصرف کی وجہ سے ہوتا ہے اور جس شخص کا حال ایسا ہو، اس کا سب کلام تالیف اور مشاہدۂ حق سے ہوتا ہے اس لیے کہ بشریت کی صفت کی صحت یا غافل کامل کو حاصل ہوتی ہے یا بھولنے والے کو یا بالکل اللہ والے کو۔ پس انبیا نہ غافل ہوتے ہیں نہ غلطی کرنے والے اور سوائے انبیاء علیہم السلام کے صحیح معنوں میں اللہ والا اور کوئی نہیں ہوتا۔ اب رہ گئے اولیاء، سو جب تک وہ بشریت کے حال کو قائم رکھتے ہوئے باہوش ہوتے ہیں، حق تعالےٰ سے حجاب میں ہوتے ہیں۔ جب مشاہدہ کرنے والے ہوتے ہیں تو اللہ تعالےٰ کے امکان کی حقیقت میں بے ہوش اور متحیر ہو جاتے ہیں اور کرامت

کا ظہور سوائے حالت کشف کے اور کسی حالت میں درست نہیں ہوتا کیونکہ وہ ان کے قرب کا درجہ ہوتا ہے اور اس وقت ہوتا ہے کہ پتھر اور سونا ان کے نزدیک یکساں ہوتا ہے اور کسی صورت میں بھی یہ حالت سوائے انبیاء کے کسی اور آدمی کی صفت نہیں ہوتی اور اگر ایسی صفت کسی میں پائی بھی جائے تو بالکل عارضی یا حالت سکر میں ہوگی۔ چنانچہ ایک روز حارثہؓ نے دنیا سے کنارہ کش ہوتے وقت دنیا میں عقبیٰ کا مکاشفہ کرتے ہوئے فرمایا: اَعْرَضْتُ نَفْسِيْ عَنِ الدُّنْيَا فَاسْتَوٰى عِنْدِيْ حَجَرُهَا وَ ذَهَبُهَا وَ مَدَرُهَا۔ (ترجمہ: میرے نفس نے دنیا سے اعراض کیا تو میرے نزدیک اس کا پتھر اور سونا چاندی اور ڈھیلا سب برابر ہو گئے)۔ دوسرے روز لوگوں نے ان کو دیکھا کہ کھجور کے درخت پر چڑھے ہوئے کام کر رہے ہیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ اے حارثہ! کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ روزی تلاش کر رہا ہوں کہ اس سے چارہ نہیں۔ اس وقت ویسی حالت تھی اور اب اس وقت ایسی حالت ہے۔ پس اولیاء کے صحو کے مقام کو عوام کا درجہ ہوتا ہے اور ان کے مقام سکر کو انبیاء کا درجہ۔ جب وہ باہوش ہوتے ہیں تو اپنے آپ کو عام لوگوں میں سے ایک معمولی آدمی سمجھتے ہیں اور جب حالت سکر میں بے ہوش ہو جاتے ہیں اور حق تعالےٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ان کی بے ہوشی پاکیزہ ہو جاتی ہے اور حق تعالےٰ کے لیے تہذیب یافتہ ہو جاتے ہیں اور سارا عالم ان کے حق میں سونا ہو جاتا ہے۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ذَهَبٌ اَيْنَمَا ذَهَبْنَا وَ دُرٌّ حَيْثُ دُرْنَا وَ فِضَّةٌ فِي الْفَضَاءِ۔ (ترجمہ: جہاں ہم چلے گئے سونا ہے اور جہاں ہم گھومے وہاں موتی ہیں اور فضا میں چاندی ہے) اور حضرت استاد ابو القاسم قشری رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے سنا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے حضرت طبرانی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے ابتدائے حال کی نسبت دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ایک مرتبہ مجھے پتھر کی ضرورت ہوئی تو سرخس کے دریا سے جو پتھر میں اُٹھاتا تھا، وہ ایک موتی ہو جاتا تھا اور میں اس کو پھینک دیتا تھا۔ یہ اس لیے ہوتا تھا کہ دونوں آپ کے نزدیک یکساں ہوتے تھے بلکہ موتی زیادہ ذلیل ہوتا تھا کیونکہ آپ کو اس کی خواہش نہ ہوتی تھی بلکہ پتھر کی ضرورت ہوتی تھی۔ خواجہ امام خزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے سرخس میں سنا کہ انہوں نے فرمایا کہ میں بچہ تھا اور ایک محلے میں ریشم کے کیڑوں کے لیے توت کے پتوں کی تلاش میں گیا ہوا تھا، چنانچہ ایک درخت پر چڑھ گیا۔ اس کی شاخ کو ہلایا کہ شیخ ابو الفضل بن الحسن رحمۃ اللہ علیہ کا اس کوچے میں گزر ہوا اور میں درخت پر چڑھا ہوا تھا۔ آپ نے مجھے نہ دیکھا اور مجھے کوئی شک نہ ہوا کہ وہ مدہوش ہیں اور دل سے خدا کی طرف متوجہ ہیں۔ اتنے میں آپ سر اٹھا کر فرمانے لگے: "بارِ خدایا! ایک سال سے زیادہ عرصہ ہوا کہ تو نے مجھے ایک دانگ تک نہ دیا کہ سر کے بال منڈواؤں، کیا دوستوں سے ایسا ہی سلوک روا رکھتے ہیں؟" آپ فرماتے ہیں کہ اس وقت درختوں کے تمام پتے، ٹہنیاں اور جڑیں میں نے سنہری دیکھیں۔ پھر آپ نے فرمایا: "یہ عجیب معاملہ ہے کہ ہمارا اشارہ دنیا سے اعراض کرنا ہے، دل کی کشائش کے لیے تجھ سے کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔" حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے چار ہزار دینار سب کے سب دریائے دجلہ میں پھینک دیئے۔ لوگوں نے پوچھا: "آپ نے یہ کیا کیا؟" آپ نے جواب دیا: "پتھر پانی میں بہتر ہیں۔" لوگوں نے کہا: "آپ اور لوگوں کو کیوں نہیں دیتے؟" آپ نے فرمایا: "سبحان اللہ! میں اللہ تعالےٰ کے حضور میں کیا جواب دے سکوں گا کہ حجاب اپنے دل سے اٹھا کر مسلمان بھائیوں کے دل پر رکھ دیا اور یہ دین کی شرط نہیں مسلمان بھائی کے واسطے اپنی نسبت زیادہ برائی چاہوں۔" یہ سب سکر کی حالت ہے اور اس کی شرح پہلے میں بیان کر چکا ہوں،

لیکن یہاں مراد کرامات کا ثابت کرنا ہے اور حضرت جنید و حضرت ابو العباس سیاری و حضرت ابوبکر واسطی و حضرت محمد بن علی ترمذی رحمہم اللہ (اللہ ان سب سے راضی ہو، جو صاحب طریقہ ہیں) وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ کرامت حالت صحو و تمکین میں ظاہر ہوتی ہے نہ سکر میں، اس لیے کہ اولیاء اللہ ملک کے مدبر ہیں اور عالم کے احوال سے آگاہ۔ خدا تعالےٰ نے ان کو عالم کے لیے حاکم بنادیا ہے، اس کا انتظام ان سے متعلق فرمادیا ہے اور عالم کے جملہ احکام کو ان کی ہمت سے وابستہ کر دیا ہے۔ پس ضرور ہے کہ سب سے زیادہ صحیح رائے انہی کی ہو اور اللہ کی مخلوق پر سب سے زیادہ شفقت والا دل انہی کا ہو کیونکہ وہ منزلِ مقصود پر پہنچے ہوئے ہوتے ہیں اور مزاج میں تغیر و سکر حال کی ابتدا میں ہوتا ہے۔ جب منزلِ مقصود پر رسائی حاصل ہو جائے تو تغیر تمکین سے بدل جاتا ہے اور اسی وقت وہ دراصل ولی ہوتا ہے اور اس کی کرامت صحیح ہوتی ہے۔

اہل طریقت کا عقیدہ ہے کہ اوتاد کو چاہیے کہ ہر رات عالم کے گرد گھومیں اور اگر کوئی ایسی جگہ رہ جائے، جہاں ان کی نظر نہ پڑے تو دوسرے روز ایسی جگہ خلل پیدا ہو جاتا ہے، تب وہ اپنے وقت کے قطب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تاکہ وہ اپنی ہمت مبذول کرے اور وہ خلل عالم سے اس کی برکتوں کی وجہ سے دُور ہو جائے۔ اگر یہ کہتے ہیں کہ سونا اور مٹی کا ڈھیلا ان کے نزدیک مساوی ہو جاتا ہے، یہ سب سکر کی علامت اور مشاہدے کی نادرستی ہے۔ کوئی زیادہ شرف و فضیلت کی بات نہیں، بلکہ شرف اس میں ہے کہ سونا اس کے نزدیک سونا ہو اور مٹی کا ڈھیلا ڈھیلا تاکہ اس کی خرابی سے آگاہ ہو، یہاں تک کہ وہ کہہ سکے یَا صَفْرَآءُ یَا بَیْضَآءُ غِرِیْ غَیْرِیْ لَاْلِیْ۔ (ترجمہ: اے زرِ زرد! اے سیم سفید! کسی اور کو فریب دے، تو مجھے فریب نہیں دے سکتی) کیونکہ میں تیری خرابی سے آگاہ ہوں۔ پس جو شخص تیری خرابی کو دیکھ لیتا ہے، اس کو حجاب کا محل سمجھتا ہے۔ جب اس کو ترک کر دیتا ہے تو اس کا ثواب پالیتا ہے۔ پھر جس شخص کو سونا ڈھیلے کی طرح معلوم ہو، اس کا ڈھیلے کو ترک کرنا ٹھیک نہیں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ حضرت حارثہؓ چونکہ صاحب سکر تھے، اس لیے انہوں نے کہہ دیا کہ سونا پتھر، ڈھیلا اور چاندی میرے نزدیک یکساں ہیں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ صاحب صحو تھے۔ آپ نے دنیا لینے کی خرابی کو دیکھ لیا اور اس کے ترک کرنے کا ثواب انہیں معلوم ہو گیا تو آپ نے اس کو ترک کر دیا۔ یہاں تک کہ پیغمبر ﷺ نے پوچھا کہ "بیوی بچوں کے لیے تم نے کیا چھوڑا؟" تو انہوں نے عرض کیا کہ "اللہ اور اس کا رسول ﷺ۔" ابوبکر وراق رحمتہ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ ایک روز محمد بن علی رحمتہ اللہ علیہ نے مجھ سے فرمایا: "اے ابوبکر! آج میں تمہیں ایک جگہ لے جاؤں گا۔" میں نے کہا: "جیسا حکم ہو، تعمیل کے لیے تیار ہوں۔" چنانچہ میں آپ کے ہمراہ چلا گیا۔ ابھی کچھ دیر نہ ہوئی تھی کہ میں نے ایک بہت دشوار گزار جنگل دیکھا جس میں ایک سبز درخت کے نیچے سنہری تخت بچھا ہوا اور اس کے نیچے پانی کا چشمہ جاری تھا۔ اس تخت پر ایک شخص نہایت عمدہ لباس پہنے ہوئے بیٹھا تھا۔ محمد بن علی رحمتہ اللہ علیہ اس کے پاس گئے تو وہ شخص اُٹھ کھڑا ہوا اور ان کو اس تخت پر بیٹھا دیا۔ جب کچھ وقت گزر گیا تو ہر طرف سے لوگ آنے شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ چالیس آدمی جمع ہو گئے۔ اس شخص نے اشارہ کیا تو آسمان سے کھانے کی نہایت عمدہ چیزیں نازل ہوئیں۔ ہم سب نے انہیں سیر ہو کر کھایا اور محمد بن علی رحمتہ اللہ علیہ نے اس شخص سے ایک سوال کیا اور اس شخص نے اس کے متعلق بہت کچھ کہا، لیکن ایک بات بھی اس میں سے میری سمجھ میں نہ آئی۔ جب تھوڑا سا وقت گزر گیا تو آپ اجازت لے کر واپس ترمذ لوٹے اور مجھ سے فرمایا کہ "جا تو سعید ہو گیا۔" جب ہم ترمذ واپس آئے تو میں نے عرض کیا: "اے شیخ! وہ کونسی جگہ تھی اور وہ شخص کون تھا؟ آپ

نے فرمایا: "وہ مقام بنی اسرائیل کا جنگل تھا اور وہ شخص قطب[1] مدار علیہ تھا۔" میں نے پوچھا: "اے شیخ! ہم اتنے وقت میں ترمذ سے بنی اسرائیل کے جنگل میں کیونکر پہنچ گئے؟" آپ نے جواب دیا: "تمہیں پہنچنے سے کام تھا نہ کہ پوچھنے اور اس کی کیفیت دریافت کرنے سے۔" مطلب یہ کہ یہ حال کے صحیح ہونے کی علامتیں ہیں نہ کہ سکر کی۔ میں نے تو ان واقعات کو مختصر بیان کر دیا ہے، اگر میں ان کی تفصیل میں مشغول ہوتا اور ایسی باتوں کی شرح کرتا تو کتاب طویل ہو جاتی اور اصل مضمون بیان ہونے سے رہ جاتا۔ اس کے بعض ان دلائل کو جو اس کتاب سے متعلق ہیں، کرامات اور حکایات کے ذکر کرنے سے ان کی تاویل کرتا ہوں تاکہ اس کے پڑھنے سے مریدوں کو تنبیہ ہو، علماء کو راحت، محققین کے لیے یاد دہانی، عوام کے لیے یقین کی زیادتی اور شبہ دُور کرنے کا باعث ہو، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ساتویں بحث

کراماتِ اولیاء اللہ

جاننا چاہیے کہ جب کرامات کے صحیح ہونے پر عقلی حجت ثابت ہو چکی اور ان کے ثبوت پر دلیل قائم ہو چکی تو نقلی دلائل بھی تمہیں ضرور معلوم ہونے چاہییں۔ یہ واضح رہے کہ کتاب اور سنت اہل ولایت کے ہاتھ سے کرامات اور افعالِ خلافِ عادت کے ظہور کے صحیح ہونے پر ناطق ہیں اور ان کا انکار کرنا نصوص کا انکار کرنا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے: وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى۔ (ترجمہ: ہم نے تم پر بادل کا سایہ کیا اور من و سلویٰ اُتارا) اگر منکرین میں سے کوئی یوں کہے کہ یہ تو موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا، تو ہم کہیں گے کہ یہ جائز ہے کیونکہ اولیاء کی کرامتیں سب محمد ﷺ کا معجزہ ہیں اور اگر وہ یوں کہیں کہ یہ ہماری کرامتیں حضور ﷺ سے غائب ہونے کی حالت میں ہیں، اس لیے ضروری نہیں کہ آپ کا معجزہ ہوں اور معجزہ موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں تھا تو ہم کہتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے غائب ہو کر کوہِ طور پر چلے گئے تو وہی حکم یعنی ابر کا سایہ اور من و سلویٰ ان پر باقی رہا، پس زمان و مکان کی غیبت دونوں مساوی ہیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ بھی غیبت زمان کی صورت میں جائز ہو گا۔ اسی طرح ہم کو آصف بن برخیا کی کرامت کی یہ خبر دی گئی ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو ضرورت ہوئی کہ بلقیس کا تخت اس کے یہاں پر پہنچنے سے پیشتر آپ کے سامنے حاضر کر دیں اور اللہ تعالےٰ نے آصف بن برخیا کا شرف اور اس کی کرامت کو لوگوں پر ظاہر کرنا اور اہل زمانہ کو یہ جتانا چاہا کہ اولیاء اللہ کی کرامت جائز ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: "کون ہے جو بلقیس کا تخت اس کے آنے سے پہلے یہاں حاضر کر دے؟"

اللہ تعالےٰ اس واقعہ کی حکایت کرتے ہوئے ہمیں خبر دیتا ہے کہ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ۔ (ترجمہ: جنوں میں سے ایک دیو نے کہا میں اس کو آپ کے پاس اس سے پہلے لا سکتا ہوں کہ آپ اپنے مقام سے اُٹھیں) حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: اس سے زیادہ جلدی چاہیئے تو حضرت آصف بن برخیا نے کہا: اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ۔ (ترجمہ: میں اسے آپ کی خدمت میں پلک جھپکنے سے پہلے لا سکتا ہوں)۔ ان کی اس بات سے حضرت سلیمان ناراض نہیں ہوئے نہ ہی اس کا انکار فرمایا نہ آپ کو محال معلوم

[1] جن کے ہاتھ میں دنیا کی باگ ہو انہیں قطب مدار علیہ کہتے ہیں۔

ہوا، اور یہ کسی صورت سے بھی معجزہ نہ تھا کیونکہ آصف پیغمبر نہ تھے۔ اس لیے لامحالہ کرامت ہوگی اور اگر وہ معجزہ ہوتا تو حضرت سلیمان علیہ السلام سے اس کا ظاہر ہونا لازم تھا۔ نیز حضرت مریم علیہا السلام کے قصے میں اللہ تعالےٰ نے خبر دی ہے کہ جب حضرت زکریا علیہ السلام آپ کے پاس آتے تو گرمی کے موسم میں سردی کے پھل موجود پاتے اور سردی کے موسم میں گرمی کے، حتیٰ کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا: اَنّٰی لَكِ هٰذَا۔ (ترجمہ: یہ پھل تمہارے پاس کہاں سے آئے؟) حضرت مریم علیہا السلام نے فرمایا: هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ (ترجمہ: یہ اللہ کے ہاں سے آئے ہیں)۔ حالانکہ وہ نبی نہ تھیں، نیز خدا تعالےٰ نے ان کے حال سے متعلق دوسری جگہ ہمیں یہ خبر دی ہے: وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا۔ (ترجمہ: اے مریم! تو کھجور کے تنے اپنی طرف ہلا، اس سے تجھ پر تازہ کھجوریں گریں گے) نیز اصحاب کہف کا حال، کتے کا ان سے کلام کرنا، غار میں ان کا تین سو سال تک سوتے رہنا اور غار میں دائیں بائیں کروٹ بدلنا، چنانچہ فرمایا: وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ (ترجمہ: اور ہم ان کو دائیں بائیں پہلو پر کروٹیں بدلتے رہتے ہیں اور ان کا کتا ہاتھ پھیلائے بیٹھا ہے)۔ پس یہ سب افعال عادت کے خلاف ہیں اور ظاہر ہے کہ معجزہ نہیں ہیں۔ اس لیے ضرور ہے کہ کرامات ہوں اور یہ بھی روا ہے کہ یہ کرامات تکلیف کے وقت ناممکن الحصول چیزوں کے لیے دُعاؤں کے قبول ہونے کی صوت میں ہوں اور یہ بھی روا ہے کہ ایک ولی اللہ لوگوں کے دلی اندیشوں پر اطلاع پالے۔

احادیثِ صحیحہ میں پیغمبر ﷺ کی حدیث الغار مروی ہے کہ ایک دن صحابہؓ نے نبی ﷺ سے عرض کیا: "یا رسول اللہ ﷺ! گذشتہ اُمتوں کے عجیب افعال میں سے بھی کچھ بتایئے۔" تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ "پہلے زمانے میں تین شخص کہیں جا رہے تھے۔ جب رات ہوئی تو انہوں نے ایک غار کا قصد کیا اور اس کے اندر جا کر سو رہے۔ جب کچھ رات گزر گئی تو ایک پتھر پہاڑ پر سے گر پڑا، جس سے غار کا منہ بند ہو گیا۔ وہ حیران ہو کر آپس میں کہنے لگے کہ اب ہمیں یہاں سے کوئی اور چیز رہائی نہیں دلا سکتی سوائے اس کے کہ ہم اپنے نیک اور بے ریا اعمال کو اللہ تعالےٰ کے حضور میں وسیلہ بنائیں۔ تب ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ میرے ماں باپ زندہ تھے اور دنیا کے مال سے سوائے چند بکریوں کے میرے پاس اور کچھ نہ تھا جن کا دودھ میں ان کو پلاتا تھا اور میں ہر روز ایک گٹھا ایندھن کا لاتا اور اس کی قیمت ان کے اور اپنے کھانے پر خرچ کرتا تھا۔ ایک رات میں دیر سے گھر آیا اور جب تک کہ میں ان بکریوں کو دوہ کر ان کا کھانا دودھ میں تر کر دوں، وہ سو گئے تھے۔ وہ پیالہ میرے ہاتھ میں رہا اور میں بدستور کھڑا رہا اور خود کچھ کھائے بغیر ان کی بیداری کا انتظار کرتا رہا، یہاں تک کہ صبح ہوگئی اور وہ دونوں بیدار ہوئے اور کھانا کھایا۔ میں اس کے بعد بیٹھا اور وہ کہنے لگا: بارِ خدایا! اگر میں اس معاملے میں سچا ہوں تو ہمارے لیے کچھ کشائش بھیج اور پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ اسی وقت وہ پتھر ہلا اور کچھ شگاف سا پیدا ہو گیا۔ دوسرے شخص نے کہا کہ میرے چچا کی لڑکی نہایت خوبصورت تھی اور میرا دل ہمیشہ اس پر فریفتہ رہتا تھا۔ میں اُسے اپنی طرف بلاتا تھا یہاں تک کہ ایک دفعہ بہت حیلوں سے میں نے ایک سو بیس دینار اس کے پاس بھیجے کہ وہ ایک رات میرے ساتھ خلوت کرے اور اس نے اس بار رضامندی ظاہر کی۔ جب میں اس کے پاس گیا تو میرے دل میں خدا تعالےٰ کا خوف پیدا ہوا اور میں نے ہاتھ اس سے اُٹھا لیا اور وہ روپے بھی اس کے پاس رہنے دیئے۔ پھر اس نے عرض کی: بارِ خدایا! اگر میں اس بیان میں سچا ہوں تو ہمارے لیے کشائش فرما۔ پیغمبر ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ پتھر ایک دفعہ پھر ہلا اور وہ سوراخ زیادہ ہوگیا، لیکن ابھی تک وہ اس غار سے باہر نہیں نکل

سکتے تھے۔ تیسرے نے کہا کہ میرے پاس مزدوروں کی ایک جماعت کام کرتی تھی۔ جب وہ کام ختم ہوگیا تو وہ سب مجھ سے مزدوری لے گئے سوائے ایک مزور کے کہ وہ کہیں غائب ہوگیا۔ میں نے اس کی اُجرت سے ایک بھیڑ خریدلی۔ دوسرے سال وہ دو ہوگئیں، تیسرے سال چار۔ اسی طرح ہر سال بڑھتی رہیں اور جب چند سال گزرے تو وہ بہت سا مال جمع ہو گیا۔ اب وہ مزدور آ گیا اور کہنے لگا: تجھے یاد ہو گا کہ ایک دفعہ میں نے تیرا کچھ کام کیا تھا، اب مجھے اُجرت کی حاجت ہے۔ میں نے کہا: جاؤ وہ بھیڑیں تمہارا مال اور ملک ہیں، لے جاؤ۔ اس نے کہا کہ تو مجھ سے تمسخر کرتا ہے۔ میں نے کہا: نہیں، میں سچ کہتا ہوں اور وہ مال اس کو دے دیا یہاں تک کہ وہ لے گیا۔ اس کے بعد اس نے عرض کیا، بارِ خدایا! اگر میں اس میں سچا ہوں تو ہمارے لئے کشائش بھیج۔ پیغمبر ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ پتھر غار کے منہ سے ہٹ گیا یہاں تک کہ وہ تینوں غار میں سے باہر نکل آئے۔" یہ فعل عادت کے خلاف تھا۔

پیغمبر ﷺ سے جریج راہب کی ایک حدیث مشہور ہے اور اس کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ "بچپن میں گہوارے کے اندر سوائے تین شخصوں کے کسی نے کلام نہیں کیا۔ ایک تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اور وہ تم سب لوگ جانتے ہو۔ دوسرے بنی اسرائیل میں ایک پادری تھا جس کا نام جریج تھا۔ وہ ایک بہت ہی عبادت گزار آدمی تھا۔ اس کی والدہ بھی ایک پردہ دار عورت تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک روز وہ بیٹے کو دیکھنے کے لیے آئی۔ اس وقت وہ نماز پڑھ رہا تھا۔ اس نے عبادت خانے کا دروازہ نہ کھولا اور دوسرے تیسرے چوتھے روز بھی ایسا ہی کیا۔ اس کی والدہ نے اس سے رنجیدہ ہو کر دُعا کی کہ "اے پروردگار! میرے لڑکے کو رُسوا کر اور میرے حق کے عوض اس کا مواخذہ فرما۔" اس زمانے میں ایک فاحشہ عورت تھی۔ اس نے ایک جماعت کے پاس جا کر کہا کہ میں جریج کو گمراہ کرتی ہوں۔ چنانچہ وہ اس کے عبادت خانے میں چلی گئی۔ جریج نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اس نے راستے میں ہی ایک چرواہے سے صحبت کی اور حاملہ ہوگئی۔ جب شہر میں آئی تو کہنے لگی کہ یہ جریج کا حمل ہے اور جب اس نے وضع حمل کیا تو لوگوں نے جریج کے عبادت خانے کا رُخ کیا اور اسے محل شاہی کے دروازے پر لے آئے۔ جریج نے بادشاہ کے سامنے ایک نوزائیدہ بچے کو مخاطب کر کے کہا: "اے لڑکے! تیرا باپ کون ہے؟" اس نے جواب دیا۔ "اے جریج! میری ماں تجھ پر بہتان لگاتی ہے، میرا باپ تو ایک چرواہا ہے۔" تیسرے ایک عورت کا بچہ تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کی ماں اپنے مکان کے دروازے پر بیٹھی تھی کہ اتنے میں ایک خوبصورت سوار عمدہ لباس پہنے ہوئے وہاں سے گزرا تو عورت نے اسے دیکھ کر دُعا کی کہ "اے پروردگار! تو میرے اس لڑکے کو اس سوار جیسا بنا دے۔" لڑکے نے کہا: "اے رب! مجھے ایسا نہ کیجیو۔" جب کچھ مدت گزری تو مکان کے پاس سے ایک عورت گزری۔ اسے دیکھ کر بچے کی ماں نے دعا کی کہ "اے رب! تو میرے لڑکے کو اس عورت جیسا نہ کیجیو۔" تب لڑکے نے دعا کی: "اے رب! مجھے اس عورت جیسا بنا دے۔" ماں متعجب ہوئی اور پوچھنے لگی کہ تو یہ کیوں کہتا ہے؟ لڑکے نے جواب دیا "اس لیے کہ وہ سوار ایک ظالم آدمی تھا اور یہ عورت نیک ہے لیکن لوگ اس کو بری بتاتے ہیں اور اس کو نہیں جانتے اور میں نہیں چاہتا کہ ظالموں میں سے ہوں، بلکہ چاہتا ہوں کہ نیکوکاروں میں سے ہوں۔" ایک حدیث حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی ایک لونڈی زائدہ کی نسبت مشہور ہے کہ وہ ایک روز پیغمبر ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ کو سلام کیا تو پیغمبر ﷺ نے فرمایا: "اے زائدہ! تو میرے پاس دیر دیر سے کیوں آیا کرتی ہے؟ تیرا انتظار کیا جاتا ہے اور میں تجھے اچھا سمجھتا ہوں۔" اس نے عرض کی: "یا رسول اللہ! ﷺ! میں آج ایک عجیب بات لے کر حاضر ہوئی ہوں۔" آپؐ نے

فرمایا: "وہ کیا ہے؟" اس نے جواب دیا کہ "صبح کو میں ایندھن کی تلاش میں گئی۔ جب میں نے گٹھا باندھ کر ایک پتھر پر رکھ لیا تاکہ اس کو اُٹھالوں تو ناگاہ میں نے ایک سوار دیکھا کہ آسمان سے زمین پر آرہا ہے۔ جب زمین پر اترا تو اس نے مجھے سلام کیا اور پھر کہا کہ محمد ﷺ سے میرا سلام کہو اور یہ بات کہو کہ رضوان بہشت کے خازن نے کہا ہے کہ آپ کو بشارت ہو کہ بہشت کو آپ کی اُمت کے لیے تین حصے کر دیا گیا۔ ایک جماعت بے حساب اس میں داخل ہوگی، دوسری جماعت کے لیے حساب آسان کر دیں گے اور تیسری جماعت کو آپ کی شفاعت سے بخش دیں گے۔ یہ کہہ کر اس نے آسمان کا قصد کیا اور آسمان و زمین کے درمیان پہنچ کر پھر میری طرف توجہ کی اور دیکھا کہ میں اس گٹھے کو اُٹھا نہیں سکتی۔ یہ دیکھ کر اس نے کہا: اے زائدہ! گٹھے کو پتھر پر رکھ دے۔ پھر اس نے پتھر سے کہا: اے پتھر! یہ گٹھا زائدہ کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دروازے تک لے جا۔ چنانچہ وہ پتھر اس گٹھے کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دروازے تک میرے ساتھ لایا۔" پیغمبر ﷺ یہ واقعہ سن کر اُٹھے اور اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہمراہ عمرؓ کے دروازے پر تشریف لائے اور آپ نے اس پتھر کے آنے جانے کا نشان دیکھا تو فرمایا: "الحمد اللہ! کہ خدا نے مجھے دنیا سے اس وقت تک نہیں اُٹھایا جب تک کہ رضوانِ جنت نے مجھے میری اُمت کی بخشش کی بشارت نہیں دی اور جب تک خدا تعالےٰ نے میری اُمت میں سے ایک عورت کو مریم علیہا السلام کے درجے تک نہیں پہنچادیا۔"

یہ واقعہ بھی مشہور ہے کہ ایک مرتبہ پیغمبر ﷺ نے علاء بن الحضری رضی اللہ عنہ کو ایک غزوے پر بھیجا۔ وہ دریا پر پہنچے تو کچھ پانی سامنے آیا۔ اس پر انہوں نے قدم رکھا اور سب لوگ ایسے عبور کر گئے کہ ان کے قدم تک تر نہ ہوئے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی نسبت مشہور ہے کہ وہ ایک راستے پر جا رہے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک گروہ عین راستے میں کھڑا ہے اور شیر نے اس پر راستہ بند کیا ہوا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے شیر سے مخاطب ہوکر فرمایا: "اے کتے! اگر خدا کی طرف سے تو کھڑا ہے تو بے شک کھڑا رہ، ورنہ ہم کو راستہ دے تاکہ ہم نکل جائیں۔" شیر اُٹھ کھڑا ہوا اور آپ کو چوم چاٹ کر چلا گیا۔ اسی طرح پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ایک حدیث مشہور ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ ہوا میں بیٹھا ہوا ہے۔ آپ نے پوچھا: "اے بندۂ خدا! تو نے یہ رُتبہ کس چیز سے پایا؟" اس نے جواب دیا کہ "تھوڑی سی چیز سے۔" آپ نے فرمایا: "وہ کیا ہے؟" اس نے کہا کہ "میں نے دنیا سے منہ موڑا، اللہ تعالےٰ کے حکم کی طرف توجہ کی تو مجھ سے پوچھا گیا کہ تو کیا چاہتا ہے؟ تو میں نے کہا کہ مجھے ہوا میں مکان دیا جائے تاکہ میرا دل اہل جہاں سے بے تعلق ہو جائے۔" اسی طرح ایک عجمی جوان نے مدینہ میں آ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملنے کا قصد کیا تو لوگوں نے بتایا کہ امیر المومنین جنگل میں کسی جگہ سو رہے ہوں گے۔ اس نے جا کر دیکھا کہ آپ زمین پر سو رہے ہیں اور دِرّہ سر کے نیچے رکھا ہوا ہے۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ جہاں میں سب فتنہ اسی کی وجہ سے ہے اور اب اس کا قتل کرنا میرے نزدیک آسان ہے۔ چنانچہ اس نے تلوار سونت لی اور وار کرنے کو بڑھا ہی تھا کہ دو شیر نمودار ہوئے اور اس عجمی کے پھاڑ کھانے کے لیے دوڑے۔ یہ دیکھ کر اس نے واویلا شروع کیا۔ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ جاگ اُٹھے۔ اس نے اپنا سارا ماجرہ بیان کیا اور پھر اسلام لے آیا۔ اسی طرح حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں ملک عراق میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس چند تحفے آئے، جن میں ایک ڈبیا زہر قاتل کی تھی اور کسی بادشاہ کے خزانے میں اس قسم کا زہر موجود نہ تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس ڈبیا کو کھولا اور وہ زہر ہتھیلی پر رکھا اور بسم اللہ پڑھ کر منہ میں ڈال لیا تو آپ کو اس سے کچھ بھی نقصان نہ ہوا۔ لوگ

متعجب ہوئے اور بہت سے ان میں سے راہِ راست پر آگئے۔ حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ روایت فرماتے ہیں کہ عبادان میں ایک سیاح تھا جو ویرانوں میں رہتا تھا۔ ایک روز میں نے کوئی چیز بازار سے خریدی اور اس کے پاس لے گیا تو اس نے کہا کہ "یہ کیا چیز ہے؟" میں نے کہا کہ "کھانا ہے، اس لیے لایا ہوں کہ شاید تجھے اس کی حاجت ہو۔" اس نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا اور مجھے دیکھ کر ہنسا۔ میں نے اس ویرانے کی دیواروں کے ڈھیلوں اور پتھروں کو دیکھا کہ وہ سب سونا ہو گئے تو میں اپنے کیے پر سخت پشیمان ہوا اور جو کچھ میں لے گیا تھا اس کو وہیں چھوڑ کر چلا آیا۔

حضرت ابراہیم ادہم رحمتہ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ میں ایک چرواہے کے پاس سے گزرا اور اس سے پینے کے لیے تھوڑا سا پانی مانگا۔ اس نے کہا: "میں دودھ بھی رکھتا ہوں اور پانی بھی، تو کیا چاہتا ہے؟" میں نے کہا: "پانی چاہتا ہوں۔" وہ اُٹھا اور لاٹھی پتھر پر ماری۔ اس پتھر سے نہایت عمدہ اور پاکیزہ پانی نکلا تو میں بڑا متعجب ہوا۔ اس نے کہا: "تعجب نہ کر کیونکہ جب بندہ حق تعالیٰ کا فرمانبردار ہو جاتا ہے تو سارا جہان اس کا مطیع ہو جاتا ہے۔" حضرت ابو درداءؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ ایک روز بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے اور پیالہ تسبیح پڑھتا تھا، جسے وہ دونوں اصحاب سنتے تھے۔

حضرت ابوسعید خراز رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ کچھ مدت سے میں تین روز کے بعد ایک دفعہ کھانا کھایا کرتا تھا۔ اندریں اثنا ایک روز میں جنگل میں جا رہا تھا کہ تیسرے روز میں نے اپنے اندر ضعف محسوس کیا لیکن کھانا نہ تھا اور طبیعت اپنی عادت کے مطابق کچھ تقاضا کرنے لگی۔ آخر کار میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اتنے میں ہاتفِ غیب نے آواز دی کہ "اے ابوسعید! کوئی سی بات اختیار کر، کیا تو سستی کو دور کرنے کے لیے کھانے کے سوا کوئی اور سبب چاہتا ہے یا نفس کے لیے کھانا بغیر کسی اور سبب کے یا قوت چاہتا ہے؟" میں نے کہا: "الٰہی! میں قوت چاہتا ہوں۔" جب میں اُٹھا تو مجھ میں قوت آ گئی اور میں متواتر بارہ منزل بغیر کچھ کھائے پیے چلا گیا۔ مشہور ہے کہ آج کل تستر میں حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ کے گھر کو بیت السباع[۱] کہتے ہیں اور سب اہلِ تستر اس بات پر متفق ہیں کہ بہت سے درندے اور شیر آپ کے پاس آیا کرتے تھے، آپ ان کو کھانا کھلاتے اور پیار و محبت کیا کرتے تھے اور اس واقعہ کو دیکھنے والے بہت ہیں۔

ابوالقاسم مروزی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ابوسعید خراز رحمتہ اللہ علیہ کے ہمراہ جا رہا تھا کہ دریا کے کنارے ایک جوان دیکھا جو گدڑی پہنے، کھانے کا سامان چمڑے کے تھیلے میں ڈالے چلا آ رہا تھا۔ حضرت ابوسعیدؒ نے فرمایا: "اس جوان کا ظاہر حال تو گدڑی ہے، لیکن درحقیقت اس کا معاملہ کچھ اور ہے کیونکہ جب میں اس کی طرف دیکھتا ہوں تو کہتا ہوں کہ وہ خدا رسیدہ بزرگوں میں سے ہے اور جب اس کے کھانے کے سامان کو دیکھتا ہوں تو کہتا ہوں کہ طالبانِ درگاہ میں سے ہے۔ آؤ اس سے پوچھیں کہ اللہ تعالےٰ تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟" چنانچہ حضرت خرازؒ نے پوچھا: "اے جوان! خدا تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟" اس نے جواب دیا کہ "اللہ تعالےٰ تک پہنچنے کے دو راستے ہیں، ایک تو عوام کی راہ اور دوسرے خواص کی راہ، تجھے خواص کی راہ کی تو کچھ خبر نہیں لیکن عوام کی راہ یہی ہے جو تو چل رہا ہے اور تو اپنے عمل کو حق تعالےٰ تک پہنچنے کی علت قرار دے رہا ہے اور کھانے پینے کو حجاب کا سبب جانتا ہے۔"

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں ایک روز مصر سے جدہ جانے کے ارادے سے کشتی میں سوار ہوا۔ اس کشتی میں ایک گدڑی پوش جوان بھی سوار تھا۔ میں اس سے گفتگو کی خواہش تو رکھتا تھا لیکن

۱۔ درندوں کا گھر

اس کی عجیب و غریب شکل و صورت میرے راستے میں ہمیشہ حائل رہی۔ ایک عجیب ہی درویش تھا۔ اپنا تمام وقت عبادتِ الٰہی میں گزارتا تھا۔ اتفاق سے کشتی میں کسی سوداگر کا ایک قیمتی موتی گم ہو گیا اور اس سوداگر نے اسی درویش پر شبہ کیا۔ ابتدا میں لوگوں نے اس سے کچھ پوچھ گچھ کی لیکن اس نے مطلقاً لاعلمی کا اظہار کیا۔ آخر کار لوگوں نے اس پر جبر و تشدد کرنے کا ارادہ کیا، لیکن میں نے یہ کہہ کر انہیں ایسا کرنے سے باز رکھا کہ محض شبہ کی بنا پر عجلت درست نہیں۔ پہلے مجھے اس سے گفتگو کرنے دو۔ چنانچہ میں نے اسے علیحدہ کر کے بڑی نرمی سے پوچھا کہ یہ لوگ تجھ پر موتی چرانے کا الزام لگاتے ہیں اور اب جبر و تشدد پر آمادہ ہیں۔ اب بتا تیرا کیا ارادہ ہے؟ یہ سن کر اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھایا اور کچھ کہا۔ میں نے دیکھا کہ اسی وقت بہت سی مچھلیاں پانی کی سطح پر اُبھر آئیں، جن میں سے ہر ایک کے منہ میں ایک بیش قیمت موتی تھا۔ چنانچہ اس درویش نے ایک مچھلی کے منہ سے موتی لے کر الزام لگانے والے سوداگر کو دیا اور خود کشتی سے اتر کر پانی کی سطح پر قدم رکھا اور چلتے چلتے دریا عبور کر گیا۔ یہ اس لیے کہ وہ کشتی والوں سے بہت سخت بیزار ہو گیا تھا۔ جس شخص نے وہ موتی چرا لیا تھا، وہ اہل کشتی میں سے تھا۔ چنانچہ از خود اس نے وہ موتی نکال کر مالک کے سامنے پھینک دیا۔ یہ دیکھ کر تمام اہل کشتی شرمندہ ہوئے اور اپنے آپ کو ملامت کرنے لگے۔

حضرت ابراہیم رقی رحمتہ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ اپنے حال کی ابتدا میں حضرت مسلم مغربی رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کا قصد کیا۔ جب مسجد میں داخل ہوا تو اس وقت وہ امامت کرا رہے تھے، لیکن میں نے دیکھا کہ الحمد غلط پڑھ رہے ہیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میری محنت برباد گئی۔ اس رات میں وہاں رہا۔ دوسرے روز میں نے طہارت کے ارادے سے دریائے فرات کے کنارے جانا چاہا تو دیکھا کہ ایک شیر راستے میں سویا ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر میں واپس آ گیا۔ جب مڑا تو ایک دوسرا شیر میرے پیچھے آ رہا تھا۔ میں بڑا گھبرایا اور شور مچا دیا اور عاجز ہو کر رہ گیا۔ اتنے میں حضرت مسلم رحمتہ اللہ علیہ عبادت خانے سے باہر نکل آئے۔ جب شیروں نے انہیں دیکھا تو ان کی تواضع کی۔ آپ نے ہر ایک کا کان پکڑ کر کہا: ”اے خدا کے کتو! کیا میں نے تم سے نہیں کہہ رکھا تھا کہ تم ہمارے مہمانوں کو نہ چھیڑنا۔ تب آپ نے مجھ سے فرمایا: اے ابواسحاق! تم تو مخلوق کی خاطر ظاہر کے درست کرنے میں مشغول ہوئے یہاں تک کہ تم مخلوق سے ڈرنے لگے اور ہم خدا کے لیے باطن کے درست کرنے میں مشغول ہوئے، اس لیے مخلوق ہم سے ڈرتی ہے۔“ ایک روز میرے شیخ نے (اللہ ان سے راضی ہو) بیت الجن سے دمشق کا قصد کیا اور میں ان کے ہمراہ تھا چونکہ بارش ہو گئی تھی، اس لیے ہم لوگ کیچڑ میں مشکل سے چل رہے تھے۔ ناگاہ جب میں نے شیخ رحمتہ اللہ علیہ کی طرف نگاہ کی تو آپ کی نعلین اور کپڑا خشک تھا۔ میں نے آپ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا: ”ہاں! جب سے میں نے توکل کے راستے سے توہمات کو اٹھا دیا ہے اور دل کو حرص کی وحشت سے محفوظ کر لیا ہے، خدا تعالےٰ نے میرے قدم کو کیچڑ سے محفوظ کر دیا ہے۔“ مجھے علی ابن عثمان جلابی کو ایک مرتبہ ایک واقعہ پیش آیا اور اس کے حل کرنے کا طریقہ مجھ پر دشوار ہوا تو میں نے طوس میں حضرت ابوالقاسم گرگانی رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کا قصد کیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو میں نے آپ کو ان کے مکان کے قریب مسجد کے اندر تنہا پایا اور میں نے دیکھا کہ آپ بعینہٖ وہی میرا واقعہ ایک ستون سے بیان فرما رہے تھے، چنانچہ میں نے سوال کیے بغیر اپنا جواب پا لیا تو عرض کیا کہ ”اے شیخ! آپ یہ واقعہ کس سے بیان فرما رہے ہیں؟“ انہوں نے فرمایا: ”اے بیٹا! حق تعالےٰ نے اس وقت اس ستون کو گویا کر دیا، یہاں تک کہ اس نے مجھ سے سوال کیا۔“

ملک فرغانہ میں ایک گاؤں کے اندر جسے سلاتک کہتے ہیں، اوتاد میں سے ایک بزرگ رہتے تھے، جنہیں بابِ عمر کہتے تھے اور اس علاقے کے سب درویش بڑے مشائخ کو باب ہی کہتے ہیں۔ ان کے ہاں ایک بڑھیا تھی جس کا نام فاطمہ تھا۔ میں مقام روزگند سے آپ کی زیارت کے لیے روانہ ہوا۔ جب میں ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے فرمایا: "تو کس لیے آیا ہے؟" میں نے کہا: "اس لیے کہ شیخ کو اصلی صورت میں دیکھوں اور وہ مجھ پر شفقت سے نظر ڈالیں۔" آپ نے فرمایا: "اے بیٹا! میں خود فلاں روز سے تجھے دیکھ رہا تھا اور جب تک کوئی مجھے تجھ سے غائب نہ کر دے، میں تجھے دیکھتا ہی رہوں گا۔" خواجہ ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ جب میں نے دنوں اور سالوں کا شمار کیا تو وہ روز جو آپ نے بتایا تھا، وہ میری توبہ کی ابتدا کا دن تھا۔ انہوں نے فرمایا: اے بیٹا! تھوڑے وقت میں طویل مسافت طے کرنا بچوں کا کام ہے۔ اس زیارت کے بعد اس کی زیارت کر جسے ہر کوئی نہیں پا سکتا اور نہ اس کی زیارت کرنے میں مسافت طے کرنے کی کوئی شرط ہے۔ اس کے بعد فرمایا: "اے فاطمہ! جو کچھ تیرے پاس ہے لا کہ یہ درویش کھا لے۔" وہ تازہ انگوروں کا ایک طباق لے آئیں، حالانکہ انگور کا موسم نہ تھا اور ان کے اوپر چند تازہ کھجوریں تھیں حالانکہ فرغانہ میں تازہ کھجوریں ملنی ناممکن تھیں۔ ایک روز مہنہ نامی گاؤں میں حضرت شیخ ابوسعید رحمتہ اللہ علیہ کی تربت پر میں عادت کے مطابق تنہا بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے دیکھا ایک سفید کبوتر آ کر اس غلاف میں گھس گیا جو قبر پر ڈالا ہوا تھا۔ میں نے خیال کیا شاید یہ کبوتر کسی کے ہاتھ سے چھوٹ آیا ہے اور جب میں نے اٹھ کر غلاف کے نیچے نگاہ ڈالی تو کوئی چیز موجود نہ تھی۔ دوسرے روز بھی ایسا ہی دیکھا اور میں حیران رہ گیا، یہاں تک کہ آپ کو میں نے ایک رات خواب میں دیکھا اور آپ سے اس واقعہ کی نسبت دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: "وہ کبوتر میرے معاملے کی صفائی ہے، جو ہر روز قبر میں میری ہم نشینی کے لیے آتی ہے۔" اگر اس قسم کی بہت سی حکایات بیان کرتا جاؤں تو بھی ختم نہ ہوں اور اس کتاب سے مقصود فرع و معاملات میں طریقت کو ثابت کرنا ہے اور بعض نقل کرنے والوں نے خود بھی اس موضوع پر کئی کتابیں لکھیں اور بہت سی باتیں جمع کی ہیں اور واعظ لوگ منبر پر ان کو بیان بھی کرتے ہیں۔ اس لیے اب وہ فصلیں جو اس علم طریقت سے تعلق رکھتی ہیں، اس کتاب میں ان کی پیروی کرتے ہوئے لاتا ہوں تاکہ کسی اور جگہ اس مطلب کی تلاش کے لیے نہ جانا پڑے۔

آٹھویں بحث

اولیاء پر انبیاء کی فضیلت

جان لو کہ تمام اوقات و احوال میں طریقت کے تمام مشائخ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اولیاء اللہ انبیاء کے تابع اور ان کی دعوت کی تصدیق کرنے والے ہیں اور یہ کہ انبیاء اولیاء سے افضل ہیں کیونکہ ولایت کی انتہا نبوت کی ابتدا ہوتی ہے اور تمام انبیاء ولی ہوتے ہیں لیکن اولیاء میں سے کوئی ولی نبی نہیں ہوتا اور انبیاء صفاتِ بشریت کی نفی میں طاقت ور ہوتے ہیں۔ اولیاء اس حال پر جو ان پر طاری ہوتا ہے، عارتی ہوتے ہیں اور انبیاء کرام کا مقام ایک مختص مقام ہے اور عارتی مقام نہیں، پھر جو مقام اولیاء کو حاصل ہے وہ انبیاء کا حجاب ہے۔ اہل سنت میں سے کسی عالم نے اور اہل طریقت میں سے کسی محقق نے اس بارے میں اختلاف نہیں کیا، سوائے حشویہ لوگوں کے، جو خراسان کے ہیں اور اہل تجسیم[1] کے نام سے مشہور ہیں اور اصول توحید میں مناقض کلام کرتے ہیں کیونکہ وہ اس طریقت کی اصل کو نہیں سمجھتے اور اس کے باوجود اپنے آپ کو ولی کہتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ولی ضرور ہیں لیکن شیطان کے ولی ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ

[1] وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کے جسم کے قائل ہیں، اہلِ تجسیم کہلاتے ہیں

اولیاء انبیاء سے افضل ہیں اور یہی گمراہی ان کے لیے کافی ہے کہ ایک جاہل شخص کو محمد مجتبےٰ ﷺ سے افضل بتاتے ہیں۔ ان کا ایک گروہ اور بھی ہے جسے مشبہین[1] کہتے ہیں۔ وہ بھی طریقت سے اپنے آپ کو وابستہ خیال کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے حلول[2]، نزول، انتقال اور اس کی ذاتِ لطیف کے تجزیہ و تقسیم کو جائز سمجھتے ہیں۔ یہ باتیں ان دو بڑے مذاہب کے بیان میں جن کا میں نے وعدہ کیا ہے، اس کتاب میں پورے طور پر ذکر کروں گا۔ ان شأ اللہ تعالےٰ!

الغرض یہ دونوں گروہ جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں، انبیاء کی تخصیص وفضیلت کی نفی کے بارے میں برہمنوں سے متفق ہیں اور جو شخص انبیاء کی تخصیص کی نفی کا اعتقاد کرے، وہ کافر ہوتا ہے۔ پس انبیاء صلوٰت اللہ علیہم خلقت کو حق کی طرف دعوت کرنے والے ہیں اور امام و اولیاء سب نیک عمل کرنے میں ان کے تابع ہیں اور یہ بات محال ہے کہ مقتدی امام سے افضل ہو۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اگر تمام اولیاء کے اقوال واحوال کو کسی ایک نبی کے سچے رُتبے کے مقابل لایا جائے، تو وہ سب ہیچ ہوں گے، اس لیے کہ اولیاء منزلِ مقصود کے طالب ہوتے ہیں اور اس راستے پر چلتے ہیں اور انبیاء منزلِ مقصود پر پہنچے ہوئے، مقصود حاصل کیے ہوئے ہوتے ہیں، دعوتِ حق کا فرمان دینے کے لیے آتے ہیں اور ایک قوم کو حق کی طرف لے جاتے ہیں اور اگر ان ملحدوں میں سے (اللہ ان پر لعنت کرے) کوئی شخص یوں کہے کہ عادت یوں جاری ہے کہ جب کسی بادشاہ کی طرف سے کوئی قاصد آئے تو لازم ہے کہ وہ مبعوثٌ الیہ[3] اس قاصد سے افضل ہو جیسا کہ پیغمبر صلوٰت اللہ علیہم جبرئیل علیہ السلام سے افضل ہیں، تو ہم ان کے جواب میں یوں کہتے ہیں کہ اگر کوئی بادشاہ کسی ایک آدمی کی طرف کوئی رسول بھیجے تو ضرور لازم ہے کہ وہ مرسلٌ الیہ[4] اس رسول سے افضل ہو، جیسا کہ جبرئیلؑ کو ایک ایک پیغمبر کے پاس بھیجا گیا اور ہر ایک پیغمبر اس سے فضل ہوا ہے، لیکن رسول جب ایک جماعت اور قوم کی طرف بھیجا جائے تو لامحالہ وہ رسول اس قوم و جماعت سے افضل ہوگا جیسا کہ انبیاء اپنی اُمتوں سے افضل ہوتے ہیں اور کسی عقلمند کو اس میں کوئی اشکال پیش نہیں آتا۔ پس ایک پیغمبر تمام اولیاء سے افضل ہوگا۔ اس لیے کہ جب عادت وعرف کی رُو سے جو منزل مقصود کی نہایت پر پہنچ جاتے ہیں تو مشاہدے سے خبر دیتے ہیں اور بشریت کے حجاب سے خلاصی پا جاتے ہیں اگر وہ بالکل بشری ہیں۔ پس رسول کا پہلا قدم ہی مشاہدے میں ہوتا ہے چونکہ رسول کی ابتدا ولی کی انتہا ہوتی ہے، اس لیے ولی کو نبی پر قیاس نہیں کرسکتے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ اولیاء اللہ میں سے سب طالبانِ حق اس بات پر متفق ہیں کہ کثرت کا وحدت میں گم ہوکر ایک ہو جانا مقام ولایت کا کمال ہوتا ہے اور اس کی صورت یوں ہے کہ بندہ کثرت ریاضت وعبادت سے جب ایسے درجے پر پہنچ جاتا ہے، جہاں غلبہ محبت الٰہی سے اس کی عقل فعل کے دیکھنے میں مغلوب ہو جاتی ہے اور فاعل کل یعنی اللہ تعالےٰ کے شوق میں سارے عالم کو ہو بہو وہی جانتا اور دیکھتا ہے۔ چنانچہ حضرت علی رودباری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر ہم سے رویت حق زائل ہو جائے تو ہم اس کی عبادت نہ کریں، یعنی بندگی کا اسم ہم سے ساقط ہو جائے کیونکہ ہم اس کی عبادت کا شرف اس کے دیدار کے سوا نہیں پا سکتے۔ یہ امور انبیاء کے لیے ابتدائے حال ہی میں ہوتے ہیں کیونکہ ان کے حال میں تفرقہ ممکن نہیں کیونکہ وہ نفی و اثبات وسلوک وقطع سلوک و توجہ وعدم توجہ و ابتدا و انتہا میں ہمیشہ عین جمع کے مقام میں ہوتے ہیں، چنانچہ ابتدائے حال میں حضرت ابراھیم علیہ السلام نے

---

[1] جو اللہ تعالیٰ کے لیے عام مخلوق کی طرح جسم ثابت کرتے ہیں۔ [2] کسی شے میں اُترنے اور سرایت کرنے کو حلول، کسی شے کے اوپر اُترنے کو نزول، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کو انتقال اور کسی شے کے حصہ بخری ہونے کو تجزیہ کہتے ہیں۔ [3] جس کی طرف قاصد بھیجا جائے۔ [4] جس کی طرف رسول بھیجا گیا ہو۔

آفتاب کو دیکھ کر کہا: "یہ میرا رب ہے۔" اور چاند اور ستارے کو دیکھ کر کہا: "یہ میرا رب ہے۔" اس لیے کہ وہ اپنے دل پر حق کے غلبے اور عین مقام جمع میں اپنے ثابت ہونے کی وجہ سے غیر کو نہ دیکھتے تھے۔ جب سب کو جمع کی آنکھ سے دیکھا تو عین دیدار کی حالت میں اپنے مشاہدے سے بیزاری ظاہر کی اور یوں کہا: "میں زوال پانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔" آپ کے حال کی ابتدا بھی جمع اور انتہا بھی جمع تھی، لہٰذا ضروری طور پر ولایت کی ابتدا اور نہایت ہوتی ہے لیکن نبوت کی نہیں ہوتی۔ جب وہ موجود تھے تو نبی تھے اور جب تک رہے نبی ہی رہے اور جب وہ دنیا میں موجود نہ تھے، اللہ کے علم و ارادہ میں بھی نبی تھے۔

حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کہ انبیاء کے حال میں آپ کیا کہتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: یہ احاطۂ بیان سے باہر ہے کیونکہ ہمیں انبیاء کے بارے میں کچھ دخل نہیں۔ ان کے حق میں جو کچھ بھی ہم تصور کرتے ہیں، وہ سب ہم خود ہی ہوتے ہیں۔ حق تعالےٰ نے ان کی نفی و اثبات کو ایسے درجے میں رکھ دیا ہے کہ انسان کی نظر وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ پس جس طرح اولیاء کا رُتبہ لوگوں کے ادراک سے بالا ہے، اسی طرح انبیاء اولیاء کے ادراک سے بھی بالا ہیں۔ حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ جو زمانے کی حجت ہوئے ہیں، فرماتے ہیں: ابتدا میں جو میں نے وحدانیت کی طرف سیر کی تو میں نے دیکھا کہ میرے باطن کو آسمان پر لے گئے اور اس نے راستے میں کسی چیز کی طرف نگاہ نہیں کی۔ بہشت و دوزخ اس کو دکھایا تو بھی اس نے کسی چیز کی طرف توجہ نہ کی اور جب مجھے کائناتِ عالم اور حجابوں سے آگے لے گئے تو میں ایک پرندہ ہوگیا، جس کا جسم اَحدیت سے بنا تھا اور پر و بال قدم سے، پس میں تنزیہ و تقدیس کی ہوا میں اُڑتا رہا حتیٰ کہ میں ازلیت کے میدان میں جا پہنچا اور احدیت کے درخت کو دیکھا، پس میں نے اس پر نظر غائر ڈالی تو میں نے معلوم کیا کہ وہ سب کچھ اس کا غیر ہے یعنی وہ سب کچھ میں خود ہی تھا۔ میں نے عرض کی: "بارِ خدایا! مجھے اپنی خودی کے ہوتے ہوئے تیری ذات تک کچھ بھی رسائی نہیں ہوئی اور میں اپنی خودی سے آگے نہیں نکل سکا، مجھے کیا کرنا چاہیے؟" حکم ہوا کہ "اے بایزید! تیری خودی سے تیری خلاصی ہمارے دوست (رسول اللہ ﷺ) کی متابعت سے وابستہ ہے۔ اپنی آنکھ کو آپ کے قدموں کی مٹی سے سرمہ لگا اور آپ کی متابعت پر ہمیشگی اختیار کر۔" یہ حکایت بہت لمبی ہے اور اہل طریقت اس کو حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ کی معراج کہتے ہیں اور معراج سے مراد قربِ حق ہے۔ پس انبیاء کی معراج جسم و بدن کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے اور اولیا کی معراج ہمت و ارادہ سے پوشیدہ طور پر ہوا کرتی ہے اور پیغمبروں کا ظاہری جسم صفائی اور پاکیزگی اور قربت میں اولیاء کے دل اور ان کے باطن کی طرح ہوتا ہے اور فضیلت ظاہر ہے اور یہ اس طرح ہے کہ ولی کو حال میں مغلوب کر دیتے ہیں تاکہ وہ مست ہو جائے۔ تب آہستہ آہستہ اس کے باطن کو اس سے غائب اور قربِ حق سے آراستہ کر دیتے ہیں اور جب وہ صحو کی حالت میں واپس آجاتا ہے تو ان تمام دلائل کی صورت اس کے دل پر نقش ہوتی ہے اور ان کا علم اس کو حاصل ہوا ہوتا ہے۔ پس نبی کے جسم کو قرب میں لے جایا جاتا ہے اور ولی کے صرف فکر کو اور ظاہر ہے کہ ان دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے، واللہ اعلم۔

نویں بحث

ملائکہ پر انبیاء و اولیاء کی فضیلت

جاننا چاہیے کہ اہل سنت و جماعت اور جمہور مشائخ اہل طریقت کے اتفاق سے انبیائے عظام و اولیائے کرام

جو گناہ سے محفوظ ہیں، وہ فرشتوں سے افضل ہیں۔ بخلاف معتزلہ کے کہ وہ ملائکہ کو انبیاء سے افضل سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فرشتے رُتبے میں انبیاء سے زیادہ بلند، پیدائش میں ان سے زیادہ لطیف اور حق تعالیٰ کے زیادہ فرماں بردار ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ وہ ان سے افضل ہوں۔ ہم کہتے ہیں کہ حقیقت اس کے خلاف ہے کیونکہ فرمانبردار جسم، بلند رُتبہ اور لطیف پیدائش فضیلت کی علت نہیں ہوسکتی۔ فضل الٰہی اس کو حاصل ہوتا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقدر کر دیا ہوا اور یہ سب امور جو معتزلہ بیان کرتے ہیں، وہ شیطان کو بھی حاصل تھے لیکن سب کے اتفاق سے وہ ملعون[1] و مخذول ہو گیا۔ پس فضل الٰہی اسی کے لیے ہے جس کے لیے خدا تعالیٰ نے مقدر کر دیا ہے اور انبیاء کی فضیلت پر سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا تو انہوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا اور یہ بات مقرر ہے کہ جس کو سجدہ کیا جائے، اس کا رُتبہ سجدہ کرنے والے سے بلند ہوتا ہے۔ اگر وہ کہیں کہ خانہ کعبہ ایک پتھر ہے اور مومن اس سے افضل ہے، حالانکہ وہ اس کو سجدہ کرتا ہے۔ پس کیوں نہ ملائکہ آدم علیہ السلام سے افضل ہوں اگرچہ انہوں نے اس کو سجدہ کیا تو ہم کہتے ہیں کہ کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ میں خانہ کعبہ یا محراب یا دیوار کو سجدہ کرتا ہوں بلکہ سب یہی کہتے ہیں کہ ہم خدا کو سجدہ کرتے ہیں اور کلام الٰہی کے تقاضے کے مطابق سب لوگ کہتے ہیں کہ ملائکہ نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے سجدہ کرنے کا ذکر کیا تو یوں فرمایا: "ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ تم آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرو۔" اور جہاں مومنین کے سجدہ کرنے کا ذکر کیا تو فرمایا: "اپنے رب کو سجدہ کرو اور اس کی عبادت اور نیک اعمال کرو۔" پس خانہ کعبہ آدم علیہ السلام کی طرح نہیں ہوسکتا اور دوسرے یہ کہ مسافر جب جانور کی پیٹھ پر خداوند تعالیٰ کی عبادت کرنا چاہتا ہے تو اگر اس کا رُخ خانہ کعبہ کی طرف نہ بھی ہو، تب بھی وہ نماز ادا کر سکتا ہے۔ اسی طرح جب کسی پر بے ہوشی طاری ہو یا کسی جنگل میں قبلہ اس کو معلوم نہ ہوسکے تو جس طرف بھی وہ رُخ کرے، نماز درست ہو گی۔ پس ثابت ہوا کہ مومن دراصل خانہ کعبہ کو سجدہ نہیں کرتے بلکہ ان کا مسجود درحقیقت پروردگار ہی ہوتا ہے اور جب ملائکہ کو آدم کی طرف سجدہ کرنے کا حکم ملا تو انہوں نے اس میں کوئی عذر نہ کیا۔ جس نے اپنی طرف سے عذر تراشا، وہ ملعون اور ذلیل ہو گیا۔ یہ دلائل اس شخص کے لیے بہت واضح ہیں، جس کو تھوڑی سی بھی بصیرت حاصل ہے۔ تیسرے یہ کہ ملائکہ معرفت و فضیلت میں انبیاء سے کیونکر فائق ہوسکتے ہیں جب کہ ان کی پیدائش میں شہوت نہیں، نہ ان کے دل میں حرص اور فساد ہے اور نہ طبیعت میں مکر و فریب ہے۔ ان کی غذا عبادت ہے اور طریقہ حق تعالیٰ کے حکم پر قائم رہنا ہے۔ ان کے برعکس آدمی کی سرشت میں شہوت مرکب ہے اور معاصی کے اِرتکاب کرنے کا اس سے احتمال ہے اور دنیا کی زینت اس کے دل میں اثر انداز اور حرص و فریب اس کی طبیعت میں منتشر ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شیطان کو اس کے جسم میں اتنا غلبہ ہے کہ رگوں میں خون کے دوران کے راستوں میں چلتا پھرتا ہے اور نفس امارہ جو سب شرارتوں کو دعوت دینے والا ہے، اس کا ہم نشین ہے۔

پس وہ شخص جس کے وجود میں یہ سب اوصاف ہوں، غلبۂ شہوت کے امکان کے باوجود فسق و فجور سے پرہیز کرے، باوجود عین حرص کے دنیا سے اعراض کرے اور اپنے دل میں وسوسہ شیطان کے باوجود معاصی سے اجتناب کرے، نفسانی آفت (خواہش) سے رُوگردانی کرے تاکہ عبادت پر قائم رہنے، بندگی پر ہمیشگی کرنے، نفس کے ساتھ جہاد کرنے اور شیطان سے جنگ کرنے میں مشغول ہو، وہ فرشتے سے یقیناً افضل ہو گا جس کی صفت میں نہ شہوت

[1] لعنتی، رُسوا

کی معرکہ آرائی ہو، نہ اس کی طبیعت میں غذا اور لذت دنیا کی خواہش ہو، نہ بیوی بچوں کا غم ہو اور نہ خویش و اقرباء میں مشغول ہو، نہ سبب و آلہ کا محتاج نہ چھوٹی موٹی آرزوؤں میں مستغرق ہو۔

مجھے اپنی جان کی قسم ہے، میں اس شخص پر تعجب کرتا ہوں جو بزرگی افعال میں دیکھتا ہے، عزت و جمال میں دیکھتا ہے یا بندگی مال و اسباب کے حاصل کرنے میں دیکھتا ہے۔ ایسا شخص بہت جلد اس نعمت و بزرگی کو اپنے سے زوال پذیر دیکھے گا کیونکہ وہ شخص اشیاء کی فضیلت مالک حقیقی کی مہربانی میں، عزت اللہ سبحانہ کی رضا میں، معرفت الٰہی کی بندگی اور اس پر ایمان لانے میں نہیں دیکھتا تاکہ اس نعمت کو اپنے لیے ہمیشہ دیکھے اور دونوں جہاں میں اپنے دل کو اس سے خوش و خرم رکھے۔ جبرئیل جو ہزار سال خلت کے لیے عبادت کرتا رہے آخر کار اس کی خلت محمد ﷺ کی حاشیہ برداری تھی کہ معراج کی رات آپ کے براق کی خدمت کرنے کو اپنے لیے قابل افتخار سمجھا۔ پس وہ ایک نبی سے کیونکر افضل ہو سکتا ہے جو دنیا میں اپنے نفس کو ریاضت میں ڈالے، رات دن مجاہدہ کرے اور حق تعالیٰ اس پر عنایت کر کے اپنا دیدار اس کو کرامت فرمائے اور تمام وساوس سے اس کو سلامت رکھے، حالانکہ یہ بھی مقرر ہے کہ جب ملائکہ کی شیخی حد سے زیادہ بڑھ گئی اور اپنے عمل کی صفائی کو حجت گردانا اور ملامت کی زبان بنی آدم کے حق میں دراز کی اور ان کے عیوب بیان کرنے لگے اور حق تعالیٰ نے چاہا کہ ان کا حال ان پر ظاہر کرے تو ان کو فرمایا کہ تم اپنے میں سے تین ایسے شخصوں کو اختیار کرو جن پر تم کو اعتماد ہے تاکہ وہ تینوں جا کر زمین کے خلیفہ ہوں، خلقت کی اصلاح کریں اور آدمیوں میں عدل و انصاف کریں۔ انھوں نے تین فرشتوں کا انتخاب کیا جن میں سے ایک تو پیشتر اس کے کہ وہ زمین پر آئے، اس کی خرابی کو دیکھ لیا اور خدا تعالیٰ سے واپسی کی درخواست کی اور دو فرشتے زمین پر آئے۔ خداوند تعالیٰ نے ان کی پیدائش کو تبدیل کر دیا اور انسانوں کی طرح ان میں کھانے پینے اور جماع کی خواہش پیدا کر دی۔ چنانچہ وہ زمین پر اترتے ہی شہوت کی طرف مائل ہوئے اور نفسانی خواہشات کی پیروی کرنے لگے۔ انجام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کی سزا دی۔ ان فرشتوں نے ملائکہ پر بنی آدم کی فضیلت کو آنکھوں سے دیکھ لیا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ تمام علماء و صوفیائے محققین کے اتفاق سے مومنوں میں سے خواص خاص فرشتوں سے افضل ہیں اور عام مومن عام فرشتوں سے افضل۔ پس انسانوں میں سے جو لوگ گناہ سے محفوظ اور معصوم ہیں یعنی اولیاء و انبیاءؑ وہ جبرئیل و میکائیل علیہم السلام وغیرہ خواص ملائک سے افضل ہیں اور جو محفوظ و معصوم نہیں یعنی عام مومن وہ محافظ و کراماً کاتبین فرشتوں سے افضل ہیں، واللہ اعلم۔

اس کے متعلق کلام بہت ہے اور مشائخ طریقت میں سے ہر ایک نے اس کے متعلق کچھ نہ کچھ کہا ہے اور خدا تعالیٰ جس کو جس پر چاہتا ہے، فضیلت دیتا ہے اور توفیق قبضۂ قدرت الٰہی میں سے ہے۔ پس تصوف اور صوفیوں کے باہمی اختلاف کے متعلق فرقۂ حکیمیہ کے مذہب سے متعلقہ امور یہی ہیں جو میں نے اختصار کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں، لیکن جو حقیقت میں جاننا چاہیے کہ ولایت اسرارِ الٰہی میں سے ایک سر ہے جو سوائے ریاضت کے ظاہر کرنا جائز ہوتا تو ولی غیر ولی سے اور واصل غافل سے ممتاز نہ ہوتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ایسا چاہا کہ ولایت کے موتی کو خلقت کی رسوائی کے سیپ میں رکھ کر دریا میں ڈال دے تاکہ اس کا طالب اس کے عزیز الوجود ہونے کی وجہ سے اپنی جان کو خطرے میں ڈال دے اور اس مہلک دریا کو عبور کرے اور اس کی گہرائی میں غوطہ لگائے تاکہ اس کی مراد حاصل ہو یا اس پر یہ حال ختم ہو جائے۔ میں چاہتا تھا کہ اس بحث کو طویل کر دوں، لیکن تمھارے ملال خاطر اور طبیعت کی نفرت کا خوف ایسا کرنے سے مانع ہوا اور ویسے مرید باصفا کے لیے اتنا بیان ہی کافی ہے اور اللہ بہتر جانتا ہے۔
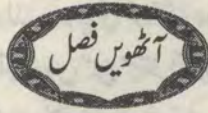
فرقۂ خرازیہ

خرازی فرقے کے لوگ حضرت ابراہیم خراز رحمۃ اللہ علیہ سے محبت و عقیدت رکھتے اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔ طریقت میں آپ کی بہت واضح تصانیف موجود ہیں۔ طریقت میں فنا و بقا کی اصطلاحات کو دراصل آپ ہی نے وضع کیا ہے اور اس طریق کے تمام مطالب و معانی کو انھی دو لفظوں پر منحصر فرمایا ہے۔ اب میں اس مسلک کو بیان کرتا ہوں اور جن لوگوں کو اس مسلک کے بارے میں کچھ غلط فہمی ہوئی ہے، ان کا بھی ساتھ ساتھ ذکر کروں گا تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ ان کا مذہب کیا ہے اور اس گروہ خرازیہ کی فنا و بقا کے الفاظ متداولہ سے کیا مراد ہے؟

پہلی بحث

فنا و بقا کی حقیقت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "جو کچھ تمہارے پاس ہے، وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے ہاں ہے، وہ ہمیشہ اور باقی رہنے والا ہے"۔ دوسری جگہ فرمایا ہے: "جو کچھ زمین پر ہے وہ فانی ہے اور صرف تیرے پروردگار کی ذات باقی رہ جائے گی، جو بڑی شان اور بزرگی والا ہے۔"

جاننا چاہیے کہ فنا و بقا کے علم لغت کی رُو سے اور معنی ہیں اور اہل طریقت کی زبان میں ان کے کچھ اور معنی ہیں۔ اہل ظاہر اس فرقے (خرازیہ) کی عبارات میں سے کسی عبارت میں اتنے زیادہ متحیر نہیں جتنے کہ فنا و بقا کے ان دو لفظوں کے معنوں میں حیران ہیں۔ پس بقا علم لغت کی رُو سے تین قسم کی ہے:

اوّل: وہ بقا کہ طرف اوّل بھی فنا میں ہو اور آخر بھی فنا میں ہو جیسا کہ یہ عالم ناسوت کہ وہ ابتدا میں بھی نہ تھا اور انتہا میں بھی نہ ہوگا اور فقط اس وقت باقی ہے۔

دوم: وہ بقا کہ پہلے کبھی نہ تھی، بعد میں موجود ہوگی اور کبھی فانی نہ ہوگی جیسے بہشت، دوزخ اور عالم عقبیٰ اور اس کے رہنے والے کہ ابتدا میں نہ تھے، نیست سے ہست ہوئے اور ان کی ہستی پر کبھی عدم طاری نہ ہوگا۔

سوم: وہ بقا کہ ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ رہے گی، یعنی کوئی ایسا وقت نہیں ہوا کہ وہ نہ تھی اور نہ کوئی ایسا وقت ہوگا کہ وہ نہ ہو۔ وہ ذات حق اور اس کی صفات ازلی و ابدی کی بقا ہے اور اپنی صفات کے ساتھ قدیم ہے اور اس کی بقا سے مراد اس کے وجود کا ہمیشہ رہنا ہے اور کسی کو اس کی صفات میں اس کے ساتھ مشارکت نہیں۔

پس فنا کا علم یہ ہے کہ تم جان لو کہ دنیا فانی ہے اور بقا کا علم یہ ہے کہ تم جان لو کہ عقبےٰ باقی ہے، چنانچہ خدائے عزوجل نے فرمایا ہے: "عالم آخرت بہتر اور زیادہ باقی رہنے والا ہے۔" اس آیت میں ابقیٰ مبالغہ کے طور پر فرمایا ہے۔ اس لیے کہ اس عالم آخرت کی عمر کی بقا کے لیے فنا نہیں لیکن اہل طریقت کی اصطلاح میں فنا و بقا یہ ہے کہ جب جہالت فانی ہو جائے تو ضرور علم باقی ہوتا ہے اور جب معصیت یعنی نافرمانی فانی ہو جاتی ہے تو اطاعت یعنی بندگی باقی ہوتی ہے۔ جب بندہ اپنی بندگی کا علم حاصل کر لیتا ہے تو ذکر حق کے باقی رہنے سے اس کی غفلت فنا ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ جب بندہ حق تعالیٰ کا علم حاصل کر لیتا ہے تو اس کے علم کے ساتھ باقی جاتا ہے اور اس کے نہ جاننے سے فانی ہو جاتا ہے اور جب غفلت سے فانی ہو جاتا ہے تو اس کے ذکر سے باقی ہو جاتا ہے۔ گویا فنا و بقا ان کے نزدیک برے اوصاف

کو ساقط کر کے نیک صفات پر قائم ہونا ہے، لیکن اہل طریقت میں سے خاص لوگوں کی مراد ان الفاظ سے یہ نہیں، جو ہم نے ذکر کیا ہے اور ان کا اشارہ اس اصل میں علم اور حال کی طرف نہیں ہے بلکہ وہ فنا و بقا کو ان اہل ولایت کے کمال کے درجہ کے سوا کسی اور مقام میں استعمال نہیں کرتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مجاہدہ کرتے کرتے اس کی تکلیف سے چھوٹ گئے ہیں اور مقامات کی پابندی اور احوال کے تغیر سے نکل گئے ہیں۔ حصول مقصد کی طلب میں مقصود پر پہنچ چکے ہیں۔ سب دیکھنے کی چیزیں دیکھ چکے اور سب سننے کی چیزیں سن چکے ہیں۔ دل کے جاننے کے لائق امور جان چکے اور باطن کے پانے کے لائق چیزیں پا چکے اور سب سے منہ موڑ چکے ہیں حتیٰ کہ مراد کا قصد ان سے فانی ہو چکا ہے اور منزل مقصود کی راہ طے کر کے منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ دعویٰ سے بیزار ہو کر معنیٰ سے الگ ہو گئے ہیں۔ ان کی کرامتیں حجاب ہو گئیں اور مقاماتِ مشاہدہ ہو گئے ہیں۔ ان کے احوال آفت کا لباس پہن چکے ہیں اور عین مراد میں مراد سے بے مراد ہو گئے ہیں۔ ان کا طریق تمام مخلوق سے ہٹ کر معبود حقیقی کے لیے ہو جانا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "تاکہ ہلاک ہو جو ہلاک ہوا دلیل سے اور زندہ رہے وہ جو زندہ رہا دلیل سے" اور اس معنی کے متعلق میں کہتا ہوں[1]:

(ترجمہ: میری خواہش کے معدوم ہونے کی وجہ سے میری فنا فانی ہو گئی، پس تمام امور میں میری خواہش بالکل تیری محبت ہو گئی)۔

پس جب بندہ اپنے اوصاف سے فانی ہو جاتا ہے تو کامل بقا حاصل کر لیتا ہے اور جب بندہ اپنے اوصاف کے موجود ہونے کی حالت میں اوصاف کی خرابی سے فانی ہو جاتا ہے تو مراد کی بقا کے ساتھ مراد کی فنا میں باقی ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ نہ اس کو قرب و بعد رہتا ہے اور نہ وحشت و انس، نہ صحو و سکر اور نہ فراق و وصال کا ڈر، نہ مٹانا اور جڑ سے اکھاڑنا، نہ نام و مقام اور نہ نشان و نفس سے کچھ تعلق رہتا ہے۔ اسی معنی میں ایک شیخ فرماتے ہیں:

"اور میرا مقام اور نشان دونوں مٹ گئے۔ پس اپنے وقت میں نہ قرب کو دیکھتا ہوں اور نہ بعد کو۔ پس میں ذات حق کے ساتھ اپنی ذات و صفات سے فنا ہو کر اسی سے قائم ہوا اور میرے لیے راہِ حق ظاہر ہو گئی۔" پس فنا کے وقت یہ ظہورِ حق ہی مقصود ہے، الغرض کسی چیز سے فنا ہونا، اس کی خرابی کو دیکھنے اور اس کی خواہش کے دور کرنے کے سوا درست نہیں ہوتا، کیونکہ جس کا خیال ہے کہ اگر کسی چیز سے فنا ہونا اس چیز سے حجاب میں نہ ہوئے بغیر درست ہے، وہ غلطی پر ہے۔ ایسا نہیں کہ جب کوئی آدمی کسی چیز کو دوست رکھتا ہے تو کہتا ہے کہ میں اس کے ساتھ باقی ہوں، یا کسی چیز سے دشمنی رکھتا ہے تو کہتا ہے کہ میں اس چیز سے فانی ہوں، کیونکہ یہ دونوں صفتیں طالب کی ہیں اور فنا میں محبت و عداوت نہیں ہوتی اور نہ بقا میں جمع و تفرقہ کا دیکھنا ہوتا ہے۔ ایک گروہ کو اس معنی میں غلطی ہوئی ہے، جو یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ فنا اس کی ذات کے معدوم ہو جانے اور شخصیت کے نیست و نابود ہو جانے کے معنی میں ہے جبکہ بقا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی بقا بندے میں پیوست ہو جائے۔ یہ دونوں باتیں محال ہیں اور ہندوستان میں میں نے ایک آدمی کو دیکھا جو علوم ظاہری و باطنی کا مدعی تھا۔ میرے ساتھ اس امر میں اس نے مناظرہ کیا۔ جب میں نے خود غور کر کے دیکھا تو وہ خود نہ فنا کو پہچانتا تھا اور نہ بقا ہی کو جانتا تھا اور نہ قدیم و حادث میں فرق کر سکتا تھا۔ جاہلوں میں سے اس قسم کے لوگ بہت ہیں جو فنا کلی کو روا رکھتے ہیں اور یہ کھلم کھلا مکابرہ[2] اور فضول جھگڑا ہے کیونکہ پیدائشی اجزا کا فانی ہونا اور

---

[1] فَنَاءُ فَنَائِي بِفَقْدِ هَوَائِي
فَصَارَ هَوَائِي فِي الْأُمُورِ هَوَاكَ

[2] ایک دوسرے پر اپنی بڑائی ظاہر کرنے کے لیے جھگڑا

ان کا منقطع ہو جانا روا نہیں۔ ایسے جاہل خطاکاروں کو میں کہتا ہوں کہ اس فنا سے تمہاری کیا مراد ہے؟ اگر وہ کہیں ہماری مراد اس سے عین یعنی کسی چیز کی ذات کا فنا ہونا ہے تو یہ بالکل محال ہے اور اگر وہ یوں کہیں ہماری مراد اس سے عین یعنی کسی چیز کی ذات کا فنا ہونا ہے تو یہ بالکل محال ہے اور اگر وہ یوں کہیں کہ ہماری مراد صفت کا فانی ہونا ہے تو ہم بھی ان دو صفتوں میں سے، جن کا بندے سے تعلق ہو ایک صفت کے فانی ہو جانے کو دوسری صفت کے باقی ہونے سے جائز سمجھتے ہیں، لیکن یہ محال ہے کہ کوئی شخص اپنی صفت کے بغیر کسی غیر کی صفت سے قائم ہو۔

روم کے نسطوریوں[1] اور عام نصرانیوں کا یہ مذہب ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کثرتِ مجاہدہ کی وجہ سے کل جسمانی اوصاف سے فانی ہو گئی تھیں اور بقائے الٰہی ان میں پیوست ہو گئی تھی، جس سے انہوں نے بقا حاصل کر لی تھی۔ یہاں تک کہ وہ بقائے الٰہی سے باقی ہو گئی اور عیسیٰ علیہ السلام اسی بقائے الٰہی کا نتیجہ تھے اور یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کی ترکیب کا اصل مادہ انسانی مادہ نہ تھا، بلکہ ان کی بقا حقیقت میں بقائے الٰہی تھی۔ پس وہ، ان کی والدہ اور خداوند تعالیٰ تینوں ایک بقا کے ساتھ باقی ہیں، جو قدیم اور صفت الٰہی ہے۔ یہ سب باتیں مجسمین[2] اور مشبہین[3] میں سے حشویہ فرقے کے قول کے مطابق ہیں جو لوگ ذات حق تعالیٰ کو حوادث کا محل قرار دیتے ہیں اور قدیم کے لیے حادث کی صفت روا رکھتے ہیں، میں ان سب سے کہتا ہوں کہ حادث قدیم کا اور قدیم حادث کا محل کیسے بن سکتا ہے؟ قدیم کا وصف حادث اور حادث کی صفت قدیم کس طرح ہو سکتی ہے؟ ان باتوں کو جائز رکھنا دہریوں کا مذہب ہے اور حدوث، عالم کی دلیل کو بھی باطل کرتا ہے۔ اسی طرح مخلوق و خالق کو قدیم ماننا پڑتا ہے یا دونوں کو حادث کہنا لازم آتا ہے اور یہ سب خرابی مخلوق کے غیر مخلوق کے ساتھ ترکیب پانے اور غیر مخلوق کے مخلوق میں حلول کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی اور یہ خسارہ ان کے لیے کافی ہے کہ جب وہ قدیم کو محل حوادث کہیں اور یا حادث کو محل قدیم کہیں تو مصنوع و صانع کو قدیم یا دونوں کو حادث کہنا چاہیے۔ لہٰذا منطقی طور پر جب مصنوع جو حادث ہے، صانع کا محل ہوگا تو صانع جو اس حال میں ہے، وہ بھی حادث ہوگا اور ٹھیک اسی طرح اگر صانع جو قدیم ہے محل ہوگا تو مصنوع جو اس حال میں ہے، وہ بھی قدیم ہوگا کیونکہ کسی چیز کا محل عین حال کی طرح ہوتا ہے۔ جب محل حادث ہو تو ضرور حال بھی حادث ہونا چاہیے اور جب محل قدیم ہو تو حال کو بھی قدیم ہونا لازم ہے۔ پس ثابت ہوا کہ حادث کو قدیم کہیں یا قدیم کو حادث، یہ دونوں امر صریح گمراہی ہیں۔ الغرض جو چیز کسی دوسری چیز کے ساتھ متصل، پیوستہ، مرکب اور متحد ہو، دونوں چیزوں کا حکم ایک ہی ہوتا ہے۔ پس ہماری بقا بھی ہماری صفت ہے اور ہماری فنا بھی ہماری ہی صفت اور ہمارے اوصاف کی تخصیص میں ہماری بقا ہماری فنا کی طرح ہے اور ہماری فنا ہماری بقا کی طرح۔ پس فنا ایک وصف کا فنا ہونا ہے، دوسرے وصف کی بقا کی وجہ سے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص فنا سے وہ فنا مراد لے جس کے ساتھ بقا کا کوئی تعلق نہ ہو تو روا ہے۔ اسی طرح بقا سے اگر وہ بقا مراد لے جس کے ساتھ فنا کا کوئی واسطہ نہ ہو تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ مراد اس فنا سے ذکر ماسویٰ اللہ کی فنا ہے اور بقا سے مراد ذکر حق تعالیٰ کی بقا ہے۔ جو اپنی مراد سے فانی ہو جاتا ہے، وہ مراد حق سے باقی ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ تیری مراد تو فانی ہے اور حق تعالیٰ کی مراد باقی ہے۔ جب تو اپنی مراد کے ساتھ قائم ہوگا تو تیری مراد فانی ہو جائے گی اور تیرا قیام فنا پر ہوگا اور پھر جب تو مراد حق تعالیٰ پر عمل کرے تو مراد حق تعالیٰ باقی رہے گی اور تیرا قیام بقا

---

[1] نصاریٰ کا ایک فرقہ ہے۔
[2] وہ فرقہ جو اللہ تعالیٰ کے لیے جسم ثابت کرتا ہے۔
[3] وہ فرقہ جو اللہ تعالیٰ کو عام مخلوق کی مانند سمجھتا ہے۔

پر ہوگا۔ اس کی مثال یوں بھی ہوسکتی ہے کہ جو چیز آگ میں گر جائے، وہ اس کے غلبہ سے اسی کی صفت اختیار کر کے آگ ہی بن جاتی ہے۔ پس جب آگ کا غلبہ ایک چیز کے وصف کو اس کے اندر تبدیل کر سکتا ہے تو حق تعالیٰ کی محبت کا غلبہ تو آگ کے غلبے سے بہت بہتر ہے، حالانکہ آگ کا تصرف تو لوہے کے وصف کے تبدیل کرنے میں ہوتا ہے مگر لوہے کی ذات تو جوں کی توں موجود ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی کیونکہ لوہا کبھی آگ نہیں ہوسکتا، واللہ اعلم۔

دوسری بحث

فنا و بقا کے متعلق مشائخ کے رموز

مشائخ رضی اللہ عنہم میں سے ہر ایک کے لیے اس معنی کے متعلق ایک لطیف امر ہے چنانچہ حضرت ابو سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ جو صاحب مذہب ہیں کہ فرماتے ہیں: فنا سے مراد بندے کا اپنی بندگی کو دیکھنے سے فانی ہو جانا ہے اور بقا سے مراد بندے کا مشاہدۂ الٰہی کے ساتھ باقی رہنا ہے یعنی عمل میں اپنی بندگی کو دیکھنا خرابی ہے۔ چنانچہ بندہ بندگی کی حقیقت پر اس وقت پہنچتا ہے جب کہ وہ اپنے عمل کو نہ دیکھے اور اپنے فعل کو دیکھنے سے بالکل فنا ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے فضل کو دیکھنے کے ساتھ باقی رہے تاکہ اس کے عمل کو تعلق حق تعالیٰ سے ہو نہ خود اپنی ذات سے کیونکہ جو فعل بھی بندے کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، وہ ناقص ہوتا ہے اور جو فعل حق تعالیٰ کی طرف بندے کو پہنچتا ہے، وہ سب کامل ہوتا ہے۔ پس جب بندہ اپنے متعلقات سے فانی ہو جاتا ہے تو جمال حق تعالیٰ سے باقی رہتا ہے۔ حضرت ابویعقوب نہرجوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حق بندگی کا صحیح ہونا فنا و بقا میں مضمر ہے اس لیے کہ جب تک بندہ ہر ایک چیز سے بیزاری ظاہر نہ کرے، خالص خدمت خلق کے لائق نہیں ہوتا۔ پس بشریت کے لوازم سے بیزاری ظاہر کرنا فنا ہے اور خالص اللہ کی عبادت کرنا بقا ہے۔ حضرت ابراہیم بن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: فنا و بقا کے جاننے کا دار و مدار خالص وحدانیت اور صحیح عبودیت پر ہے اور جو کچھ اس کے سوا ہے، وہ مغالطہ اور بے دینی ہے یعنی بندہ جب حق تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کر لیتا ہے تو اپنے آپ کو حق تعالیٰ کے حکم سے مغلوب اور مقہور دیکھتا ہے اور مغلوب غالب کے غلبے میں فانی ہو جاتا ہے اور جب اس کی فنا اس پر درست ہو جاتی ہے تو وہ اپنی عاجزی کا اقرار کر لیتا ہے اور پھر سوائے بندگی کے کوئی چارہ نہیں دیکھتا اور رضائے حق کی درگاہ کے حلقے کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے اور جو شخص فنا اور بقا کو اس کے سوا کسی اور امر سے تعبیر کرے یعنی یوں تنبیہ کرے کہ فنا کو اپنی ذات کی فنا جانے اور بقا کو بقائے حق تعالیٰ سمجھے، یہ بے دینی ہے۔ یہ نصاریٰ کا مذہب ہے جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔

میں علی بن عثمان جلابی (رحمۃ اللہ علیہ) کہتا ہوں کہ بغور دیکھا جائے تو یہ سب اقوال معنی کی رُو سے ایک دوسرے سے قریب ہیں اگرچہ عبارت میں مختلف ہیں اور ان سب کی حقیقت یہ ہے کہ بندے کو فنا جلال الٰہی کے دیکھنے اور دل پر اس کی عظمت کے ظاہر ہونے سے ہوتی ہے تاکہ اس کی عظمت کے غلبے میں دنیا اور عقبیٰ اس کے دل سے فراموش ہو جائے، سب احوال اس کی ہمت کی نظر میں حقیر معلوم ہوں اور کرامات کا ظہور اس کے حال میں ہیچ محض ہو جائے حتیٰ کہ عقل، نفس اور فنا سے بھی فانی ہو جائے اور عین فنا کے اندر اس کی زبان حق کے ساتھ ناطق ہو اور اس کا دل و جسم خصوع و خشوع کرنے والا ہو جیسا کہ آدم علیہ السلام کی پشت سے آپ کی اولاد کے نکالے جانے کے شروع میں حال کے اندر آفات کی ترکیب کے بغیر عہد عبودیت باندھا گیا تھا۔ ایک شیخ اسی معنی میں فرماتے ہیں:

(شعر) اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تیری طرف پہنچنے کی کیا صورت ہے تو میں اپنے آپ کو اپنے تمام متعلقات سے فنا کر لیتا اور تیرے اشتیاق میں روتا رہتا۔

اور دوسرے بزرگ فرماتے ہیں:

(شعر) پس میری فنا میں میری فنا کا فنا ہونا ہے اور میری فنا میں تو نے معلوم کر لیا کہ میں نے اپنے نام اور اپنے جسم کے نشان کو مٹا دیا ہے اور جب مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ تو کون ہے؟ تو میں کہتا ہوں تو ہی ہے۔

یہ ہیں فنا و بقا کے احکام اور فقر و تصوف کے باب میں بھی کچھ احکام جو میں نے بیان کر دیئے ہیں اور جہاں کہیں اس کتاب میں فنا و بقا کا بیان کروں گا، یہی مراد ہوگی۔ یہ ہے خراز رحمتہ اللہ علیہ کے حال کا اصل اور یہ بہت ہی اچھا اصل ہے۔ وہ فصل جو وصل کی دلیل ہو، وہ بے اصل نہیں ہوتا اور اس گروہ کے کلام کے دوران یہ مقولہ بہت مشہور ہے، واللہ اعلم۔

فرقۂ خفیفیہ

خفیفیہ فرقے کے لوگ حضرت ابی عبداللہ محمد بن خفیف شیرازی رحمتہ اللہ علیہ سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں، جو گروہ صوفیا کے سرداروں اور بزرگوں میں سے ہوئے ہیں اور اپنے وقت کے عزیز اور علوم ظاہر و باطن کے عالم تھے۔ علم طریقت کے شعبوں میں آپ کی تصنیفات بہت مشہور و معروف ہیں اور آپ کے اوصاف اس سے زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ کر سکیں۔ الغرض آپ اپنے زمانے میں نہایت باعزت اور پاک نفس بزرگ تھے اور شہوت نفسانی کی متابعت سے منہ موڑے ہوئے تھے۔ میں سنا ہے کہ آپ نے چار سو نکاح کیے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ شہزادوں میں سے تھے اور جب آپ نے توبہ کی تو شیراز والوں نے آپ سے بہت تقرب حاصل کیا۔ جب آپ کا حال ترقی پا گیا تو بادشاہوں اور رئیسوں کی لڑکیوں نے برکت کے حصول کے لیے آپ سے نکاح کرنا چاہا۔ آپ ان سے نکاح کر لیا کرتے اور صحبت صحیحہ سے پہلے ہی ان کو طلاق دے دیا کرتے تھے لیکن چالیس عورتیں جو بیگانہ اور پریشان حال تھیں، آپ کی عمر میں دو دو تین تین کر کے آپ کے بستر کی خادم رہیں۔ ان میں سے ایک تو چالیس سال تک آپ کی صحبت میں رہی، جو ایک وزیر کی لڑکی تھی۔ میں نے شیخ ابوالحسن علی بن بکران الشیرازی سے سنا ہے کہ ایک روز ان عورتوں کا جو آپ کے عقد میں تھیں، ایک جگہ اجتماع ہوا۔ ہر ایک نے آپ کے متعلق اپنی وابستگی کی حکایت بیان کی، چنانچہ سب کا اس بات پر اتفاق ہوا کہ انہوں نے شیخ کو خلوت میں اسبابِ شہوت کے تابع کبھی نہیں دیکھا، چنانچہ یہ سن کر ہر ایک کے دل میں وسوسہ پیدا ہوا اور متعجب ہوئیں حالانکہ اس سے پہلے ہر ایک سمجھتی تھی کہ شیخ فلاں عورت سے خاص تعلق رکھتے ہیں، بالآخر سب کہنے لگیں کہ "آپ کی صحبت کے بھید سے وزیر لڑکی کے سوا اور کوئی خبر نہیں رکھتا کیونکہ وہ کئی سال سے انکی صحبت میں ہے اور آپ کے نزدیک سب عورتوں سے زیادہ محبوب وہی عورت ہے۔" پس انہوں نے اس مجلس میں اپنے میں سے دو عورتوں کا انتخاب کیا اور اس (وزیر کی لڑکی) کے پاس بھیجا کہ "شیخ تجھ سے بہت رہے ہیں، تو ہمیں ان کی صحبت کے بھید سے آگاہ کر۔" اس نے کہا کہ "جس دن شیخ نے مجھ سے عقد باندھا، اسی دن ایک شخص نے میرے پاس آکر کہا کہ شیخ آج رات تیرے کمرے میں آئیں گے۔ میں نے

اچھے اچھے کھانے پکائے اور اپنی زیب و زینت میں خوب تکلف کیا۔ جب وہ آئے تو نوکران کے پاس کھانا لائے اور مجھے آپ نے بلایا تو کبھی آپ میری طرف دیکھتے اور کبھی کھانے کی طرف۔ پھر آپ نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنی قمیص کے اندر رکھا تو میں نے دیکھا کہ آپ کے سینے سے ناف تک پیٹ میں پندرہ گرہیں پڑی ہوئی تھیں۔ آپ نے فرمایا: اے وزیر کی لڑکی! تو پوچھ کہ یہ گانٹھیں کیا ہیں؟ میں نے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ یہ سب صبر کی سختی اور تکلیف سے وجود میں آئی ہیں کیونکہ میں نے ایسے چہرے اور ایسے کھانے سے صبر کیا۔" یہ بات کہہ کر آپ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میری زیادہ گستاخی آپ کے ساتھ یہی ہوئی۔ اس کے بعد متواتر کئی سال میں آپ کی خدمت ورضاجوئی میں مصروف رہی اور آپ سے کوئی نفسانی خواہش نہیں کی۔ تصوف میں آپ کے مذہب کا اصل اصول غیبت اور حضور ہے اور وہ اسی کو بیان کیا کرتے ہیں اور میں انشاء اللہ تعالیٰ اپنی طاقت کے مطابق اسے بیان کروں گا۔

بحث

غیبت وحضور

غیبت و حضور ایسے الفاظ ہیں کہ کسی معنی مقصود پر ان کا اطلاق ایسا ہوتا ہے جیسا کسی آنکھ میں اصل چیز کا عکس پڑتا ہے، پھر وہ عکس اصل سے متضاد معلوم ہوتا ہے اور یہ لفظ اہل زبان و اہل معنی کے درمیان مستعمل اور مروّج ہیں، پس حضور سے مراد یقینی دلالت کے ساتھ اللہ کے سامنے دل کا حاضر ہونا ہے تاکہ غیبی حکم اس کے لیے عینی حکم کی طرح ہو جائے۔ غیبت سے مراد ماسویٰ اللہ سے دل کا اس حد تک غائب ہو جانا ہے کہ وہ اپنے آپ سے بھی غائب ہو جائے بلکہ اپنے غائب ہونے سے بھی غائب ہو جائے تاکہ وہ اپنی اس غیبت میں آپ اپنا نظارہ کر سکے اور اس کی علامت رواجی امور کے حکم سے اعراض کرنا اور ان سے اپنے آپ کو ایسا معصوم بنانا ہوتا ہے جیسا کہ نبی حرام امور سے معصوم ہوتا ہے۔ پس اپنے آپ سے غائب ہونا، حق تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونا ہے اور خدا کے حضور میں حاضر رہنا، اپنے آپ سے غائب ہونا ہے چنانچہ جو شخص اپنے آپ سے غائب ہو جاتا ہے، وہ حق کے سامنے حاضر ہوتا ہے اور جو شخص حق تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوتا ہے، وہ اپنے آپ سے غائب ہوتا ہے چونکہ دل کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، پس جب اللہ عزوجل کی کششوں میں سے کوئی کشش طالب حق کے دل کو مقہور و مغلوب کر لیتی ہے تو دل کا غائب ہونا اس کے نزدیک حاضر ہونے کے مانند ہوتا ہے اور اس کے دل سے کسی اور کی شرکت اٹھ جاتی ہے اور اس کے علاوہ کسی اور چیز کو اپنے سے نسبت دینا منقطع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں:

"دل ہے اور تو اس کا تنہا مالک ہے، پس وہ کیسے منقسم ہو سکتا ہے۔"

جب دل کا سوائے حق سبحانہ و تعالیٰ کے کوئی اور مالک نہ ہو تو خواہ اس کو غائب رکھے یا حاضر، وہ اسی کے تصرف میں ہوتا ہے اور اسی کے حکم میں اور جمع کی آنکھ سے دیکھنا سب محبت ہے، سب احباب کا عمل یہی ہے۔ رہا یہ امر کہ غیبت اور حضور میں کونسا زیادہ افضل ہے؟ سو اس میں مشائخ کرام نے اختلاف کیا ہے۔ ان میں سے ایک گروہ حضور کو غیبت پر مقدم رکھتا ہے اور دوسرا گروہ غیبت کو حضور پر ترجیح دیتا ہے جیسا کہ ہم نے صحو اور سکر میں بیان کیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ صحو اور سکر تو اوصاف کی بقا کا پتہ دیتے ہیں اور غیبت و حضور اوصاف کی فنا کا۔ نظر تحقیق میں یہ غیبت و حضور کا اعزاز ہے۔ جو لوگ غیبت کو حضور پر مقدم رکھتے ہیں، وہ ابن عطا و حسین ابن منصور و ابوبکر شبلی

و بندار بن حسین و ابو حمزہ بغداع و سمنون محب رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ عراقیوں میں ایک جماعت کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ راہِ حق میں سب سے بڑا حجاب تو خود ہے۔ جب تو اپنی خودی سے غائب ہو جائے، تیری ہستی کو ثابت کرنے والی چیزیں تیرے اندر فانی ہو جائیں، تیرے حال کی بنیاد پلٹ جائے، مریدوں کے مقامات سب تیرے لیے حجاب بن جائیں، طالبوں کے احوال تیرے لیے محل آفت بن جائیں، اسرار تیری نظر میں زنار ہو جائیں، ہستی کو ثابت کرنے والے امور تیرے ارادے کے سامنے حقیر اور خوار ہو جائیں، تیری آنکھ اپنے سے اور غیر سے بالکل بند ہو جائے، بشریت کو ثابت کرنے والی باتیں تیرے اندر قربت الٰہی کے شعلے سے جل جائیں اور اس وقت صورت حال ایسی بنے کہ گویا خدا تعالیٰ نے تیری غیبت کی حالت میں تجھے آدم علیہ السلام کی پشت سے باہر نکالا، اپنا کلام عزیز تجھے سنایا، توحید کے خلعت اور مشاہدہ حق کے لباس سے مخصوص فرمایا اور جب تک تو اپنے آپ سے غائب تھا (دنیا میں موجود نہیں تھا) حق تعالیٰ کے حضور میں بے حجاب حاضر تھا۔ جب تو اپنی صفات کو دیکھنے لگا اور دنیا میں آ موجود ہوا تو قربِ حق سے تو غائب ہو گیا۔ پس تیری ہلاکت تیرے اپنے آپ کو دیکھنے کی صورت میں ہے اور یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا کہ "تم مرنے کے بعد ہمارے پاس اسی طرح تنہا آئے جیسے ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔" حارث محاسبی و جنید و سہل بن عبداللہ و ابوحفص حداد و ابو حمدان قصار و ابو محمد حریری و حصری و محمد بن خفیف رحمۃ اللہ علیہم جو سب کے سب اصحابِ مذہب ہیں، مع دوسری جماعت کے اس بات پر متفق ہیں کہ حضور غیبت سے افضل ہے، کیونکہ سب خوبیاں حق کے حضور میں حاضر رہنے سے متعلق ہیں اور اپنے آپ سے غائب ہونا حضور الٰہی میں حاضر ہونے کا ذریعہ ہے۔ جب تو بارگاہ حق میں پہنچ گیا تو ذریعہ اس وقت ایک آفت ہو جاتا ہے۔ پس جو شخص اپنے آپ سے غائب ہو، وہ ضرور بارگاہ حق میں حاضر ہوتا ہے اور غیبت کا فائدہ کبھی حضور کی وجہ سے ہے اور غیبت بلا حضور جنون اور دیوانگی ہے۔ لہٰذا طالب حق کو چاہیے کہ غفلت کو چھوڑ دے تاکہ اس غیبت کا مقصود حضور ہو اور جب مقصود حاصل ہو گیا تو علت ساقط ہو گئی۔ (شعر)

(ترجمہ: غائب وہ نہیں جو اپنے شہر، وطن سے غائب ہو، بلکہ غائب تو وہ ہے جو اپنی مراد سے غائب ہو۔)

مطلب یہ کہ اپنے تمام ارادے چھوڑ دے اور حق کا ارادہ ہی اس کا ارادہ ہو اور حاضر یہ نہیں کہ جس کی کوئی مراد نہ ہو بلکہ حاضر تو وہ ہے کہ جس کا دل ہی نہ ہو کہ اس میں کوئی اور مقصود قرار پذیر ہو سکے تاکہ نہ دل ہو نہ اس میں دنیا و آخرت کا ذکر پیدا ہو اور نہ خواہش نفس سے اس کو آرام ہو۔ اسی معنی میں ایک بزرگ فرماتے ہیں:

(شعر) ترجمہ: "جو شخص اپنے نفس، خواہش اور احباب کے ساتھ اُنس کرنے سے فانی نہیں ہوا، وہ گویا مراتب کے درمیان حظِ نفس کے حاصل کرنے یا نیک انجام کے لیے ٹھہرا ہوا ہے۔"

یہ بات مشہور ہے کہ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں میں سے ایک نے حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کا قصد کیا۔ جب وہ عبادت خانے کے دروازے پر پہنچا اور اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو حضرت بایزید نے پوچھا: "تو کون ہے اور کس سے ملنا چاہتا ہے؟" اس نے کہا کہ "حضرت بایزید سے۔" آپ نے فرمایا: "بایزید کون ہے؟ کہاں ہے؟ اور کیا کام کرتا ہے؟ میں تو ایک مدت سے بایزید کی جستجو میں ہوں لیکن وہ مجھے نہیں ملا۔" جب وہ شخص واپس گیا اور اپنا حال ذوالنون رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا تو آپ نے فرمایا: اَخِیْ اَبُوْیَزِیْدَ ذَھَبَ فِے الذَّاھِبِیْنَ فِی اللہِ ۔ (میرا بھائی بایزید ان لوگوں میں چلا گیا ہے جو فنا فی اللہ ہو گئے)۔ ایک شخص حضرت جنیدؒ کے پاس آیا اور عرض کرنے

لگا: "آپ مہربانی کر کے مجھے تھوڑی دیر کے لیے شرف ملاقات بخشیے۔ میں چند باتیں آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں۔" آپ نے فرمایا: "اے جواں مرد! تو مجھ سے وہ چیز طلب کرتا ہے جو مدت ہوئی تلاش کر رہا ہوں۔ میں تو کئی سال سے یہ چاہتا ہوں کہ دم بھر کے لیے اپنی طرف متوجہ ہو جاؤں مگر ایسا نہ ہو سکا، پھر بھلا ایسی صورت میں تیری طرف کیسے متوجہ ہو سکتا ہوں؟" پس غیبت میں حجاب کی وحشت ایک اور حجاب ہے اور حضور میں کشف راحت ہے اور اسی معنی میں شیخ ابو سعید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ (شعر)

(ترجمہ: "جدائی اور غیبت کا بادل حبیب کے چاند جیسے رُخسار سے چھٹ گیا اور غیبت کے اندھیرے میں صبح کا نور روشن ہو گیا)۔"

اس معنی کے فرق کے متعلق مشائخ کا ایک مشہور لطیفہ ہے، جو حقیقت میں حال سے تعلق رکھتا ہے گو ظاہر میں وہ قال سے متعلق ہے۔ یہ بزرگ غیبت اور حضور کے دونوں الفاظ کو آپس میں قریب المعنی ظاہر کرتے ہیں یعنی کیا حق تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونا اور کیا اپنے آپ سے غائب ہونا، دراصل یہ دونوں امر مساوی ہیں کیونکہ اپنے آپ سے غائب ہونے سے مراد حق کے سامنے حاضر ہونا ہے اور جو اپنے آپ سے غائب نہیں، وہ حق کے سامنے حاضر نہیں اور جو حق کے سامنے حاضر ہے، وہ اپنے آپ سے ضرور غائب ہے، جیسا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کی بے قراری مصیبت کے وارد ہونے کی حالت میں اپنی ذات کی طرف توجہ کرنے کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ وہ اس حالت میں اپنے آپ سے بالکل غائب تھے۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس بے قراری کو صبر سے الگ نہیں فرمایا۔ چنانچہ جب آپ نے نہایت جزع و کرب کی حالت میں اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: "مجھے سخت تکلیف پہنچی۔" تو اللہ تعالیٰ نے ان کی نسبت فرمایا: "بے شک ہم نے اسے نہایت صابر پایا۔" اور یہ حکمت بعینہٖ اس کے قصے سے ظاہر ہے۔ اچھی طرح غور کرو تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے۔

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ایک وقت میں میری یہ حالت تھی کہ اہل آسمان و زمین میری حیرانی پر روتے تھے، پھر ایسا ہوا کہ میں انکی غیبت پر روتا تھا اور اب یہ حال ہے کہ نہ ان کی مجھے خبر ہے نہ اپنی خبر، اور یہ حضور کی طرف بہت اچھا اشارہ ہے۔ پس غیبت و حضور کے مختلف مشائخ کے نزدیک یہ معنی ہیں، جو میں نے مختصراً بیان کر دیئے تاکہ خفیفیہ فرقے کا مسلک تجھے معلوم ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ غیبت و حضور سے ان لوگوں کی کیا مراد ہے؟ کیونکہ شرح و توضیح کتاب کو طویل کر دے گی اور میرا طریق اس کتاب میں اختصار ہے اور توفیق اللہ کے قبضے میں ہے۔

فرقۂ سیاریہ
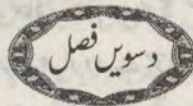
سیاریہ فرقے کے لوگ حضرت ابو العباس سیاری رحمتہ اللہ علیہ سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔ آپ مرو میں امام تھے، سب علوم کے عالم اور حضرت ابوبکر واسطی رحمتہ اللہ علیہ کے ہم نشین تھے۔ آج بھی نسا اور مرو میں آپکے طبقے کے بہت سے لوگ موجود ہیں اور حق یہ ہے کہ آپ کے مذہب کے سوا اور کوئی مذہب تصوف میں اپنے حال پر نہیں رہا کیونکہ کسی وقت بھی مرو اور نسا کسی ایسے پیشوا سے خالی نہیں رہا، جو آپ کے اصحاب کو آپ کے مذہب پر قائم

رکھنے کے لیے آج تک ان کی حفاظت نہ کرتا رہا ہو۔ آپ کے ان اصحاب کی طرف سے جو اہل نسا سے ہیں، کچھ عمدہ رسالے اور خطوط اہل مرو کے نام بھیجے گئے تھے اور جن کے ذریعے انھوں نے اہل مرو سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ میں نے ان خطوط میں سے بعض کو مرو میں خود دیکھا ہے۔ وہ بہت ہی اچھے ہیں اور ان کی عبارتیں جمع و تفرقہ پر مبنی ہیں اور یہ ایک ایسا لفظ ہے جو تمام اہل علوم کے درمیان مشترک ہے اور ایک گروہ خاص طور پر اس لفظ کو اپنی عبارت کے سمجھانے میں استعمال کرتا ہے، لیکن ہر ایک گروہ کی مراد اس لفظ سے جدا جدا ہے۔ چنانچہ محاسبیہ فرقے کے لوگ جمع و تفرق سے کسی چیز کے اعداد کا جمع ہونا اور علیحدہ ہونا مراد لیتے ہیں اور نحوی لوگ نحوی اسماء و صفات کا لفظوں میں متفق اور معانی میں مختلف ہونا اس سے مراد لیتے ہیں۔ فقہاء قیاس کا جمع ہونا اور نص کی صفات کا علیحدہ و مختلف ہونا یا نص کا جمع ہونا اور قیاس کا مختلف ہونا مراد لیتے ہیں۔ اہل اصول صفات ذاتیہ کا جمع ہونا اور صفات فعلیہ کا اختلاف مراد لیتے ہیں لیکن اس گروہ سیاریہ کی مراد جمع و تفرقہ کے الفاظ سے یہ باتیں نہیں جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں۔ اس لیے اب میں ان الفاظ سے اس گروہ کے مقصود کو اور ان کے مشائخ کے اختلاف کو انشاء اللہ بیان کروں گا تاکہ تمہیں اس کی حقیقت اور مشائخ میں سے ہر ایک گروہ کا جمع و تفرقہ سے جو مقصود ہے، معلوم ہو جائے۔

پہلی بحث

جمع و تفرقہ کی حقیقت

یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں کو اپنی دعوت میں جمع کر دیا ہے، چنانچہ بیان فرمایا ہے: ”اللہ سب کو دارالسلام یعنی جنت کی طرف بلاتا ہے۔“ پھر ہدایت کے بارے میں ان میں تفریق کر دی اور فرمایا: ”وہ ہدایت کرتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی طرف۔،، مطلب یہ کہ وہ سب کو دعوت دے کر جنت کی طرف بلاتا ہے۔ پھر ایک گروہ کو اپنی مشیت کے تحت ہدایت دیتا ہے اور دوسرے کو اپنی رحمت سے محروم کر کے رد کر دیتا ہے، گویا سب کو حکم میں پہلے جمع کر دیا اور پھر ان میں تفریق کر دی۔ ایک گروہ کو مقبول اور دوسرے کو مردود بنایا۔ اسی طرح اس نے سب کو ”نہی“ میں جمع کر کے سب کو معاصی سے دور رہنے کی تاکید فرمائی، پھر ان میں تفریق کر دی کہ ایک گروہ کو بالکل عصمت عطا فرمائی اور دوسرے کو گناہ کی طرف راغب کر دیا۔ پس اس معنی کے اعتبار سے جمع کے بھید کی حقیقت حق تعالیٰ کے علم و ارادہ میں ہے لیکن تفرقہ، سو وہ امر و نہی کا ظاہر کرنا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اسمٰعیل علیہ السلام کا سر کاٹ اور چاہا کہ وہ ایسا نہ کرے اور آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ گیہوں نہ کھا اور چاہا کہ وہ کھائے۔ اسی طرح بہت سی مثالیں ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے کرنے کا حکم دیا اور نہ کرنا چاہا۔ پس جمع سے مراد وہ ہے کہ جو اللہ نے اپنے اوصاف کو جمع کیا ہے اور تفرقے سے مراد وہ ہے جو اس نے اپنے افعال میں تفریق کی ہے اور یہ سب ارادۂ حق کے اثبات میں ارادے کا منقطع ہو جانا اور خلقت کے تصرف کو ترک کرنا ہے اور جمع و تفرقہ کی مذکورہ بالا توجیہات سے معتزلہ کے سوا سب مشائخ طریقت نے اہل سنت و جماعت سے اتفاق کیا ہے، البتہ ان عبارات کے استعمال میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ جمع کو توحید پر استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جمع کے دو درجے ہیں۔ ایک اوصاف الٰہی میں اور دوسری اوصافِ بندہ میں، جو جمع اوصافِ الٰہی میں ہے، وہ توحید کا بھید ہے۔ بندے کا کسب اس سے منقطع ہے اور جو اوصاف بندے میں ہیں، وہ صدق عقیدہ اور پختہ ارادے پر ہے۔ یہ قول ابوعلی رودباری رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور یہ

وہ گروہ ہے جو ان الفاظ کو اوصافِ الٰہی پر جاری کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جمع صفاتِ الٰہی ہیں اور تفرقہ اس کے افعال ہیں اور بندے کا کسب اس سے منقطع ہے، اس لیے کہ الوہیت میں کوئی اس سے جھگڑا کرنے والا نہیں۔ پس جمع اس کی ذات و صفات کے لیے ہے۔ اس لیے کہ جمع اصل میں برابر کرنے کو کہتے ہیں اور سوائے اس کی ذات و صفات کے قدم اور ہمیشگی میں کوئی چیز مساوی نہیں اور ذات و صفاتِ الٰہیہ کی علیحدگی کے متعلق بیان و تفصیل میں لوگ متفق ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات قدیم ہیں اور وہ ان سے مخصوص ہے اور ان صفات کا قیام اس کی ذات سے ہے اور ان کا وجود اس کی ذات سے مختص ہے، لہٰذا وہ اور اس کی صفات علیحدہ علیحدہ دو چیزیں ہیں کیونکہ اس کی وحدانیت میں تفریق و مقدار روا نہیں۔ پس اس پر جمع کا حکم سوائے اس معنی کے اور کسی لحاظ سے روا نہیں۔

احکامِ الٰہی میں تفرقہ

یہ اللہ تعالیٰ کے افعال ہیں جو سب حکم میں مختلف ہیں۔ اگر ایک فعل کے لیے حکم وجود کا ہے تو دوسرے فعل کے لیے حکم عدل کا ہے لیکن جو ممکن الوجود ہوتا ہے، اس میں ایک کو حکم فنا کا ہوتا ہے اور دوسرے کو حکم بقا کا۔ ان کے علاوہ ایک گروہ اور ہے جو جمع و تفرقہ کے الفاظ کا علم پر اطلاق کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جمع علم توحید الٰہی ہے اور تفرقہ علم احکام الٰہی۔ پس علمِ اصول جمع ہے اور علمِ فروع تفرقہ۔ مشائخ میں سے ایک بزرگ نے یہ بھی کہا ہے کہ جمع وہ ہے جس پر اہل علم نے اتفاق کیا ہے اور تفرقہ وہ ہے جس میں انہوں نے اختلاف کیا ہے اور پھر اہل تصوف میں سے جمہور محققین (اللہ تعالیٰ ان کے چہروں کو تازہ کرے) ان کی عبارات اور اشارات کے موقعوں پر میں لفظ تفرقہ سے مراد مکاسب و اعمال اور جمع سے مراد مواہب یعنی مجاہدات اور مشاہدہ ہے۔ پس جو کچھ بندہ اپنے حسن عمل سے حاصل کرتا ہے، وہ سب تفرقہ ہے اور جو کچھ محض عنایت اور ہدایت الٰہی سے بندے کو حاصل ہوتا ہے، وہ جمع ہے۔ بندے کی عزت اس میں ہے کہ اپنے افعال کے وجود اور مجاہدے کے ممکن ہونے میں جمال الٰہی کی وجہ سے اپنے فعل کی خرابی سے چھوٹ جائے۔ اپنے افعال کو حق تعالیٰ کے افعال میں ڈوبا ہوا پائے اور مجاہدے کو ہدایت کے مقابلے میں بالکل معدوم سمجھے۔ پس پورے طور پر اس کا قیام حق تعالیٰ کے ساتھ ہو اور اللہ تعالیٰ اس کے اوصاف کا مظہر ہو یعنی اس کے اوصاف کا وکیل و کارساز ہو اور اس بندے کے ہر فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تاکہ وہ اپنے کسب کی نسبت سے چھوٹ جائے۔ چنانچہ پیغمبر ﷺ نے ہمیں جبریل علیہ السلام سے اور جبریل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا ہے: "بندہ ہمیشہ نوافل سے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو دوست رکھتا ہوں اور جب میں اس کو دوست بنا لیتا ہوں تو اس کی ہستی کو اس میں فنا کر کے اس جملہ افعال کی نسبت اس سے اُٹھا لیتا ہوں، حتیٰ کہ میں خود اس کے کان، آنکھ، ہاتھ اور زبان ہو جاتا ہوں۔ چنانچہ وہ میرے ہی ذریعے سے سنتا اور میرے ہی ذریعے سے دیکھتا اور میرے ہی سبب سے کوئی چیز پکڑتا اور میرے ہی ذریعے سے بولتا ہے" یعنی ہمارے ذکر میں ہمارے ذکر سے مغلوب ہو جاتا ہے، اس کا اپنا کسب اس کے ذکر سے فنا ہو جاتا ہے اور ہمارا ذکر اس کے ذکر پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے اور اس کے ذکر سے بشریت کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے، پس اس کا ذکر ہمارا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ غلبۂ ذکر کی حالت میں وہ اس صفت پر ہوتا ہے، جیسے بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: "میری ذات پاک ہے، میری شان بڑی عظیم ہے۔" اور جو کچھ آپ نے کہا تھا اس گفتار کا نشانہ تو خود تھے یعنی گفتار آپ کے منہ سے ہی سرزد

ہو رہی تھی، لیکن کہنے والا حق تعالیٰ تھا۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: "حق تعالیٰ عمر رضی اللہ عنہ کی زبان پر بولتا ہے۔" اس کی حقیقت یوں ہے کہ جب حق تعالیٰ کی قاہریت آدمی پر اپنا غلبہ ظاہر کرتی ہے تو اس کی ہستی کو اس سے چھین لیتی ہے یہاں تک کہ اس بندے کی گویائی تبدیل ہو کر اللہ تعالیٰ کی گویائی ہو جاتی ہے، بغیر اس کے کہ حق تعالیٰ مخلوقات کے ساتھ امتزاج پائے یا موجودات کے ساتھ متحد ہو یا اللہ تعالیٰ اشیاء میں حلول کرے، اللہ تعالیٰ اس سے اور ان سب فضول باتوں سے جو ملحدین اس ذات اقدس کی طرف منسوب کرتے ہیں، بہت بلند ہے۔ پس روا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت بندے کے دل پر غلبہ پا جائے اور اس محبت الٰہی کے غلبہ اور زیادتی کی وجہ سے عقل اور طبیعت اسے برداشت کرنے سے عاجز ہو جائے اور پھر اس کا معاملہ بندے کے کسب و مجاہدہ سے ساقط ہو جائے۔ اس وقت اس درجے کو جمع کہتے ہیں اور دوسرے الفاظ میں وحدت الوجود اور وحدت[1] الشہود، چنانچہ جب کہ رسول ﷺ محبت الٰہی میں غرق اور مغلوب تھے تو جو فعل آپ سے سرزد ہوا، خداوند تعالیٰ نے اس فعل کی نسبت آپ سے دُور کر کے فرمایا کہ وہ فعل میرا تھا نہ کہ تیرا، اگرچہ اس فعل کا نشانہ (ظاہری سبب) تو تھا جیسے کہ ارشادِ ربانی ہے: "(اے محمد ﷺ!) وہ خاک کی مٹھی جو تو نے دشمن کے منہ پر پھینکی تھی، وہ تو نے نہیں پھینکی تھی بلکہ درحقیقت وہ ہم نے پھینکی تھی"۔ اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام سے بھی اسی قسم کا فعل سرزد ہوا تو اس کی نسبت فرمایا: "داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا" کیونکہ حضرت داؤد اس وقت حال تفرقہ میں تھے یعنی محبت الٰہی میں مستغرق و مغلوب تھے پس وہ شخص جس کے فعل کو خدا تعالیٰ اسی کی طرف منسوب کرے حالانکہ وہ شخص آفات و حوادث کا محل ہے اور وہ شخص جس کے فعل کو اللہ تعالیٰ خود اپنی ذات کی طرف منسوب فرمائے حالانکہ اس کی ذات قدیم اور محل آفات و حوادث نہیں۔ ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ پس جب کسی بندے پر ایسا فعل ظاہر ہو جو آدمیوں کے فعل کی جنس سے نہیں تو لا محالہ اس فعل کا فاعل اللہ تعالیٰ ہی ہوتا ہے اور معجزات و کرامات سب اسی درجے سے تعلق رکھتے ہیں۔

پس وہ افعال جو عادت کے مطابق ہوتے ہیں، سب تفرقہ ہوتے ہیں اور خلاف عادت افعال سب جمع ہیں، اس لیے کہ ایک رات میں زمین سے مقام قاب قوسین تک چلے جانا عادت کے مطابق نہیں اور یہ سوائے فعل الٰہی کے نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح غیب کے متعلق صحیح بات بیان کرنا عادت نہیں تھی۔ سو یہ بھی سوائے فعلِ الٰہی کے نہیں ہوسکتا اور آگ سے نہ جلنا، یہ بھی عادت میں داخل نہیں، سو یہ بھی فعل حق تعالیٰ کے سوا نہیں ہوسکتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء و اولیاء کو یہ معجزات و کرامات عطا فرمائے ہیں اور اپنے فعل کو ان کی طرف منسوب فرمایا ہے اور ان کے فعل کو اپنی طرف، کیونکہ اس کے دوستوں کا فعل اسی کا فعل ہوتا ہے اور ان کی بیعت خود اسی کی بیعت ہے اور ان کی اطاعت

---

[1] وحدت الوجود اور وحدت الشہود صوفیا کرام کی دو مشہور اصطلاحیں ہیں، جو ممکنات کے حقائق میں اختلاف کی وجہ سے رواج پا گئیں چنانچہ صوفیا کا ایک گروہ اس امر کا قائل ہے کہ عالم میں فقط ایک ہی وجود ہے اور وہ ذاتِ حق ہے اور باقی موجودات و ممکنات اسی ذات حق میں علیٰ سبیل الاجمال اسی طرح منطوی ہے جس طرح ایک درخت اپنی ٹہنیوں، پتوں اور دوسرے شیون ممنوعہ کے ساتھ ایک دانے میں اجمالی طور پر منطوی ہوتا ہے، لہٰذا انہوں نے وحدت الوجود یعنی ہمہ اوست کی تلقین شروع کی اور یہی عندیہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی و اتباعہ کا ہے۔ ایک گروہ اس امر کا معتقد ہے کہ ممکنات موجود تو ہیں لیکن ان کا وجود عارضی، ظلی اور انتزاعی ہے۔ اصل وجود صرف ذاتِ حق کا ہے جس سے ان ممکنات کے وجود کا اسی طرح ظہور ہوتا ہے جس طرح شعلۂ جوالہ سے گھماتے وقت ایک موہوم دائرہ نظر آتا ہے یا آئینے میں دیکھتے وقت اپنی صورت دکھائی دیتی ہے، لہٰذا ان لوگوں نے "وحدت الشہود" کو رواج دیا۔ اس نظریہ کے قائل الشیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانی اور ان کے اتباع ہیں لیکن امعان سے دیکھا جائے تو ان بزرگوں کا یہ نزاع لفظی ہے نہ کہ معنوی، اس لیے کہ ہمہ اوست اور ہمہ از وست کا مآل بالکل واحد ہے۔

خود اسی کی اطاعت ہوتی ہے، چنانچہ فرمایا: "بلاشبہ وہ لوگ جو آپ سے بیعت کر رہے ہیں، وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ سے بیعت کر رہے ہیں۔" نیز فرمایا ہے: "جس نے رسول اللہ (ﷺ) کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔" پس اولیاء اللہ باطن میں تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ حالت جمع میں ہوتے ہیں یعنی واصل بحق ہوتے ہیں اور اپنے عمل و ظاہر حالت میں حالت افتراق میں تاکہ ان کے باطنوں کے حق تعالیٰ کے ساتھ مجتمع ہونے سے محبت الٰہی مضبوط ہو اور ان کی ظاہری حالت کے حق تعالیٰ سے جدا ہونے سے بندگی کو قائم رکھنا صحیح ہو چنانچہ بڑے مشائخ میں سے ایک بزرگ حالت جمع میں فرماتے ہیں: (شعر)

(ترجمہ: تو میرے باطن میں ثابت ہو گیا پس میری زبان نے تجھ سے سرگوشی کی، پس ہم کئی اُمور کے لحاظ سے تو جمع ہیں اور کئی اُمور کے لحاظ سے جدا ہیں۔ پس اگر تیری عظمت شان نے تجھ کو میرے مشاہدے سے غائب کر دیا ہے تو میرے جذبۂ عشق نے تجھے غیبت میں بھی میری پناہ بنا دیا ہے)۔

باطنوں کے خدا تعالیٰ کے ساتھ ملنے کو جمع اور زبان سے حق تعالیٰ کے حضور میں مناجات کرنے کو تفرقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر جمع اور تفرقہ کا اپنے اندر نشان دیا ہے اور اس کی بنیاد خود اپنے آپ کو قرار دیا ہے۔ کلام نہایت عمدہ ہے اور توفیق قبضۂ الٰہی میں ہے۔

جمع و تفرقہ میں اختلاف

باقی رہا وہ اختلاف جو ہمارے اور اس گروہ کے درمیان ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ جمع کو ثابت کرنا تفرقہ کی نفی ہے اس لیے کہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہیں، کیونکہ جب ہدایت الٰہی کی حکومت جو جمع کی صورت ہے تو تفرقہ کی صورت جو کسب اور مجاہدہ ہے، ختم ہو جائے گی حالانکہ یہ صحیح نہیں اس لیے کہ یہ تعطل محض ہے جو جائز نہیں کیونکہ جب تک بندے میں طاقت و قوت ہے، اس سے عمل اور مجاہدہ ہرگز ساقط نہیں ہو سکتا اس لیے کہ جمع تفرقہ سے علیحدہ نہیں جیسا کہ نور آفتاب سے، عرض جوہر سے اور صفت موصوف سے جدا نہیں ہو سکتے پس مجاہدہ، ہدایت سے، شریعت حقیقت سے اور مطلوب کا پانا طلب سے بھی جدا نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ مجاہدہ ہدایت حق کے حصول سے پہلے ہو یا پیچھے ہو مگر جس کے لیے مجاہدہ پہلے ہو گا، اس پر تکلیف زیادہ ہو گی اور جس کے لیے مجاہدہ پیچھے کرنا پڑے گا، اسے رنج اور کلفت نہ ہو گی۔ اس لیے کہ وہ حضور حق میں ہو گا اور وہ شخص جسے اعمال کی مشقت کی نفی جو جمع یعنی ہدایت حق سے مشاہدہ میں حاصل ہوتی ہے، عین عمل کی نفی معلوم ہوتی ہے، وہ سخت غلطی پر ہے اور یہ جائز نہیں کہ بندہ ایسے درجے پر پہنچ جائے کہ اپنے تمام اوصاف کو برا اور معیوب سمجھے، مثلاً وہ اپنے نیک اوصاف کو بھی عیب کی نظر سے دیکھے اور ان کو ناقص جانے بلکہ برے اوصاف ہی ان کو زیادہ معیوب ہونے چاہئیں۔ اور یہ بات میں نے اس لیے بیان کی ہے کہ جاہلوں کی ایک قوم کو اس امر کے متعلق غلطی واقع ہوئی ہے، جو حقیقت سے بیگانگی کی دلیل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مقصود کا پانا کچھ بھی ہماری کوشش اور اعمال سے وابستہ نہیں، اس لیے کہ ہماری عبادات اور افعال سب عیب دار ہیں۔ پس ناقص مجاہدہ کرنے سے نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ ہم ان سے کہتے ہیں کہ ہمارے عمل کو تم اور ہم بالاتفاق فعل کہتے ہیں اور افعال کو تم عیب کا محل اور نقصان کا منبع کہتے ہو تو لامحالہ ناکردہ عمل کو بھی فعل ہی کہنا لازم آئے گا اور جب دونوں فعل ہیں اور فعل عیب و نقصان کا محل ہے، پس نہ کیے ہوئے عمل کو تم کئے ہوئے عمل

سے کیوں بہتر سمجھتے ہو؟ یہ تو ظاہر خسارہ اور واضح نقصان ہے۔ یہ کفر اور ایمان کے درمیان بہت اچھا فرق ہے، اس لیے کہ مومن اور کافر دونوں متفق ہیں کہ ان کے افعال عیب کا محل ہیں۔ پس مومن تو فرمانِ الٰہی کی رُو سے کرنے کو نہ کرنے سے بہتر جانتا ہے اور کافر تعطیل کی رُو سے نہ کرنے کو کرنے سے بہتر سمجھتا ہے۔ پس جمع یہ ہے کہ رویت میں تفرقے کی آفت و نقصان اور اس کا حکم بندے سے ساقط نہ ہو اور تفرقہ یہ ہے کہ جمع کے حجاب میں بندہ تفرقہ کو جمع سمجھے اور اسی معنی میں مزین کبیر فرماتے ہیں: (شعر)

(ترجمہ: جمع مشاہدہ و قربِ حق سے مخصوص ہوتا ہے اور تفرقہ اللہ کی بندگی کرنا ہے کہ ہر ایک ان میں سے دوسرے سے متصل ہے، جدا نہیں)۔

اس لیے کہ قربِ حق سے مخصوص ہونے کی علامت خود عبودیت کی حفاظت کرنا ہی ہے کیونکہ جب مدعی اپنے اعمال میں کسی عمل پر قائم نہ ہو تو وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہوتا ہے، پس روا ہے کہ مجاہدہ اور خدا کی طرف سے مقررہ احکام کی تعمیل کا حق ادا کرنے میں مجاہدے کی دُشواری اور تکلیف کا رنج بندے سے اُٹھ جائے لیکن یہ روا نہیں کہ بغیر کسی عذر واضح کے جو شریعت کے حکم میں عام ہے، عین حالت جمع میں مجاہدہ اور احکام مقررہ ہی اُٹھ جائیں۔

میں اس بات کو بیان کرتا ہوں تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے، سو جان لو کہ جمع دو قسم کی ہوتی ہے: ایک تو جمع سالم اور دوسری جمع تکسیر۔ جمع سالم یہ ہے کہ حق تعالیٰ حال کے غلبے میں وجد کی قوت اور شوق کی بے قراری پیدا کر دے اور خود حق تعالیٰ بندے کا محافظ ہو اور اپنا حکم اس کے ظاہر حال پر جاری کر کے اس کو اپنے امر کے ادا کرنے کی توفیق دے اور اس کو مجاہدے سے آراستہ کر دے، جیسا کہ سہل بن عبد اللہ و ابوحفص حداد و ابو العباس سیاری مروزی امام ہر دو صاحب مذہب بایزید بسطامی و ابوبکر شبلی و ابوالحسن حصری اور بڑے دوسرے مشائخ میں سے ایک جماعت رحمہم اللہ تعالیٰ و قدس اللہ ارواحہم ہمیشہ مغلوب الحال رہتے تھے لیکن جب نماز وقت آتا تو حالت صحو میں ہو جاتے تھے، جب فارغ ہو جاتے تو پھر مغلوب الحال ہو جایا کرتے تھے، اس لیے کہ جب تک تو تفرقہ کی حالت میں ہو گا تو تو ہو گا اور امر الٰہی کو ادا کرے گا اور جب حق سبحانہ، تجھے اپنے حکم سے اپنی طرف جذب کرے گا تو زیادہ مناسب ہے کہ تجھ پر نگاہ رکھے، دو امور کے لیے۔ اوّل، اس لیے کہ بندگی تجھ سے ساقط نہ ہو دوسرے، اس لیے کہ اپنے اس وعدے کے حکم پر قائم رہے کہ محمد ﷺ کی شریعت کو کبھی منسوخ نہیں کروں گا۔

جمع تکسیر یہ ہے کہ بندہ حکم میں بے خود اور مدہوش ہو جائے اور اس کا حکم مجنونوں کا سا ہے، پس مجذوب مدہوش تو اس عمل و مجاہدے سے معذور ہو گا اور مجذوب باہوش عمل کرنے پر مشکور و مقبول۔ جو مشکور ہو گا، اس حال معذور کی نسبت زیادہ قوی ہو گا۔ الغرض جاننا چاہیے کہ جمع کا کوئی خاص مقام نہیں اور نہ کوئی علیحدہ حال ہے کیونکہ جمع سے مراد اپنے امر مطلوب میں اپنے ارادے و ہمت کو جمع کر لینا ہے۔ ایک گروہ کو اس امر کا کشف مشاہدہ اور مقامات طریقت میں ہوتا ہے اور دوسرے گروہ کو اس کا مشاہدہ احوال طریقت میں اور دونوں وقتوں میں صاحب جمع کی مراد حاصل شدہ مراد کی نفی کرنا ہے، کیونکہ تفرقے سے مراد علیحدگی اور جمع سے مراد اتصال و قربِ حق ہے اور یہ سب اُمور میں درست ہے، چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی ہمت کا حضرت یوسف علیہ السلام پر جمع ہونا حتیٰ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے سوا آپ کا کوئی ارادہ اور مقصود ہی نہ رہا تھا، اسی طرح مجنوں کے قصد کا لیلیٰ پر جمع ہونا سارے عالم میں لیلیٰ کے سوا کسی اور کو نہ دیکھنا تھا اور ایسی بہت سی مثالیں ہیں جہاں طالب کا ارادہ ایک نکتے پر مرتکز رہتا ہے، جیسا کہ

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ ایک روز اپنے عبادت خانے میں بیٹھے تھے کہ ایک آدمی نے آکر پوچھا: "کیا حضرت بایزید بسطامی گھر میں ہیں؟" تو حضرت بایزید نے فرمایا: "اللہ کے سوا گھر میں کوئی نہیں"۔ ایک اور بزرگ (اللہ ان سے راضی ہو) فرماتے ہیں کہ ایک درویش مکہ میں آیا اور خانہ کعبہ کے مشاہدے میں ایک سال بیٹھا رہا، نہ کھایا نہ پیا اور نہ سویا نہ طہارت کی، اپنی ہمت و ارادے کو خانہ کعبہ (جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے) کی رویت پر جمع کر دیا، وہی اس کے جسم کی غذا اور جان کا شربت بن گیا تھا۔ ان سب امور کا اصل یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اپنی محبت کا اصل جو ایک جوہر تھا، اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقسیم کر دیا اور اپنے دوستوں میں سے ہر ایک کو اس محبت الٰہی میں اس کی گرفتاری کے مطابق محبت کے کل اجزا میں سے ایک جز کے ساتھ اسے مخصوص کر دیا پھر انسانیت کا جوش، طبیعت کا لباس، مزاج کا پردہ اور روح کا حجاب اس پر ڈال دیا۔ یہاں تک کہ محبت الٰہی کے اس جز نے اپنی قوت سے اس دوست حق کے ہر ایک جز کو جو محبت الٰہی کے اس جز کے ساتھ پیوست اور متصل تھا، اپنی صفت پر کر دیا، حتیٰ کہ وہ دوست حق ہمہ تن مجسمۂ محبت ہو گیا اور اس کی تمام حرکتیں اور ملحوظات اس محبت کے پیوستہ ہونے کی جگہ بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل معانی و لغت نے اس مقام کا نام ہی جمع رکھ دیا ہے اور اسی معنی کے متعلق حسین بن منصور رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ شعر:

(ترجمہ: اے میرے آقا! میرے مولا! میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، اے میرے مقصود اور میرے مطلوب میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، اے میرے وجود کی دونوں آنکھوں کی اصل، اور اے میری ہمت (اے ارادہ) کے منتہی اور اے میری گویائی اور اے میرے اشارات اور اے میرے ایما! اور اے میرے کل وجود کے کل! اور اے میرے کان! اور اے میری بصارت! اور اے میرے جملہ وجود! اور اے میرے عنصر وجود! اور میرے تمام اجزائے بدن! میں تیرے ہر حکم کی تعمیل کے لیے حاضر ہوں)۔

پس جو شخص اپنے اوصاف میں مستعار ہو، اسے اپنے ہستی کا ثابت کرنا اس کے لیے عار ہوتا ہے اور اس کی توجہ دونوں جہاں کی طرف باعث کفر ہوتی ہے اور تمام موجودات اس کے ارادے میں ہیچ و خوار ہوتی ہیں۔ پھر اہل لغت کا ایک گروہ کلام کی باریکی اور عبارت کے عجیب ہونے کو کہتے ہیں کہ جمع الجمع ہے اور یہ کلمہ اَزرُوئے عبارت و تلفظ تو بہت ہی اچھا ہے، لیکن معنی کے لحاظ سے یوں بہتر ہے کہ جمع نہ کہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ جمع سے پہلے تفرقہ ہوتا ہے کہ اس پر جمع کا اطلاق درست ہو۔ جمع کی جمع کیسے ہو سکتی ہے؟ کیونکہ جمع تو تفرقہ کی ہوتی ہے اور جمع اپنے حال اور کیفیت سے نہیں بدلتی اور یہ عبارت محل نظر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے صاحب جمع جس کا قصد ایک امر پر جمے ہوا اپنے سے باہر، اوپر اور نیچے نہیں دیکھ سکتا۔ کیا تو نے دیکھا نہیں کہ شب معراج میں دونوں جہاں پیغمبر ﷺ کو دکھا دیئے لیکن آپ نے کسی چیز کی طرف التفات نہیں کیا، کیونکہ آنحضرت ﷺ مقام جمع میں تھے اور ایک ہی امر یعنی مشاہدۂ ذات حق پر اپنا ارادہ جمع کیے ہوئے تھے اور ایک مجتمع کے لیے تفرقہ یعنی ماسویٰ اللہ کا مشاہدہ ممکن نہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ نہ تو حضور ﷺ کی نگاہ تجلیاتِ حق سے اِدھر اُدھر پلٹی اور نہ ہی آگے بڑھی بلکہ عین تجلیات پر گڑی رہی۔ میں نے اسی معنی کے متعلق ابتدائے حال میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "کتاب البیان لاہل العیان" رکھا ہے اور کتاب بحر القلوب کے باب جمع میں بھی میں نے ایک طویل فصل بیان کی ہے۔ ان میں سے فرقہ سیاریہ کا طریقہ یہ ہے، جو میں نے بیان کر دیا ہے۔ اب اس گروہ کے قول کی طرف رجوع کرتا ہوں، جن سے ملحدین

اپنے آپ کو وابستہ کرتے ہیں۔ ان کی عبارات کو اپنے الحاد کے ظاہر کرنے کا ذریعہ بناتے اور اپنے آپ کو ان کی عزت میں ذلیل کرتے ہیں تاکہ ان لوگوں کی غلطیوں کے مقام ظاہر ہو جائیں اور مرید ان کے دعووں سے پرہیز کریں اور اپنے آپ کی حفاظت کریں۔ سارا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔
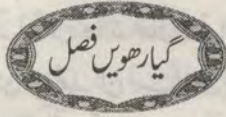
فرقۂ حلولیہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "حق کے بعد سوائے گمراہی کے اور کیا چیز ہے؟" ان دو مردود گروہوں میں سے جو اس طائفۂ حلولیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کو اپنی گمراہی میں اپنے مددگار بناتے ہیں۔ ایک گروہ ابی حلمان دمشقی سے عقیدت رکھتا ہے اور اس سے روایات بیان کرتا ہے، لیکن وہ روایتیں دراصل اسی طرح نہیں جو مشائخ کی کتابوں میں اس کی طرف سے منسوب ہیں۔ اس طریقے کے پیرو اس بزرگ ابی حلمان دمشقی کو اہل لہ یعنی جذب و بے خودی میں سے سمجھتے ہیں لیکن وہ ملحدین اس کو عقیدہ حلول و امتزاج اور ارواح کے دوسرا جسم تبدیل کرنے کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ میں نے کتاب مقدس میں بھی دیکھا ہے کہ اس میں اس عقیدہ پر طعن کیا ہے اور علمائے اصول کو بھی اس سے ایک خیال پیدا ہو گیا ہے اور خدائے تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ ایک دوسرا گروہ ہے جو اپنے اقوال کو فارس کی طرف منسوب کرتا ہے اور وہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ حسین بن منصور کا مذہب ہے حالانکہ ان کے سوا ہم نشینان حسین میں سے کسی کا بھی یہ مذہب نہیں، چنانچہ میں نے ابو جعفر صیدلانی کو اور چار ہزار آدمیوں کو جو عراق میں پھیلے ہوئے ہیں، دیکھا ہے کہ جو سب حلاجی تھے۔ وہ سب فارس کو اس قول کی وجہ سے لعنت کرتے تھے اور حسین بن منصور کی کتابوں میں بھی جو اُن کی تصنیف ہیں، سوائے تحقیق کے اور کچھ نہیں۔ میں علی بن عثمان جلابی (اللہ ان سے راضی ہو) کہتا ہوں کہ میں نہیں جانتا کہ فارس اور حلمان کون ہوئے ہیں اور انہوں نے کیا کہا ہے؟ لیکن جو شخص ان اقوال کا قائل ہو جو توحید الٰہی و تحقیق کے خلاف ہیں، اس کو دین میں کچھ حصہ حاصل نہیں اور جب دین جو اصل ہے، مضبوط نہ ہو تو تصوف جو اس دین کی فرع اور نتیجہ ہے، زیادہ مناسب ہے کہ اس میں زیادہ خلل ہو کیونکہ کرامات کا ظاہر ہونا، دلائل عرفان کا کشف اہلِ دین و اہلِ توحید کے سوا کسی اور پر ممکن نہیں اور جن لوگوں کو روح کے متعلق غلطیاں واقع ہوئی ہیں۔ اب میں اس کے تمام احکام سنت کے قانون کے مطابق بیان کرتا ہوں اور ملحد لوگوں کے اقوال اور ان کے مغالطے اور شبہات بھی بیان کرتا ہوں تاکہ اللہ تمہیں قوی کرے۔ اس بیان سے قوت حاصل ہو کیونکہ ان مغالطوں اور شبہات میں بہت فساد ہے اور توفیق اللہ کے قبضے میں ہے۔

پہلی بحث

رُوح کی تحقیق

جان لو کہ رُوح کی ہستی کے متعلق علم کا ہونا ضروری ہے اگرچہ اس کی کیفیت اور اصل حقیقت معلوم کرنے میں عقل عاجز ہے، کیونکہ یہ عالم امر کی ایک غیر مرئی چیز ہے جس کی حقیقت کا صحیح علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ تاہم اُمت کے علماء و حکماء میں سے ہر ایک نے اپنے علم و قیاس کے مطابق اس کے متعلق بہت کچھ کہا ہے اور کافروں کے گروہوں نے بھی اس میں کلام کیا، چنانچہ کفار قریش نے یہودیوں کے کہنے سے نضر بن حارث کو بھیجا کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے

رُوح کی کیفیت اور ماہیت دریافت کرے تو اللہ تعالیٰ نے پہلے اس کے عین وجود کو ثابت کیا اور فرمایا: ”وہ قریش آپ سے روح کی بابت دریافت کرتے ہیں۔“ پھر اس کے قدیم ہونے کی نفی کی اور فرمایا: ”کہہ دیجیے، روح میرے پروردگار کا حکم ہے“۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا ہے: ”ارواح بے شمار جمع کیے ہوئے لشکر ہیں۔ پس ان میں جو عالم ارواح میں باہم شناسا ہوئے، وہ دنیا میں بھی باہم اُلفت کرتے ہیں اور جو وہاں ناشناسا تھے، وہ یہاں بھی باہم مختلف رہتے ہیں“۔

پس روح کی ہستی پر ایسی بہت سی دلیلیں ہیں لیکن ان میں اس کی کیفیت و ماہیت کی نسبت کچھ بحث نہیں کی گئی ہے۔ سو ایک گروہ کہتا ہے کہ رُوح وہ زندگی ہے جس سے بدن زندہ ہوتا ہے۔ متکلمین کے ایک گروہ کی بھی یہی رائے ہے۔ اس معنی کی رو سے گویا رُوح ایک عرض ہے۔ جاندار اللہ کے حکم سے اسی کے سبب سے زندہ رہتا ہے اور ا
جاندار میں تالیف، حرکت اور باہم اجزا کا اجتماع اسی کی وجہ سے ہے اور ایسے ہی وہ اعراض جن کی وجہ سے جسم ایک حال سے دوسرے حال کی طرف انتقال کرتا ہے، وہ سب اسی قوتِ حیات کی وجہ سے ہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ روح زندگی کے علاوہ کوئی چیز ہے۔ زندگی اس کے بغیر پائی نہیں جاتی، جس طرح روح بغیر جسم کے پائی نہیں جاتی اسی طرح زندگی بغیر روح کے پائی نہیں جاتی اور یہ کہ ان دونوں، روح و حیات میں کوئی بھی ایک دوسرے کے بغیر نہیں پایا جاتا جیسا کہ درد اور اس کا علم کیونکہ دو چیزیں ہیں، ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں۔ اس معنیٰ کے لحاظ سے بھی روح عرض ہے جیسا کہ زندگی عرض ہے۔ پھر سب مشائخ اور بہت سے اہل سنت و جماعت کی یہ رائے ہے کہ روح ایک جوہر ہے جو قائم بذاتِ خود ہے، نہ وہ وصف کہ جب تک وہ جسم کے ساتھ پیوستہ ہے۔ عادت جاریہ کے مطابق اللہ تعالیٰ اس قالب میں زندگی پیدا کر دیتا ہے اور آدمی کی صفت زندگی ہے اور وہ اسی سے زندہ ہے لیکن اس کے جسم میں روح امانت کے طور پر رکھی گئی ہے اور یہ بھی روا ہے کہ وہ روح آدمی سے جدا ہو جائے اور وہ زندگی کی وجہ سے زندہ رہے، جیسا کہ خواب کی حالت میں روح نکل جاتی ہے اور حیات باقی رہتی ہے لیکن یہ روا نہیں کہ اس روح کے چلے جانے کی حالت میں علم و عقل باقی رہے اور انسان زندوں کی طرح ان سے کام لے سکے۔ اس لیے کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”شہیدوں کی روحیں پرندوں کی پوٹوں میں ہوں گی۔“ اس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ روح ایک جوہر قائم بذات خود ہو۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ ارواح بہت سے لشکر ہیں جمع کیے ہوئے۔ اس لیے لامحالہ وہ لشکر باقی ہوں گے حالانکہ عرض اپنے محل کے بغیر باقی نہیں رہتا کیونکہ وہ قائم بالذات نہیں ہوتا۔ پس روح ایک جسم لطیف ہے، جو فرمانِ الٰہی سے جسم میں آتی اور اسی کے فرمان سے چلی جاتی ہے پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں نے شب معراج میں آدم صفی اللہ و یوسف صدیق و موسیٰ کلیم اللہ و ہارون کلیم اللہ و عیسیٰ روح اللہ اور ابراہیم خلیل اللہ علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کو آسمان میں دیکھا تو لامحالہ وہ ان انبیاء کی ارواح ہی ہوں گی۔ اگر روح عرض ہوتی تو ضرور بذاتِ خود قائم نہ ہوتی اور ہستی کی حالت میں نبی ﷺ اس کو نہ دیکھ سکتے، اس لیے کہ اس کے وجود کے لیے کوئی محل چاہیے تاکہ وہ روح اس کو عارض ہو اور اس کا وہ محل جوہر قائم بذات خود ہو۔ جواہر یعنی اجسام قائم بذات خود سب مرکب اور کثیف ہوتے ہیں، حالانکہ آنحضرت ﷺ نے ان ارواح انبیاء کو اجسام کے ساتھ نہیں دیکھا۔ پس معلوم ہوا کہ روح جسم لطیف ہے اور جب وہ جسم ہے تو اس کا دیکھنا جائز ہے، لیکن دل کی آنکھ سے اور یہ بھی روا ہے کہ ارواح پرندوں کی پوٹوں میں رہیں اور یہ بھی روا ہے کہ وہ ایک لشکر ہوں اور وہ آجا سکتے ہوں۔ چنانچہ احادیثِ صحیحہ اس امر پر ناطق ہیں اور ان کا اجسام میں آنا اور ان سے نکل جانا حکم الٰہی پر موقوف ہے، چنانچہ فرمایا ہے: ”اے رسول (ﷺ)! کہہ دیجیے کہ روح میرے رب کے حکم سے

ہے۔"اب باقی رہا اختلاف ملحدین کا کہ وہ روح کو قدیم کہتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں اور اشیا کا فاعل اور ان کا مدبر اس کے سوا کسی کو نہیں جانتے۔ ان ہی ارواح کو معبود قدیم اور مدبر عالم کہتے ہیں اور ایک جسم سے دوسرے جسم کی طرف پلٹ جانے والا خیال کرتے ہیں۔ جتنا اس شبے پر خلقت کا اجتماع و اتفاق رہا ہے، اتنا کسی اور شبے پر نہیں کیونکہ سب نصاریٰ دراصل اسی بات پر متفق ہیں اگرچہ وہ بیان اس کے خلاف کرتے ہیں۔ اسی طرح سب ہندو، اہل تبت اور چین و ماچین اس بات پر متفق ہیں۔ شیعوں، قرامطیوں اور باطنی لوگوں کا بھی اجتماع اسی پر ہے اور وہ دو گروہ ملحدین کے بھی اسی قول کے قائل ہیں۔ یہ تمام گروہ جو ہم نے بیان کیے ہیں، ان میں سے ہر ایک اسی قول کو ترجیح دیتے ہیں اور دلائل کے ساتھ اس کا دعویٰ کرتے ہیں۔ پس ہم ان سب گروہوں سے پوچھتے ہیں کہ تم اس لفظ "قدیم" سے کیا مراد لیتے ہو، قدیم زمانی یا قدیم ذاتی؟ اگر وہ کہیں کہ قدیم سے ہماری مراد قدیم زمانی ہے تو پھر اختلاف کیسا؟ کیونکہ ہم بھی تو روح کو بدیں معنی قدیم کہتے ہیں کہ زمانے میں کوئی ایسا وقت نہیں تھا جس میں روح موجود نہ تھی۔ حضور اکرم ﷺ کی ایک حدیث سے بھی اجسام پر ارواح کے قدیم زمانی کی تائید ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے: "بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ارواح کو ہزاروں سال پہلے اجسام سے پیدا کیا ہے" پس ثابت ہوا کہ روح اگرچہ زمانے کے لحاظ سے قدیم سہی، ذات اور ماہیت کے لحاظ سے حادث ہے اور ظاہر ہے کہ حادث محدث کے بغیر نہیں ہوتا، بلکہ وہ عدم سے وجود میں آنے میں کسی موجود کرنے والے کا محتاج ہے اور موجود کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ گویا روح اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے ایک جنس ہے، جو دوسری جنس یعنی جسم کے ساتھ پیوستہ ہوتی ہے اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست کرنے سے اللہ تعالیٰ اپنی تقدیر کے مطابق اس میں زندگی پیدا کر دیتا ہے، غرض یہ کہ ارواح مخلوق میں سے ایک جنس ہے اور اجسام دوسری جنس۔ پس جب اللہ تعالیٰ ایک حیوان کی حیات مقدر کرتا ہے تو حکم دیتا ہے کہ روح جسم سے پیوست ہو جائے اور اس میں حیات حاصل ہو جائے لیکن اس روح کا ایک جسم سے دوسرے جسم میں جانا روا نہیں۔ اس لیے کہ جس طرح ایک جسم کے لیے دو زندگیاں روا نہیں، اسی طرح ایک روح کے لیے دو جسم بھی روا نہیں۔

اگر احادیث اس امر پر ناطق نہ ہوتیں اور رسول اللہ ﷺ ہمیں اس کے متعلق خبر نہ دیتے تو محض عقل کی رو سے روح کا مفہوم سوائے حیات کے اور نہ ہوتا اور وہ ایک صفت ہوتی نہ عین قائم بذات خود۔ اور اگر وہ لوگ یوں کہیں کہ ہماری مراد قدم سے ہمیشہ رہنے والا قدیم ہے، جو نہ کسی وقت عدم تھا اور نہ عدم ہوگا، تو ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ وہ قائم بذات خود ہے یا اپنے قیام میں غیر کا محتاج ہے۔ اگر وہ کہیں کہ وہ قدیم قائم بذاتہٖ ہے تو ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ وہ خالق عالم ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہیں کہ وہ عالم کا خالق نہیں تو پھر اس صورت میں خالق عالم کے سوا دوسرے قدیم کا ثابت کرنا لازم آئے گا اور یہ بات عقل سے بعید ہے، کیونکہ قدیم ذاتی کی نہ ابتدا و انتہا ہوتی ہے اور نہ وہ کسی میں محصور ہوتا ہے حالانکہ یہاں ایک قدیم کے وجود و ذات کی ابتدا و انتہا ہوتی ہے اور نہ وہ کسی میں محصور ہوتا ہے حالانکہ یہاں ایک قدیم کے وجود و ذات کی ابتدا دوسرے سے ہے اور اسی میں محصور ہے اور یہ محال ہے، لہٰذا روح کا قدیم بالذات ہونا بھی محال ہے کیونکہ جس شے کے لیے ابتدا و انتہا ہو اور اس پر کسی شے نے احاطہ کیا ہو، وہ قدیم نہیں حادث ہوتی ہے اور اگر وہ کہیں کہ وہ خالق عالم ہے تو ہم کہتے ہیں پس وہ قدیم ہے اور خلق حادث۔ یہ محال ہے کہ حادث قدیم کے ساتھ یا اس میں سرایت کرے یا حادث قدیم کا محل اور موصوف ہو کیونکہ جو چیز کسی دوسری سے پیوست ہوتی ہے، وہ وہی ہوتی ہے۔ دوسرا یہ کہ ملنا اور جدا ہونا یہ حادث کے سوائے کسی اور چیز پر روا نہیں کیونکہ حادث چیزیں سب ایک دوسرے کی ہم

جنس ہیں اور اللہ تعالیٰ بہت بلند ہے۔ اگر وہ کہیں کہ وہ قائم بذات خود نہیں بلکہ اس کا قیام غیر کے ساتھ ہے تو یہ دعویٰ دو باتوں سے خالی نہیں، یا تو وہ ایک صفت ہوگا یا عرض۔ اگر وہ کہیں کہ عرض ہے تو لا محالہ اسے یا کسی محل کے اندر ماننا پڑے گا یا لا محل کے اندر اور اگر محل کے اندر کہیں تو اس کا وہ محل بھی اسی طرح کا عرض اور قائم بغیر ہوگا۔ اس صورت میں پھر قدیم کا اطلاق ان میں سے کسی پر بھی روا نہیں اور اگر محل کے اندر کہیں تو یہ بھی محال ہے کیونکہ جب عرض قائم بذاتِ خود نہیں ہوتا تو لا محل کے اندر اس کا قیام عقل میں نہیں آسکتا۔ اگر وہ کہیں کہ وہ صفت قدیم ہے جیسے اہل تناسخ اور حلولیہ کہتے ہیں اور پھر اس کو حق تعالیٰ کی صفت قرار دیتے ہیں تو یہ محال ہے کہ حق تعالیٰ کی صفت قدیم حادث مخلوق کی صفت ہو جائے، ورنہ پھر یہ بھی روا ہوگا کہ اس کی قدرت مخلوق کی قدرت ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کی یہ صفت قدیم مخلوق کی صفت ہو تو لا محالہ وہ اس سے متصف ہوگی، حالانکہ یہ محال ہے کہ صفت قدیم کا موصوف حادث ہو۔ اس لیے لا محالہ قدیم کا حادث کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا، لہٰذا ملحد لوگوں کے تمام اقوال روح کے متعلق باطل ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ روح مخلوق ہے اور اس کے حکم سے ہے اور جو شخص اس کے سوا کچھ اور کہے، وہ کھلا مکابرہ ہے بلکہ وہ شخص حادث و قدیم میں فرق ہی نہیں کرسکتا اور یہ ہرگز روا نہیں کہ ولی اپنی ولایت کے صحیح ہونے کی حالت میں حق تعالیٰ کے اوصاف سے جاہل ہو۔ پس اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہم کو بدعت اور خطرۂ نفسانی سے محفوظ رکھا اور عقل دی کہ جس سے ہم اس کے مصنوعات میں غور اور استدلال کرتے ہیں اور ہمارے دل کو ایمان کے نور سے منور کیا جس سے ہم اسے پہچان لیتے ہیں اور وہ ایسی حمد وثنا کے لائق ہے کہ جس کی انتہا نہ ہو کیونکہ حمد متناہی نعت لامتناہی کے مقابلے میں مقبول نہیں ہوتی اور جب اہل ظاہر نے یہ حکایت اہل اصول سے سن لی تو انہوں نے خیال کر لیا کہ سب اہل تصوف کا یہی عقیدہ ہے، یہاں تک کہ اسی بھاری غلطی اور ظاہری خسارے کی وجہ سے وہ اہل خیر صوفیائے کرام کے جمال سے حجاب میں ہوگئے اور ولایت الٰہی کا لطیفہ اور ربانی تجلیات کے شعلے ان سے پوشیدہ ہوگئے، اس لیے کہ طریقت کے بزرگوں اور سرداروں کے نزدیک خلقت کا اُنہیں رّد کر دینا یا قبول کر لینا برابر ہے، واللہ اعلم۔

دوسری بحث

رُوح کے متعلق مشائخ کے اقوال

ایک شیخ فرماتے ہیں (اللہ تعالیٰ ان پر رحمت کرے) کہ روح جسم میں ایسی ہے جیسے آگ لکڑی میں۔ پس آگ مخلوق ہے اور کوئلہ مصنوعی چیز اور حق تعالیٰ کی ذات و صفات کے سوا کسی چیز پر قدم کا اطلاق روا نہیں۔ مشائخ میں سے حضرت ابو بکر واسطی رحمتہ اللہ علیہ نے روح کے متعلق بہت کلام کیا ہے۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ ارواح کے دس مقامات ہیں:

اوّل: خطا کاروں کی ارواح جو تاریکی میں بند کی ہوئی ہیں اور وہ نہیں جانتیں کہ آخرت میں ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔

دوم: پرہیز گاروں کی ارواح جو پہلے آسمان میں ہیں۔ اپنے اچھے اعمال کے باعث خوش و خرم ہیں، اپنی عبادت کی وجہ سے مسرور اور ان کی قوت سے سیر کرتی ہیں۔

سوم: مریدانِ حق کی ارواح جو چوتھے آسمان پر اپنے صدقِ معاملہ کی لذت اور اپنے اعمال صالحہ کے سائے میں

فرشتوں کے ساتھ رہتی ہیں۔

چہارم: اہل احسان کی ارواح جو نور کی قندیلوں میں عرش کے نیچے لٹکی ہوئی ہیں۔ ان کی غذا رحمتِ الٰہی، شربتِ لطف اور قربِ حق ہے۔

پنجم: اہل وفا کی ارواح جو صفا کے حجاب اور برگزیدگی کے مقام میں خوش رہتی ہیں۔

ششم: شہیدوں کی ارواح جو بہشت میں بہشتی پرندوں کی پوٹوں میں رہتی ہیں اور جنت کے باغوں میں جہاں چاہیں، وقت بے وقت جاتی رہتی ہیں۔

ہفتم: عاشقانِ الٰہی کی ارواح جو صفات حق کے نوری پردوں میں ادب واحترام کے فرشوں پر قیام پذیر ہیں۔

ہشتم: عارفانِ الٰہی کی ارواح جو بارگاہ قدس میں رہتی ہیں اور صبح و شام کلام حق تعالیٰ سنتی اور بہشت و دنیا میں اپنے مکانات کو دیکھتی رہتی ہیں۔

نہم: اولیاء اللہ کی ارواح جو جمال الٰہی کے مشاہدہ اور کشف حقیقت کے مقام میں ہمیشہ غرق رہتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چیز کو نہیں جانتیں اور نہ کسی اور چیز سے آرام پاتی ہیں۔

دہم: درویشوں کی ارواح جو فنا کے محل میں قرب حاصل کیے ہوئے ہیں۔ ان کے اوصاف واحوال تبدیل ہوگئے ہیں اور وہ جمال سرمدی سے لطف اندوز ہو رہی ہیں۔

مشائخ سے روایت کرتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک نے ارواح کو ان مدارج اور ان کے احوال کی جدا جدا صورت میں دیکھا ہے اور یہ روا ہے۔ اس لیے کہ ہم نے کہا ہے کہ روح موجود ہے اور ایک لطیف جسم ہے، سو اس قابل ہے کہ دیکھی جائے اور حق تعالیٰ جب اور جس طرح چاہے، اسے اپنے برگزیدہ بندوں کو دکھا دیتا ہے۔

میں علی بن عثمان جلابی کہتا ہوں کہ ہماری زندگی اور ہمارا قیام و ثبات سب اللہ تعالیٰ کے سبب سے ہے اور ہمیں زندہ رکھنا بھی اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور اسی کے پیدا کرنے اور حکم کی وجہ سے ہم زندہ ہیں، نہ کہ اس کی ذات و صفات کی وجہ سے۔ ملاحدہ اور روحیوں کے تمام اقوال جو روح کے متعلق ہیں، سب غلط اور باطل ہیں اور لوگوں میں منجملہ اور بڑی بڑی گمراہیوں کے ایک گمراہی یہ بھی ہے کہ وہ روح کو قدیم کہتے ہیں اگرچہ عبارت کو انہوں نے تبدیل کر دیا ہے۔ ان میں سے ایک گروہ اسے نفس اور ہیولیٰ کہتا ہے، دوسرا گروہ نور و ظلمت۔ طریقت کے جھوٹے مدعی فنا یا بقا یا جمع و تفرقہ کہتے ہیں اور ایسی ہی طمع کی ہوئی جھوٹی اور بے اصل عبارات بنا کر ان سے اپنے قول کی تزئین کرتے ہیں حالانکہ صوفی لوگ اس گروہ ملحدین سے بیزار ہیں، کیونکہ ولایت اور محبت الٰہی کی حقیقت کا ثابت کرنا اللہ تعالیٰ کی معرفت کے سوا درست نہیں۔ جب کوئی شخص قدیم اور حادث میں تمیز نہ کر سکے تو جو کچھ وہ کہتا ہے، جہالت کی وجہ سے کہتا ہے اور عقلمند لوگ جاہلوں کی باتوں کی طرف رغبت نہیں کیا کرتے۔ ان دونوں جھوٹے گروہوں کے خیالات کا اور ان دونوں باطل فرقوں کا جو مقصود تھا، وہ کسی حد تک گزشتہ دو فصلوں میں بیان ہو چکا اور اگر اس سے زیادہ معلوم کرنے کی ضرورت ہو تو میری دوسری کتابوں میں تلاش کرنا چاہیے کیونکہ یہاں طوالت مقصود نہیں۔ اب میں حجابوں کا اٹھ جانا، معاملاتِ طریقت کے ابواب، اہل تصوف کے حقائق عقلی اور نقلی دلیلوں کے ساتھ اس کتاب میں بیان کرتا ہوں تاکہ مقصود کے جاننے کا طریق تم پر آسان ہو جائے اور منکرین میں سے جس کو دلی بصیرت حاصل ہو، اس راہِ طریق کی طرف واپس آجائے اور مجھے اس کے سبب سے دُعائے خیر اور ثواب حاصل ہو، اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہو۔

پندرھواں باب

معرفت الٰہی میں پردے کا کھولنا

اللہ جل و علا نے فرمایا ہے: "ان لوگوں نے اللہ تعالےٰ کی قدر نہیں جانی جیسا کہ اس کی قدر کرنی چاہیے تھی۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: "اگر تم اللہ تعالیٰ کو پہچان لیتے جیسا کہ اس کے پہچاننے کا حق ہے تو سمندروں پر پاؤں پاؤں چلتے اور تمہاری دُعا سے پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جاتے۔" پس خدائے غالب و بزرگ کی معرفت دو قسم کی ہے: ایک علمی اور دوسری حالی۔ معرفت علمی دنیا و آخرت کی تمام نیکیوں کی طرف رہنمائی کرنے والی ہے اور اپنے اوقات و احوال میں بندہ کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز اللہ تعالےٰ کی معرفت ہے جیسا کہ اللہ غالب و بزرگ نے فرمایا ہے: "ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت یعنی معرفت الٰہی کے لیے پیدا کیا ہے۔" لیکن بہت سے لوگ اس بارے میں کوتاہی کر رہے ہیں اور اپنی پیدائش کی غرض و غایت سے غافل ہیں۔ سوائے ان اولیاء اللہ کے جنہیں اللہ تعالےٰ نے برگزیدہ کر لیا اور دنیا کی تاریکیوں سے انہیں رہائی بخشی ہے اور ان کے دلوں کو اپنی معرفت سے زندہ کر دیا ہے، چنانچہ اللہ تعالےٰ نے حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ کے حال سے ہمیں خبر دی ہے اور فرمایا ہے: "ہم نے اس کے لیے روشنی پیدا کر دی ہے جس کی وجہ سے وہ لوگوں میں چلتا ہے" اور ابو جہل ملعون کے حال سے خبر دی اور فرمایا: "اس کا حال اس شخص کی مانند ہے جو تاریکیوں میں گھرا ہوا اور باہر نہ نکل سکتا ہو۔" پس معرفت الٰہی سے دل کی زندگی ہے اور ماسویٰ اللہ سے رُوگردانی ہر شخص کی قیمت ہوتی ہے کیونکہ جس کو معرفت حق حاصل نہیں، اس کی کوئی قیمت نہیں۔ پس علماء و حکماء و فقہا وغیرہ اہل علم اللہ تبارک و تعالےٰ کے متعلق صحیح علم کو معرفت کہتے ہیں اور مشائخ صوفیا خداوند تعالےٰ کے ساتھ حال کے صحیح ہونے کو معرفت کہتے ہیں اور اسی وجہ سے معرفتِ الٰہی کو علم حق تعالیٰ سے افضل کہتے ہیں کیونکہ حال کا صحیح ہونا علم کے صحیح ہونے کے بغیر نہیں ہو سکتا اور علم کے صحیح ہونے سے صحیح حال نہیں ہوتا یعنی جو شخص اللہ تعالےٰ کا علم صحیح نہ رکھتا ہو وہ عارف صحیح الحال نہیں ہو سکتا، لیکن جو عارف صحیح الحال نہ ہو، وہ حق تعالےٰ کا عالم ہو سکتا ہے اور دونوں گرہوں میں سے جو لوگ اس حقیقت سے ناواقف تھے، انہوں نے اس امر کے متعلق بے فائدہ مناظرے کیے ہیں، چنانچہ علماء کے اس گروہ نے صوفیاء کے اس گروہ علماء کا انکار کر دیا اور اب میں اس مسئلے کا بھید ظاہر کرتا ہوں تاکہ دونوں گروہوں کو فائدہ پہنچے، ان شاءاللہ۔

معرفتِ الٰہی کے متعلق اختلاف

جان لو (اللہ تعالیٰ تمہیں سعادت مند کرے) کہ خداوند تعالےٰ کی معرفت اور اس کے متعلق صحیح علم رکھنے کے بارے میں لوگوں کا بہت اختلاف ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی معرفت عقل سے حاصل ہوتی ہے اور سوائے عقلمند کے اس کی معرفت کسی کو روا نہیں، لیکن یہ قول بوجوہ باطل ہے اس لیے کہ جو دیوانے دارالاسلام میں داخل ہوتے ہیں، ان کا حکم معرفت کا حکم ہوتا ہے اور دوسرے وہ لڑکے جو عاقل نہیں ہوتے، ان کا حکم ایمان کا حکم

ہوتا ہے کیونکہ اگر معرفت عقل سے ہوتی تو ان کو جو عقل نہیں رکھتے، معرفت کا حکم نہ ہوتا اور کافروں کو جو عقل حاصل ہے، انہیں کفر کا حکم نہ ہوتا۔ اسی طرح عقل معرفت کی علت ہوتی تو چاہیے تھا کہ جو عقلمند ہوتا، وہ عارف ہوتا اور سب بے عقل ہوتے اور یہ کھلا مکابرہ ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ معرفت الٰہی کی علت استدلال ہے اور استدلال کرنے والے کے سوا کسی اور کو معرفت کا حاصل ہونا روا نہیں اور یہ قول بھی باطل ہے ابلیس کی وجہ سے کہ اس نے بہت سے دلائل، مثلاً بہشت و دوزخ و عرش و کرسی وغیرہ دیکھے اور سب کا دیکھنا اس کے لیے معرفت کی علت نہ ہوا۔ دوسرے یہ کہ خداوند تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ "اگر ہم کفار پر بجائے پیغمبروں کے فرشتے نازل کرتے اور مردے ان سے باتیں کرتے اور ہم دنیا بھر کی نعمتیں ان کے سامنے جمع کر دیتے تو بھی وہ ایمان نہ لاتے مگر جب کہ مشیت الٰہی میں ہوتا۔" پس ثابت ہوا کہ اللہ تعالےٰ کی معرفت کے لیے فقط دلائل اور آیاتِ ربانی کا دیکھنا علت نہیں، اس لیے کہ اگر آیات و دلائل کا دیکھنا اور ان سے استدلال کرنا بھی معرفت الٰہی کی علت ہوتا تو اللہ تعالےٰ اپنی معرفت کی علت اسی کو قرار دیتا نہ کہ اپنی مشیت کو، اور اہل سنت و جماعت کے نزدیک عقل کا صحیح ہونا اور آیت و دلیل کا دیکھنا معرفت کا سبب ہے نہ کہ معرفت کی علت۔

جان لو کہ معرفت الٰہی کی علت عنایت و مشیت الٰہی کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ اس کی عنایت کے بغیر عقل نابینا ہے۔ اس لیے کہ عقل اپنی نسبت خود جاہل ہے اور کسی عقل مند نے آج تک اس کی حقیقت کو نہیں پہچانا ہے اور جب وہ اپنی نسبت جاہل ہے تو وہ اپنے غیر کو کس طرح پہچانے گی اور اللہ بزرگ و بلند کی عنایت و رہنمائی کے بغیر محض دلیل سے استدلال کرنا اور اس میں غور کرنا بھی خطا ہے کیونکہ سب اہل ہوا اور ملحدوں کے گروہ استدلال ہی کیا کرتے ہیں لیکن اکثر ان میں سے عارف نہیں۔ پھر جو شخص اہل عنایت میں ہے، اس کی سب حرکتیں معرفت کی علامت ہیں اور ان کا استدلال طلب حق ہے اور ترکِ استدلال تسلیم اور معرفت الٰہی کے صحیح ہونے میں تسلیم طلب سے بہتر نہیں ہوتی کیونکہ طلب حق ایک اصل ہے جس کا ترک کرنا جائز نہیں اور تسلیم ایک ایسا اصل ہے کہ اس میں اضطراب و بے چینی کی صورت نہیں اور ان دونوں کی حقیقت معرفت نہیں درحقیقت جاننا چاہیے کہ بندے کا حقیقی رہنما اور دل کھولنے والا سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں۔ اللہ تعالےٰ ان تمام باتوں سے پاک اور بلند تر ہے جن کی ظالم اس کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ رہا عقل اور دلائل سے استدلال کرنا تو قرآن کی رُو سے یہ ہدایت و رہنمائی کا مجاز نہیں جیسا کہ عقل و استدلال سے ہدایت حاصل نہیں ہوسکتی جب تک خدا کی تائید و توفیق شامل حال نہ ہو، جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے: "اگر وہ کفار دنیا میں واپس لوٹا دیئے جائیں تو پھر بھی وہی برے کام کریں گے جن سے ان کو روکا گیا تھا۔" اسی طرح جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے لوگوں نے معرفت کی نسبت پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ "میں نے اللہ تعالےٰ کو اس کے فضل سے پہچانا اور غیر اللہ کو اللہ کے نور سے پہچانا۔" پس خدا تعالےٰ نے جسم کو پیدا کیا اور اس کی زندگی روح سے متعلق کر دی اور دل کو پیدا کیا تو اس کی زندگی اپنے متعلق فرما دی۔ پس جب عقل اور دلیل کو جسم کے زندہ کرنے کی طاقت نہیں تو محال ہے کہ وہ دل کو زندہ کر سکے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "کیا وہ شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اس کو زندہ کر دیا۔" اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اس میں زندگی کا تعلق اپنی طرف ظاہر فرمایا۔ پھر یوں ارشاد فرمایا: "اور ہم نے اس کے لیے نور پیدا کیا جس کے ذریعے سے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے۔" یعنی اس نور کا پیدا کرنے والا جس میں ایمانداروں کی روشنی ہے، میں ہی ہوں، نیز فرمایا: "پس کیا وہ شخص

جس کا سینہ اللہ تعالےٰ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے اور اس وجہ سے وہ اپنے پروردگار کی طرف سے روشنی حاصل کیے ہوئے ہے۔" اس میں دل کے کھولنے کو اپنی ذات سے متعلق فرمایا اور اسی طرح دل کے باندھنے کو بھی اپنے فعل سے متعلق کیا اور فرمایا: "اللہ تعالےٰ نے مہر لگا دی ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہیں۔" نیز فرمایا: "آپ اس شخص کا حکم نہ مانیے جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے۔" جب دل کو قبض کرنا، کشادہ کرنا اور کھولنا اور اس پر مہر لگانا اللہ تعالےٰ ہی سے تعلق رکھتا ہے تو محال ہے کہ اپنی ذات کے سوا کسی اور کو رہنما سمجھے کیونکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے سوا ہے، وہ سب علت وسبب ہے اور علت وسبب مسبب کی عنایت کے بغیر ہرگز رہنمائی نہیں کر سکتے کیونکہ تمام حجاب رہزن ہوتے ہیں نہ کہ رہبر۔

نیز اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے: "لیکن اللہ تعالےٰ نے ایمان کو تمہارے دلوں میں محبوب کر دیا ہے اور اس کو تمہارے دلوں میں زینت دے دی ہے" اور اس آیۂ کریمہ میں اللہ تعالےٰ نے تزئین[1] اور تحبیب[2] کو اپنی طرف نسبت دی ہے اور تقوی کا لازم کرنا جو عین معرفت الٰہی ہے، وہ بھی حق تعالےٰ کی طرف سے ہے چنانچہ متقی کو تقوی کے اپنے اوپر لازم کرنے یا نہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ پس حق سبحانہٗ تعالےٰ کی توفیق کے بغیر معرفت الٰہی میں سے لوگوں کا حصہ عجز کے سوا اور کچھ نہیں۔ ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ فرماتے ہیں: "اللہ تعالےٰ کی معرفت پر اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی رہنما نہیں" علم تو صرف اس لیے حاصل کیا جاتا ہے کہ کام کرنے کے آداب معلوم ہو جائیں نہ اس لیے کہ اس سے معرفت الٰہی حاصل ہو جائے اور مخلوقات میں سے کسی کو بھی یہ قدرت نہیں کہ وہ کسی کو خدا تک پہنچا دے ورنہ استدلال میں کوئی ابوجہل سے زیادہ عقلمند نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی دلیل محمد مصطفےٰ ﷺ سے بڑھ کر ہو سکتی ہے، لیکن چونکہ ابوجہل کے لیے بدبختی کا حکم جاری ہو چکا تھا، اس لیے حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کی رہنمائی اس کو کوئی نفع نہ دے سکی اور یاد رکھو کہ استدلال کا پہلا درجہ ہی حق تعالےٰ سے رُوگردانی ہے، کیونکہ دلیل لانا غیر اللہ میں تامل کرنا ہے اور معرفت الٰہی کی حقیقت اس کے برعکس غیر حق تعالیٰ سے اعراض کرنا ہے۔ دوسرے یہ کہ تمام مطلوبات کا وجود استدلال کی وجہ سے ہوتا ہے اور معرفت الٰہی عادت کے خلاف ہے۔ پس معرفت الٰہی عقل کی ہمیشہ کے لیے حیرانی کے سوا کچھ نہیں اور عنایت الٰہی کا حاصل ہونا بندے کے کسب میں نہیں کیونکہ بندے کے کسب وفعل کو اس کے حصول میں کوئی دخل نہیں اور اس کی تائید و توفیق کے سوا بندے کا کوئی رہنما نہیں۔ وہی ہے جو غیب کے ہاتھوں سے دلوں کے قفل کھولتا ہے، اس لیے جو کچھ حق تعالیٰ کے سوا ہے، سب حادث ہے اور یہ روا ہے کہ حادث اپنے جیسے حادث تک پہنچ جائے، لیکن وہ روا نہیں کہ وہ اپنے خالق تک پہنچ جائے ورنہ اس صورت میں خالق اس کے کسب سے حاصل ہوگا اور جو کچھ کسب کے تحت آ جائے تو اس کا کسب اس پر غالب ہوتا ہے اور اس کا کسب کیا ہوا مغلوب۔ پس کرامت یہ نہیں کہ عقل فعل کو دیکھ کر فعل کی ہستی کو ثابت کرے بلکہ کرامت یہ ہے کہ وہ حق تعالےٰ کے نور سے اپنی ہستی کی نفی کرے۔ پس ایک کو قال کی معرفت حاصل ہوگی اور دوسرے کو حال کی۔ اس ایک (عقل کے ذریعہ سے ہستی فاعل کو ثابت کرنے والے) کو معرفت قال (تقریری معرفت) حاصل ہوگی اور دوسرے (نورِ الٰہی) سے اس کی ہستی کو ثابت کرنے والے) کو معرفت حال (اصلی معرفت) حاصل ہوگی۔ جس چیز کو ایک دوسرا گروہ معرفت کی علت جانتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ عقل ہے تو اس سے پوچھو کہ عقل دل میں حقیقی معرفت میں سے کس چیز کو ثابت کرتی ہے کیونکہ جس چیز کو

[1] زینت بخشنا [2] محبوب بنانا

عقل ثابت کرتی ہے، معرفت الٰہی تو اس کی نفی کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ دل میں عقل کی دلالت سے متصور ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ یہ ہے، درحقیقت اللہ تعالےٰ اس کے خلاف ہے۔ اگر اس کے خلاف کوئی اور چیز مقصود ہو تو وہ بھی اس کے خلاف ہے۔ پس یہاں عقل کی کیا مجال ہے کہ اس کے دلیل پیش کرنے سے معرفت الٰہی حاصل ہو اس لیے کہ عقل اور وہم دونوں ایک جنس ہیں اور جہاں جنس ثابت ہو جائے، وہاں معرفت منفی ہو جاتی ہے۔ پس عقل کے استدلال سے معرفت حق کو ثابت کرنا تشبیہ ہے اور عقل کے استدلال کی نفی کرنا تعطیل ہے اور اس عقل کی جولاں گاہ سوائے ان دو اصلوں کے اور کوئی نہیں اور یہ دونوں کے دونوں معرفت ناشناس ہیں کیونکہ مشبہ اور معطل موحد نہیں ہوتا۔ پس جب عقل امکان بھر کوشش کے باوجود اللہ تعالےٰ کی معرفت میں کامیاب نہ ہوئی، بلکہ جو کچھ اس سے ظاہر ہوا، وہ خود اس کا وہم تھا تو دوستانِ حق کے دلوں کو اس کی طلب کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ سو وہ عاجزی کی درگاہ پر بغیر کسی آلے کے آرام پذیر ہوئے اور اپنے آرام میں بے آرام ہو گئے اور عاجز ہو کر انہوں نے اپنے دلوں کے لیے مرہم تلاش کی۔ دراصل ان کا راستہ طلب کی اقسام اور ان کی قدرت دونوں سے پوشیدہ تھا۔ ایک طرف تو ان کی قدرت اس راستے سے آگاہ نہ تھی، دوسری طرف طلب کی گوناگوں اقسام اس راہ سے ناآشنائے محض تھیں۔ پس قدرت حق تعالےٰ یہاں ان کی قدرت بن گئی یعنی انہوں نے خود اس کی مہربانی سے اس کی طرف راہ پالی اور اسی طرح اس سے دُوری اور غیبت کے رنج سے آسودہ ہو گئے۔ انس الٰہی کے روضہ میں انہیں جگہ مل گئی، انہوں نے آرام پایا اور راحت و سرور میں آرام پذیر ہوئے۔ جب عقل نے دلوں کو اپنی مراد پر پہنچا ہوا دیکھا تو اپنا تصرف شروع کیا لیکن معرفت کو نہ پا سکی، عاجز رہ گئی۔ جب عاجز رہ گئی تو حیران ہو گئی اور فرمایا کہ جب تو اپنی خودی میں رہی، اپنے تصرف کی وجہ سے حق سے محجوب رہی اور جب تیرے تصرف و عمل کے آلات فانی ہو گئے تو صرف تو رہ گئی اور جب تو رہ گئی تو حق تعالیٰ تک پہنچ گئی۔ پس دل کے حصے میں قرب الٰہی آیا اور عقل کے حصے میں خدمت اور معرفت تو خود معرفت ہی تھی۔ پس خدا تعالےٰ نے بندے کو اپنی تعریف و توفیق معرفت سے شناسا کیا۔ یہاں تک کہ اس نے اس حق سبحانہٗ کو اس توفیق معرفت سے پہچان لیا، نہ ایسا پہچاننا جو اسباب سے ہو بلکہ وہ پہچاننا کہ خود اس کی ہستی اس میں عاریتی (عارضی) ہو تاکہ تمام وجوہ سے عارف کو انانیت یعنی غرور تکبر اور خود بینی خیانت معلوم ہو، یہاں تک کہ اس کی یاد بغیر بھولنے کے اور اس کا وقت بغیر کوتاہی کے اور اس کی معرفت حال ہو نہ کہ زبانی گفتگو۔

نیز ایک گروہ نے کہا ہے کہ معرفت حق الہامی ہے لیکن یہ بھی محال ہے، اس لیے کہ معرفت کے حق و باطل ہونے کے لیے دلیل ہوتی ہے اور اہل الہام کے صواب و خطا ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہوتی، کیونکہ اگر کوئی کہے کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ خداوند تعالیٰ مکان میں ہے اور دوسرا شخص کہے کہ مجھے الہام یوں ہوا ہے کہ اس کے لیے مکان نہیں تو لامحالہ ان دونوں متضاد دعووں میں حق ایک کے نزدیک ہو گا حالانکہ وہ دونوں الہام سے دعویٰ کرتے ہیں۔ پس لامحالہ ایک ایسی دلیل چاہیے کہ ان ہر دو مدعیوں کے صدق و کذب میں فرق کر سکے۔ اس وقت دلیل ہی سے ان کو فرق معلوم ہو سکے گا اور الہام سے اس پر حکم لگانا باطل ہو گا۔ یہ برہمنوں اور الہامی لوگوں کا قول ہے اور میں نے اپنے زمانے میں کچھ لوگوں کو دیکھا ہے جو اس معاملے میں بہت مبالغہ کرتے تھے اور اپنے حال کی نسبت پارساؤں کے طریق کی طرف کرتے تھے لیکن وہ سب لوگ گمراہی پر ہیں۔ ان کا قول اہل کفر و اہل اسلام میں سے تمام عقلمندوں کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ دس الہام کے مدعی ایک حکم میں دس ہی باہم متناقص باتوں کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ پس وہ سب باطل ہوتے

ہیں اور کوئی شخص ان سے حق پر نہیں ہوتا۔ اگر کوئی کہنے والا کہے کہ جو کچھ خلافِ شرع ہو، وہ الہام نہیں ہوتا تو ہم دیکھتے ہیں کہ تو اپنے اصل میں خطاکار اور غلطی پر ہے، کیونکہ جب تو الہام کو اپنے ساتھ قائم ہونے میں شریعت کو لیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس الہام کا اثبات اس شریعت کی وجہ سے ہے تو پس معرفت شرعی و نبوتی و ہدایتی ہو گی نہ الہامی اور الہام کا حکم معرفت میں ہر طرح سے باطل ہے اور ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ معرفت الٰہی ضروری ہے لیکن یہ بھی محال ہے کیونکہ جس چیز میں بندے کے علم کی ضرورت ہو اس میں لازم آتا ہے کہ سب عقلمند اس میں مشترک ہوں لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ عقلمندوں کا ایک گروہ اس کا انکار کرتا ہے، تشبیہ و تعطیل کو روا سمجھتا ہے تو یہ بات صحیح ہو گی کہ ضروری نہیں ہے۔ نیز اگر معرفت الٰہی ضروری ہوتی تو اس پر سب لوگوں کو مکلّف کرنا صحیح نہ ہوتا کیونکہ اس چیز کی معرفت پر مکلّف کرنا محال ہے، جس کو جاننا ضروری ہوتا ہے۔ جیسا کہ خود اپنی ہستی اور آسمان و زمین و روز و شب و درد و لذت وغیرہ جو ایسی چیزیں ہیں کہ کوئی عاقل آدمی اپنے آپ کو ان کے وجود کے متعلق کسی شک میں نہیں ڈال سکتا کہ وہ اس میں لاچار ہو جائے اور کوئی چاہے کہ ان کو نہ پہچانے، تو وہ ایسا نہیں کر سکتا کہ ان کو نہ پہچانے، لیکن صوفیوں کا ایک گروہ جس نے اپنے یقین کی صحت کو مدنظر رکھ کر کہا ہے کہ ہم اس کو ضروری طور پر پہچانتے ہیں کیونکہ ان لوگوں نے اللہ کے متعلق کوئی شک نہ پایا اور اس کے متعلق اپنے یقین کا نام ضرورت رکھ لیا تو وہ لوگ اس معنی میں تو راستی پر ہیں لیکن عبادت میں خطاکار ہیں کیونکہ علم ضروری میں صحیح کی تخصیص روا نہیں، اس لیے کہ سب دانا لوگ یکساں ہوتے ہیں۔

نیز علم ضروری وہ علم ہوتا ہے کہ زندوں کے دل میں بغیر کسی سبب اور دلیل کے پیدا ہو، حالانکہ علم معرفت حق سبب کے واسطے سے پیدا ہوتا ہے، لیکن استاد ابو علی دقاق، شیخ ابو سہل صعلوکی اور بدر ابن ابی سہل رحمۃ اللہ علیہ جو نیشاپور کے رئیس اور امام تھے، سب اس بات پر متفق ہیں کہ معرفت کی ابتدا استدلال ہے اور انتہا ضرورت، جیسا کہ صنعتوں کا علم کہ اس کی ابتدا کسب ہے اور انتہا ضرورت۔ یہ بات اہل سنت کے ایک قول کے مطابق ہے اور وہ کہتے ہیں کہ کیا تم دیکھتے نہیں کہ بہشت میں خدا تعالےٰ کا علم ضروری ہو گا۔ جب جائز ہے کہ آخرت میں خدا تعالےٰ کا علم ضروری ہو تو جائز ہے کہ یہاں دنیا میں بھی اس کا علم ضروری ہو نیز انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام دنیا میں اس حال میں کہ خدا تعالیٰ کا کلام بے واسطہ سنتے تھے تاکہ اس کو ضروری طور پر پہچانیں یا فرشتے اور وحی کے واسطے سے سنتے تھے اور ہم بھی کہتے ہیں کہ بہشتی لوگ بہشت میں اس کو ضروری طور پر پہچانیں گے کیونکہ بہشت تکلیف کا مقام نہیں اور پیغمبر برے انجام سے محفوظ ہیں اور حق تعالےٰ کی جدائی سے امن میں ہیں اور جس نے اس کو ضروری طور پر پہچان لیا، ـــ علیحدگی کا بھی کوئی خوف نہ ہو گا اور ایمان و معرفت الٰہی کی بزرگی اس وجہ سے ہے کہ وہ غیب ہے اور جب عین ہو جائے تو ایمان جبری ہو جائے گا۔ اس مشاہدے میں ایمان لانے کا اختیار اٹھ جائے گا اور شریعت کے تمام اصولوں میں اضطراب واقع ہو جائے گا اور ارتداد کا حکم باطل ہو جائے گا اور بلعم بن باعور، ابلیس اور برصیصا پر تکفیر کا حکم درست نہ رہے گا کیونکہ وہ سب بالاتفاق خدا کے عارف تھے جیسا کہ ابلیس کی نسبت اس کے مردود و رجیم یعنی راندۂ درگاہ ہونے کے حال سے اللہ تعالےٰ نے ہمیں خبر دی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ "تیری عزت کی قسم کہ میں تمام اولادِ آدم کو گمراہ کر دوں گا" اور ظاہر ہے کہ اس سے کلام کرنا اور جواب سننا معرفت کا تقاضا کرتا ہے اور عارف جب تک عارف ہو، علیحدگی سے امن میں ہوتا ہے کیونکہ علیحدگی معرفت کے زائل ہونے سے حاصل ہوتی ہے اور علم ضروری کا زائل ہونا ممکن نہیں۔ یہ مسئلہ لوگوں کے درمیان بہت خطرناک ہے لہٰذا اس کی گہرائی میں نہیں جانا چاہیے، البتہ شرط

یہ ہے کہ تم اتنا جان لو کہ بندے کو خدا تعالیٰ کا علم اور اس کی معرفت حق تعالےٰ کی ازلی ہدایت اور اس کے خبر دیئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی لیکن یہ روا ہے کہ بندوں کا یقین معرفت الٰہی میں کبھی زیادہ ہو اور کبھی کم لیکن اصل معرفت کم و بیش نہیں ہوسکتی، کیونکہ اس کی زیادتی بھی نقصان اور کمی بھی نقصان ہے۔ خداوند تعالےٰ کی شناخت میں تقلید نہ کرنی چاہیے بلکہ اس کو اس کی صفات کمال کے ساتھ پہچاننا چاہیے اور یہ بات حق تعالیٰ کی محض عنایت اور اس کی عمدہ حفاظت کے بغیر صحیح نہیں ہوسکتی۔ دلائل اور عقلیں سب اس کی ملک اور اس کے تصرف میں ہیں۔ چاہے تو اپنے کسی فعل کو کسی کے لیے دلیل بنادے اور اس کو اس دلیل کے ذریعے اپنی طرف راستہ دکھادے، اگر چاہے تو اسی فعل کو اس کے لیے حجاب بنادے تاکہ وہ اسی فعل کے ذریعے اس تک پہنچنے سے باز رہے۔ چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام ایک قوم کے لیے تو معرفت حق کی دلیل ہوگئے لیکن دوسری قوم کے لیے اس کی معرفت سے حجاب بن گئے، یہاں تک کہ ایک گروہ نے کہہ دیا عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے تھے اور دوسرے گروہ نے کہا کہ وہ خدا کے بیٹے تھے۔ اسی طرح بت، آفتاب اور چاند ایک گروہ کے لیے حق کی دلیل بن گئے اور دوسرا گروہ انہی کی وجہ سے حق سے باز رہا اور اگر دلیل معرفت الٰہی کی علت ہوتی تو چاہیے تھا کہ ہر ایک دلیل لانے والا عارف الٰہی ہوتا اور یہ کھلا مکابرہ ہے۔

پس خدا تعالیٰ ایک کو تو برگزیدہ کرلیتا ہے اور سب اُمور کو اس کا رہبر بنادیتا ہے تاکہ وہ ان کے ذریعے حق سبحانہٗ تک پہنچ جائے اور اس کو جان لے۔ پس دلیل معرفت حق کے لیے سبب اور ذریعہ ہے نہ کہ علت۔ مسبب کے لیے سبب ہونے میں کوئی سبب دوسرے سبب سے بہتر نہیں ہوتا۔ مجھے اپنی جان کی قسم ہے کہ سبب کا ثابت کرنا عارف کے لیے معرفت الٰہی میں زنار ہے اور غیر حق کی طرف توجہ کرنا شرک ہے۔ جس کو اللہ تعالےٰ گمراہ کرے، اسے کوئی راہ پر لانے والا نہیں۔ جب لوح محفوظ میں بلکہ اللہ تعالےٰ کے علم و مراد میں کسی کے نصیب میں بدبختی ہو تو دلیل لانا اس کے لیے کیونکر رہنما ہوسکتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے کہ جس نے غیر حق کی طرف التفات کیا، اس کی معرفت باعث کفر و شرک ہے جو شخص قہر الٰہی میں غرق ہے، حق تعالےٰ کے سوا کوئی چیز اس کا گریبان پکڑ کر اس کو اس میں سے نکال نہیں سکتی۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام غار سے نکلے تو دن میں آپ نے کچھ نہ دیکھا، حالانکہ دن میں دلائل بہت اور عجائب زیادہ ظاہر تھے۔ جب رات ہوئی تو ایک ستارا دیکھا۔ اگر آپ کی معرفت الٰہی علت کی دلیل ہوتی تو دلائل دن میں زیادہ ظاہر اور اس کے عجائب زیادہ واضح ہوتے۔ پس خداوند تعالیٰ جب چاہتا ہے، بندے کی اپنی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اپنی معرفت کا دروازہ اس پر کھول دیتا ہے یہاں تک کہ کبھی عین معرفت میں وہ اس درجے پر پہنچ جاتا ہے کہ عین معرفت اس کو غیر معلوم ہوتی ہے۔ اس کی صفت معرفت اس کی آفت ہوجاتی ہے اور حق تعالےٰ کی معرفت سے حجاب میں ہوجاتا ہے، حتیٰ کہ اس کی معرفت کی تحقیق اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ اس کی معرفت اس کا دعویٰ ہوجاتی ہے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اس بات سے بچ کہ حق تعالےٰ کی معرفت کا تو دعویٰ کرے۔" (شعر)

"عارف لوگ تو اس کی معرفت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ میں اپنی جہالت کا اقرار کرتا ہوں، یہی میری معرفت ہے۔"

یعنی تجھ پر لازم ہے کہ معرفت الٰہی کا دعویٰ نہ کرے کیونکہ اس کے اندر تیری ہلاکت ہے۔ ہاں، اس کے معنی سے تعلق پیدا کر کہ تو نجات پاجائے۔ پس جو شخص اس کے جلال کے کشف و مشاہدے سے سرفراز کیا جائے، اس کی ہستی اس کے لیے وبال ہوجاتی ہے اور اس کی صفات سب اس کے لیے آفت کا محل بن جاتی ہیں اور جو حق تعالےٰ کا ہو رہے اور حق تعالیٰ

اس کا ہو، اس کے لیے کوئی چیز دونوں عالم میں ایسی نہیں ہوتی، نہ اس کی نسبت اس چیز سے درست ہو۔ الغرض معرفت کی حقیقت یہ جاننا ہے کہ ملک سب خدا تعالےٰ کا ہے۔ جب کوئی شخص سارے ملک میں اسی حق تعالےٰ کو متصرف جانے، اس کو خلقت سے کیا کام رہ جاتا ہے، یہاں تک کہ اپنے سے یا خلقت سے وہ حجاب میں ہو جاتا ہے۔ ان سب کا حجاب جہل کی وجہ سے ہوتا ہے، جب جہالت فانی ہو جائے تو حجاب لاشئی ہو جاتا ہے اور دنیا بمنزلہ عقبیٰ کے ہو جاتی ہے۔

دوسری فصل
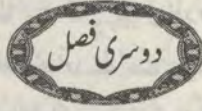
معرفت الٰہی کے متعلق مشائخ کے رموز

جاننا چاہیے کہ معرفت الٰہی کے متعلق مشائخ رحمہم اللہ کے بہت سے رموز ہیں۔ فائدے کے لیے ان کے اقوال میں سے بعض کو میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: "معرفت وہ ہے کہ کسی چیز سے تو تعجب نہ کرے۔" کیونکہ تعجب اس فعل پر ہونا چاہیے کہ کوئی اپنی قدرت سے زیادہ کرے۔ جب اللہ تبارک و تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے تو عارف کو اس کے افعال پر تعجب کرنا محال ہے اور اگر تعجب متصور بھی ہو تو وہاں ہونا چاہیے کہ اس نے ایک مٹھی خاک کو اس درجے پر پہنچا دیا جس کی وجہ سے وہ اس کا فرمانبردار بنا اور خون کے قطرے کو اس مرتبے پر پہنچا دیا کہ اس کی محبت و معرفت، اس کے دیدار کی طلب و اس کے قرب اور وصل کا طلب گار ہوا۔
ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "معرفت کی حقیقت خداوند تعالیٰ کا نہایت لطیف انوار کے ساتھ دلوں پر جلوہ فرمانا ہے۔" یعنی جب تک خداوند تعالیٰ اپنی مہربانی سے بندے کے دل کو اپنے نور سے آراستہ نہ کر دے تب تک اس کا دل تمام خرابیوں سے رہائی نہیں پاتا، چنانچہ تمام موجودات اور مخلوقات کو اس کے دل میں ایک رائی کے دانے کے برابر وزن نہیں رہتا۔ باطن اور ظاہر کے اسرار کا مشاہدہ اس پر غلبہ نہیں کرتا۔ جب وہ ایسا کر لیتا ہے تو اس کا دیکھنا سب مشاہدہ ہو جاتا ہے۔

شبلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "معرفت ہمیشہ کی حیرانی ہے" اور حیرانی دو قسم کی ہوتی ہے، ایک تو وجود کے متعلق، دوسرے اس کی کیفیت کے متعلق۔ وجودِ الٰہی کے متعلق حیرانی شرک و کفر ہے اور کیفیت میں حیرانگی معرفت ہے اس لیے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ کی ہستی میں عارف کو شک ہونا ممکن نہیں اور اس کی کیفیت اور ماہیت میں عقل کو مجال نہیں۔ اب یہاں حق تعالےٰ کے وجود میں یقین اور اس کی کیفیت میں حیرانی رہ گئی اسی وجہ سے ایک بزرگ نے فرمایا ہے: "اے متحیروں کے رہنما! میری حیرت کو بڑھا دے۔" پہلے تو حق تعالیٰ کے وجود کی معرفت اور اس کی صفات کا کمال ثابت کیا اور جان لیا کہ وہی خلقت کا مقصود اور ان کی دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے اور حیرت والوں کو سوائے اس کی کیفیت کے کسی میں حیرت نہیں۔ تب حیرت کی زیادتی کی درخواست کی اور جان لیا کہ مطلوب کے اندر عقل کو سوائے حیرانی اور پریشانی کے کوئی شرکت اور مداخلت نہیں اور یہ بات نہایت لطیف ہے۔ نیز اس میں احتمال ہے کہ حق تعالےٰ کی ہستی کی معرفت اپنی ہستی کے متعلق حیرانی کا تقاضا کرتی ہے، اس لیے کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کو پہچان لیتا ہے تو اپنی ساری ہستی کو اس کے قہر کی قید میں دیکھ پاتا ہے۔ جب اس کا وجود بھی اسی کے سبب سے ہے اور عدم بھی اسی کی وجہ سے، اس کی حرکت اور سکون بھی اسی کی قدرت پر موقوف ہے تو وہ حیران ہو جاتا ہے اور جب سب چیزوں کا قیام اسی کی ذات پر موقوف ہے تو میں خود کون ہوں اور کیا ہوں؟ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: "جس نے اپنے آپ کو فنا کے ساتھ پہچان لیا، اس نے خدا تعالےٰ کو بقا کے ساتھ پہچان لیا" اور فنا سے عقل اور صفت

باطل ہو جاتی ہے۔ جب کسی چیز کا عین عقل میں نہ آسکے تو اس کی معرفت میں سوائے حیرانی کے اور کوئی چیز ممکن نہیں ہوسکتی۔ بایزید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”معرفت یہ ہے کہ تو جان لے کہ خلقت کی سب حرکات و سکنات اللہ تبارک و تعالیٰ کی وجہ سے ہیں اور کسی کو اس کے اذن کے بغیر اس کے ملک میں تصرف حاصل نہیں اور اسی کی وجہ سے عین (قائم بخود[1])، عین ہے اور اسی کی وجہ سے اثر[2] اثر ہے اور صفت، صفت ہے اور متحرک، متحرک اور ساکن، ساکن ہے کیونکہ جب تک اللہ تعالیٰ نے جسم کے اندر استطاعت نہیں پیدا کی اور دل کے اندر ارادہ نہیں رکھا، بندہ کوئی فعل نہیں کر سکتا اور بندے کا فعل مجاز ہے اور حقیقی فعل خداوند تعالےٰ کے لیے ہے۔ محمد بن واسع رحمتہ اللہ علیہ عارف کی صفت میں فرماتے ہیں: ”جس نے اللہ تعالےٰ کو پہچان لیا، اس کا کلام کم ہو گیا اور اس کی حیرت ہمیشہ کے لیے ہو گئی۔“ اس لیے کہ تعبیر اسی چیز سے کر سکتے ہیں جو بیان کے تحت میں آسکے اور اصولاً عبارت کے لیے ایک حد ہوتی ہے اگر تعبیر کیا ہوا محدود ہی نہ ہو جس پر کہ تعبیر کرنے والے نے اپنی عبارت کی بنیاد رکھی ہے تو پھر تعبیر کیے ہوئے کے متعلق عبارت یا بیان کیسے ثابت ہو؟ جب مقصود عبارت میں نہ آسکے اور بندے کو اس سے چارہ نہ ہو تو سوائے ہمیشہ کی حیرانی کے اس کے لیے اور کیا چارہ ہوسکتا ہے۔ حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”معرفت الٰہی کی حقیقت اللہ تبارک و تعالےٰ کی معرفت سے عاجز ہونا ہے“ اور وہ چیز جس کی حقیقت کی نسبت بندہ سوائے اظہار عجز کے اور کچھ نہ کر سکے تو مناسب ہے کہ بندے کو اس کے ادراک کرنے میں اپنی نسبت زیادہ دعویٰ نہ ہو، اس لیے کہ عاجزی اس کے لیے طلب ہے اور طالب جب تک اپنے آلہ اور صفت سے اعضا و قوائے انسانیت کے ساتھ قائم ہے، عاجزی کا اطلاق اس پر صحیح نہیں ہوتا۔ جب یہ آلات و اوصاف اس کے ختم ہو جاتے ہیں تو اس وقت فنا ہوتی ہے نہ عاجزی۔ مدعیوں کا ایک گروہ باوجود اس کے کہ ان کی آدمیت کے اوصاف ثابت، ان پر تکلیف شرعی کا خطاب صحیح اور اللہ تعالےٰ کی حجت ان پر قائم ہے، یہ کہتا ہے کہ معرفت الٰہی کی حقیقت عاجز ہو جانا ہے اور ہم عاجز ہیں اور سب باتوں سے ہارے ہوئے ہیں، حالانکہ یہ قول گمراہی اور خسارہ ہے۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ کس چیز کی طلب میں تم عاجز ہو گئے؟ کیونکہ عاجزی کی دو علامتیں ہوتی ہیں اور وہ دونوں تم میں موجود نہیں۔ ایک علامت تو آلہ اور اسباب طلب کا فنا ہونا ہے اور دوسری علامت تجلی الٰہی کا ظہور ہے۔ جہاں آلہ فنا ہو وہاں بیان معدوم ہوتا ہے اگر ایسی صورت میں اپنے عجز کو بیان کرے گا تو عجز کی تعبیر سوائے عاجزی کے کسی اور چیز سے نہیں ہوسکتی اور جہاں تجلی الٰہی کا ظہور ہو وہاں نہ نشان کیا جا سکتا ہے اور نہ تمیز مقصود ہوتی ہے، یہاں تک کہ عاجز یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ عاجز ہے بلکہ جس صفت کی طرف وہ منسوب ہوتا ہے اگر اس کو عجز کہیں تو یہ بھی ممکن نہیں، اس لیے کہ عجز خود غیر حق اور ماسویٰ اللہ ہے اور غیر کی معرفت کا ثابت کرنا معرفت الٰہی نہیں ہو سکتی اور جب تک غیر حق کی جگہ دل میں ہے تب تک تو معرفت الٰہی صحیح نہیں اس لیے کہ عارف جب تک غیر حق سے کنارہ نہ کرے، وہ عارف الٰہی نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابوحفص حداد رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا ہے، میرے دل میں نہ حق کا خیال گزرا ہے نہ باطل کا، اس لیے کہ جب خلقت کو کوئی غرض اور خواہش ہوتی ہے تو وہ دل کی طرف رجوع کرتی ہے یہاں تک کہ دل اس کی نفس کے حوالے کر دیتا ہے، جو باطل کا محل ہے اور جو ہمیشگی کا پختہ ارادہ پاتے ہیں تو وہ بھی دل کی طرف رجوع کرتے ہیں اور دل اس کو روح کی طرف رہنمائی کرتا ہے، جو حق اور حقیقت کا سرچشمہ ہے۔ جب دل میں غیر حق کا خیال آتا ہے تو عارف کا اس کی طرف رجوع کرنا اس کی ناشناسائی کی دلیل ہے۔ پس

---

[1] عین سے مراد ذاتِ باری تعالیٰ عز اسمہٗ ہے [2] اثر۔ نشانِ اصل

تمام لوگ معرفت کی برہان کی تلاش بھی دل سے کرتے ہیں اور غرض اور خواہش نفسانی کی جستجو بھی دل سے کرتے ہیں اور چونکہ ان اہل اللہ کی دنیا میں کوئی غرض نہیں ہوتی، اس لیے وہ دل کی طرف رجوع نہیں کرتے اور سوائے حق تعالیٰ کے کسی چیز سے وہ آرام نہیں پاتے اور جب ان کو معرفت کی برہان کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ حق تعالےٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں نہ کہ دل کی طرف۔ پس وہ بندہ جس کا رجوع دل کی طرف ہوتا ہے اور وہ بندہ جس کا رجوع حق تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے، ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ابوبکر واسطی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "جس نے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا وہ دنیا سے الگ ہوگیا بلکہ دنیا سے متعلق کچھ بیان کرنے سے گونگا ہوگیا اور اپنے اوصاف سے فانی ہوگیا۔" نبی ﷺ نے فرمایا ہے: "میں تیری صفت و ثنا کا احاطہ نہیں کرسکتا۔" چنانچہ پیغمبر ﷺ جب تک غیبت کی حالت میں تھے، عرب و عجم میں سب سے زیادہ فصیح تھے: آپ نے فرمایا: اَنَا اَفْصَحُ الْعُرَبِ وَالْعَجَمِ۔ (میں عرب و عجم میں سب سے زیادہ فصیح ہوں)۔ جب آنحضرت ﷺ کی غیبت سے حضور حق کا شرف حاصل ہوا تو آپ نے فرمایا: "میں تیری صفت و ثنا کماحقہٗ اپنی زبان سے ادا نہیں کرسکتا۔" پس کیا کہوں کہ میں گویا سے بے گویا ہوگیا اور حال سے بے حال۔ پس تو وہی ہے جو تو ہے۔ میرا کلام میری وجہ سے ہوگا یا تیری وجہ سے، اگر اپنے واسطے سے کلام کروں تو اپنے کسب کی وجہ سے قربت کے ثابت کرنے میں معیوب ہوں گا، پس میں کچھ نہیں کہتا ہوں۔ حکم ہوا: کہ اے محمد ﷺ! اگر تو نہیں کہتا تو ہم خود کہتے ہیں۔ "تیری جان کی قسم! جب تو میری ثنا سے ساکت رہے گا تو سب عالم کا ثنا کرنا تیری طرف سے میری ثنا ہوگی۔" یعنی سارا عالم آپ کا نائب ہوکر میری ثنا کرے گا اور وہ آپ ہی کی طرف سے میری ثنا ہوگی۔
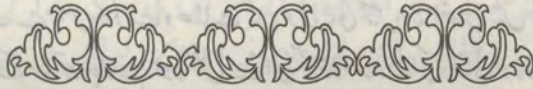
سولھواں باب

دوسرے پردے کا کھولنا۔ توحید الٰہی

پہلی فصل
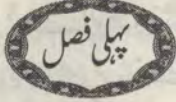
اثباتِ توحید

اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے: "اور تمہارا معبودِ برحق واحد ہے۔" نیز فرمایا: "تم دو معبود اختیار نہ کرو، بے شک وہ معبودِ برحق اکیلا ہی ہے۔" پیغمبر ﷺ نے فرمایا: "تم سے پہلے لوگوں میں ایک شخص تھا، اس نے سوائے توحید الٰہی کے اور کوئی نیک عمل نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ جب میں مرجاؤں تو تم مجھے جلا دینا، پھر میری خاکستر کو پیس کر سرمہ بنا دینا، پھر اسے ہوا کے ساتھ کچھ خشکی اور کچھ پانی کی طرف اُڑا دینا، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ہوا اور پانی کو حکم دیا کہ جو کچھ تم نے اس کی خاکستر میں سے لیا ہے، اُسے قیامت تک محفوظ رکھو۔ سو قیامت کے روز وہ اللہ تعالےٰ کے سامنے پیش ہو گا تو اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ تو نے جو یہ کام کیا تھا، تجھے اس پر کسی چیز نے اُبھارا تھا؟ وہ کہے گا کہ میں سخت گناہ گار تھا، مجھے تیری جناب سے شرم آئی تو میں نے ایسا کیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے گا۔" دراصل توحید کی حقیقت کسی چیز کے ایک ہونے پر حکم کرنا ہے اور اس کے ایک ہونے کو صحیح طور پر جاننا ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ ایک ہے، اس کا ذات و صفات میں کوئی ثانی نہیں، نہ افعال میں کوئی مثل و شریک ہے اور اہل توحید نے اس کو اسی صفت کے ساتھ جانا ہے اور عقل نے ان کو خدا تعالےٰ کی یکتائی اور وحدانیت کی دعوت دی ہے۔

یاد رکھو کہ توحید تین قسم کی ہوتی ہے: (اوّل) اللہ تعالےٰ کا اپنے آپ کو واحد جاننا اور وہ اس کا اپنی یکتائی کو جاننا ہے، (دوم) خدا کی توحید ہے خلقت کے لیے، وہ اللہ تعالےٰ کا بندے کو اپنی توحید کا حکم دینا اور اس کے دل میں توحید کا جذبہ پیدا کرنا ہے، (سوم) خلقت کی توحید اللہ کے لیے اور وہ ان کا اللہ تعالےٰ کی یکتائی اور وحدانیت کو جاننا ہے۔ پس جب بندہ عارفِ حق تعالےٰ ہو اور اس کی وحدانیت کی نسبت یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اللہ تعالےٰ ایک ہے، جو فصل و وصل کو قبول نہیں کرتا یعنی نہ کوئی چیز اس سے پیوست ہوسکتی ہے نہ اس سے علیحدہ ہو سکتی ہے، دوئی اس میں روا نہیں، اس کی وحدانیت عددی نہیں کہ دوسرے عدد کے ثابت ہونے سے دو ہو جائیں اور وہ ان دونوں میں سے عددِ واحد ہو جس سے اس کی وحدانیت عددی ہو اور یہ اعداد کا ثابت کرنا بے نہایت ہو اور محدود نہیں تاکہ اس کی چھ طرفیں ہوں، جنہیں وہ گھیرے ہوئے ہو اور اس کا مکان نہیں اور نہ وہ مکان کے اندر ہے تاکہ مکان ثابت کرنے کی حاجت ہو۔ اس لیے کہ اگر وہ مکان کے اندر جاگزیں ہوتا تو مکان کے لیے بھی مکان کا ہونا لازم آتا، پھر فعل و فاعل اور قدیم و حادث کا حکم باطل ہو جاتا۔ وہ عرض بھی نہیں کہ وہ جوہر کا محتاج ہو اور پھر اس کے اندر حال ہو اور اپنے محال میں باقی رہے۔ وہ جوہر بھی نہیں ہے کہ اس کا وجود اپنے جیسے جواہر کے سوا صحیح نہ ہو۔ وہ طبعی بھی نہیں ہے کہ حرکت اور سکون کا مبدا ہو اور وہ روح بھی نہیں ہے کہ فنا کا محتاج ہو۔ جسم بھی نہیں کہ اجزا سے مرکب ہو۔ کسی چیز میں حال نہیں تاکہ چیزوں کی جنس میں سے ہو اور کسی چیز کے ساتھ اس کا پیوند نہیں تاکہ وہ چیز اس کا ایک جزو ہو بلکہ تمام نقائص سے وہ بری ہے۔ تمام خرابیوں سے پاک اور سب عیوب سے برتر ہے۔ کوئی اس کی مانند نہیں تاکہ وہ اپنے مانند

کے ساتھ دو ہو۔ نہ اس کا کوئی فرزند ہے تاکہ اس کی نسل اس کے اصل کا اقتضاد کرے۔ اس کی ذات و صفات پر تغیر روا نہیں کہ اس کا وجود اس تغیر کی وجہ سے متغیر ہو جائے یا متغیر کے حکم میں ہو جائے۔ وہ ان کامل صفات سے موصوف ہے کہ مومن اور موحد لوگ اس کے لیے نورِ عقل سے ثابت کرتے ہیں کیونکہ اس نے اپنے آپ کو ان سے موصوف کیا ہے اور ان صفتوں سے پاک ہے جن سے ملحد لوگ اپنے نفس کی پیروی کرتے ہوئے اسے موصوف کرتے ہیں کیونکہ اس نے اپنے آپ کو ان صفتوں سے موصوف نہیں کیا۔ وہ حَیّی (ہمیشہ زندہ)، علیم (سب کچھ جاننے والا)، رؤف (نہایت مہربان)، رحیم (نہایت رحم کرنے والا) اور مُرید (ارادہ کرنے والا)، قدیر (ہر چیز پر قادر)، سمیع (سب کچھ سننے والا)، بصیر (ہر چیز دیکھنے والا)، متکلّم (کلام کرنے والا) اور باقی ہے۔ اس کا علم اس کے اندر حال نہیں۔ اس کی قدرت ٹھوس نہیں جس سے اشتقاق نہ ہو سکے۔ اس کی سمع و بصر اس کے اندر نو پیدا نہیں۔ اس کے کلام میں تبعیض و تجدید نہیں (یعنی نہ اس کے اجزا ہو سکتے ہیں اور نہ وہ نئی ہے)، وہ ہمیشہ اپنی صفات کے ساتھ قدیم ہے۔ تمام معاملات اس کے علم سے باہر نہیں اور موجودات کو اس کے ارادے سے گریز نہیں، جو چاہتا ہے کرتا ہے اور وہ جو چاہتا ہے، ازل سے جانتا ہے اور مخلوق اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتی۔ اس کا حکم سب حق ہے۔ اس کے دوستوں کو سوائے اسے تسلیم کر لینے کے اور کوئی صورت نہیں۔ اس کا حکم قطعی ہے، جسے بجا لانے کے سوا طالبانِ حق کے لیے کوئی چارہ ہی نہیں۔ خیر و شر کا اندازہ کرنے والا سوائے اس کے کوئی نہیں۔ سوائے اس کی ذات کے کسی سے اُمید رکھنا یا خوف کرنا جائز نہیں۔ نفع اور ضرر کا پیدا کرنے والا وہی ہے اور حکم سوائے اس کے کسی کو حاصل نہیں۔ اس کا حکم سب حکمت ہے اور اس کی قضا کے بغیر نہیں کسی کو اس کے اصل کی بو تک نہیں پہنچی اور نہ اس تک پہنچنا ممکن ہے۔ اس کا دیدار بہشتیوں کے لیے جائز ہے۔ اس کے لیے تشبیہ اور جہت نہیں، نہ مقابلہ اور مواجہہ اس کی ہستی پر ممکن۔ دنیا میں اولیا کے لیے اس کا مشاہدہ جائز ہے اور انکار کرنا لازم نہیں، جو اس کو ان اوصاف سے متصف جانے وہ دین سے علیحدہ نہیں اور جو اس کے خلاف جانتا ہے، اس کا دین نہیں۔

اس معنی کے متعلق اصول اور وصول کے لحاظ سے بہت سا کلام ہے، لیکن طوالت کے خوف سے میں نے اسی پر بس کی اور ان سب امور کے متعلق میں (علی بن عثمان جلابی رحمۃ اللہ علیہ) کہتا ہوں کہ اس فصل کے شروع میں میں نے یہ کہہ دیا ہے کہ توحید کسی چیز کی وحدانیت پر حکم کرنا ہے اور حکم کرنا سوائے اس چیز کے علم کے نہیں ہو سکتا۔ پس اہل سنت نے خداوند تعالیٰ کی وحدانیت پر تحقیقی طور پر حکم کیا ہے۔ اس لیے انہوں نے اس کی عجیب و غریب صنعت اور اس کے نہایت ہی عجیب فعل کو دیکھا، جس میں بہت سے عجائبات اور لطائف ان کو نظر آئے اور انہوں نے اس کا خود بخود ہو جانا محال جانا اور ہر چیز کے اندر حدوث کی علامات ظاہر پائیں تو لامحالہ ایک فاعل کا ہونا ضروری سمجھا کہ اس کو عدم سے وجود میں لائے۔ یہ تمام سورج، چاند، ستارے، خشکی، تری، پہاڑ اور دریا پیدا کیے۔ پھر ان تمام صورتوں اور شکلوں کو ان کی حرکات و سکنات، علم و گویائی، موت اور زندگی کے ساتھ وابستہ کیا۔ پس ان سب کو اپنی نمود کے لیے ایک صانع کے بغیر چارہ نہیں تھا اور دو تین صانع کے بجائے صرف ایک صانع کامل، حی عالم قادر کی وجہ سے جو کسی دوسرے شریک کا محتاج نہ ہو۔ یہ سب چیزیں مستغنی تھیں چونکہ فعل کو فاعل کے سوا چارہ نہیں ہوتا اور ایک فعل کے لیے دو فاعل کی صورت میں لازم ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہوں، اس لیے لامحالہ اور بلاشک و شبہ یقینی علم سے ثابت ہوا کہ وہ خدا ایک ہو۔ ہمارے ساتھ یہ اختلاف دو خالق ماننے والوں نے کیا ہے۔ نور اور ظلمت کو

ثابت کر کے، آتش پرستوں نے یزدان (خدا) اور اہرمن (شیطان) ثابت کرنے سے، طبیعی (فلاسفر و سائنسدانوں) نے طبیعت اور قوت کے ثابت کرنے سے، فلکیوں (ہیئت دانوں) نے سات ستاروں کے ثابت کرنے سے اور معتزلیوں نے بے نہایت خالق اور صانع ثابت کرنے سے اور میں نے ان سب کے رّد کرنے کے لیے چھوٹی سی دلیل بیان کر دی ہے، کیونکہ یہ کتاب ان کے فضول خیالات کو رّد کرنے کی جگہ نہیں اور اس علم کے طالب کو یہ مسئلہ میری دوسری کتاب سے تلاش کرنا چاہیے، جو میں نے اس موضوع پر تصنیف کی ہے اور اس کا نام اَلرِّعَایَۃُ بِحُقُوْقِ اللّٰہِ رکھا ہے یا مقتدمین اہل اصول رضی اللہ عنہم کی کتابوں میں تلاش کرنا چاہیے۔ اب ہم ان رموز کی طرف رجوع کرتے ہیں جو توحید کے متعلق مشائخ نے بیان کیے ہیں اور سب امر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

دوسری فصل
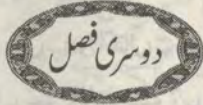
توحید کے متعلق مشائخ کے رموز

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''توحید قدیم کو حوادث سے علیحدہ اور ممیّز کرنا ہے۔'' یعنی یہ کہ تو قدیم کو حوادث کا محل نہ جانے اور نہ حوادث کو قدیم کا محل سمجھے اور یہ جان لے کہ حق تعالےٰ قدیم ہے اور تو حادث ہے۔ تیری جنس سے کوئی چیز اس کے ساتھ پیوست نہیں ہوسکتی اور اس کی صفات میں سے کوئی چیز تیرے اندر نہیں مل سکتی کیونکہ قدیم حادث کا ہم جنس نہیں ہوتا بلکہ قدیم حوادث کے موجود کے وجود ہونے سے پہلے تھا۔ جب حوادث کے وجود سے پہلے قدیم حادث کا محتاج نہیں تھا تو حوادث کے وجود کے بعد بھی ان کا محتاج نہیں ہوگا۔ یہ اختلاف ان لوگوں کا ہے جو ارواح کو قدیم کہتے ہیں اور ان کا ذکر گزر چکا ہے۔ جب کوئی شخص قدیم کو حادث میں اترنے والا، حلول کرنے والا کہے یا حادث کو قدیم کے ساتھ متعلق جانے تو پھر حق تعالےٰ کے قدیم ہونے اور عالم کے حادث ہونے پر کوئی دلیل باقی نہیں رہتی اور یہ دہری لوگوں کا مذہب ہے۔ سو اس برے عقیدے سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ الغرض اشیائے حادثہ کی سب حرکات توحید کی دلیلیں ہیں اور خداوند تعالےٰ کی قدرتِ کاملہ اور اس کے قدیم کے ثابت کرنے پر گواہ ہیں لیکن انسان ان سے غافل ہے، جو اپنے دل میں اس کے غیر کو چاہتا ہے یا اس کے ذکر کے سوا غیر کے ذکر سے آرام پاتا ہے، جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے:

فَفِیْ کُلِّ شَیْءٍ لَّہٗ اٰیَۃٌ
قَدُلّ عَلٰی اِنَّہٗ وَاحِدٌ

(ترجمہ: پس ہر شے میں اس کی ایک نشانی ہے، جو اس کے ایک ہونے پر دلالت کرتی ہے)۔

جب تیرے نیست اور ہست کرنے میں اس کا کوئی شریک نہیں ہونا چاہیے تو محال ہے کہ تیری پرورش کے اندر اس کا کوئی شریک ہو۔ حسین بن منصور رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ توحید الٰہی کے میدان میں بندے کا پہلا قدم اللہ تعالےٰ کو اپنے اوصافِ حقیقیہ میں منفرد نہیں بلکہ یکتائے محض سمجھنا ہے اس لیے کہ تفرید کسی کا خرابیوں سے جدا ہونے پر حکم لگانا ہے اور توحید کسی کی وحدانیت پر حکم لگانا ہے پس تفرید میں غیر کا ثابت کرنا روا ہوتا ہے۔ حق سبحانہٗ تعالےٰ کے سوا کسی کو اس صفت سے موصوف کرنا مناسب نہیں اور وحدانیت میں غیر کا ثابت کرنا روا نہیں اور سوائے حق تعالےٰ کے کسی کو اس صفت سے موصوف نہیں کرنا چاہیے۔ پس تفرید کا لفظ مشترک ہے اور ممکن اور واجب تعالےٰ دونوں پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے مگر توحید شرکت کی نفی کرتی ہے، اس لیے پہلا قدم توحید میں شرکت کی نفی کرنا اور راستے سے غیر

کی موجودگی کو دفع کرنا ہے کیونکہ طریق حق میں غیر کی موجودگی کے ساتھ راستے کو چراغ سے تلاش کرنا ہے۔
حضری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "ہمارے اصول توحید میں پانچ چیزیں ہیں: حدوث کا اٹھا دینا (نفی کرنا)، اللہ کے قدیم ہونے کو ثابت کرنا، وطنوں کو چھوڑ دینا، بھائیوں سے جدائی اور معلوم اور نا معلوم کو فراموش کرنا۔" لیکن دفع حدث سے مراد توحید الٰہی کے سوا سب حادث چیزوں کے پیوست ہونے کی نفی کرنا اور اس کی ذات مقدس پر حوادث کے وقوع کو محال سمجھنا ہے اور قدم کے اثبات۔ سے مراد خداوند تعالےٰ کے ہمیشہ ہونے کا اعتقاد کرنا ہے، جس کی شرح حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے قول میں بیان کر چکا ہوں اور وطنوں کے چھوڑنے سے مراد نفس کے مرغوبات اور دل کے آرام کی جگہوں اور طبیعت کے قرار پکڑنے کی چیزوں کو چھوڑ دینا ہے اور طالب حق کے لیے دنیا کی رسوم چھوڑ دینا ہے۔ بھائیوں کی مفارقت سے مراد مخلوق کی صحبت سے رُوگردانی اور حق کی صحبت کی طرف توجہ کرنا ہے کیونکہ غیر کے اندیشے سے جو کچھ موحد کے دل پر گزرتا ہے، وہ ایک حجاب اور آفت ہوتی ہے اور جس قدر دل کو غیر سے صحبت ہوتی ہے اتنا ہی وہ توحید میں حجاب کے اندر ہوتا ہے، اس لیے کہ سب لوگوں کے اتفاق سے توحید اپنے ارادوں کو حق تعالےٰ پر جمع کرنا ہے اور غیر کے ساتھ آرام پانا، ہمت کے متفرق ہونے کا نشان ہے۔ توحید میں اس چیز کی فراموشی سے جس کو جانتے ہیں یا نہیں جانتے، مراد یہ ہے کہ مخلوق کا علم ماہیت، کیفیت، جنس یا طبیعت کے متعلق ہوتا ہے۔ اس مخلوق کا علم حق تعالےٰ کی توحید میں جو کچھ ثابت کرتا ہے، توحید اس کی نفی کرتی ہے اور جس چیز کو ان کی جہالت ثابت کرتی ہے، وہ اس کے علم کے خلاف ہوتا ہے، اس لیے کہ جہالت تو توحید نہیں ہے اور توحید کا تحقیقی علم تصرف غیر کی نفی کیے بغیر درست نہیں ہوتا۔ مخلوق کے علم اور جہل میں سوائے تصرف کے اور کچھ نہیں کیونکہ ایک علم تو بصیرت پر تصرف کرنے سے ہوتا ہے اور دوسرا (جہالت) غفلت پر تصرف کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک شیخ فرماتے ہیں کہ میں حصری رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں تھا۔ مجھے نیند آگئی اور میں نے دو فرشتوں کو دیکھا کہ وہ آسمان سے اُترے اور کچھ دیر تک آپ کا کلام سنتے رہے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ جو کچھ یہ مردِ حق کہہ رہا ہے، وہ توحید کا علم ہے نہ کہ عین توحید۔ جب میں بیدار ہوا تو آپ توحید ہی کو بیان کر رہے تھے اور آپ نے میری طرف رُخ کر کے فرمایا: اے فلاں! توحید کی نسبت سوائے علم توحید کے اور کچھ نہیں بتا سکتے۔" حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: توحید یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالےٰ کے سامنے ایک ایسا جسم ہو کر رہ جائے جو اپنے اختیار اور ارادے سے بالکل خالی ہو اور جس پر اللہ تعالےٰ کی توحید کے ناپیدا کنار سمندر میں اور اس کی قدرت کے احکام کے اجرا کے وقت اسی کی تدبیر کے تصرفات کارفرما ہوں اور جو اللہ تعالیٰ کے حقیقی قرب اور توحید کی حقیقت سے آگاہ ہو جانے کے باعث اپنے نفس اور مخلوق کی دعوت کے ردّ و قبول سے قطعاً بے خبر ہو اور پھر اس مقام فنا فی اللہ کے حصول کے بعد اس کا اپنا کوئی ارادہ باقی نہ رہے اور اس مقام کی طرف لوٹ آئے جہاں اس کا آخر اس کے اول سے ہمکنار ہو، وہ ایسا ہو جائے جیسا دنیا میں موجود ہونے سے پہلے تھا۔ پس مراد ان سب امور سے یہ ہے کہ موحد کو حق تعالےٰ کے اختیار میں کوئی اس کا اپنا اختیار نہ رہے اور حق تعالیٰ کی وحدانیت میں اپنی ذات کی طرف نگاہ نہ ہو، اس لیے کہ قربِ حق کے محل میں اس کا نفس فنا ہو جائے گا اور اس کی حس و حرکت جاتی رہے گی اور جیسا کہ اللہ تعالےٰ چاہے گا، بندہ کی وجہ سے حق تعالیٰ کے احکام اس پر جاری رہیں گے یہاں تک کہ وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کہ وہ ازل میں عہدِ توحید کے وقت ایک ذرّہ تھا کہ گویا کہنے والا بھی حق تعالیٰ تھا اور جواب دینے والا بھی حق تعالےٰ اور بظاہر

نشانہ وہ ذرہ تھا اور جو ایسا ہو جائے تو پھر مخلوق کو اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا کہ اسے وہ کسی چیز کی طرف دعوت دیں اور اسے بھی کسی کے ساتھ انس اور محبت نہیں ہوتی کہ ان کی دعوت قبول کرے اور اس قول میں بشری صفت کے فنا ہونے اور غلبہ وکشف جلال حق کی حالت میں تسلیم و رضا کی صحت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بندہ کو اس کے اپنے اوصاف سے فانی کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ محض ایک آلہ اور ایک ایسا جوہر لطیف ہو کر رہ جاتا ہے کہ اگر اس کے جگر میں نیزہ لگائیں تو بلا تمیز پار ہو جائے اور اگر صحیح و سالم پیٹھ پر لگائیں تو بے تصرف اس کو کاٹ کر رکھ دے۔

مختصر یہ ہے کہ وہ تمام اوصاف سے فانی ہو جائے۔ اس کا جسم اسرار الٰہی کے مظاہر میں سے ہو جائے یہاں تک کہ اس کی گویائی کا تعلق بھی حق تعالےٰ سے ہو۔ اس کے فعل کی نسبت بھی اسی سے اور اس کے وصف کا قیام بھی اسی سے ہے اور فقط حجت کے ثابت کرنے کے لیے شریعت کا حکم اس پر باقی رہے، ویسے وہ سب امور کے دیکھنے سے فانی ہو۔ یہ پیغمبر ﷺ کے صفت تھی کہ جب معراج کی رات آپ کو اللہ تعالےٰ نے مقام قرب حق پر پہنچا دیا تو گو اس مقام کے لیے مسافت تھی مگر آپ کی قربت بے مسافت تھی۔ آپ کا حال مخلوق کی عقل و دانش سے بعید ہو گیا اور لوگوں کے وہموں سے بالاتر۔ یہاں تک کہ عالم کون و فساد نے آپ کو کھو دیا اور آپ نے اپنے آپ کو صفت کے فنا کے مقام میں گم کر دیا، چنانچہ بے صفت متحیر ہو گئے اور طبیعت مبارک کی ترتیب اور مزاج کا اعتدال پراگندہ ہو گیا، بالآخر نفس دل کے مقام پر، دل جان کے درجہ جان باطن کے مرتبے اور باطن قرب حق کی صفت پر پہنچ گیا اور سب احوال میں آپ سب سے جدا تھے۔ آپ نے چاہا کہ وجود معدوم ہو کر جسم کو چھوڑ دے لیکن اللہ تعالےٰ کی مراد اس حجت کا قائم کرنا تھا، اس لیے فرمانِ الٰہی ہوا کہ اپنے حال پر مستقل رہیے۔ آپ نے اس فرمان سے قوت پائی، وہ قوت آپ کی قوت ہوگئی اور اس فنا سے بقا باللہ کا مقام جلوہ گر ہوا یہاں تک کہ آپ رُک گئے اور فرمایا: ”میں تم میں سے کسی ایک آدمی جیسا نہیں ہوں۔ میں تو اپنے پروردگار کے حضور میں رات بسر کرتا ہوں۔ وہی مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔“ میری زندگی اور بقا اسی کی وجہ سے ہے۔ نیز فرمایا: ”مجھے اللہ تعالےٰ کے ساتھ ایک ایسا وقت میسر ہوتا ہے کہ اس وقت میرے ساتھ نہ کسی مقرب فرشتے کی گنجائش ہوتی ہے اور نہ کسی نبی مرسل کی۔“ حضرت عبداللہ بن سہل تستری رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کی ذات اگرچہ علم سے موصوف ہے لیکن حواسِ ظاہری و باطنی سے اس کا ادراک نہیں کیا جا سکتا اور نہ وہ اس دنیا میں آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہے۔“ وہ ایمان کی حقیقت میں بغیر حد اور حلول کے موجود ہے، البتہ آخرت میں اس کو اس کی ملک اور اس کی قدرت کو ظاہر و باطن میں دیکھ لیں گی اور اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اپنی ذات کی حقیقت کے دریافت کرنے سے حجاب میں رکھا ہے اور اپنی قدرت کی نشانیوں کو مخلوق کی رہبری کا ذریعہ بنایا ہے۔ عارفین کے دل اس کو پہچانتے ہیں۔ عقلیں اس کو معلوم نہیں کر سکتیں اور مومن قیامت میں ادراک و احاطہ کیے بغیر اپنی آنکھوں سے اس کا دیدار کر سکیں گے اور یہ لفظ توحید کے تمام احکام کا جامع ہے۔

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: ”توحید الٰہی کے متعلق سب سے بزرگ اور حکیمانہ قول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہے۔ پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندوں کے لیے اپنی معرفت کی طرف سوائے اعترافِ عجز کے راستے کے اور کوئی راستہ نہیں رکھا۔“ لیکن عام لوگ اس کلمہ کے متعلق غلطی میں پڑے ہوئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ معرفت سے عاجز ہو جانا معرفت کا نہ ہونا ہے، حالانکہ یہ محال ہے اس لیے کہ عاجز ہو جانا معرفت کا نہ ہونا ہے حالانکہ یہ محال ہے اس لیے کہ عاجز ہو جانا موجود کی حالت میں ممکن ہو سکتا ہے لیکن معدوم کی حالت میں عاجز ہونا کبھی متصور نہیں ہو سکتا جیسا

کہ مردہ حالت سے عاجز نہیں ہوتا، بلکہ موت میں موت سے عاجز ہوتا ہے کیونکہ اس کی قوت کو عجز کا نام دینا محال ہے۔ اسی طرح اندھا بینائی سے عاجز نہیں ہوتا، بلکہ نابیناپن سے عاجز ہوتا ہے۔ اپاہج کھڑا ہونے سے عاجز نہیں ہوتا، بلکہ بیٹھنے کی حالت میں وہ بیٹھنے سے عاجز ہوتا ہے، جیسا کہ عارف معرفت میں معرفت کے حصول سے عاجز آ جاتا ہے اور اس وقت معرفت کا حصول اس کے لیے بمنزلہ ایک احتیاج کے ہوتا ہے۔

پس ہم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس قول کو اس بات پر محمول کرتے ہیں جو حضرت ابوسہل صعلوکی اور استاد ابو علی دقاق رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ معرفت ابتدا میں کیسی ہوتی ہے اور انتہا میں ضروری ہو جاتی ہے۔ علم ضروری وہ ہوتا ہے کہ صاحبِ علم اس علم کی موجودگی کی حالت میں اس کے ٹالنے یا لینے سے عاجز ہوتا ہے۔ پس اس قول کے مطابق توحید بندے کے دل میں محض فعل الٰہی ہوتی ہے۔ پھر شبلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: توحید جمال احدیث یعنی وحدانیت موحد کا حجاب ہوتی ہے اس لیے کہ اس توحید کو بندے کا فعل کہیں تو لامحالہ بندے کا فعل مشاہدہ حق تعالیٰ کے لیے علت نہیں ہو سکتا اور عین مشاہدے میں جو چیز کشف و مشاہدہ کی علت نہ ہو، وہ حجاب ہوتی ہے اور بندہ اپنے تمام اوصاف کے ساتھ غیر حق ہوتا ہے کیونکہ بندہ جب اپنی صفت کو حق تعالے سمجھے گا تو لامحالہ اس صفت کے موصوف کو بھی جو وہ خود ہے، حق تعالےٰ سمجھنا پڑے گا تب موحد، توحید اور احد تینوں ایک دوسرے کے وجود کی علت ہو جائیں گے اور یہ بعینہٖ نصاریٰ کا باطل عقیدہ تین میں کا تیسرا ہو جائے گا (کہ وہ خدا و عیسیٰ و روح القدس میں سے ہر ایک کو تین خداؤں میں سے تیسرا خدا اور تینوں کو پھر ایک خدا مانتے ہیں) اور جو صفت طالب کے لیے توحید میں اس کی اپنی فنا سے مانع ہو تو اس صفت کی وجہ سے وہ طالب ابھی تک توحید حق تعالےٰ سے حجاب میں ہے، موحد نہیں کیونکہ اللہ تعالےٰ کے سوا جو بھی موجود ہے، سب باطل ہے اور خود طالب بھی اللہ کے سوا ہے تو اس کی صفت بھی جمال حق تعالےٰ کے مشاہدے میں باطل ہوگئی اور لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کی یہی تفسیر ہے۔ حکایات میں یہ بات مشہور ہے کہ حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ حسین ابن منصور رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کے لیے کوفہ گئے۔ حضرت حسین رحمتہ اللہ علیہ نے پوچھا: "اے ابراہیم! تم نے اپنا وقت کس بات میں گزارا؟" انہوں نے فرمایا "کہ میں نے اپنے آپ کو توکل کے مطابق کر دیا۔" تب حضرت حسین بن منصور رحمتہ اللہ علیہ نے کہا: "اے ابراہیم! تم نے اپنی عمر اپنے باطن کی آبادی میں ضائع کر دی۔ پس توحید الٰہی میں تیرا فنا ہونا کہاں ہے؟" یعنی تجھے توحید میں فنا ہو جانا چاہیے۔ فی الجملہ توحید کی تعبیرات میں مشائخ کے بہت سے اقوال ہیں۔ ایک گروہ نے اس کو اپنی بقا سے تعبیر کیا ہے کیونکہ بقا کے سوا مشیت حق کسی چیز پر دُرست نہیں ہوتی۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اپنی فنا کے سوا توحید کی کوئی اور صفت نہیں ہو سکتی۔ ان اقوال کو جمع و تفرقہ پر قیاس کرنا چاہیے کہ بقائے بندہ، جمع اور فنائے بندہ، تفرقہ ہے تاکہ اس کی حقیقت معلوم ہو۔ میں علی بن عثمان جلابی (رحمتہ اللہ علیہ) کہتا ہوں کہ توحید الٰہی حق کی طرف سے بندے کے ساتھ اسرار ہیں، جو بیان میں ظاہر نہیں ہو سکتے کہ کوئی شخص اس کو عبارت کے طمع سے آراستہ کر کے ظاہر کر سکے، کیونکہ عبارت اور جو عبارت میں بیان کیا ہے، ایک دوسرے کا غیر ہوتے ہیں اور توحید میں غیر کو ثابت کرنا شریک کا ثابت کرنا ہے۔ تب تو وہ کھیل ہو جائے گا اور موحد الٰہی اللہ والا ہوتا ہے نہ کہ لاہی[1] (کھیلنے والا)۔ توحید کے احکام اور اس کے متعلق اہل معرفت کے اقوال و ارشادات جن کو میں نے یہاں اختصار کے طور پر بیان کر دیا ہے، یہی ہیں، واللہ اعلم۔

---

[1] غافل

سترھواں باب

تیسرے پردہ کا کھولنا۔ ایمان کی حقیقت

پہلی فصل
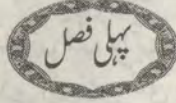
ایمان کا ثبوت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ (ﷺ) پر ایمان لاؤ۔" نیز کئی دوسرے مقامات میں فرمایا: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا (اے ایمان والو) اور پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: "ایمان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں پر ایمان لائے۔" اور ایمان سنت کی رو سے دل سے تصدیق کرنا ہے اور شریعت میں اس کے متعلق لوگوں کے مختلف اقوال ہیں، جن میں بہت اختلاف ہے۔ معتزلہ سب عبادات علمی و عملی کو ایمان کہتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ بندے کو گناہ کبیرہ کے سبب خارج از ایمان جانتے ہیں۔ خارجی لوگ بھی ایسا ہی کہتے ہیں اور بندے کو اس گناہ کی وجہ سے جو وہ کرتا ہے، کافر قرار دیتے ہیں۔ ایک دوسرا گروہ ایمان کو صرف قول کہتا ہے اور تیسرا گروہ صرف معرفت کو ایمان کہتا ہے۔ متکلمین اہل سنت و جماعت کا ایک گروہ مطلق تصدیق قلب کو ایمان کہتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایمان قلب کی ایک بسیط کیفیت کا نام ہے۔ فقط اور یہی کیفیت اقرار و عمل کا باعث ہے۔ میں نے ایمان کے بیان میں ایک علیحدہ کتاب لکھی ہے اور یہاں صرف مشائخ صوفیا کے اعتقاد کا ثابت کرنا مراد ہے۔ یاد رکھو کہ مشائخ صوفیا دو قسم کے ہیں: ایک گروہ کہتا ہے کہ قول، تصدیق اور عمل سے ایمان عبارت ہے، جیسا کہ حضرت فضیل بن عیاض، بشر حافی، خیر النساج، سمنون المحب، ابو حمزہ بغدادی، محمد حریری اور ان کے سوا اور بہت سے بزرگ فقہاء اور اہل یقین رحمۃ اللہ علیہم بھی اس نظریے کے قائل ہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ایمان قول و تصدیق کا نام ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم بن ادہم، ذوالنون مصری، بایزید بسطامی، ابو سلیمان دارانی و حارث محاسبی، جنید بغدادی، سہل بن عبد اللہ تستری، شقیق بلخی، حاتم اصم، محمد بن فضل البلخی رحمہم اللہ، اور ان کے سوا فقہائے اُمت کی ایک جماعت، جیسا کہ امام مالک و امام شافعی و احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم پہلے قول کے مطابق ہیں اور امام ابو حنیفہ و حسین بن فضل بلخی اور امام ابو حنیفہ کے اصحاب، مثلاً امام ابو یوسف و محمد بن حسن اور داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہم دوسرے قول کے مطابق ہیں، لیکن حقیقت میں یہ اختلاف صرف لفظی ہے، معنوی نہیں۔ اب میں ایمان کے معنی مختصر طور پر بیان کرتا ہوں تاکہ حقیقت معلوم ہو جائے اور تو اس اختلاف کی وجہ سے کسی کو ایمان میں اصل کے خلاف نہ سمجھے، ان شاء اللہ تعالیٰ اور توفیق قبضۂ الٰہی میں ہے۔

دوسری فصل
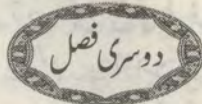
تحقیقِ ایمان

جان لو کہ تمام اہلِ سنت و جماعت و اہل تحقیق و معرفت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایمان کا ایک اصل ہے اور ایک فرع۔ ایمان کا اصل تو دل سے تصدیق کرنا ہے اور اس کی فرع حکم الٰہی کی تعمیل اور عادت۔ یہ عرف میں یوں ہے کہ کسی چیز کو استعارہ اور مجاز کے طور پر اس کے اصل نام سے پکارتے ہیں، جیسا کہ آفتاب کے نور کو سب زبانوں

میں آفتاب ہی کہتے ہیں اسی لحاظ سے وہ جماعت عبادت کو ہی ایمان کہتی ہے، کیونکہ بندہ اس کے بغیر عذاب سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور جب تک امر الٰہی کے احکام بجانہ لائے محض تصدیق کافی نہیں۔

پس جس کی بندگی زیادہ ہو گی، عذاب سے اس کو امن بھی زیادہ ہو گا چونکہ عبادت تصدیق اور قول کے ساتھ امن کی علت ہے، اس لئے انہوں نے عبادت ہی کو ایمان کہہ دیا۔ ایک گروہ جو کہتا ہے کہ امن کی علت معرفت الٰہی ہے نہ بندگی، کیونکہ اگر عبادت حاصل ہو اور معرفت موجود نہ ہو تو وہ عبادت کچھ سود مند نہ ہو گی اور اگر معرفت موجود ہے، عبادت نہیں تو آخرکار نجات پالے گا، گوکہ اس کا حکم مشیت الٰہی ہے خواہ خداوند تعالیٰ خود اپنے فضل سے اس کی لغزش کو معاف کر دے یا پیغمبر علیہ السلام کی شفاعت سے بخش دے یا اس کے جرم کے برابر سزا دے کر دوزخ سے نجات دے اور بہشت میں پہنچا دے۔ پس اہل معرفت اگرچہ مجرم ہوں، معرفت کے سبب سے ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہیں گے۔ رہے عمل والے لوگ تو وہ محض عمل کی وجہ سے بغیر معرفت الٰہی کے بہشت میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ پس معلوم ہوا کہ عبادت امن کی علت نہیں ہے۔ اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے، جیسا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے: ''تم میں سے کوئی اپنے عمل کی وجہ سے نجات نہیں پا سکے گا۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا آپ بھی اپنے عمل کی وجہ سے نجات نہیں پائیں گے؟ تو آپ نے فرمایا: اور میں بھی نجات نہیں پاؤں گا، مگر اسی صورت میں کہ اللہ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے۔'' پس ثابت ہوا کہ ایمان فی الحقیقت معرفت الٰہی ہی ہے۔ اس پر پوری اُمت کا اتفاق ہے اور اقرار عمل کا قبول کرنا ہے اور جو شخص خدا کو پہچانتا ہے، وہ اس کے اوصاف میں سے کسی وصف کی وجہ سے ہی پہچانتا ہے، اس لئے خاص الخاص اوصاف تین قسم کے ہیں، یعنی اول وہ جو اس کے جمال سے تعلق رکھتے ہیں، دوسرے کمال سے اور تیسرے جلال سے۔ پس وہ شخص جس کا شاہد معرفت میں جمال الٰہی ہو، وہ ہمیشہ دید و مشاہدے کا مشتاق رہتا ہے اور جس کا شاہد معرفت میں جلال الٰہی ہو، وہ ہمیشہ اپنے اوصاف سے نفرت کرتا ہے اور اس کا دل ہمیشہ خوف اور ہیبت کے محل میں ہوتا ہے۔ اب رہ گیا کمال سو جو شخص اس کے کمال سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے لئے اس کے کمال تک پہنچنے کی کوئی سبیل نہیں، بجز اس کے کہ وہ اس کے کمال کو تو ثابت کریں اور نقص کی اس سے نفی کریں۔ پس شوق محبت کی تاثیر ہے اور نفرت بشریت کے اوصاف میں سے ہے۔ اس لئے کہ بشریت کے حجاب کا کھلنا محبت کے سوا اور کسی طرح ممکن نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ ایمان و معرفت کی انتہا عشق و محبت ہے اور محبت کی علامت بندگی ہے کیونکہ جب دل محبت اور مشاہدے کا محل ہے، آنکھ رویت کا محل اور جان عبرت کا تو جسم کو چاہئے کہ امر الٰہی کا تارک نہ ہو اور جو شخص امر الٰہی کا تارک ہو، اس کو امر الٰہی کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔ یہ فساد ہمارے زمانے کے صوفیوں کے درمیان ظاہر ہوا ہے کہ ملحدین کے ایک گروہ نے ان صوفیوں کے جمال کو دیکھا اور ان کی قدر اور مرتبے کو معلوم کیا تو اپنے آپ کو بھی ان کی مانند کر لیا اور کہنے لگے کہ عبادات اور اعمال کی یہ تکلیف تو اسی وقت تک ہے کہ تو نے اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچانا۔ جب تو نے اس کو پہچان لیا تو عبادت جسم سے اُٹھ گئی حالانکہ یہ فاش خطا ہے کیونکہ جب اس نے پہچان لیا تو چاہیے کہ دل شوق کا محل ہو جائے اور اس کے حکم کی تعظیم اور زیادہ ہو جائے۔ ہاں، ہم اس بات کو جائز رکھتے ہیں کہ فرماں بردار اس درجے پر پہنچ جائے کہ عبادت کی تکلیف اس سے اُٹھ جائے، بلکہ اس سے اُٹھا دیں۔ اس طرح اس کے ادا کرنے پر اس کو زیادہ توفیق دیں یہاں تک کہ جو امر لوگ تکلیف سے ادا کرتے ہیں، اسے ادا کرنے میں کوئی تکلیف نہ ہو، لیکن یہ بات سوائے بے قرار کرنے

والے شوق کے پیدا نہیں ہو سکتی۔

ایک اور گروہ ہے جو ایمان کو سب اللہ کی طرف سے سمجھتے ہیں اور دوسرا گروہ سب ایمان کو بندے کی طرف سے سمجھتا ہے اور ملک ماوراء النہر میں یہ اختلاف لوگوں کے درمیان بہت بڑھ گیا ہے۔ پس جو شخص کہتا ہے کہ ایمان سب اللہ کی طرف سے ہے، اس کا یہ قول جبر محض ہے، اس لئے کہ بندے کو اس میں مضطر و مجبور ہونا پڑتا ہے اور جو شخص کہتا ہے کہ ایمان سب بندے کی طرف سے ہے، اس کا یہ قول قدر محض ہے کیونکہ بندہ اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر اس کو جان نہیں سکتا۔ حقیقت میں توحید کا طریقہ جبر سے نیچے اور قدر سے اوپر ہے۔ ایمان بندے کا فعل ہے جس کے ساتھ حق کی ہدایت ملی ہوئی ہے کہ اس کا گمراہ کیا ہوا شخص راستے پر آ نہیں سکتا اور اس کا راستے پر لایا ہوا شخص کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ فرمایا ہے: "اللہ جس کو ہدایت کرنا چاہتا ہے، اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جس کو وہ گمراہ کرنا چاہتا ہے، اس کے راستے کو تنگ اور سخت کر دیتا ہے۔" اس اصل کے مطابق چاہیے کہ ایمان یا اسلام کی طرف میلان حق تعالیٰ کی ہدایت ہو اور مائل ہونا بندے کا فعل ہو۔ پس دل میں مائل ہونے کی علامت توحید الٰہی کا اعتقاد کرنا ہے اور آنکھ کا حرام چیزوں سے بچنا اور نشانات و دلائل قدرت دیکھ کر عبرت حاصل کرنا، کان کا کلام الٰہی کا سننا، معدے کا اکل حرام سے خالی ہونا، زبان کا سچ بولنا اور بدن کا حرام باتوں سے پرہیز کرنا ہے تاکہ اعتقاد و دعویٰ کے ساتھ موافق ہو جائے یعنی زبان سے جو اس نے ایمان کا دعویٰ کیا ہے، وہ حقیقت میں اس کے عمل کے موافق ہو۔ اسی وجہ سے اس گروہ نے ایمان کی زیادتی میں زیادتی اور کمی کو روا رکھا ہے حالانکہ ایمان کی معرفت میں کمی بیشی روا نہیں کیونکہ اگر معرفت زیادہ یا کم ہو سکتی تو چاہیے تھا کہ جس کی معرفت حاصل کی گئی ہے وہ بھی کم و بیش ہو جاتا۔ جب اس چیز میں کمی بیشی روا نہیں جس کی معرفت حاصل کی گئی ہے تو معرفت میں کمی بیشی کیسے ممکن ہو سکتی ہے، کیونکہ ناقص معرفت معرفت ہی نہیں۔ پس چاہیے کہ بیشی اور کمی فروع اور عمل کے اندر ہو۔ سب کا اتفاق ہے کہ عبادات میں کمی بیشی روا ہے اور حشوی لوگوں کا، جو مذکورہ بالا دونوں فرقوں سے اپنے آپ کو نسبت دیتے ہیں، یہ کہنا کسی طرح دُرست معلوم نہیں ہوتا کہ عبادت منجملہ ایمان کے ہے، جب کہ انہیں کا دوسرا فریق ایمان کو قول کے سوا کچھ نہیں مانتا لیکن طلب حق میں یہ دونوں باتیں ناانصافی ہیں۔ ایمان کی حقیقت میں بندے کے کل اوصاف کا طلب حق میں مستغرق ہو جانا ہے اور سب طالبانِ حق کو اس بات پر اتفاق کرنا چاہیے کہ معرفت کے سلطان کا غلبہ ناشناسی کے اوصاف کو مغلوب کرنے والا ہوتا ہے اور جہاں ایمان ہو، وہاں سے ناشناسی کے اسباب دُور ہو جاتے ہیں، کیونکہ بزرگوں نے کہا ہے: "جب صبح نمودار ہوئی تو چراغ بے نور ہو گیا۔" دن کو دلیل سے ظاہر نہیں کر سکتے کیونکہ

ع آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو برباد کر دیتے ہیں۔" مطلب یہ ہے کہ جب معرفت کی حقیقت عارف کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے تو ناشناسی کے ظن اور شک کی حکومت فانی ہو جاتی ہے اور معرفت کی سلطنت حواس اور اس کی خواہش کو اپنا مطیع کر لیتی ہے، یہاں تک کہ جس چیز کو وہ دیکھتا ہے یا جو کچھ وہ کرتا ہے اور کہتا ہے سب حکم الٰہی ہی کے دائرے میں آ جاتا ہے۔ ایک دفعہ میں نے ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ سے ایمان کی حقیقت کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ "میں تو اس کا جواب نہیں دے سکتا کیونکہ جو کچھ میں کہوں گا، وہ عبارت ہو گی، حالانکہ مجھے چاہیئے کہ میں اس کا جواب عمل سے دوں، البتہ میں مکہ مکرمہ کا قصد رکھتا ہوں اور تو بھی

وہاں جانے کا ارادہ رکھتا ہے، لہٰذا اس راستے میں تو میرے ساتھ صحبت رکھ تاکہ تو اپنے سوال کا جواب پا سکے۔" میں نے کہا: بہت اچھا۔ جب ہم جنگل میں چلے گئے تو ہر رات دو روٹیاں اور دو پیالے پانی کے نمودار ہوتے۔ ایک مجھے دے دیتے اور دوسرا آپ اٹھا لیتے۔ یہاں تک کہ جنگل کے اندر ایک بوڑھا سوار آ گیا۔ جب اس نے آپ کو دیکھا تو وہ گھوڑے سے اتر آیا۔ انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کچھ پوچھا اور کچھ دیر باتیں کیں۔ پھر وہ بوڑھا گھوڑے پر سوار ہو کر واپس چلا گیا۔ میں نے عرض کیا: "اے شیخ! وہ بوڑھا کون تھا؟" تو آپ نے فرمایا: "وہ تیرے سوال کا جواب تھا۔" میں نے کہا: "وہ کس طرح؟" تو آپ نے فرمایا کہ "وہ خضر علیہ السلام تھے جو میری ہم نشینی چاہتے تھے، مگر میں نے قبول نہیں کیا۔" میں نے پوچھا: "یہ کیوں؟" آپ نے فرمایا کہ "میں اس بات سے ڈرا کہیں ان کی صحبت میں حق تعالیٰ کو چھوڑ کر ان پر بھروسا نہ کروں اور اس طرح میرا توکل برباد ہو جائے حالانکہ ایمان کی حقیقت توکل کی حفاظت کرنا ہے۔" چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "اللہ پر بھروسا کرو اگر تم مومن ہو۔" اور حضرت محمد بن خفیف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "ایمان دل سے اس امر کی تصدیق کرنا ہے جو اس کو غیب سے معلوم ہوا ہے یعنی جو کچھ غیب سے اس پر ظاہر کریں اور اس کو سکھائیں۔" اس لئے کہ صحیح ایمان غیب ہی پر ایمان لانا ہے اور خداوند تعالیٰ جو سر کی آنکھوں سے دیکھا نہیں جا سکتا، اس کی تائید کے سوا جو بندے کے یقین میں ظاہر ہوتی ہے، اس پر یقین نہیں لا سکتے اور یہ صرف خداوند تعالیٰ کے آگاہ کرنے اور شناسا کرنے سے ہی ہو سکتا ہے، جیسا کہ وہ حقیقت جس کو عارف پہچانتے اور عالم جانتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے آگاہ کرنے اور شناسا کرنے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے، جس نے ان کے دل میں معرفت اور علم پیدا کر دیا۔ پس علم اور معرفت کا تعلق ان کے کسب سے نہیں ہے اس لئے مومن اور واصل بحق حقیقت میں وہی ہے، چونکہ اس کتاب کے سوا اور جگہ بھی اس معنی کے متعلق میرا بہت کلام ہے، اس لئے یہاں اتنے بیان پر ہی میں نے اکتفا کیا ہے تاکہ کتاب طویل نہ ہو جائے اور اتنا بیان اہل بصیرت کے لیے کافی ہے۔ اب میں اعمال کی طرف رجوع کرتا ہوں اور ان سے پردہ ہٹاتا ہوں، ان شاءاللہ تعالیٰ۔

اٹھارہواں باب

چوتھے پردے کا کھولنا

طہارت

ایمان لانے کے بعد سب سے پہلی چیز جو بندے پر فرض ہے، وہ نماز ادا کرنے کے لیے طہارت ہے اور وہ بدن کو نجاست[1] اور جنابت[2] سے پاک کرنا ہے۔ شریعت کے مطابق تین اعضا یعنی منہ، ہاتھ اور پیر کا دھونا، سر کا مسح کرنا، پانی نہ ہونے یا مرض کی شدت کی حالت میں تیمّم کرنا ہے اور اس کے احکام خود معلوم ہیں، مگر جاننا چاہئے کہ طہارت دو قسم کی ہوتی ہے: ایک تو جسم کی طہارت، دوسرے دل کی طہارت۔ جیسا کہ بدنی طہارت کے بغیر نماز درست نہیں، اسی طرح دلی طہارت کے بغیر معرفت حق درست نہیں ہوتی۔ جس طرح بدنی طہارت کے لئے خالص پانی کی ضرورت ہے اور دوسری اشیاء سے ملا ہوا اور مستعمل پانی درکار نہیں، اسی طرح دل کی طہارت کے لئے خالص توحید الٰہی چاہیے، خلط ملط اور پریشان اعتقاد درکار نہیں۔ پس صوفیا کا گروہ ہمیشہ ظاہر میں بدنی طہارت کے ساتھ رہتا ہے اور باطن میں دل کی طہارت یعنی توحید خالص کے ساتھ۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی سے فرمایا:

"تو ہمیشہ باوضو رہ تاکہ تجھے دونوں محافظ فرشتے دوست رکھیں۔"

پس جو شخص ظاہر میں طہارت پر مداومت کرتا ہے، ملائکہ اس کو دوست رکھتے ہیں لیکن جو شخص باطن میں توحید الٰہی پر قائم ہے، اس کو خداوند تعالیٰ دوست رکھتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ دُعا میں فرمایا کرتے تھے: "اے اللہ! میرے دل کو نفاق سے پاک کر دے۔" حالانکہ کسی وجہ سے بھی نفاق آپ کے دل میں متصور نہیں ہو سکتا، لیکن اپنی بزرگیوں کا دیکھنا ہی آپ کو غیر کا ثابت کرنا معلوم ہوا اور غیر کا ثابت کرنا محل توحید میں نفاق لاتا ہے، گو کہ مشائخ کی کرامات میں سے ایک ذرّہ بھی مریدوں کی آنکھ کا سرمہ ہے مگر وہ کمال صاحب کمال کے لئے ایک حجاب ہی رہا ہے۔ اس لئے کہ جو کچھ غیر اللہ ہو اس کا دیکھنا آفت ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: "عارفوں کا نفاق طالبوں کے اخلاص سے بہتر ہے"، یعنی جو کچھ مرید کا مقام ہوتا ہے، وہ کامل کا حجاب ہوتا ہے کیونکہ مرید کا قصد تو یہ ہوتا ہے کہ کرامت حاصل کرے اور کامل کا قصد یہ ہوتا ہے کہ کرامت عطا کرنے والی ذات حق تعالیٰ کو پالے۔ الغرض کرامات کا ثابت کرنا اہل حق کے لئے نفاق معلوم ہوتا ہے، غرض یہ کہ جو بات غیر اللہ کے معائنہ کی قسم سے ہے، وہ بھی ایسا ہی نفاق معلوم ہوتی ہے۔

پس دوستانِ حق تعالیٰ کی آفت جملہ اہل معصیت کی معصیت سے خلاصی ہے اور اہل معصیت کی آفت سب اہل ضلالت کی ضلالت سے نجات ہے، کیونکہ اگر کافر جان لیں کہ ان کی نافرمانی خدا تعالیٰ کو ناپسند ہے جیسا کہ گناہ گار جانتے ہیں تو سب کفر سے چھوٹ جائیں اور اگر گناہ گار جان لیں کہ ان کے سب عمل نقصان کا محل ہیں جیسا کہ دوست جانتے ہیں تو وہ سب معصیت سے نجات پا جائیں اور سب آفتوں اور گناہوں سے پاک ہو جائیں۔ پس چاہیے کہ ظاہر کی طہارت باطن کی طہارت کے موافق ہو یعنی جب ہاتھ دھوئے تو چاہیے کہ دل کو بھی دنیا کی جحت سے

---

[1] بول براز، خون اور پیشاب وغیرہ، یہ ظاہری اور حقیقی ناپاکی ہے۔ [2] حکمی پلیدی یعنی وہ پلیدی جس کے بعد انسان پر غسل واجب ہو جاتا ہے۔

دھودے اور جب استنجا کرے تو چاہیے کہ جس طرح اس نے ظاہری نجاست سے نجات ڈھونڈی ہے اسی طرح باطن میں غیر کی محبت سے بھی نجات ڈھونڈے۔ جب منہ میں پانی ڈالے تو چاہیے کہ اپنے منہ کو غیر کے ذکر سے خالی کر دے اور جب ناک میں پانی ڈالے تو چاہیے کہ ناجائز چیزوں کے سونگھنے کو اپنے اوپر حرام کر دے۔ جب منہ دھوئے تو چاہیے کہ تمام مرغوبات نفس سے یک لخت اعراض کرے اور حق تعالیٰ کی طرف توجہ کرے اور جب ہاتھوں کو دھوئے تو چاہیے کہ اپنی تمام لذات دنیوی سے ہاتھ اٹھالے۔ جب سر کا مسح کرے تو چاہیے کہ اپنے تمام امور کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے اور جب پاؤں دھوئے تو چاہیے کہ سوائے موافق حکم الٰہی کے کھڑا نہ ہو تاکہ دونوں طہارتیں اس کو حاصل ہو جائیں کیونکہ شریعت کے تمام ظاہری کام باطن کے دور سے وابستہ ہیں، جیسا کہ ایمان میں بظاہر زبان کا قول دل کی تصدیق کے ساتھ وابستہ ہے اور شریعت میں بندگی کے احکام ظاہر بدن پر دل کی نیت کے ساتھ مربوط ہیں پس دل کی طہارت کا طریقہ دنیا کی حیرانی میں تدبر اور تفکر کرنا اور یہ دیکھنا ہے کہ دنیا ایک بے وفا جگہ اور فنا کا مقام ہے، لہٰذا دل کو اس سے خالی کر دے اور یہ بات سخت مجاہدہ کیے بغیر حاصل نہیں ہوتی اور سب سے ضروری مجاہدہ ظاہر کے آداب کی حفاظت کرنا اور سب احوال میں ان پر مداومت کرنا ہے۔

حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "مجھے خداوند تعالیٰ کا حق ادا کرنے کے لئے دنیا میں ابدی عمر چاہیے تاکہ اگر سب لوگ دنیا کی نعمتوں میں مشغول ہو کر حق تعالیٰ کو فراموش کر دیں تو میں دنیا کی مصیبت میں شریعت کے آداب کی حفاظت پر قائم رہ کر حق تعالیٰ کو یاد رکھوں۔" روایت ہے کہ ابوجعفر حرمی رحمتہ اللہ علیہ چالیس سال تک مکہ میں مجاور رہے اور حرم کعبہ کے اندر طہارت نہیں کی بلکہ ہر بار طہارت کے لئے حرم کی حد سے باہر جاتے اور فرماتے کہ جس زمین کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے، میں ناپسند کرتا ہوں کہ مستعمل پانی اس پر گراؤں۔ حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ رے کی جامع مسجد میں دردِ شکم میں مبتلا تھے تو ایک دن رات میں آپ نے ساٹھ غسل کیے تھے اور آخر کار آپ کی وفات بھی پانی میں ہی ہوئی۔

ابوعلی رودباری رحمتہ اللہ علیہ کچھ مدت طہارت میں وسوسے کی بیماری میں مبتلا رہے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک دن میں صبح کے وقت دریا پر چلا گیا اور سورج نکلنے تک وہاں رہا۔ اس عرصے میں میرا دل رنجیدہ ہوا۔ میں نے عرض کیا: "اے بارِ خدایا! آرام دے، آرام دے، آرام دے۔" دریا میں سے ہاتف نے آواز دی کہ "آرام علم میں ہے۔"

حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ وفات کے دن بیماری میں آپ نے ہر نماز کے لئے ساٹھ بار طہارت فرمائی اور فرمایا: "یہ اس لئے تاکہ جس وقت حکم الٰہی آئے تو میں اس وقت طہارت کے ساتھ حاضر ہوں۔" کہتے ہیں کہ حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ نے مسجد میں داخل ہونے کے لئے وضو کیا تو ہاتف نے آواز دی کہ "تو نے ظاہر کو آراستہ کر لیا، باطن کی صفائی کہاں ہے؟" آپ وہاں سے واپس لوٹے اور سارا مال واسباب راہِ خدا میں دے دیا اور ایک سال تک اتنے کپڑے کے سوا نہ پہنا جس سے نماز درست ہو جائے۔ پھر حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے پاس آئے تو انہوں نے فرمایا: "اے ابوبکر! وہ نہایت مفید طہارت تھی جو تو نے کی، اللہ تعالیٰ تجھے ہمیشہ پاک رکھے۔" آپ نے فرمایا کہ اس کے بعد آپ کبھی بے طہارت نہ رہے، یہاں تک کہ جب آپ دُنیا سے رُخصت ہونے لگے تو آپ کا وضو ٹوٹ گیا۔ آپ نے ایک مرید کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ مجھے طہارت کرا دے چنانچہ اس نے آپ کو وضو کرا دیا اور ریش مبارک کا خلال کرنا بھول گیا اور آپ اس وقت بول نہ سکتے تھے۔ مرید کا ہاتھ پکڑ کر ریش مبارک کی طرف اشارہ فرمایا

اٹھارہواں باب

چوتھے پردے کا کھولنا

طہارت

ایمان لانے کے بعد سب سے پہلی چیز جو بندے پر فرض ہے، وہ نماز ادا کرنے کے لیے طہارت ہے اور وہ بدن کو نجاست[1] اور جنابت[2] سے پاک کرنا ہے۔ شریعت کے مطابق تین اعضا یعنی منہ، ہاتھ اور پیر کا دھونا، سر کا مسح کرنا، پانی نہ ہونے یا مرض کی شدت کی حالت میں تیمّم کرنا ہے اور اس کے احکام خود معلوم ہیں، مگر جاننا چاہئے کہ طہارت دو قسم کی ہوتی ہے: ایک تو جسم کی طہارت، دوسرے دل کی طہارت۔ جیسا کہ بدنی طہارت کے بغیر نماز درست نہیں، اسی طرح دلی طہارت کے بغیر معرفت حق درست نہیں ہوتی۔ جس طرح بدنی طہارت کے لئے خالص پانی کی ضرورت ہے اور دوسری اشیاء سے ملا ہوا اور مستعمل پانی درکار نہیں، اسی طرح دل کی طہارت کے لئے خالص توحید الٰہی چاہیے، خلط ملط اور پریشان اعتقاد درکار نہیں۔ پس صوفیا کا گروہ ہمیشہ ظاہر میں بدنی طہارت کے ساتھ رہتا ہے اور باطن میں دل کی طہارت یعنی توحید خالص کے ساتھ۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی سے فرمایا:

"تو ہمیشہ باوضو رہ تا کہ تجھے دونوں محافظ فرشتے دوست رکھیں۔"

پس جو شخص ظاہر میں طہارت پر مداومت کرتا ہے، ملائکہ اس کو دوست رکھتے ہیں لیکن جو شخص باطن میں توحید الٰہی پر قائم ہے، اس کو خداوند تعالیٰ دوست رکھتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ دُعا میں فرمایا کرتے تھے: "اے اللہ! میرے دل کو نفاق سے پاک کردے۔" حالانکہ کسی وجہ سے بھی نفاق آپ کے دل میں متصور نہیں ہوسکتا، لیکن اپنی بزرگیوں کا دیکھنا ہی آپ کو غیر کا ثابت کرنا معلوم ہوا اور غیر کا ثابت کرنا محل توحید میں نفاق لاتا ہے، گو کہ مشائخ کی کرامات میں سے ایک ذرّہ بھی مریدوں کی آنکھ کا سرمہ ہے مگر وہ کمال صاحب کمال کے لئے ایک حجاب ہی رہا ہے۔ اس لئے کہ جو کچھ غیر اللہ ہو اس کا دیکھنا آفت ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: "عارفوں کا نفاق طالبوں کے اخلاص سے بہتر ہے"، یعنی جو کچھ مرید کا مقام ہوتا ہے، وہ کامل کا حجاب ہوتا ہے کیونکہ مرید کا قصد تو یہ ہوتا ہے کہ کرامت حاصل کرے اور کامل کا قصد یہ ہوتا ہے کہ کرامت عطا کرنے والی ذات حق تعالیٰ کو پالے۔ الغرض کرامات کا ثابت کرنا اہل حق کے لئے نفاق معلوم ہوتا ہے، غرض یہ کہ جو بات غیر اللہ کے معائنہ کی قسم سے ہے، وہ بھی ایسا ہی نفاق معلوم ہوتی ہے۔

پس دوستانِ حق تعالیٰ کی آفت جملہ اہل معصیت کی معصیت سے خلاصی ہے اور اہل معصیت کی آفت سب اہل ضلالت کی ضلالت سے نجات ہے، کیونکہ اگر کافر جان لیں کہ ان کی نافرمانی خداتعالیٰ کو ناپسند ہے جیسا کہ گناہ گار جانتے ہیں تو سب کفر سے چھوٹ جائیں اور اگر گناہ گار جان لیں کہ ان کے سب عمل نقصان کا محل ہیں جیسا کہ دوست جانتے ہیں تو وہ سب معصیت سے نجات پا جائیں اور سب آفتوں اور گناہوں سے پاک ہو جائیں۔ پس چاہیے کہ ظاہر کی طہارت باطن کی طہارت کے موافق ہو یعنی جب ہاتھ دھوئے تو چاہیے کہ دل کو بھی دنیا کی جحت سے

---

[1] بول براز، خون اور پیشاب وغیرہ، یہ ظاہری اور حقیقی ناپاکی ہے۔ [2] حکمی پلیدی یعنی وہ پلیدی جس کے بعد انسان پر غسل واجب ہو جاتا ہے۔

دھودے اور جب استنجا کرے تو چاہیے کہ جس طرح اس نے ظاہری نجاست سے نجات ڈھونڈی ہے اسی طرح باطن میں غیر کی محبت سے بھی نجات ڈھونڈے۔ جب منہ میں پانی ڈالے تو چاہیے کہ اپنے منہ کو غیر کے ذکر سے خالی کر دے اور جب ناک میں پانی ڈالے تو چاہیے کہ ناجائز چیزوں کے سونگھنے کو اپنے اوپر حرام کر دے۔ جب منہ دھوئے تو چاہیے کہ تمام مرغوبات نفس سے یک لخت اعراض کرے اور حق تعالیٰ کی طرف توجہ کرے اور جب ہاتھوں کو دھوئے تو چاہیے کہ اپنی تمام لذات دنیوی سے ہاتھ اٹھالے۔ جب سر کا مسح کرے تو چاہیے کہ اپنے تمام امور کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے اور جب پاؤں دھوئے تو چاہیے کہ سوائے موافق حکم الٰہی کے کھڑا نہ ہو تاکہ دونوں طہارتیں اس کو حاصل ہو جائیں کیونکہ شریعت کے تمام ظاہری کام باطن کے دور سے وابستہ ہیں، جیسا کہ ایمان میں بظاہر زبان کا قول دل کی تصدیق کے ساتھ وابستہ ہے اور شریعت میں بندگی کے احکام ظاہر بدن پر دل کی نیت کے ساتھ مربوط ہیں پس دل کی طہارت کا طریقہ دنیا کی حیرانی میں تدبر اور تفکر کرنا اور یہ دیکھنا ہے کہ دنیا ایک بے وفا جگہ اور فنا کا مقام ہے، لہٰذا دل کو اس سے خالی کر دے اور یہ بات سخت مجاہدہ کیے بغیر حاصل نہیں ہوتی اور سب سے ضروری مجاہدہ ظاہر کے آداب کی حفاظت کرنا اور سب احوال میں ان پر مداومت کرنا ہے۔

حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "مجھے خداوند تعالیٰ کا حق ادا کرنے کے لئے دنیا میں ابدی عمر چاہیے تاکہ اگر سب لوگ دنیا کی نعمتوں میں مشغول ہو کر حق تعالیٰ کو فراموش کر دیں تو میں دنیا کی مصیبت میں شریعت کے آداب کی حفاظت پر قائم رہ کر حق تعالیٰ کو یاد رکھوں۔" روایت ہے کہ ابو جعفر حرمی رحمتہ اللہ علیہ چالیس سال تک مکہ میں مجاور رہے اور حرم کعبہ کے اندر طہارت نہیں کی بلکہ ہر بار طہارت کے لئے حرم کی حد سے باہر جاتے اور فرماتے کہ جس زمین کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے، میں ناپسند کرتا ہوں کہ مستعمل پانی اس پر گراؤں۔ حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ رے کی جامع مسجد میں دردِ شکم میں مبتلا تھے تو ایک دن رات میں آپ نے ساٹھ غسل کیے تھے اور آخر کار آپ کی وفات بھی پانی میں ہی ہوئی۔

ابو علی رود باری رحمتہ اللہ علیہ کچھ مدت طہارت میں وسوسے کی بیماری میں مبتلا رہے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک دن میں صبح کے وقت دریا پر چلا گیا اور سورج نکلنے تک وہاں رہا۔ اس عرصے میں میرا دل رنجیدہ ہوا۔ میں نے عرض کیا: "اے بارِ خدایا! آرام دے، آرام دے، آرام دے۔" دریا میں سے ہاتف نے آواز دی کہ "آرام علم میں ہے۔"

حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ وفات کے دن بیماری میں آپ نے ہر نماز کے لئے ساٹھ بار طہارت فرمائی اور فرمایا: "یہ اس لئے تاکہ جس وقت حکم الٰہی آئے تو میں اس وقت طہارت کے ساتھ حاضر ہوں۔"

کہتے ہیں کہ حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ نے مسجد میں داخل ہونے کے لئے وضو کیا تو ہاتف نے آواز دی کہ "تو نے ظاہر کو آراستہ کر لیا، باطن کی صفائی کہاں ہے؟" آپ وہاں سے واپس لوٹے اور سارا مال و اسباب راہِ خدا میں دے دیا اور ایک سال تک اتنے کپڑے کے سوا نہ پہنا جس سے نماز درست ہو جائے۔ پھر حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے پاس آئے تو انہوں نے فرمایا: "اے ابوبکر! وہ نہایت مفید طہارت تھی جو تو نے کی، اللہ تعالیٰ تجھے ہمیشہ پاک رکھے۔" آپ نے فرمایا کہ اس کے بعد آپ کبھی بے طہارت نہ رہے، یہاں تک کہ جب آپ دُنیا سے رُخصت ہونے لگے تو آپ کا وضو ٹوٹ گیا۔ آپ نے ایک مرید کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ مجھے طہارت کرادے چنانچہ اس نے آپ کو وضو کرادیا اور ریش مبارک کا خلال کرنا بھول گیا اور آپ اس وقت بول نہ سکتے تھے۔ مرید کا ہاتھ پکڑ کر ریش مبارک کی طرف اشارہ فرمایا

یہاں تک کہ اس نے خلال کر دیا۔

نیز آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: "میں نے طہارت کے آداب میں سے کوئی ادب ترک نہیں کیا مگر اس وقت جب کہ میرے دل میں غرور سا پیدا ہوگیا۔" حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "جب میرے دل میں دُنیا کا خیال گزرتا ہے تو میں وضو کر لیتا ہوں اور جب عقبیٰ کا خیال آتا ہے تو غسل کر لیتا ہوں کیونکہ دنیا حادث ہے اور اس کا خیال حدث (بے وضو) ہوتا ہے اور عقبیٰ غیبت اور آرام کا محل ہے اور اس کا خیال جنابت یعنی حکمی ناپاکی موجب غسل ہے۔ پس حدث سے وضو واجب ہوتا ہے اور جنابت سے غسل۔"

حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک روز آپ نے وضو کیا۔ جب مسجد میں آئے تو آپ کے دل میں ندا آئی کہ "اے ابوبکر! کیا تو وہ طہارت رکھتا ہے کہ اس بے باکی کے ساتھ ہمارے دربار میں داخل ہوا؟" آپ یہ ندا سن کر واپس لوٹے تو ندا آئی کہ "ہماری درگاہ سے واپس لوٹ کر کہاں جائے گا؟"۔ آپ نے نعرہ مارا تو ندا ہوئی کہ "کیا تو ہم پر طعنہ زنی کرتا ہے؟" آپ اسی جگہ پر خاموش کھڑے ہو گئے تو ندا آئی کہ "کیا تو ہمارے سامنے مصیبت برداشت کرنے کا دعویٰ کرتا ہے؟" حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ نے عرض کیا: "اے مولا! تجھ سے تیری ہی جناب میں فریاد ہے۔"

طہارت کی تحقیق کے متعلق مشائخ کرام کا بہت سا کلام ہے اور انہوں نے اپنے مریدوں کو حق تعالیٰ کی درگاہ کا قصد کرتے وقت ظاہر و باطن کی طہارت پر مداومت کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ جب کوئی شخص ظاہر میں عمل کا قصد کرے تو اسے چاہئے کہ ظاہر میں وضو کرے اور جب باطن میں قربِ حق کا قصد کرے تو اسے چاہئے کہ باطن کی طہارت کرے۔ ظاہر کی طہارت پانی سے ہوتی ہے اور باطن کی طہارت توبہ کرنے اور اللہ تعالیٰ کی جناب میں رجوع کرنے سے۔ اب میں توبہ اور اس کے متعلقہ امور کا حکم کھول کر بیان کرتا ہوں تاکہ تم اس کی حقیقت بھی معلوم ہو جائے، ان شاءاللہ تعالیٰ۔
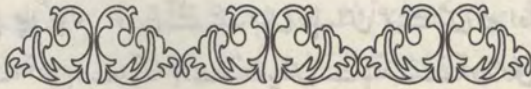
اُنیسواں باب

توبہ اور اس کے متعلق دوسرے اُمور کے بیان میں

پہلی فصل
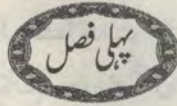
توبہ کی حقیقت

جاننا چاہیے کہ سالکانِ راہِ حق کا پہلا مقام توبہ ہے، جیسا کہ طالبانِ عمل کا پہلا درجہ طہارت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ عزاسمہ، نے فرمایا ہے "اے ایمان والو! اللہ کی جناب میں سچی توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔" نیز فرمایا: "سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: "اللہ تعالیٰ کو توبہ کرنے والے جوان سے بڑھ کر کوئی چیز زیادہ محبوب نہیں۔" حضور ﷺ نے مزید فرمایا ہے: "گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی مانند ہے جس پر کوئی گناہ نہیں۔" پھر آپ نے فرمایا کہ "جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو دوست رکھتا ہے تو کوئی گناہ اس کو نقصان نہیں دیتا۔" پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔" صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ "توبہ کی علامت کیا ہے؟" تو آپؐ نے فرمایا کہ "ندامت و پشیمانی"، لیکن یہ جو آپ نے فرمایا کہ دوستانِ حق کو گناہ نقصان نہیں دیتا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ گناہ سے کافر نہیں ہوتا اور گناہ کرنے سے اس کے ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا تو اس نافرمانی کا نقصان جس کا انجام نجات ہو، حقیقت میں نقصان نہیں ہوتا۔ جاننا چاہئے کہ توبہ کے معنی لغت میں رجوع کرنا ہیں، چنانچہ عرب کہتے ہیں تاب یعنی اس نے رجوع کیا۔ پس اللہ تعالیٰ کی نہی یعنی وہ فعل جس کے کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، سے محض اللہ تعالیٰ کے خوف سے باز آ جانا، توبہ کی حقیقت ہے اور پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: "فعل بد سے پشیمانی توبہ ہے" اور یہ ایک ایسا قول ہے جس میں توبہ کی تمام شرطیں موجود ہیں کیونکہ توبہ کی ایک شرط تو مخالفت احکام الٰہی پر افسوس کرنا ہے، دوسری شرط لغزش کو فوراً چھوڑ دینا ہے اور تیسری شرط معصیت کی طرف نہ لوٹنے کا قصد کرنا ہے۔ یہ تینوں شرطیں ندامت کے ساتھ وابستہ ہیں کیونکہ جب دل میں کیے پر ندامت پیدا ہوتی ہے تو باقی دو شرطیں اس کے ساتھ خود بخود آ جاتی ہیں اور اپنے کیے پر ندامت و پشیمانی کے تین اسباب ہیں، جیسا کہ توبہ کی تین شرطیں ہیں: ایک تو یہ ہے کہ جب عذاب کا خوف دل پر غلبہ پاتا ہے اور برے افعال پر دل میں غم پیدا ہوتا ہے تو ندامت حاصل ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ نعمت کی خواہش دل پر غالب آجائے اور معلوم ہو کہ برے فعل اور نافرمانی سے وہ نعمت حاصل نہیں ہوگی تو برے فعل سے پشیمانی حاصل ہوگی اور تیسرے یہ کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اور تمام مخلوق کے سامنے اپنی بے نقابی کے تصور سے خائف ہو کر برے افعال پر نادم ہو۔ پس ان میں سے پہلا تو تائب[1]، دوسرا منیب[2] اور تیسرا اواب[3] کہلاتا ہے، نیز توبہ کے مقام بھی تین ہیں: پہلا توبہ، دوسرا انابت، تیسرا اوبت[4]۔ پس توبہ کا مقام عذاب کے خوف کے لئے، انابت کا مقام طلب ثواب کے لئے اور اوبت فرمانِ حق کی رعایت کے لئے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ توبہ عام مومنین کا مقام ہے اور وہ کبیرہ گناہ سے ہوتا ہے جیسا کہ

---

[1] توبہ کرنے والا [2] منیب: انابت کرنے والا یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا۔ [3] تواب: اللہ تعالیٰ کی طرف بہت رجوع کرنے والا۔ [4] اوبت: انبیاء کی توبہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”اے ایمان والو! اللہ کی جناب میں سچی اور پکی توبہ کرو۔“ انابت اولیاء و مقربانِ حق کا مقام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”جو شخص رحم کرنے والے اللہ سے بن دیکھے ڈر گیا اور خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا دل لے کر آیا۔“ اوبت انبیاء و مرسلین کا مقام ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”وہ کیا ہی اچھا بندہ ہے کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف بہت رجوع کرنے والا ہے۔“ پس توبہ گناہ کبیرہ سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے اس کے حضور میں رجوع کرنا ہے، انابت صغیرہ گناہوں سے اللہ سے محبت کرنے کے باعث رجوع کرنا ہے اور اوبت اپنی ذات کو چھوڑ کر خداوند تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا ہے۔ پس جو شخص فواحش یعنی کبیرہ گناہوں سے حکم الٰہی کی اطاعت کرتے ہوئے اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور جو شخص محض صغیرہ گناہ اور فاسد اندیشے سے اللہ تعالیٰ کی خالص محبت رکھنے کے باعث اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور جو شخص اپنی خودی کو ترک کر کے ذاتِ حق کی طرف رجوع کرتا ہے، ان تینوں میں بڑا فرق ہے۔ افضل توبہ اللہ تعالیٰ کی جھڑکیوں یعنی تنبیہات و وعید سے بچنے، خواب غفلت سے دل کی بیداری اور اپنے حال کے عیب کو دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ جب بندہ اپنے برے احوال اور برے افعال میں غور کرے اور ان سے خلاصی طلب کرے تو اللہ تعالیٰ توبہ کے اسباب اس پر سہل کر دیتا ہے۔ اس کو معصیت کی بدبختی سے رہائی دے دیتا ہے اور اُسے عبادت کی حلاوت تک پہنچا دیتا ہے۔

اہل سنت و جماعت اور تمام مشائخ معرفت کے نزدیک یہ بات روا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک گناہ سے توبہ کرے لیکن دوسرے گناہ کرتا رہے تو خداوند تعالیٰ اس ایک گناہ سے باز رہنے کی وجہ سے بھی اس کو ثواب دے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس ایک گناہ سے توبہ کی برکت سے وہ دوسرے گناہوں سے بھی باز آ جائے جیسا کہ کوئی شخص شراب خور اور زانی ہو اور زنا سے توبہ کرے اور شراب خوری کرتا رہے تو اس ایک گناہ سے توبہ باوجود دوسرے گناہ کے ارتکاب کرنے کے بھی دُرست ہے۔ معتزلہ میں سے بہتمی کہتے ہیں کہ جب تک تمام کبیرہ گناہوں سے بیک وقت پختہ توبہ نہ کی جائے، توبہ کرنا فضول ہے کیونکہ بعض گناہوں سے توبہ کرنا اور بعض گناہوں میں مبتلا رہنا، یہ توبہ کی توہین ہے لیکن یہ قول محال ہے اس لئے کہ ان تمام معاصی پر جو بندہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو عذاب دیتا ہے۔ جب ان معاصی میں سے ایک معصیت کو ترک کر دے گا تو وہ بندہ اس معصیت کے عذاب سے محفوظ اور بے خوف ہو جائے گا اور لامحالہ اس کی وجہ سے وہ تائب ہو گا۔ نیز اگر کوئی شخص بعض فرائض ادا کرتا ہے اور بعض ادا نہیں کرتا تو لامحالہ جو ادا کرتا ہے اس کا اسے ثواب ملے گا جیسا کہ اس فرض کے بدلے میں جو وہ ادا نہیں کرتا، اُسے عذاب ہو گا اور اگر کسی کو معصیت کا آلہ حاصل نہ ہو اور اس کے اسباب مہیا ہوں اور وہ اس معصیت سے توبہ کرے تو وہ بھی تائب ہی ہو گا اس لئے کہ توبہ کا ایک رُکن پشیمانی ہے۔ اس کو اس توبہ کی وجہ سے گزشتہ پر ندامت حاصل ہو جائے گی اور فی الحال وہ اس جنس معصیت سے اعراض کر رہا ہے اور ارادہ رکھتا ہے کہ اگر معصیت کا آلہ موجود ہو جائے اور اسباب بھی مہیا ہو جائیں تو بھی میں ہرگز اس معصیت کی طرف نہیں جاؤں گا۔ یاد رکھو کہ توبہ کے وصف اور اس کی صحت میں مشائخ کا کچھ اختلاف ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ اور صوفیا کی ایک جماعت اس بات پر متفق ہیں کہ توبہ یہ ہے کہ تو اپنے گناہ کو نہ بھولے اور ہمیشہ اس کی پریشانی میں رہے تاکہ اگرچہ تو عمل بہت رکھتا ہو، اس پر مغرور نہ ہو۔ اس لئے کہ برے کام پر ندامت اور پشیمانی نیک اعمال پر مقدم ہوتی ہے اور وہ شخص جو گناہ کو فراموش نہیں کرتا، اپنے اعمال پر کبھی غرور نہیں کرتا۔ پھر حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ اور ایک جماعت اس پر متفق ہیں کہ

اَلتَّوْبَةُ اَنْ تَنْسٰی ذَنْبَكَ یعنی "توبہ یہ ہے کہ تو اپنے گناہوں کو بھول جائے۔" اس لئے کہ توبہ کرنے والا محبّ الٰہی ہوتا ہے اور محبّ الٰہی مشاہدے میں ہوتا ہے اور مشاہدے میں گناہ کا یاد کرنا ظلم ہے۔ کچھ عرصہ تو وفا کے ساتھ ہو گا مشاہدے میں اور پھر کچھ عرصہ عین وفا میں جفا کے ذکر کے ساتھ ہو گا۔ جفا یعنی ظلم کا ذکر وفا یعنی مشاہدے میں وفا سے حجاب ہوتا ہے۔ اس اختلاف کا تعلق مجاہدہ و مشاہدہ سے ہے اور اس کا مفصل ذکر سہلیوں کے مذہب کے بیان میں تلاش کرنا چاہیے۔ جو شخص تائب کو قائمقام بخود کہتا ہے، وہ گناہ کے بھول جانے کو اس کے لئے غفلت جانتا ہے اور جو شخص اس کو قائم بحق کہتا ہے، وہ گناہ کے یاد کرنے کو اس کے لئے شرک سمجھتا ہے۔ فی الجملہ اگر تائب کی صفت باقی ہو تو اس کے اسرار کا عقدہ حل نہیں ہوا ہو گا اور جس کی صفت فنا ہو گئی ہو، پھر اپنی صفت کا ذکر کرنا اس کو درست نہ ہو گا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے صفت کی بقا کی حالت میں فرمایا: تُبْتُ اِلَيْكَ (میں نے تیری جناب کی طرف رجوع کیا) اور رسول اللہ ﷺ نے صفت کے فنا کی حالت میں فرمایا: لَا اُحْصِی ثَنَآءً عَلَيْكَ (یعنی میں تیری ثناء بیان نہیں کر سکتا)، الغرض قربِ حق کے محل میں وحشت کا ذکر وحشت ہوتا ہے لہٰذا تائب کو چاہئے کہ اپنی خودی کو بھی یاد نہ کرے۔ بھلا اس کو اپنا گناہ کس طرح یاد آئے گا اور حقیقت میں گناہ کا یاد کرنا خود گناہ ہے۔ اس لئے کہ وہ اعراض کا محل ہے اور جیسا کہ گناہ خدا تعالیٰ سے رُوگردانی کا محل ہے، اس کا ذکر بھی حق تعالیٰ سے رُوگردانی کا محل ہے اور جیسا کہ جرم کا ذکر جرم ہوتا ہے ویسا ہی اس جرم کا بھول جانا بھی جرم ہے، اس لئے کہ ذکر و نسیان دونوں کا تعلق تجھ سے ہے۔

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں کسی چیز میں مجھے اتنا فائدہ نہیں ہوا جتنا اس شعر میں ہوا ہے:

اِذَا قُلْتُ مَا اَذْنَبْتُ قَالَتْ مُجِيْبَةً
حَيَاتُكَ ذَنْبٌ لَا يُقَاسُ بِهٖ ذَنْبٌ

(ترجمہ: جب میں نے محبوب سے کہا کہ میں نے تو کوئی گناہ نہیں کیا تو اس نے جواب دیتے ہوئے یوں کہا کہ تیری زندگی خود ایسا جرم ہے جس کے مقابلے میں کسی دوسرے جرم کا قیاس نہیں کیا جا سکتا) اور جب دوست کا موجود ہونا دوست کے حضور میں جرم ہے تو اس کی صفت کی کیا قیمت رہ جاتی ہے؟ الغرض توبہ، توحید ربانی ہے اور گناہ، فعل جسمانی ہے۔ جب دل میں پشیمانی آ گئی تو جسم میں کوئی آلہ ایسا نہیں ہوتا جو دل کی پشیمانی کو دور کر دے۔ جب فعل کی ابتداء میں اس کی پشیمانی توبہ کو دفع نہیں کرتی تو جب ندامت آ جاتی ہے تو انتہا میں بھی اس کا فعل توبہ کو روکنے والا نہیں ہوتا۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (ترجمہ: پس اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول فرمائی۔ بلاشبہ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم والا ہے) اور اس کے نظائر کتاب اللہ میں بہت سے ہیں اور اتنے مشہور ہیں کہ ان کے بیان کی یہاں ضرورت نہیں۔ پس توبہ تین طرح کی ہوتی ہے: ایک توبہ گناہ سے نیکی کی طرف، دوسری نیکی سے زیادہ نیکی کی طرف، تیسری قسم اپنی خودی سے حق تعالیٰ کی طرف۔ جو توبہ خطا سے نیکی کی طرف ہوتی ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ (الآیہ) (ترجمہ: اور وہ لوگ کہ جب انہوں نے کوئی برا فعل کیا یا اپنی جانوں پر ظلم کیا، اللہ تعالیٰ کو یاد کیا پھر اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔" جو توبہ نیکی سے زیادہ نیکی کی طرف ہوتی ہے، اس کی مثال وہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تُبْتُ اِلَيْكَ (میں نے تیری طرف رجوع کیا) اور جو توبہ اپنی

خودی سے حق تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے، اس کی مثال وہ ہے جو پیغمبر ﷺ نے فرمایا: وَاِنَّہٗ لَیُھَانُ عَلَیَّ حَتّٰی اِنِّیْ کُنْتُ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ فِی کُلِّ یَوْمٍ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً۔ (ترجمہ: اور توبہ مجھ پر آسان کر دی جاتی ہے یہاں تک کہ میں ہر روز ستر بار اللہ سے معافی مانگتا ہوں)۔ خطا کا ارتکاب کرنا برا اور قابلِ مذمت ہے اور خطا سے نیکی کی طرف رجوع کرنا اچھا اور قابلِ ستائش ہے اور یہ توبہ عام ہے اور اس کا حکم ظاہر ہے۔ جب تک زیادہ نیکی حاصل نہ ہو، معمولی نیک کام پر قرار پکڑنا اور راستے میں ٹھہر جانا ایک حجاب ہے۔ نیکی سے زیادہ نیکی کی طرف رجوع کرنا اہل ہمت اور اولیاء کے درجے میں بہت ستائش کے قابل ہے اور یہ توبہ خاص ہے اور محال ہے کہ اللہ کے خاص بندے معصیت سے توبہ کریں کیونکہ وہ معصیت کرتے ہی نہیں، بلکہ وہ نیکی سے توبہ کر کے زیادہ نیکی کی طرف رجوع کیا کرتے ہیں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ سارا عالم تو خداوند تعالیٰ کی رویت کی حسرت میں ہے، لیکن موسیٰ علیہ السلام نے رویت سے توبہ کی۔ اس لئے انہوں نے رویت حق اپنے اختیار سے طلب کی اور محبت میں اپنا اختیار حیرانی ہے اور حیرانی کو ترک کرنا خلقت کے لئے حق کو اختیار کرنا ہے، اس لئے آپ نے دیدارِ الٰہی کو ترک کر دیا۔ اپنے آپ کو ترک کر کے حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا درجہ محبت میں ہے یا جیسا کہ بلند تر مقام کی محبت کی وجہ سے مقام بلند پر ٹھہرنے سے توبہ کرے اور تمام مقامات واحوال سے بھی توبہ کرے جیسا کہ حضور مصطفیٰ ﷺ کے مقامات ہمیشہ ترقی پذیر تھے۔ آپ جب بلند تر مقام پر پہنچتے تھے تو اس سے نیچے کے مقام سے استغفار اور اس مقام کے دیکھنے سے توبہ کرتے تھے، واللہ اعلم۔

دوسری فصل
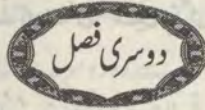
توبہ کرنے کے بعد ارتکابِ معصیت

جاننا چاہئے کہ معصیت کی طرف رجوع نہ کرنے کا پختہ ارادہ صحیح ہونے کے بعد توبہ پر ہمیشہ قائم رہنا شرط نہیں ہے۔ اگر توبہ کرنے والے کی توبہ میں کوئی فتور واقع ہو جائے اور ایام گزشتہ میں پختہ ارادے کے صحیح ہونے کے بعد پھر معصیت کی طرف رجوع کرے تو اس کو اس توبہ کا ثواب ملے گا۔ سلوک طریقت کے مبتدیوں میں سے توبہ کرنے والے کچھ ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں کہ انہوں نے توبہ کرلی، پھر ان کی توبہ میں کچھ فتور آگیا اور گناہ کی طرف رجوع کیا پھر وہ کسی تنبیہہ کی وجہ سے درگاہ حق تعالیٰ کی طرف واپس آگئے یہاں تک کہ مشائخ میں سے ایک بزرگ نے فرمایا ہے کہ میں نے ستر بار توبہ کی اور پھر گناہ کی طرف رجوع کیا یہاں تک کہ اکہترویں بار مجھے استقامت نصیب ہوئی۔ حضرت ابو عمر و جنید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ میں نے ابتدا میں حضرت ابو عثمان حیری کی مجلس میں توبہ کی اور کچھ مدت اس توبہ پر قائم رہا، پھر میرے دل میں معصیت کی خواہش پیدا ہوئی تو میں نے اس خواہش کو پورا کیا اور اس رہنما کی صحبت سے اعراض کیا اور جہاں کہیں میں ان کو دُور سے دیکھتا تو ندامت کی وجہ سے بھاگ جاتا تھا تاکہ وہ مجھے نہ دیکھیں۔ ایک روز میں آپ کے پاس پہنچ گیا تو آپ نے فرمایا: "بیٹا! اپنے دشمنوں کی صحبت اختیار نہ کر مگر اس وقت کہ تو بالکل بے گناہ ہو۔ اس لئے کہ دشمن تیرا عیب دیکھتا ہے اور جب تو عیب دار ہو گا تو دشمن خوش ہو گا اور جب بے گناہ ہو گا تو وہ غمگین ہو گا اور اگر تجھے معصیت کا ارتکاب کرنے کی ضرورت ہے تو ہمارے پاس آجا تاکہ تیری بلا ہم اُٹھالیں اور دشمن کی خواہش کے مطابق ذلیل نہ ہو۔" آپ نے فرمایا ہے کہ اس پر میرا دل گناہوں سے بالکل سیر ہو گیا اور میری توبہ درست ہوگئی۔ نیز میں نے سنا ہے کہ کسی شخص نے گناہ سے توبہ کی، پھر گناہ کی طرف رجوع کیا، پھر اس

سے پشیمان ہوا۔ ایک روز اپنے دل میں کہنے لگا، اگر درگاہِ الٰہی میں واپس جاؤں گا تو میرا کیا حال ہوگا؟ ہاتف نے آواز دی: اَطَعْتَنَا فَشَکَرْنَاكَ ثُمَّ تَرَکْتَنَا فَاَمْهَلْنَاكَ فَاِنْ عُدْتَّ اِلَيْنَا قَبِلْنَاكَ (ترجمہ: تو نے ہماری فرماں برداری کی تو ہم نے تجھے قبول کیا پھر تو نے ہمارے حکم کو چھوڑ دیا تو ہم نے تجھے مہلت دی۔ پس اگر تو ہماری طرف واپس آجائے تو ہم تجھے قبول کریں گے)۔ اب ہم توبہ کے متعلق مشائخ رحمہم اللہ کے اقوال کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

تیسری فصل
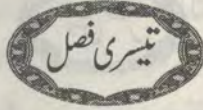
توبہ کے متعلق مشائخ کے اقوال

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: تَوْبَةُ الْعَوَامِّ مِنَ الذُّنُوْبِ وَ تَوْبَةُ الْخَوَاصِّ مِنَ الْغَفْلَةِ (ترجمہ: عوام کی توبہ گناہوں سے ہوتی ہے اور خاص لوگوں کی توبہ غفلت سے ہوتی ہے) اس لئے کہ عوام سے ظاہر حال کی نسبت پوچھیں گے اور خواص سے عمل کے حقیقی طور پر ادا کرنے کی نسبت پرسش ہوگی، کیونکہ غفلت عام آدمیوں کے لئے تو نعمت ہوتی ہے لیکن خاص لوگوں کے لئے حجاب۔ حضرت ابوحفص حداد رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لَيْسَ لِلْعَبْدِ فِى التَّوْبَةِ شَيْئٌ لِاَنَّ التَّوْبَةَ اِلَيْهِ لَا مِنْهُ (ترجمہ: بندے کو توبہ میں کچھ دخل نہیں ہوتا، کیونکہ توبہ حق تعالیٰ کی طرف سے بندے کو وہبی طور پر ملتی ہے نہ کہ بندے کے اپنے اختیار سے)۔ پس اس قول کے مطابق ضرور ہے کہ توبہ کسبی نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی بخششوں میں سے ایک بخشش ہو اور یہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔

حضرت ابوالحسن بوشنجہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اِذَا ذَکَرْتَ الذَّنْبَ ثُمَّ لَا تَجِد حَلَاوَةً عِنْدَ ذِکْرِهٖ فَهُوَا لتَّوْبَةُ (ترجمہ: جب تو گناہ کو یاد کرے اور اس کے یاد کرنے سے لذت نہ پائے پس یہی توبہ ہے) اس لئے کہ گناہ کا ذکر تو حسرت کی وجہ سے ہوتا ہے یا دلی خواہش کی وجہ سے۔ جب کوئی شخص حسرت و ندامت کی وجہ سے اپنی معصیت کو یاد کرے تو تائب ہوتا ہے اور جو شخص ارادے سے معصیت کو یاد کرتا ہے تو گناہ گار ہوتا ہے، کیونکہ گناہ کے کرنے میں اتنی حیرانی نہیں ہوتی جتنی کہ اس کا ارادہ کرنے میں۔ اس لئے کہ اس کا فعل تو ایک وقت ہوتا ہے لیکن اس کی محبت ہمیشہ ہوتی ہے۔ پس جو شخص گھڑی بھر جسم سے گناہ کرے، وہ ایسا نہیں ہوتا جیسا کہ وہ شخص جو رات دن دل سے اس گناہ کا ارادہ رکھے۔ حضرت ذوالنون رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلتَّوْبَةُ تَوْبَتَانِ تَوْبَةُ الْاِ نَابَةِ وَتَوْبَةُ الْاِسْتِحْيَآءِ فَتَوْبَةُ الْاِنَابَةِ اَنْ يَتُوْبَ الْعَبْدُ خَوْفًا مِنَ الْعُقُوْبَةِ وَ تَوْبَةُ الْاِسْتِحْيَآءِ اَنْ يَتُوْبَ حَيَآءً مِنْ کَرَمِهٖ۔ (ترجمہ: توبہ دو قسم کی ہوتی ہے: ایک توبہ انابت، یعنی رجوع کرنے کی وجہ سے اور دوسری توبہ استحیاء، یعنی شرم کی وجہ سے۔ پس خدا کی طرف رجوع کرنے کی توبہ یہ ہے کہ بندہ عذاب کے خوف سے خدا کی طرف رجوع کرے اور حیا کی وجہ سے توبہ یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے کرم سے حیا کر کے گناہ سے خدا کی طرف رجوع کرے۔ پس توبہ بوجہ خوف جلال الٰہی کے کشف سے ہوتی ہے اور توبہ بوجہ حیا اللہ تعالیٰ کے جمال کے مشاہدے سے ہوتی ہے۔ پس ایک تو جلالِ الٰہی میں خوف کی آگ سے جل رہا ہے اور دوسرا جمالِ حق میں حیا کے نور سے روشن ہو رہا ہے، گویا ایک مست اور دوسرا بے ہوش ہوتا ہے اور اہل حیا اصحاب سکر ہوتے ہیں اور اہل خوف اصحاب صحو اور اس کے متعلق کلام بہت طویل تھا، لیکن میں نے مختصر کر دیا ہے اور توفیق قبضۂ الٰہی میں ہے۔

بیسواں باب

پانچویں پردے کے کھولنے کے بیان میں

پہلی فصل
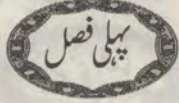
حقیقتِ نماز

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (اور نماز قائم کرو) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اَلصَّلٰوۃُ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ (نماز اور جو تمہارے ملک میں ہیں) لونڈی اور غلام کا خیال رکھو۔ نماز کے معنی لغت کی رُو سے ذکر، دُعا اور فرمانبرداری کے ہیں۔ فقہا کی اصطلاح میں وہ ایک مخصوص عبادت ہے جو روزمرہ چند مخصوص احکام کے ساتھ ادا کی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ پانچ وقتوں میں پانچ نمازیں روزانہ ادا کرو اور اس نماز میں داخل ہونے سے پہلے کچھ شرطیں ہیں۔ پہلی ان میں سے جسم کی طہارت، ظاہر میں نجاست سے اور باطن میں خواہش نفسانی سے، دوسری لباس کی طہارت، ظاہر میں نجاست سے اور باطن میں مالِ حرام سے، تیسری مکان کی طہارت، ظاہر میں نجاست اور گندگیوں سے اور باطن میں فساد اور گناہ سے، چوتھی قبلہ کی طرف منہ کرنا اور قبلہ ظاہر کا کعبہ شریف ہے اور باطن کا عرش معلّٰی اور سر کا مشاہدہ مقصود ہے۔ پانچویں قیام ظاہر طاقت کی حالت میں اور قیام باطن قربِ حق کے باغیچے میں۔ قیام ظاہر کی شرط یہ ہے کہ اس کا وقت درست ہو اور قیام باطن کی شرط یہ ہے کہ حقیقت کے درجے میں اس کا وقت ہمیشہ ہے۔ چھٹی حضرت حق تعالیٰ کی طرف توجہ کر کے خالص نیت کرنا، ساتویں ہیبت الٰہی اور فنائے صفت کے مقام میں تکبیر پڑھنا، وصل کے محل میں قیام کرنا، نہایت ترتیل (صحت تلفظ و مخارج وعظمت کے ساتھ قرأت کرنا) اور گڑگڑا کر رُکوع اور عاجزی سے سجود، دل جمعی کے ساتھ تشہد اور صفت کے فنا ہونے کے ساتھ سلام دینا۔ احادیث میں ہے: کَانَ عَلَیْہِ السَّلَامُ یُصَلِّیْ وَفِیْ جَوْفِہٖ اَزِیْزٌ کَاَزِیْزِ الْمِرْجَلِ (ترجمہ: کہ حضور ﷺ نماز پڑھا کرتے تھے تو آپ کے دل میں ایسا جوش ہوتا تھا جیسا کہ کانسی کی اس دیگ میں جس کے نیچے آگ جلتی ہو)۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، نماز کا قصد کیا کرتے تو آپ کے بدن کے بال کھڑے ہو جاتے اور کپڑے سے باہر سر نکال دیتے، آپ پر کپکپی طاری ہو جاتی اور فرماتے کہ اس امانت کے ادا کرنے کا وقت آ گیا جس کے اٹھانے سے آسمان اور زمین عاجز آ گئے تھے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ آپ نماز کس طرح ادا فرماتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ "جب نماز کا وقت آ جاتا ہے تو ایک وضو ظاہر کا کرتا ہوں اور دوسرا وضو باطن کا، ظاہری وضو پانی سے اور باطنی وضو توبہ سے کرتا ہوں، پھر مسجد میں داخل ہوتا ہوں، مسجد بیت الحرام کا مشاہدہ کرتا ہوں، مقام ابراہیم کو اپنے دونوں ابرو کے سامنے رکھتا ہوں، بہشت کو اپنے دائیں طرف اور دوزخ کو بائیں جانب رکھتا ہوں، صراط اپنے قدموں کے نیچے رکھتا ہوں اور فرشتہ ملک الموت کو اپنی پیٹھ کے پیچھے خیال کرتا ہوں، پھر نہایت عظمت واحترام کے ساتھ تکبیر پڑھتا ہوں اور حرمت کے ساتھ قیام اور بڑی ہیبت کے ساتھ قرأت اور خاکساری کے ساتھ رکوع اور عاجزی سجود اور بڑے علم و وقار کے ساتھ تعوذ اور پھر آخر میں شکر حق کے ساتھ سلام پھیرتا ہوں" اور توفیق قبضہ الٰہی میں ہے۔
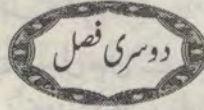
اہل طریقت کے لیے نماز کے فوائد

جاننا چاہیئے کہ نماز ایک ایسی عبادت ہے کہ طالبان اللہ کی راہ میں ابتدا سے انتہا تک اسی سے راہِ حق پاتے ہیں اور اسی میں ہمیشہ مشغول ہوتے ہیں اور ان کے مقامات عموماً اس میں کشف ہوتے ہیں، چنانچہ طہارت طالبانِ حق کے لئے توبہ ہوتی ہے اور قبلہ کی طرف رُخ کرنا پیر کے ساتھ تعلق کے قائم مقام ہے اور قیام کرنا مجاہدۂ نفس، قرأت ذکر دوام، رکوع تواضع، سجود معرفت نفس، تشہد اُنس حق اور سلام دنیا سے علیحدگی اور مقامات کی پابندی سے نکلنے کا قائم مقام ہے، یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ دنیا کے تمام تعلقات سے منقطع ہو جاتے تو کمال حیرت کے محل میں شوق دیدار کے طالب ہوتے اور فقط یاد حق سے تعلق مضبوط کرتے، پھر فرماتے: اَرِحْنَا یَا بِلَالُ بِالصَّلٰوۃِ (ترجمہ: اے بلال !ہمیں نماز سے خوش کر) یعنی نماز کی اذان دے تاکہ نماز پڑھ کر راحت قلب حاصل کریں۔ اس امر کے متعلق مشائخ کے بہت سے اقوال ہیں اور ہر ایک کا ایک خاص درجہ ہے، چنانچہ مشائخ کا ایک گروہ کہتا ہے کہ نماز دربارِ حق میں حاضری کا ذریعہ ہے اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نماز اپنے آپ سے غائب ہونے کا ذریعہ ہے اور جو لوگ غائب ہوتے ہیں، وہ نماز میں حاضر ہو جاتے ہیں اور جو لوگ پہلے سے حاضر ہیں، وہ نماز میں غائب ہو جاتے ہیں، جیسا کہ اس عالم میں رویت حق کے محل میں جو لوگ خدا تعالیٰ کو دیکھیں گے، وہ پہلے سے غائب ہوں گے اور وہ اس وقت حاضر ہو جائیں گے اور جو لوگ حاضر ہوں گے، وہ غائب ہو جائیں گے۔

میں علی بن عثمان جلابی کہتا ہوں کہ نماز حکم الٰہی ہے نہ حاضری کا آلہ ہے، یہ غیبت کا ذریعہ کیونکہ امر الٰہی کسی چیز کا آلہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ حضور کی علت عین حضور ہوتا ہے اور غیبت کی علت بھی عین غیبت ہے اور امر حق کسی سبب سے نقص پذیر نہیں ہوتا کہ اگر نماز حضور کا آلہ اور علت ہوتی تو چاہیئے تھا کہ سوائے نماز کے کوئی اور چیز بندے کو دربار حق میں حاضر نہ کر سکتی اور اگر نماز غیبت کی علت ہوتی تو ضرور ایسا ہوتا کہ غائب نماز کے ترک کرنے سے حاضر دربار حق ہو جاتا اور جب حاضر اور غائب کو نماز کے ادا و ترک کرنے میں کوئی عذر نہیں تو نماز کو بذات خود ایک غلبہ حاصل ہے، غیبت و حضور سے اس کا کچھ واسطہ نہیں۔ پس اہل مجاہد و اہل استقامت نماز زیادہ پڑھتے ہیں اور دوسروں کو حکم دیتے ہیں۔ چنانچہ مشائخ اپنے مریدوں کو رات دن میں چار سو رکعت پڑھنے کا حکم فرماتے ہیں تاکہ جسم عبادت کا عادی ہو جائے اور استقامت والے بھی بہت نماز پڑھا کرتے ہیں تاکہ دربار حق میں قبولیت کا شکر ادا کریں۔ اب رہ گئے احوال والے لوگ، سو وہ دو گروہ ہیں: اوّل، وہ لوگ جن کی نمازیں کمال سلوک اور محویت کے باعث مقام جمع میں ہوتی ہیں اور اپنی نمازوں میں مجتمع ہوتے ہیں۔ دوسرے، وہ لوگ جن کی نمازیں سلوک کے انقطاع اور عدم محویت کے باعث مقام تفرقہ میں ہوتی ہیں، وہ ان میں تفرقہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو نماز میں اجتماع خاطر حاصل کرتے ہیں، وہ رات دن نماز میں رہتے ہیں اور فرائض و سنت کے علاوہ بکثرت نوافل پڑھتے ہیں اور جو لوگ نماز میں تفرقے کی حالت میں ہوتے ہیں، وہ لوگ سوائے فرائض اور سنن کے نفل نماز کم پڑھا کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جُعِلَتْ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ (ترجمہ: میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھ دی گئی ہے) یعنی مجھے نماز ہی میں سرور و فرحت حاصل ہوتی ہے اس لئے کہ اہل استقامت کا طریق ہی نماز میں رہنا ہے اور وہ یوں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو

معراج کی رات محل قرب حق میں پہنچا دیا گیا تو آپ کا نفس شریف عالم کون و فساد کے تعلق سے منقطع ہو گیا اور حضور اس درجہ پر پہنچ گئے کہ آپ کا نفس دل کے درجے پر، دل جان کے درجے پر اور جان باطن کے محل میں پہنچ گئی، باطن درجات سے فانی ہو گیا اور مقامات سے محو اور بے نشان کی نشانیوں میں سے ہو گیا اور عین مشاہدے میں مشاہدے سے غائب ہو گیا اور معاینے کی حالت میں معاینے سے الگ ہو گیا۔ آپ کے انسانی خواص معدوم ہو گئے، نفسانی مادہ جل گیا اور طبعی قوت نیست و نابود ہو گئی۔ ربانی مشاہدے اپنی ولایت و حکومت میں جلوہ نما ہوئے اور خود ہی خودی سے رہ گئے۔ مقصود، مقصود کے ساتھ مل گئے۔ ذات لم یزل کے مشاہدے میں محو ہوئے۔ کمال شوق سے بے اختیار ہو کر عرض کیا: "اے بارِ خدایا! مجھے پھر دنیا کے بلاخانے میں نہ لے جا اور طبیعت اور خواہش نفس کی قید میں نہ ڈال۔" حکم ہوا کہ "ہمارا حکم یونہی ہے کہ آپ دنیا میں شریعت کے قائم کرنے کے لئے واپس جائیں تاکہ جو کچھ ہم نے آپ کو یہاں عالم ملکوت میں عطا کیا ہے، وہاں دنیا میں عطا کریں۔" چنانچہ جب حضور ﷺ دنیا میں واپس تشریف لائے تو جب کبھی آپ کا دل معراج کا مشتاق ہوتا تو حضور فرماتے: اَرِحْنَا یَا بِلَالُ بِالصَّلٰوۃِ (اے بلال! ہمیں اذان دے کر نماز سے خوش کر) پس ہر نماز آپ کے لئے ایک معراج ہوتی تھی اور ایک نیا تقرب حق ہوتا تھا۔ گو لوگ آپ کو نماز میں دیکھتے حالانکہ آپ کی روح تو نماز میں ہوتی لیکن آپ کا دل اور باطن اللہ تعالیٰ کے ساتھ راز و نیاز میں، اور حضور علیہ السلام کا جسم تواضع میں ہوتا یہاں تک کہ آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہو جاتی اور آپ کا جسم مبارک بظاہر اس ملک دنیا میں ہوتا، لیکن آپ کا دلِ مبارک عالم ملکوت میں۔ آپ کا جسم بظاہر انسانوں کے ساتھ ہوتا لیکن آپ کی رُوح محل انس الٰہی میں۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: عَلَامَةُ الصِّدْقِ اَنْ یَکُوْنَ لَهٗ تَابِعٌ مِنَ الْحَقِّ اِذَا دَخَلَ وَقْتُ الصَّلٰوةِ بَعَثَهٗ عَلَیْهَا وَ یُنَبِّهُ اِنْ کَانَ نَائِمًا۔ (ترجمہ: سچے فرمانبردار کے صدق کی علامت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ایک تابعدار فرشتہ اس کے لئے مقرر ہو کہ جب نماز کا وقت آئے تو وہ اس بندے کو نماز ادا کرنے پر آمادہ کرے اور اگر وہ شخص سو رہا ہو تو اس کو بیدار کر دے) اور یہ علامت حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ میں ظاہر تھی، اس لئے کہ آپ بوڑھے اور معذور ہو گئے تھے لیکن جب نماز کا وقت آتا تو ٹھیک ٹھاک ہو جاتے اور جب نماز ادا کر چکتے تو پھر عاجز اور معذور کھڑے کے کھڑے رہ جاتے۔ مشائخ رحمہم اللہ میں سے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ لَحْتَاجُ الْمُصَلِّیْ اِلٰی اَرْبَعَةِ اَشْیَآءَ فَنَآءِ النَّفْسِ وَ ذِهَابِ الطَّبْعِ وَ صَفَآءِ السِّرِّ وَ کَمَالِ الْمُشَاهَدَةِ (ترجمہ: نمازی کو چار چیزوں کی حاجت ہوتی ہے: نفس کے فانی ہونے، طبیعت کے مٹ جانے، باطن کی صفائی اور کمال مشاہدہ کی) یعنی نمازی کو فناء نفس کے سوا چارہ نہیں اور وہ ارادے کو ایک نقطے پر جمع کرنے کے سوا حاصل نہیں ہو سکتی، اور جب ہمت مجتمع ہو گئی تو نفس کی حکومت ختم ہو گئی اس لئے کہ اس کا وجود تفرقے سے ہے، وہ جمع اور مشاہدہ حق کی تاب نہیں لا سکتا اور طبیعت کا مٹ جانا جلال حق کے ثابت کرنے کے بغیر نہیں ہو سکتا، کیونکہ حلال حق غیر کا زوال ہوتا ہے۔ باطن کی صفائی محبت الٰہی کے سوا حاصل نہیں ہو سکتی اور مشاہدے کا کمال سوائے صفائی باطن کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ روایت ہے کہ حسین بن منصور رحمتہ اللہ علیہ رات دن میں چار سو رکعت نماز اپنے اوپر لازم رکھتے تھے۔ لوگوں نے پوچھا کہ "آپ جو اتنے بلند درجے پر ہیں تو اس قدر رنج اٹھانے کی کیا وجہ ہے؟" آپ نے فرمایا: "یہ سب رنج و راحت تیرے اپنے حال میں ظاہر ہوتا ہے اور دوستانِ حق جو فانی الصفت ہوتے ہیں، انہیں نہ رنج محسوس ہوتا ہے اور نہ راحت۔ خبردار! کہیں سستی کا نام حق تک پہنچنا اور حرص کا نام طلب حق نہ رکھنا۔" ایک شخص نے بیان کیا کہ

میں نے ایک مرتبہ حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ کے پیچھے نماز پڑھی۔ جب آپ نے تکبیر شروع کر کے اللہ اکبر کہا تو بے ہوش ہوکر گر پڑے اور ایسے گرے گویا کہ آپ کے جسم میں روح اور حس نہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ جب بوڑھے ہو گئے تو روزانہ ایام جوانی کے اوراد میں سے کوئی ورد بھی نہ چھوڑتے تھے۔ لوگوں نے عرض کیا: "اے شیخ! اب آپ ضعیف ہو گئے ہیں، ان اوراد میں سے کچھ چھوڑ دیجئے" تو آپ نے فرمایا: "یہ وہ چیزیں ہیں کہ شروعِ سلوک میں میں نے جو کچھ پایا، انہی کی بدولت پایا۔ اب محال ہے کہ انتہائے سلوک میں ان کو ترک کر دوں۔"

مشہور ہے کہ فرشتے ہمیشہ عبادت میں لگے رہتے ہیں اور ان کا پینا بھی عبادت الٰہی ہے اور کھانا بھی عبادت حق، اس لئے کہ وہ رُوحانی مخلوق ہیں۔ ان میں نفس امارہ نہیں اور بندگی سے روکنے والا نفس امارہ ہی ہوتا ہے اور جتنا بھی وہ نفس زیادہ مغلوب ہو، اتنا ہی بندگی کا طریقہ سہل ہو جاتا ہے اور جب نفس فانی ہو جاتا ہے تو اس کا کھانا اور پینا عبادت ہی ہو جاتی ہے جیسا کہ فرشتوں کا کھانا اور پینا عبادت ہے، بشرطیکہ نفس کا فانی ہونا صحیح ہو۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے بچپن میں ایک عابدہ عورت کو دیکھا کہ بچھو نے نماز میں اُسے چالیس جگہ کاٹا اور اس میں کچھ بھی تغیر ظاہر نہ ہوا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے اس سے کہا "اے اماں جان! تو نے بچھو کو کیوں نہیں ہٹایا؟" تو اس نے جواب دیا۔ "لڑکے! تو ابھی بچہ ہے، یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ میں خداوند تعالیٰ کے کام میں اپنا کام کرتی۔" حضرت ابوالخیر اقطع رحمتہ اللہ علیہ کے پاؤں میں گوشت خورہ کی بیماری ہوگئی تھی۔ حکیموں نے کہا اس پاؤں کو کاٹ دینا چاہئے لیکن آپ اس بات پر راضی نہ ہوئے چنانچہ مریدوں نے مشورہ کیا کہ نماز میں آپ کا یہ پاؤں کاٹ دیا جائے، کیونکہ اس حالت میں ان کو اپنی کچھ خبر نہیں ہوتی۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو پاؤں کو کٹا ہوا دیکھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ جب رات کے وقت قرأت کرتے تو دھیمی آواز سے پڑھتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بلند آواز سے۔ جیسا کہ ہم نے صحابہؓ کے ذکر میں اس بات کو بیان کیا ہے۔ پیغمبر ﷺ نے پوچھا: "اے ابوبکر! آپ کیوں نماز میں آہستہ پڑھتے ہیں؟" آپ نے عرض کیا کہ "میں حسنِ قرأت سے راز و نیاز کی بات کرتا ہوں اور جس کو سناتا ہوں، وہ سنتا ہے، خواہ میں آہستہ کہوں یا زور سے۔" پھر حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: "آپ کیوں بلند آواز سے پڑھتے ہیں؟" آپ نے عرض کیا: "میں سوتے کو جگاتا اور شیطان کو بھگاتا ہوں۔" حضور ﷺ نے فرمایا: "اے ابوبکر! تم ذرا اونچا پڑھا کرو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا، تم ذرا آہستہ پڑھا کرو تاکہ عادت چھوٹ جائے۔" پس صوفیا کرام سے بعض لوگ فرائض کو ظاہر طور پر ادا کرتے ہیں اور نوافل کو مخفی طور پر۔ اس بات سے ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ریا سے چھوٹ جائیں کیونکہ جب کوئی شخص عمل میں دکھلاوا کرتا اور خلقت کی توجہ اپنی طرف چاہتا ہے تو وہ ریاکار ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ ہم عمل کرتے اور اس کو نہیں دیکھتے لیکن لوگ تو دیکھتے ہیں اور یہ بھی ریا ہے اور دوسرا گروہ فرضوں اور نفلوں سب کو ظاہر میں ادا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ریا باطل ہے اور عبادت حق ہے۔ اس لئے محال ہے کہ ہم ایک باطل کی خاطر حق کو چھپادیں۔ پس ریا کو دل سے باہر نکال دو اور جہاں جیسی چاہو، عبادت کرو۔ مشائخ رضی اللہ عنہم نے خود عبادت کے آداب کو نگاہ میں ہے اور مریدوں کو بھی اس کا حکم فرمایا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے چالیس سال سفر کیا۔ میری کوئی نماز جماعت کے بغیر نہ ہوتی تھی اور ہر جمعہ کے روز میں ایک قصبے میں ہوتا تھا اور نماز کے احکام اس سے زیادہ ہیں کہ ان کو حصر کر سکیں لیکن مقامات میں سے جو بات نماز سے تعلق رکھتی ہے، وہ محبت الٰہی ہے۔ اس لئے اب ہم اس کے تمام احکام بیان کریں گے، ان شاءاللہ تعالیٰ۔

اکیسواں باب

محبتِ الٰہی اور اس سے متعلقہ اُمور کے بیان میں
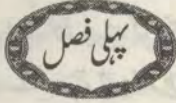
محبت کا ثبوت

اللہ عزّوجل نے فرمایا ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗۤ۔ (ترجمہ: اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے سو اللہ تعالیٰ ایک ایسی قوم پیدا کرے گا جسے وہ خود دوست رکھے گا اور وہ لوگ بھی اسے دوست رکھیں گے) نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ (ترجمہ: بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ کے سوائے اوروں کو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ تعالیٰ سے کرنی چاہئے) اور پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں نے جبرئیل علیہ السلام سے سنا کہ انہوں نے کہا کہ خدائے عزّوجل نے فرمایا ہے:

مَنْ اَهَانَ لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ بَارَزَنِیْ بِالْمُحَارَبَةِ مَا تَرَدَّدْتُ فِی شَیْءٍ كَتَرَدُّدِیْ فِیْ قَبْضِ نَفْسِ عَبْدِ الْمُؤْمِنِ مَنْ یَكْرَهُ الْمَوْتَ وَاَكْرَهُ مَسَاءَتَهٗ وَلَا بُدَّلَهٗ مِنْهُ ، وَمَا یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَدَاءِ مَا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ وَلَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ لَهٗ سَمْعًا وَبَصَرًا وَیَدًا وَرِجْلًا وَلِسَانًا (الحدیث) (ترجمہ: جس نے میرے دوست کی اہانت کی، اس نے مجھ سے جنگ کا اعلان کیا اور مجھے کسی چیز کے متعلق اتنا تردّد نہیں ہوتا جتنا کہ ایک مومن کی روح قبض کرنے میں ہوتا ہے۔ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اس کو تکلیف دینا ناپسند کرتا ہوں، حالانکہ اس کو موت سے چارہ نہیں اور میرا بندہ کسی ایسی چیز سے میرا قرب حاصل نہیں کرسکتا جو مجھے ان احکام کے ادا کرنے سے زیادہ محبوب ہو جو میں نے اس پر فرض کئے اور میرا بندہ ہمیشہ نوافل ادا کرنے سے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس کو اپنا دوست بنا لیتا ہوں۔ پس جب میں اس کو اپنا دوست بنا لیتا ہوں تو میں اس کا کان اور آنکھ اور پاؤں اور زبان ہو جاتا ہوں) نیز فرمایا ہے: مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَآءَهٗ وَمَنْ كَرِهَ كَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ۔ (ترجمہ: جو اللہ تعالیٰ سے ملنا چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے ملنا چاہتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کو ناپسند کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے دیکھنے کو ناپسند کرتا ہے)۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے: اِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ الْعَبْدَ قَالَ لِجِبْرِیْلَ یَا جِبْرِیْلُ اِنِّیْ اُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبَّهٗ فَیُحِبُّهٗ جِبْرِیْلُ ثُمَّ یَقُوْلُ جِبْرِیْلُ لِاَهْلِ السَّمَآءِ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَدْ اَحَبَّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْهُ فَیُحِبُّهٗ اَهْلُ السَّمَآءِ ثُمَّ یَصْنَعُ لَهُ الْقَبُوْلَ فِی الْاَرْضِ فَیُحِبُّهٗ اَهْلُ الْاَرْضِ وَفِیْ بَعْضِ الرِّوَایَاتِ مِثْلُ ذٰلِكَ۔ (ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو دوست رکھتا ہے تو جبریل علیہ السلام سے فرماتا ہے کہ اے جبریل! میں فلاں بندے کو دوست رکھتا ہوں پس تو بھی اس بندے کو دوست رکھ، سو جبریل اس کو دوست رکھتا ہے۔ پھر جبریل اہلِ آسمان سے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں شخص کو دوست بنا لیا ہے پس تم بھی اسے دوست بنا لو۔ پس اہل آسمان اسے دوست بنا لیتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اس بندے کو

اہل زمین میں بھی مقبول بنا دیتا ہے تو اہل زمین بھی اس سے محبت کرتے ہیں، بعض روایات میں اَھْلَ الْاَرْضِ کی جگہ مِثْلُ ذٰلِکَ ہے) یعنی اہل آسمان کی طرح اہل زمین بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت بندے کے لئے اور بندے کی خدا کے لئے درست ہے اور کتاب و سنت اس پر ناطق و شاہد ہیں اور ساری اُمت اس پر متفق ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے اوصاف سے متصف ہے کہ اولیاء اللہ اس کو دوست رکھتے ہیں اور وہ بھی ان کو دوست رکھتا ہے۔ محبت کے لغوی معنی کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ حبہ بکسر حاء سے ماخوذ ہے اور وہ بیج ہیں جو صحرا میں زمین پر پڑتے ہیں۔ پس لوگوں نے محبت کا نام حب کر دیا، اس لئے کہ حیات کا اصل اس کے اندر ہوتا ہے جیسا کہ نباتات کے اصول بیج کے اندر ہوتے ہیں اور جس طرح بیج صحرا میں گر کر مٹی میں چھپ جاتا ہے، پھر اُس پر بارش ہوتی ہے، آفتاب چمکتا ہے، سردی اور گرمی اس کو پہنچتی ہے اور وہ بیج زمانوں کے تغیر سے متغیر نہیں ہوتا مگر جب اس کا وقت آپہنچتا ہے تو وہ اُگ آتا ہے، پھول نکالتا اور پھل دیتا ہے۔ اسی طرح محبت دل میں جگہ پکڑتی ہے۔ حضور و غیبت، بلا و محنت، راحت و لذت اور فراق و وصال سے وہ متغیر نہیں ہوتی۔ اسی مفہوم کو کسی شاعر نے ذیل کے شعر میں ادا کیا ہے:

یَا مَنْ سِقَامُ جُفُوْنِہٖ لِسِقَامِ عَاشِقِہٖ طَبِیْبٌ

حَرَثَ الْمَوَدَّۃِ فَاسْتَوٰی عِنْدِیْ حُضُوْرُکَ وَالْمَغِیْبُ

(ترجمہ: اے وہ شخص کہ جس کی پلکوں کی بیماریاں اس کے عاشق کی بیماریوں کے لئے طبیب ہیں، اس نے میرے دل میں محبت کا بیج بو دیا، پس میرے نزدیک تیرا حاضر ہونا اور غائب ہونا برابر ہے)۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ محبت کا لفظ حَبَبْ سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں وہ گڑھا، جس میں پانی بہت ہو اور نظر کا اس سے گذر نہ ہو اور وہ پانی اس کو روکنے والا ہو۔ ایسی ہی محبت ہے کہ جب وہ طالب کے دل میں جمع ہو کر اس کے دل کو لبریز کر دیتی ہے تو دوست کی بات کے سوا دل میں کسی اور چیز کی جگہ نہیں رہتی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو خلت اور دوستی کی خلعت سے نوازا تو حضرت خلیل علیہ السلام محض اللہ تعالیٰ کے کام کے لئے سب دنیا سے الگ ہو گئے، سب اہل عالم ان کے لئے حجاب ہو گئے اور آپ حق تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے سب حجابوں کے دشمن ہو گئے۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان کے حال اور ان کے مقام سے ہمیں خبر دی اور فرمایا: فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ (ترجمہ: بلاشبہ سب اہل عالم پروردگار کے سوا میرے دشمن ہیں)۔ اسی معنی میں حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں: سُمِّیَتِ الْمُحَبَّۃُ لِاَنَّهَا تَمْحُوْ مِنَ الْقَلْبِ مَاسِوَی الْمَحْبُوْبِ (ترجمہ: محبت کو اس لئے محبت کہتے ہیں کہ وہ دل سے محبوب کے سوا سب کو مٹا دیتی ہے) بعض کہتے ہیں کہ حُبّ اس چار چوبہ کو کہتے ہیں کہ جن کو باہم جوڑ کر پانی کا لوٹا اس پر رکھ دیتے ہیں۔ پس حُبِّ الٰہی کو بھی حُبّ اس لئے کہتے ہیں کہ محبت الٰہی اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی عزت و ذلت، راحت و مصیبت، تکلیف و آسائش اور وفا و جفا کو برداشت کرتی ہے اور یہ چیزیں اس پر گراں نہیں گزرتیں، کیونکہ ان کا کام بھی ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ ان چار لکڑیوں کا کام جو لوٹے کا بوجھ اٹھاتی ہیں۔ پس محبت کی پیدائش دوست کا بوجھ اُٹھانے کے لئے کی گئی ہے اور اس معنی میں ایک شاعر کہتا ہے:

اِنْ شِئْتِ جُوْدِیْ وَاِمَّا شِئْتِ فَامْتَنِعِیْ

کِلَاھُمَا مِنْکِ مَنْسُوْبٌ اِلَی الْکَرَمِ

(ترجمہ: اے محبوبہ! تو چاہے تو سخاوت کر اور چاہے تو نہ کر۔ تیری یہ دونوں باتیں کرم سے ہی منسوب ہیں)

بعض کہتے ہیں کہ حُبّ سے ماخوذ ہے اور وہ حبہ کی جمع ہے اور مراد اس سے حبہ دل یعنی دل کا نقطۂ سیاہ ہے اور دل کا نقطہ لطف الٰہی کا محل ہے۔ دل کا انتظام اسی کی وجہ سے ہوتا ہے اور محبت کا قیام بھی اسی سے ہے۔ پس محبت کو اس کے محل کا نام حب دیا گیا، کیونکہ اس کا قرار دل کے دانے میں ہے اور اہل عرب کسی چیز کو اس کے محل و موضع کے نام سے بھی موسوم کیا کرتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ محبت حَبَابُ الْمَاءِ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بے اتھاہ پانی اور چونکہ اس کا جوش سخت بارش کے وقت ہوا کرتا ہے، اس لئے محبت کا نام حب رکھا کیونکہ وہ بھی دل کا جوش ہی ہے جو محبوب کے لقا کے شوق کے وقت ہوا کرتا ہے۔ محبّ کا دل ہمیشہ محبوب کے دیدار کے شوق میں مضطرب اور بے قرار رہا کرتا ہے، جیسا کہ جسم رُوحوں کے مشتاق ہوا کرتے ہیں اور ان کا قیام روح کی وجہ سے ہوتا ہے، اسی طرح دل کا قیام محبت سے ہے اور محبت کا قیام محبوب کے دیدار اور اس کے ملنے سے ہے، اسی معنی کے متعلق ایک شاعر کہتا ہے:

اِذَا مَا تَمنَّی النَّاسُ رُوْحًا وَرَاحَةً
تَمَنَّیْتُ اَنْ اَلْقَاكَ تعْرِفُ حَالِیَا

(ترجمہ: جب لوگ آرام وراحت کی آرزو کرتے ہیں تو میں اس بات کی آرزو کرتا ہوں کہ تجھ سے ملوں، تاکہ کم سے کم تو میرا حال ہی معلوم کرے)۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حُبّ ایک اسم ہے جو صفائے محبت کے لئے وضع کیا گیا ہے، اس لئے کہ اہلِ عرب آنکھ کے تل کو حُبَّةُ الْاِنْسَانِ (آنکھ کی پتلی کا تل) کہتے ہیں جیسا کہ وہ دل کے نقطہ سیاہ کو حُبَّةُ الْقَلْبْ (دل کا سیاہ دانہ یا نقطہ) کہتے ہیں۔ پس یہ ایک (حُبَّةُ الْقَلْبْ) تو محبت کا محل ہے اور دوسرا (حُبَّةُ الْاِنْسَانِ) رویت کا محل ہے، یہی وجہ ہے کہ دل اور آنکھ محبت میں متصل ہیں اور اسی معنی میں ایک شاعر کہتا ہے:

اَلْقَلْبُ یَحْسَدُ عَیْنِیْ لَذَّتَ النَّظَرْ
وَالْعَیْنُ تَحْسُدُ قَلْبِیْ لَذَّتَ الْفِکَرْ

(ترجمہ: میرا دل میری آنکھ سے محبوب کے دیکھنے کی لذت پانے کے بارے میں حسد کرتا ہے اور میری آنکھ میرے دل سے محبوب کے متعلق غور وفکر کرنے میں حسد کرتی ہے)۔

دوسری فصل
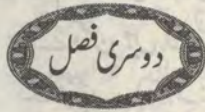
استعمال لفظِ محبت

جاننا چاہیے کہ لفظ محبت کا استعمال علماء کے نزدیک کئی طور پر ہوتا ہے۔ ایک تو محبوب کی طرف نفس کی بے آرامی، رغبت، خواہش، دل کی آرزو اور طلب اُنس کے ساتھ ارادہ کرنے کے معنوں میں، مگر ان سب اُمور کو اللہ تعالیٰ سے متعلق کرنا روا نہیں بلکہ یہ سب باتیں مخلوقات اور موجودات سے متعلق ہیں اور انہی میں پائی جاتی ہیں۔ دوسرے کے ساتھ خداوند تعالیٰ ان سب اُمور سے بے نیاز اور بہت برتر ہے۔ دوسرے، محبت کا استعمال احسان اور بندے کو اپنی عنایات سے مخصوص کرنے کے معنی میں ہوتا ہے کہ وہ اس کو برگزیدہ کر لیتا ہے اور اس کو کمال کے درجے پر پہنچا دیتا ہے اور اپنی نوازشات سے مخصوص کر لیتا ہے۔ تیسرے، بندے کی صفت وثنا کرنے کے معنی میں مستعمل ہے، اچھی ثنا وصفت۔ متکلمین کا ایک گروہ کہتا ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت جہاں تک ہمیں علم ہے، وہ اس کی سماعی صفات میں

سے ایک صفت ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں اس کے لئے چہرہ، ہاتھ اور استواء (سیدھے ہو کر بیٹھنا) ثابت ہے کہ اگر کتاب و سنت اس کو بیان نہ کرتی تو ان کا ثبوت حق تعالیٰ کے لئے عقل کی رُو سے محال ہوتا۔ پس اس وجہ سے ہم حق تعالیٰ کے لئے محبت ثابت کرتے اور اس پر ایمان لاتے ہیں، لیکن اس کے استعمال کرنے میں ہم توقف کرتے ہیں اور اس لفظ محبت کے حق تعالیٰ پر اطلاق کرنے میں گروہ صوفیا کی مراد وہ سب اقوال ہیں، جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں اور میں ان شاءاللہ تعالیٰ تمہارے سامنے اس کی حقیقت بیان کروں گا۔

جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت بندے کے لئے اُس پر رحمت اور اس کی بھلائی کا ارادہ کرنا ہے اور محبت ارادت کے اسموں میں سے ایک اسم ہے، جیسا کہ رضا، سخط، رحمت و رافت اور ایسے ہی اور نام۔ ان ناموں کو اللہ تعالیٰ کی ارادت کے سوائے کسی اور چیز پر محمول نہیں کرنا چاہئے۔ ارادت اللہ تعالیٰ کی صفت قدیم ہے جس سے وہ اپنے فعلوں کو چاہتا ہے۔ پس مبالغہ اور فعل کے ظاہر کرنے میں ان صفات میں سے بعض صفتیں بعض سے زیادہ مخصوص ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کی محبت بندے کے لئے یہ ہے کہ اس پر نعمت زیادہ کرتا ہے، دنیا و عقبیٰ میں اس کو ثواب دیتا ہے، عذاب کے محل سے اس کو محفوظ رکھتا ہے، گناہ سے اس کو بچاتا ہے، بلند احوال اور اونچے مقامات اس کو کرامت فرماتا ہے، اس کے باطن کو اغیار کی طرف توجہ کرنے سے ہٹا دیتا ہے اور اپنی ازلی عنایات سے اسے سرفراز کرتا ہے تاکہ وہ سب سے جدا ہو کر اس کی رضا کی طلب کے لئے تنہا رہ جائے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اس امور سے مخصوص کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے اس مخصوص ارادے کو محبت کا نام دیتے ہیں اور یہ مذہب حضرت وارث محاسبی و حضرت جنید رحمہما اللہ اور مشائخ کی ایک جماعت کا ہے۔ دونوں فریقوں کے فقہا اور اہل سنت و جماعت کے اکثر متکلمین کا بھی یہی مسلک ہے اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ بندے سے اللہ تعالیٰ کی محبت اس کی نیک تعریف ہے، اگر یہ درست مان لیا جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کا ثنا کرنا اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ماننا پڑے گا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا کلام قدیم ہے اور قدیم سے حادث کا تعلق محال ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ محبت بمعنی احسان الٰہی ہے تو اس کا احسان اس کا اپنا فعل ہی ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ یہ سب اقوال معنوی لحاظ سے ایک دوسرے کے قریب ہیں لیکن بندے کی محبت اللہ تعالیٰ کے لئے ایک صفت ہے جو فرمانبردار مومن کے دل میں تعظیم و تکبیر و تکریم کے معنی میں پیدا ہوتی ہے تاکہ وہ محبوب برحق کی رضا طلب کرے، اس کے دیدار کی طلب میں بے صبر ہو، اس کی قربت کی آرزو میں بے قرار رہے، اس کے سوا کسی اور سے اس کو آرام نہ ہو، اس کے ذکر کا عادی ہو، اس کے سوا غیر کے ذکر سے بیزار ہو، آرام اس پر حرام ہو، چین اس سے بھاگ جائے، تمام مرغوبات و مطلوبات دنیوی سے الگ ہو جائے، خواہش نفس سے اعراض کرے، محبت کے غلبے کی طرف توجہ کرے، اس کے حکم پر گردن جھکا دے اور کامل صفتوں کے ساتھ خداوند تعالیٰ کو پہچانے۔ یہ روا نہیں کہ خالق کی محبت اس کے لئے ویسی ہی ہو جیسی کہ خلقت کی محبت ایک دوسرے کے ساتھ ہوتی ہے کیونکہ مخلوق کی باہمی محبت محبوب کا احاطہ کر لینے اور اس کو پا لینے کی رغبت ہوتی ہے اور یہ اجسام کی صفت ہے۔

پس اللہ تعالیٰ کے دوست اس کے قرب میں ہلاک ہونے والے ہوتے ہیں نہ کہ اس کی کیفیت کے طالب، اس لیے کہ طالب محبت میں قائم بخود ہوتا ہے اور کشتۂ محبت میں فانی اور مغلوب لوگ ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ حادثات کو قدیم سے منسوب ہونے کے سوا اور کسی طرح قرب حاصل نہیں ہو سکتا اور جو شخص محبت کی اصلی حقیقت معلوم کرلے، اس کے لئے کوئی شک و ابہام باقی نہیں رہے گا۔ پس محبت دو طرح کی ہوتی ہے: ایک تو محبت جنس کی جنس کے ساتھ

اور وہ نفس کا میلان اور جستجو پر جم جانا، ایک دوسرے کو جسمانی طور پر چھونا اور ایک دوسرے سے چمٹ جانے کے طریق پر محبوب کی ذات کو طلب کرنا ہے۔ دوسری محبت ایک جنس کی غیر جنس سے ہے اور یہ محبت پوری کوشش چاہتی ہے تاکہ محبوب کے اوصاف میں سے کسی ایک صفت کے ساتھ اطمینان پا جائے اور اُنس گیر ہو، مثلاً بغیر کلام کے سننا اور بغیر آنکھوں کے دیکھنا۔ عاشقانِ الٰہی محبت حق میں دو قسم کے ہوتے ہیں: اول، وہ لوگ جو اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کا انعام واحسان دیکھتے ہیں تو انعام واحسان کا دیکھنا ہی منعم ومحسن کی معیت کا تقاضا کرتا ہے۔ دوسرے، وہ لوگ جو سب انعام کو محبت کے غلبے کی وجہ سے محل حجاب میں رکھتے ہیں اور ان کا راستہ نعمتوں کے دیکھنے سے منعم حقیقی کی طرف ہوتا ہے اور ان کا راستہ پہلے گروہ کے راستے سے بہت اُونچا ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

تیسری فصل
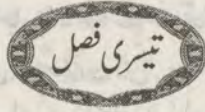
محبت کے مختلف نام

الغرض محبت ایک مشہور ومعروف لفظ ہے جو تمام لوگوں اور تمام زبانوں میں مروّج ہے، گو اسے الفاظ وعبارت میں ادا کرنا ناممکن سہی، تاہم عقلاء کے کسی گروہ نے اس کی حقیقت ثابتہ سے کبھی انکار نہیں کیا اور مشائخ طریقت میں حضرت سمنون المحب رحمۃ اللہ علیہ محبت الٰہی میں ایک خاص مذہب اور مسلک رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محبت الٰہی حق تعالیٰ کے راستے کی اصل اور بنیاد ہے، احوال ومقامات اس کی منزلیں ہیں اور جس منزل ومحل میں بھی طالب ہوتا ہے، اس پر زوال آنا روا ہوتا ہے۔ سوائے محل محبت حق کے کہ جب تک وہ موجود رہتی ہے، اس پر کسی حال میں زوال نہیں آتا اور دوسرے سب مشائخ اس بات پر اگرچہ آپ سے متفق ہیں، لیکن چونکہ محبت کا نام عام اور ظاہر ہے، اس لئے انہوں نے چاہا کہ اس کو چھپا دیں اور اس کی معنوی حیثیت برقرار رکھتے ہوئے اس کا نام بدل دیں پس انہوں نے خالص محبت کا نام صفوت رکھ دیا اور محبّ حق کو صوفی کہہ دیا اور ایک دوسرے گروہ نے حبیب کے اختیار کو ثابت کرنے اور محبّ کے اپنے اختیار کو ترک کرنے کو فقرا اور محبّ الٰہی کو فقیر کہا ہے اس لئے کہ محبت کا ادنیٰ درجہ حبیب کے ساتھ ہر حالت میں موافقت کرنا ہے اور حبیب کی موافقت ظاہر ہے کہ اس کی مخالفت کا غیر ہوتی ہے یعنی اپنا اختیار جو حبیب کے اختیار کے مقابلے میں ہو، یہی اس کی مخالفت ہے اور اس کے ترک کرنے سے ہی حبیب کی موافقت حاصل ہو سکتی ہے۔ میں نے اس کتاب کے شروع میں فقرا اور صفوت کا حال کھول کر بیان کر دیا ہے۔

اسی معنی میں چند بزرگ رہنما (اللہ ان پر رحمت کرے) فرماتے ہیں: اَلْحُبُّ عِنْدَ الزُّهَّادِ اَظْهَرُ مِنَ الْاِجْتِهَادِ۔ (محبت زاہدوں کے نزدیک نیکی میں کوشش کرنے کی نسبت زیادہ ظاہر ہے)۔ وَعِنْدَ التَّائِبِيْنَ اَوْجَدُ مِنْ اَنِيْنٍ وَحَنِيْنٍ۔ (اور اہل توبہ کے نزدیک محبت نالہ وفغاں سے زیادہ آسانی سے پائی جاتی ہے)۔ وَعِنْدَ الْاَتْرَاكِ اَشْهَرُ مِنَ الْفِتْرَاكِ۔ (اور ترکوں کے نزدیک محبت شکار بند سے زیادہ مشہور ہے)۔ وَصَبْىُ الْحُبِّ عِنْدَ الْهُنُوْدِ اَظْهَرُ مِنْ صَبْىِ مَحْمُوْدٍ (اور ہندوؤں میں محمود کے غلام بننے کے مقابلہ میں محبت کے غلام بننے کی رغبت زیادہ نظر آتی ہے)۔ وَتِهْتُهُ الْحُبِّ وَالْحَبِيْبِ عِنْدَ الرُّوْمِ اَشْهَرُ مِنَ الصَّلِيْبِ (اور محبت ومحبوب کا قصہ رومیوں کے نزدیک صلیب سے زیادہ مشہور ہے)۔ اَلْحُبُّ فِى الْعَرَبِ اَدَبٌ فِىْ كُلِّ حَىٍّ مِنْهُ طَرَبٌ اَوْ وَيْلٌ اَوْ نَيْلٌ اَوْ حُزْنٌ اَوْ هَرَبٌ (اور محبت کا قصہ عرب میں ایک ادب ہے جس سے ہر ایک قبیلے میں خوشی ہے، یا ہلاکت ہے، یا کامیابی یا غم یا بھاگنا ہے)

اور مراد ان سب اقوال سے یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ایسا نہیں جسے غیب میں کوئی ایسا کام نہ پڑا ہو جس کی محبت سے اپنے دل میں فرحت یا زخم نہ رکھتا ہو یا اس کا دل اس کی شراب سے مست یا اس کے غلبے سے مخمور نہ ہو، اس لئے کہ دل کی ترکیب بے قراری اور بے چینی سے ہے اور محبت کی گرہ کے سوا جو کچھ اس کے اندر ہے، وہ سب ایک سراب کی مانند ہے اور اس کے لئے محبت غذا کی حیثیت رکھتی ہے، جس سے وہ زندہ ہے۔ جو دل محبت سے خالی ہے، وہ دل خراب ہے اور تکلف کو اس کے ہٹانے اور اپنی طرف مائل کرنے کی طرف راستہ نہیں اور نفس ان لطائف سے جو دل پر گزرتے ہیں، آگاہ نہیں۔ حضرت عمر عثمان مکی رحمتہ اللہ علیہ اپنی کتاب "محبت" میں فرماتے ہیں کہ "خداوند تعالیٰ نے دلوں کو جسموں سے سات ہزار سال پہلے پیدا کیا اور مقام قرب میں رکھا۔ رُوحوں کو دلوں سے سات ہزار سال پہلے پیدا فرما کر اُنس کے درجے میں رکھا اور باطنوں کو روحوں سے سات ہزار سال پہلے پیدا کر کے وصل کے مقام میں رکھا اور ہر روز تین سو ساٹھ بار اپنے جمال کے ظاہر کرنے سے باطن پر تجلی فرمائی، تین سو ساٹھ بار نظر عنایت فرمائی اور محبت کا کلمہ رُوحوں کو سنایا اور اپنے تین سو ساٹھ لطیفے دل پر ظاہر کئے، یہاں تک کہ سب نے عالم میں نگاہ کی تو اپنے سے بڑھ کر باعزت اور کسی کو نہ دیکھا جس کے باعث ان میں غرور و فخر پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سبب سے ان کا امتحان فرمایا کہ بھید کو جان میں قید کر دیا اور جان کو دل میں اور دل کو جسم میں بند کر دیا، پھر عقل کو ان میں ترکیب دی اور انبیاء علیہم السلام کو بھیج کر ان کو احکام دیئے۔ تب ان میں سے ہر ایک اپنے مقام کا طالب ہوا، چنانچہ حق تعالیٰ نے نماز کا حکم فرمایا تو جسم نماز میں لگ گیا اور دل محبت سے وابستہ ہو گیا، جان قربِ حق میں پہنچ گئی اور سر باطن نے وصلِ حق سے قرار پکڑا، الغرض محبت کا لطیف مفہوم الفاظ و عبارات میں کبھی ادا نہیں ہو سکتا کیونکہ محبت ایک حال ہے اور حال کبھی قال نہیں ہو سکتا۔ اگر سب اہل عالم چاہیں کہ محبت کو کھینچ کر زبردستی اپنے اندر پیدا کر لیں تو کر نہیں سکتے اور اگر تکلف سے اس کو ہٹانا چاہیں تو بھی ہٹا نہیں سکتے، کیونکہ وہ محبت خدا تعالیٰ کی بخششوں میں سے ہے نہ کہ انسانی کسبوں میں سے اور اگر سب اہل عالم اس لئے جمع ہوں کہ محبت کو اس شخص کے لئے حاصل کریں، جو اس کا طالب ہے تو وہ ایسا بھی نہیں کر سکتے اور اگر اس شخص کے دل سے اس کو دفع کرنا چاہیں جو اس کا اہل ہے تو بھی عاجز ہو جائیں گے، کیونکہ محبت عطیۂ الٰہی ہے اور آدمی لہو و لعب کرنے والا ہے اور لہو و لعب کرنے والا عطیۂ الٰہی کو پا نہیں سکتا۔"
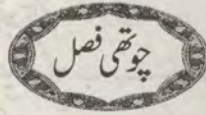
عشق کی حقیقت

عشق کے متعلق مشائخ طریقت کے بہت سے اقوال ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ نے بندے کی طرف سے خدا تعالیٰ کے عشق کو جائز رکھا ہے لیکن خدا تعالیٰ کی طرف سے بندے کے عشق کو جائز نہیں رکھا اور یوں کہا ہے کہ عشق اپنے محبوب سے روکنے کی صفت ہے اور بندہ حق تعالیٰ کے ملنے سے روکا گیا ہے لیکن حق تعالیٰ بندے کے ملنے سے نہیں روکا گیا۔ پس بندے سے خدا تعالیٰ کا عشق جائز ہے اور حق تعالیٰ سے بندے کا عشق جائز نہیں۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ بندے سے بھی خدا تعالیٰ کا عشق جائز نہیں، کیونکہ عشق حد سے تجاوز کرنا ہے اور خداوند تعالیٰ محدود نہیں اور پھر متاخرین صوفیا نے کہا ہے کہ عشق دونوں جہاں میں ذات حق تعالیٰ کے ادراک کے طالب کے سوا کسی اور کے لئے درست نہیں اور حق تعالیٰ کی ذات کا ادراک احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس کے ساتھ محبت اور اخلاص تو درست ہے،

عشق درست نہیں۔ نیز وہ کہتے ہیں کہ عشق آنکھ سے دیکھنے کے سوا ممکن نہیں اور محبت سننے سے جائز ہے اور چونکہ عشق نظر سے ہوتا ہے، اس لئے اس کی اطلاق حق تعالیٰ پر روا نہیں، کیونکہ دنیا میں اس کو کوئی شخص دیکھ نہیں سکتا، چونکہ حق تعالیٰ کی نسبت یہ ایک خبر تھی کہ وہ ایسا ہے اس لئے ہر ایک نے اس کا دعویٰ کیا، کیونکہ خطاب میں سب یکساں ہیں۔ پس حق تعالیٰ کی ذات قابل ادراک اور محسوس نہیں، تاکہ خلقت کا اس کے ساتھ عشق درست ہو، چونکہ وہ اپنے افعال اور اپنی صفات سے اولیاء پر احسان اور کرم کرنے والا ہے، اس لئے اس کی محبت صفات سے درست ہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جب یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کی محبت نے مستغرق کر دیا اور فراق کی حالت میں جب آپ نے پیراہن کی بو ہی پالی تو آپ کی آنکھیں بینا اور روشن ہوگئیں۔ جب زلیخا کو یوسف علیہ السلام کے عشق میں فنا کا درجہ حاصل ہو گیا تو جب تک اس نے وصل نہیں پایا، دوبارہ بینائی نہیں پائی اور یہ طریق بہت ہی عجیب ہے کہ ایک تو ہوا اور خواہش کی پرورش کرتا ہے، دوسرا ہوا اور خواہش کو چھوڑتا ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ عشق کی ضد نہیں اور اللہ تعالیٰ کی بھی ضد نہیں، اس لئے اس کا اطلاق اللہ پر جائز ہونا چاہئے اور اس عشق کے متعلق لطیفے بہت ہیں، لیکن طوالت کے خوف سے میں نے اتنے ہی لطائف بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے، واللہ اعلم۔

پانچویں فصل
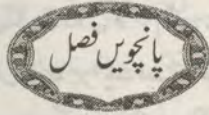
محبت کی تحقیق میں مشائخ کے رموز

محبت کی تحقیق میں مشائخ صوفیا کے رموز اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ ان کو شمار کر سکیں اور میں ان کے اقوال میں سے تھوڑے سے اس کتاب میں بیان کرتا ہوں تاکہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہو تو اس سے تبرک حاصل کر سکوں۔

استاد ابو القاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلْمَحَبَّةُ مَحْوُ الْحُبِّ بِصِفَاتِهٖ وَاِثْبَاتُ الْمَحْبُوْبِ بِذَاتِهٖ (ترجمہ: محبت محبّ کا اپنے کل اوصاف کو اپنے محبوب کی طلب میں محو کرنا اور محبوب یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کو ثابت کرنا ہے) یعنی چونکہ محبوب باقی ہوتا ہے اور محبّ فانی، اس لئے محبت کی عزت کے لئے محبوب کی بقا کو اپنی نفی سے طلب کرتا ہے، تاکہ مطلق ولایت اس کو حاصل ہو اور محبّ کی صفت کا فانی ہونا محبوب کی ذات کے ثابت کرنے کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ یہ روا نہیں کہ محبّ اپنی صفت کے ساتھ قائم ہو، کیونکہ اگر وہ اپنی صفت کے ساتھ قائم ہوتا تو محبوب کے جمال سے بے نیاز ہوتا۔ جب وہ جانتا ہے کہ اس کی حیات محبوب کے جمال سے ہے تو ضرور وہ اپنے اوصاف کی نفی کا طالب ہوتا ہے، کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ اپنی صفت کے ہوتے ہوئے وہ محبوب سے حجاب میں رہتا ہے۔ پس حق تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے وہ اپنا دشمن ہوگیا ہے اور یہ مشہور ہے کہ جب حسین بن منصورؒ کو سولی پر چڑھایا گیا تو ان کا آخری کلام یہ تھا حُبُّ الْوَاجِدِ اِقْرَارُ الْوَاحِدِ۔ (صاحب حال کی محبت اللہ واحد کو یکتا سمجھنا ہے)۔ محبّ کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اس کی ہستی محبت کے راستے میں بالکل مٹ جائے اور نفس کی حکومت اس کے وجود میں بالکل ختم اور معدوم ہوجائے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں: اَلْمَحَبَّةُ اِسْتِقْلَالُ الْكَثِيْرِ مِنْ نَّفْسِكَ وَاسْتِكْثَارُ الْقَلِيْلِ مِنْ حَبِيْبِكَ (ترجمہ: محبت یہ ہے کہ اپنے بہت کو تو تھوڑا جانے اور دوست کے تھوڑے کو بھی بہت) اور یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کا بندے کے ساتھ ہے کہ دنیا کی نعمت اور جو کچھ دنیا میں اس نے بندے کو عطا کیا ہے، اس کو تھوڑا کہا ہے، چنانچہ فرمایا ہے: قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ (ترجمہ: اے محمد ﷺ! کہہ دیجئے کہ دنیا کا سامان جو تمہیں دیا گیا ہے، وہ تھوڑا ہے) پھر

اس تھوڑی سی عمر، تھوڑی سی جگہ اور تھوڑے سے سامان کے ہوتے ہوئے ان کے تھوڑے سے ذکر کو بہت کہا۔ چنانچہ فرمایا ہے: وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ (اور اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور عورتیں) کہ اہل عالم جان لیں کہ حقیقی دوست اللہ تعالیٰ ہی ہے اور یہ صفت مخلوق کے لئے درست نہیں، اس لئے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی بندے کو پہنچتا ہے اس میں کوئی چیز تھوڑی نہیں اور بندے کی طرف سے جو کچھ بھی ہے، وہ سب تھوڑا ہے۔

شیخ سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلْمَحَبَّۃُ مُعَانَقَۃُ الطَّاعَاتِ وَمُبَایَنَۃُ الْمُخَالَفَاتِ (ترجمہ: محبت یہ ہے کہ تو محبوب کی عبادات سے بغلگیر ہو اور اس کی مخالفت سے علیحدہ ہو) کیونکہ جب محبت دل میں قوی ہو جاتی ہے تو دوست کا فرمان بجا لانا زیادہ آسان ہو جاتا ہے، اور یہ ملحدین کے اس گروہ کا ردّ ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بندہ محبت میں اس درجے پر پہنچ جاتا ہے کہ بندگی اس سے اُٹھ جاتی ہے۔ یہ محض بے دینی ہے کیونکہ محال ہے کہ عقل کی صحت کی حالت میں بندے سے تکلیف کا حکم ساقط ہو جائے، اس وجہ سے کہ سب امت کا اجماع ہے کہ محمد ﷺ کی شریعت کبھی منسوخ نہیں ہوگی اور جب ایک شخص سے عقل کی صحت کی حالت میں تکلیف کا ساقط ہو جانا روا ہو تو ضرورت سے روا ہوگا۔ یہ محض بے دینی ہے اور ہاں، مغلوب العقل اور بے ہوش کا حکم دوسرا ہے اور اس کا عذر بھی اور ہے، البتہ یہ بات روا ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنے کسی بندے کو اپنی محبت میں اس درجے پر پہنچادے کہ عبادت کرنے کا رنج اس سے اٹھ جائے کیونکہ کسی امر کا رنج اس امر کی محبت کی مقدار کے مطابق ہوتا ہے۔ جتنی محبت زیادہ قوی ہوگی، اتنا ہی فرمانبرداری کی تکلیف اٹھانا اس پر زیادہ آسان ہوگا اور یہ بات پیغمبر ﷺ کے حال سے ظاہر ہے کہ جب حق تعالیٰ کی طرف سے آپ پر یہ نازل ہوا:

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ (ترجمہ: آپ کی جان کی قسم! کفار اپنی مدہوشی میں سرگرداں ہیں)

تو آپ نے رات دن اتنی عبادت کی کہ آپ ﷺ سب کاموں سے رہ گئے اور آپ ﷺ کے پاؤں مبارک سوج گئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: طٰهٰ ۚ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰۤی (اے رسول ﷺ!) ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ اس کی وجہ سے ناقابل برداشت تکلیف اٹھائیں) نیز یہ بھی روا ہے کہ ادا کرنے کی حالت میں ادا کرنے کو خیال میں لانا بندے سے اُٹھ جائے، چنانچہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اِنَّهٗ لَیُغَانُ عَلٰی قَلْبِیْ وَاِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِیْ كُلِّ یَوْمٍ سَبْعِیْنَ مَرَّةً (ترجمہ: بے شک میرے دل پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے اور میں ہر روز ستر بار استغفار کرتا ہوں)، کیونکہ حضور ﷺ اپنی ذات اور اپنے فعل کی طرف نہیں دیکھتے تھے کہ اپنی عبادت پر مغرور ہوتے، بلکہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعظیم کو مدنظر رکھتے اور یوں فرماتے تھے کہ میرا یہ کام اس کی ذات کے لائق نہیں ہے۔

حضرت سمنون محبّ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ذَهَبَ الْمُحِبُّوْنَ لِلّٰهِ بِشَرَفِ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ لِاَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (ترجمہ: دوستانِ الٰہی دنیا و آخرت کی ساری بزرگی لے گئے ہیں کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ آدمی قیامت میں اس شخص کے ساتھ ہوگا، جسے وہ دوست رکھتا ہے) پس دوستانِ حق دنیا و عقبیٰ میں حق کے ساتھ ہوں گے اور جو حق تعالیٰ کے ساتھ ہو اس کے لئے خطا روا نہیں۔ پس دنیا کا شرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے اور آخرت کا شرف یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہوں۔ یحیٰ بن معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حَقِیْقَةُ الْمَحَبَّةِ مَالَا یَنْقُصُ بِالْجَفَاءِ وَلَا یَزِیْدُ بِالْبِرِّ وَالْعَطَاءِ (ترجمہ: محبت کی حقیقت یہ ہے کہ وہ جفا سے کم ہوتی ہے اور نہ احسان و عطا سے بڑھتی ہے) کیونکہ یہ دونوں محبت کے سبب ہیں اور اشیاء کے موجود ہونے کی حالت میں

اسباب معدوم ہوتے ہیں اور دوست کے لئے دوست کی بھیجی ہوئی بلا اچھی لگتی ہے اور جفا و وفا طریق محبت میں مساوی ہوتے ہیں۔ جب محبت حاصل ہو تو وفا، جفا کی طرح اور جفا، وفا کی طرح ہو جاتی ہے۔

حکایات میں مشہور ہے کہ حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ کو دیوانے پن کی تہمت لگا کر شفاخانے میں لے گئے اور وہاں بند رکھا تو کچھ لوگ آپ کی زیارت کے لئے آئے۔ آپ نے ان سے فرمایا: مَنْ اَنْتُمْ ؟قالُوْا اَحِبَّاءُ كَ اِفرَمٰا هُمْ بِالْحِجَارَةِ فَفَرّوْا۔ (ترجمہ: تم لوگ کون ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کے دوست ہیں۔ آپ نے ان کو پتھر مارنے شروع کر دیئے تو وہ سب بھاگ گئے)۔ تب آپ نے فرمایا: لَو كُنْتُم اَحِبَّائِیْ لَمَا فَرَرْتُمْ مِنْ بَلَائِیْ فَاصْبِرُوْا مِنْ بَلَائِیْ (ترجمہ: اگر تم میرے دوست ہوتے تو میری اس بلا سے کیوں بھاگتے؟ پس تم کو میری بلا پر صبر کرنا چاہیے) کیونکہ دوست، دوست کی بلا سے نہیں بھاگا کرتے۔ غرض اس سلسلے میں باتیں تو بہت ہیں مگر میں نے اتنے پر کفایت کی ہے، واللہ اعلم۔
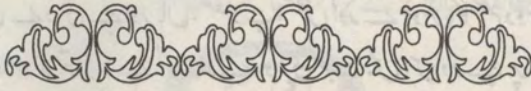
بائیسواں باب

چھٹے پردے کا کھولنا۔ زکوٰۃ

پہلی فصل
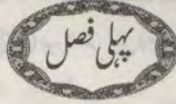
اثباتِ زکوٰۃ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُو الزَّکٰوۃَ (نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو)۔ اس کے متعلق بہت سی آیات اور احادیث میں اسلام کے ارکان و فرائض میں سے ایک زکوٰۃ ہے اور جس پر واجب ہو، اسے اس سے رُوگردانی روا نہیں۔ زکوٰۃ نعمت کے پورا ہونے پر واجب ہوئی یعنی جب دو سو درہم شرعی تقریباً ½۵۲ روپیہ رائج الوقت جو پوری نعمت ہے، کسی کے تصرف میں ملکیت کے طور پر ہوں اور ایک سال گزرنے کے باوجود اس کی ضرورت نہ پڑے تو اس پر پانچ درہم زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوتی ہے اور اسی طرح بیس دینار تقریباً ½۷ تولے سونا بھی پوری نعمت ہے، جس پر نصف دینار زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور پانچ اونٹ بھی پوری نعمت ہے، اس پر ایک بکری زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور جو مال اس کے مانند ہیں ان میں اسی طرح زکوٰۃ واجب ہے۔

یہ یاد رکھو کہ جس طرح مال پر زکوٰۃ فرض ہے، اسی طرح مرتبے پر بھی زکوٰۃ فرض ہے، کیونکہ وہ بھی پوری نعمت ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ فَرَضَ عَلَیۡکُمۡ زَکٰوۃَ جَاھِکُمۡ کَمَا فَرَضَ عَلَیۡکُمۡ زَکٰوۃَ مَالِکُمۡ (ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تم پر تمہارے مرتبے کی زکوٰۃ فرض کی ہے، جیسا کہ اس نے تم پر تمہارے مال کی زکوٰۃ فرض کی ہے) نیز فرمایا: اِنَّ لِکُلِّ شَیۡءٍ زَکٰوۃٌ وَ زَکٰوۃُ الدَّارِبَیۡتُ الضِّیَافَۃً (ترجمہ: بلاشبہ ہر چیز کی زکوٰۃ ہے اور گھر کی زکوٰۃ مہمان خانہ ہے) کسی نعمت پر زکوٰۃ ادا کرنے کی حقیقت اس نعمت پر خدا کا شکر ادا کرنا ہے، اسی طرح تندرستی بھی بڑی بھاری نعمت ہے، اس لئے ہر عضو کی علیحدہ علیحدہ زکوٰۃ ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے تمام اعضا کو عبادتِ الٰہی میں مشغول رکھیں اور کسی کھیل کود کے کام میں ان کو نہ لگائیں تاکہ نعمت کی زکوٰۃ کا حق ادا کریں۔ اگر حاکم ہو تو انصاف کرے اور عالم ومفتی ہو تو سفارش و رعایت اخلاص سے مسائل حق بیان کرے۔ اسی طرح باطن کی نعمت کی بھی زکوٰۃ ہے لیکن اس کی کثرت کی وجہ سے اس کی حقیقت کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ اس میں بھی اس کے لائق زکوٰۃ وہ ظاہری و باطنی نعمت کا عرفان ہے۔ جب بندہ جان لیتا ہے کہ حق تعالیٰ کی نعمت اس پر بے شمار ہے تو بے شمار شکر بھی ادا کرتا ہے اور وہ بے شمار شکر بے اندازہ نعمت کی زکوٰۃ ادا کرنا ہے، الغرض نعمت دنیا کی زکوٰۃ گروہ صوفیا کے نزدیک اچھی نہیں ہوتی، کیونکہ بخل آدمی کے لئے بہت برا ہے اور جب پورا بُخل ہو تو کوئی دو سو درہم روک رکھے اور ایک سال برابر ان کو اپنے تصرف میں نہ لائے اور پانچ درہم اس میں سے کسی کو دے، چونکہ اہل کرم کا طریق مال کا مستحق لوگوں میں خرچ کرنا اور سخاوت ان کی سیرت ہے تو پھر ان پر زکوٰۃ کہاں سے واجب ہو جائے گی۔

میں نے حکایات میں دیکھا ہے کہ ایک ظاہری عالم نے حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ سے آزمائش کے طور پر زکوٰۃ کی نسبت پوچھا کہ ادا کرنی چاہئے تو آپ نے فرمایا کہ جب بخل موجود ہو اور مال حاصل ہو تو دو سو درہم میں پانچ درہم

دینے چاہئیں اور ہر بیس دینار میں سے تمہارے مذہب کے مطابق نصف دینار ادا کرنا چاہئے لیکن میرے مذہب میں کوئی چیز اپنی ملکیت نہیں بنانی چاہئے تاکہ زکوٰۃ کے مشغلے سے تو چھوٹ جائے۔ یہ سن کر اس عالم نے کہا کہ اس مسئلے میں آپ کا امام کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کہ جو کچھ ان کے پاس تھا، سب راہِ حق میں دے دیا اور رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: مَاخَلَفْتَ لِعَيَالِكَ ؟ (تو نے اپنے اہل و عیال کے لئے پیچھے کیا چھوڑا؟) تو انہوں نے عرض کیا: اَللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ (اللہ اور اس کا رسول ﷺ) اور حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: (شعر)

فَمَا وَجَبَتْ عَلَىَّ زَكٰوةُ مَالٍ
وَهَلْ تَجِبُ الزَّكٰوةَ عَلَى الْجَوَادِ

(ترجمہ: مجھ پر مال کی زکوٰۃ واجب نہیں اور کیا سخی پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے؟ (ہرگز نہیں)۔

پس ان کا مال راہِ حق میں خرچ ہو جاتا ہے اور ان کا خون اللہ کے لئے معاف ہوتا ہے، نہ وہ لوگ مال میں بخل کرتے ہیں اور نہ خون پر کوئی گلہ کرتے ہیں اس لئے کہ ان کی کوئی ملک ہی نہیں ہوتی، لیکن اگر کوئی شخص جہالت کا ارتکاب کر کے کہے کہ میرے پاس کوئی مال نہیں، اس لئے زکوٰۃ کے علم سے میں مستغنی ہوں تو یہ سخت غلطی ہے کیونکہ علم کا سیکھنا ہر مومن پر فرض عین ہے اور علم سے استغنا کرنا کفر ہے۔ اس زمانے کی خرابیوں میں سے ایک یہ ہے کہ نیکی اور فقر کے مدعی لوگ اپنی جہالت سے علم کو ترک کر دیتے ہیں۔

ایک دفعہ میں صوفیوں کی ایک جماعت کو جو مبتدی تھے کچھ فقہی مضمون سکھا رہا تھا کہ ایک جاہل آ گیا اور میں اس وقت اونٹوں کی زکوٰۃ کے مسائل بیان کر رہا تھا اور بنت لبون[1]، بنت مخاض[2] اور حقہ[3] کا حکم بیان کر رہا تھا۔ اس جاہل کا دل ان باتوں کے سننے سے تنگ آ گیا اور اٹھ کر کہنے لگا کہ میرے پاس تو کوئی اونٹ نہیں کہ بنت لبون کا علم مجھے درکار ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ اے فلاں! جتنا ہمیں زکوٰۃ ادا کرنے کا علم ہونا چاہئے، اتنا ہی اس کے لینے کا بھی علم درکار ہے۔ اگر کوئی شخص تجھے بنت لبون دیدے اور تو اس کو لے لے تو تجھے بنت لبون کے علم کو ترک کرنے کے لئے نہ کہنا چاہئے اور اگر کسی کے پاس مال نہ ہو اور مال کی ضرورت بھی نہ ہو تو بھی علم کی فرضیت اس سے ساقط نہیں ہوتی، پس جہالت سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

دوسری فصل
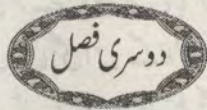
زکوٰۃ لینے کے متعلق مشائخ صوفیا کا عمل

مشائخ صوفیا میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے زکوٰۃ لی ہے اور بعض وہ ہیں جنہوں نے نہیں لی۔ جن کا فقر اختیاری ہوا ہے، انہوں نے زکوٰۃ نہیں لی۔ جب ہم مال جمع نہیں کریں گے تو زکوٰۃ بھی نہیں دینی پڑے گی اور دُنیاداروں سے ہم لیتے بھی نہیں کہ ان کا ہاتھ ہم سے اُونچا اور ہمارا ہاتھ ان سے نیچا نہ ہو اور جن کا فقر مجبوری اور غربت کی وجہ سے ہے، انہوں نے زکوٰۃ لی ہے لیکن نہ اپنی ضرورت کے لئے بلکہ اس لئے کہ مسلمان بھائی کی گردن سے فرض اُتاریں اور جب نیت یہ ہو تو اونچا ہاتھ یہی ہوگا نہ وہ۔ اگر دینے والے کا ہاتھ بلند ہوتا اور لینے والے کا نیچا تو اللہ تعالیٰ کے اس قول

[1] بنت لبون: اونٹ کا تین سالہ بچہ [2] بنت مخاض: اونٹ کا دو سالہ بچہ [3] حقہ: اونٹ کا چار سالہ بچہ

وَ یَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ (وہ صدقات وصول کرتا ہے) کے معنی ہی باطل ہو جاتے ہیں اور لازم آتا کہ زکوۃ دینے والا، زکوٰۃ لینے والے سے افضل ہو حالانکہ یہ اعتقاد صریح گمراہی ہے۔ پس بلند ہاتھ وہ ہے کہ کوئی چیز واجب ہونے کی وجہ سے مسلمان بھائی کی گردن پر سے اٹھالے تاکہ اس کا بوجھ اس مسلمان کی گردن سے اتر جائے۔ فقرا دنیادار نہیں ہوتے بلکہ وہ اہل عقبیٰ ہوتے ہیں اور اگر اہلِ عقبیٰ اہل دنیا کی گردن سے بوجھ نہ اٹھائے تو اس فرض کے ادا کرنے کا حکم اس پر قائم رہے اور قیامت میں اس کے سبب گرفتار بلا ہو۔

پس خداوند تعالیٰ نے اہلِ عقبیٰ کا مناسب طور اور آسان طریق سے امتحان لیا ہے تاکہ اہل دنیا اس فرض کے بوجھ کو اپنی گردن سے اُتار سکیں۔ یقیناً بلند ہاتھ فقیروں کا ہاتھ ہی ہوتا ہے جو شریعت کے حکم کے مطابق اپنا حق لینے والے ہوتے ہیں، اس شخص سے جس پر خداوند تعالیٰ کا حق واجب ہوتا ہے اور اگر زکوٰۃ لینے والے کا ہاتھ نیچا ہاتھ ہوتا جیسا کہ حشویہ لوگوں کا ایک گروہ کہتا ہے تو چاہئے تھا کہ پیغمبروں کا ہاتھ نیچا ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حق بندوں سے وصول کرتے اور شرائط کے مطابق صحیح مصرف میں صرف کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ غلطی پر ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ پیغمبر امر الٰہی سے زکوٰۃ لیتے تھے اور پیغمبروں کے بعد دین کے امام بھی اسی طریق پر عمل پیرا رہے ہیں، جو بیت المال کا حق لیتے رہے اور جو شخص زکوٰۃ لینے والے کے ہاتھ کو نیچا اور زکوٰۃ دینے والے کے ہاتھ کو اونچا سمجھتا ہے، وہ سخت غلطی پر ہے۔ ان دونوں باتوں کو تصوف میں ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے، چونکہ اس موضوع سے جود و سخا کا گہرا تعلق ہے، اس لئے میں اس کے متعلق بھی کچھ ذکر کیے دیتا ہوں اور توفیق و عصمت اللہ کے قبضے میں ہے۔
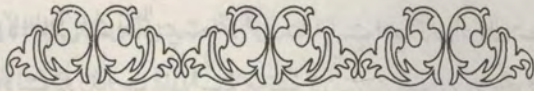
تیئیسواں باب

جود و سخا کے بیان میں

پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اَلسَّخِیُّ قَرِیْبٌ مِّنَ الْجَنَّةِ وَبَعِیْدٌ مِّنَ النَّارِ وَالْبَخِیْلُ قَرِیْبٌ مِّنَ النَّارِ وَ بَعِیْدٌ مِّنَ الْجَنَّةِ (ترجمہ: سخی آدمی بہشت سے قریب اور دوزخ سے دُور ہے اور بخیل آدمی دوزخ کے نزدیک اور بہشت سے دُور ہے) نیز فرمایا ہے: کَافِرٌ سَخِیٌّ عِنْدَاللّٰهِ اَفْضَلُ مِنْ مُؤْمِنٍ بَخِیْلٍ۔ (ترجمہ: کافر سخی اللہ کے نزدیک بخیل مومن سے اچھا ہے)۔ علماء کے نزدیک مخلوقات کی صفات میں جود و سخا دونوں ایک ہی معنی میں مستعمل ہوتے ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ صحیح نہیں کیونکہ حق تعالیٰ کو جواد کہتے ہیں، سخی نہیں کہتے، کیونکہ جواد کے متعلق توقیف[1] موجود ہے اور سخی کے متعلق توقیف ثابت نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو سخی کے نام سے نہیں پکارا اور رسول اللہ ﷺ سے بھی اس کے متعلق کوئی حدیث نہیں آئی۔

تمام اُمت و اہلِ سنت کے اجماع سے یہ بات روا نہیں کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا عقل و لغت کی رُو سے کوئی ایسا نام رکھے جس پر کتاب و سنت گواہ نہ ہوں، چنانچہ اللہ تعالیٰ عالم ہے اور اجماع امت سے اس کو عالم کہنا چاہئے، لیکن عاقل و فقیہہ نہیں کہنا چاہئے۔ اگرچہ یہ تینوں نام مترادف ہیں اور ایک ہی معنی میں مستعمل ہیں۔ عالم چونکہ ایک توقیفی اسم ہے، اس وجہ سے اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر جائز سمجھا گیا ہے اور عاقل و فقیہہ چونکہ توقیفی نہیں، یعنی کتاب و سنت سے ثابت نہیں، اس لئے ان کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر ناجائز قرار دیا گیا ہے اور بعض لوگوں نے جود و سخا کے درمیان فرق کرتے ہوئے کہا ہے کہ سخی وہ ہے جو سخاوت میں اپنے پرائے کی تمیز کرے اور جو کچھ وہ کرے کسی دنیوی غرض اور سبب سے وابستہ ہو۔ سخاوت میں یہ ابتدا کا مقام ہے اور جواد وہ ہوتا ہے جو بخشش کرتے وقت اپنے اور بیگانے کی تمیز نہ کرے اور اس کی سخاوت بے غرض اور بلا سبب ہو۔ یہ دو پیغمبروں کا حال ہے۔ ان دونوں پر اللہ کی رحمت اور سلام ہو۔ ایک ان میں سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہیں اور دوسرے حبیب اللہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ صحیح احادیث میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب تک کوئی مہمان نہ آجائے، کچھ نہ کھاتے تھے۔ ایک دفعہ تین روز تک کوئی شخص نہ آیا۔ آخر ایک آتش پرست آپ کے گھر کے دروازے پر آگیا۔ آپ نے اس سے پوچھا: "تو کون ہے؟" اس نے کہا: "میں آتش پرست ہوں۔" آپ نے فرمایا: "چلا جا، تو میری مہمانی اور مہربانی کے لائق نہیں۔" اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو عتاب ہوا کہ "جس شخص کی ستر سال تک میں نے پرورش کی ہے، تجھے اتنا بھی گوارا نہ ہوا کہ اسے ایک روٹی دے دے" لیکن اسکے برعکس جب حاتم کا بیٹا عدی، سید عالم ﷺ کی خدمت میں آیا تو حضور ﷺ نے اپنی چادر اُٹھا کر اس کے نیچے بچھا دی اور فرمایا: اِذَا اَتَاكُمْ كَرِیْمُ قَوْمٍ فَاَكْرِمُوْهُ (ترجمہ: جب تمہارے پاس کسی بھی قوم کا کوئی شریف آدمی آجائے تو اس کی تکریم کرو) پس حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بخشش میں اپنے پرائے کی تمیز کی اور ایک روٹی تک کسی غیر مذہب والے کو دینا گوارا نہ کیا اور حضور ﷺ نے اپنے پرائے میں کوئی تمیز نہ کی تو انہوں نے نبوت کی چادر کو کافر کا فرش بنا دیا، اس لئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام سخاوت تھا اور حضور اکرم ﷺ کا مقام جود تھا۔

[1] اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو کسی امر سے واقف کرنا اور اس امر کو وحی کے ذریعے متعین کرنا توقیف ہے۔

اس بارے میں سب سے اچھا مذہب وہ ہے جو کہتے ہیں کہ جود خیال اول کی پیروی کرنا ہے اور جب دوسرا خیال پہلے خیال پر غلبہ کرلیتا ہے تو وہ بخل کی علامت ہوتی ہے اور اہل تحصیل یعنی نیکی حاصل کرنے والوں نے اسی پہلے خیال کو ترجیح دی ہے، کیونکہ لامحالہ پہلا خیال حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ نیشاپور میں ایک سوداگر تھا جو ہمیشہ حضرت شیخ ابوسعید رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں رہتا تھا۔ ایک دن حضرت شیخ نے کسی درویش کے لئے کچھ طلب کیا۔ سوداگر نے بیان کیا کہ میرے پاس اس وقت ایک دینار اور قراضہ یعنی چاندی کا ایک چھوٹا سکہ تھا۔ پہلے تو جی میں آیا کہ دینار دے دوں لیکن پھر خیال آیا کہ قراضہ دینا چاہیے، چنانچہ میں نے قراضہ دے دیا۔ جب حضرت شیخ باتیں کرنے لگے تو میں نے آپ سے پوچھا کہ کیا یہ بات روا ہے کہ کوئی شخص حق تعالیٰ سے معارضہ کرے؟ حضرت شیخ نے فرمایا: "تو نے البتہ حق تعالیٰ سے معارضہ کیا ہے کہ اس نے تو کہا تھا کہ دینار دے اور تو نے قراضہ دیا۔" نیز مجھے معلوم ہوا ہے کہ شیخ ابو عبداللہ محمد رودباری رحمتہ اللہ علیہ ایک مرید کے گھر میں داخل ہوئے۔ مرید موجود نہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے گھر کا سامان بازار میں لے جائیں اور سب فروخت کر کے اللہ کی راہ میں دے دیں۔ جب مرید آیا تو اس بات سے بہت خوش ہوا اور شیخ کی خوشنودی کے واسطے کچھ نہ کہا۔ جب اس کی عورت آئی تو اس معاملے کو دیکھ کر گھر کے اندر چلی گئی اور اپنے کپڑے اُتار کر پھینک دیئے اور کہنے لگی کہ "یہ بھی گھر کے سامان میں سے ہے اور ان کا بھی یہی حکم ہے۔" خاوند نے اس کو پکار کر کہا کہ "تو نے یہ تکلف کیا اور یہ فعل تو نے ذاتی اختیار سے کیا، شیخ کا حکم نہ تھا۔" عورت نے کہا کہ "بھلے آدمی! جو کچھ شیخ نے کیا، وہ جود تھا اس لئے ہمیں چاہئے کہ ہم بھی تکلیف اُٹھا کو جود کریں۔" خاوند نے کہا کہ "ہاں یہ صحیح ہے، لیکن جب ہم نے شیخ کو اپنے لئے تسلیم کر لیا ہے تو ان کا یہ کام ہماری طرف سے عین جود ہے اور جود آدمی کی صفت میں تکلف کرنا ہوتا ہے اور مجاز ہے۔" مرید کو ہمیشہ چاہیے کہ اپنی ملک اور نفس کو امر الٰہی کی موافقت میں خرچ کرے، یہی وجہ ہے کہ حضرت سہل بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: اَلصُّوْفِیْ دَمُهٗ هَدَرٌ وَ مِلْكُهٗ مُبَاحٌ۔ (ترجمہ: صوفی کا خون معاف ہے اور اس کی ملکیت عام لوگوں کے لیے مباح ہے)۔

میں نے شیخ ابومسلم فارسی رحمتہ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک دفعہ میں نے ایک جماعت کے ہمراہ حجاز جانے کا ارادہ کیا تو حلوان کے گرد و نواح میں کردوں نے ہمارا راستہ روک لیا اور ہمارے چیتھڑے ہم سے چھین لئے اور ہم نے ان سے کچھ بھی جھگڑا نہ کیا، بلکہ ان کی دلجوئی کی۔ اندریں حال ہمارے درمیان ہی ایک شخص تھا جو بے قراری کر رہا تھا جسے دیکھ کر ایک کرد نے تلوار سونت لی اور اس کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ ہم سب نے اس کرد کے پاس اس کی سفارش کی تو اس نے کہا کہ "یہ روا نہیں کہ میں اس جھوٹے کو زندہ چھوڑوں، میں تو اس کو ضرور ہی قتل کروں گا۔" ہم نے اس کے قتل کرنے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا: "کیونکہ وہ صوفی نہیں اور اولیا کی صحبت میں خیانت کرتا ہے، ایسے شخص کا نہ ہونا ہی بہتر ہے۔" میں نے پوچھا کہ وہ کیسے؟ اس نے کہا: "اس لئے کہ صوفیوں کے لئے سب سے کم درجہ جود کرنا ہے اور اس کی گدڑی میں چند ٹکڑے بندھے ہیں۔ یہ شخص کیسے صوفی ہوسکتا ہے جو اپنے دوستوں کے ساتھ اتنا جھگڑا کرتا ہے، کیونکہ ہم لوگ کئی سال سے تمہارا ہی کام کر رہے ہیں اور تمہیں راستے میں لوٹ کر دنیا کے تعلقات کو تم سے قطع کرتے ہیں۔"

کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کا ایک دفعہ کسی نخلستان کے پاس سے لوگوں کی ایک

جماعت پر گزر ہوا اور ایک حبشی غلام کو دیکھا جو بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا۔ اتنے میں ایک کتا آ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ غلام نے ایک روٹی نکال کر اس کتے کو دے دی اور اس طرح دوسری اور تیسری بھی اس کے آگے ڈال دی۔ یہ دیکھ کر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس کے پاس جا کر فرمایا: "اے غلام! تیری ہر روز کی خوراک کتنی ہے؟" اس نے کہا: "بس اتنی ہی جو آپ نے دیکھی۔" آپ نے فرمایا کہ "تو نے وہ خوراک کتے کو کیوں دے دی؟" اس نے جواب دیا: "اس لئے کہ یہ کتوں کی جگہ نہیں اور وہ کہیں دُور سے اس اُمید پر آیا ہے، چنانچہ میں نے خود اس بات کو پسند نہیں کیا کہ اس کی تکلیف کو ضائع کروں۔" حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو اس کی یہ بات پسند آئی اور اس غلام کو مع بھیڑ بکریوں اور کھجوروں کے باغ کے خریدا اور پھر اللہ کی راہ میں آزاد کر دیا اور اسے کہا کہ "یہ بھیڑ بکریاں اور باغ میں نے تجھے بخش دیا۔" غلام نے آپ کو دُعا دی اور بھیڑ بکریوں کو اللہ کی راہ میں دے کر وہاں سے چلا گیا۔

روایت ہے کہ ایک شخص حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے گھر کے دروازے پر آ گیا اور کہنے لگا: "اے پیغمبر خدا (ﷺ) کے بیٹے! میرے ذمے چار سو درہم چاندی کے واجب الادا قرض ہیں۔" حضرت امیر المومنین حسن رضی اللہ عنہ نے اسی وقت اس کو چار سو درہم چاندی کے دے دینے کا حکم دیا اور روتے ہوئے گھر کے اندر چلے گئے۔ لوگوں نے پوچھا: "اے پیغمبر خدا (ﷺ) کے بیٹے! آپ کیوں روتے ہیں؟" آپ نے فرمایا: "اس لئے کہ پہلے سے اس شخص کا حال دریافت کرنے میں میں نے کوتاہی کی اور آخر اس کو سوال کرنے کی ذلت اٹھانی پڑی۔" کہتے ہیں کہ حضرت ابو سہل صعلوکی رحمۃ اللہ علیہ کبھی صدقہ کسی درویش کے ہاتھ نہ رکھا کرتے تھے اور جو کچھ بخشتے تھے کسی کے ہاتھ میں نہیں دیا کرتے تھے، بلکہ اس کو زمین پر رکھ دیا کرتے تھے تاکہ وہ لوگ خود اٹھالیں۔ اس کے متعلق لوگوں نے جب آپ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ دنیا کی اتنی وقعت نہیں کہ کسی مسلمان کے ہاتھ میں دی جائے تاکہ اس کی وجہ سے میرا ہاتھ اونچا اور اس کا نیچا ہو۔

پیغمبر ﷺ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ شاہ حبش نے آپ کو دو سیر مشک بھیجا تو آپ نے ایک ہی بار اس کو پانی میں ڈال دیا اور اپنے اور دوستوں کے جسموں پر مل دیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص سید عالم ﷺ کے پاس آیا۔ حضور ﷺ نے دو پہاڑوں کے درمیان ایک وادی جو بھیڑ بکریوں سے پر تھی، اُسے بخش دی۔ جب وہ اپنی قوم کی طرف واپس لوٹ کر گیا تو کہنے لگا: "اے قوم! مسلمان ہو جاؤ کہ محمد ﷺ ایسی بخشش فرماتے ہیں کہ اپنی مفلسی سے بھی نہیں ڈرتے۔" نیز حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید عالم ﷺ کے پاس ایک مرتبہ اسی ہزار درہم آئے۔ آپ نے ان کو ایک گدڑی پر ڈال دیا اور جب تک ان سب کو راہِ مولیٰ میں نہ دے ڈالا، حضور ﷺ اس جگہ سے نہ اُٹھے۔ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو ایک مرتبہ ایسی حالت میں دیکھا کہ آپ ﷺ نے بھوک کی وجہ سے پیٹ پر ایک پتھر باندھ رکھا تھا اور میں نے متاخرین میں سے ایک درویش کو دیکھا کہ ایک بادشاہ نے تین سو درہم کے وزن کے برابر خالص سونا اس کو بھیجا کہ وہ اسے لے لے، مگر وہ حمام میں چلے گئے اور سب کا سب سونا اہل حمام کو دے کر چلے آئے۔ اس سے پہلے نوری فرقے کے بیان کے ضمن میں ایثار کے متعلق میں نے کچھ مثالیں اور حکایتیں بیان کی ہیں، لہٰذا اس جگہ اتنے پر ہی اکتفا کیا گیا، وَاللهُ اَعْلَمُ۔
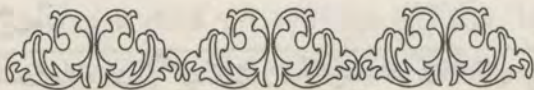
چوبیسواں باب

ساتویں پردے کے کھولنے کے بیان میں

پہلی فصل
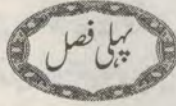
روزے کی حقیقت

خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے: یٰۤاَیُّهَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ (ترجمہ: اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں) پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے مجھے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِهٖ (ترجمہ: روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزادوں گا)۔ اس لئے کہ روزہ باطنی عبادت ہے جو ظاہر سے کچھ تعلق نہیں رکھتا اور غیر کا اس میں کچھ حصہ نہیں اور اس سبب سے اس کی جزا بھی بہت بڑی ہے اور کہتے ہیں کہ لوگوں کا بہشت میں داخلہ رحمت الٰہی سے ہوگا اور درجات بقدر عبادات کے اور بہشت میں ہمیشہ رہنا روزے کی جزا کے طور پر ہوگا، اسی لئے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: اَنَا اَجْزِیْ بِهٖ۔ (میں اس کی جزادوں گا)۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے اَلصَّوْمُ نِصْفُ الطَّرِیْقَةُ (روزہ آدھی طریقت ہے) اور میں نے کچھ ایسے مشائخ کو دیکھا ہے جو ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اور بعض کو دیکھا ہے کہ سوائے ماہ رمضان کے روزہ نہ رکھتے تھے اور وہ رمضان کے روزے رکھنا طلب اجر کے لئے تھا اور غیر رمضان میں روزہ نہ رکھنا اپنے اختیار اور ریا کو ترک کرنے کے لئے تھا۔ یہ بھی دیکھا ہے کہ بعض مشائخ نفلی روزہ رکھتے تھے لیکن کوئی نہیں جانتا تھا اور جب لوگ کھانا لاتے تو کھا لیتے تھے اور یہ بات سنت نبوی ﷺ کے زیادہ موافق ہے چنانچہ حدیث میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ پیغمبر ﷺ ان کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے کہا: اِنَّا قَدْ خَبَرْنَالَكَ حِیْسًا قَالَ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمْ اَمَّا اِنِّیْ کُنْتُ اُرِیْدُ الصَّوْمَ وَلٰکِنْ قَرِّبِیْهِ سَاَصُوْمُ یَوْمًا مَکَانَهٗ۔ (ترجمہ: ہم نے آپ کے لئے کھجور کا حلوہ پکایا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: میرا تو روزہ رکھنے کا ارادہ تھا لیکن تم اسے لے آؤ، میں اس کے بدلے کسی اور دن کا روزہ رکھ لوں گا) اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ مشائخ ایام بیض یعنی ہر ماہ کی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخ اور دس محرم کو روزے رکھا کرتے تھے۔ نیز میں نے دیکھا کہ وہ صوم داؤد بھی رکھا کرتے تھے، جسے پیغمبر ﷺ نے خیر الصیام کہا ہے اور وہ ایک دن روزہ رکھنا اور دوسرے دن افطار کرنا ہے۔ ایک دفعہ میں شیخ احمد بخاری کے پاس آیا۔ آپ کے سامنے حلوے کا طبق رکھا ہوا تھا اور آپ اس میں سے کھا رہے تھے۔ آپ نے میری طرف اشارہ فرمایا۔ میں نے بچپن کی عادت کے مطابق کہہ دیا کہ میں روزے سے ہوں۔ آپ نے فرمایا: کیوں؟ میں نے عرض کیا کہ فلاں بزرگ کی موافقت میں۔ آپ نے فرمایا کہ مخلوق کو کسی مخلوق کی موافقت و پیروی کرنا درست نہیں۔ میں نے روزہ افطار کرنے کا قصد کیا تو آپ نے فرمایا کہ جب تو اس بزرگ کی موافقت سے بیزاری ظاہر کرتا ہے تو پھر میری موافقت بھی نہ کر، کیونکہ میں بھی مخلوق سے ہوں اور یہ دونوں امر یکساں ہیں اور یاد رکھو کہ روزے کی حقیقت نفس کو روکنا ہے، گو یہ تعریف مختصر سہی لیکن اتنی جامع ہے کہ پوری طریقت کے اسرار و رموز اسی میں پوشیدہ ہیں اور سب

سے کم درجہ روزے میں بھوکا رہنا ہے، اس لئے کہ وَالْجُوعُ طَعَامُ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ (ترجمہ: اور بھوک زمین میں اللہ کا کھانا ہے) اور بھوک شرع وعقل کی رو سے سب زبانوں میں لوگوں کے درمیان پسندیدہ ہے۔

پس رمضان کے ایک ماہ کے روزے ہر عاقل و بالغ مسلمان تندرست مقیم پر فرض ہیں۔ ان کی ابتداء ماہ رمضان کے ہلال دیکھنے سے ہوتی ہے اور اختتام شوال کا چاند دیکھ کر اور ہر روز کے لئے صحیح نیت اور سچی شرط ضروری ہے، لیکن یہ یاد رکھو کہ نفس کو روکنے کی بہت سی شرطیں ہیں، مثلاً پیٹ کو کھانے اور پینے سے بچائے رکھے، آنکھ کو نظر شہوت سے، کان کو غیبت سننے، زبان کو لغو اور بیہودہ باتوں اور جسم کو دنیا کی متابعت اور شریعت کی مخالفت سے محفوظ رکھے۔ اُس وقت کوئی شخص حقیقی طور پر روزہ دار ہو گا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابیؓ سے فرمایا: اِذَا صُمْتُ فَلْیَصُمْ سَمْعُكَ وَبَصَرُكَ وَلِسَانُكَ وَیَدُكَ وَ كُلُّ عُضْوٍ مِنْكَ (جب تو روزہ رکھے تو چاہیے کہ تیرے کان، آنکھ، زبان، ہاتھ اور تیرا ہر عضو بھی روزہ رکھے)۔ نیز حضور ﷺ نے فرمایا ہے: رُبَّ صَائِمٍ لَیْسَ لَهٗ مِنْ صَوْمِهٖ اِلَّا الْجُوْعُ وَالْعَطَشُ (بہت سے روزہ دار ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو اپنے روزے سے سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا)۔

میں (علی بن عثمان جلابیؒ) نے سید عالم ﷺ کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اَوْصِنِی (یارسول اللہ! مجھے وصیت فرمائیے) آپ نے فرمایا: اِحْبِسْ لِسَانَكَ وَحَوَاسَكَ (اپنی زبان اور دوسرے سب حواس کو بند رکھ) کیونکہ حواس کو بند رکھنا ہی پورا مجاہدہ ہے، اس لئے کہ تمام علوم انہی کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں۔ وہ حواس دیکھنے، سننے، چکھنے اور چھونے کی قوتیں ہیں جو اس علم وعقل کی سپہ سالار ہیں۔ ان میں سے چار حواس کا محل مخصوص ہے، البتہ ایک حس سارے جسم میں پھیلی ہوئی ہے چنانچہ آنکھ نظر کا محل ہے جو جسم اور رنگ کو دیکھتی ہے، کان شنوائی کا محل ہے جو خبر اور آواز کو سنتا ہے، تالو ذائقہ کا محل ہے جو مزے اور بے مزہ کو جانتا ہے، ناک سونگھنے کا محل ہے جو خوشبو اور بدبو کو معلوم کرتا ہے اور لمس یعنی چھونے کا کوئی خاص محل نہیں بلکہ تمام اعضائے بدن میں پھیلی ہوئی ہے جو کہ نرمی، گرمی، سردی اور سختی کو محسوس کرتی ہے۔ یاد رکھو کہ بدیہی اور الہامی امور کے سوا کوئی ایسی چیز نہیں جس کا علم انسان کو ان پانچ طریقوں کے سوا کسی اور طریق سے حاصل ہو، کیونکہ الہامی امور میں کوئی خرابی نہیں ہوسکتی اور ان حواس خمسہ میں سے ہر ایک طریقے میں صفائی بھی ہے اور کدورت بھی، کیونکہ جس طرح علم وعقل اور روح کو ان حواس میں دخل حاصل ہے، اسی طرح نفس اور خواہش نفسانی کو بھی، گویا یہ حواس فرماں برداری، نافرمانی، نیک بختی اور بدبختی میں قدرِ مشترک ہیں۔ پس حق تعالیٰ کی ولایت سمع وبصر میں امر خیر کا دیکھنا اور سننا ہے لیکن نفس کی ولایت جھوٹ کا سننا اور شہوت سے نظر کرنا ہے۔ چھونے، چکھنے اور سونگھنے میں ولایت حق حکم الٰہی کی موافقت اور سنت کی متابعت ہے اور نفس کی ولایت فرمان حق وشریعت کی مخالفت۔ پس روزہ دار کو چاہئے کہ وہ بہرکیف ان پانچ حواس کو اپنے قابو میں رکھے، یہاں تک کہ وہ حکم الٰہی کی مخالفت کو چھوڑ کر شریعت کی پوری طرح پیروی اختیار کرے، تاکہ وہ صحیح معنوں میں روزہ دار کہلائے ورنہ صرف کھانے پینے سے روزہ رکھنا بچوں اور بوڑھی عورتوں کا کام ہے۔ روزہ دراصل لہو، غیبت اور حرام چیزوں سے پرہیز کرنا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ (ترجمہ: ہم نے ان کے ایسے اجسام نہیں بنائے کہ وہ کھانا نہ کھائیں)۔ نیز فرمایا ہے اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا (ترجمہ: کیا تم نے خیال کر لیا ہے کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا ہے؟) یعنی ہم نے ہر ایک مخلوق

کو کھانے کا محتاج کیا ہے اور لوگوں کو کھیل کود کے لئے پیدا نہیں کیا۔ پس درحقیقت نفس کو کھیل اور حرام سے روکنا چاہئے، نہ کہ صرف حلال کے کھانے سے۔ مجھے اس شخص پر سخت تعجب ہے جو کہتا ہے کہ میں نے نفلی روزہ رکھا ہے، حالانکہ وہ فرض کو ترک کرتا ہے کیونکہ نافرمانی نہ کرنا فرض ہے اور ہمیشہ نفلی روزے رکھنا سنت ہے۔ پس ہم دل کی اس سختی سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اور جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے محفوظ ہو جائے تو پھر اس کے تمام احوال ہی روزہ ہوتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ جس دن شکم مادر سے پیدا ہوئے، روزہ دار تھے اور جس دن دنیا سے رُخصت ہوئے، اس روز بھی روزہ دار تھے۔ لوگوں نے کہا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" جواب دیا کہ "جس دن آپ کی پیدائش ہوئی، صبح کا وقت تھا۔ آپ نے صبح سے شام تک کوئی دودھ نہ پیا اور جب دنیا سے رُخصت ہوئے تو خود روزہ دار تھے۔" یہ روایت ابوطلحہ مالکی رحمتہ اللہ علیہ نے بیان کی ہے لیکن روزہ وصال[1] کی پیغمبر ﷺ سے نہی آئی ہے کیونکہ جب حضور ﷺ وصال کرتے تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی حضور ﷺ کی موافقت کرتے تھے۔ تب حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ روزۂ وصال نہ رکھو۔ اِنِّیْ لَسْتُ كَاَحَدِكُمْ اِنِّیْ اَبِیْتَ عِنْدَرَبِّیْ یُطْعِمُنِیْ وَیُسْقِیْنِیْ (ترجمہ: تم میں سے میں کسی ایک کی طرح نہیں ہوں، کیونکہ میں اللہ کے پاس رات بسر کرتا ہوں، وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے)۔ پس اہل مجاہدہ کہتے ہیں کہ وہ نہی شفقت ہے نہ کہ نہی تحریم۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ روزۂ وصال رکھنا خلافِ سنت ہے، لیکن حقیقت میں وصال کا روزہ خود محال ہے اس لئے کہ جب دن گزر گیا تو رات کو روزہ نہیں ہوتا اور جب روزے کی نیت رات کو باندھتا ہے تو وصال نہ ہو گا۔ حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ ہر پندرہ روز میں ایک بار اور جب ماہِ رمضان ہوتا تو عید تک کچھ نہ کھاتے تھے اور ہر رات چار سو رکعت نماز نفل ادا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات انسان کی طاقت سے باہر ہے اور سوائے توفیق الٰہی کے ایسا نہیں کر سکتے۔ دراصل وہ تائید الٰہی میں ہے جو اس شخص کی غذا ہو جاتی ہے اور ایک کی غذا تو دنیا کا کھانا ہے اور دوسرے کی غذا تائید الٰہی۔

شیخ ابونصر سراج طاؤس الفقراء صاحب سمعہ رحمتہ اللہ علیہ سے یہ بات مشہور ہے کہ ایک مرتبہ آپ ماہِ رمضان میں بغداد پہنچے تو مسجد شونیزیہ میں آپ کو ایک الگ حجرہ دے دیا گیا اور درویشوں کی امامت بھی آپ کے سپرد کر دی گئی۔ آپ عید تک اپنے اصحاب کی امامت کرتے رہے اور تراویح میں آپ نے پانچ قرآن مجید ختم کیے۔ ہر رات خادم ایک روٹی حجرہ میں آپ کو دے آتا۔ جب عید کا دن ہوا تو آپ وہاں سے چلے گئے اور خادم نے دیکھا کہ سب تیس کی تیس روٹیاں بدستور موجود تھیں۔ علی بن بکار رحمتہ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حفص مصیصی رحمتہ اللہ علیہ کو دیکھا ہے کہ رمضان میں سوائے پندرھویں روز کے آپ نے کچھ نہیں کھایا۔ ابراہیم ادہم رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ رمضان میں اوّل سے اخیر تک آپ نے کچھ نہیں کھایا تھا، حالانکہ گرمی کا موسم تھا اور ہر روز مزدوری پر گیہوں کاٹتے تھے اور جو کچھ مزدوری لیتے تھے، وہ سب درویشوں کو دے دیتے تھے اور ساری رات دن نکلنے تک نماز نفل ادا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو محفوظ رکھا، نہ انہوں نے کھایا اور نہ آپ سوئے۔ شیخ عبداللہ بن خفیف رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب دنیا سے آپ نے رحلت کی تو چالیس چلے پے در پے آپ نے کاٹے تھے۔

میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ جنگل میں ہر سال دو چلے کاٹا کرتے تھے اور دانش مند ابو محمد بالقری رحمتہ اللہ علیہ

[1] افطار کئے بغیر پے در پے روزہ رکھنا یا لگاتار روزے رکھنا

نے جب دنیا سے رحلت فرمائی تو میں وہاں حاضر تھا۔ اسی روز سے آپ نے کچھ نہیں کھایا تھا اور کسی نماز میں بھی جماعت فوت نہ ہوئی تھی۔ میں نے متاخرین میں سے ایک درویش کو دیکھا کہ اسّی (۸۰) دن رات تک اس نے نہ کچھ کھایا تھا اور نہ کسی نماز میں آپ سے جماعت فوت ہوئی تھی۔ مرو میں دو بزرگ تھے، ایک کا نام مسعود اور دوسرے کا نام شیخ ابو علی سیاہ تھا۔ (اللہ ان دونوں پر رحم فرمائے) مسعود نے ابو علی کی طرف آدمی بھیجا کہ یہ فقر کا دعویٰ کب تک رہے گا؟ آؤ چالیس روز تک ہم بیٹھیں اور کچھ نہ کھائیں۔ ابو علی نے اسے جواب دیا کہ آؤ ہر روز تین بار کھائیں اور چالیس روز تک ایک ہی وضو میں رہیں۔ یہاں ایک اشکال ہے جس کا دُور کرنا ضروری ہے کیونکہ جاہل لوگ اس کو سند بنا کر کہتے ہیں کہ روزہ وصال جائز ہے، حالانکہ حضور اکرم ﷺ نے اس کی سخت ممانعت فرمائی ہے اور طبیب لوگ بھی اس کو ناممکن العمل قرار دیتے ہیں۔ اسی لئے میں اس مسئلے کو پورے طور پر بیان کرتا ہوں تاکہ وہ مشکل حل ہو جائے۔ جاننا چاہئے کہ ایسے طور پر روزہ وصال رکھنا کہ فرمان الٰہی کی تعمیل میں کوئی خلل نہ آئے، کرامت ہے اور کرامت خاص لوگوں کو حاصل ہوتی ہے نہ کہ عام کو اور جب اس کا حکم عام نہیں تو عوام کو اس کا حکم دینا درست نہیں اور اگر کرامت کا اظہار عام ہوتا تو ایمان لانا جبر ہوتا اور معرفت پر عارفوں کو کوئی ثواب نہ ہوتا۔

پس چونکہ رسول اللہ ﷺ صاحب معجزہ تھے اس لئے آپ نے روزہ وصال علانیہ رکھا اور اہل کرامت کو اس کے ظاہر کرنے سے منع فرمادیا، کیونکہ کرامت کی شرط پوشیدہ رکھنا اور معجزے کی شرط ظاہر کرنا ہے اور یہ فرق معجزہ و کرامت کے درمیان بالکل واضح ہے اور جس کو ہدایت ہو، اس کے لئے اتنا بیان کافی ہے اور ان کے چلّے کا اصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حال سے تعلق رکھتا ہے اور مقام کی حالت میں مکالمہ درست ہوتا ہے۔ اولیاء جب چاہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کا کلام باطن سے سنیں تو وہ چالیس روز بھوکے رہتے ہیں اور جب تیس روز گزر جاتے ہیں تو مسواک کر لیتے ہیں اور اس کے بعد دس روز اور بھوکے رہتے ہیں تو ضرور اللہ تعالیٰ ان کے باطن سے کلام کرتا ہے، کیونکہ جو بات انبیاء کو ظاہر طور پر کرنی روا ہے، اولیاء کو وہ بات اپنے باطن سے روا ہے۔

پس کلام الٰہی کا سننا طبیعت کے باقی رکھنے کے باوجود روا نہیں اور طبیعتوں کے لئے چالیس روز تک کھانے اور پینے کی نفی کرنی چاہئے تاکہ وہ طبائع مغلوب ہو جائیں اور محبت کی صفائی اور روح کی لطافت پورے طور پر حاصل ہو جائے اور اس کے لئے چونکہ زیادہ موافق بھوک کا باب ہے، اس لئے اب ہم اس کی حقیقت کو واضح کرتے ہیں تاکہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس کی حقیقت بھی تمہیں معلوم ہو جائے۔
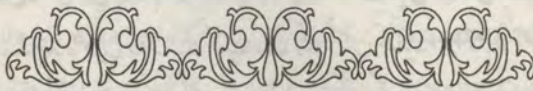
پچیسواں باب

بھوک اور اس کے متعلقات

خداوند تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ (ترجمہ: اور ہم تم کو کچھ خوف، بھوک اور مالوں، جانوں اور پھلوں کے نقصان سے ضرور آزمائیں گے)۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: بَطْنٌ جَائِعٌ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ سَبْعِيْنَ عَابِدًا غَافِلًا۔ (ترجمہ: بھوکا پیٹ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ستر غافل عابدوں سے زیادہ محبوب ہے)۔ جاننا چاہئے کہ بھوکا رہنے کو بہت بڑا شرف حاصل ہے۔ تمام اُمتوں اور ملتوں کے نزدیک وہ پسندیدہ ہے اس لئے کہ ظاہر طور پر بھی بھوکے آدمی کا دل بہت تیز، اس کی طبیعت بہت تہذیب یافتہ اور زیادہ تندرست ہوتی ہے۔ خصوصاً وہ بھوکا جس میں شر زیادہ نہ ہو اور ریاضت و مجاہدے سے اس نے اپنے آپ کو مہذب کر لیا ہو۔ لِاَنَّ الْجُوْعَ لِلنَّفْسِ خُضُوْعٌ وَلِلْقَلْبِ خُشُوْعٌ (ترجمہ: کیونکہ بھوک نفس کے لئے فروتنی اور دل کے لئے عاجزی کا باعث ہے) کیونکہ بھوکے آدمی کا جسم پژمردہ اور دل گڑگڑانے والا ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نفسانی قوت بھوک کی وجہ سے مٹ جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اَجِيْعُوْا بُطُوْنَكُمْ وَاَظْمُوْا اَكْبَادَكُمْ وَاَعْرُوْا اَجْسَامَكُمْ لَعَلَّ قُلُوْبَكُمْ تَرَوْنَ اللّٰهَ عَيَانًا فِي الدُّنْيَا (ترجمہ: اپنے شکموں کو بھوکا رکھو اور اپنے جگروں کو پیاسا اور اپنے جسموں کو ننگا تاکہ تمہارے دل دنیا میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیں) اگرچہ جسم کو بھوک کی وجہ سے مصیبت ہوگی لیکن دل کو اس سے نور حاصل ہوگا، روح کو صفائی اور باطن کو لقائے حق میسر ہوگا اور جب باطن کو لقائے حق، روح کو صفائی اور دل کو روشنی حاصل ہو تو اگرچہ جسم مصیبت بھی دیکھے تو کیا نقصان ہے؟ کیونکہ پیٹ بھر کر کھانے کی کچھ وقعت نہیں۔ اگر وقعت ہوتی تو جانوروں کو پیٹ بھر کر نہ کھلاتے، کیونکہ پیٹ بھر کر کھانا جانوروں کا کام ہے اور بھوکا رہنا بیماروں کا علاج ہے۔ نیز بھوکا رہنا باطن کو آباد کرنا اور پیٹ بھر کر کھانا پیٹوں کو آباد کرنا ہے اگر ایک شخص اپنی ساری عمر باطن کی آبادی میں صرف کر دیتا ہے تاکہ حق تعالیٰ کے لئے وہ تنہا اور تعلقات دنیا سے الگ ہو تو وہ بھلا ایسے شخص کے برابر کیسے ہوسکتا ہے جو ساری عمر بدن کی آبادی اور جسم کی خواہش کی خدمت میں خرچ کرتا ہے۔ ایک تو دنیادار شخص ہے، جسے سارا جہان صرف کھانے کے لئے درکار ہے اور دوسرا ولی اللہ، جسے کھانا صرف عبادت کرنے کے لئے ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے كَانَ الْمُتَقَدِّمُوْنَ يَاْكُلُوْنَ لِيَعِيْشُوْا وَاَنْتُمْ تَعِيْشُوْنَ لِتَاْكُلُوْا (پہلے لوگ تو کھانا صرف اس لئے کھاتے تھے کہ وہ زندہ رہ سکیں اور تم اس لئے زندہ رہتے ہو کہ کھاتے رہو) اَلْجُوْعُ طَعَامُ الصِّدِّيْقِيْنَ وَمَسْلَكُ الْمُرِيْدِيْنَ وَقَيْدُ الشَّيَاطِيْنَ۔ (بھوک صدیقوں کا کھانا، مریدوں کا طریقہ اور شیطانوں کی قید ہے)۔

آدم علیہ السلام کا بہشت سے زمین پر گرنا اور قربِ الٰہی سے دُور ہونا، اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر کے بعد ایک لقمہ کھانے کی وجہ سے ہی تھا اور درحقیقت جو شخص بھوک میں لاچار ہو، وہ بھوکا نہیں ہوتا کیونکہ کھانے کا طالب خود کھانے والا ہوتا ہے۔ پس جس کو بھوک کا درجہ حاصل ہوتا ہے، وہ کھانے کو ترک کرنے والا ہوتا ہے نہ کہ کھانے سے روکا ہوا۔ جو شخص کھانے کے موجود ہونے کی حالت میں اس کو ترک کر دے اور بھوک کا رنج اور بوجھ اٹھائے،

وہ فی الحقیقت بھوکا ہوتا ہے اور شیطان کو مقید کرنا اور ہوائے نفس کو روکنا بھوکا رہنے کے سوا ہو نہیں سکتا۔

کنانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مِنْ حُکْمِ الْمُرِیْدِ اَنْ یَکُوْنَ فِیْہِ ثَلٰثَۃُ اَشْیَاءٍ نَوْمُہٗ غَلَبَۃٌ وَ کَلَامُہٗ ضُرُوْرَۃٌ وَاَکْلُہٗ فَاقَۃٌ (ترجمہ: مرید کے لئے شرط یہ ہے کہ اس میں تین باتیں موجود ہوں، اس کا سونا غلبے کی وجہ سے، اس کا کلام ضرورت کے سبب سے اور اس کا کھانا فاقے کی وجہ سے ہو)۔ فاقہ بعض کے نزدیک دو رات دن بھوکا رہنا ہے اور بعض کے نزدیک تین رات دن اور بعض کے نزدیک ایک ہفتہ اور بعض کے نزدیک چالیس روز۔ اس لئے کہ اہل تحقیق اس بات پر متفق ہیں کہ سچی بھوک چالیس رات دن میں صرف ایک دفعہ ہوتی ہے اور جو صرف جان کی حفاظت کے لئے ہوتی ہے۔ اس عرصے کے درمیان جو خواہش ظاہر ہوتی ہے وہ طبیعت کی حرص اور اس کا غرور ہوتا ہے، اللہ تمہیں معاف کرے۔ تمہیں جاننا چاہئے کہ اہل معرفت کی رگیں سب اللہ تعالیٰ کے اسرار کی دلیلیں ہیں اور ان کے دل اللہ تعالیٰ کی نظر کا مقام اور دلوں کی ضو سے ان کے سینوں میں دروازے کھلے ہوئے ہوتے ہیں اور عقل و ہوا ان کی درگاہ پر بیٹھی ہیں۔ پس روح تو عقل کی مدد کرتی ہے اور نفس خواہش کی اور طبیعتیں جس قدر غذاؤں سے زیادہ پرورش پاتی ہیں، اسی قدر نفس زیادہ قوی ہوتا ہے اور خواہش نفس زیادہ پرورش پاتی ہے۔ اس کا دبدبہ اعضا میں زیادہ پھیلتا ہے اور ہر ایک رگ میں اس کے انتشار کی وجہ سے ایک اور طرح کا حجاب ظاہر ہو جاتا ہے اور جب غذائیں نفس کو قوی کرنے سے ہاتھ اٹھا لیتی ہیں اور غذا نہ ملنے کی وجہ سے نفس کمزور ہو جاتا ہے تو خواہش نفس زیادہ کمزور ہو جاتی ہے۔ عقل زیادہ قوی اور نفس کی قوت رگوں سے منقطع ہو جاتی ہے اور اسرار الٰہی اور اس کے دلائل زیادہ واضح ہو جاتے ہیں اور جب نفس اپنی حرکات سے عاجز آ جاتا ہے اور خواہش نفس اپنے وجود سے فانی ہو جاتی ہے تو جھوٹی ارادتِ حق کے ظاہر کرنے میں محو ہو جاتی ہے، اس وقت مرید کی ساری مراد حاصل ہو جاتی ہے۔

حضرت ابوالعباس قصاب رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ میری اطاعت و معصیت دو فعلوں سے وابستہ ہے، یعنی جب میں کھاتا ہوں تو مقام معاصی کا مادہ اپنے اندر پاتا ہوں اور جب کھانے سے ہاتھ اُٹھا لیتا ہوں تو سب عبادت کی اصل اپنے اندر دیکھتا ہوں، لیکن بھوک کا ثمرہ مشاہدہ ہوتا ہے کیونکہ مجاہدہ اس مشاہدے کی اصل بنیاد ہے۔ پس سیری مشاہدے کے ساتھ اس بھوک سے اچھی ہے جو مجاہدے کے ساتھ ہو، اگر سیر ہو جانے سے مشاہدہ حق حاصل ہو جائے تو یہ اس کے بھوکا رہنے سے بہتر ہے، جس میں محض مجاہدہ و ریاضت ہو اور اگر اصل مقصود یعنی مشاہدۂ حق حاصل نہ ہو، اس لئے کہ مشاہدۂ حق مردانِ الٰہی کا میدان کارزار ہے اور مجاہدہ بچوں کا کھیل ہے: فَالشَّبْعُ بِشَاھِدِ الْحَقِّ خَیْرٌ مِّنَ الْجُوْعِ بِشَاھِدِ الْخَلْقِ (ترجمہ: پس وہ سیری جس میں مشاہدہ حق حاصل ہو، اس بھوک سے بہتر ہے جس میں خلقت کا مشاہدہ حاصل ہو)۔ اس معنی میں کلام بہت ہے، لیکن میں نے کتاب کی طوالت کے خوف سے اسی پر اختصار کیا ہے اور توفیق اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے۔

چھبیسواں باب

آٹھویں پردے کا کھولنا

حج کی حقیقت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا۔ (اللہ کے بندوں پر بیت اللہ کا حج فرض ہے، جس کو اس تک پہنچنے کی استطاعت ہو) یعنی بندے پر صحتِ عقل اور بلوغ، اسلام اور استطاعت کے حاصل ہونے کی حالت میں شرعی فرائض میں سے ایک فرض بیت اللہ کا حج کرنا ہے اور وہ میقات[1] پہنچ کر احرام باندھنا اور میدانِ عرفات (مکہ معظمہ سے ۱۲، ۱۳ میل کے فاصلہ پر پہاڑوں سے گھرا ہوا ایک وسیع میدان ہے جہاں نویں ذی الحجہ کو حاجی ظہر کے بعد سے لے کر سورج غروب ہونے کے بعد تک دعائیں مانگتے رہتے ہیں اور اس جگہ کا قیام حج کے مناسک میں سے ایک اہم منسک ہے۔ "منسک" حج کے ارکان میں سے ایک رُکن کو کہتے ہیں) میں کھڑے ہونا اور کعبہ کا طوافِ زیارت کرنا ہے، اس میں سب علماء کا اتفاق ہے اور صفا و مروہ[2] کے درمیان دوڑنا، اس میں علماء کا اختلاف ہے، البتہ احرام باندھے بغیر حرم مکہ میں داخل نہ ہونا چاہیئے۔ حرم مکہ کو اس لئے حرم کہتے ہیں کہ اس میں مقام ابراہیم ہے اور محل امن ہے اور لڑنا اس میں حرام ہے۔ پس ابراہیم علیہ السلام کے دو مقام ہوئے۔ ایک آپ کے جسم کا مقام، دوسرا آپ کے دل کا مقام اور آپ کے جسم کا مقام یعنی قیام گاہ تو مکہ ہے اور آپ کے دل کا مقام خلت سے خالص محبت الٰہی ہے۔ جو شخص آپ کے جسم کے مقام کا قصد کرے، اسے تمام شہوات اور لذات نفسانی سے اعراض کرنا چاہیئے یعنی احرام باندھ کر گویا کفن پہن لینا، حلال شکار سے ہاتھ اٹھالینا، تمام حواس کو بند کر لینا، عرفات میں حاضر ہونا، وہاں سے مزدلفہ و شعر الحرام میں جانا، کنکریاں اٹھا کر مکہ میں کعبہ کا طواف کر کے پھر منیٰ میں آنا، وہاں تین روز تک ٹھہرنا، کنکریاں مقررہ شرط کے ساتھ جمروں پر مارنا، وہاں سر کے بال منڈانا اور قربانی کے بعد اصلی لباس پہن لینا چاہیئے، پھر جو شخص آپ کے دل کے مقام کا قصد کرے، اسے اپنی مرغوبات سے اعراض کرنا، دُنیوی لذتوں اور راحتوں کو ترک کرنا اور اغیار کے ذکر سے رُوگردانی کرنی چاہیئے اس لئے کہ عالم کون و فساد کی طرف اس کا التفات کرنا ممنوع ہے۔ تب معرفت کے عرفات میں قیام کرنا، وہاں سے اُلفت کے مزدلفہ کا قصد کرنا، وہاں سے اپنے باطن کو تنزیہہ حق تعالیٰ کے حرم کے طواف کے لئے بھیجنا، خواہش نفسانی اور فاسد خیالات کی کنکریاں ایمان کی امان کی منیٰ میں پھینکنا اور نفس کو مجاہدے کے قربان گاہ میں قربان کرنا چاہیئے تاکہ خلت کے مقام پر پہنچ جائے۔

پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جسم کے مقام یعنی حرم کعبہ میں داخل ہونا، دشمن اور اس کی تلوار سے محفوظ ہونا ہے اور آپ کے دل کے مقام یعنی خلت میں داخل ہونا، قطعیت یعنی علیحدگی، خدا سے دُوری وغیرہ اسی قسم کی برائیوں سے امان پانا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اَلْحَاجُ وَفْدُ اللّٰهِ يُعْطِيهِمْ مَاسَأَلُوْا وَيَسْتَجِيْبُ لَهُمْ مَادَعُوْا (ترجمہ: حاجی لوگ اللہ تعالیٰ کا قافلہ ہیں۔ جو کچھ وہ مانگیں، انہیں عطا کرتا ہے اور ان کی دُعا کو قبول فرماتا ہے) اور کچھ عام لوگ تو پناہ مانگتے ہیں اور کچھ لوگ نہ پناہ مانگتے ہیں اور نہ دُعا کرتے ہیں، سوائے تسلیم کے جیسا کہ

[1] احرام باندھنے کی جگہ [2] مکہ مکرمہ کے پاس دو پہاڑیاں ہیں، جہاں حضرت ہاجرہ علیہا السلام پانی کی تلاش میں کئی بار اِدھر سے اُدھر دوڑتی پھریں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا۔ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (جب اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ فرمانبردار ہو جا، تو آپ نے کہا: میں پروردگار عالم کا فرماں بردار ہوں) اور وہ خلت کے مقام پر پہنچ گئے اور تعلقاتِ دُنیا سے الگ ہو گئے اور آپ کا دل غیر حق سے منقطع ہوگیا۔ تب حق تعالیٰ نے چاہا کہ آپ کو مخلوق کے سامنے ظاہر فرمائے، اس لئے نمرود کو مقرر کیا یہاں تک کہ اس نے آپ کے اور آپ کے والدین کے درمیان پہلے تو جدائی ڈال دی اور پھر آگ بھڑکائی۔ شیطان نے آکر گوپھیا[1] بنائی اور لوگوں نے آپ کو گائے کے چمڑے میں سی کر گوپھیا کے پلڑے میں رکھ دیا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اس گوپھیا کا پلڑا پکڑ کر کہا: هَلْ لَكَ اِلَیَّ مِنْ حَاجَةٍ؟ (کیا آپ کو مری اعانت کی ضرورت ہے؟) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اَمَّا اِلَیْكَ فَلَا۔ (نہیں، مجھے آپ کی کوئی ضرورت نہیں) انہوں نے کہا: کیا آپ کو خداوند تعالیٰ کی بھی کوئی حاجت نہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ کی مجھے حاجت ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا: وہ کیسے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: حَسْبِیْ مِنْ سُؤَالِیْ عِلْمُهٗ بِحَالِیْ (میرے سوال کی نسبت اس کا میرے حال کو جاننا ہی میرے لئے کافی ہے) یعنی وہ جانتا ہے کہ محض اسی کی ذات کے لئے مجھے آگ میں ڈال رہے ہیں، اس لئے اب مجھے سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔

محمد بن فضیل رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس بات سے تعجب ہے کہ لوگ دنیا میں تو آپ کا مقام یعنی کعبۃ اللہ تلاش کرتے ہیں لیکن دل میں آپ کا مشاہدۂ حق طلب نہیں کرتے، حالانکہ آپ کا یہ گھر یعنی خانہ کعبہ کبھی تو موجود ہوتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ موجود نہیں ہوتا یعنی منہدم ہو جاتا ہے اور دل میں مشاہدۂ حق ضرور ہوتا رہتا ہے، اگر عمارتِ کعبہ کی زیارت فرض ہے جس پر سال میں ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کی نظر ہوتی ہے تو وہ دل جس پر رات دن میں تین سو ساٹھ مرتبہ نظر رحمت کرتا ہے، اس کعبہ سے کہیں بڑھ کر زیارت کے لائق ہے، لیکن اہل تحقیق کے لئے مکہ کے راستے میں ہر قدم پر ایک نشان قدرت ظاہر ہے اور جب حرم میں پہنچتے ہیں تو ہر ایک سے خلعت پاتے ہیں۔ بایزید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس کی عبادات کا ثواب اور جزا کل قیامت کو ملنا ٹھہرا ہے، اس سے کہہ دو کہ آج اس نے عبادت ہی نہیں کی، کیونکہ مجاہدے کی عبادت سے ہر دم کا ثواب حال ہی میں حاصل ہو جاتا ہے۔ وہی فرماتے ہیں کہ پہلی دفعہ حج میں میں نے سوائے خانہ کعبہ کے اور کچھ نہ دیکھا دوسری دفعہ گھر بھی دیکھا اور گھر والا بھی اور تیسری دفعہ گھر والے یعنی اللہ تعالیٰ کو دیکھا، خانہ کعبہ بیت اللہ کو بالکل نہ دیکھا، الغرض حرم وہاں نہیں ہوتا جہاں مجاہدہ ہوتا ہے، بلکہ وہاں ہوتا ہے جہاں مشاہدۂ حق ہوتا ہے اور اس کی تعظیم ہوتی ہے اور جس شخص کے لئے سارا عالم قربِ حق کے وعدے کا مقام اور انس کی خلوت گاہ نہ ہو، اسے محبت حق کی ابھی تک کچھ خبر نہیں اور جب بندہ حق کا مشاہدہ کرنے والا ہو تو سارا عالم اس کے لئے حرم ہوتا ہے اور جب مشاہدۂ حق سے حجاب میں ہو تو حرمِ کعبہ بھی اس کے لئے سارے عالم سے تاریک ترین مقام ہوتا ہے۔

ع اَظْلَمُ الْاَشْیَاءِ دَارُ الْحَبِیْبِ بِلَا حَبِیْبٍ

(ترجمہ: محبّ کے لئے محبوب کا گھر محبوب کے بغیر سب سے زیادہ تاریک مقام ہوتا ہے)۔

پس خلت دوستی حق کے مقام میں ہی مشاہدہ و رضائے حق کی قدرت و قیمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کعبے کے دیکھنے کو اس کے حصول کا سبب بنا دیا ہے نہ کہ کعبہ کی، لیکن سبب سے محض سبب ہونے کی حیثیت سے تعلق پیدا کرنا

[1] ایک آلہ ہے جس میں بڑے بڑے پتھر رکھ کر دور پھینک دیئے جاتے ہیں، عربی میں اسے منجنیق کہتے ہیں۔

چاہئے نہ کہ اصل مقصود کی حیثیت سے، تاکہ معلوم ہو کہ عنایت الٰہی کس کمین گاہ سے ظہور پذیر ہوتی ہے اور طالب کی مراد کہاں سے جلوہ نمائی کرتی ہے۔ پس جنگلوں اور بیابانوں کے قطع کرنے سے مردانِ حق کی مراد بعینہ حرم نہیں ہوتی کیونکہ حق کے دوست پر حرم کا دیکھنا حرام ہوتا ہے، بلکہ ان کی مراد ایک بیقرار رکھنے والے شوق اور اللہ کی محبت میں ہمیشہ گھلتے رہنے کی آرزو کے ساتھ مجاہدہ کرنا ہے۔

کوئی شخص حضرت جنید بغدادیؒ کے پاس آیا۔ آپ نے اس سے پوچھا: "تو کہاں سے آیا ہے؟" اس نے کہا: "میں حج پر گیا ہوا تھا۔" آپ نے فرمایا: "تو نے حج کیا؟" اس نے کہا ہے: ہاں! آپ نے پوچھا: "شروع میں جو تو اپنے گھر سے باہر نکلا اور وطن کو چھوڑا تو کیا سب گناہوں کو بھی چھوڑا؟" اس نے جواب دیا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: "تو تو نے وطن سے سفر نہیں کیا۔" پھر آپ نے پوچھا کہ "جب تو گھر سے نکلا اور ہر منزل پر رات کے وقت مقام کیا تو کیا تو نے اس مقام میں طریق حق میں سے بھی کچھ قطع کیا؟" اس نے کہا: نہیں۔ تب آپ نے فرمایا کہ "تو نے منزلیں طے نہیں کیں۔" پھر آپ نے پوچھا کہ "جب تو نے میقات پر احرام باندھا تو کیا تو اپنی صفاتِ بشری سے ایسا ہی جدا ہوا جیسا کہ اپنے کپڑوں اور عادتوں سے؟" اس نے کہا: نہیں! تو آپ نے فرمایا: "تو نے احرام نہیں باندھا۔" پھر پوچھا کہ "جب تو عرفات کے میدان میں کھڑا ہوا تو کیا کشف و مشاہدۂ حق میں بھی تجھے کھڑا ہونا حاصل ہوا؟" اس نے کہا: نہیں، تو آپ نے فرمایا: "تو عرفات میں بھی کھڑا نہیں ہوا۔" پھر پوچھا کہ "جب تو مزدلفہ میں گیا اور تیری مراد حاصل ہو گئی تو کیا تو نے سب نفسانی مرادوں کو ترک کر دیا؟" اس نے کہا: نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ "تو مزدلفہ بھی نہیں گیا۔" پھر پوچھا: "جب تو نے بیت اللہ کا طواف کیا تو کیا تو نے باطن کی آنکھ سے تنزیہ[1] کے مقام میں حضرت حق سبحانہٗ کے جمال کے لطائف کو بھی دیکھا؟" اس نے کہا: نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ "تو نے طواف بھی نہیں کیا۔" پھر فرمایا: "جب تو نے صفا و مروہ کے درمیان سعی کی تو کیا تو نے صفا اور مروہ کا درجہ معلوم کیا؟" اس نے کہا: نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ "تو نے ابھی سعی بھی نہیں کی۔" پھر پوچھا کہ "جب منیٰ میں آیا تو کیا تیری آرزوئیں تجھ سے ساقط ہو گئیں؟" اس نے کہا: نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ "تو ابھی منیٰ میں نہیں گیا۔" پھر پوچھا کہ "جب تو قربان گاہ میں آیا اور قربانی کی تو کیا تو نے اپنی نفسانی خواہشات کی قربانی کی؟" اس نے کہا: نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ "تو نے قربانی بھی نہیں کی۔" پھر پوچھا کہ "جب تو نے کنکریاں پھینکیں تو کیا جو کچھ تیرے ساتھ نفسانی اُمور تھے، ان سب کو تو نے پھینک دیا؟" اس نے کہا: نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ "تو نے ابھی کنکریاں بھی نہیں پھینکیں اور حج بھی نہیں کیا، واپس لوٹ جا اور اس طرح حج کر تاکہ تو بھی مقام ابراہیم پر پہنچ جائے۔"

میں نے سنا کہ ایک بزرگ کعبہ کے بالمقابل بیٹھا رو رہا تھا اور یہ اشعار زبان سے پڑھ رہا تھا:

وَاَصْبَحْتُ یَوْمَ النَّحْرِ وَالْعِیْسُ تَرْحَلُ
وَکَانَ حُدَی الْحَادِیْ بِنَا وَھُوَ مُعْجِلُ
اُسَائِلُ عَنْ سَلْمٰی فَھَلْ مِنْ مُّخْبِرٍ
بِاَنَّ لَہٗ عِلْمًا بِھَا اَیْنَ تَنْزِلُ
لَقَدْ اَفْسَدَتْ حَجِّیْ وَنُسْکِیْ وَعُمْرَتِیْ
وَبِیْ الْبَیْنِ لِیْ شُغْلٌ مِنَ الْحَجِّ اَشْغَلُ

---

[1] تنزیہ: خداوند تعالیٰ کو ہر عیب سے منزہ اور پاک سمجھنا

سَأُرْجِعُ مِنْ عَامِيْ لِحَجَّةٍ قَابِلٍ
فَإِنَّ الَّذِيْ قَدْ كَانَ لَا يَتَقَبَّلُ

(ترجمہ: اور ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو جب کہ سفید اونٹ کوچ کر رہے تھے اور حدی خواں نے حدی پڑھ کر ہمارے اونٹوں کو چلایا اور وہ جلدی کر رہا تھا۔ میں اپنی محبوبہ سلمیٰ کی بات پوچھنے لگا۔ پس ہے کوئی اس بات کی خبر دینے والا جسے اس کی نسبت علم ہو کہ وہ کہاں اُترے گی؟ اس محبوبہ نے تو میرا حج، میری قربانی اور میرا عمرہ سب فاسد کر دیئے اور اس کے فراق میں مجھے ایک شغل حاصل ہے جو سب سے زیادہ حج سے روکنے والا ہے۔ میں اس سال آئندہ سال کے حج کے لئے واپس لوٹ جاؤں گا کیونکہ وہ حج جو ہو چکا ہے وہ قبول نہیں کیا جائے گا)۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک جوان کو دیکھا کہ موقف حج میں خاموش کھڑا ہے اور سر نیچے ڈال رکھا ہے۔ لوگ دُعا کر رہے تھے اور وہ بالکل خاموش تھا۔ میں نے کہا: "اے جوان! تو کیوں دُعا اور خوشی نہیں کرتا؟" اس نے کہا: "مجھے وحشت ہو گئی اور خوشی کا وقت جو مجھے حاصل تھا، وہ فوت ہو گیا ہے۔ اب دُعا کرنے کی کوئی صورت نہیں۔" میں نے کہا: "دُعا کر تا کہ خداوند اس مجمع کی برکت سے تیری مراد بر لائے۔" اس نے چاہا کہ ہاتھ اُٹھا کر دعا کرے، مگر اس نے ایک نعرہ مارا اور جان دے دی۔ ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک جوان کو دیکھا جو منیٰ میں آرام سے بیٹھا تھا حالانکہ سب لوگ قربانیوں میں مشغول تھے، میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے اور کون ہے؟ وہ کہنے لگا۔ "بارِ خدایا! سب لوگ قربانیوں میں مشغول ہیں، میں بھی چاہتا ہوں کہ اپنے نفس کو تیری بارگاہ میں قربان کروں، مجھے تو قبول فرما۔" یہ بات کہی اور انگشت شہادت سے اپنے گلے کی طرف اشارہ کیا اور نیچے گر پڑا۔ جب میں نے غور سے دیکھا تو روح اس سے پرواز کر گئی تھی، اللہ اس پر رحم کرے۔

پس حج دو قسم کا ہوتا ہے: ایک غیبت میں اور دوسرا حضور میں۔ جو شخص حرمِ مکہ میں پہنچ کر بھی غیبت کے اندر ہو، وہ اس جیسا ہے جو اپنے گھر میں بھی غیبت کے اندر ہو۔ اس لئے کہ کوئی غیبت دوسری غیبت سے بہتر نہیں ہوتی اور وہ شخص جو اپنے گھر میں ہوتے ہوئے حاضر بحق ہو، وہ ایسا ہی ہے گویا کہ حاضر دربارِ الٰہی ہے کیونکہ کوئی دربارِ الٰہی کی حاضری دوسری حاضری سے بہتر نہیں ہوتی۔ پس حج ظہور مشاہدۂ حق کے لئے مجاہدہ ہے اور مجاہدہ مشاہدۂ حق کی علت نہیں بلکہ اس کی معراج ہے اور سبب کو معانی کی حقیقت میں کوئی زیادہ تاخیر نہیں ہوتی۔ میرا حج سے مقصود خانہ کعبہ کا دیدار نہیں بلکہ اس سے مقصود ظہور مشاہدۂ حق ہے۔ اب میں مشاہدۂ حق کے متعلق ایک باب درج کرتا ہوں جو انہی معانی پر مشتمل ہو تا کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہو تو تمہیں اپنا مقصود حاصل کرنے میں مدد دے، وَاللّٰہُ اَعْلَمُ۔
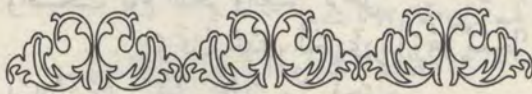
ستائیسواں باب

کشف و مجاہدہ کی حقیقت میں

پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: اَجِيعُوا بُطُوْنَكُمْ وَعُوا الْحِرْصَ وَاَعْرُوْا اَجْسَامَكُمْ قَصِّرُوْا الْاَمَلَ وَاَظْمَاُوْا اَكْبَادَكُمْ دَعُوَا الدُّنْيَا لَعَلَّكُمْ تَرَوْنَ اللّٰهَ بِقُلُوْبِكُمْ (ترجمہ: اپنے شکموں کو بھوکا رکھو، حرص کو چھوڑ دو، اپنے جسموں کو برہنہ رکھو، آرزو کم کرو اور اپنے جگروں کو پیاسا رکھو، دنیا کو چھوڑ دو تاکہ اللہ تعالیٰ کو اپنے دل سے دیکھ لو) نیز جب جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ سے مقام احسان کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ احسان یہ ہے: اَنْ تَعْبُدُ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ (ترجمہ: کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے طور پر کرے کہ گویا تو اس کو خود دیکھ رہا ہے۔ پس اگر تو اس کو دیکھ نہیں سکتا تو یقیناً وہ تجھے دیکھ رہا ہے)۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی: يَا دَاوٗدُ اَتَدْرِىْ مَا مَعْرِفَتِىْ قَالَ لَا قَالَ حَيَاةُ الْقَلْبِ فِىْ مُشَاهَدَتِىْ (ترجمہ: اے داؤدؑ! کیا آپ کو معلوم ہے کہ میری معرفت کیا چیز ہے؟ انہوں نے عرض کیا: نہیں، تو فرمایا: وہ میرے مشاہدے میں دل کا زندہ ہونا ہے)۔ جماعت صوفیا کے نزدیک مشاہدے سے مراد ذاتِ الٰہی کو دل کی آنکھوں سے دیکھنا ہے کہ وہ دل سے خداوند تعالیٰ کو خلوت و جلوت میں بے کیف دیکھتے ہیں۔ حضرت ابوالعباس بن عطار رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تفسیر میں اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (بلاشبہ جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار تو اللہ تعالیٰ ہے پھر اس پر مضبوطی سے جمے رہے) کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ بِالْمُجَاهَدَةِ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا عَلٰى بَسَاطِ الْمُشَاهَدَةِ۔ (جنہوں نے حالت مجاہدہ میں یوں کہا کہ ہمارا پروردگار تو اللہ تعالیٰ ہے، پھر وہی مشاہدہ الٰہی کی بساط پر مضبوطی سے جمے رہے)۔

مشاہدے کی حقیقت دو طرح ہے: ایک تو صحیح یقین سے، دوسرے محبت کے غلبے سے کہ محبِّ الٰہی غلبہ محبت میں اس درجے پر پہنچ جائے کہ وہ ہمہ تن محبوب حقیقی کی بات بن جائے اور اس کے سوا کچھ نہ دیکھے۔ ایک اور شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مَارَاَيْتُ شَيْئًا اِلَّا وَرَاَيْتُ اللّٰهَ قِبْلَهٗ۔ (ترجمہ: میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی کہ اس کے سامنے خدا کو نہ دیکھا ہو) اور یہ حق تعالیٰ کا دیدار ہے۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مَارَاَيْتُ شَيْئًا قَطُّ اِلَّا وَرَاَيْتُ اللّٰهَ فِيْهِ اَىْ بِصِحَّةِ الْيَقِيْنِ (ترجمہ: میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی مگر اس میں صحیح یقین کے ساتھ صرف اللہ کو دیکھا)۔ ایک اور شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مَارَاَيْتُ شَيْئًا قَطُّ اِلَّا اللّٰهَ يَعْنِىْ بِغَلَبَاتِ الْمَحَبَّةِ وَغَلَيَانِ الْمُشَاهَدَةِ۔ (ترجمہ: میں نے محبت الٰہی کے غلبے اور مشاہدے کے جوش میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور چیز کو نہیں دیکھا)۔ پس ایک شخص تو کسی فعل کو سر کی ظاہری آنکھ سے دیکھتا ہے اور دوسرا باطن کی آنکھ سے فاعل حقیقی کو دیکھتا ہے۔ پس پہلے شخص کے مشاہدۂ حق کا طریقہ نظری اور استدلالی ہے، گویا یہ حق کو دلائل سے ثابت کرتا ہے اور دوسرے شخص کے مشاہدۂ حق کا طریقہ جذبہ الٰہی ہے۔ وہ اس میں بالکل مجذوب اور بے خود ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک دلائل اور حقائق سب حجاب ہوتے ہیں۔ لِاَنَّ مَنْ عَرَفَ شَيْئًا لَا يَهْدَاُ بِغَيْرِهٖ وَمَنْ اَحَبَّ شَيْئًا لَا يُطَالِعُ غَيْرَهٗ فَيَتْرُكُ الْمُنَازَعَةَ مَعَهٗ وَ الْاِعْتِرَاضَ عَلَيْهِ فِىْ

اَحْکَامِہٖ وَ اَفْعَالِہٖ (ترجمہ: کیونکہ جو شخص کسی چیز کو پہچان لیتا ہے، وہ اس کے سوا تسلی نہیں پاتا اور جو شخص کسی چیز کو دوست رکھتا ہے، وہ اس کے سوا کسی پر نگاہ نہیں ڈالتا، اس لئے کہ اس کے افعال اور احکام میں اس کے ساتھ مخالفت کرنے اور اس پر اعتراض کرنے کو چھوڑ دیتا ہے) تاکہ مخالفت اور تصرف کرنے والا نہ ہو۔ اسی طرح اللہ نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کی معراج کی بابت ہم کو خبر دی اور فرمایا ہے: مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (ترجمہ: آپ کی نگاہ تجلیاتِ حق سے اِدھر اُدھر ہٹی، اور نہ آگے بڑھی) یہاں تک کہ جو کچھ ضروری تھا، آپ نے دل کی آنکھوں سے اسے دیکھ لیا کیونکہ جب دوست حق موجودات سے آنکھیں بند کر لیتا ہے تو لامحالہ دل سے پیدا کرنے والے حق تعالیٰ کو دیکھ لیتا ہے۔ نیز خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے: لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی (ترجمہ: حضور ﷺ نے اپنے پروردگار کی بڑی نشانیوں کو دیکھ لیا) نیز فرمایا: قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ اَیْ اَبْصَارِ الْعُیُوْنِ مِنَ الشَّھَوَاتِ وَ اَبْصَارِ الْقُلُوْبِ عَنِ الْمَخْلُوْقَاتِ (ترجمہ: اے رسول ﷺ! اہل ایمان سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی کر لیں یعنی ظاہری آنکھوں کو نفسانی خواہشوں سے اور دل کی آنکھوں کی نظروں کو مخلوقات سے)۔ پس جو شخص مجاہدہ سے اپنے سر کی آنکھ کو خواہشوں سے روک دے، وہ باطن کی آنکھ سے حق تعالیٰ کو ضرور دیکھ لیتا ہے۔ فمن کان اخلص مجاھدۃ کان اصدق مشاھدۃ (ترجمہ: کیونکہ جو مجاہدے میں زیادہ مخلص ہو، وہ مشاہدے میں زیادہ سچا ہوتا ہے) پس باطن کا مشاہدہ ظاہر کے مجاہدے سے وابستہ ہوتا ہے۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مَنْ غَضَّ بَصَرَہٗ عَنِ اللّٰہِ طَرْفَۃَ عَیْنٍ لَا یَھْتَدِیْ طُوْلَ عُمْرِہٖ (ترجمہ: جو شخص آنکھ جھپکنے جتنی دیر کے لئے اپنی نگاہ کو اللہ تعالیٰ سے بند کر لے، وہ ساری عمر ہدایت نہیں پاتا) کیونکہ غیر کی طرف نگاہ ڈالنا غیر کی طرف لوٹنا ہوتا ہے اور جس کو قضاو قدر نے غیر اللہ کے ساتھ رہنے دیا، وہ ہلاک ہو گیا پس اہل مشاہدہ کی زندگی یہی ہے کہ وہ ہمیشہ مشاہدۂ حق میں رہیں اور عمر کا جو حصہ حق تعالیٰ سے غیبت اور دوری میں گزرے، اس کو وہ زندگی میں شمار نہیں کرتے، کیونکہ وہ حقیقت میں ان کے لئے موت ہوتی ہے۔ چنانچہ بایزید رحمتہ اللہ علیہ سے ایک مرتبہ لوگوں نے پوچھا کہ "آپ کی عمر کتنی ہے؟" تو آپ نے فرمایا: "چار سال اور ایک نسخے میں ہے چالیس سال۔" لوگوں نے کہا: "یہ کیسے؟" تو آپ نے فرمایا کہ "ستر سال تک میں دنیا کے حجاب میں رہا ہوں، لیکن اب چار سال سے میں اس کو دیکھ رہا ہوں اور حجاب کا زمانہ عمر میں شمار نہیں ہوتا۔"

شبلی رحمتہ اللہ علیہ دعا میں فرمایا کرتے تھے: اَللّٰھُمَّ اِخْبَاءِ الْجَنَّۃَ وَالنَّارَ فِیْ خُبَایَا غَیْبِکَ حَتّٰی نَعْبُدُکَ بِغَیْرِ وَاسِطَۃٍ (ترجمہ: اے اللہ! جنت و دوزخ کو اپنے غیب کے پردوں میں چھپا دے تاکہ ہم کسی لالچ کے بغیر بلاواسطہ تیری عبادت کریں) کیونکہ بہشت کی طبیعت کو خواہش ہے، اس لئے دنیا میں عقلمند اسی بہشت کے لئے عبادت کرتا ہے اور چونکہ ان کے دل کو محبت الٰہی سے کوئی لگاؤ نہیں اس لئے لامحالہ غافل آدمی مشاہدۂ الٰہی سے حجاب میں رہتا ہے۔ رسول ﷺ نے شب معراج کا واقعہ سناتے ہوئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ "میں نے خداوند تعالیٰ کو نہیں دیکھا" اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ "میں نے حق تعالیٰ کو دیکھا ہے۔" پس لوگ اسی اختلاف میں پڑ گئے لیکن جو بات بہتر تھی، دوستانِ حق نے وہ درمیان سے لے لی یعنی آپ ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے، سو اس سے مراد باطن کی آنکھ سے دیکھنا ہے اور جو یہ فرمایا کہ میں نے نہیں دیکھا، اس سے ظاہر کی آنکھ سے دیکھنا مراد لیا ہے، چونکہ ان دونوں میں سے ایک یعنی حضرت

عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اہل باطن تھے اور دوسری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اہل ظاہر میں سے تھیں، اس لئے حضور علیہ نے ہر ایک سے اس کی سمجھ کے مطابق کلام کیا۔ پس چونکہ آپ نے باطن کی آنکھ سے دیکھا تھا، اس لئے اگر ظاہری آنکھ کا واسطہ نہ ہو تو کیا نقصان ہے؟ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر خداوند تعالیٰ فرمائے کہ مجھے دیکھ تو میں نہیں دیکھوں گا کیونکہ محبت الٰہی میں آنکھ غیر اور بیگانہ ہے۔ غیریت کی غیریت مجھے دیدار سے روکتی ہے، کیونکہ دنیا میں آنکھ کے واسطے کے بغیر اس کو دیکھتا رہا ہوں۔ پس میں آخرت میں اس واسطے کو کیا کروں گا؟

وَاِنِّی لَاَحْسُدُ نَاظِرِیْنَ اِلَیْکَ
وَاَغَضُّ طَرْفِیْ اِذَا نَظَرْتُ اِلَیْکَ

(ترجمہ: اور میں تیری طرف نظر کرنے والوں سے حسد کرتا ہوں اور جب خود تیری طرف دیکھتا ہوں تو اپنی آنکھ موند لیتا ہوں) یعنی ہم دوست کو آنکھ سے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے کیونکہ آنکھ بیگانہ ہوتی ہے۔

کسی بزرگ سے لوگوں نے پوچھا: "کیا آپ خداوند تعالیٰ کو دیکھنا چاہتے ہیں؟" انہوں نے فرمایا: "نہیں۔" لوگوں نے پوچھا: "کیوں؟" فرمایا: "جب موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی تو خدا کو نہ دیکھا اور محمد علیہ نے درخواست نہ کی تو آپ نے دیکھ لیا۔" پس ہمارا چاہنا ہمارے لئے حق تعالیٰ کے دیدار سے ایک بڑا حجاب ہے، اس لئے کہ محبت میں ارادہ کا ہونا مخالفت ہے اور مخالفت حجاب ہوتی ہے اور جب ارادہ دنیا میں ختم ہو جاتا ہے تو مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے اور جب مشاہدہ ثابت ہو جاتا ہے تو دنیا عقبیٰ کی طرح اور عقبیٰ دنیا کی طرح ہو جاتی ہے۔

حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اِنَّ لِلّٰہِ عِبَادًا لَوْ حُجِبُوْا عَنِ اللّٰہِ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ لَارْتَدُّوْا (ترجمہ: بلاشبہ اللہ کے کچھ ایسے بندے ہیں کہ اگر وہ دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دیدار سے حجاب میں رکھے جائیں تو وہ مرتد ہو جائیں) یعنی اللہ ان کو دوامی مشاہدے سے پرورش کرتا اور محبت کی زندگی سے ان کو زندہ رکھتا ہے۔ پس لامحالہ جب مشاہدہ کرنے والا مشاہدے سے حجاب میں ہو جاتا ہے تو وہ زندۂ درگاہ ہو جاتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں مصر کے اندر جا رہا تھا۔ میں نے لڑکوں کو دیکھا کہ ایک جوان پر پتھر مار رہے تھے۔ میں نے کہا: "تم اس سے کیا مانگتے ہو؟" انہوں نے کہا: "یہ آدمی دیوانہ ہے۔" میں نے کہا: "اس میں دیوانگی کی کون سی علامت ہے؟" انہوں نے کہا کہ "یہ کہتا ہے کہ میں خدا کو دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا: "اے جواں مرد! یہ بات تو واقعی کہتا ہے یا یہ لوگ تجھ پر تہمت دھرتے ہیں؟" اس نے کہا: "نہیں، میں ہی کہتا ہوں کیونکہ اگر ایک لحظہ میں حق تعالیٰ کو نہ دیکھوں تو اس سے حجاب میں رہوں اور اس کی بندگی نہ کر سکوں۔" اہل طریقت میں سے ایک گروہ کو اس مقام سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ دل سے رویت حق اور اس کا مشاہدہ ایک صورت ہوتی ہے جو وہم، ذکر یا فکر کی حالت میں اس کے دل کے اندر ثابت کر دیتا ہے اور یہ محض تشبیہ اور صریح گمراہی ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ کے لئے اندازہ و مقدار نہیں جس کا دل کے اندر وہم کے ذریعہ اندازہ لگا سکیں یا عقل اس کی کیفیت پر مطلع ہو سکے۔ پھر جو چیز وہم میں آتی ہے وہ بھی وہم ہی کی قسم سے ہوتی ہے اور جو چیز عقل میں آتی ہے، وہ عقلی ہوتی ہے حالانکہ خداوند تعالیٰ جنسوں کا ہم جنس نہیں۔ یہ سب لطیف اور کثیف چیزیں ایک دوسرے کی جنس ہیں اور ضد کے محل میں باہم ایک دوسرے کی ہم جنس ہوتی ہیں اس لئے کہ توحید کی تحقیق میں ضد بھی قدیم کے مقابلے میں ایک جنس ہی ہوتی ہے، کیونکہ ضدیں سب حادث ہیں اور سب حادث ایک جنس ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان

باتوں سے اور ان سے جو ملحدین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں، پاک اور بہت برتر ہیں۔

پس مشاہدۂ حق تعالیٰ دنیا کے اندر ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ آخرت میں رویت حق۔ جب تمام اصحاب کے اجماع و اتفاق سے آخرت میں رویت حق روا ہے، تو دنیا میں مشاہدۂ حق بھی روا ہو گا۔ پس وہ مخبر جو آخرت میں رویت حق کی خبر دے اور وہ مخبر جو دنیا میں مشاہدۂ حق کی خبر دے، ان دونوں میں کوئی فرق نہیں اور جو کوئی شخص ان دونوں باتوں کے متعلق خبر دے گا وہ اجازت ہی سے خبر دے گا، نہ کہ فقط دعویٰ سے، یعنی وہ یوں کہے گا کہ آخرت میں حق تعالیٰ کا دیدار اور دنیا میں اس کا مشاہدہ جائز ہے لیکن یوں نہیں کہے گا کہ مجھے مشاہدہ ہوا ہے یا اب مشاہدہ ہے، کیونکہ مشاہدہ باطن کی صفت ہے اور اس کے متعلق خبر دینا زبان کی عبارت ہے اور جب زبانَ کو باطن کی خبر ہو کہ اس کو عبارت میں لا سکے تو مشاہدہ نہیں ہوتا، بلکہ دعویٰ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جس چیز کی حقیقت عقل کے اندر ثابت نہیں ہو سکتی، زبان کس طرح اس کو عبارت میں لا سکتی ہے۔ سوائے معنی مجازی کے لِاَنَّ الْمُشَاهَدَةَ قُصُوْرُ اللِّسَانِ بِحُضُوْرِ الْجَنَانِ (ترجمہ: کیونکہ مشاہدہ دل کے حاضر ہونے میں زبان کا قاصر ہو جانا ہے) یہی وجہ ہے کہ خاموشی کا درجہ گویائی سے برتر ہے، کیونکہ خاموشی مشاہدہ کی علامت ہوتی ہے اور گویائی شہادت کا نشان ہے اور کسی چیز پر شہادت اور کسی چیز کے مشاہدہ کے درمیان بڑا فرق ہے اور اسی وجہ سے کہ پیغمبر ﷺ نے اس قرب اور اعلیٰ مقام میں جو حق تعالیٰ نے آپ کو خاص طور پر عطا کیا، فرمایا: لَا اُحْصِی ثَنَاءً عَلَیْكَ (ترجمہ: میں تیری ثنا کا احاطہ نہیں کر سکتا) اس لئے کہ آپ مشاہدے میں تھے اور مشاہدۂ محبت کے درجے میں کمال اتحاد ہوتا ہے اور اتحاد کی حالت میں بیان کرنا بیگانگی ہے۔ تب آپ ؐ نے فرمایا:

اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ (ترجمہ: تیری ذات ایسی ہے جیسی تو نے اپنی آپ تعریف فرمائی) یعنی یہاں تیرا کہنا خود میرا کہنا اور تیرا تعریف کرنا خود میرا تعریف کرنا ہے اور میں اپنی زبان میں یہ قابلیت نہیں سمجھتا کہ میرے حال کو بیان کر سکے اور بیان کو بھی میں اس کا مستحق نہیں دیکھتا کہ وہ میرے حال کو ظاہر کر سکے اور اس معنی میں کسی کامل کا یہ قول ہے:

تَمَیَّتُ مَنْ اَهْوٰی فَلَمَّا رَاَیْتُهٗ
بُهِتُّ فَلَمْ اَمْلِكْ لِسَانًا وَّ لَا طَرْفًا

(ترجمہ: میں اس سے ملنے کی تمنا کیا کرتا تھا جس سے میں محبت کرتا تھا، جب میں نے اس کو دیکھ لیا تو میں حیران ہو گیا، تو اب نہ زبان میرے قابو میں ہے اور نہ آنکھ)۔

یہ ہیں مشاہدے کے تمام احکام جو مختصر طور پر بیان کر دیئے گئے اور توفیق اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔
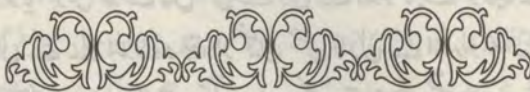
اٹھائیسواں باب

نویں پردے کا کھولنا

محبت اور اس کے آداب واحکام

پہلی فصل
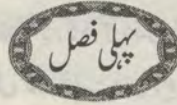
اثباتِ ادب

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: یَآاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡٓا اَنۡفُسَکُمۡ وَاَھۡلِیۡکُمۡ نَارًا (الآیتہ) اَیۡ اَدِّبُوۡھُمۡ (ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے آپ اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ، مطلب یہ کہ ان کو ادب اور تہذیب سکھاؤ) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: حُسۡنُ الۡاَدَبِ مِنَ الۡاِیۡمَانِ (ترجمہ: اچھا ادب ایمان میں سے ہے)۔ نیز فرمایا: اَدَّبَنِیۡ رَبِّیۡ فَاَحۡسَنَ تَادِیۡبِیۡ (ترجمہ: میرے پروردگار نے مجھے ادب سکھایا اور اچھا ادب سکھایا) پس جاننا چاہئے کہ دنیا اور دین کے تمام اُمور کی زیب و زینت ادب سے وابستہ ہے اور لوگوں کے گروہوں کے مقامات میں سے ہر مقام کے لئے ایک ادب ہے اور سب کافر، مسلمان، ملحد، موحد، سنی اور بدعتی اس بات پر متفق ہیں کہ معاملہ میں اچھا ادب پسندیدہ ہے اور دنیا کی کوئی رسم بھی ادب کا لحاظ کئے بغیر انجام نہیں پا سکتی۔ ادب لوگوں میں مروّت کی حفاظت ہے۔ لوگوں میں مروّت کی حفاظت، دین میں سنت کی حفاظت اور محبت میں حرمت کی حفاظت کا نام ادب ہے اور یہ تینوں باتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اس لئے جس کو مروّت حاصل نہیں، اس کو سنت کی متابعت بھی حاصل نہیں اور جس کو سنت کی حفاظت حاصل نہیں، اس کو حرمت کی رعایت بھی حاصل نہیں۔

معاملات میں آداب کی حفاظت دل میں مطلوب کی تعظیم سے حاصل ہوتی ہے اور حق تعالیٰ اور اس کے نشانات کی تعظیم تقویٰ میں سے ہے اور جو شخص بے ادبی سے حق تعالیٰ کی تجلیات کی تعظیم کو پامال کر دے، اس کو تصوف کے طریق میں کوئی حصہ نہیں اور کسی حالت میں مدہوشی اور غلبۂ حال طالب حق کو آداب کی حفاظت سے منع نہیں کرتے، کیونکہ ادب طالبانِ حق کی عادت ہوتا ہے اور عادت طبیعت کے مانند ہوتی اور طبیعت کا جاندار سے ساقط ہونا کسی حال میں بھی متصور نہیں ہوسکتا کیونکہ جب تک زندگی قائم ہے، طبیعت کا ساقط ہونا محال ہے۔ پس جب تک انسانوں کا وجود قائم ہے، کبھی تکلف سے اور کبھی بغیر تکلف، وہ آداب کی شرط کو نگاہ رکھتے ہیں اور جب ان کا حال ہوشیاری کا ہوتا ہے، تو وہ تکلف سے آداب کی حفاظت کرتے ہیں اور جب ان کا حال بے ہوشی کا ہوتا ہے تو حق تعالیٰ بھی ان کے ادب کی نگہداشت کرتا ہے اور یہ یاد رکھو کہ ولی کسی صورت میں بھی تارکِ آداب نہیں ہوتا کیونکہ ولایت میں سنتِ نبوی کی پیروی بہت ضروری ہوتی ہے اور تارکِ ادب عادات و اخلاق محمدی سے منحرف ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ ترکِ ادب عدمِ محبت کی دلیل ہے۔ لِاَنَّ الۡمَوَدَّۃَ عِنۡدَ الۡاٰدَابِ وَ حُسۡنُ الۡاَبِ صِفَۃُ الۡاَحۡبَابِ۔ (ترجمہ: کیونکہ محبت آداب کے ہونے کی صورت میں ہے اور اچھا ادب دوستوں کی صفت ہے) اور جس کو خداوند تعالیٰ کرامت عطا فرماتا ہے، اس کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ اس کو آدابِ دین کے حکموں پر چلنے کی توفیق عطا کر دیتا ہے،

بر خلاف ملحدین کے (اللہ ان پر لعنت کرے) جو کہتے ہیں کہ جب بندہ محبتِ الٰہی میں مغلوب ہو جاتا ہے تو دین کی متابعت کا حکم اس سے ساقط ہو جاتا ہے اور میں اس بات کو انشاءاللہ دوسرے مقام پر زیادہ واضح طور پر بیان کروں گا۔

واضح رہے کہ آداب تین قسم کے ہوتے ہیں: اول، توحید کے اندر حق تعالیٰ کے ساتھ ادب اور وہ اس طرح کہ خلوت اور جلوت میں بے ادبی سے محفوظ رہے اور ایسا معاملہ اختیار کرے جیسا بادشاہوں کے حضور میں کرتا ہے۔ صحیح احادیث میں آیا ہے کہ ایک دن پیغمبر ﷺ پاؤں پھیلا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ جبرئیل علیہ السلام نے آکر کہا: یَا مُحَمَّدُ! اِجْلِسْ جِلْسَةَ الْعَبِيدِ۔ (ترجمہ: اے رسول ﷺ! بارگاہِ حق میں غلاموں کی طرح ادب سے بیٹھیۓ)۔ کہتے ہیں کہ حضرت حارث محاسی رحمۃ اللہ علیہ نے چالیس سال تک رات دن دیوار سے پیٹھ نہیں لگائی اور ہمیشہ دوزانو بیٹھے رہے۔ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ "آپ اتنی کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں؟" تو آپ نے فرمایا کہ "مجھے شرم آتی ہے کہ مشاہدۂ حق میں غلاموں کی طرح بیٹھنے کے سوائے کسی اور حالت میں بیٹھوں۔" میں (علی بن عثمان جلابیؒ) ملک خراسان میں ایک گاؤں میں پہنچا، جسے کمند کہتے تھے۔ وہاں ایک مشہور آدمی تھے جس کو ادب کمندی کہتے تھے۔ وہ بہت بزرگ آدمی تھا جو بیس سال سے پاؤں پر کھڑا تھا اور نماز میں تشہد کے سوا اور کسی وقت نہ بیٹھتا تھا۔ میں نے اس سے اس کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ "مجھے ابھی تک وہ درجہ حاصل نہیں ہوا کہ مشاہدۂ حق کے اندر بیٹھ جاؤں۔" حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا: وَلِمَ وَ جَدْتَ مَا وَجَدْتَ قَالَ بِحُسْنِ الصُّحْبَةِ مَعَ اللّٰهِ تَعَالٰی۔ (ترجمہ: جو درجہ آپ نے پایا ہے، کس وجہ سے پایا ہے؟ آپ نے فرمایا: اس وجہ سے کہ میں نے حق تعالےٰ کے ساتھ اچھی ہم نشینی اختیار کی) یعنی اچھی صحبت اور ادب کیا اور خلوت و جلوت میں ایک سا رہا، یعنی دونوں حالتوں میں ادب ملحوظ رکھا اور اہل عالم کو چاہیے کہ معبود برحق کے مشاہدہ میں آداب کی حفاظت کرنا زلیخا سے سیکھیں کہ جب اس نے اور یوسف علیہ السلام سے خلوت کی اور یوسف علیہ السلام سے اپنی بات کے قبول کرنے کی درخواست کی تو پہلے اپنے بت کے چہرے کو کسی چیز سے ڈھانپ دیا۔ یوسف علیہ السلام نے پوچھا کہ تو یہ کیا کرتی ہے؟ اس نے کہا میں اپنے معبود کا چہرہ ڈھانپتی ہوں تاکہ وہ مجھ کو تیرے ساتھ اس بے حرمتی کے ساتھ نہ دیکھے کہ وہ ادب کی شرط نہیں ہے۔ جب یوسف علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس پہنچے اور خداوند تعالےٰ نے ان کو حضرت یوسف علیہ السلام کا وصال بخشا تو زلیخا کو جوان کر دیا اور اسلام کی طرف رہنمائی فرمائی اور یوسف علیہ السلام کے ساتھ اس کا نکاح کر دیا۔ پس جب یوسف علیہ السلام نے اس کے پاس جانے کا قصد کیا تو زلیخا ان سے پیچھے ہٹی۔ آپ نے پوچھا: "اے زلیخا! میں تو تیرا وہی معشوق ہوں، تو مجھ سے کیوں بھاگتی ہے؟ شاید میری محبت تیرے دل سے محو ہوگئی ہے۔" اس نے جواب دیا: "نہیں! اللہ کی قسم محبت اسی طرح قائم ہے، بلکہ زیادہ ہے لیکن میں نے ہمیشہ معبود کے ادب کو ملحوظ رکھا ہے۔ جس دن میں نے تیرے ساتھ خلوت کی تھی، اس دن میرا معبود ایک بت تھا اور باوجودیکہ اس کی آنکھیں نہ تھیں، میں نے اس کے چہرے پر ایک چیز ڈال دی تھی تاکہ بے ادبی کی تہمت مجھ سے اُٹھ جائے، لیکن اب تو میرا وہ معبود ہے جو بغیر آنکھ اور آلہ کے دیکھتا ہے اور جس صفت پر کہ میں ہوں، وہ مجھ کو دیکھتا ہے، لہٰذا میں نہیں چاہتی کہ تارکِ ادب بنوں۔" جب رسول اللہ ﷺ کو معراج پر لے گئے تو محض حق تعالیٰ کے ادب کی حفاظت کی وجہ سے آپ نے دونوں عالم کی طرف نہیں دیکھا، یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی اَیْ بِرُؤْيَةِ الدُّنيا وَ مَا طَغٰی اَیْ بِرُئويَتِ الْعُقْبٰی۔ (ترجمہ: آپ کی نگاہ تجلیاتِ حق سے اِدھر اُدھر نہیں ہٹی، یعنی دنیا کے دیکھنے کی طرف اور نہ حد

سے بڑھی یعنی عاقبت کے دیکھنے کی طرف)۔

دوسرے عمل میں اپنے ساتھ ادب کرنا ہے اور وہ یوں ہے کہ تمام احوال میں اپنے نفس کے ساتھ مروّت مرعی رکھے یہاں تک کہ جو کچھ خلقت کی صحبت میں بے ادبی ہوتی ہے، اپنی صحبت میں بھی اس کو استعمال نہ کرے۔ اس کی مثال اس طرح ہو سکتی ہے کہ سچ کے سوا کچھ نہ بولے اور وہ یوں ہے کہ خود جس بات کے خلاف ہو، اس کو زبان پر نہ لائے کیونکہ وہ بے مروّتی ہے، دوسری بات یہ کہ کم کھائے تاکہ غسل خانے میں اسے کم جانا پڑے، تیسری یہ ہے کہ اپنی شرمگاہ کو نہ دیکھے جس پر غیر کی نظر پڑنا حرام ہے کیونکہ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ آپ نے کبھی اپنی شرمگاہ کو نہیں دیکھا تھا۔ لوگوں نے آپ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے اپنے آپ سے شرم آتی ہے کہ ایسی چیز کو دیکھوں کہ جس کا دیکھنا دوسروں پر حرام ہے۔

تیسرے لوگوں سے ادب کے ساتھ پیش آنا ہے اور مخلوق کی صحبت کے آداب میں سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ سفر اور حضر میں ان کے ساتھ سنت کی متابعت میں عمدہ برتاؤ کرے اور ان تینوں قسم کے آداب کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔ اب میں حسب توفیق تینوں اقسام کو ترتیب وار بیان کرتا ہوں۔
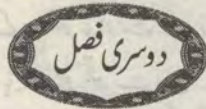
صحبت کے حقوق

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ای بِحُسْنِ رِعَایَتِھِمِ الْاِخْوَانِ (ترجمہ: بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، اللہ تعالےٰ ان کے لیے دوستی پیدا کر دے گا یعنی اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنے دوستوں سے اچھا برتاؤ کیا یعنی جن مسلمانوں کے عمل اچھے ہیں، خدا تعالےٰ ان کو دوست بنا لیتا ہے اور دلوں میں ان کی دوستی پیدا کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ وہ دلوں کی رعایت کرتے ہیں اور اپنے بھائیوں کا حق ادا کرتے ہیں اور ان کو خود پر فضیلت دیتے ہیں۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: ثَلٰثٌ تُصْفِیْنَ لَكَ وُدَّاَخِیْكَ اَنْ تُسَلِّمَ عَلَیْهِ اِنْ لَقِیْتَهٗ وَ تُوسِعُ لَهٗ فِی الْمَجْلِسِ وَ تَدْعُوْہُ بِاَحَبَّ اَسْمَائِهٖ۔ (ترجمہ: تین چیزیں ہیں جو تیرے بھائی کی دوستی تیرے لیے مصفا کر دیں گی۔ اوّل یہ کہ اگر تو اسے سلام کرے اور دوم، مجلس میں اس کے لیے جگہ کشادہ کر دے اور سوم، اس کو اس نام سے پکارے جو اس کا زیادہ پسندیدہ ہو) نیز خداوند تعالےٰ نے فرمایا ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ۔ (ترجمہ: سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو)۔ سب کو دو مسلمان بھائیوں کے درمیان مہربانی اور لطف کرنے کا حکم فرمایا تاکہ ان کے دل آپس میں رنجیدہ نہ رہیں اور رسول ﷺ نے فرمایا ہے: اَکْثِرُوْا مِنَ الْاِخْوَانِ فَاِنَّ رَبَّکُمْ حَیٌّ کَرِیْمٌ یَسْتَحْیِیْ اَنْ یُّعَذِّبَ عَبْدَهٗ بَیْنَ اِخْوَتِهٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔ (ترجمہ: اپنے بھائی زیادہ بناؤ، کیونکہ تمہارا پروردگار باحیا کریم ہے۔ وہ قیامت کے روز اپنے کسی بندے کو اس کے بھائیوں کے درمیان عذاب دینے سے حیا کرے گا)، لیکن یہ ضروری ہے کہ ہم نشینی خداوند تعالےٰ کے لیے ہو نہ کہ خواہش نفس اور عرض نفس کے حصوں کے لیے تاکہ اس کے ادب کی رعایت کرنے کی وجہ سے بندہ مشکور ہو۔

مالک بن دینار رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے داماد مغیرہ بن شعبہؓ سے فرمایا: یَامُغِیْرَۃُ کُلُّ اَخٍ وَ صَاحِبٍ لَمْ

تُسْتَفِدُ مِنْهُ فِیْ دُیْنِكَ خَیْرًا فَانْبِذْ عَنْ صُحْبَتِهٖ حتّٰی تَسْلَمَ۔ (ترجمہ: اے مغیرہ! جس بھائی اور دوست سے تو اپنے دین کا کچھ فائدہ حاصل نہ کر سکے، اس کی صحبت ترک کردے تاکہ تو سلامت رہے) کیونکہ ایسے شخص کی صحبت تجھ پر حرام ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ صحبت یا تو اپنے سے بڑے کے ساتھ یا اپنے سے چھوٹے کے ساتھ مناسب ہے، کیونکہ اگر تو اپنے سے بزرگ کی صحبت اختیار کرے گا تو اس سے تجھے فائدہ ہوگا اور اگر اپنے سے کم درجہ کے ساتھ صحبت اختیار کرے گا تو تجھے دینی فائدہ ہوگا کہ وہ تجھ سے کوئی بات سیکھے گا اور دونوں کو دینی فائدہ حاصل ہوگا۔ اگر تو کچھ اس سے سیکھے گا تو بھی، اسی طرح دونوں کو دینی فائدہ حاصل ہوگا اور یہی وجہ ہے پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: اِنَّ مِنْ تَمَامِ التَّقْوٰی تَعْلِیْمُ مَنْ لَّمْ یَعْلَمْ۔ (ترجمہ: بلاشبہ جو شخص نہیں جانتا، اس کو سکھانا پوری پرہیز گاری ہے)۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: بِئْسَ الصَّدِیْقُ صَدِیْقٌ تَحْتَاجُ اَنْ تَقُوْلَ لَهٗ اُذْكُرْنِیْ فِیْ دُعَائِكَ وَ بِئْسَ الصَّدِیْقُ صَدِیْقٌ تَحْتَاجُ اَنْ تَعِیْشَ مَعَهٗ مَالْمُدَا رَاةِ وَ بِئْسَ الصَّدِیْقُ صَدِیْقٌ یُلْجِئُكَ اِلَی الْاِعْتِذَارِ فِیْ زَلَّةٍ کَانَتْ مِنْكَ۔ (ترجمہ: برا دوست ہے وہ شخص کہ تجھے اس کو یہ بات کہنے کی ضرورت ہو کہ مجھے اپنی دُعا میں یاد کرنا، کیونکہ اس ساعت کی صحبت کا حق ہمیشہ دوست کے حق میں دُعائے خیر کرنا ہے اور برا ہے وہ دوست کہ تجھے اس کے ساتھ مدارات سے زندگی بسر کرنا پڑے، کیونکہ صحبت کا سرمایہ تو خوشی ہوتی ہے اور برا ہے وہ دوست کہ اس قصور کی بابت جو تجھ سے اس کے متعلق سرزد ہوا ہے، تجھے اس سے عذر کرنے کی ضرورت ہو کیونکہ عذر کرنا بیگانوں کی شرط ہے اور صحبت میں بیگانگی ظلم ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اَلْمَرْءُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِهٖ فَلْیَنْظُرْ اَحَدُکُمْ مَنْ یُّخَالُ۔ (ترجمہ: آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، پس تم میں سے ہر کسی کو غور کرنا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی پیدا کر رہا ہے) کیونکہ اگر وہ نیک لوگوں سے صحبت رکھتا ہے تو اگرچہ وہ برا ہی ہو، نیک ہوگا۔ اس لیے کہ ان کی صحبت اس کو نیک کردے گی اور اگر وہ بروں سے صحبت رکھتا ہے تو اگرچہ وہ خود نیک ہی ہے، برا ہو جائے گا۔ اس لیے کہ ان کے فعل بد پر اس کی رضامندی ہے اور جب برائی پر راضی ہوگا تو خواہ نیک ہے، بد ہوگا۔ حکایات میں وارد ہوا ہے کہ ایک آدمی کعبہ کے گرد طواف میں یوں دعا کر رہا تھا: اَللّٰھُمَّ اَصْلِحْ اِخْوَانِیْ فَقِیْلَ لَهٗ لِمَ لَمْ تَدْعُ لَكَ فِیْ هٰذَا الْمَقَامِ۔ (ترجمہ: اے اللہ! میرے بھائیوں کی اصلاح کردے۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ اس شریف مقام میں تو اپنے لیے کیوں دعا نہیں کرتا)؟۔ قَالَ اِنَّ لِیْ اِخْوَانًا اَرْجِعُ اِلَیْهِمْ فَاِنْ صَلَحُوْا اَصْلَحْتُ مَعَهُمْ وَاِنْ فَسَدُوْا فَسَدْتُ مَعَهُمْ۔ (ترجمہ: اس نے کہا کہ میرے کچھ بھائی ہیں جن کے پاس لوٹ کر جاؤں گا۔ پس اگر وہ دُرست ہوں گے تو میں بھی ان کی صحبت سے دُرست ہو جاؤں گا اور اگر وہ خراب ہوں گے تو میں بھی ان کی صحبت سے خراب ہو جاؤں گا) یعنی جب کہ میری اصلاح کی بنیاد اصلاح کرنے والوں کی صحبت پر موقوف ہے تو میں اپنے بھائیوں کے لیے دعا کرتا ہوں تاکہ میرا مقصود ان سے حاصل ہو، اور ان سب امور کی بنیاد اس بات پر ہے کہ نفس کو آرام دوستوں کے ساتھ ہوتا ہے اور جس گروہ میں وہ ہوتا ہے، اس کی عادت اور ان کا فعل اختیار کرلیتا ہے اس لیے کہ تمام معاملات ارادے سے پرورش پاتے ہیں اور اس کے ارادے پر دوسروں کا ارادہ غالب آ جاتا ہے۔ یوں بھی طبیعت پر صحبت کا بڑا اثر ہوتا ہے اور عادت کو سخت غلبہ حاصل ہوتا ہے یہاں تک کہ آدمی عالم کی صحبت سے عالم ہو جاتا ہے، طوطا آدمی کی تعلیم سے ناطق (بولنے والا) ہو جاتا ہے اور گھوڑا بھی ریاضت اور مشق کی وجہ سے عادتِ بہیمی سے عادتِ انسانی اختیار کرلیتا ہے۔ ایسی سب

چیزوں سے صحبت کی تاثیر ہوتی ہے کہ ان کی طبعی عادت بدل جاتی ہے۔ طریقت کے مشائخ رحمۃ اللہ علیہ پہلے ایک دوسرے سے صحبت کا حق طلب کرتے اور مریدوں کو اس کی ترغیب دلاتے ہیں یہاں تک کہ ان کے درمیان یہ بات ایک فریضے کی طرح ہو گئی ہے اور اس سے پہلے مشائخ نے اس گروہِ صوفیا کے لیے صحبت کے آداب میں مشرح کتابیں تصنیف کی ہیں چنانچہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب لکھی ہے، جس کا نام انہوں نے "تصحیح الاوادت" رکھا ہے اور ایک کتاب حضرت احمد بن خضرویہ بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے، جس کا نام "الرعایۃ بحقوق اللہ" رکھا ہے اور محمد بن علی ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک کتاب تصنیف کی ہے، جس کا نام آداب المریدین رکھا ہے۔ ابوالقاسم حکیم، ابوبکر وراق، سہل بن عبداللہ، ابوعبدالرحمٰن سلمی اور استاذ ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہم سب نے اس کے متعلق کامل کتابیں لکھی ہیں اور یہ سب لوگ اس فن کے امام ہوئے ہیں چونکہ میرا مقصود اس کتاب سے یہ ہے کہ جس کے پاس بھی یہ کتاب موجود ہو، اسے دوسری کتابوں کی حاجت نہ ہو اور اس سے پیشتر اس کتاب کے مقدمے میں تمہارے سوال کے موقع پر یہ کہہ چکا ہوں کہ یہ کتاب تمہارے لیے اور طالبانِ طریقت کے لیے مطلوب ہے، اس لیے میں ان شاءاللہ تعالیٰ ان صوفیائے کرام کے معاملات کے آداب کے انواع میں سے کچھ باب ترتیب وار بیان کروں گا۔
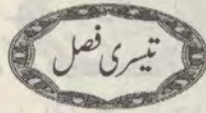
رعایتِ حقوقِ صحبت

جب تمہیں معلوم ہو گیا کہ مرید کے لیے سب سے ضروری چیز صحبت ہے تو لامحالہ صحبت کے حق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوا، کیونکہ مرید کے لیے تنہا رہنا ہلاکت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: اَلشَّیْطَانُ مَعَ الْوَاحِدِ وَ ھُوَ مِنَ الْاِثْنَیْنِ اَبْعَدُ۔ (ترجمہ: اکیلے آدمی کے ساتھ شیطان ہوتا ہے اور دو سے وہ دور رہتا ہے۔) خداوند تعالےٰ نے فرمایا ہے: مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا ھُوَ رَابِعُھُمْ۔ (ترجمہ: کوئی تین آدمی بھی سرگوشی نہیں کرتے مگر اللہ تعالےٰ ان میں چوتھا ہوتا ہے)۔ پس مرید کے لیے تنہائی جیسی اور کوئی آفت نہیں ہے۔

حکایات سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں میں سے ایک کے دل میں خیال آیا کہ وہ اب کمال کے درجہ پر پہنچ گیا ہے اور اس کے لیے تنہائی صحبت سے بہتر ہے، چنانچہ وہ گوشے میں چلا گیا اور جماعت کی صحبت سے منہ موڑ لیا۔ جب رات ہوتی تو اس کے پاس ایک اونٹ لاتے اور اس سے کہتے کہ تمہیں بہشت میں جانا چاہیے، اس پر وہ اس اونٹ پر بیٹھ کر چلے جاتے، یہاں تک کہ ایک مقام نہایت اچھا ظاہر ہوتا اور ایک خوبصورت جماعت اور عمدہ عمدہ کھانے اور جاری پانی صبح تک اس کے لیے وہاں مہیا رہتے، پھر وہ سو جاتا۔ جب بیدار ہوتا تو اپنے آپ کو اپنے تکیے میں موجود پاتا۔ یہاں تک کہ انسانیت کا غرور اس کے اندر بھر گیا اور تکبر نے اس کے دل میں پوری تاثیر کی اور اس نے دعوےٰ کی زبان کھولی اور کہنے لگا کہ مجھے ایسی حالت ہوتی ہے۔ یہ خبر حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچی۔ آپ اُٹھے اور اس کے تکیے کے دروازے پر تشریف لے جا کر معلوم کیا کہ غرور اور تکبر اس کے سر میں جگہ پکڑے ہوئے ہے۔ اس سے حال دریافت کیا تو اس نے سارا ماجرا حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کر دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ "آج رات جب تو اس مقام پر پہنچے تو یاد رکھ کہ تین بار لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔ (بلند اور عظمت والے اللہ کی مدد کے بغیر نہ نیکی کر سکتے ہیں نہ بدی سے بچ سکتے ہیں) کہیو۔" جب رات ہوئی

تو اس کو وہاں لے گئے اور وہ دل میں حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا انکار کر رہا تھا اور جب کچھ وقت گزرا تو اس نے تجربہ کے لیے تین بار لاحول پڑھی، وہ سب چلانے لگے اور وہاں سے چلے گئے اور اس نے اپنے آپ کو ایک کوڑی میں بیٹھا ہوا پایا اور کچھ ہڈیاں مردار کی اپنے چاروں طرف رکھی ہوئی دیکھیں۔ چنانچہ اپنی غلطی پر آگاہ ہوا اور توبہ کر کے صحبت اختیار کر لی۔ مرید کے لیے تنہائی جیسی اور کوئی آفت نہیں ہوتی اور ان کی صحبت کی شرط یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے درجے میں پہنچائیں، مثلاً بوڑھوں کے ساتھ ادب سے پیش آئیں اور ہم جنسوں کے ساتھ عشرت سے زندگی بسر کریں اور بچوں سے شفقت کریں، چنانچہ بوڑھوں کو باپوں کے درجہ میں، ہم جنسوں کو بھائیوں کے درجہ میں اور بچوں کو بھائیوں کے مقام پر رکھیں۔ کنبہ سے بیزاری، حسد سے پرہیز اور دلی دشمنی سے رُوگردانی کریں اور نصیحت کسی سے بھی روک نہ رکھیں۔ آپس کی صحبت میں ایک دوسرے کی غیبت اور خیانت اور ایک دوسرے کے فعل کا انکار کرنا مناسب نہیں، کیونکہ جب صحبت خداوند تعالیٰ کے لیے ہو تو کسی فعل یا قول سے جو بندے سے ظاہر ہو، قطع تعلق نہ کرے۔

مصنف رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ المشائخ ابو القاسم گرگانی رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا کہ صحبت کی شرط کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: یہ ہے کہ تو صحبت میں اپنا حصہ نہ طلب کرے، کیونکہ صحبت کی تمام خرابیاں اسی وجہ سے ہیں کہ ہر شخص اس سے اپنا حصہ طلب کرتا ہے اور حصہ طلب کرنے والے کے لیے صحبت سے تنہائی بہتر ہے اور جب اپنا حصہ چھوڑ دے اور اپنے ساتھ کے حصے کی رعایت کرے تو وہ صحبت میں حق پر ہوتا ہے۔ ایک درویش کہتا ہے کہ ایک دفعہ میں کوفہ سے مکہ کے ارادے سے جا رہا تھا۔ میں نے حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ کو راستے میں پایا۔ ان سے صحبت کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا کہ "صحبت کے لیے ایک امیر چاہیے اور ایک حکم ماننے والا۔ کیا تو چاہتا ہے کہ تو امیر ہو یا میں؟" میں نے کہا: "امیر آپ ہو جیئے۔" آپ نے فرمایا: "اب تجھے میرے حکم کے خلاف کوئی کام نہیں کرنا ہوگا۔" میں نے کہا: "بجا ہے۔" اس نے بیان کیا ہے کہ جب ہم منزل پر پہنچے تو آپ نے مجھ سے کہا: "بیٹھ جا۔" میں نے ایسا ہی کیا۔ آپ نے کنویں سے پانی نکالا، سردی تھی، آپ نے ایندھن جمع کیا اور آگ روشن کر کے مجھے گرم کیا اور جس کام کا میں ارادہ کرتا تھا، مجھے فرماتے تھے: بیٹھ جا اور میں چونکہ حکم کی شرط ملحوظ رکھتا تھا، اس لیے خاموش ہو جاتا۔ جب رات ہوئی، بارش بہت برسنے لگی۔ آپ نے اپنی گدڑی نکالی اور صبح تک میرے سر پر کھڑے رہے۔ گدڑی ہاتھوں پر ڈالے ہوئے تھے اور میں شرمندہ ہو رہا تھا اور اس شرط کی رُو سے کوئی بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ جب صبح ہوئی، میں نے کہا: "اے شیخ! آج امیر میں ہوں۔" آپ نے فرمایا: "بہت بہتر۔" جب ہم منزل پر پہنچے تو آپ نے وہی خدمت اپنے ہاتھ میں لی۔ میں نے کہا: "میرے حکم سے آپ باہر نہ ہوں۔" آپ نے فرمایا کہ "فرمان سے وہ شخص باہر نکلتا ہے جو امیر کو اپنی خدمت سپرد کرے۔" مکہ تک اسی طرح آپ نے میرے ساتھ صحبت رکھی، جب ہم مکہ میں پہنچے تو میں مارے شرم کے بھاگ گیا۔ یہاں تک منیٰ میں آپ نے مجھے دیکھا اور کہنے لگے کہ "بیٹا! تجھ پر لازم ہے کہ درویشوں کے ساتھ ایسی صحبت رکھے جیسی میں نے تیرے ساتھ رکھی۔"

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: صَحِبْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ خَدِمْتُهُ عَشْرَ سِنِيْنَ فَوَاللّٰهِ مَا قَالَ لِيْ اُفٍّ قَطُّ وَمَا قَالَ لِيْ بِشَيْءٍ فَعَلْتَ كَذَا وَلَا بِشَيْءٍ لَمْ اَفْعَلْهُ لِمَ لَا فَعَلْتَ كَذَا۔ (ترجمہ: میں دس سال رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں رہا اور آپؐ کی خدمت کی۔ سو قسم اللہ کی، آپؐ نے کبھی بھی مجھے اُف تک نہیں کہی اور نہ ہی کسی کام میں آپ نے مجھ سے فرمایا کہ تو نے ایسا کیا

اور نہ اس کام میں جو میں نے نہیں کیا، یوں فرمایا کہ تو نے ایسا کیوں نہیں کیا)۔ پس سب درویش دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک مقیم، دوسرے مسافر۔ مشائخ کا طریقہ یہ ہے کہ مسافر مقیموں کو اپنے اوپر ترجیح دیں۔ اس لیے کہ وہ مسافر اپنے نصیبے کے واسطے جارہے ہیں اور مقیم لوگ حق کی خدمت میں بیٹھے ہوئے ہیں کیونکہ مسافروں کے اندر طلب اور تلاش کی علامت ہوتی ہے اور مقیموں میں مطلوب کے حاصل ہونے کی نشانی۔ پس فضیلت اس کی ہوگی جس نے مطلوب کو پالیا اور بیٹھ گیا۔ اس شخص کے مقابلے میں جو مطلوب کی تلاش میں ہے اور مقیموں کو بھی چاہیے کہ مسافروں کو اپنے اوپر ترجیح دیں۔ اس لیے کہ وہ خود تعلق رکھتے ہیں اور مسافر تعلقات دنیا سے مفرد اور مجرد ہے اور مسافر لوگ تلاش میں ہیں اور مقیم توقف میں ہیں۔ بوڑھوں کو چاہیے کہ جوانوں کو اپنے اوپر فضیلت دیں کیونکہ وہ دنیا میں حال ہی میں وارد ہوئے ہیں اور ان کے گناہ بہت تھوڑے ہیں اور جوانوں کو بھی چاہیے کہ بوڑھوں کو اپنے اوپر فوقیت دیں کیونکہ وہ عبادت الٰہی میں ان سے پہلے اور خدمت میں مقدم ہیں اور جب ایسا ہو جائے گا جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے تو دونوں گروہ ایک دوسرے کی وجہ سے نجات پا جائیں گے ورنہ ہلاک ہو جائیں گے۔

چوتھی فصل
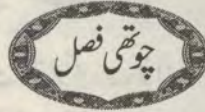
آداب کی حقیقت

یاد رکھو کہ آداب کی حقیقت نیک خصلتوں کا جمع ہونا ہے۔ مَأْدُبَۃٌ (مہمانی کا کھانا) کو اس لیے مادبہ کہتے ہیں کہ اس میں جو چیز ہوتی ہے، خیر ہوتی ہے۔ وَالَّذِیْ اجْتَمَعَ فِیْهِ خِصَالُ الْخَیْرِ اَدِیْبٌ۔ (ترجمہ: پس وہ شخص جس میں نیک خصلتیں جمع ہوں، وہ ادب والا ہے) اور لوگوں کی اصطلاح میں جو شخص علم لغت و صرف و نحو کو جانے، اس کو ادیب کہتے ہیں لیکن گروہ صوفیا کے نزدیک اَلْاَدَبُ هُوَالْوُقُوْفُ مَعَ الْحَسَنَاتِ وَ مَعْنَاهُ اَنْ تَعَامِلَ اللّٰهَ فِی الْاَدَبِ سِرًّا وَ عَلَانِیَةً وَ اذَا کُنْتَ کَذَالِكَ کُنْتَ اَدِیْبًا وَ اِنْ کُنْتَ اَعْجَمِیًّا وَ اِنْ لَّمْ تَکُنْ کَذَالِكَ تَکُوْنُ عَلٰی ضِدِّهٖ۔ (ترجمہ: ادب اچھے کام کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو اللہ کے حضور ظاہر و باطن میں ادب ملحوظ رکھے۔ جب تو ایسا ہو تو ادیب ہوگا اگرچہ تو غیر عربی ہے، اگر تو ایسا نہیں ہے تو اس کے برعکس یعنی غیر ادیب ہوگا) کیونکہ لفظی اور لسانی عمل کی کچھ قیمت نہیں اور تمام احوال میں عمل کرنے والے بے عملوں سے زیادہ بزرگ ہیں۔ ایک بزرگ سے لوگوں نے پوچھا کہ ادب کی شرط کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے جو کچھ سنا ہے، ایک بات کے اندر تیرا جواب دیتا ہوں۔ پھر فرمایا: ادب یہ ہے کہ اگر تو کچھ کہے تو تیرا کلام سچا ہو، اگر تو کوئی معاملہ کرے تو تیرا معاملہ حق و انصاف کے ساتھ ہو اور سچا کلام اگرچہ سخت اور کڑوا ہی کیوں نہ ہو، اچھا ہی ہوتا ہے اور نیک عمل اگرچہ کتنا ہی سخت ہو، اچھا ہی ہے۔ پس جب تو کوئی بات کہے تو اسے کہنے میں حق بیان کرنیوالا ہو اور جب خاموش ہو تو اپنی خاموشی میں راستی پر ہو۔ شیخ ابوالنصر سراج رحمتہ اللہ علیہ مصنف لمع نے اپنی کتاب میں ادب کے مختلف فرق بیان فرمائے اور کہا ہے: اَلنَّاسُ فِی الْاَدَبِ عَلٰی ثَلَاثِ طَبَقَاتٍ اِمَّا اَهْلُ الدُّنْیَا فَاَکْثَرُ اٰدَابِهِمْ فِی الْفَصَاحَةِ وَالْبَلَاغَةِ وَ حِفْظِ الْعُلُوْمِ وَ اَسْمَارِ الْمُلُوْكِ وَ اَشْعَارِ الْعَرَبِ وَاِمَّا اَهْلُ الدِّیْنِ فَاَکْثَرُ اٰدَابِهِمْ فِیْ رِیَاضَةِ النَّفْسِ وَتَادِیْبِ الْجَوَارِ وَ حِفْظِ الْحُدُوْدِ وَ تَرْكُ الشَّهَوَاتَ وَاِمَّا اَهْلُ الْخُصُوْصِیَّةِ فَاَکْثَرُ اٰدَابِهِمْ فِی طَهَارَتَ الْقُلُوْبِ وَ مُرَاعَاتِ الْاَسْرَرِ وَالْوَفَاءِ بِالْعُهُوْدِ وَ حِفْظِ الْوُقْتِ وَقِلَّةِ الْاِلْتِفَاتِ اِلَی الْخَوَاطِرِ

وَ حُسنِ الْاَدَبِ فِی مَوَاقِفِ الطَّلَبِ وَ اَوقاتِ الْحُضُورِ وَ مَقَامَاتِ الْقُرْبِ۔ (ترجمہ: لوگ آداب میں تین قسم کے ہوتے ہیں: ایک اہل دنیا ہیں کہ ان کے نزدیک ادب و فصاحت اور بلاغت علوم و فنون کی تحقیق و تدوین، زمانے کے بادشاہوں کے قصے اور مختلف الفکر شعراء کے اشعار کا اچھا ذخیرہ حافظے میں محفوظ کرنا ہے اور علموں اور بادشاہوں اور اشعارِ عرب کا حفظ کرنا ہے، دوسرے اہل دین کہ ان کے نزدیک ادب نفس کو ریاضت و مجاہدہ کا عادی بنانا اور اعضا کو تادیب، حدود الٰہی کی حفاظت اور نفسانی خواہشات کو ترک کرنا ہے، تیسرے اہل خصوصیت کہ ان کے نزدیک ادب دل کو پاک رکھنا، باطن کے بھید کی رعایت کرنا، عہد کو پورا کرنا، وقت کی نگہداشت اور خیالاتِ پراگندہ کو کم کرنا ہے اور پھر طلب و قرب کے مقامات اور حضور کے اوقات میں سب سے اچھا ادب کرنا ہے)۔ یہ کلام جامع ہے اور اس کی تفصیل اس کتاب میں متفرق مقامات پر آئے گی۔

پانچویں فصل
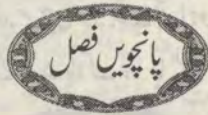
اقامت میں صحبت کے حقوق

جب کوئی درویش سفر چھوڑ کر اقامت اختیار کرلے تو اس کے ادب کی شرط یہ ہے کہ جب کوئی مسافر اس کے پاس پہنچے تو اس کی عزت کرتے ہوئے اس کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے اور کامل ادب واحترام سے اس کو قبول کرے اور یوں سمجھے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کے باعظمت مہمانوں میں سے ایک ہے اور اس کے ساتھ وہی سلوک کرے جو ابراہیم علیہ السلام اپنے مہمانوں سے کیا کرتے تھے، یعنی تکلف کے بغیر جو کچھ موجود ہو، لا حاضر کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِینٍ۔ (ترجمہ: پس آپ موٹا تازہ بچھڑا بھنا ہوا لے آئے) اور ادب کا خیال رکھتے ہوئے یوں نہ پوچھے کہ تو کہاں سے آیا ہے یا کہاں جاتا ہے؟ یا تیرا نام کیا ہے؟ پس ان کے آنے کو خدا کی طرف سے، ان کے جانے کو خدا کی طرف اور ان کے نام کو خدا کا بندہ خیال کرے۔ پھر غور کرے کہ اس کو آرام کے لیے تنہائی چاہیے یا صحبت؟ اگر اس کو خلوت پسند ہے تو اس کے لیے جگہ خالی کردے۔ اگر اُسے صحبت پسند ہے تو بے تکلف محبت، ہمدردی اور معاشرے کے دیگر مراسم کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سے گفتگو کرے اور جب مسافر سرہانے پر سر رکھ کر سونے کا ارادہ کرے تو مقیم کو چاہیے کہ اس کے پاؤں دبائے۔ اگر وہ ایسا نہ کرنے دے اور کہے کہ مجھے اس کی عادت نہیں تو اسے چھوڑ دے تاکہ اس کو ناگوار نہ گزرے۔ دوسرے دن اسے کسی صاف ستھرے حمام میں لے جائے اور اس کے کپڑوں کو حمام کی ناپاک جگہوں سے محفوظ رکھے اور کسی اجنبی خدمت گار کو اس کی خدمت پر مقرر نہ کرے۔ چاہیے کہ ایسے اچھے اعتقاد کے ساتھ اس کی خدمت کرے کہ وہ بدن کو صاف کرنے کے ساتھ خود تمام عیبوں سے پاک ہو جائے۔ ضروری ہے کہ اس کی پیٹھ کھجلائے اور اس کے گھٹنوں، تلووں اور ہاتھوں کو اچھی طرح ملے اور اس پر اکتفا کرے اور اگر اس مقیم کو اس بات کی دسترس ہو کہ اس کو نئے کپڑے بنوادے تو یہ بھی کردے ورنہ تکلف بھی نہ کرے۔ اس کے انہی کپڑوں کو دھو ڈالے تاکہ جب حمام سے نکلے تو ان کو پہن لے اور جب حمام سے اپنی جگہ پر واپس آئے تو تین دن اور ٹھہرائے۔ اگر اس شہر میں کوئی بزرگ، کوئی جماعت یا اسلام کے اماموں میں سے کوئی ہو تو اس سے کہے کہ اگر مناسب ہو تو اس کی زیارت کو چلیں۔ اگر وہ چلے تو بہتر اور اگر انکار کرے تو اس کو مجبور نہ کرے، کیونکہ طالبانِ حق پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ اپنا دل بھی ان کے قابو میں نہیں ہوتا۔

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جب حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے کہا کہ اپنے سفروں کے عجائبات میں سے کچھ بتایئے، تو آپ نے فرمایا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک دفعہ مجھ سے ہم نشینی کی درخواست کی مگر میں نے قبول نہ کی اور ان کی ہم نشینی پر راضی نہ ہوا، کیونکہ اس وقت میرے دل نے نہ چاہا کہ حق تعالےٰ کے سوا کسی اور کی میرے دل میں قدر و قیمت ہو اور اس کی رعایت کرنا پڑے، البتہ یہ روا نہیں کہ مقیم مسافر کو اہل دنیا کے سلام کرنے اور ان کی مہمانیوں اور بیمار پرسیوں کے لیے لے جائے۔ جس مقیم کو مسافروں سے یہ لالچ ہو کہ ان کو اپنی گدائی کا آلہ بنائے اور اسے گھر گھر لیے پھرے، اس کے لیے ان کے جسم پر وہ گدائی کی ذلت ڈالنے اور ان کے دل کو رنج پہنچانے کے مقابلے میں یہ کہیں بہتر ہے کہ سرے سے ان کی خدمت ہی نہ کی جائے۔

مجھ (علی بن عثمان جلابیؒ) کو اپنے سفروں میں اس سے بڑھ کر اور کوئی بات ناگوار اور رنجیدہ نہ تھی کہ جاہل خادم اور بے وقوف مقیم کبھی مجھ کو اپنے ساتھ لے لیتے اور اس چودھری کے گھر سے اس زمیندار کے گھر لیے پھرتے اور میں دلی کراہت سے ان کے ساتھ چلا جاتا مگر بظاہر درگزر کرتا۔ پھر مقیم لوگ مجھ سے جو بے قاعدگی کیا کرتے تھے، میں ان کی وجہ سے دل میں عہد کرلیتا کہ اگر میں کسی وقت مقیم ہو جاؤں گا تو مسافروں سے کبھی ایسا سلوک روا نہیں رکھوں گا اور بے ادبوں کی صحبت سے اس سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا کہ جو کچھ ان کے معاملات میں سے ناپسند ہو تو اس کو برداشت کرے اور خود ان جیسی کوئی حرکت نہ کرے۔ پھر اگر کو درویش مسافر خوش ہو اور چند روز صحبت رکھے اور دنیا کی ضرورت ظاہر کرے تو مقیم کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ضرورت پوری کردے یعنی جو کچھ اس کو ضرورت ہو، فوراً حاضر کرے اور اگر وہ مسافر جھوٹا دعویٰ کرنے والا بے ہمت ہے تو مقیم کو نہ چاہیے کہ وہ بھی بے ہمتی کرے اور اس کی محال ضروریات میں اس کے تابع ہو جائے کیونکہ یہ دنیا سے قطع تعلق کرنے والوں کا طریقہ نہیں ہے۔ جب اسے کوئی ضروری چیز درکار ہو تو لین دین کے لیے بازار جانا چاہیے نہ کہ سائلین کے ساتھ بادشاہوں کے دربار میں، بادشاہوں کا تارکانِ دُنیا کی صحبت سے کیا کام؟ کہتے ہیں کہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ اپنے اصحاب کے ساتھ ریاضت و مجاہدہ کے لیے بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک مہمان آگیا۔ اس کے واسطے بہت تکلف کیا اور کھانا اس کے سامنے لاکر رکھا۔ وہ کہنے لگا مجھے تو فلاں چیز چاہیے۔ آپ نے فرمایا: "تب تو تجھے بازار جانا چاہیے کیونکہ تو بازاری آدمی ہے، اہل مساجد و صوامع سے نہیں"۔

ایک دفعہ میں نے دمشق سے درویشوں کے ہمراہ ابن مبلاح کی زیارت کا قصد کیا۔ وہ رملہ گاؤں میں رہتے تھے۔ ہم نے راستے میں ایک دوسرے سے کہا کہ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے دل میں ایسی بات سوچ لینی چاہیے کہ جو اسے معلوم ہو تاکہ وہ پیر ہمارے باطن سے ہمیں خبر دیں اور ہمارا وہ واقعہ حل ہو جائے۔ چنانچہ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھے آپ سے حسین بن منصورؒ کی مناجات اور ان کے اشعار کی درخواست کرنی چاہیے۔ دوسرے نے کہا کہ مجھے دعا کرانی ہے تاکہ میری تلی اچھی ہو جائے اور تیسرے نے کہا کہ مجھے صابونی حلوہ چاہیے۔ جب ہم لوگ آپ کے پاس پہنچے تو آپ کے حکم سے حسین بن منصورؒ کی مناجات کے کچھ اشعار لکھے ہوئے تھے۔ سو میرے سامنے رکھ دیئے گئے۔ دوسرے درویش کے پیٹ پر ہاتھ پھیر دیا، اس کی تلی کم ہوگئی اور تیسرے سے فرمایا کہ صابونی حلوہ سلطانی نوکروں چاکروں کی غذا ہے، تو اولیا کا لباس رکھتا ہے اور اولیا کا لباس سرکاری آدمیوں اور دنیاداروں کے مطالب کے ساتھ درست معلوم نہیں ہوتا، ان دونوں باتوں میں سے ایک کو اختیار کرلے۔ الغرض مقیم کو اس شخص کی رعایت

کے سوا اور کچھ نہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ حق تعالےٰ کی رعایت میں مشغول ہے اور اپنے حصے کو ترک کرنے والا ہے اور جب کوئی شخص اپنے حصے کی رعایت پر اقامت کرے تو نفس کی خوشی محال ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس کی نفس کی خوشی کے حصول میں اس کے ساتھ موافقت کرے، کیونکہ درویش ایک دوسرے کے راہ بَر ہوتے ہیں راہ بُر نہیں ہوتے۔ جب کوئی شخص اپنے حظ نفس پر قائم ہو تو دوسرے کو چاہیے کہ اس کے خلاف کرے اور جب وہ اپنے حظ نفس کو چھوڑ دے تو چاہیے کہ اس کے حصے پر وہ بھی موافقت کرے تاکہ دونوں حال میں وہ رہبر ہو نہ کہ رہزن۔ احادیث میں مشہور ہے کہ پیغمبر ﷺ نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے برادری قائم کردی تھی۔ دونوں اصحابِ صفہ اور اہل باطن کے سردار تھے۔ ایک دن حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے گھر زیارت کے لیے آئے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی بیوی نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے پاس ان کی شکایت کی کہ آپ کا یہ بھائی نہ تو دن کو کچھ کھاتا ہے اور نہ رات کو سوتا ہے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کچھ کھانے کی چیز ہو تو لے آؤ۔ جب وہ لائیں تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہا: "اے بھائی! تجھے میرے ساتھ موافقت کرنی چاہیے کیونکہ یہ روزہ تجھ پر فرض نہیں۔" حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے موافقت نہ کی اور جب رات ہوئی تو کہا: "اے بھائی! سونے میں بھی تجھ کو میرے ساتھ موافقت کرنی چاہیے۔" اِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَ اِنَّ الزَوْجَتِيكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَ اِنَّ لِرَبِّكَ عَلَيْكَ حَقًّا۔ (ترجمہ: بلاشبہ تیرے جسم کا تجھ پر حق ہے اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیرے پروردگار کا بھی تجھ پر حق ہے) جب دوسرے دن حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ پیغمبر خدا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو پیغمبر ﷺ نے فرمایا: "میں بھی وہی کہتا ہوں جو کل سلمان رضی اللہ عنہ نے تجھ سے کہا۔ اِنَّ لِجَسَدِكَ حَقًّا الخ۔ (ترجمہ: تیرے جسم کا بھی تجھ پر حق ہے الخ)۔" چونکہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اپنے نفس کی خواہشات کو ترک کیا ہوا تھا، اس لیے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے ان کی نفس و خواہشات پر اقامت کی اور اپنا ورد چھوڑ دیا اور اسی بنیاد پر جو کچھ بھی تو کرے، وہ صحیح اور مستحکم ہوگا۔ ایک دفعہ میں ملک عراق میں دنیا کی طلب اور اس کے فنا کرنے میں اسراف کر رہا تھا اور قرض بہت ہو گیا تھا اور جس کو ضرورت ہوتی وہ میری طرف متوجہ ہوتا اور میں ان کی خواہش نفسانی کے پورا کرنے کی تکلیف میں مبتلا تھا۔ وقت کے سرداروں میں سے ایک سردار نے مجھے لکھا کہ "اے بیٹا! خبردار اپنے دل کو خدا سے ہٹا کر اس دل کو آرام دینے میں مشغول نہ کر، جو اپنے نفس کی خواہش میں مشغول ہے۔ پس اگر اپنے دل سے زیادہ عزیز دل تجھے ملے تو روا ہے کہ اس دل کی فراغت کے لیے تو اپنے دل کو مشغول کرے ورنہ اس کام سے ہاتھ اٹھالے، کیونکہ خود خداوند تعالےٰ اپنے بندوں کے لیے کافی ہے۔" چنانچہ فوراً مجھے اس کام سے فراغت حاصل ہوئی۔ مسافروں کی صحبت میں مقیموں کے لیے مختصر احکام بس یہی ہیں۔
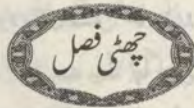
سفر میں آدابِ صحبت

جب درویش اقامت چھوڑ کر سفر اختیار کرے تو اس کے ادب کی شرط یہ ہے کہ پہلے سفر خدا کے لیے کرے، نفس کی متابعت نہ کرے اور جیسا کہ وہ ظاہر میں سفر کر رہا ہے، باطن میں بھی اپنے نفس کی خواہش کو چھوڑ کر سفر کرے اور ہمیشہ باوضو رہے۔ اپنے ورد و ظائف ضائع نہ کرے اور چاہیے کہ اس سفر سے اس کی مراد خانہ کعبہ کا حج ہو یا

جہاد یا کسی پاک مقام کی زیارت سے باطنی فائدہ اٹھانا یا علم کی تلاش یا کسی بزرگ اور شیخ کے مزار کی زیارت مقصود ہو ورنہ اس سفر میں وہ خطاوار ہوگا اور اس کے لیے اس سفر میں گدڑی، مصلیٰ، لوٹا، رسی، جوتا یا نعلین اور لاٹھی کے بغیر چارہ نہیں تاکہ گدڑی سے اپنا بستر ڈھانپے، مصلےٰ پر نماز ادا کرے اور لوٹے سے وضو کرے اور لاٹھی سے ضرر پہنچانے والے جانوروں کو ہٹائے اور ان میں اس کے لیے اور بھی کچھ فوائد ہیں۔ پھر نعلین یا جوتا وضو کی حالت میں پیروں میں ڈالے تاکہ مصلیٰ پر آئے اور اگر کوئی شخص سنت کی پیروی کرتے ہوئے اس سے زیادہ سامان رکھے جیسا کہ کنگھی، ناخن گیر، سوئی اور سرمہ وغیرہ تو یہ بھی جائز ہے۔ اگر اس سے زیادہ سامان سفر مہیا کرے اور اپنے آپ کی زینت کرے تو وہ غور کرے کہ وہ کس مقام پر ہے اور اگر ارادت کے مقام میں ہے تو ان میں سے ہر ایک چیز اس کے لیے ایک مفید، ایک بت، ایک دیوار اور حجاب ہے اور اس کے نفس کی سرکشی اور رعونت کے ظاہر کرنے کا سامان ہے اگر وہ تمکین و استقامت کے مقام میں ہے یعنی نفس اس کا قابو میں ہے اور ثابت قدم ہے تو اس کے لیے یہ سامان اور اس سے بھی زیادہ رکھنا دُرست ہے۔

میں نے شیخ ابو مسلم فارس بن غالب الفارسی رحمتہ اللہ علیہ سے سنا ہے، فرماتے تھے کہ میں ایک دن شیخ ابو سعید ابوالخیر فضل اللہ بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کے پاس زیارت کے قصد سے آیا تو میں نے دیکھا کہ آپ ایک تخت پر چار تکیے لگائے ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر عجیب انداز سے دھرے لیٹے ہیں اور ایک بیش قیمت مصری چادر اوڑھ رکھی ہے۔ میرے کپڑے میل کی وجہ سے چمڑے کی طرح ہوگئے تھے، میرا جسم رنج سے گھلا ہوا اور رنگِ مجاہدہ کی وجہ سے زرد تھا۔ آپ کے دیدار سے میرے دل میں انکار سا پیدا ہوا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ "یہ بھی درویش اور میں بھی درویش، یہ تو اتنے آرام کے اندر اور میں اتنی تکلیف میں؟" آپ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فوراً میرے باطن پر اطلاع پائی اور میری نخوت و وسوسہ کو دیکھ کر فرمایا: "اے مسلم! کسی دیوان میں تو نے دیکھا ہے کہ خود بین آدمی درویش ہوتا ہے چونکہ میں نے سب حق کو دیکھا۔ حق تعالےٰ نے فرمایا کہ تجھے تخت پر ہی بٹھاؤں گا اور چونکہ تو نے سب اپنے ہی آپ کو دیکھا تو اس نے فرمایا کہ تجھے نیچے ہی رکھوں گا، لہٰذا ہمارے نصیب تو مشاہدۂ حق ہوا اور تیرے نصیب مجاہدہ اور یہ دونوں مقام طریقت کے مقامات میں سے ہیں اور حق تعالےٰ ان سے پاک ہے اور درویش مقامات سے فانی اور احوال سے خلاصی پائے ہوئے ہے۔" شیخ ابو مسلم فرماتے ہیں کہ یہ سن کر میرے ہوش جاتے رہے اور تمام عالم مجھ پر سیاہ ہو گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے معذرت کی۔ آپ نے میری معذرت قبول کی۔ تب میں نے عرض کیا: "اے شیخ! مجھے اجازت ہو کہ میں چلا جاؤں کیونکہ میرا حال آپ کی رویت کا متحمل نہیں ہوسکتا۔" آپ نے فرمایا: صَدَقْتَ یَا اَبَا مُسْلِمْ (اے ابو مسلم! تو نے سچ کہا ہے) اور مثال کے طور پر آپ نے یہ بیت پڑھا

؎ آنچه گوشم نتوانست شنیدن به خبر
همه چشمم بعیاں بکسره دیدآں به بصر

(ترجمہ: جو کچھ میرا کان خبر سے نہ سن سکا، میری آنکھ نے سب کچھ ظاہر طور پر نظر سے دیکھ لیا)۔

پس مسافر کو چاہیے کہ ہمیشہ سنت کی حفاظت کرتا رہے اور جب کسی مقیم کے پاس پہنچے تو قابل عزت واحترام کے ساتھ اس کے پاس آئے۔ پہلے سلام کرے اور پھر بایاں پاؤں جوتے سے باہر نکالے، کیونکہ پیغمبر ﷺ نے ایسا ہی کیا ہے۔ جب جوتا پہنے تو پہلے دایاں پاؤں جوتی میں ڈالے پھر بایاں۔ جب پاؤں دھوئے تو پہلے داہنا پھر بایاں اور دو رکعت نفل تحیۃ ادا کرے۔ پھر درویشوں کے حقوق کی رعایت میں مشغول ہو جائے اور کسی حالت میں مقیموں پر اعتراض نہ

کرے اور نہ معاملے میں کسی پر زیادتی کرے، نہ اپنے سفر کی سختیوں کو بیان کرے اور نہ جماعت کے درمیان عملی باتیں، حکایتیں اور روایتیں بیان کرے، کیونکہ یہ سب امور سرکشی کا اظہار ہیں اور چاہیے کہ جاہلوں کا رنج اُٹھائے اور ان کا بوجھ خدا کے لیے برداشت کرے، کیونکہ اس میں بہت برکتیں ہیں۔ اگر مقیم یا ان کے خادم اس پر کوئی حکم کریں اور اس کو سلام کرنے یا کسی زیارت پر جانے کی دعوت دیں تو اگر ہو سکے تو ان کی مخالفت نہ کرے لیکن دل میں اہل دُنیا کی رعایت کرنے میں منکر رہے اور ان بھائیوں کے افعال کے لیے کوئی عذر ڈھونڈتا رہے اور ان کی تاویل کرتا رہے اور اپنی کسی مشکل سے حاصل ہونے والی ضرورت کا بوجھ ان کے دل پر نہ ڈالنا چاہیے۔ اپنی راحت اور نفس کی خواہش کے حصول کے لیے انہیں امراء کے درباروں میں لیے پھرنا بھی مناسب نہیں، تمام حالات میں مسافر اور مقیم کے لیے صحبت میں خداوند تعالےٰ کی رضا جوئی مطلوب ہونی چاہیے، ایک دوسرے پر نیک اعتقاد رکھنا چاہیے، آپس میں برا نہیں کہنا چاہیے اور پیٹھ پیچھے غیبت نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ طالب حق کے لیے کسی کی برائی کرنا نہایت برا ہے۔ اس لیے کہ محقق لوگ فعل کے دیکھنے میں فاعل کو دیکھتے ہیں اور چونکہ خلقت جس صفت پر کہ ہے، خداوند پاک کی ملک اور اس کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اگرچہ وہ عیب دار ہے یا بے عیب، حجاب میں ہے یا مکاشفہ میں، کسی فعل پر اعتراض کرنا اس کے فاعل پر اعتراض ہے اور جب آدمیت کی آنکھ سے مخلوق میں دیکھے گا تو سب سے چھوٹ جائے گا اور جان لے گا کہ تمام مخلوق خدا سے حجاب میں ہے، مغلوب اور مقہور اور عاجز ہے اور کوئی اس حالت کے سوائے جس پر وہ پیدا ہو گیا ہے، کسی اور حالت میں نہیں ہوسکتا۔ مخلوق کو اس کے ملک میں کوئی تصرف نہیں اور کسی کو قائم بذات خود چیز کے تبدیل کرنے پر سوائے حق تعالیٰ کے مطلق قدرت نہیں اور توفیق اللہ کے قبضے میں ہے۔

ساتویں فصل
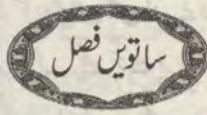
کھانے کے آداب میں

جاننا چاہیے کہ انسان کو غذا سے چارہ نہیں ہے کیونکہ طبیعتوں کی ترکیب کو قائم رکھنا کھائے پیئے بغیر نہیں ہوسکتا، لیکن ضروری شرط یہ ہے کہ اس میں حد سے مبالغہ نہ کرے اور رات دن اپنے آپ کو کھانے پینے کی فکر میں مستغرق نہ رکھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مَنْ كَانَ هِمَّتُهٗ مَا يَدْخُلُ فِيْ جَوْفِهٖ كَانَ قِيْمَتُهٗ مَا يَخْرُجُ مِنْهُ۔ (ترجمہ: جس شخص کے پیش نظر ہمیشہ وہ چیز ہو جو اس کے پیٹ میں داخل ہوتی ہے، تو اس کی قیمت وہ ہے جو اس کے پیٹ سے خارج ہوتی ہے)۔ راہِ حق تعالےٰ کے مریدوں کے لیے بہت کھانے سے بڑھ کر کوئی چیز مضر نہیں اور اس سے پہلے اس کتاب میں بھوک کے باب میں کچھ کہہ چکا ہوں لیکن یہاں اسی قدر مناسب ہے۔ بعض حکایات سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ بایزید رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ بھوک کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ہاں! اگر فرعون بھوکا ہوتا تو ہرگز یوں نہ کہتا۔ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى۔ (ترجمہ: میں ہی تمہارا سب سے اونچا خدا ہوں) اور اگر قارون بھوکا ہوتا تو سرکش نہ ہوتا اور ثعلبہ جب تک بھوکا تھا، سب لوگ اس کی تعریف کرتے تھے، جب سیر ہوگیا تو اس نے منافقت ظاہر کی اور اللہ تعالےٰ نے کفار کی صفت میں فرمایا: ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ وَقَوْلُهٗ تَعَالٰى۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ۔ (ترجمہ: انہیں چھوڑ دیجئے کہ کھائیں، تمتع حاصل کریں اور آرزو ان کو غافل کیے رہے۔ پس وہ سب کچھ جان لیں گے

اور اللہ کا یہ قول کہ جو کافر ہیں، وہ دنیا میں تمتع حاصل کرتے اور کھاتے ہیں جس طرح کہ چوپائے کھاتے ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے)۔ سہل بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "میں اس پیٹ کو جو شراب سے بھرا ہوا ہو، حلال کھانے سے بھرے ہوئے پیٹ کی بہ نسبت زیادہ پسند کرتا ہوں۔" لوگوں نے کہا: "کیوں؟" آپ نے فرمایا: "اس لیے کہ جب پیٹ شراب سے بھر جاتا ہے تو عقل اس کی وجہ سے آرام پا جاتی ہے اور شہوت کی آگ مر جاتی ہے لیکن جب حلال کھانے سے وہ پُر ہو جاتا ہے تو فضول آرزو کرتا ہے، شہوت زور پکڑتی ہے اور نفس اپنے حصوں کے طلب کرنے کے لیے سر اُٹھاتا ہے۔" مشائخ نے ایسے لوگوں کی صفت میں کہا ہے۔ اَكْلُهُمْ كَاَكْلِ الْمَرْضٰى وَ نَوْمُهُمْ كَنَوْمِ الْغَرْقٰى وَ كَلَامُهُمْ كَكَلَامِ الثَّكْلٰى۔ (ترجمہ: ان کا کھانا بیماروں کا سا کھانا، ان کا سونا غرق شدہ لوگوں کا سونا اور ان کا کلام ان عورتوں کا سا ہے جن کے بچے مر گئے ہوں)۔

پس کھانے کے ادب کی شرط یہ ہے کہ تنہا نہ کھائیں اور جو کھائیں ایک دوسرے پر ایثار کریں، کیونکہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: شَرُّ النَّاسِ مَنْ اَكَلَ وَحْدَهٗ وَ ضَرَبَ عَبْدَهٗ وَ مَنَعَ وَفْدَهٗ۔ (ترجمہ: سب سے برا آدمی وہ ہے جو اکیلا کھائے، اپنے غلام کو پیٹے اور اپنے قاصد کو روکے) یا اپنی بخشش کو روکے۔ جب دستر خوان پر بیٹھے تو خاموش معلوم ہوتا ہو، اللہ کے نام سے شروع کرے اور چیزوں کو اوپر نیچے، اُلٹ پلٹ ہرگز نہ کرے جس سے ساتھیوں کو کراہت ہو، پہلا لقمہ نمکین اٹھائے اور اپنے ساتھیوں سے انصاف کرے۔

حضرت سہل بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے اس آیت کے معنی دریافت کیے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔ (ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالٰے عدل اور نیکی کا حکم فرماتا ہے) تو آپ نے فرمایا: عدل یہ ہے کہ اپنے ساتھی سے کھانے میں انصاف کرے اور احسان یہ ہے کہ اس کھانے کے لیے اس کو اپنے سے بہتر سمجھے۔

میرے شیخ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ مجھے اس جھوٹے مدعی پر تعجب ہے جو کہتا ہے کہ میں نے دنیا کو چھوڑ دیا ہے اور ساتھ ہی شب و روز کھانے کی فکر میں رہتا ہے اور چاہیے کہ کھانا ہاتھ سے کھائے اور اپنے لقمے کے سوا دوسری طرف نہ دیکھے اور کھانا کھانے میں پانی اس وقت پیئے جس وقت سچی پیاس ہو اور جب پیئے تو اتنا تھوڑا پیئے کہ اس کا جگر تر ہو جائے اور لقمہ بڑا نہ اٹھائے اور کھانے اور چبانے میں جلدی نہ کرے، کیونکہ ان باتوں سے بدہضمی اور سنت کی مخالفت کا خوف ہے۔ جب کھانے سے فارغ ہو تو الحمد اللہ پڑھے اور ہاتھ دھوئے اور اگر جماعت میں سے دو، تین یا زیادہ آدمی چھپ کر کسی دعوت پر چلے جائیں اور کچھ کھائیں تو بعض مشائخ نے فرمایا ہے کہ وہ حرام ہے اور حقوق صحبت میں خیانت کرنا ہے۔ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ۔ (ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کا کھانا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں) اور ایک گروہ نے کہا ہے کہ جب وہ ایک جماعت ہو تو بھی جائز ہے، کیونکہ اس کو تنہائی ہی کی حالت میں انصاف نہیں کرنا چاہیے بلکہ صحبت کی حالت میں انصاف کرنا چاہیے کیونکہ جب اکیلا ہو گا تو اس وقت کی صحبت کا حاکم اس سے اُٹھ جائے گا اور اس کے عوض میں وہ ماخوذ نہیں ہو گا اور سب سے زیادہ ضروری قاعدہ اس مذہب میں یہ ہے کہ درویش کی دعوت کو رد نہ کرے اور دنیادار کی دعوت کو قبول نہ کرے، اس کے گھر نہ جائے اور اس سے کوئی چیز نہ مانگے کیونکہ اس میں اہل طریقت کے لیے کمزوری ہے، اس لیے کہ اہل دنیا درویش کے محرم نہیں ہیں اور پھر آدمی سامان کی زیادتی سے دنیادار نہیں ہو جاتا اور اس کی کمی سے درویش نہیں ہو جاتا۔ جو شخص دولت مندی پر فقر کی فضیلت کا قائل ہو وہ دنیادار نہیں ہوتا اگرچہ بادشاہ ہو اور جو فقیر کا منکر ہو،

وہ دنیادار ہوتا ہے اگرچہ لاچار ہی ہو۔ جب دعوت میں حاضر ہو تو کسی چیز کے کھانے اور نہ کھانے میں تکلف نہ کرے۔ وقت کے تقاضے کو دیکھ کر جو ملے کھالے۔ جب دعوت والا قریبی اور محرم ہو تو جائز ہے کہ گھر والا بچا کھچا اٹھالے اور اگر دعوت والا نامحرم ہو تو اس کے گھر میں جانا جائز تو ہے لیکن کھانا بچانا نہ چاہیے کیونکہ سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: اَلزَّلَّۃُ هِیَ الذِّلَّۃُ۔ (ترجمہ: پس خوردہ چھوڑنا ذلت ہے) اور توفیق اللہ کے قبضے میں ہے۔

آٹھویں فصل
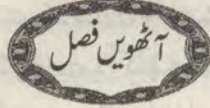
چلنے کے آداب میں

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا۔ (ترجمہ: اور اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عجز و انکسار سے چلتے ہیں) یعنی طالب حق کو چاہیے کہ وہ چلتے وقت یہ خیال رکھے کہ وہ اپنا قدم زمین پر کس کے لیے رکھتا ہے، خواہش نفسانی کے لیے یا اللہ تعالیٰ کے لیے۔ اگر وہ خواہش نفسانی کے لیے زمین پر قدم رکھتا ہے تو استغفار پڑھے اور اگر اس کا قدم اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہے تو اس میں اور بھی کوشش کرے تاکہ اسے مزید خوشنودی حاصل ہو جائے۔

حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک روز آپ نے دوا پی ہوئی تھی۔ لوگوں نے کہا کہ "تھوڑی دیر گھر کے صحن میں ٹہل لیں تاکہ دوا اپنا اثر ظاہر کرے۔" تو آپ نے فرمایا کہ "مجھے شرم آتی ہے کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ مجھ سے سوال کریں کہ تو نے اتنے قدم کیوں اپنے نفس کی خواہش میں زمین پر رکھے؟" جب کہ اللہ جبار اور بزرگ نے فرمایا ہے: وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ۔ (ترجمہ: اور ان کے پاؤں اس امر کی شہادت دیں گے جو وہ دنیا میں کماتے تھے)۔ پس درویش کو لازم ہے کہ بیداری میں مراقبے میں سر نیچے ڈالے ہوئے چلے اور سوائے سامنے نظر رکھنے کے کسی اور طرف نہ دیکھے اور اگر راستے میں کوئی شخص اس کے سامنے سے آئے تو پہلے کپڑوں کی حفاظت کے لیے اپنے آپ کو اس سے ایک طرف نہ کھینچے، تاکہ اس پر ظاہر کرے کہ مومن اور اس کے کپڑے سب پاک ہوتے ہیں اور یہ بات سوائے غرور اور خودنمائی کے اور کچھ نہیں البتہ اگر وہ شخص کافر ہے یا اس پر بظاہر کوئی غلاظت نظر آتی ہے تو روا ہے کہ اپنے آپ کو اس سے بچائے اور نگاہ رکھے۔ جب ایک جماعت کے ہمراہ چل رہا ہو تو آگے آگے چلنے کا ارادہ نہ کرے کیونکہ زیادتی چاہنا اور آگے بڑھنا تکبر ہے، نیز پیچھے چلنے کا قصد بھی نہ کرے اور کسی معاملے میں حد سے زیادہ تواضع کا مظاہرہ بھی اچھا نہیں کہ یہ بھی عین تکبر ہے اور نعلین اور جوتے کو جہاں تک ہو سکے، دن میں ناپاکیوں سے محفوظ رکھے تاکہ اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے اس کے کپڑے کو رات کے وقت محفوظ رکھے۔ جب کوئی جماعت یا درویش اس کے ہمراہ ہو تو راستے میں اس کو کسی سے بات کرنے کے لیے کھڑا نہیں ہونا چاہیے اور نہ اس کو اپنا انتظار کرانا چاہیے اور آہستہ چلے، جلدی نہ کرے کہ یہ اہل حرص کے چلنے کے مشابہ ہے اور اتنا آہستہ بھی نہ چلے جو متکبر لوگوں کے چلنے کی مانند ہو اور زمین پر قدم پورا رکھے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ہمیشہ طالب حق کی رفتار ایسی ہونی چاہیے کہ اگر کوئی شخص اس سے پوچھے کہ تو کہاں جا رہا ہے؟ تو جواب میں کہہ سکے: اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ۔ (ترجمہ: بلاشبہ میں اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہوں۔ عنقریب وہ مجھے حق کی طرف رہنمائی کرے گا) اور اگر اس کی رفتار ایسی نہ ہو تو اس کا چلنا اس کے لیے وبال ہوگا،

اس لیے کہ قدموں کا صحیح ہونا دل کے خطرات کے صحیح ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پس جس کا خیال حق کے لیے مجتمع ہو، اس کے قدم اس کے اندیشے اور فکر کے تابع ہوں گے۔

حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ درویش کی رفتار مراقبے کے بغیر غفلت کی علامت ہے کہ خود جو کچھ ہے، دو قدم میں حاصل ہو جاتا ہے کہ ایک قدم تو اپنی خواہشات کے مطابق رکھتا ہے اور دوسرا خداوند تعالےٰ کے حکم کے مطابق۔ پس اس ایک قدم کو تو اُٹھالے اور اس دوسرے کی جگہ پر رکھ دے اور طالب کی رفتار مسافت کے قطع کرنے کی علامت ہوتی ہے اور قربِ حق مسافت کے ساتھ نہیں ہوتا۔ جب اس کا قرب مسافت سے نہیں ہوتا تو طالب کے لیے آرام کے محل میں پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے کے سوا اور کیا چارہ ہو سکتا ہے اور اللہ توفیق کا مالک ہے۔
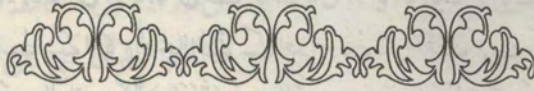
اُنتیسواں باب

سفر اور حضر میں سونے کے آداب

جاننا چاہیے کہ مشائخ رحمتہ اللہ علیہم کا اس امر میں بہت اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک مرید کو سوائے نیند کے غلبے کے کسی حالت میں سونا جائز نہیں، جب کہ وہ اپنے آپ کو نیند سے باز نہ رکھ سکتا ہو، کیونکہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: اَلنَّوْمُ اَخُ الْمَوْتِ (ترجمہ: نیند موت کا بھائی ہے)۔ پس زندگی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے اور موت ایک مصیبت ہے اور لامحالہ نعمت ابتلا اور مصیبت سے زیادہ بزرگ ہے۔ حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: اِطَّلَعَ الْحَقُّ فَقَالَ مَنْ نَامَ غَفَلَ وَ مَنْ غَفَلَ حُجِبَ۔ (ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نگاہ ڈالی۔ پس فرمایا جو سویا، وہ غافل ہوا اور جو غافل ہوا، وہ حق سے حجاب میں ہوگیا)۔ ایک گروہ کے نزدیک روا ہے کہ مرید اپنے اختیار سے سوئے اور حق تعالیٰ کے احکام کو بجالانے کے بعد سونے میں تکلف کرے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثٍ عَنِ النَّائِم حَتّٰی یَنْتَبِہَ عَنِ الصَّبِیِّ حَتّٰی یَحْتَلِمَ وَ عَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتّٰی یَفِیْقَ۔ (ترجمہ: تین آدمیوں سے تکلیف (احکام) اُٹھا دی گئی ہے: ایک، سونے والے سے یہاں تک کہ وہ بیدار ہو دوسرا، لڑکے سے جوان ہونے تک اور تیسرا، دیوانے سے باہوش ہونے تک) چونکہ سوئے ہوئے آدمی سے تکلیف اٹھائی جا چکی ہے جب تک کہ وہ بیدار نہ ہو، اس لیے خلقت اس کے شر سے محفوظ رہتی ہے اور اس کا اختیار اس سے کم ہوتا ہے، اس کا نفس اس کی مرادوں سے برطرف کیا جاتا ہے اور کراماً کاتبین لکھنے سے فارغ ہوتے ہیں، اس کی زبان دعویٰ سے کوتاہ ہوتی ہے، جھوٹ اور غیبت سے وہ رُکا ہوا ہوتا ہے اور اس کا ارادہ خود بینی اور ریا کی زد سے باہر ہوتا ہے۔ لَا یُمْلِكُ لِنَفْسِہٖ ضَرًّا وَّلَانَفْعًا وَّلَا مَوْتًا وَّلَا حَیٰوۃً وَّلَا نُشُوْرًا۔ (ترجمہ: نہ وہ اپنے نفس کو ضرر دے سکتا ہے، نہ نفع، نہ موت اور نہ زندگی اور دوبارہ زندہ ہونا)۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لَاشَیْءٌ اَشَدُّ عَلٰی اِبْلِیْسَ مِنْ نَوْمِ الْعَاصِی فَاِذَا نَامَ الْعَاصِی یَقُوْلُ مَتٰی یَنْتَبِہُ وَ یَقُوْمُ حَتّٰی یَعْصِیَ اللّٰہَ۔ (ترجمہ: شیطان پر گناہ گار کے سونے سے کوئی چیز زیادہ سخت نہیں۔ پس جب گناہ گار سو جاتا ہے تو شیطان کہتا ہے کب بیدار ہوگا اور اُٹھ کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا)۔ اس مسئلے میں حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا علی بن سہل اصفہانی رحمتہ اللہ علیہ سے اختلاف ہے۔ اس کے متعلق بہت عمدہ خط ہے، جو علی بن سہل رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کی طرف لکھا ہے اور وہ سب اُمت میں مقبول ہے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ علی بن سہل رحمتہ اللہ علیہ اس خط میں فرماتے ہیں کہ خواب غفلت اور آرام ہے اور محبّ کو غفلت اور آرام سے اعراض لازم ہے اور حق کے دوست کو رات دن اور آرام نہ چاہیے، کیونکہ وہ اس حالت میں رہے گا تو اپنے مقصود کو کھو دے گا اور اپنی ہستی اور اپنے حال سے غافل ہوجائے گا اور حق تعالیٰ تک پہنچنے سے رہ جائے گا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیج کر فرمایا: یَادَاوٗدُ كَذَبَ مَنِ ادَّعٰی مَحَبَّتِیْ فَاِذَا جَنَّہُ اللَّیْلُ نَامَ عَنِّیْ۔ (ترجمہ: اے داؤد! اس شخص نے میری محبت کا جھوٹا دعویٰ کیا کہ جب رات ہوئی تو سوگیا اور میرے ذکر سے غافل ہوگیا)۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ اس کے جواب میں یوں فرماتے ہیں: "جاننا چاہیے کہ

ہماری بیداری حق تعالےٰ کے راستے میں ہمارا عمل ہے اور ہمارا خواب ہم پر اللہ تعالےٰ کا فعل ہے۔ پس جو کچھ ہمارے اختیار کے بغیر ہم سے ہوتا ہے، وہ اس سے زیادہ کامل ہوتا ہے جو ہمارے اختیار سے ہوتا ہے۔" وَالنَّوْمُ مَوْهِبَةٌ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى عَلَى الْمُحِبِّيْنَ۔ (ترجمہ: اور نیند محبانِ الٰہی پر اللہ تعالےٰ کی بخشش ہے)۔ اس مسئلے کا تعلق ہوشیاری اور بے ہوشی سے ہے، اور اس کے متعلق کلام پورے طور پر بیان ہو چکا ہے، لیکن تعجب ہے کہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ صاحبِ صحو مرد تھے، وہ یہاں سکر کی تعریف فرما رہے ہیں وہ البتہ اس وقت مغلوب الحال ہوں گے اور وہ حال ان کی زبان سے بول رہا ہوگا۔ نیز روا ہے کہ اس کے برعکس ہو کیونکہ نیند خود عین بیداری ہوتی ہے اور بیداری عین مدہوشی، اس لیے کہ نیند آدمی کی صفت ہے اور جب تک آدمی اپنے اوصاف کی تاریکی میں رہتا ہے، وہ بیداری کی طرف منسوب ہوتا ہے اور نہ سونا حق تعالےٰ کی صفت ہے اور جب آدمی حق تعالیٰ کی صفت کی تاریکی میں ہوتا ہے، بے ہوشی سے منسوب اور مغلوب ہوتا ہے۔ میں نے مشائخ کے ایک گروہ کو دیکھا ہے جو حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے موافق خواب کو بیداری پر فضیلت دیتے تھے، کیونکہ اولیاء، بزرگوں اور پیغمبروں کا مکاشفہ اور الہام زیادہ خواب میں ہی ہوا ہے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يُبَاهِى بِالْعَبْدِ الَّذِىْ نَامَ فِىْ سُجُوْدِهٖ وَ يَقُوْلُ اللّٰهُ لِلْمَلَائِكَةِ انْظُرُوْا اِلٰى عَبْدِىْ رُوْحُهٗ فِىْ مَحَلِّ النَّجْوٰى وَ بَدَنُهٗ عَلٰى بِسَاطِ الْعِبَادَةِ۔ (ترجمہ: خداوند تعالےٰ اُس بندے پر فخر کرتا ہے جو سجدے میں سو جائے اور فرشتوں سے فرماتا ہے کہ میرے اس مومن بندے کی طرف دیکھو جس کی جان میرے ساتھ راز گوئی میں لگی ہے اور اس کا جسم عبادت کے فرش پر ہے)۔ نیز پیغمبر ﷺ نے فرمایا: مَنْ نَامَ عَلَى الطَّهَارَةِ يَاْذَنُ لِرُوْحِهٖ اَنْ يَّطُوْفَ بِالْعَرْشِ وَيَسْجُدَ لِلّٰهِ تَعَالٰى۔ (ترجمہ: جو باوضو سو جائے اس کی جان کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ عرش کا طواف کرے اور اللہ تعالےٰ کو سجدہ کرے)۔ حکایات میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ شاہ شجاع کرمانی رحمتہ اللہ علیہ چالیس سال تک مسلسل بیدار رہے۔ جب ایک رات سو گئے تو حق تعالےٰ کو خواب میں دیکھا کہ اس کے بعد آپ ہمیشہ اسی کی اُمید پر سویا کرتے۔ اسی معنی میں قیس عامری کہتا ہے:

وَاِنِّىْ لَاَسْتَنْعِسُ وَمَالِىْ نَعِيْسَةٌ
لَعَلَّ خِيَا لًامِّنْكِ يَلْقٰى خِيَالِيَا

(گو مجھے نیند نہیں آتی لیکن میں یقیناً ابھی ابھی سو جاؤں گا، اس لیے کہ شاید اس سونے میں تیرا خیال میرے دل سے آملے)۔

میں نے ایک گروہ کو دیکھا ہے جو علی بن سہل رحمتہ اللہ علیہ کی طرح بیداری کو خواب پر ترجیح دیتے تھے۔ اس لیے کہ رسولوں کی وحی اور اولیاء کی کرامات کا تعلق بیداری سے ہوا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ لَوْ كَانَ فِى النَّوْمِ خَيْرًا لَكَانَ فِى الْجَنَّةِ نَوْمٌ۔ (ترجمہ: اگر خواب میں کوئی بھلائی ہوتی تو جنت میں نیند ہوتی) چونکہ بہشت میں نہ حجاب ہوگا اور نہ خواب، اس لیے معلوم ہوا کہ خواب حجاب ہے اور اہل لطائف کہتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام بہشت میں سو گئے تو حضرت حوا علیہا السلام آپ کے بائیں پہلو سے پیدا ہوئیں اور ان کی ساری مصیبتیں حضرت حوا علیہا السلام کی وجہ سے تھیں۔ نیز کہتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: يٰبُنَىَّ اِنِّىْ اَرٰى فِى الْمَنَامِ اَنِّىْ اَذْبَحُكَ۔ (ترجمہ: اے میرے بیٹے! میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ میں تجھے اللہ کی راہ میں ذبح کر رہا ہوں) تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے کہا: هٰذَا جَزَاءُ مَنْ نَامَ عَنْ حَبِيْبِهٖ لَوْ لَمْ تَنَمْ لَمَا اُمِرْتَ بِذَبْحِ الْوَلَدِ۔ (ترجمہ: یہ اس شخص کی جزا ہے جو اپنے دوست سے غافل ہو کر سو جائے، اگر آپ نہ سوتے تو آپ کے بیٹے کے ذبح کرنے کا حکم نہ دیا جاتا)۔ پس آپ کی نیند

نے آپ کو اپنے بیٹے سے محروم کر دیا اور مجھے میری جان سے، لیکن میرا درد تو ایک ساعت رہے گا اور آپ کا درد ہمیشہ کے لیے۔ حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ رات نمکین پانی کا ایک کٹورا مع سلائی کے اپنے پاس رکھ لیتے، جب سونے لگتے تو سلائی اس میں ڈبو کر آنکھ میں لگا لیتے تاکہ نیند نہ آئے۔

میں (علی بن عثمان جلابیؒ) نے ایک بزرگ کو دیکھا جو بخار میں رہتے تھے۔ چالیس سال تک وہ رات کو نہیں سوئے تھے، البتہ دن میں تھوڑا سا سو جاتے تھے اور اس مسلے کا مآل یہ ہے کہ جب کسی شخص کو موت، زندگی سے زیادہ پسند ہو تو وہ نیند کو بیداری سے زیادہ پسند کرے گا اور جب کسی کو زندگی، موت سے زیادہ پسند ہو تو اس کے نزدیک بیداری نیند سے زیادہ پسندیدہ ہو گی۔ پس اس بات کی کچھ وقعت نہیں کہ وہ تکلف سے بیدار رہے بلکہ وقعت اس بات کی ہے کہ اسے بیدار رکھے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالےٰ نے برگزیدہ کر دیا اور اعلےٰ درجے پر پہنچا دیا تو آپ نے نہ سونے میں تکلف کیا نہ بیداری میں۔ چنانچہ آپ کو حکم الٰہی ہوا: قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا نِّصْفَہٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلًا۔ (ترجمہ: آپ رات کو عبادت میں قیام کیجئے مگر تھوڑا حصہ رات کا یعنی آدھی رات یا اس سے کچھ کم) اور اس امر کی بھی کچھ وقعت نہیں کہ تکلف سے سو جائے بلکہ وقعت اس بات کی ہے کہ اسے خود قضا و قدر سلا دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کو برگزیدہ کر لیا اور اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا اور کفر کا لباس اُن کی گردن سے اتار لیا تو انہوں نے نہ سونے میں تکلف کیا نہ بیداری میں، یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے ان پر نیند طاری کی اور ان کے اختیار کے بغیر ان کی پرورش فرمائی۔ چنانچہ ان کی نسبت فرمایا: وَتَحْسَبُہُمْ اَیْقَاظًا وَّہُمْ رُقُوْدٌ وَّنُقَلِّبُہُمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ۔ (ترجمہ: اور تم ان کو بیدار سمجھو گے حالانکہ وہ سو رہے ہیں اور ہم ان کو دائیں اور بائیں پہلو پر کروٹیں بدلتے رہتے ہیں) اور یہ دونوں حالتیں ان کی بے اختیاری کی تھیں۔ غرض یہ کہ جب بندہ ایسے درجے پر پہنچ جائے کہ اس کا اختیار ختم ہو جائے، اس کا ہاتھ سب سے منقطع ہو جائے اور اس کا دل غیر سے اعراض کرے تو وہ سوئے یا بیدار رہے، جس صفت میں بھی وہ ہو، عزیز ہوتا ہے۔ پس مرید کے لیے سونے کی شرط یہ ہے کہ اپنی نیند کی ابتدا کو اپنی عمر کے آخری وقت کی طرح سمجھے، گناہوں سے توبہ کرے، اپنے سے مخالف اور ناراض لوگوں کو خوش کرے، اچھی طرح طہارت کرے اور داہنے ہاتھ پر قبلہ رُخ ہو کر سوئے، دنیا کے کام ٹھیک کر کے اسلام کی نعمت کا شکر ادا کرے اور یہ عہد کر لے کہ اگر بیدار ہوں گا تو گناہوں کا ارتکاب نہ کروں گا۔ پس جس شخص نے بیداری میں اپنا کام کر لیا ہو، اس کو نیند یا موت سے کوئی خوف نہیں ہے۔ حکایات میں مشہور ہے کہ کوئی بزرگ ایک امام کے پاس، جو جاہ و ثروت اور نفس کی سرکشی میں مبتلا تھا، آتا تھا اور کہتا تھا: "اے فلاں! مرنا چاہیے۔" اس امام کو اس بات سے دل میں بڑا رنج ہوتا تھا کہ یہ گدا اگر ہر وقت مجھ سے یہی بات کہتا ہے۔ ایک دن اس نے کہا: "میں کل خود ہی پہل کر کے کہوں گا۔" چنانچہ جب دوسرے روز وہ بزرگ آیا تو اس امام نے اس سے کہا کہ "اے فلاں! مرنا چاہیے۔" اس بزرگ نے مصلیٰ نیچے بچھایا اور اس پر سر رکھا اور کہنے لگا کہ "میں مر گیا۔" اسی وقت اس کی جان نکل گئی۔ اس امام کو اس سے تنبیہ ہوئی اور جانا کہ یہ بزرگ مجھے فرماتا تھا کہ موت کا اس طرح ارادہ کرنا چاہیے، جیسا کہ میں نے کیا ہے۔ میرے شیخ رحمتہ اللہ علیہ مریدوں کو اس بات کی تاکید کرتے تھے کہ نیند کے غلبہ کے سوا نہ سوؤ اور جب بیدار ہو جاؤ تب بھی نہ سوؤ کہ دوسری دفعہ سونا حق کے مریدوں کو حرام ہے۔ نیند اور بیکاری بندے کو سست اور فراموشی کی بیماری میں مبتلا کر دیتی ہے اور اس موضوع پر بزرگانِ دین طریقت نے بہت طویل اور عمدہ بحث کی ہے، واللہ اعلم۔

تیسواں باب

آدابِ کلام و خاموشی

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے: وَ مَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَی اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا۔ (ترجمہ: اچھی بات میں اس شخص سے بڑھ کر کون اچھا ہے، جس نے اللہ کی طرف دعوت دی اور نیک عمل کیا) نیز فرمایا: قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ (نیک بات کہنی چاہیے) نیز فرمایا: قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا۔ (ترجمہ: زبان سے کہو کہ ہم ایمان لائے)۔ جاننا چاہیے کہ حق تعالےٰ نے اپنے بندوں کو نیک اور اچھے کلام کرنے کا اسی طرح حکم دیا ہے جس طرح کہ اس کی ربوبیت کا اقرار کرنا، اس کی صفت و ثنا کرنا اور خلقت کو اس کی درگاہ کی طرف بلانا۔ گویا حق تعالےٰ کی طرف سے بندے کے لیے ایک بہت بڑی اور بھاری نعمت ہے اور آدمی اسی کی وجہ سے دوسری چیزوں سے ممتاز ہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے: وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ۔ (ترجمہ: ہم نے آدم علیہ السلام کی اولاد کو بزرگی عطا فرمائی ہے)۔ مفسرین کے قول کے مطابق لفظ کرمنا کا مطلب گویائی عطا کرنا ہے۔ پس جس قدر گویائی حق تعالےٰ کی طرف سے بندے کے لیے ایک بڑی نعمت ہے، اسی قدر اس کی خرابی بھی بہت بڑی ہے، کیونکہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: اَخْوفُ مَا اَخَافُ عَلٰی اُمَّتِیْ اللِّسَانُ۔ (ترجمہ: وہ چیز جس کی نسبت میں اُمت کے بارے میں سب چیزوں سے زیادہ ڈرتا ہوں، وہ زبان ہے)۔ الغرض کلام شراب کی طرح ہے کہ جو عقل کو مست کر دیتا ہے اور آدمی جب اس کے پینے میں پڑ جاتا ہے تو اس سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنے آپ کو اس سے روک نہیں سکتا۔ جب اہل طریقت کو معلوم ہو گیا کہ بولنا ایک آفت ہے تو انہوں نے سوائے ضرورت کے کلام نہ کیا اور جو کلام کیا اس کی ابتدا و انتہا پر نگاہ ڈالی۔ اگر کلام حق کے لیے تھا تو انہوں نے اس کو منہ سے نکالا ورنہ خاموش رہے، کیونکہ ان کا اعتقاد تھا کہ اللہ تعالےٰ اسرار کو جاننے والا ہے اور بدبخت ہیں وہ لوگ جو اللہ تعالےٰ کو ایسا نہیں جانتے، جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے: اَمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰهُمْ بَلٰی وَرُسُلُنَا لَدَیْهِمْ یَکْتُبُوْنَ۔ (ترجمہ: کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور راز دارانہ گفتگو کو نہیں سنتے؟ کیوں نہیں، ہم سنتے ہیں (ہمارے فرشتے لکھتے بھی ہیں)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنْ صَمَتَ نَجَا۔ (ترجمہ: جو خاموش رہا، وہ نجات پا گیا)۔

پس خاموشی میں بہت سے فائدے اور کشائشیں ہیں اور بولنے میں نسبتاً بہت سی خرابیاں ہیں۔ مشائخ کا ایک گروہ خاموشی کو بولنے پر فضیلت دیتا ہے اور ایک گروہ بولنے کو خاموشی پر ترجیح دیتا ہے اور ان میں سے حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ الفاظ اور عبارتیں سب دعویٰ ہیں اور جہاں حقیقتوں کو ثابت کرنا ہو، وہاں دعویٰ بے کار ہے اور ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ اختیار کی حالت میں بندہ قول کے ساقط ہو جانے سے معذور سمجھا جاتا ہے جیسے تقیہ اور کسی خوف کے وقت جو بولنے پر باوجود اختیار و قدرت رکھنے کے آدمی سے قول ساقط ہو جاتا ہے اور خوف نہ بولنے کا عذر ہو جاتا ہے اور بولنے سے انکار کرنا معرفت کی حقیقت کے لیے نقصان نہیں دیتا اور کسی وقت بندہ بغیر معنی کے محض دعویٰ سے معذور نہیں ہوتا اور اس کا حکم منافقوں کا سا حکم ہے۔ پس دعویٰ بلا حقیقت منافقت ہے اور حقیقت بغیر دعویٰ کے اخلاص ہے۔ لاَنَّ مَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی بَیَانٍ لَا یَسْتَغْنِیْ عَنِ اللِّسَانِ وَ مَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی عَیَانٍ

اسْتَغْنٰی فِیْمَا بَیْنَہٗ وَ بَیْنَ رَبِّہٖ مِنَ اللِّسَانِ۔ (ترجمہ: جس نے اپنی بنیاد بیان پر قائم کی، وہ زبان سے مستغنی نہیں ہو سکتا اور جس نے مشاہدے پر اپنے کلام کی بنیاد رکھی، وہ اس راز کے متعلق جو خود اس کے اور اس کے رب کے درمیان ہے، زبان سے مستغنی ہے) یعنی جب بندہ پر راہ کھول دی جاتی ہے تو بولنے سے مستغنی ہو جاتا ہے کیونکہ بیان کرنا غیر کو خبر دینے کے لیے ہے اور حق جل جلالہٗ حالات کے بیان کرنے سے بے نیاز ہے اور اس کے سوائے اور کوئی اس لائق نہیں ہے جس سے مشغول ہونا لازم ہو۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے بھی اس کی تاکید ہوتی ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے: مَنْ عَرَفَ اللّٰہَ، کَلَّ لِسَانَہٗ۔ (ترجمہ: جس نے خدا کو دل سے پہچان لیا، اس کی زبان گنگ ہوگئی) کیونکہ مشاہدے میں بیان کرنا حجاب معلوم ہوتا ہے۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں یکایک اٹھے اور بآواز بلند نعرہ لگا کر کہا یَامُرَادِیْ۔ (ترجمہ: اے میری مراد) اور اس لفظ سے اشارہ حق تعالےٰ کی طرف کیا تو حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "اے ابوبکر! اگر تیرا مقصود اس سے حق تعالےٰ ہے تو تو نے بآواز بلند یہ نعرہ کیوں لگایا؟ کیونکہ وہ اس سے بے نیاز ہے اور اگر تیرا مقصود وہ نہیں تو تو نے خلاف کیوں کیا؟ کیونکہ حق تعالےٰ تیری بات کو جانتا ہے۔" شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قول سے توبہ کی اور وہ گروہ جو کلام کو خاموشی پر فضیلت دیتا ہے، کہتا ہے کہ اپنے احوال کے بیان کرنے کا حق تعالےٰ کی طرف سے ہمیں حکم ہے تاکہ دعوےٰ حقیقت پر قائم ہو، کیونکہ اگر کوئی شخص ہزار سال اپنے دل سے اور باطن سے عارفِ الٰہی ہو اور کوئی ضرورت اس کو روکنے والی نہ ہو تو جب تک معرفت کے ساتھ اقرار نہ کرے، اس کا حکم کافروں کا سا ہوگا اور خداوند تعالےٰ نے سب مسلمانوں کو اس کی نعمتوں اور نوازشات پر شکر اور حمد و ثنا کا حکم دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ (ترجمہ: لیکن اپنے رب کی نعمت بیان کر) اور اس کی نعمتوں پر شکر اور حمد و ثنا کلام ہی ہے۔ پس ہمارا بولنا اللہ تعالےٰ کے حکم کی تعمیل و تعظیم ہے اور اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے: اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ (ترجمہ: مجھے پکارو، میں تمہاری پکار کو قبول کروں گا) نیز فرمایا: اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ (ترجمہ: میں پکارنے والے کی دعوت کا جواب دیتا ہوں، جب وہ مجھے پکارتا ہے) اور ایسی ہی بے شمار آیتیں ہیں جو ہمیں بولنے کا حکم دیتی ہیں۔ ایک شیخ فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے حال کو بیان نہیں کر سکتا اُسے صحیح حال ہی نصیب نہیں ہوتا کیونکہ تیرے حال کو بیان کرنے والا خود تیرا حال ہی ہے، چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:

لِسَانُ الْحَالِ اَفْصَحُ مِنْ لِّسَانِیْ وَ صَمْعِیْ عَنْ سُؤَالِیْ تَرْجُمَانِیْ

(ترجمہ: حال کی زبان میرے جسم کی زبان سے زیادہ فصیح ہے اور میری خاموشی میرے سوال کی ترجمان ہے)۔

میں نے حکایات میں یہ پڑھا ہے کہ ایک روز حضرت ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ بغداد کے محلّہ کرخ میں جا رہے تھے۔ اس اثنا میں آپ نے طریقت کے مدعیوں میں سے ایک شخص کو دیکھا جو کہہ رہا تھا۔ اَلسَّکُوْتُ خَیْرٌ مِّنَ الْکَلَامِ فَقَالَ شِبْلِیْ سَکُوْتُكَ خَیْرٌ مِّنْ کَلَامِكَ۔ لِاَنَّ کَلَامَكَ لَغْوٌ وَّ سَکُوْتُكَ هَزْلٌ وَ کَلَامِیْ خَیْرٌ مِّنْ سُکُوْتِیْ لِاَنَّ سَکُوْتِیْ حِلْمٌ وَّ کَلَامِیْ عِلْمٌ۔ (ترجمہ: خاموشی کلام سے بہتر ہے یہ سن کر حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: تیرا خاموش رہنا تیرے کلام کرنے سے بہتر ہے کیونکہ تیرا کلام فضول اور خاموشی بے ہودہ ہے اور میرا کلام کرنا خاموش رہنے سے بہتر ہے کیونکہ میری خاموشی بردباری ہے اور میرا کلام علم ہے)۔ مطلب یہ کہ اگر میں نہ بولوں تو اس

کی وجہ میرا حلم ہے اور اگر بولوں تو اس کی وجہ میرا علم ہے، جب کچھ نہیں بولتا تو حلیم ہوتا ہوں اور بولتا ہوں تو علیم۔ میں علی بن عثمان جلابیؒ کہتا ہوں کہ کلام بھی دو قسم کا ہوتا ہے اور سکوت بھی دو قسم کا۔ ایک کلام تو حق ہوتا ہے، دوسرا باطل اور اسی طرح ایک سکوت تو مقصود کے حاصل ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے اور دوسرا سکوت غفلت کی وجہ سے۔ پس بولنے اور خاموش رہنے کے وقت ہر ایک شخص کو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہیے۔ اگر اس کا کلام حق ہے تو اس کا بولنا خاموشی سے بہتر ہے اور اگر باطل ہے تو اس کی خاموشی بولنے سے بہتر اور اگر اس کی خاموشی حجاب غفلت کی وجہ سے ہے تو اس کا بولنا خاموشی کی نسبت بہتر ہے اور اگر حصول مقصود کے سبب سے ہے تو اس کی خاموشی بولنے سے بہتر ہے۔

خلاصہ یہ کہ اور مدعیوں کا ایک گروہ جنہوں نے چند فضول اور خواہش نفسانی کی باتیں اور کچھ معنی سے خالی عبارتیں سامنے رکھ لی ہیں، وہ کہتے کہ ہمارا بولنا خاموشی سے بہتر ہے، اور جاہلوں کا ایک گروہ جو انتہائی جہالت کے باعث منارہ کو کوئیں سے تمیز نہیں کر سکتے، کہتے ہیں کہ خاموشی بولنے سے بہتر ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کی مانند ہیں۔ پس کس کو بولنے دیں اور کس کو خاموش رہنے دیں۔ اَلَا مَنْ نَطَقَ اَصَابَ اَوْ غَلَطَ وَ مَنْ اُنْطِقَ عُصِمَ مِنَ الشَّطَطِ۔ (ترجمہ: سنو جو خود بولتا ہے وہ یا تو صحیح بولتا ہے یا غلط لیکن جس کو قضا و بدر بلاتے ہیں، وہ خطا سے محفوظ رہتا ہے) چنانچہ شیطان لعین خود بولا اور یوں کہا: اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ۔ (ترجمہ: میں آدم علیہ السلام سے بہتر ہوں) اور آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بولنے کا حکم دیا تو آپ نے کہا: رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا۔ (ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا) پس طریقت کی طرف دعوت دینے والے اپنے بولنے پر مامور اور مجبور ہوتے ہیں اور خاموشی میں شرگیں اور بے بس ہوتے ہیں: مَنْ کَانَ سُکُوْتُہٗ حَیَاءً کَانَ کَلَامُہٗ حَیٰوۃٍ۔ (ترجمہ: جس کی خاموشی حیا کی وجہ سے ہے، اس کا کلام دلوں کے لیے حیات بخش ہے) اس لیے کہ ان کا کلام دیدارِ الٰہی کی وجہ سے ہوتا ہے اور کلام دیدارِ الٰہی کے بغیر ان کے نزدیک ذلیل و خوار ہے اور جب وہ باہوش ہوتے ہیں تو نہ کہنے کو کہنے سے زیادہ پسند کرتے ہیں اور جب مدہوش اور اپنے سے غائب ہوتے ہیں تو لوگ ان کے قول کو اپنی جان پر لکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس بزرگ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: مَنْ کَانَ سُکُوْتُہٗ لَہٗ ذَھَبًا کَانَ کَلَامُہٗ لِغَیْرِہٖ مُذَھِّبًا۔ (ترجمہ: جس کی خاموشی خود اس کے لیے سونا ہوتی ہے، اس کا کلام غیر کے لیے سونا بنانے والی کیمیا ہوتا ہے)۔ پس چاہیے کہ طالبِ حق اس زبان کو جو بندگی میں لگی ہوئی ہے خاموش کر دے، یہاں تک کہ وہ زبان جو ربوبیت الٰہی کے اقرار میں گویا ہے، بولنے والی ہو جائے اور اس کا بیان مریدوں کا شکار کرنے والا۔ کلام کے آداب یہ ہیں کہ بے امر الٰہی نہ بولے اور سوائے امر حق کے نہ کہے اور خاموشی کے آداب یہ ہیں کہ خاموش رہنے والا جاہل نہ ہو، جہالت پر راضی نہ ہو اور غافل بھی نہ ہو۔ مرید کو چاہیے کہ رہنماؤں کے کلام میں دخل نہ دے اور اس میں کچھ تصرف نہ کرے، پریشان اور اوپری عبارت استعمال نہ کرے اور جس زبان سے کہ اس نے شہادت دی اور توحید کا اقرار کیا ہے اس سے جھوٹ اور غیبت نہ کرے، کسی مسلمان کو رنجیدہ نہ کرے اور درویشوں کو محض نام سے نہ پکارے، جب تک اس سے نہ پوچھا جائے، کچھ نہ کہے اور خود بولنے کی ابتدا نہ کرے اور درویش کی خاموشی کی شرط یہ ہے کہ باطل پر خاموش نہ رہے اور بولنے کی شرط یہ ہے کہ سوائے حق کے اور کوئی بات نہ کہے۔ اس اصل کی فرعیں بہت اور باریکیاں بے شمار ہیں لیکن میں نے اسی پر اکتفا کیا ہے تاکہ کتاب لمبی نہ ہو جائے، وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

اکتیسواں باب

سوال اور اس کے ترک کے آداب

اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے: لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا۔ (ترجمہ: وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے) اور جب ان سے کوئی سوال کرے تو وہ روکتے نہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام کو فرمایا:
وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ۔ (ترجمہ: سوال کرنے والے کو مت جھڑکیے)۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے حق تعالےٰ کے سوا کسی سے سوال نہ کریں اور اس کے سوا غیر کو حاجت روانہ سمجھیں، کیونکہ سوال کرنا حق تعالےٰ کے غیر کی طرف رُوگردانی کرنا ہے اور جب بندہ حق تعالیٰ سے رُوگردانی کرے تو خطرہ ہے کہ اللہ تعالےٰ بھی اس سے رُوگردانی کرے۔

میں نے سنا ہے کہ ایک دُنیادار شخص نے حضرت رابعہ عدویہ رحمہا اللہ سے کہا کہ "اے رابعہ! مجھ سے مانگ تاکہ میں تری مراد حاصل کروں۔" انہوں نے فرمایا: "اے فلاں! مجھے تو دنیا کے خالق سے بھی دنیا مانگتے ہوئے شرم آتی ہے۔ تو کیا مجھے شرم نہیں آئے گی کہ ایک شخص سے دنیا کی کوئی چیز مانگوں؟" کہتے ہیں کہ ابو مسلم کے زمانے میں ایک صاحبِ دعوت اور خدارسیدہ درویش کو بے گناہ چوری کی تہمت میں گرفتار کر لیا اور اسے جیل خانے میں قید کر دیا۔ جب رات ہوئی تو ابو مسلم نے پیغمبر ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرما رہے ہیں کہ "اے ابو مسلم! مجھے خداوند تعالےٰ نے تیری طرف بھیجا ہے کہ میرا ایک دوست بے جرم تیرے قید خانہ میں ہے، تو اُٹھ اور اسے رہائی دے۔" ابو مسلم خواب سے چونک پڑا اور ننگے سر، ننگے پاؤں جیل خانے پہنچ کر حکم دیا کہ دروازہ کھولیں۔ خادموں نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے درویش کو باہر نکال کر اس سے معافی مانگی اور کہا کہ "کچھ ضرورت ہو تو فرمائیں۔" درویش نے کہا: "اے امیر! جو شخص ایسا مالک رکھتا ہے کہ آدھی رات کو ابو مسلم کو بستر پر سے اُٹھا کر بھیجتا ہے تاکہ وہ اس کو مصیبت سے رہائی دلائے، کیا اس کے لیے روا ہے کہ وہ دوسرے سے سوال کرے اور حاجت مانگے؟" ابو مسلم رونے لگے اور درویش چلا گیا۔

ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ درویش کو روا ہے کہ لوگوں سے سوال کرے، کیونکہ خداوند تعالےٰ یہ نہیں کہتا لَا یَسْئَلُوْنَ اَلْبَتَّۃَ۔ (ترجمہ: بالکل سوال ہی نہ کریں)، بلکہ وہ فرماتا ہے کہ سوال کرو لیکن اس پر ضد نہ کرو اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنے اصحاب کی ضروریات کے لیے سوال کیا ہے اور ہم کو بھی فرمایا ہے۔ اُطْلُبُوْا الْحَوَائِجَ عِنْدَ حِسَانِ الْوُجُوْہِ۔ (ترجمہ: اپنی حاجتیں نیک صورت میں لوگوں سے طلب کرو)۔ دوسرے مشائخ نے تین صورتوں میں سوال کو جائز رکھا ہے۔ اوّل، دل کی فراغت کے لیے ضروری ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ دو روٹی کی یہ قیمت نہیں سمجھتے کہ رات دن اسی کے انتظار میں گزار دیں اور اس لاچاری کی حالت میں اللہ تعالےٰ کے حضور میں اور کوئی حاجت ہی نہ ہو کیونکہ کھانے اور اس کے انتظار سے زیادہ اور کوئی حق تعالےٰ سے روکنے والا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شفیق رحمۃ اللہ علیہ کے مرید سے، جو ان کی زیارت کے لیے آیا ہوا تھا، حضرت شفیق رحمۃ اللہ علیہ کے حال کی نسبت پوچھا تو مرید نے عرض کیا کہ "آپ خلقت سے فارغ ہو کر توکل کے حکم پر بیٹھے ہوئے ہیں۔" اس پر حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "جب تو لوٹ کر واپس جائے تو ان سے کہہ دینا کہ

آئندہ اللہ تعالےٰ کو دوروٹی کے لیے نہ آزمایا کرے، جب بھوکا ہو تو دوروٹی اپنے ہم جنسوں سے مانگ لیا کرے اور توکل کی کتاب کو ایک طرف رکھ دے تاکہ وہ شہر اور ملک اس کے عمل کی نحوست سے زمین میں نہ دھنس جائے۔"

دوسروں نے نفس کی ریاضت کے لیے سوال کو جائز قرار دیا ہے تاکہ اس کی ذلت جھیلیں اور اس کا رنج دل پر رکھیں اور اپنی قیمت معلوم کریں کہ دوسروں کی نظروں میں ان کی کیا قدر و قیمت ہے اور اس طرح وہ تکبر سے بچ جائیں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا تھا: "اے ابوبکر! تیرے سر میں اس بات کا غرور بھرا ہوا ہے کہ میں خلیفہ اور سامرہ کے امیر کے دربانوں کے سردار کا لڑکا ہوں، پس تجھ سے اس وقت تک کوئی کام نہیں ہو سکے گا جب تک کہ تو بازار میں نہ نکلے اور جسے دیکھے اس سے سوال نہ کرے تاکہ تجھے اپنی قیمت معلوم ہو جائے۔" آپ نے ایسا ہی کیا۔ یہاں تک کہ چھ سال میں اس درجے تک پہنچ گیا کہ سارے بازار میں آپ نے گشت کیا اور کسی نے آپ کو کچھ نہ دیا۔ آپ واپس آگئے اور حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا تو آپ نے فرمایا: "اے ابوبکر! اب تو نے اپنی قیمت معلوم کر لی ہے کہ لوگوں کے نزدیک تیری کچھ قیمت نہیں، لہٰذا دل ان لوگوں میں نہ لگا اور ان کو کسی قیمت پر بھی اختیار نہ کرو اور یاد رکھو کہ یہ بات محض ریاضت نفس کے لیے تھی، نہ کہ کسب معاش کے لیے۔"

ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: میرا ایک دوست تھا جو میرے موافق تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے حضور میں بلالیا اور دنیا کی تکلیف سے نکال کر عقبیٰ کی نعمت پر پہنچا دیا۔ میں نے اسے خواب میں دیکھ کر پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اس نے کہا: اس نے مجھے بخش دیا۔ میں نے کہا کہ کس خصلت کی وجہ سے؟ اس نے کہا کہ اللہ تبارک و تعالےٰ نے مجھے کھڑا کر کے فرمایا: "اے میرے بندے! تو نے کمینوں اور بخیلوں سے بہت ذلت اور رنج اٹھایا، ان کے آگے ہاتھ دراز کیا اور اس پر صبر کیا۔ میں نے تجھے اس وجہ سے بخش دیا ہے۔"

تیسرے حق تعالےٰ کی حرمت و عظمت کے لیے لوگوں سے سوال کرنے کو جائز قرار دیا ہے اس لیے کہ دنیا کے سب احوال اللہ تعالےٰ ہی کے ہیں اور لوگ صرف ان کے وکیل و نگران ہیں۔ پس جو چیز نفس کے لیے ضروری ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے اموال کے نگران وکیل سے طلب کرتے ہیں اور اپنی حاجت اس کے پاس لے جاتے ہیں اور وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کے کسی وکیل سے کوئی چیز طلب کرتا ہے، ادب اور اطاعت میں اس شخص سے زیادہ ہے جو کوئی چیز خود اللہ تعالےٰ سے طلب کرتا ہے۔ پس ان کا غیر سے سوال کرنا حق تعالےٰ کے حضور اور اس کی طرف توجہ کرنے کی علامت ہے نہ کہ اس سے غیبت اور رُوگردانی کی۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ یحییٰ بن معاذ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی ایک لڑکی تھی۔ ایک دن اس نے اپنی ماں سے کہا: مجھے "فلاں چیز چاہیے۔" اس کی ماں نے کہا کہ "خدا سے مانگ۔" اس نے کہا: "اماں جان! مجھے شرم آتی ہے کہ اپنی نفسانی ضروریات اس سے طلب کروں اور جو کچھ آپ مجھے دیں گی، وہ بھی اسی کا مال ہے اور میرے لیے مقدر ہے۔"

پس سوال کے آداب یہ ہیں کہ اگر سوال سے مقصود حاصل نہ ہو تو تو اس سے زیادہ خوشی محسوس کر جو مقصود حاصل ہونے کی صورت میں حاصل ہوتی ہے اور لوگوں کو درمیان میں نہ دیکھے۔ عورتوں اور بازاری لوگوں سے تو سوال نہ کر اور سوائے اس شخص کے کہ جس کے مال کے حلال ہونے پر تجھے یقین ہے، اپنی حاجت کسی اور شخص پر ظاہر نہ کر

اور جہاں تک ہو سکے اپنی ضرورت کے مطابق سوال کر، آرائش اور خانہ داری کا سامان اور ملکیت نہ بنا اور صرف وقت کی ضرورت کا پابند ہو اور کل کی ضرورت کا خیال نہ کر تاکہ ہمیشہ کی تباہی میں گرفتار نہ ہو، خداوند تعالیٰ کو اپنی گدائی کا جال نہ بنا اور اپنی طرف سے پارسائی ظاہر نہ کر کہ پارسائی کی وجہ سے تجھے کچھ زیادہ دیں۔

میں نے ایک بزرگ کو دیکھا جو باحشمت صوفیوں میں سے تھے، وہ جنگل سے نکل کر فاقے کے مارے راستے کی تکلیف اٹھائے ہوئے کوفہ کے بازار میں ہاتھ پر ایک چڑیا رکھے ہوئے آئے اور وہ کہہ رہے تھے: "کون ہے جو اس چڑیا کے واسطے مجھے کچھ دے؟" لوگوں نے کہا: "اے فلاں! تو یہ کیا کہتا ہے؟" اس نے کہا: "یہ جائز نہیں ہے کہ میں یوں کہوں کہ خدا کے لیے مجھے کچھ دو۔" پس دنیا کے لیے ایک حقیر چیز کے سوا کسی چیز کو سفارشی نہیں لا سکتے۔ اس موضوع پر کلام کرنے کی کافی گنجائش ہے، لیکن طوالت کے خوف سے میں نے چند مختصر مگر ضروری امور کو بیان کیا، وَاللّٰہُ اَعْلَمُ۔
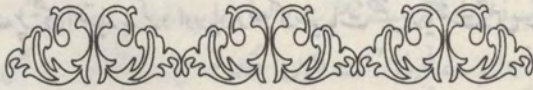
بتیسواں باب

نکاح کرنے اور مجرد رہنے کے آداب

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے: هُنَّ لِبَاسٌ[1] لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ۔ (ترجمہ: وہ (عورتیں) تم مردوں کے لیے لباس ہیں اور تم ان عورتوں کے لیے لباس ہو)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: تَنَاكَحُوا تَكْثُرُوا فَاِنِّیْ اُبَاهِیْ بِكُمُ الْاُمَمَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَ لَوْ بِالسَّقَطِ۔ (ترجمہ: تم آپس میں نکاح کرو تاکہ تم زیادہ ہو کیونکہ میں تمہاری کثرت کی وجہ سے قیامت کے دن سب اُمتوں پر فخر کروں گا، اگرچہ وہ اَدھورے بچے ہی سے ہو) نیز آپ نے فرمایا: اِنَّ اَعْظَمُ النِّسَاءِ بَرَكَةً اَقَلُهُنَّ مُؤْنَةً وَّ اَحْسَنُهُنَّ وُجُوْهًا وَ اَحْصَنُهُنَّ فُرُوْجًا۔ (ترجمہ: سب عورتوں سے زیادہ برکت والی عورت وہ ہے جو ان سب میں کم خرچ کرنے والی اور زیادہ خوبصورت اور زیادہ پاک دامن ہو)۔

صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ سب مردوں اور عورتوں کے لیے فی الجملہ نکاح مباح ہے اور اس شخص کے لیے جو حرام سے پرہیز نہ کر سکے، فرض ہے اور اس شخص کے لیے جو بال بچے کے حقوق ادا کر سکے، سنت ہے اور طریقت کے مشائخ میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ نکاح شہوت کو دفع کرنے کے لیے کرنا چاہیے اور کسب حلال دل کی فراغت کے لیے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ نکاح کرنا نسل کی افزائش کے لیے چاہیے تاکہ کوئی اولاد ہو اور جب اولاد ہو جائے تو اگر وہ باپ سے پہلے دنیا سے چل دے تو باپ کا شفیع ہو۔ اگر باپ اس سے پہلے دنیا سے رُخصت ہو جائے تو وہ اس کے حق میں دُعا گو رہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنت رسول اللہ ﷺ کی بیٹی، حضرت اُم کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی نسبت ان کے والد حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہٗ سے اپنے لیے درخواست کی تو انہوں نے فرمایا کہ وہ بہت ہی چھوٹی عمر کی ہے اور تم بوڑھے ہو اور میرا ارادہ ہے کہ میں اس کو اپنے بھتیجے عبداللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دوں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آدمی بھیجا کہ اے ابوالحسن! جہاں میں بڑی عمر والی عورتیں بہت ہیں اور میرا مقصد اُم کلثوم سے نکاح سے شہوت کا دفع کرنا نہیں بلکہ نسل کا ثابت رکھنا ہے کیونکہ میں نے پیغمبر ﷺ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: كُلُّ نَسَبٍ وَّ حَسَبٍ یَنْقَطِعُ بِالْمَوْتِ اِلَّا نَسَبِیْ وَ حَسَبِیْ وَ یُرْدِیْ كُلُّ سَبَبٍ وَ نَسَبٍ یَنْقَطِعُ اِلَّا سَبَبِیْ وَ نَسَبِیْ۔ (ترجمہ: ہر حسب اور نسب موت سے منقطع ہو جائے گا مگر میرا حسب و نسب منقطع نہیں ہو گا۔ ایک اور روایت میں ہے ہر سبب اور نسب منقطع ہو جائے گا مگر میرا سبب اور نسبت منقطع نہیں ہو گی) اب میرا سبب تو ہے مجھے اس کی ضرورت ہے کہ نسب بھی قائم رہے تاکہ میں دونوں طرفیں حضور ﷺ کی متابعت کی وجہ سے محکم کر دوں۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اُم کلثوم کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں دے دیا اور زید بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان ہی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: تُنْكَحُ النِّسَاءُ عَلٰے اَرْبَعَةٍ عَلَى الْمَالِ وَ الْحَسَبِ وَ الْحُسْنِ وَالدِّیْنِ فَعَلَیْكُمْ بِذَاتِ الدِّیْنِ فَاِنَّهٗ مَا

---

[1] لباس کے معنی پوشاک ہیں جو سردی و گرمی سے بچاتی ہے، چونکہ عورت مرد ایک دوسرے کو گناہ سے بچاتے ہیں اور ایک دوسرے کے عیوب کو ڈھانپتے ہیں، اس لیے ان کو لباس سے تشبیہ دی ہے۔

اسْتَفَاوَ امْرَاءٌ بَعْدَ الْاِسْلَامِ خَيْرًا مِّنْ زَوْجه مُّؤْمِنَةٍ مُوَافِقَةٍ يَسُرُّبِهَا اِذَ نَظَرَ اِلَيْهَا۔ (ترجمہ: عورتوں سے چار اعراض کے لیے نکاح کیا جاتا ہے: مال، حسب، حسن اور دین کے لیے۔ پس تمہارے لیے دین دار عورت سے نکاح کرنا لازم ہے، کیونکہ انسان اسلام کے بعد ایسی مومنہ اور مرضی کے مطابق بیوی کے سوا اور کسی چیز سے مستفید نہیں ہو سکتا کہ جب وہ اس کی طرف نظر کرے تو اس سے خوش ہو جائے) اور ایماندار آدمی دین میں اس عورت کی صحبت سے قوت، استحکام اور پاکیزگی حاصل کرتا ہے اور دنیا میں اس کی صحبت و رفاقت سے محبت، سعادت اور دوسری سرفرازیاں میسر آتی ہیں کیونکہ سب وحشتیں تنہائی میں ہوتی ہیں اور تمام راحتیں صحبت میں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اَلشَّيْطَانُ مَعَ الْوَاحِدِ۔ (ترجمہ: شیطان اکیلے آدمی کے ساتھ ہوتا ہے)۔ درحقیقت مرد یا عورت جب تنہا ہو تو اس کا ہم نشین شیطان ہوتا ہے اور وہ شہوت نفس کو اس کے دل کے سامنے پیش کرتا رہتا ہے اور کوئی صحبت دین کی حرمت اور حرام سے بچنے کے لیے میاں بیوی کی صحبت جیسی نہیں ہے، بشرطیکہ دونوں میں باہم مجانست اور موافقت ہو اور کوئی عذاب اور رنج ناموافق عورت سے صحبت و رفاقت کے سوا نہیں۔ پس درویش کو چاہیے کہ پہلے اپنے معاملے میں خوب سوچے اور مجرد رہنے اور نکاح کرنے کی خرابیوں کا دل میں تصور کرے تاکہ جس آفت کا دفع کرنا اس کے دل کے لیے آسان ہو، اس کی طرف توجہ دے۔ الغرض مجرد رہنے میں دو خرابیاں ہیں۔ ایک تو رسول اللہ ﷺ کی سنتوں میں سے ایک سنت کا ترک کرنا، دوسرے دل میں شہوت نفسانی کی پرورش کرنا اور حرام میں پڑ جانے کا خطرہ۔ نکاح کرنے میں بھی دو آفتیں ہیں: ایک، دل کا غیر حق میں مشغول ہونا اور دوسرے، جسم کا لذتِ نفسانی میں مصروف ہونا اور اس مسئلے کی اصل گوشہ نشینی اور صحبت کی طرف لوٹتی ہے۔ جو شخص لوگوں کی صحبت اختیار کرتا ہے، اس کے لیے نکاح کرنا ضروری ہے اور جو لوگوں سے علیحدہ رہنا چاہتا ہے، اس کے لیے مجرد رہنا زیب و زینت ہے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: سِيْرُوْا سَبَقَ الْمُفْرِدُوْنَ۔ (ترجمہ: سیر کرو، تنہا لوگ سبقت لے گئے ہیں) اور حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: نَجَا الْمُخَفَّفُوْنَ وَهَلَكَ الْمُثَقَّلُوْنَ۔ (ترجمہ: ہلکے بوجھ والے مجرد لوگ نجات پا گئے اور بھاری بوجھ والے عیال دار ہلاک ہو گئے)۔

حضرت ابراہیم خواص سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: میں ایک گاؤں میں کسی بزرگ کی زیارت کے ارادے سے گیا۔ جب اس کے گھر کے اندر داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ گھر ایسا پاکیزہ ہے جیسا کہ اولیاء کا عبادت خانہ اور اس نے گھر کے دونوں کونوں میں دو محراب بنائے ہوئے ہیں۔ ایک محراب میں تو وہ بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں اور دوسرے محراب میں ایک پاکیزہ اخلاق بڑھیا بیٹھی ہے اور زیادہ عبادت کرنے کی وجہ سے دونوں کمزور ہو گئے ہیں۔ میرے آنے پر انہوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور میں وہاں تین روز رہا۔ جب میں نے واپس لوٹنا چاہا تو میں نے اس بزرگ سے پوچھا "اس پاک دامن بڑھیا کا آپ سے کیا رشتہ ہے؟" آپ نے فرمایا "ایک طرف سے تو یہ میرے چچا کی لڑکی ہے اور دوسری طرف سے میری بیوی ہے۔" میں نے کہا کہ "تین روز میں آپ کی صحبت میں رہا، میں نے ان کو بیگانہ ہی سمجھا۔" انہوں نے فرمایا کہ "ہاں پینسٹھ سال سے یہی حال ہے۔" میں نے کہا کہ "مجھے اس کا سبب بتائیے کہ کیوں ایسا ہے؟" آپ نے فرمایا کہ "تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بچپن میں ہم ایک دوسرے پر عاشق تھے اور ان کا والد ان کا نکاح مجھ سے نہیں کرتا تھا، کیونکہ ہماری آپس کی محبت اسے معلوم ہو گئی تھی۔ ایک مدت تک ہم نے اس بات کا رنج اٹھایا، یہاں تک کہ ان کا والد فوت ہو گیا اور میرے والد چونکہ ان کے تایا تھے، اس لیے انہوں نے ان کا

نکاح مجھ سے کر دیا۔ جب پہلی رات ہم ایک دوسرے سے ملے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ تو جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کیا نعمت ہم کو بخشی ہے، جس نے ہمیں ایک دوسرے سے ملا دیا اور ہمارے دلوں کو آفت اور خوف سے فارغ کر دیا۔ میں نے کہا: ہاں! کیوں نہیں۔ پس اس نے کہا ہمیں آج رات اپنے آپ کو خواہش نفس سے روکنا، نفس کی مراد کو پامال کرنا اور اس نعمت کے شکریے میں خدائے تعالےٰ کی عبادت کرنی چاہیے۔ میں نے کہا۔ بہت بہتر۔ دوسری رات بھی اس نے ایسا ہی کہا۔ تیسری رات میں نے کہا کہ دو رات تو ہم نے تیرے کہنے سے نعمت الٰہی کا شکریہ ادا کیا ہے۔ آج رات میرے کہنے پر آؤ اللہ کی عبادت کریں۔ چنانچہ اب ۶۵ سال ہو گئے ہیں کہ ہم نے ایک دوسرے کو چھوا تک نہیں اور ساری عمر اس نعمت کے شکر میں گزار رہے ہیں۔"

پس جب کوئی درویش کسی عورت سے نکاح کر کے اس کی صحبت اختیار کرے تو اسے چاہیے کہ جب تک اس پردہ نشین عورت کی روزی حلال مال سے نہ بنا لے، اس کا حق مہر حلال مال سے نہ ادا کر دے اور جب تک حقوق الٰہی اور اس کے حکموں کو بجا نہ لائے، تب تک اپنی نفس کی لذات میں مستغرق نہ ہو اور جب اپنے اوراد وظائف ادا کر چکے تو اس کی ہمبستری کا ارادہ کرے اور اپنی حرص اور مراد کو اپنے اندر مار دے اور خداوند تعالےٰ سے مناجات کے طور پر غرض کرے: "بارِ خدایا! تو نے آدمی کی سرشت میں جہان کی آبادی کے لیے شہوت پیدا فرمائی ہے اور اپنے علم میں تو نے چاہا ہے کہ مجھے یہ صحبت حاصل ہو۔ اے پروردگار! یہ صحبت میرے لیے دو باتوں کا موجب بنا۔ ایک اس کا کہ فعل حلال کے ساتھ حرام سے محفوظ رہوں۔ دوسرے اس کا کہ مجھے ایسا فرزند عطا فرما جو تیرا ولی اور پسندیدہ ہو نہ کہ ایسا فرزند کہ میرے دل کو تیری طرف سے ہٹا کر اپنی طرف مشغول کر دے۔" حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ہے کہ ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ وہ لڑکا جب لڑکپن میں اپنی ماں سے کھانا مانگتا تو ماں اسے کہتی کہ "اللہ تعالیٰ سے مانگ۔" وہ لڑکا محراب میں جا کر سجدہ کرتا اور اس اثنا میں اس کی ماں ایسے طور پر ان کے سامنے کھانا رکھ دیتی کہ اسے معلوم نہ ہوتا کہ یہ ماں نے اسے دیا ہے اور یہ اس لیے کہ وہ حق تعالےٰ سے مانگنے کی عادت پکڑ لے، حتیٰ کہ ایک روز وہ لڑکا مدرسے سے گھر آیا۔ اتفاق سے اس کی والدہ گھر پر موجود نہ تھی تو اس نے اپنی ضرورت کے لیے سر سجدہ میں رکھا اور اللہ تعالےٰ نے اس کی ضرورت اس کو مہیا کر دی۔ اس کی والدہ نے آ کر یہ حال دیکھا تو اس نے حیرت سے کہا: "اے لڑکے! یہ کھانا کہاں سے آیا ہے؟" اس نے کہا: "جہاں سے ہر روز آیا کرتا ہے۔"

اس طرح حضرت زکریا علیہ السلام جب مریم علیہا السلام کے پاس آتے تو گرمی کے دنوں میں سردیوں کا میوہ آپ کے پاس دیکھتے اور سردیوں میں گرمیوں کا میوہ دیکھتے اور تعجب سے پوچھتے اَنّٰی لَكِ هٰذَا۔ (ترجمہ: یہ میوہ آپ کو کہاں سے ملا ہے؟) تو آپ فرماتیں: هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ (ترجمہ: یہ اللہ کی طرف سے ہے)۔ پس چاہیے کہ کسی سنت کا استعمال درویش کو حرام دنیا کی تلاش اور دل کے شغل میں نہ ڈال دے، کیونکہ درویش کی ہلاکت اس کے دل کی خرابی میں ہے جیسا کہ دولت مند کی خرابی اس کے گھر اور اس کے سامان خانگی کی خرابی میں ہے۔ پس جو چیز دولت مند کی خراب ہو جائے، اس کا عوض ہو سکتا ہے لیکن جو چیز درویش کی بگڑ جائے، اس کا کوئی عوض نہیں ہوتا اور ہمارے زمانے میں ممکن نہیں کہ کسی شخص کو ایسی موافق عورت میسر ہو جو حاجت سے زیادہ فضول اور امر محال کو طلب نہ کرے۔ یہی سبب ہے کہ ایک گروہ نے مجرد اور سبکبار رہنا اختیار کیا اور اس حدیث کی رعایت مدنظر رکھی ہے جو پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ خَيْرُ النَّاسِ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ خَفِيْفُ الْحَالِ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ مَا خَفِيْفُ الْحَالِ

قَال الَّذِیْ لَا اَھْلَ لَہٗ وَلا وَلَدَلَہٗ۔ (ترجمہ: اخیر زمانہ میں سب سے اچھا وہ شخص ہوگا جو کم حال ہوگا۔ آپ سے پوچھا گیا کہ یارسول اللہ ﷺ! کم حال کون ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جس کے اہل وعیال نہ ہوں) نیز آپ نے فرمایا کہ سِیْرُوْ اسَبَقَ الْمُفرِدُوْنَ۔ (ترجمہ: تیز چلو کہ بے اہل وعیال والے تم سے سبقت لے گئے ہیں)۔ طریقت کے مشائخ اس بات پر متفق ہیں کہ اہل طریقت میں سب سے زیادہ بہتر اور افضل مفرد اور تنہا رہنے والے لوگ ہیں، بشرطیکہ ان کا دل خرابی سے خالی اور طبیعت ارتکابِ معاصی اور خواہشات کے ارادے سے رُوگرداں ہو اور عام لوگ خواہشات نفسانی کے ارتکاب کرنے میں اس حدیث کو حجت بناتے ہیں جو پیغمبر ﷺ سے مروی ہے۔ آپ نے فرمایا ہے: حُبِّبَ اِلیٰ مِنَ الدُّنْیَا کُمْ ثَلٰثٌ اَلطِیبُ وَ النِساءُ وَ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلوۃِ۔ (ترجمہ: تمہاری دنیا کی اشیا میں سے تین چیزیں میری محبوب بنادی گئی ہیں۔ خوشبو، عورتوں اور نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے) اور وہ لوگ کہتے ہیں چونکہ عورتیں حضور ﷺ کو محبوب ہیں، تو عورتوں سے نکاح کرنا افضل ہے، میں کہتا ہوں کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: لِیْ حِرْفَتَانِ اَلْفَقْرُوَ الْجِھَادُ۔ (ترجمہ: میرے دو پیشے ہیں: فقر اور جہاد)۔ پس ان پیشوں سے تم کیوں ہاتھ اٹھاتے ہو؟ اگر عورت آپ کی محبوب ہے تو یہ پیشہ بھی آپ کا محبوب ہے۔ پس محض اس وجہ سے کہ تمہارے نفس کو عورت کی طرف زیادہ رغبت ہے تو اس کو پیغمبر ﷺ کا محبوب قرار دینا نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص پچاس سال اپنی خواہش نفس کا تابع رہ کر یوں خیال کرے کہ وہ سنت کا تابع ہے تو وہ سخت غلطی پر ہے۔

الغرض پہلا فتنہ جو بہشت میں حضرت آدم علیہ السلام پر مقدر ہوا ہے، اس کی اصل بھی عورت ہی ہوئی ہے۔ ہابیل و قابیل کا پہلا فتنہ جو دنیا میں ظاہر ہوا ہے، اس کا سبب بھی عورت ہی ہوئی ہے اور جب اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں ہاروت و ماروت کو عذاب دینا چاہا تو اس کا سبب بھی زہرہ نامی ایک عورت ہی تھی اور آج تک ہمارے تمام دینی و دنیوی فتنوں کا سبب عورتیں ہی ہیں۔ چنانچہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: مَا تَرَکْتُ بَعْدِیْ فِتْنَۃً اَضَرّ عَلٰی الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ۔ (ترجمہ: میں نے اپنے بعد مردوں کے حق میں عورتوں کے فتنہ سے بڑھ کر ضرر رساں اور کوئی فتنہ نہیں چھوڑا)۔ پس ان کا فتنہ اگر ظاہر میں اس قدر ہے تو باطن میں بھلا وہ کس قدر ہوگا۔

میں علی بن عثمان جلابی بھی اس کے بعد کہ حق تعالیٰ نے مجھے گیارہ سال تک نکاح کی آفت سے محفوظ رکھا لیکن بالآخر تقدیر الٰہی سے فتنے میں مبتلا ہوگیا۔ میرا ظاہر و باطن بن دیکھے ایک پری صفت عورت کے حسن و جمال کا اسیر ہوگیا اور پورے ایک سال تک میں اس میں مبتلا رہا، چنانچہ قریب تھا کہ میرا دین برباد ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے کمال مہربانی اور اپنے پورے فضل سے میرے دل کو ہلاکت سے بچانے کا سامان فرمایا اور اپنی رحمت سے اس سے خلاصی بخشی۔ اس اللہ تعالیٰ کی اس بڑی نعمت پر اس کا شکر ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ طریقت کی بنیاد مجرد رہنے پر رکھی گئی ہے اور جب انسان نکاح کر کے متاہل بن جاتا ہے تو حال متغیر ہو جاتا ہے اور پھر خواہش نفس کے لشکروں میں سے کوئی لشکر ایسا نہیں ہوتا کہ اس کی آگ کو کوشش سے بجھا سکیں، کیونکہ جو خرابی خود تجھ سے پیدا ہوتی ہے، اس کے دفع کرنے کا سامان بھی تجھ ہی پر موقوف ہوتا ہے اور کسی اور کو ضرورت نہیں کہ یہ بری صفت تجھ سے دُور کرے اور یہ یاد رکھو کہ خواہش نفس کا ازالہ دو چیزوں سے ہوسکتا ہے: اول، اس چیز سے جو انسان کے تکلف اور سعی و کوشش کے تحت آسکے۔ دوسرے، اس چیز سے جو انسان کے کسب اور اس کوشش کے دائرے سے خارج ہو۔ وہ چیز جو انسانی سعی و تکلف کے تحت ہے، وہ بھوکا رہنا ہے اور وہ چیز جو انسانی سعی و کوشش سے باہر ہے، وہ یا تو بے قرار کرنے والا خوف ہے یا سچی

محبت، جو ہمتوں اور ارادوں کو آہستہ آہستہ جسم کے کام میں لانے سے دل کو آخر کار تسکین بخشتی ہے کیونکہ محبت آہستہ آہستہ جسم کے تمام اعضا پر غلبہ حاصل کرلیتی ہے اور تمام حواس کو ان کی صفت سے معزول کر کے آدمی کو ہمہ تن معقول بنادیتی ہے اور بیہودگی اس سے دُور کر دیتی ہے۔

احمد سرخسی رحمتہ اللہ علیہ جو ماوراء النہر میں میرے رفیق اور بڑے باحشمت آدمی تھے، ایک دفعہ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ "کیا آپ کو نکاح کی ضرورت ہے؟" آپ نے فرمایا: "نہیں۔" لوگوں نے کہا: "کیوں؟" آپ نے فرمایا: "اس لیے کہ میں اپنے حال میں کبھی تو غائب اور بے خبر رہتا ہوں اور کبھی حاضر، اور جب غائب ہو جاتا ہوں تو پھر مجھے دونوں جہاں میں کسی چیز کی بھی خبر نہیں ہوتی اور جب حاضر ہوتا ہوں تو پھر اپنے نفس کو ایسا رکھتا ہوں کہ اگر ایک روٹی اسے مل جائے تو وہ یوں خیال کرے کہ اسے ہزاروں حوریں مل گئیں۔ پس دل کے لیے کوئی نہ کوئی شغل چاہیے، خواہ کسی چیز کے متعلق ہو اور یہ بڑا بھاری کام ہے۔"

ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نکاح کرنے اور مجرد رہنے میں ہمارے اپنے اختیار کو کوئی دخل نہیں اور دیکھتے ہیں کہ تقدیر الٰہی کے مطابق پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ اگر مجرد رہنا ہی ہمارے نصیب میں ہو تو اس میں پاک دامن رہنے کی ہم کوشش کریں گے، کیونکہ جب اللہ تعالےٰ کی حفاظت بندے کے لیے مقدر ہو تو بندہ تجرید میں بھی ایسا ہی محفوظ رہتا ہے جس طرح یوسف علیہ السلام زلیخا کی ابتلا میں محفوظ رہے کہ جس وقت زلیخا نے آپ کے ساتھ خلوت کی تو باوجود اپنی مراد حاصل کرنے پر قادر ہونے کے اپنی مراد سے انہوں نے رُوگردانی کی اور مراد سے بے مراد رہے اور خواہش نفس کو مغلوب کرانے اور اپنے نفس کے عیوب دیکھنے میں مشغول رہے۔ نکاح کی صورت میں بھی اگر اللہ تعالےٰ کی حفاظت میسر ہو تو وہ نکاح ایسا ہی ہوگا جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کہ اللہ تعالےٰ پر مکمل اعتماد رکھنے کی وجہ سے گھر والوں کو اپنی زندگی کا واحد مشغلہ نہیں بنایا، یہاں تک کہ جب حضرت سارہ علیہا السلام کے دل میں رشک پیدا ہوا اور غیرت کا اظہار کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو لے جا کر مکہ معظّمہ کی بے آب و گیاہ اور بے آباد وادی میں خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیا اور ان سے رُوگردانی فرمائی یہاں تک کہ حق تعالےٰ نے اپنی حفاظت میں جیسا چاہا، ان کی پرورش فرمائی۔ پس بندے کی ہلاکت نہ تو تجرید میں ہے اور نہ تزویج میں، بلکہ اس کی مصیبت اپنے اختیار کو ثابت رکھنے اور نفس کی خواہش کی متابعت کرنے میں ہے۔ عیال دار کے آداب کی شرط یہ ہے کہ اس کے روزمرہ کے اور اوراد و وظائف میں سے کوئی وظیفہ فوت نہ ہو، احوال سلوک ضائع نہ ہوں اور اوقاتِ کار پریشان نہ ہوں، اپنے گھر والوں سے شفقت کرے اور حلال روزی سے ان کی ضرورت مہیا کرے اور ان کا نفقہ ادا کرنے کے لیے ظالموں اور بادشاہوں کی خوشامد و رعایت نہ کرے تاکہ اگر کوئی لڑکا پیدا ہو تو وہ بھی ان شرائط کا پابند ہو اور اس کے اخلاق و سیرت پر کوئی اثر نہ پڑے۔

حکایات میں مشہور ہے کہ احمد بن حرب نیشاپوری رحمتہ اللہ علیہ ایک روز نیشاپور کے رئیسوں اور سرداروں کی جماعت میں، جو آپ کے سلام کو آئے ہوئے تھے، بیٹھے تھے کہ اتنے میں آپ کا لڑکا شراب پیے ہوئے مستانہ وار ساز بجاتے، راگ گاتے ہوئے اندر آیا اور کامل بے حرمتی کے ساتھ بے دھڑک ان کے پاس سے گزرا۔ اس سے سب رنجیدہ ہوئے۔ حضرت احمد رحمتہ اللہ علیہ نے ان سے پوچھا کہ "آپ لوگوں میں تغیر کیوں پیدا ہوا؟" سب نے جواب دیا کہ "اس لڑکے کے اس حال میں آپ کے پاس سے گزر جانے سے ہمیں پریشانی پیدا ہوئی کہ اس نے آپ سے کچھ خوف نہ کیا۔"

آپ نے فرمایا: "وہ معذور ہے کیونکہ ایک رات ہمارے واسطے ہمسایہ کے گھر سے کھانا لایا گیا تھا جس کو میں نے اور میری بیوی نے کھایا اور اتفاق سے اس رات ہم نے صحبت کی جس نے اس کو نطفہ قرار پایا۔ پھر ہم پر نیند نے غلبہ کیا اور اس رات کے تمام اور اوراد و وظائف ہمارے ضائع ہوگئے۔ جب صبح ہوئی اور اپنے حال کی جستجو کی، اس ہمسائے کے پاس پہنچے اور دریافت کیا کہ جو کھانا اس نے ہمارے پاس بھیجا تھا، وہ کہاں سے آیا تھا؟ اس نے کہا کہ وہ کھانا ہمارے ہاں شادی کی ایک تقریب سے آیا تھا۔ جب ہم نے مزید جستجو کی تو معلوم ہوا کہ وہ کھانا بادشاہ کے گھر سے گیا تھا۔"

مجرد آدمی کے آداب کی شرط یہ ہے کہ آنکھ کو ناشائستہ امور کے دیکھنے سے روکے، نہ سننے کے لائق باتوں کو نہ سنے اور نہ سوچنے کے لائق باتوں کو نہ سوچے، شہوت کی آگ کو بھوک کے ذریعے سے بجھائے، دل کو دنیا سے اور اس کے حوادث میں مشغول ہونے سے محفوظ رکھے، اپنی خواہش نفس کو علم اور الہام نہ کہے اور شیطان کے شعبدہ کی تاویل نہ کرے تاکہ طریقت میں مقبول ہو۔ غرض یہ کہ صحبت و معاملہ کے مختصر آداب یہ ہیں، اگرچہ مذکور تھوڑے ہوئے، تاہم تھوڑا بہت کی دلیل ہوتا ہے، واللہ اعلم۔
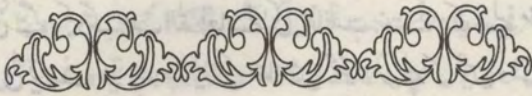
تینتیسواں باب

دسویں پردے کا کھولنا

صوفیاء کرام کی اصطلاحات اور ان کی تشریح

اللہ تمہیں سعادت مند کرے، تمہیں جاننا چاہیے کہ اہل فن و اربابِ معاملہ کے آپس میں اپنے اسرار و رموز بیان کرنے کے لیے مخصوص الفاظ و اصطلاحات ہوتی ہیں کہ ان کے سوا ان کے معنی اور کوئی نہیں جانتا اور ان عبارات و اصطلاحات کے وضع کرنے سے مراد ایک تو اچھی طرح سمجھانا ہے اور مشکل باتوں کو آسان کرنا تاکہ بات مرید کی فہم سے قریب ہو جائے۔ دوسرے، بھید کو ان لوگوں سے چھپانا ہے جو اس کے اہل نہیں ہوتے اور اس امر کی دلیلیں بالکل واضح ہیں، چنانچہ اہل لغت کی اپنی وضع کردہ مخصوص اصطلاحیں ہیں جیسے کہ فعلِ ماضی، فعل مستقبل، صحیح اور معتل، اجوف ولفیف و ناقص وغیرہ وغیرہ اور اہل نحو کی اپنی مخصوص وضع کی ہوئی اصطلاحیں ہیں، مثلاً رفع و نصب، جر و ضمہ، کسرہ اور جزم و منصرف وغیر منصرف وغیرہ وغیرہ۔ اہل عروض اپنی وضع کی ہوئی عبارات سے مخصوص ہیں جیسا کہ بحور و دوائر، سبب و وتد اور فاصلہ وغیرہ وغیرہ۔ اہل حساب اپنی وضع کی ہوئی عبارتوں سے مخصوص ہیں جیسے فرد و زوج، ضرب و تقسیم، کعب و جذر، اضافت، تضعیف و تنصیف، جمع و تفریق وغیرہ وغیرہ، اور اہلِ فقہ اپنی وضع کی ہوئی عبارتوں سے مخصوص ہیں جیسے علت و معلول، قیاس و اجتہاد و دفع و الزام وغیرہ وغیرہ۔ اہل حدیث بھی اپنی وضع کی ہوئی عبارتوں سے مخصوص ہیں، مثلاً مسند و مرسل، احاد و متواتر، جرح و تعدیل وغیرہ وغیرہ۔ اہل کلام بھی اپنی وضع کی ہوئی عبارتوں سے مخصوص ہیں، مثلاً عرض و جوہر، کل و جزو، جسم و حدوث، تحیر و قوالی وغیرہ وغیرہ۔ پس اسی طرح اس گروہ صوفیا کے بھی اپنے مطالب کے خفا و ظہور کے لیے کچھ الفاظ مقرر ہیں تاکہ طریقت میں ان الفاظ کے ذریعہ جسے چاہیں، اپنا مقصود بتا دیں اور جس سے چاہیں، اسے چھپا دیں۔ پس میں ان کلمات میں سے بعض مشرح طور پر بیان کروں گا اور ہر دو کے درمیان فرق واضح کروں گا کہ صوفیا کی ان کلمات سے کیا مراد ہے تاکہ تمہیں اور اس کتاب کے پڑھنے والوں کو پورا فائدہ حاصل ہو اور مجھے نیک دُعا حاصل ہو۔

پہلی فصل
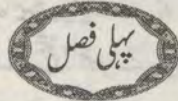
حال و وقت

"وقت" جماعت صوفیا کے درمیان ایک مشہور اصطلاح ہے اور مشائخ طریقت کے اس میں بہت سے اقوال ہیں۔ میرا مقصد چونکہ بیان کو طول دینا نہیں، اس لیے میں یہاں صرف ان دونوں کی ماہیت بیان کر کے ان کے آپس میں فرق کو واضح کرتا ہوں۔ یاد رکھو کہ ان کے نزدیک وقت وہ حالت ہے کہ بندہ اس کی وجہ سے زمانہ ماضی و مستقبل سے فارغ ہو جائے اور حق تعالیٰ کی طرف اس کے دل میں جلوۂ الٰہی یا الہام کی قسم کا کوئی فیضان ہو جو اس کے باطن کو ہمہ تن اس میں اس طرح مجتمع کر دے کہ اس حال کے مکاشفہ میں نہ اس کو وقت گزشتہ یاد ہو نہ آئندہ۔ پس سب لوگوں کو اس حال پر دسترس نہیں ہوتی اور وہ نہیں جانتے کہ ہماری سابقہ تقدیر کس بات پر ٹھہری اور انجام کس

بات پر ہوگا؟ سوائے ان لوگوں کے جن کو یہ وقت یعنی حالت مشاہدہ حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا علم انجام اور تقدیر سابقہ کا ادراک نہیں کرسکتا۔ ہمارے لیے تو یہ وقت یعنی حالت مشاہدہ ایک بہت اچھی چیز ہے کیونکہ اگر ہم آئندہ کل میں مشغول ہوں یا گزشتہ کل کا اندیشہ دل میں لائیں تو موجودہ وقت مشاہدہ سے ہم حجاب میں چلے جائیں گے اور حق سے حجاب میں ہونا ایک بڑی پراگندگی اور پریشانی ہے۔ پس جس چیز پر دسترس نہ ہو، اس کا خیال کرنا غلط ہے۔ چنانچہ حضرت ابوسعید خراز رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اپنے عزیز وقت کو سب سے عزیز ترین چیز کے سوا کسی اور چیز میں مشغول نہ کر اور بندے کی عزیز ترین چیز ماضی اور مستقبل کے درمیان وقتِ موجود میں حق تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہونا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ لَّا یَسَعُنِیْ فِیْہِ مَلَكٌ مُّقَرَّبٌ وَّلَا نَبِیٌّ مُّرْسَلٌ۔ (ترجمہ: مجھے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ایسا وقت مشاہدہ حاصل ہوتا ہے کہ اس وقت میرے ساتھ نہ کسی فرشتۂ مقرب کو گنجائش ہوتی ہے نہ کسی نبی مرسل کو) یعنی ان بے شمار دنیاؤں میں سے کسی دنیا کا اس وقت میرے دل میں گزر نہیں ہوتا اور نہ اس کی میری نظر میں کوئی وقعت ہوئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ معراج کی رات جب ملک زمین و آسمان کی زینت کو آپ پر پیش کیا گیا تو آپ نے دیدارِ الٰہی میں مستغرق ہونے کے باعث کسی چیز کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (ترجمہ: نہ آپ کی نگاہ تجلیاتِ حق سے اِدھر اُدھر ہٹی اور نہ آگے بڑھی) کیونکہ حضور مصطفیٰ ﷺ سب سے عزیز تھے اور عزیز چیز کو عزیز چیز کے سوا کسی اور چیز میں مشغول نہیں کیا کرتے۔ پس موحد کے دو وقت ہوتے ہیں۔ ایک فقد جس میں مشاہدہ حق حاصل نہیں اور دوسرا وجد جس میں مشاہدہ حاصل ہے، مگر موحد ان دونوں حالتوں میں مطلوب اور محمود ہے اس لیے کہ وصل میں اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے اور جدائی میں اس کی جدائی بھی حق تعالیٰ کے حکم سے ہوتی ہے۔ خود اس کے اپنے اختیار اور کسب کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا کہ اس کا وصف بیان کرسکیں اور جب بندے کا اپنا اختیار اس کے حال سے الگ کردیا جائے تو جو کچھ وہ کرتا یا دیکھتا ہے، وہ وقت یعنی مشاہدۂ حق کی وجہ سے ہوتا ہے۔

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: میں نے ایک درویش کو جنگل میں کیکر کے درخت کے نیچے سخت ریاضت و مجاہدہ کی حالت میں بیٹھا ہوا دیکھا۔ میں نے اس سے پوچھا: "بھائی! تو اس جگہ کیوں بیٹھا ہے اور اتنی سختی اور تکلیف کیوں اٹھا رہا ہے؟" تو اس نے جواب دیا کہ "مجھے اللہ تعالیٰ کے پاس ایک وقت یعنی مشاہدہ حاصل تھا، وہ یہاں ضائع ہوگیا ہے، اب یہاں بیٹھا ہوا غم کھا رہا ہوں۔" میں نے پوچھا: "کتنی مدت سے تو یہاں بیٹھا ہے؟" اس نے کہا: "بارہ سال سے۔ اے شیخ! میرے لیے دُعا فرمائیں تاکہ میں اپنی مراد پالوں اور اپنا کھویا ہوا وقت یعنی مشاہدہ دوبارہ حاصل کرلوں۔" حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے وہاں سے جا کر حج کیا اور اس کے حق میں دعا کی، وہ قبول ہو کر اس کی مراد بر آئی۔ جب میں نے واپس آ کر اس کو وہیں پھر بیٹھے دیکھا تو میں نے اس سے پوچھا کہ "اے جواں مرد! اب کہ تجھے وہ کھویا ہوا وقت دوبارہ مل گیا ہے پھر کیوں یہاں سے نہیں جاتا؟" اس نے کہا: "اے شیخ! میں نے اس جگہ کو لازم پکڑا تھا جو میری وحشت کا محل تھی اور میرا سرمایہ وہاں گم ہوا تھا۔ کیا اب روا ہے کہ جس جگہ میں نے اپنا وہ سرمایہ دوبارہ حاصل کیا ہے اور وہ میری محبت کی جگہ ہے، اس کو چھوڑ دوں؟ شیخ سلامتی کے ساتھ تشریف لے جائیں۔ میں تو اپنی مٹی کو اس جگہ کی مٹی سے ملا دوں گا تاکہ قیامت میں میں اس خاک سے سر اُٹھاؤں جو میری انس و محبت کا سرمایہ اور میری خوشی کا مقام ہے۔" (شعر)

؎ فَکُلُّ امْرِئٍ یُؤْتِیَ الْجَمِیْلَ مُحَبَّبٌ
وَ کُلُّ مَکَانٍ یُنْبِتُ الْعِزَّ طَیِّبٌ

(پس جس شخص کی طرف کوئی حسین آدمی تحفہ بھیجتا ہے، وہ پیارا ہوتا ہے اور جس مکان سے عزت پیدا ہو، وہ پاکیزہ ہوتا ہے)۔

پس وہ چیز جس کا معاملہ انسانی کسب کے تحت نہ آئے کہ اس کو تکلیف اور محنت ومشقت سے حاصل کر سکے، جان دے دے مگر اس کو نہ دے۔ اسے اس کے حاصل کرنے اور بدلنے کا بھی اختیار نہ ہو اور دونوں طرف اس کی رعایت میں مساوی ہوں اور بندہ اپنے اختیار سے اپنے آپ کو کسی طرح بھی اس کا مستحق نہیں بنا سکتا اور مشائخ نے فرمایا ہے: اَلْوَقْتُ سَیْفٌ قَاطِعٌ۔ (وقت ایک کاٹنے والی تلوار ہے) کیونکہ تلوار کی صفت کاٹنا ہے اور وقت کی صفت بھی کاٹنا ہے کیونکہ وقت زمانہ ماضی و مستقبل کی جڑ کاٹتا ہے اور کل گزشتہ و آئندہ کے غم کو دل سے محو کرتا ہے۔ پس تلوار کی صحبت پر خطر ہوتی ہے یا تو اس سے ملک ملتا ہے یا ہلاکت نصیب ہوتی ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص ہزار سال تلوار کی خدمت کرے اور اسے اپنے کندھے پر اُٹھائے پھرے تو پھر بھی کاٹنے میں وہ اپنے مالک کی گردن اور دوسرے شخص کی گردن کے درمیان کچھ تمیز نہیں کر سکے گی، اس لیے کہ اس کی صفت قہر ہے اور کسی کی ملکیت میں آکر اس کی کاٹنے کی صفت زائل نہیں ہوسکتی۔ "حال" وہ فیضانِ الٰہی ہے جو مشاہدۂ حق کے وقت دل پر وارد ہو کر اسے ایسا آراستہ کر دیتا ہے جیسا کہ روح جسم کو آراستہ کر دیتی ہے، لہٰذا وقت حال کا محتاج ہوتا ہے کیونکہ وقت کی صفائی اور آراستگی حال کے سبب سے ہوتی ہے اور اس کا قیام اس پر موقوف ہوتا ہے۔ پس جب صاحب وقت، صاحبِ حال ہو جاتا ہے تو تغیر اس سے منقطع ہو جاتا ہے اور اپنے حال میں وہ مستقیم ہو جاتا ہے کیونکہ حال کے بغیر وقت پر زوال روا ہے اور جونہی اس کے ساتھ حال پیوستہ ہو جاتا ہے اس کا سارا زمانہ وقت ہی ہو جاتا ہے اور پھر اس پر زوال روا نہیں، غرضیکہ دل پر فیضان کی جو کچھ بھی آمد ورفت ہوتی ہے، وہ خفا اور ظہور کی وجہ سے ہوتی ہے جیسا کہ اس سے پہلے صاحب وقت پر وقت نازل ہوتا ہے اور غفلت متمکن ہوتی ہے۔ اب حال نازل ہوتا ہے اور وقت متمکن ہوتا ہے، اس لیے کہ صاحب وقت پر غفلت روا ہوتی ہے اور صاحب حال پر غفلت روا نہیں ہوتی مطلب یہ کہ صاحب وقت کے لیے غفلت تو ممکن ہے لیکن صاحبِ حال کے لیے نہیں۔ مشائخ نے فرمایا ہے کہ اَلْحَالُ سُکُوْتُ اللِّسَانِ عَنْ فُنُوْنِ الْبَیَانِ۔ (ترجمہ: حال یہ ہے کہ زبان کسی اندازِ بیان میں بھی اس کو بیان نہ کر سکے اور اس کا عمل اس کے حال کی حقیقت کو بیان کرے) اسی وجہ سے اس بزرگ نے فرمایا ہے: اَلسُّؤَالُ عَنِ الْحَالِ مُحَالٌ۔ (ترجمہ: یعنی حال کے متعلق سوال کیا ہی نہیں جا سکتا) کیونکہ حال دراصل مقال کی فنا ہے۔

استاد ابو علی دقاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا اور عقبیٰ میں خوشی اور ہلاکت میں تیرا وقت وہی ہے جس میں تو موجود ہے اور حال ایسا نہیں ہوتا کیونکہ وہ حق تعالیٰ کی طرف سے بندے پر فیضان ہے، جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام صاحب وقت تھے کہ ایک وقت تو فراق سے ان کی آنکھیں سفید ہوگئی تھی اور دوسرے وقت وصال سے بینا۔ کبھی تو گریہ سے بال کی طرح اور نالہ سے ریشۂ قلم کی طرح ہو جاتے اور کبھی خوشی و سرور سے روح کی طرح خوش وخرم اور مسرور، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ صاحب حال تھے، وہ نہ فراق کا کچھ خیال کرتے کہ اس سے غمگین ہوں اور نہ وصال کا خیال کرتے کہ اس سے مسرور ہوں۔ ستارے، چاند اور سورج سب ان کے حال کی مدد کرتے تھے لیکن آپ مشاہدۂ حق کی وجہ سے سب سے فارغ تھے حتیٰ کہ جس چیز کو دیکھتے، اس میں حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرتے اور

فرماتے: لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ (ترجمہ: میں زوال پانے والوں کو دوست نہیں رکھتا) پس کبھی تو عالم صاحب وقت کے لیے دوزخ بن جاتا ہے، کیونکہ وہ غیبت کے مشاہدہ میں ہوتا ہے اور حبیب کے گم ہو جانے سے اس کا دل وحشت کا محل بن جاتا ہے اور کبھی اس کا دل مشاہدۂ حق کی دولت پاکر، جو ہر آن اس کو تحفہ کے طور پر ملتی رہتی ہے، بہشت کی طرح شگفتہ ہو جاتا ہے۔ پھر صاحب حال خواہ بلا کے حجاب میں ہو یا نعمت کے مشاہدے میں، سب حالتیں اس پر یکساں ہوتی ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ مشاہدے کے محل میں ہوتا ہے۔ پس حال ایسے شخص کی صفت ہے جو خدا تعالیٰ کو مطلوب ہوتا ہے اور وقت اس شخص کا درجہ ہے جو طالب حق ہو۔ ایک تو وقت کی راحت میں اپنے ساتھ با ہوش ہوتا ہے اور دوسرا حال کی خوشی میں حق تعالیٰ کے ساتھ مجذوب اور مدہوش ہوتا ہے۔ پس ان دونوں مقامات میں بہت بڑا فرق ہے اور ان اصطلاحاتِ صوفیا میں سے مقام و تمکن بھی ہیں، جس کے متعلق ہم آئندہ فصل میں ذکر کریں گے۔

دوسری فصل
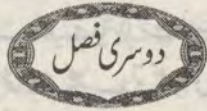
مقام و تمکن

"مقام" سے مراد طالب الٰہی کا اپنے مطلوب کے حقوق ادا کرنے کے لیے سخت کوشش کرنا اور صحیح نیت کے ساتھ قیام کرنا ہے۔ مریدانِ حق میں سے ہر ایک مرید کے لیے ایک مقام ہوتا ہے، جو طلب حق کی ابتدا میں ان کے لیے سبب ہوتا ہے اگرچہ طالب حق ہر مقام سے بہرہ ور ہوتا اور ہر ایک مقام سے گزرتا ہے لیکن اس کا قرار ان مقامات میں سے صرف ایک پر ہوتا ہے کیونکہ مقام اور اس کا ارادہ اس کی ترکیب بدنی اور پیدائش ہوتا ہے نہ اس کے فعل اور عمل سے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے کلام میں خبر دی ہے کہ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ۔ (ترجمہ: اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے ایک مقام معین ہے) پس آدم علیہ السلام کا مقام توبہ، نوح علیہ السلام کا زہد، ابراہیم علیہ السلام کا تسلیم، موسےٰ علیہ السلام کا انابت، داؤد علیہ السلام کا غم، عیسیٰ علیہ السلام کا اُمید، یحییٰ علیہ السلام کا خوف اور ہمارے پیغمبر ﷺ کا ذکر تھا۔ اگرچہ ہر ایک کو ہر ایک محل میں سیر واقع ہوتی ہے، لیکن آخر کار ان کا رجوع اپنے اصلی مقام ہی کی طرف ہوتا ہے۔

اگرچہ میں نے محاسبیوں کے مذہب کے بیان میں مقامات کے متعلق تھوڑا سا بیان کر دیا ہے اور حال اور مقام کے درمیان فرق بتا دیا ہے، لیکن اس جگہ بھی اس کے بیان سے چارہ نہیں ہے۔ پس جاننا چاہیے کہ خدا تعالیٰ کا راستہ تین قسم کا ہے: ایک مقام، دوسرا حال، تیسرا تمکین۔ اللہ تعالیٰ نے سب پیغمبروں کو اپنے راستہ دکھلانے کے لیے بھیجا تاکہ وہ مقامات کو بیان کریں اور اسی غرض کے لیے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آئے اور ہمارے پیغمبر کے تشریف لانے سے ہر مقام والے کے لیے ایک حال ظاہر ہوا اور وہاں پر جا پہنچے کہ لوگوں کی سعی اور کسب ان سے منقطع ہو گیا یہاں تک کہ لوگوں پر دین تمام ہو گیا و رنعمت حد نہایت پر پہنچ گئی، جیسا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (ترجمہ: آج میں نے تمھارے لیے دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی رحمت پوری کر دی اور تمھارے لیے دین اسلام کو پسند کیا) پھر متمکن یعنی حال پر قابو پانے والے کی تمکین ظاہر ہوئی۔ اگر میں سب کے حال اور ان کے مقامات کی شرح کرنی چاہوں تو اپنے مطلوب سے باز رہتا ہوں، البتہ مریدوں اور طالبانِ حق کے فائدے کے لیے مختصر سا بیان یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ "تمکین" سے مراد محققین کا محل کمال اور درجۂ اعلیٰ میں اقامت کرنا ہے۔ پس اہل مقامات کو مقامات سے گزرنا

ممکن ہے لیکن تمکین کے درجے سے گزرنا محال ہے، کیونکہ مقام مبدیوں کا درجہ ہے اور تمکین منتہی لوگوں کی جائے قرار ہے۔ ابتدا سے نہایت کی طرف تو گزر ہو سکتا ہے لیکن نہایت سے آگے گزرنا متصور نہیں ہو سکتا کیونکہ مقامات تو رستے کی منزلیں ہیں اور تمکین درگاہِ حق میں قرار پانا ہے، دوستانِ الٰہی راستے میں حق سے غائب اور منازل میں حق سے بیگانہ ہوتے ہیں، ان کا بھید اور باطن بارگاہِ حق میں ہوتا ہے اور بارگاہ میں اسباب آفت ہوتے ہیں اور سامان غیبت اور نقص ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں شاعر لوگ اپنے ممدوحوں کی مدح عمل سے کیا کرتے تھے اور جب تک کچھ وقت نہ گزر جاتا، شعر ادا نہ کرتے تھے۔ چنانچہ جب کوئی شاعر کسی ممدوح کی درگاہ میں پہنچ جاتا تو تلوار سونت لیتا اور گھوڑے کے پاؤں اُڑا دیتا اور تلوار کو توڑ دیتا۔ اس کی مراد اس سے یہ ہوتی تھی کہ مجھے سواری کے جانور کی اس لیے ضرورت تھی کہ آپ کی درگاہ کا فاصلہ اس سے طے کروں اور تلوار کی اس لیے ضرورت تھی کہ اپنے حاسدوں کو جو مجھے آپ کی خدمت سے منع کرتے تھے، اپنے سے ہٹا رکھوں۔ اب کہ میں جناب کے پاس پہنچ گیا ہوں، سامانِ سفر کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے سواری کے جانور کو مار ڈالا ہے کیونکہ میں آپ کے پاس پہنچ کر واپس لوٹنا جائز نہیں سمجھتا اور میں نے تلوار کو اس لیے توڑ دیا ہے کہ آپ کی درگاہ سے تعلق قطع کرنے کے خیال کو بھی دل میں نہ لاؤں۔ جب چند روز گزر جاتے تو اس وقت وہ اپنے شعر کو پڑھتا، چنانچہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بھی یہی حکم دیا تھا۔ جب آپ منزلوں کو قطع کر کے اور مقامات سے گزر کر تمکین کے محل میں پہنچے اور تغیر کے اسباب ان سے بالکل ساقط ہو گئے تو حق تعالیٰ نے ان سے فرمایا: فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ وَأَلْقِ عَصَاكَ (ترجمہ: اپنے دونوں جوتے اُتار دو اور اپنی لاٹھی پھینک دو) کیونکہ وہ مسافت طے کرنے کا آلہ ہے اور وصل کی درگاہ میں مسافت طے کرنے کے سامان کی پریشانی کی کوئی ضرورت نہیں۔ پس محبت کی ابتدا، حق کو طلب کرنا ہے اور انتہا، حق کے ساتھ آرام پانا۔ پانی جب تک دریا میں ہوتا ہے، چلتا رہتا ہے لیکن جب سمندر میں پہنچ جاتا ہے تو آرام پکڑتا ہے اور جب آرام پکڑ لیتا ہے تو مزہ تبدیل کر دیتا ہے تاکہ جس کو پانی کی ضرورت ہو، وہ سمندر کی صحبت کی طرف رغبت نہ کرے، بلکہ اس کی صحبت کی طرف صرف وہی شخص میلان کرتا ہے جس کو لعل اور جواہر چاہئیں تاکہ جان کو ترک کرے اور طلب کا بوجھ پاؤں میں باندھے اور سر نیچے ڈالے ہوئے اس سمندر میں غوطہ لگائے، پھر یا تو قیمتی موتی اور پوشیدہ جواہر حاصل کرے یا اپنی عزیز جان اسی طلب میں فنا کر دے۔

ایک شیخ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلتَّمْكِيْنُ رَفْعُ التَّلْوِيْنِ (ترجمہ: تمکین تغیر کو اُٹھا دینا ہے)۔ تلوین بھی اس گروہ کی اصطلاحات میں سے ایک اصطلاح ہے۔ حال اور مقام کی طرح آپس میں معنی کے لحاظ سے قریب میں تلوین سے مراد متغیر ہونا اور ایک حال سے دوسرے حال میں جانا ہے۔ پھر صاحب تمکین یا متمکن سے وہ شخص مراد ہے جو متردّد نہ ہو اور اپنا سارا سامان درگاہِ الٰہی میں لے گیا ہو اور غیر کا خیال دل سے اس نے نکال دیا ہو۔ نہ کوئی ایسا معاملہ گزرے کہ اس کے ظاہر کو بدل دے اور نہ کوئی ایسا حال ہو کہ اس کے باطن کو تبدیل کر دیے، جیسا کہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام متغیر تھے۔ حق تعالیٰ نے ایک نظر سے طور پر جلوہ ڈالا تو آپ کے ہوش اُڑ گئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا۔ (ترجمہ: موسیٰ علیہ السلام غش کھا کر گر پڑے) اور ہمارے رسول اللہ ﷺ متمکن تھے کہ مکہ معظمہ سے قابِ قوسین تک عین تجلی الٰہی میں گئے، لیکن آپ کا حال متغیر اور متبدل نہ ہوا۔ یہ درجہ نہایت اونچا تھا جسے فقط اللہ ہی جانتا ہے۔ پس تمکین بھی دو طرح کی ہوتی ہے: ایک تو یہ کہ اس کا تعلق شاہد کے ساتھ ہو، وہ باقی

الصفت ہوتا ہے اور جس کی نسبت فقط شاہد کی طرف ہو، وہ فانی الصفت ہوتا ہے اور فانی الصفت کے لیے مستی اور ہوشیاری، گم ہونا، ملنا، فنا اور بقا، وجود اور عدم درست نہیں ہوتا کیونکہ ان اوصاف کے قائم ہونے کے لیے موصوف چاہیے اور جب موصوف ہی مشاہدۂ حق میں مستغرق ہو تو صفت کا قائم ہونا اس سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اس موضوع پر مشائخ کا کلام بہت ہے، لیکن میں نے اتنے پر اختصار کیا ہے اور توفیق اللہ کے قبضے میں ہے۔
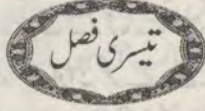
محاضرہ و مکاشفہ

اصطلاحاتِ صوفیا میں سے محاضرہ اور مکاشفہ بھی تصوف کی ایک اصطلاح ہے۔ جاننا چاہیے کہ "محاضرہ" جو دل کے حاضر ہونے پر بولا جاتا ہے اور "مکاشفہ" مشاہدہ حق کی بارگاہ میں باطن کے حاضر ہونے پر بولا جاتا ہے۔ پس محاضرہ آیات الٰہی کے شواہد میں ہوتا ہے اور مکاشفہ مشاہداتِ الٰہیہ کے شواہد میں۔ محاضرہ کی علامت اللہ تعالیٰ کی کسی نشانی میں دائمی تفکر ہے اور مکاشفہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کی کنہ میں دائمی حیرت۔ پھر ایک جو افعال حق میں متفکر ہے اور دوسرا جو جلال حق میں متحیر ہو۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے کیونکہ متفکر تو خلقت کا رفیق ہوتا ہے اور متحیر محبت کا ہم نشین۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جب خلیل علیہ السلام نے آسمانوں کے ملکوتی نظام کو دیکھا اور ان کے وجود کی حقیقت میں غور وفکر کیا تو آپ کے دل نے قرار پکڑا اور اس طرح فعل حق کے دیکھنے سے فاعل کے طالب ہو گئے اور اس اطمینان اور حضوری قلب نے فعل الٰہی کو ہی فاعل کی طرف ایک دلیل بنا دیا یہاں تک کہ کمال معرفت الٰہی میں آپ نے فرمایا: اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا۔ (ترجمہ: میں نے اپنا چہرہ سب سے الگ ہو کر اس ذات کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا) اور حبیب خدا ﷺ کو جب عالم ملکوت میں لے گئے تو کل کے دیکھنے سے آپ نے آنکھ بند کر لی۔ آپ نے فعل دیکھا نہ خلق دیکھی اور نہ ہی اپنے آپ کو دیکھا یہاں تک کہ فاعلِ حقیقی کا مشاہدہ کرنے لگے۔ پس مشاہدۂ حق میں آپ کا شوق پر شوق بڑھ رہا تھا اور بے قراری پر بے قراری زیادہ ہو رہی تھی، چنانچہ آپ نے رویت باری کی طلب کی۔ رویتِ ذاتِ حق حاصل نہ ہوئی تو قرب کا ارادہ فرمایا۔ قرب ممکن نہ ہوا تو وصل کا قصد کیا اور وصل ممکن نہ ہوا تو جس قدر آپ کے دل پر حق تعالیٰ کی تنزیہ (پاکی) زیادہ ظاہر ہوئی، اتنا ہی شوق پر شوق بڑھا۔ پھر نہ اعراض کرنے کی کوئی صورت تھی، نہ آگے بڑھنے کی طاقت۔ آپ متحیر ہو گئے۔ جہاں خلت تھی، وہاں حیرانی کفر معلوم ہوئی اور جہاں محبت تھی وہاں وصل شرک اور حیرانی سرمایہ بن گئی، اس لیے کہ خلت میں حیرانی ہستی میں ہوتی ہے اور وہ شرک ہے اور محبت میں حیرانی کیفیت میں ہوتی ہے اور یہ عین توحید ہے اور اسی وجہ سے حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ یوں کہا کرتے تھے: یَا دَلِیْلُ الْمُتَحَیِّرِیْنَ زِدْنِیْ تَحَیُّراً (ترجمہ: اے حیرانوں کے رہنما! میری حیرت کو اور بڑھا) اس لیے کہ مشاہدے میں تحیر کی زیادتی درجے کی زیادتی ہوتی ہے۔

حکایت میں مشہور ہے کہ جب ابو سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ نے ابراہیم سعد علوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ دریا کے کنارے اللہ کے ایک دوست کو دیکھا تو اس سے پوچھا کہ "حق کی طرف راستہ کون سا ہے؟" تو اس نے کہا: "حق کی طرف دو راستے ہیں: ایک عوام کا راستہ، دوسرا خواص کا۔" انہوں نے کہا کہ "اس کی شرح کیجیے۔" اس نے کہا کہ "عوام کا راستہ تو یہ ہے کہ جس پر تو ہے کہ کسی ایک سبب سے تو اسے قبول کر لیتا ہے اور پھر کسی دوسرے سبب سے

اسے ردّ کر دیتا ہے اور خواص کا راستہ یہ ہے کہ وہ نہ تو متعلق کو دیکھتے ہیں نہ علت کو۔" اس حکایت کی حقیقت تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے اور اس کے سوا اور کچھ مراد نہیں اور توفیق اللہ کے قبضے میں ہے۔
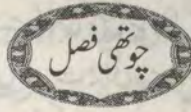
قبض اور بسط

صوفیا کی اصطلاحات میں سے قبض اور بسط کی اصطلاحیں بھی ہیں۔ جاننا چاہیے کہ قبض اور بسط ان احوال میں سے دو حالتیں ہیں کہ جن میں انسان کی کوشش کو کچھ دخل نہیں کیونکہ اس حالت کا آنا کسی کسب و کوشش کی وجہ سے ہوتا ہے نہ اس کا جانا کسی کسب و کوشش کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اَللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُطُ (اللہ تعالیٰ قبض کرلیتا ہے اور کھول دیتا ہے) "پس قبض" سے مراد حجاب کی حالت میں دل کا قبض کر لینا ہے اور "بسط" سے مراد کشف کی حالت میں دلوں کو کھولنا ہے اور یہ دونوں باتیں بندے کی تکلیف اور کوشش کے بغیر حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہیں اور قبض عارفوں کے حال میں بالکل ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ مریدوں کے حال میں خوف۔ بسط اہل معرفت کے حال میں ایسا ہی ہوتا ہے جیسا مریدوں کے حال میں اُمید۔ یہ بات اس گروہ کے قول کے مطابق ہے جو قبض و بسط کو اسی معنی پر محمول کرتے ہیں۔ مشائخ کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ قبض کا رُتبہ بسط کے رُتبے سے دو وجوہات سے زیادہ بلند ہوتا ہے۔ اول تو یہ کہ اس کا ذکر کتاب میں مقدم ہے اور دوسرے اس لیے کہ قبض میں گھلانا اور مقہور کرنا ہے اور بسط میں لطف و مہربانی۔ پس لامحالہ بشری کا گھلانا اور نفس کو مقہور کرنا اس کی پرورش اور اس پر لطف و کرم کرنے سے بہتر ہے، کیونکہ وہ بہت بڑا حجاب ہے۔ ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ بسط کا رُتبہ قبض کے رُتبہ سے زیادہ بلند ہے کیونکہ کتاب الٰہی میں قبض کے ذکر کو مقدم لانا بسط کی فضیلت کے مقدم ہونے کی علامت ہے، اس لیے کہ عربوں کے عرف اور عادت میں یہ بات ہے کہ وہ اس چیز کو ذکر میں مقدم کرتے ہیں جو فضیلت میں مؤخر ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ (ترجمہ: پس لوگوں میں سے بعض اپنی جان پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ان میں میانہ رو ہیں اور بعض ان میں سے اللہ کے حکم سے نیکیوں میں سبقت کرنے والے ہیں)۔ نیز فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ۔ (ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے)۔ مزید فرمایا: يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (ترجمہ: اے مریم! اپنے رب کی فرمانبردار ہو جا اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر) نیز بسط میں خوشی ہوتی ہے اور قبض میں ہلاکت اور عارفوں کی خوشی معرفت کے حصول کے سوا اور کسی چیز میں نہیں ہوتی اور ان کی ہلاکت مقصود سے علیحدہ ہونے کے سوا اور کسی چیز میں نہیں۔ پس وصل کے محل میں قرار پذیر ہونا فراق کے محل میں قرار پکڑنے سے بہتر ہے۔

میرے شیخ رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ قبض اور بسط دونوں ایک معنی میں ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے بندے کو حاصل ہوتے ہیں۔ جب وہ معنی دل پر وارد ہوتے ہیں تو یا تو باطن اس سے خوش ہوتا ہے اور نفس مغلوب، یا باطن مغلوب ہوتا ہے اور نفس خوش۔ ایک شخص کے باطن کے قبض میں اس کے نفس کی کشائش ہوتی ہے اور دوسرے شخص کے باطن کے کشادہ کرنے میں اس کے نفس کا قبض کرنا ہوتا ہے اور جو شخص اس معنی کی اس کے سوا کچھ

اور تعبیر کرے، وہ اوقات کو ضائع کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: قَبْضُ الْقُلُوْبِ فِیْ بَسْطِ النُّفُوْسِ وَبَسْطُ الْقُلُوْبِ فِیْ قَبْضِ النُّفُوْسِ۔ (ترجمہ: دلوں کا قبض کرنا نفسوں کی کشائش کرنا ہے اور دلوں کا کشادہ کرنا نفسوں کے قبض کا باعث ہے) پس قبض کیا ہوا نفس خلل سے محفوظ ہوتا ہے اور کشادہ کیا ہوا باطن لغزش سے محفوظ رہتا ہے کیونکہ محبت اور دوستی میں غیرت برائی ہے اور قبض غیرت حق تعالیٰ کی علامت ہے اور دوست کا دوست پر عتاب کرنا شرط ہے اور بسط عتاب کرنے کی علامت ہوتی ہے۔ آثار میں یہ بات مشہور ہے کہ جب تک حضرت یحییٰ علیہ السلام زندہ رہے، رویا کیے اور جب تک عیسیٰ علیہ السلام زندہ رہے، ہنستے رہے، اس لیے کہ یحییٰ علیہ السلام انقباض کی حالت میں تھے اور عیسیٰ علیہ السلام انبساط کی حالت میں تھے اور جب وہ ایک دوسرے کے پاس پہنچتے تو یحییٰ علیہ السلام فرماتے: "اے عیسیٰ! تو جدائی سے بے خوف ہوگیا ہے کہ ہر وقت ہنستا رہتا ہے"، تو عیسیٰ علیہ السلام جواب دیتے کہ "اے یحییٰ! کیا تو رحمت سے نا اُمید ہوگیا ہے کہ ہر وقت روتا رہتا ہے۔" پس نہ تیرا رونا ازلی حکم کو ٹال سکتا ہے نہ میرا ہنسنا فیصل شدہ قضا کو لوٹا سکتا ہے پس لَا قَبْضَ وَلَا بَسْطَ وَلَا طَمْسَ وَلَا اُنْسَ وَلَا مَحْوَ وَلَا صِحْوَ وَلَا لَحْقَ وَلَا مَحْقَ وَلَا عِجْزَ وَلَا جَهْلَ اِلَّا مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی۔ (ترجمہ: نہ قبض ہے نہ بسط، نہ مٹنا ہے اور نہ محبت ہے، نہ بے خودی ہے نہ باخودی، نہ وصل ہے نہ فصل ہے، نہ عجز ہے نہ جہل ہے مگر یہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہے) جو اللہ کے ہاں مقرر ہو چکا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

پانچویں فصل
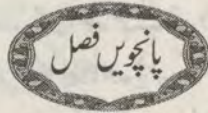
اُنس و ہیبت

صوفیا کرام کی مصطلحات میں سے اُنس اور ہیبت بھی دو حالتیں ہیں۔ اللہ تجھے نیک بخت کرے۔ جاننا چاہیے کہ ہیبت اور اُنس راہِ حق کے سالکوں کے احوال میں سے دو حالتیں ہوتی ہیں اور یہی سبب ہے کہ جب حق تعالیٰ بندے کے دل پر جلالی شہود کے ساتھ تجلی کرتا ہے تو اس کے نصیب ہیبت ہوتی ہے اور جب جمالی شہود کے ساتھ تجلی کرتا ہے تو اس کے نصیب محبت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ہیبت والے لوگ جلال کی وجہ سے تکلیف میں ہوتے ہیں اور اہل اُنس اس کے جمال سے سرور اور خوشی محسوس کرتے ہیں۔ پس وہ دل جو جلالِ الٰہی سے محبت کی آگ میں جل رہا ہے اور وہ دل جو جمالِ حق کے مشاہدہ کے نور سے چمک رہا ہو، برابر نہیں ہو سکتے۔ مشائخ کے ایک گروہ نے تو کہا ہے کہ "ہیبت" عارفانِ حق کا درجہ ہے اور "اُنس" مریدانِ حق کا۔ اس لیے کہ جس شخص کو بارگاہِ حق اور اس کے اوصاف کی تنزیہ میں زیادہ قیام ہوتا ہے، ہیبت کو اس کے دل پر زیادہ غلبہ ہوتا ہے اور اُنس سے اس کی طبیعت زیادہ متنفر ہوتی ہے کیونکہ محبت ہم جنس سے ہوا کرتی ہے، چونکہ بندے کو حق تعالیٰ کے ساتھ ہم جنس اور ہم شکل ہونا محال ہے، اس لیے اس کے ساتھ اُنس و محبت متصور نہیں ہو سکتی اور اسی طرح اس کی طرف سے بھی مخلوق کے ساتھ اُنس و محبت کا تصور محال ہے۔ اگر اُنس ہو بھی تو اس کے ذکر کے ساتھ ہونا ممکن ہے اور اس کا ذکر ظاہر ہے کہ اس کا غیر ہوتا ہے کیونکہ وہ بندے کی صفت ہے اور غیر حق کے ساتھ آرام پذیر ہونا محبت الٰہی میں جھوٹ اور نرا دعویٰ اور غلط خیال ہے اور ہیبت عظمت الٰہی کے مشاہدے سے ہوتی ہے اور عظمت حق تعالیٰ کی صفت ہے۔ پس وہ بندہ جس کا کام اپنی طرف سے اپنے ساتھ ہو اور بندہ جس کا کام اپنی فنا سے حق تعالیٰ کی بقا کے ساتھ ہو، ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے حکایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہے: میں کچھ مدت تک یہی سوچتا رہا کہ میں محبت الٰہی میں خوش ہو رہا ہوں اور اس کے مشاہدے کے ساتھ اُنس اختیار کیے ہوئے ہوں۔ اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ اُنس و محبت سوائے ہم جنس کے ہو ہی نہیں سکتی۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ ہیبت فراق اور سزا کا قرینہ رکھتی ہے اور اُنس وصل اور رحمت کا نتیجہ ہے۔ دوستانِ حق کو چاہیے کہ وہ ہیبت کی قسم کی باتوں سے محفوظ رہیں اور اُنس کے ساتھ ہم نشین رہیں، کیونکہ انس محبت کا تقاضا کرتا ہے جیسا کہ محبت کے لیے ہم جنس ہونا محال ہے، اُنس کے لیے بھی محال ہے۔ میرے شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: میں اس شخص پر تعجب کرتا ہوں جو یوں کہتا ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ اُنس کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: ہےاِنَّ عِبَادِیْ۔ (بلاشبہ میرے بندے) قُلْ لِّعِبَادِیَ (میرے بندوں سے کہہ دیجیے) وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ (اور جب آپ سے میرے بندے سوال کریں) یٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (اے میرے بندو! آج تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم غم کرو گے) اور ضرور جب بندہ اس مہربانی کو دیکھتا ہے تو اس کی دوستی اختیار کر لیتا ہے اور جب اس کی دوستی اختیار کر لیتا ہے تو اس سے انس کرتا ہے، اس لیے کہ دوست سے ڈرنا بیگانگی ہے اور اُنس کرنا اپنائیت ہے اور آدمی کی صفت یہ ہے کہ وہ اپنے احسان کرنے والے کے ساتھ اُنس کرتا ہے اور حق تعالیٰ کی ہم پر اتنی نعمتیں ہیں اور ہمیں ان کے ساتھ اتنی شناسائی ہے کہ محال ہے کہ ہم اس سے خوف کی کوئی بات کریں۔ میں علی بن عثمان جلابی رحمۃ اللہ علیہ کہتا ہوں کہ دونوں گروہ اس معاملے میں باوجود ان کے باہمی اختلاف کے، راستی پر ہیں۔ اس لیے کہ ہیبت کا غلبہ نفس اور اس باطن کی خواہش اور اس سے بشریت کے فنا کرنے کے ساتھ ہوتا ہے اور اُنس کا غلبہ باطن کے ساتھ اور باطن میں معرفت کے پرورش کرنے کے ساتھ ہوتا ہے۔ پس حق تعالیٰ اپنے جلال کی تجلی سے دوستوں کے نفس کو فانی کر دیتا ہے اور جمال کی تجلی سے ان کے باطن کو باقی کر دیتا ہے۔ پس جو لوگ اہل فنا تھے، انہوں نے ہیبت کو مقدم کہا اور جو اہل بقا تھے، انہوں نے اُنس کو فضیلت دی اور اس باب سے پہلے فنا اور بقا کے متعلق اس کی شرح بیان کر دی گئی ہے۔
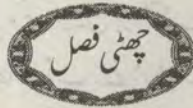
قہر و لطف

صوفیا کی اصطلاحات میں سے قہر اور لطف بھی دو اصطلاحیں ہیں، جن سے یہ اپنے حال کی تعبیر کرتے ہیں اور "قہر" سے ان کی مراد مرادوں کے فنا کرنے اور نفس کو اس کی آرزوؤں سے روکنے میں خدا کی تائید ہے، کیونکہ ان کے مقصد کا حصول اسی میں ہے۔ "لطف" سے مراد باطن کی بقا، مشاہدہ کے دوام اور درجۂ استقامت میں حال کے قرار کے ساتھ حق تعالیٰ کی تائید ہے، یہاں تک کہ ایک گروہ نے کہا ہے کہ کرامت یہ ہے کہ حق تعالیٰ بندے کو اپنی مراد کے ساتھ اس کی مراد روک دے اور نامرادی کے ساتھ اس کو مغلوب کر دے، چنانچہ اگر تشنگی کی حالت میں دریا میں چلا جائے تو دریا خشک ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ بغداد میں دو درویش تھے، جو فقر میں بڑے صاحب رُتبہ تھے۔ ایک صاحبِ قہر تھے اور دوسرے صاحبِ لطف اور ان میں ہمیشہ چشمک رہتی تھی اور ہر ایک اپنے حال کو دوسرے کے حال پر ترجیح دیتا تھا۔ ایک صاحب فرماتے کہ حق تعالیٰ کا لطف بندے پر سب چیزوں سے اشرف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اَللّٰهُ لَطِیْفٌۢ بِعِبَادِهٖ (اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے) دوسرے صاحب کہتے کہ حق تعالیٰ کا قہر بندے پر سب

سے کامل چیز ہے کیونکہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: وَھُوَ الْقَاھِرُ فَوْقَ عِبَادِہٖ (اور وہ اللہ اپنے بندوں پر غالب ہے)۔ اس مسئلہ میں ان کے درمیان کافی بحث و مباحثہ رہتا یہاں تک کہ صاحبِ لطف بزرگ نے مکہ کا قصد کیا، لیکن مکہ پہنچنے کی بجائے ایک جنگل میں جارہا اور مجاہدہ کرنے میں مصروف ہوا حتیٰ کہ کئی سال تک اس کا حال کسی کو معلوم نہ ہوا۔ ایک مرتبہ کوئی آدمی مکہ سے بغداد کو آرہا تھا تو اس نے اس بزرگ کو راستے میں دیکھا۔ اس بزرگ نے اس شخص سے کہا کہ "اے بھائی! جب تو عراق جائے تو میرے اس دوست کو جو بغداد کے محلّہ کرخ میں رہتا ہے، یہ بات پہنچا دے کہ اگر تو چاہتا ہے کہ جنگل کو باوجود اس کی تکالیف کے کرخ بغداد کی طرح اس کے عجائبات کے ساتھ دیکھے تو یہاں آجائے، کیونکہ جنگل میرے حق میں کرخ بغداد کی طرح ہے۔" جب وہ درویش بغداد کے محلّہ کرخ میں پہنچا اور اس کو دیکھ کر اسے پیغام پہنچایا تو اس کے رفیق نے کہا: "جب تو واپس جائے تو اس سے کہہ دے کہ اس میں کوئی شرف نہیں ہے کہ پر مشقت جنگل کو تیرے حق میں کرخِ بغداد کی طرح کر دیا گیا ہے تاکہ تو درگاہ سے نہ بھاگے بلکہ شرف اس میں ہے کہ کرخِ بغداد کو اس کی نعمت اور عجائب کے باوجود ہمارے حق میں پر مشقت جنگل کر دیا ہے اور ہم اس میں خوش و خرم ہیں۔"

حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنی مناجات میں کہا "بارِ خدایا! اگر تو آسمان کو میری گردن کا طوق بنادے اور زمین کو میرے پاؤں کی بیڑی اور سارے عالم کو تو میرے خون کا پیاسا کر دے تو بھی میں تجھ سے نہیں پھروں گا۔" میرے شیخ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک سال جنگل میں اولیاء اللہ کا اجتماع ہوا تھا اور میرے مرشد حضرت حصری رحمتہ اللہ علیہ مجھے بھی اپنے ساتھ وہاں لے گئے تھے۔ ایک گروہ کو میں نے دیکھا کہ ان کا ہر ایک تخت پر چلا آرہا تھا۔ ایک گروہ کو تخت ہوا پر لا رہے تھے اور دوسرا گروہ اُڑا چلا آرہا تھا اور اسی طرح ہر ایک آرہا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ میرے مرشد حضرت حصری رحمتہ اللہ علیہ ان میں سے کسی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ میں نے ایک جوان کو دیکھا جو ایسی حالت میں آرہا تھا کہ دونوں جوتیاں اور لاٹھی ٹوٹی ہوئی اور پاؤں بے کار، سر ننگا اور جسم جلا ہوا، بدن لاغر اور کمزور۔ جب وہ شخص نمودار ہوا تو حضرت حصری رحمتہ اللہ علیہ کود پڑے اور اس کے سامنے چلے گئے اور اس کو بہت اُونچے درجے پر بٹھا دیا۔ یہ دیکھ کر میں بڑا متعجب ہوا اور مجلس کے اختتام کے بعد جب میں نے حضرت شیخ سے اس جوان کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ "وہ اولیاء اللہ میں سے ایک ایسا ولی ہے کہ جو ولایت کا تابع نہیں، بلکہ ولایت اس کے تابع ہے۔ وہ کرامات کی طرف کچھ توجہ نہیں کرتا۔" الغرض جو کچھ ہم اپنے لیے اختیار کرتے ہیں، وہ ہمارے لیے مصیبت ہے۔ میں (علی بن عثمان جلابیؒ) اللہ تعالیٰ کی مرضی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا تاکہ وہ اس مقام رضا میں مجھے ہر آفت سے محفوظ رکھے۔ اگر وہ مجھے اپنے قہر میں رکھے تو میں لطف کی تمنا نہ کروں اور اگر لطف میں رکھے تو قہر کی میرے دل میں کوئی طلب نہ ہو، کیونکہ ہمیں اس کے اختیار میں کچھ دخل نہیں۔

ساتویں فصل
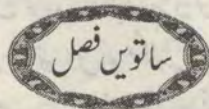
نفی واثبات

صوفیا کی اصطلاحات میں نفی واثبات کی اصطلاحیں بھی شامل ہیں۔ طریقت کے مشائخ رحمتہ اللہ علیہم آدمیت کے تمام اوصاف وخواہشات کے محو کرنے کو "نفی" اور اللہ تعالیٰ کی تائید، رضا اور جملہ اوصاف حقیقیہ کو ثابت کرنے کو "اثبات" کہتے ہیں اور پھر نفی سے بشریت کی صفات کی نفی اور اثبات سے حقیقت کے غلبے کا ثابت کرنا مراد لی ہے

کیونکہ محو کل کا مٹ جانا ہے اور کل کی نفی سوائے صفات کے اور کسی چیز پر بولی نہیں جاتی۔ اس لیے کہ ذات پر بشریت کی بقا کی حالت میں نفی ممکن نہیں۔ پس لازم ہے کہ عمدہ خصلتوں کے ثابت کرنے سے بری صفات کی نفی کی جائے یعنی حق تعالیٰ کی محبت میں مطلوب کے ثابت کرنے سے دعویٰ کی نفی کی جائے کیونکہ دعویٰ نفس کی سرکشیوں میں سے ایک سرکشی ہے اور ان صوفیا کی ہمیشہ سے یہ عادت ہے کہ جب ان کی بشریٰ صفات محبت الٰہی کے غلبے سے مغلوب ہو جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ اس طرح بقائے حق کے ثابت کرنے سے بشریت کی صفات کی نفی ہوتی ہے اور اسی معنی میں اس سے پہلے فقر و صفوت و فنا و بقا کے باب میں مفصل کلام ہو چکا ہے، لہٰذا یہاں اتنے پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔

نیز کہتے ہیں کہ اس سے مراد حق تعالیٰ کے اختیار کو ثابت کر کے بندے کے اختیار کی نفی کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس توفیق یافتہ بزرگ نے فرمایا ہے: اِخْتِيَارُ الْحَقِّ لِعَبْدِهٖ مَعَ عِلْمِهٖ لِعَبْدِهٖ خَيْرٌ مِّنْ اِخْتِيَارِ عَبْدِهٖ لِنَفْسِهٖ مَعَ جَهْلِهٖ بِرَبِّهٖ (ترجمہ: حق تعالیٰ کا اپنے بندے کے لیے اسے جانتے ہوئے کسی چیز کا پسند کرنا بہتر ہے، اس سے کہ بندہ خود اپنے لیے کوئی چیز پسند کرے جب کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت و مصلحت کو نہیں جانتا) کیونکہ محبت، محبّ کے اختیار کی نفی کرنا اور محبوب کے اختیار کو ثابت کرنا ہے اور یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے۔ مشائخ نے فرمایا ہے کہ محبت میں کمترین درجہ اپنے اختیار کی نفی کرنا ہے۔ پس حق تعالیٰ کا اختیار ازلی ہے کہ جس کی نفی ممکن نہیں اور بندے کا اختیار عارضی ہے جس کی نفی کرنا روا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ عارضی اختیار کو پاؤں تلے روند ڈالے تاکہ ازلی اختیار حاصل کرے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور پر انبساطی حالت میں تشریف لے گئے تو آپ نے رویتِ حق کی تمنا کی اور اپنے اختیار کے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے حق تعالیٰ سے عرض کیا: رَبِّ اَرِنِيْٓ۔ (اے میرے پروردگار! مجھے اپنی ذات دکھادے) حق تعالیٰ نے فرمایا: لَنْ تَرٰنِيْ۔ (تو ہرگز مجھے دیکھ نہ سکے گا)۔ عرض کیا: "بارِ خدایا! تیرا دیدار حق ہے اور میں اس کا مستحق ہوں تو یہ منع کس لیے ہے۔" فرمانِ الٰہی ہوا کہ "بے شک دیدار حق ہے لیکن محبت میں اختیار باطل ہے۔" اس معنی میں کلام بہت ہے لیکن میرا مقصود اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ تم جان لو کہ صوفیا کی ان مخصوص اصطلاحات کا کیا مطلب ہے اور توفیق اللہ کے قبضے میں ہے اور ان سب معانی میں سے جمع و تفرقہ و غیبت و حضور کا ذکر صوفیوں کے مذاہب میں گزر چکا ہے، جہاں کہ باخودی اور بے خودی اور ان معانی کی صورتیں میں نے بیان کی ہیں، وہاں اسے تلاش کرنا چاہیے، کیونکہ ان سب معانی کے بیان کا محل وہی تھا لیکن ضرورت کے طور پر یہاں بھی کچھ بیان کیا گیا ہے تاکہ ہر شخص کا مذہب ان کے متعلق مفصل طور پر سامنے آجائے۔
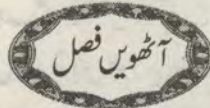
مسامرہ و محادثہ

ان کی اصطلاحات میں سے مسامرہ اور محادثہ بھی ہیں اور ان سے راہِ حق کے کاموں کے احوال میں سے دو حال مراد ہیں۔ "محادثہ" کی حقیقت یہ ہے کہ وہ باطن کا بھید ہے جسے زبان بیان کرنے سے قاصر ہے۔ "مسامرہ" کی حقیقت یہ ہے کہ وہ سر باطن کو چھپانے کی دائمی خوشی ہے اور اس کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ مسامرہ رات کے اوقات میں سے کوئی وقت ہے جب کہ بندے کو اپنے خدا کے ساتھ راز و نیاز کی کیفیت نصیب ہوتی ہے اور محادثہ دن کے اوقات میں سے ایک وقت ہے جس میں بندہ خدا کے ساتھ ظاہری و باطنی سوال و جواب میں مشغول ہوتا ہے۔ اسی

واسطے رات کی مناجات کو مسامرہ اور دن کی دعاؤں کو محادثہ کہتے ہیں۔ پس دن کا حال کشف پر مبنی ہوتا ہے اور رات کا حال پوشیدگی پر۔ پس محبتِ الٰہی میں مسامرہ، محادثہ سے زیادہ کامل ہے اور مسامرہ کا تعلق پیغمبر ﷺ کے حال سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب حق تعالیٰ نے چاہا کہ آپ کو اس کے ساتھ ایک وقت رات کی گفتگو کا میسر آئے تو اس نے جبرئیل علیہ السلام کو براق دے کر آپ کے پاس بھیجا۔ جس نے آپ کو رات کے وقت مکہ سے "قابِ قوسین" تک پہنچادیا اور آپ نے اپنے حق تعالیٰ کے ساتھ راز و نیاز کا کلام کیا اور سنا۔ جب نہایت کے درجے پر پہنچ گئے تو آپ کی زبان جلال حق کے مکاشفے میں گنگ ہوگئی اور آپ کا دل عظمت الٰہی کی کنہ میں متحیر ہوگیا اور آپ کا علم ذات حق کو پانے سے عاجز رہ گیا اور آپ کی زبان بیان سے قاصر ہوگئی تو آپ نے فرمایا: لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْكَ (ترجمہ: میں تیری ثنا کو پورے طور پر بیان نہیں کرسکتا) اور محادثہ کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آپ کو حق تعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی کا موقع ملے تو چالیس روز کے وعدے اور انتظار کے بعد طور پر آئے اور کلام حق سنا۔ یہاں تک انبساط حاصل ہوا تو دیدارِ حق کا سوال کیا، لیکن مراد کے پانے سے عاجز رہے اور ہوش جاتے رہے۔ جب ہوش میں آئے تو عرض کیا تُبْتُ اِلَیْكَ۔ (ترجمہ: میں نے اپنے خیال سے تیری جناب میں توبہ کی) تاکہ اس ذات کے درمیان جس کو فاعلان قضا و قدر ہی بارگاہ حق میں لائے تھے۔ جیسا کہ فرمایا سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا۔ (ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے (حضرت رسول کریم ﷺ) کو ایک رات سیر کرائی) اور اس ذات کے درمیان جو خود بارگاہِ حق میں حاضر ہوئے تھے (موسیٰ علیہ السلام) جیسا کہ فرمایا: وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا (ترجمہ: اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ہمارے وعدے کی جگہ پر آئے) فرق ظاہر ہو جائے۔ پس رات دوستوں کی خلوت کا وقت ہے اور دن بندوں کی خدمت کا اور ظاہر ہے کہ جب بندہ مقررہ حد سے گزر جائے تو اس کو زجر کرتے ہیں، لیکن دوست کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہوتی کہ اس سے گزرنے سے وہ ملامت کا مستحق ہو کیونکہ دوست جو کچھ بھی کرتا ہے، وہ دوست کی مرضی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور توفیق اللہ کے قبضہ میں ہے۔

نویں فصل
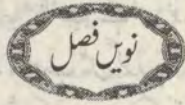
علم الیقین، حق الیقین اور عین الیقین

جاننا چاہیے کہ اصول کے مطابق ان سب اصطلاحات سے مراد اپنے معلوم کو جاننا ہے اور اپنے معلوم کی صحت پر یقین کے بغیر جاننا علم نہیں ہوتا اور جب علم حاصل ہو جائے تو غیب (پوشیدہ چیز) عین کی طرح ہو جاتا ہے کیونکہ کل قیامت کو جو مومن حق تعالیٰ کو دیکھیں گے تو اسی طور پر دیکھیں گے جیسا کہ آج وہ اس کو جانتے ہیں، اگر اس کے برخلاف دیکھیں یا کل کا دیکھنا صحیح نہ ہو یا آج دنیا میں علم درست نہ ہو تو یہ دونوں طرفیں توحید کے خلاف ہیں۔ اس لیے کہ آج دنیا میں مخلوق کا علم اس کی توحید کے متعلق درست ہے اور کل قیامت کو ان کا حق تعالیٰ کو دیکھنا درست ہوگا۔ پس ان کا یقینی علم توحید کے متعلق عین الیقین ہو جائے گا اور کما حقہ، یقین علم الیقین کی طرح ہوگا۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ عین یقین رویت حق کے متعلق پورا پورا علم ہے اور وہ محال ہے کیونکہ رویت علم حاصل ہونے کا آلہ ہے جیسا کہ سننا وغیرہ۔ جب پورا پورا علم سماع میں محال ہے تو رویت میں بھی محال ہے پس اس گروہ صوفیا کی مراد "علم الیقین" سے دنیا کے معاملات کو ان کے احکام کے ساتھ جاننا ہے اور "عین الیقین" سے مراد حالت نزع اور دنیا

سے جانے کے وقت کا علم ہے اور "حق الیقین" سے مراد بہشت میں رویت حق کے ظاہر ہونے اور اس کے احوال کی کیفیت کو آنکھوں سے دیکھ لینا ہے۔ پس علم الیقین علماء ہی کا درجہ ہے اس لیے کہ شرعی امور و احکام پر وہ ثابت قدم ہوتے ہیں اور عین الیقین عارفوں کا مقام ہے، اس لیے کہ موت کے لیے وہ بالکل مستعد ہوتے ہیں۔ حق الیقین دوستانِ حق کی فنا کا مقام ہے اس لیے کہ کل موجودات سے وہ اعراض کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ پس علم الیقین مجاہدہ سے، عین الیقین محبت الٰہی سے اور حق الیقین مشاہدۂ حق سے ہوتا ہے۔ ان میں سے علم الیقین تو عام ہے، عین الیقین خاص ہے اور حق الیقین خاص الخاص ہے اور یہ خدا جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، واللہ اعلم۔
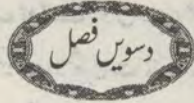
علم اور معرفت

اصطلاحاتِ صوفیا میں سے علم اور معرفت بھی ہے۔ علماءِ اصول نے علم اور معرفت میں فرق نہیں کیا بلکہ دونوں کو ایک ہی کہا ہے، البتہ انہوں نے کہا ہے کہ حق تعالیٰ کو عالم کہنا چاہیے، عارف نہیں کہنا چاہیے۔ گو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے متعلق کوئی صریح نص موجود نہیں لیکن مشائخ طریقت اس علم کو جس کے ساتھ عمل اور حال بھی ملا ہوا ہو اور اس کا عالم اپنے حال کو بیان کرے، "معرفت" کہتے ہیں اور اس کے عالم کو عارف۔ اس علم کو جو معنی سے الگ اور عمل سے خالی ہو، "علم" کہتے ہیں اور اس علم کے جاننے والے کو عالم کہتے ہیں۔ پس جو شخص کسی چیز کے معنی اور اس کی حقیقت کا عالم ہو، اس کو عارف کہتے ہیں اور جو محض عبارت اور اس کے حفظ کا معنی کے حفظ کے بغیر عالم ہو، اس کو عالم کہتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ جب صوفی لوگ اپنے ہم عصروں کی تحقیر کیا چاہتے ہیں تو اسے دانشمند کہتے ہیں اور عوام کو یہ بات بری معلوم ہوتی ہے، حالانکہ ان کی مراد علم کے حاصل کرنے سے اس کو ملامت کرنا نہیں ہوتی بلکہ عمل کے چھوڑنے کی وجہ سے اس کو ملامت کرنا مقصود ہوتا ہے: لِاَنَّ الْعَالِمَ قَائِمٌ بِنَفْسِہٖ وَ الْعَارِفُ قَائِمٌ بِرَبِّہٖ۔ (ترجمہ: کیونکہ عالم اپنی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے اور عارف اپنے رب کے ساتھ قائم ہوتا ہے)۔ اس معنی کے متعلق "کشفِ حجابِ معرفت" میں بہت کلام گزر چکا ہے اور یہاں اتنی مقدار کافی ہے۔
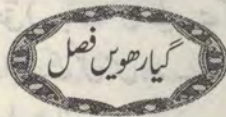
شریعت و حقیقت

یہ دونوں بھی اصطلاحاتِ صوفیا میں سے ہیں۔ ایک سے ظاہری حال کی صحت مراد ہے اور دوسری سے باطنی حالت کی دُرستی مراد ہے، لیکن دو گروہوں کو اس میں غلطی لگی ہے۔ ایک تو علماءِ ظاہر کو کہ وہ کہتے ہیں ہم دونوں میں فرق نہیں کرتے، کیونکہ شریعت خود حقیقت ہے اور حقیقت شریعت۔ دوسرا گروہ ملحدین کا ہے جو ان دونوں میں سے ہر ایک کا دوسرے کے بغیر قائم رہنا روا رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب حقیقت کا حال ظاہر ہوگیا تو شریعت اُٹھ گئی۔ یہ کلام بعینہ مشبہین[1]، قرامطہ اور وسوسہ ڈالنے والے لوگوں کا ہے اور اس بات کی دلیل کہ شریعت حکم میں حقیقت سے جدا ہے، یہ ہے کہ ایمان میں دل کی تصدیق زبان کے قول سے جدا ہے اور اس بات کی دلیل کہ اصل میں دل کی تصدیق زبان

---

[1] خدا کو جسمانی چیزوں سے تشبیہ دینے والے

کے اقرار سے جدا نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ صرف دل کی تصدیق بغیر زبان سے بولنے کے ایمان نہیں ہوسکتی اور زبان کا قول دل کی تصدیق کے بغیر منظور نہیں ہوتا اور قول اور تصدیق کے درمیان فرق ظاہر ہے۔ "پس حقیقت" سے مراد وہ معنی ہیں جن میں نسخ جائز نہیں اور عہدِ آدم سے لے کر عالم کے فنا ہونے تک اس کا حکم ایک ہی ہے، جیسا کہ حق کی معرفت اور اپنے عمل کی صحت جو خلوص نیت پر مبنی ہے اور "شریعت" سے مراد وہ معنی ہیں جن میں تغیر و تبدل جائز ہے جیسا کہ احکام اور اوامرِ الٰہی۔ پس شریعت کا قائم کرنا حقیقت کے وجود کے بغیر محال ہے اور حقیقت کا قائم کرنا شریعت کی حفاظت کے بغیر محال۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص جان کے ساتھ زندہ ہو اور جب جان اس سے جدا ہو جائے تو وہ شخص مردہ ہو جائے اور جان مثل ایک ہوا کے ہوتی ہے، غرض یہ کہ جسم و جان کی قیمت ایک دوسرے کے ساتھ ملنے کی وجہ سے ہے۔ ٹھیک اسی طرح حقیقت و شریعت ہیں کہ شریعت بغیر حقیقت کے ریا ہے اور حقیقت بغیر شریعت کے منافقت۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے: "جو لوگ ہمارے دین کے متعلق کوشش کرتے ہیں، ہم انہیں اپنے سیدھے رستے کی ہدایت کریں گے۔" پس مجاہدہ شریعت ہے اور ہدایت اس کی حقیقت۔ شریعت ظاہری احکام و اوامر کی پابندی ہے اور حقیقت خدا کی طرف سے بندے کے احوالِ باطن کی حفاظت۔ پس شریعت بندے کے کسب و کوشش سے ہے اور حقیقت اللہ تعالیٰ کی بخششوں اور غیبی تائیدات میں سے۔ یہ جو کچھ بیان ہو چکا، صوفیا کرام کی پہلی قسم کی مصطلحات ہیں۔ اب میں دوسری قسم کی اصطلاحات بھی مختصراً بیان کرتا ہوں تاکہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تمہیں عالم معنی کے کچھ مزید حقائق و معارف معلوم ہو جائیں، واللہ اعلم۔

بارھویں فصل
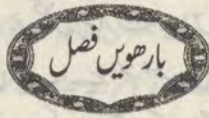
اصطلاحاتِ صوفیا کی دوسری قسم

ان اصطلاحات کی دوسری قسم وہ اصطلاحیں ہیں، جو صوفیائے کرام کے کلام میں استعارے کے طور پر رائج اور مستعمل ہیں۔ ان کی تفصیل اور شرح بہت مشکل ہوتی ہے۔ میں یہاں مختصر طور پر اس نوع کو بیان کرتا ہوں۔

اَلْحَقّ ان کی مراد اس سے حق تعالیٰ ہے کیونکہ یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے، جیسا کہ فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ (یہ بات اس لیے ہے کہ اللہ حق ہے)۔

اَلْحَقِيْقَتُ اس لفظ سے ان کی مراد ہے وصل الٰہی کے محل میں بندے کا اقامت کرنا اور محل تنزیہ پر اس کے سِرّ کا ٹھہرنا۔

اَلْخُطْرَاتُ تفرقہ کی باتوں میں سے جو کچھ دل پر گزرے۔

اَلْوَطَنَاتُ الٰہی معارف سے جو کچھ باطن میں جاگزیں ہو۔

الطَّمْسُ اصل چیز کی نفی کرنا جس کا اثر یاد میں باقی رہے۔

اَلرَّمْسُ کسی چیز کا دل سے اس کے اصل کے ساتھ نفی کرنا۔

اَلْعَلَائِقُ وہ اسباب کہ طالب ان سے تعلق پیدا کر کے اپنی مراد سے قاصر رہے۔

اَلْوَسَائِط وہ اسباب جن سے تعلق پیدا کر کے لوگ مراد کو پہنچ جاتے ہیں۔

اَلذَّوَائِدُ دل میں نورِ الٰہی کی زیادتی۔

اَلْفَوَائِدُ باطن کا اس چیز کو معلوم کر لینا جو اس کے لیے ضروری ہو۔

اَلْمُلْجَاءُ دل کا اپنی مراد کے حصول پر اعتماد کرنا۔
اَلْمُنْجَاءُ دل کا آفت کے محل سے خلاصی پانا۔
اَلْكُلِيَّةُ انسانیت کے اوصاف کو کلی طور پر پالینا۔
اَللَّوَائِحُ نفی کے وارد ہونے سے مراد کا ثابت کرنا۔
اَللَّوَامِعُ دل پر نور کا اس کے فوائد کی بقا کے ساتھ ظاہر ہونا۔
اَلطَّوَالِعُ دل پر معارفِ الٰہی کے انوار کا طلوع کرنا۔
اَلطَّوَارِقُ رات کے وقت مناجات میں بشارت یا زجر کے ساتھ ایک حالت کا دل پر وارد ہونا۔
اَللَّطَائِفُ حال کی باریکیوں سے دل میں لطیف اشارے کا آنا۔
اَلسِّرُّ محبتِ الٰہی کے احوال کو پوشیدہ رکھنا۔
اَلنَّجْوٰی غیر کی اطلاع سے خرابیوں کو چھپانا۔
اَلْاِشَارَةُ غیر کا زبان کے بیان کے بغیر مراد سے خبر دینا (دل کی بات بتانا)۔
اَلْاِيْمَاءُ بغیر زبان اور اشارے کے تعریضاً خطاب کرنا۔
اَلْوَارِدُ دل میں معانی کا اُترنا۔
اَلْاِنْتِبَاهُ دل سے غفلت کا زائل ہونا۔
اَلْاِشْتِبَاهُ حکم کی دونوں اطراف یعنی حق اور باطل میں حال کا مشتبہ ہونا۔
اَلْقَرَارُ حال کی حقیقت سے تردّد کا زائل ہونا۔
اَلْاِنْزِعَاجُ وجد و تواجد کے عالم میں دل کا حرکت کرنا۔

صوفیا کی اصطلاحات میں سے بعض کے معانی مختصراً یہ ہیں، واللہ اعلم۔

تیرہویں فصل
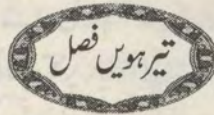
اصطلاحاتِ صوفیا کی تیسری قسم

ان اصطلاحات کی تیسری قسم وہ اصطلاحیں ہیں، جنھیں صوفیائے کرام حق تعالیٰ کی توحید اور حقائقِ الٰہی میں اپنے اعتقاد کے بیان میں بغیر استعارہ استعمال کرتے ہیں اور وہ یہ ہیں:-

اَلْعَالَم اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی مخلوقات ہیں اور کہتے ہیں کہ عالم اٹھارہ ہزار یا پچاس ہزار ہیں۔ فلسفی لوگ کہتے ہیں کہ دو عالم ہیں: ایک عالم علوی اور دوسرا عالم سفلی۔ علماءِ اصول کہتے ہیں کہ عرش سے لے کر زمین کے نیچے تک جو کچھ ہے، وہ سب ایک عالم ہے۔ الغرض عالم مختلف اجناس مخلوقات کا مجموعہ ہے اور اہل طریقت بھی عالم ارواح اور عالم نفوس کے قائل ہیں اور ان کی مراد وہ نہیں ہے جو فلسفیوں کی ہے، کیونکہ ان کی مراد ارواح اور نفوس کا مجموعہ ہے۔
اَلْمُحْدَثُ جو وجود میں متاخر ہو یعنی پہلے نہیں تھا اور بعد میں ہوا۔
اَلْقَدِيْمُ جو وجود میں ہمیشہ سے تھا اور یہ خداوند تعالیٰ کے سوائے اور کچھ نہیں۔

اَلْاَزَلُ وہ جس کی ابتدا نہ ہو۔

اَلْاَبَدُ وہ جس کی انتہا نہ ہو۔

اَلذَّاتُ کسی چیز کا اصل اور اس کی حقیقت۔

اَلصِّفَتُ جو موصوف نہ ہو سکے کیونکہ وہ قائم بخود نہیں ہوتا یعنی دوسرے کی نعت ہو سکے۔

اَلْاِسْمُ علامت جو مسمّٰی کا غیر ہے۔

اَلتَّسْمِیَۃُ مسمّٰی کی بابت خبر دینا (نام رکھنا)۔

اَلنَّفْیُ جو قابلِ نفی چیز کے عدم کا تقاضا کرے۔

اَلْاِثْبَاتُ جو قابلِ اثبات چیز کے وجود کا تقاضا کرے۔

اَلشَّیْأَانِ وہ دو چیزیں کہ ایک کا وجود دوسرے کے ہوتے ہوئے روا ہو۔

اَلضِّدَانِ وہ دو چیزیں کہ ان میں سے ایک کا وجود دوسرے کے ہوتے ہوئے ایک حال میں روا نہ ہو۔

اَلْغَیْرَانِ وہ دو چیزیں کہ ایک کا وجود دوسرے کی فنا کے ساتھ روا ہو۔

اَلْجَوْھَرُ کسی چیز کا اصل جو بذاتِ خود قائم ہو۔

اَلْعَرْضُ جو جوہر کے ساتھ قائم ہو۔

اَلْجِسْمُ جو اجراتے پراگندہ سے مرکب ہو۔

اَلسُّؤَالُ کسی حقیقت کا طلب کرنا۔

اَلْجَوَابُ سوال کے مضمون کے متعلق خبر دینا۔

اَلْحَسَنُ جو حکم کے موافق ہو۔

اَلْقَبِیْحُ جو امرِ الٰہی کے مخالف ہو۔

اَلسَّفْہُ امرِ حق کا ترک کرنا۔

اَلظُّلْمُ کسی چیز کو بے محل رکھنا۔

اَلْعَدْلُ کسی چیز کو اپنے محل پر رکھنا۔

اَلْمُلْکُ وہ جس کے فعل پر اعتراض نہ کر سکیں۔

یہ مختصراً وہ اصطلاحات ہیں کہ طالبِ حق کو ان کو جانے بغیر چارہ نہیں۔
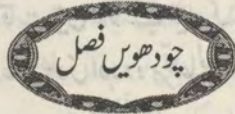
اصطلاحاتِ صوفیا کی چوتھی قسم

اصطلاحاتِ صوفیا کی چوتھی قسم وہ اصطلاحیں ہیں جن کی شرح کی ضرورت ہے اور وہ صوفیا کے درمیان مروّج ہیں۔ ان کا مقصود ان اصطلاحات سے وہ نہیں ہوتا جو اہل لغت کا ظاہر لفظ سے مراد ہوتا ہے۔

اَلْخَاطِرُ "خاطر" سے مراد ایک خیالی بات کا کسی ایسے طور پر دل میں آنا کہ وہ کسی دوسرے خیال کی وجہ سے جلدی ہی زوال پذیر ہو جائے اور صاحب خیال کو اس خیال کے دل سے دور کرنے پر قدرت ہو۔ ایسے

خیالات والے لوگ ان اُمور میں جو حق تعالیٰ کی طرف سے بندے کو بے وجہ پہنچتے ہیں، پہلے خیال کے تابع ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت خیر نساج رحمتہ اللہ علیہ کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا کہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ دروازے پر کھڑے ہیں۔ آپ نے اس خیال کو دل سے ہٹانا چاہا تو ایک دوسرا خیال اس کی تردید میں آیا۔ اس کے ہٹانے میں مشغول ہوئے۔ بالآخر جب تیسرے خیال پر آپ باہر نکلے تو حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کو دروازے پر کھڑے دیکھا۔ انہوں نے فرمایا: "اے خیر! اگر تم پہلے خیال کی پروری کرتے اور مشائخ کی سیرت بجالاتے تو مجھے اتنی دیر تک دروازے پر کھڑا رہنا نہ پڑتا" اور مشائخ نے کہا ہے کہ اگر خیال وہی تھا جو حضرت خیر نساج رحمتہ اللہ علیہ کے دل پر گزرا تو حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا خیال کیا تھا۔ مشائخ نے کہا ہے کہ چونکہ حضرت جنید، حضرت خیر نساج رحمتہ اللہ علیہ کے پیر تھے، اس لیے پیر لامحالہ اپنے مرید کے احوال پر واقف ہوتا ہے۔

اَلْوَاقِعُ "واقع" سے مراد وہ معنی ہیں جو دل میں ظہور پذیر ہو اور باقی رہے بخلاف خاطر کے اور کسی حالت میں بھی طالب کو اُسے دور کرنے پر قدرت نہ ہو، چنانچہ کہتے ہیں۔ خَطَرَ عَلٰی قَلْبِیْ وَوَقَعَ عَلٰی قَلْبِیْ (ترجمہ: میرے دل پر ایک خیال گزرا اور میرے دل میں ایک بات آئی) پس تمام دل خیالات کا محل ہوتے ہیں لیکن واقعات اس دل کے سوا کسی اور میں صورت پذیر نہیں ہوتے، جس کے اندر سب کی سب حق تعالیٰ ہی کی بات ہو۔ یہی سبب ہے کہ جب مرید کو حق تعالیٰ کی راہ میں کوئی بندش ظاہر ہوتی ہے تو اس کو قید کہتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ اس کو ایک واقعہ یعنی مشکل پیش آئی اور پھر اہل لغت واقعہ سے مراد مسائل میں مشکل پیش آنا لیتے ہیں۔ جب کوئی شخص اس کا جواب دے دے اور اس مشکل کو اٹھا دے تو یوں کہتے ہیں کہ واقعہ یعنی مشکل حل ہوگئی، لیکن اہلِ تحقیق کہتے ہیں کہ واقعہ وہ ہوتا ہے جس کا حل ہونا روا نہ ہو اور جو حل ہو جاتا ہے، خیال ہے نہ واقعہ کیونکہ اہلِ تحقیق کی رُکاوٹ کسی حقیر معاملے میں نہیں ہوتی کہ ہر وقت اس کا حکم بدل جائے اور حال تبدیل ہو جائے۔

اَلْاِخْتِیَارُ "اختیار" سے ان کی مراد یہ ہے کہ اپنے اختیار پر حق تعالیٰ کے اختیار کو ترجیح دیں یعنی خیر و شر میں جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے پسند کیا ہے، اس کو کافی سمجھیں اور بندے کا حق تعالیٰ کے اختیار کو اختیار کرنا بھی حق تعالیٰ کے اختیار ہی سے ہوتا ہے کیونکہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ حق تعالیٰ نے اس بندے کو بے اختیار کر دیا ہے تو وہ بندہ ہرگز اپنے اختیار کو نہ چھوڑتا۔ حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کہ "امین کون ہوتا ہے؟" تو آپ نے فرمایا: "وہ ہے جس کو اختیار نہ رہا ہو اور حق تعالیٰ کا اختیار ہی اس کا اختیار ہو گیا ہو۔" حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ کو بخار ہوا تو آپ نے یوں دُعا فرمائی: "بارِ خدایا! مجھے عافیت عطا کر۔" آپ کے باطن سے ندا ہوئی کہ "تو کون ہے جو میرے ملک میں کلام کرتا ہے اور تدبیر کو اختیار کرتا ہے، میں اپنے ملک کی تدبیر تجھ سے بہتر جانتا ہوں، تو میرے اختیار کو اختیار کر، اپنے آپ کو بااختیار ظاہر نہ کر"، واللہ اعلم۔

اَلْاِمْتِحَانُ اس لفظ سے وہ لوگ اولیا کے دل کو طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کرنا مراد لیتے ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے ان کے دل پر نازل ہوتی ہیں، جیسے خوف، غم، قبض اور ہیبت وغیرہ، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے

فرمایا ہے: أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ ۚ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ۔ (ترجمہ: یہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پرہیز گاری کے لیے ابتلا میں ڈالا ہے ان کے لیے بخشش اور بڑا اجر ہے) اور یہ درجہ بہت بلند ہے، واللہ اعلم۔

اَلْبَلَاءُ "بلا" سے اولیا کے جسم کو طرح طرح کی تکلیفوں، بیماریوں اور غموں سے ابتلا میں ڈالنا مراد لیتے ہیں اور جس قدر بندے پر مصیبت زیادہ قوی ہوتی ہے، حق تعالیٰ سے اس کا قرب زیادہ ہوتا ہے کیونکہ مصیبت اولیا کا لباس، برگزیدہ لوگوں کا گہوارہ اور انبیا کی غذا ہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِيَاءِ اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً۔ (ترجمہ: ہم انبیا کا گروہ سب لوگوں سے زیادہ مصیبت میں ہوتے ہیں) نیز فرمایا: اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً اَلْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْاَوْلِيَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ (ترجمہ: سب سے زیادہ مصیبت میں انبیاء ہوتے ہیں، پھر اولیاء پھر وہ لوگ جو زیادہ بزرگ ہیں، پھر جو زیادہ بزرگ ہیں)۔ الغرض بلا اس رنج کا نام ہے جو مومن بندے کے دل اور جسم پر ظاہر ہو اور جس کی حقیقت نعمت ہو اور اس لیے کہ اس کا بھید بندے پر پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس کے رنج برداشت کرنے کی وجہ سے اسے ثواب حاصل ہوتا ہے لیکن وہ مصیبت جو کافروں پر پڑتی ہے، بلا نہیں ہوتی بلکہ وہ بدبختی ہوتی ہے اور کافروں کو بدبختی سے شفا نہیں ہوتی۔ پس بلا کا مرتبہ امتحان کے مرتبہ سے زیادہ بزرگ ہے، کیونکہ امتحان کا اثر صرف دل پر ہوتا ہے اور بلا کا اثر دل اور جسم دونوں پر ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

اَلتَّحَلِّيْ اس سے مراد کسی اچھی قوم کے ساتھ صرف قول میں بغیر عمل کے مشابہت پیدا کرنا ہے اور پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: لَيْسَ الْاِيْمَانُ بِالتَّحَلِّيْ وَالتَّمَنِّيْ لٰكِنْ مَّا وُقِّرَ فِي الْقُلُوْبِ وَصَدَّقَهُ الْعَمَلُ۔ (ایمان اچھی قوم کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے اور ان جیسے بننے کی آرزو کرنے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ جو کچھ دل میں حق تعالیٰ کی نسبت یقین جم جائے اور پھر اس کی تصدیق عمل سے کی جائے، حقیقت میں ایمان ہے) پس اپنے آپ کو کسی جماعت کے ساتھ اس کے حقیقی عمل کے بغیر مانند کرنا تحلی ہے اور جو لوگ اپنے آپ کو اچھا دکھاتے ہیں اور درحقیقت اچھے نہیں ہوتے، جلدی رُسوا ہو جاتے ہیں اور ان کا راز فاش ہو جاتا ہے، گو کہ اہلِ تحقیق کے نزدیک وہ پہلے ہی سے رُسوا ہوتے ہیں اور ان کا راز ظاہر ہوتا ہے۔

اَلتَّجَلِّيْ "تجلی" سے مراد حق تعالیٰ کے انوار کا ذاتِ حق کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونے والے لوگوں کے دل میں ایسے طور سے اثر انداز ہونا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ اس قابل ہو جائیں کہ دل سے حق تعالیٰ کو دیکھ سکیں۔ اس دلی رویتِ حق اور عینی رویتِ حق کے درمیان یہ فرق ہے کہ دل میں جلوۂ حق پانے والا اگر چاہے تو حق کو دیکھ لیتا ہے، اگر نہ چاہے تو نہیں دیکھتا، یا کبھی دیکھتا ہے اور کبھی نہیں دیکھتا اور عینی رویت والے بہشت میں اگر حق کو نہ دیکھنا چاہیں تو ایسا نہیں کر سکیں گے، کیونکہ تجلی پر پردہ کا آنا جائز ہے لیکن رویت پر حجاب روا نہیں، واللہ اعلم۔

اَلتَّخَلِّيْ "تخلی" کے معنی ان اشغال سے اعراض کرنا ہے جو بندے کو خداوند تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے سے مانع ہوتے ہیں اور ایک ان میں سے دُنیا ہے کہ بندے کو اس سے ہاتھ اٹھا لینا چاہیے، دوسری عقبیٰ کی محبت ہے کہ دل کو اس سے خالی کر لینا چاہیے، تیسری خواہشِ نفس کی پیروی ہے کہ باطن کو اس سے

خالی کر لینا چاہیے اور چوتھی خلقت کی صحبت ہے کہ اپنے آپ کو اس سے علیحدہ کر لینا چاہیے اور دل کو ان کے خیال سے خالی کر لینا چاہیے۔

اَلشُّرُوْدُ "شرود" کے لغوی معنی بھاگنا اور اصطلاح میں اللہ تعالیٰ تک پہنچنے میں جن موانع اور پردوں سے دل میں بے قراری پیدا ہوتی ہے، ان سے خلاصی پانے کے لیے بھاگنا کیونکہ طالب مولیٰ کی تمام مصیبتیں حق تعالیٰ سے حجاب کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ پس حجاب کے دُور کرنے میں طالبانِ حق کی ہر تدبیر اور ان کے سفر اور ہر چیز کے ساتھ ان کے تعلق پیدا کرنے کو شرود کہتے ہیں اور جو شخص طلب حق کی ابتدا میں زیادہ بے قرار ہوتا ہے، وصل حق کی انتہا میں زیادہ قرار پذیر ہوتا ہے۔

اَلْقُصُوْدُ "قصود" سے ان صوفیا کی مراد حقیقت کی طلب کے لیے صحیح ارادہ کرنا ہے اور اس جماعت کا قصد حرکت و سکون سے وابستہ نہیں ہوتا کیونکہ دوست حق محبتِ الٰہی میں اگرچہ ساکن ہی ہو، وہ قصد کرنے والا ہوتا ہے اور یہ عادت کے خلاف ہے، اس لیے کہ قاصدوں کے قصد کو یا تو ان کے ظاہر حال پر کوئی تاثیر ہوتی ہے یا ان کے باطن میں قصد کا نشان ہوتا ہے۔ سوائے دوستانِ حق کے کہ وہ بغیر کسی علت کے طلب حق کرنے اور بغیر اپنی حرکات کے حق کا قصد کرنے والے ہوتے ہیں اور ان کی تمام صفتیں خود قصد ہی ہوتی ہیں کیونکہ وہ انتہائی قصد کرتے ہیں۔ جب محبت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ ہمہ تن قصد ہی ہوتی ہے۔

اَلْاِصْطِنَاعُ صوفیا اس لفظ سے یہ مراد لیتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ بندے کو اس کے تمام نصیبوں کے فنا کرنے اور اس کے نفس کی تمام لذات کو زائل کرنے سے مہذب کر دیتا ہے اور اس کے نفس کے اوصاف کو تبدیل کر دیتا ہے تاکہ صفت کے زوال اور اوصاف نفسانی کی تبدیلی سے وہ اپنے آپ سے بے خود ہو جائے اور اس بلند درجے سے پیغمبر مخصوص ہوتے ہیں۔ مشائخ رحمہم اللہ کا ایک گروہ اس اصطلاح کو اولیا کے لیے بھی جائز سمجھتے ہیں، واللہ اعلم۔

اَلْاِصْطِفَاءُ "اصطفاء" یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کے دل کو اپنی معرفت کے لیے بالکل خالی کر دے تاکہ اس کی معرفت اپنی صفائی اس کے دل میں پھیلا دے اور اس درجے میں خاص و عام، مومن و کافر، نافرمان و فرماں بردار، ولی و نبی سب یکساں ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ ؕ (ترجمہ: پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب دی جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا۔ پس ان میں سے بعض تو اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض میانہ رو ہیں اور بعض نیک کاموں میں سبقت کرنے والے ہیں)۔

اَلْاِصْطِلَامُ لغت میں اس کے معنی جڑ سے اُکھاڑنا اور اصطلاح میں تجلیاتِ حق کا بندے کے اپنے ارادے کو کسی محبت بھری نرم آزمائش کے ذریعہ مٹانا اور اس کو اللہ تعالیٰ کا مطیع بنانا اصطلام کہلاتا ہے۔ قلبِ ممتحن[1] اور قلب مصطلم[2] دونوں کے ایک ہی معنی ہیں، البتہ اہلِ طریقت کی مروجہ عبارتوں میں اصطلام زیادہ خاص اور نرم امتحان ہے، واللہ اعلم۔

[1] قلب ممتحن: آزمایا ہوا دل [2] قلب مصطلم: جڑ سے اُکھاڑا ہوا دل

اَلرَّیْنُ یہ دل پر ایک حجاب ہوتا ہے جو ایمان کے سوا کسی اور چیز سے دُور نہیں کیا جاسکتا اور وہ کفر اور گمراہی کا حجاب ہی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کفار کی صفت میں فرمایا ہے: كَلَّا بَلْ سکتہ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (ترجمہ: ہرگز ایسا نہیں بلکہ جو کچھ وہ کفر و شرک کیا کرتے تھے، وہ ان کے دلوں پر ایک قسم کا زنگ یعنی حجاب ہو گیا ہے) ایک گروہ کہتا ہے کہ رین وہ حجاب ہے جس کا زوال کسی طرح ممکن نہ ہو کیونکہ کافر کا دل اسلام قبول نہیں کر سکتا اور کفار میں سے جو لوگ اسلام میں داخل ہوتے ہیں، وہ علم الٰہی میں مومن ہی ہوتے ہیں۔

اَلْغَیْنُ "غین" دل پر وہ حجاب ہوتا ہے جو استغفار کرنے سے اُٹھ جاتا ہے اور دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک حجابِ خفیف اور دوسرا حجابِ غلیظ۔ حجابِ غلیظ تو اہلِ غفلت اور کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لیے ہوتا ہے اور حجابِ خفیف سب کو ہوسکتا ہے، خواہ ولی ہو خواہ نبی۔ کیا تو نے نہیں دیکھا پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: اِنَّهٗ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِىْ وَاِنِّىْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِىْ كُلِّ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ (ترجمہ: بات یہ ہے کہ میرے دل پر ایسا خفیف سا پردہ آجاتا ہے اور بلاشبہ میں ہر روز سو بار استغفار کرتا ہوں) پس حجابِ غلیظ کے لیے توبہ ضرور چاہیے اور حجابِ خفیف کے لیے حق تعالیٰ کی طرف سچا رجوع درکار ہے۔ توبہ کے معنی گناہ سے بندگی کی طرف لوٹنا ہیں اور رجوع کے معنی اپنے آپ سے خداوند تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا ہیں۔ پس توبہ تو جرم سے کرتے ہیں اور بندے کا جرم نافرمانی حق اور دوستانِ حق کا جرم اپنے وجود کو دیکھنا ہے۔ اگر کوئی شخص غلطی سے حق بات کی طرف رجوع کرے تو کہتے ہیں کہ توبہ کرنے والا ہے اور اگر صواب سے زیادہ صواب کی طرف لوٹے تو کہتے ہیں رجوع کرنے والا ہے اور یہ سب باتیں میں نے توبہ کے باب میں بیان کر دی ہیں۔

اَلتَّلْبِیْسُ کسی چیز کو اس کی حقیقت کے خلاف لوگوں کے سامنے ظاہر کرنے کو "تلبیس" کہتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ (ترجمہ: اور البتہ ہم ان پر مشتبہ کر دیں گے جو کچھ حق کو باطل سے ملاتے ہیں)۔ یہ صفت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لیے محال ہے کیونکہ وہ کافر کو مومن کی صفت میں ظاہر کرتا ہے اور مومن کو کافر کی صفت میں، حتیٰ کہ ہر شخص میں اس کے حکم اور اس کی حقیقت کے ظاہر کرنے کا وقت ہوتا ہے۔ جب اس گروہ میں سے کوئی آدمی اچھی خصلتوں کو بری صفات سے پوشیدہ کرتا ہے تو کہتے ہیں کہ وہ تلبیس کرتا ہے اور اس کے سوا کسی اور جگہ اس اصطلاح کو استعمال نہیں کرتے۔ نفاق وریا کو تلبیس نہیں کہتے خواہ وہ تلبیس ہی ہیں، کیونکہ تلبیس حق تعالیٰ کے فعل کے قائم کرنے کے سوا کسی اور موقع پر مستعمل نہیں ہوتا۔

اَلشُّرْبُ بندگی کی شیرینی، بزرگی کی لذت اور محبت کی راحت کو یہ لوگ "شرب" کہتے ہیں اور کوئی شخص کوئی کام شرب کی لذت کے بغیر نہیں کرسکتا، جیسا کہ جسم کی لذت پانی سے ہوتی ہے، دل کی لذت بندگی کی حلاوت اور اُنس کی راحت سے ہوتی ہے۔ میرے شیخ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ وہ مرید اور عارف جن کو شرب حاصل نہ ہو، ارادت و معرفت سے بیگانہ ہوتے ہیں کیونکہ مرید کو چاہیے کہ اپنے کام سے اس کو لذت حاصل ہو تاکہ ارادت میں طلب کا حق ادا کرے اور عارف کو یہ نہ چاہیے کہ حق کے بغیر اس کو

شرب حاصل ہو یا شرب اس کے لیے ایسا حال ہو جو نفس سے تعلق رکھتا ہو اور وہ آرام پائے، واللہ اعلم۔

اَلذَّوْق "ذوق" بھی شرب کی مانند ہوتا ہے، لیکن شرب راحتوں کے سوا کسی اور موقع پر مستعمل نہیں ہوتا اور ذوق رنج و راحت ہر دو کا متحمل ہو سکتا ہے چنانچہ ایک عارف کہتا ہے: ذُقْتُ الْحَلَاوۃَ وَذُقْتُ الْبَلَاءَ وَذُقْتُ الرَّاحَۃَ (ترجمہ: میں نے بندگی کی حلاوت چکھی اور میں نے رنج و راحت کا مزا چکھا)۔ یہ سب درست ہے اور پھر شرب کو کہتے ہیں: شَرِبْتُ بِکَاْسِ الْوَصْلِ اَوْ بِکَاْسِ الْوُدِّ۔ (ترجمہ: میں نے وصل یا محبت کا پیالہ پیا) وغیرہ، کیونکہ خداوند تعالیٰ نے جب شرب کی بات یاد کی تو فرمایا: کُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓئًا (کھاؤ پیو خوشگوار) اور جب ذوق کا ذکر کیا تو یوں فرمایا: ذُقْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ (ترجمہ: عذاب کا مزہ چکھ کہ تو تو بڑا عزت والا بزرگی والا ہے) ایک اور جگہ فرمایا ہے: ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ (اور دوزخ کے چھونے کا مزہ چکھو)۔

صوفیا کے درمیان مروّجہ اصطلاحات کے معانی کے احکام یہ ہیں، جو میں نے اوپر بیان کر دیئے اگر ان سب کو میں لکھتا تو کتاب طویل ہو جاتی، واللہ اعلم۔
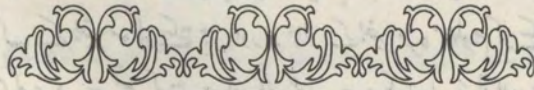
چونتیسواں باب

گیارھویں پردے کا کھولنا

پہلی فصل
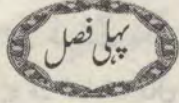
ثبوتِ سماع

جاننا چاہیے کہ حصولِ علم کے اسباب پانچ ہیں: اوّل سننا، دوم دیکھنا، سوم چکھنا، چہارم سونگھنا، پنجم چھونا اور اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل کے لیے یہ پانچ دروازے پیدا کر دیئے ہیں اور ہر ایک قسم کا علم ان میں سے کسی ایک سے وابستہ ہے، جیسا کہ آوازوں اور خبروں کا علم سننے سے متعلق ہے اور رنگوں اور جسموں کا علم دیکھنے سے، میٹھے اور کڑوے ذائقوں کا چکھنے سے، اچھی بُری بو کا علم سونگھنے سے اور سختی و نرمی کا چھونے سے اور ان پانچ حواس میں سے چار کو خاص محل میں رکھا ہے اور ایک کو سارے اعضا میں پھیلا دیا ہے یعنی سننے کا محل کان، دیکھنے کا محل آنکھ، چکھنے کا تالو اور سونگھنے کا ناک سے متعلق کیا ہے اور چھونے کو تمام اعضا میں جاری کر دیا ہے کیونکہ آدمی آنکھ کے سوا دیکھ نہیں سکتے اور نہ کان کے بغیر سن سکتے ہیں اور نہ ناک کے بغیر سونگھ سکتے ہیں اور نہ تالو کے بغیر مزہ معلوم کر سکتے ہیں، لیکن سارا جسم چھونے سے نرم کو سخت سے اور گرم کو سرد سے تمیز کرتا ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو ان حواس میں سے ہر ایک حس کا تمام اعضا میں شائع ہونا بھی جائز ہے جیسے حسِ لمس، لیکن معتزلہ کے نزدیک ان پانچ حواس میں سے ہر ایک حس کا اپنے مخصوص محل کے سوا کسی اور محل میں اطلاق و استعمال صحیح نہیں لیکن حسِ لمس سے ان کا قول ردّ ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے لیے کوئی خاص محل نہیں ہے۔ جب ان پانچوں حواس میں سے ایک حس یعنی لمس کا محل مخصوص نہیں ہے اور اس کا اس صفت سے موصوف ہونا روا ہے تو دوسرے حواس کا بھی اس صفت سے موصوف ہونا روا ہو سکتا ہے۔

گو ہمارا مقصود یہاں یہ بیان کرنا نہیں لیکن معنی کی تحقیق کے لیے اتنا بیان کر دینے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ پس چار حواس میں سے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، پانچویں حس کو چھوڑ کر جو سننا ہے، ایک حس دیکھتی ہے، دوسری سونگھتی ہے، تیسری چکھتی ہے، چوتھی چھوتی ہے اور یہ بات روا ہے کہ اس عجیب عالم کے دیکھنے، عمدہ اشیا کے سونگھنے، عمدہ نعمتوں کے چکھنے اور نرم چیزوں کے چھونے میں عقل کے لیے دلیل ہو اور وہ دلیل خداوند تعالیٰ کی طرف اس کی رہنمائی کرے کیونکہ اس حواس کے ذریعے سے ہی عقل معلوم کر لیتی ہے کہ عالم حادث ہے کیونکہ وہ تغیر کا محل ہے اور جو چیز بھی تغیر قبول کرتی ہے، وہ حادث ہوتی ہے اور یہ کہ اس عالم کا پیدا کرنے والا بھی ضرور موجود ہے جو اس عالم کی جنس میں سے نہیں ہے کیونکہ یہ عالم مکوَّن (پیدا کیا گیا) اور اس کا پیدا کرنے والا مکوِّن (خالق) ہے اور یہ کہ عالم جسم رکھتا ہے اور خالق جسم دینے والا اور یہ کہ خالق قدیم اور عالم حادث ہے اور یہ کہ خالق نامتناہی اور عالم متناہی ہے اور یہ کہ خالق سب چیزوں پر قادر اور طاقت والا ہے اور سب معلومات کا جاننے والا۔ ملک میں اسی کا تصرف ہے، جو چاہے وہ کر سکتا ہے۔ اس نے سچی دلیلیں دے کر رسول بھیجے ہیں، لیکن ان کے رسولوں پر ایمان لانا اس وقت تک واجب نہیں ہوتا جب تک کہ انسان معرفتِ الٰہی کا واجب ہونا اور ان باتوں کو جو موجب شرع و دین ہیں، رسول سے

سن کر معلوم نہ کرلے اور یہی وجہ ہے کہ اہل سنت دنیا اس میں سننے کو دیکھنے پر ترجیح دیتے ہیں اور اگر کوئی خطا کاریوں کہے کہ سننا خبر کا محل ہے اور دیکھنا نظر کا محل ہے اور اللہ کا دیکھنا اس کے کلام سننے سے افضل ہے اس لیے دیکھنا سننے سے افضل ہے تو ہم پیغمبر سے سن کر یہ جانتے ہیں کہ بہشت میں مومنوں کے لیے دیدارِ الٰہی جائز ہے اور عقل سے دیدار کے جائز ہونے میں جو حجاب ہے، وہ کشف سے بہتر نہیں کیونکہ ہم نے رسول ﷺ کے خبر دینے سے معلوم کر لیا ہے کہ حق تعالےٰ مومنوں کو دیدار دے گا اور ان کی آنکھوں پر سے حجاب اٹھالے گا کہ خدا تعالےٰ کو وہ دیکھ لیں۔ پس سننا دیکھنے سے افضل ہے، نیز احکام شریعت سننے پر مبنی ہیں کیونکہ اگر سننا نہ ہوتا تو ان احکام کا ثبوت محال ہوتا اور انبیاء علیہم السلام جو آئے تو پہلے انہوں نے پیغام حق کو بیان کیا، یہاں تک کہ جو سننے والے تھے وہ گرویدہ ہو گئے، پھر انہوں نے معجزے دکھائے اور معجزہ کے دیکھنے کی بھی تاکید سننے سے ہی ہوئی۔ پس ان دلائل کے باوجود جو شخص سننے سے انکار کرتا ہے، وہ بالکلیہ شریعت کا انکار کرتا ہے اور اس کا حکم جان بوجھ کر پوشیدہ کرتا ہے۔ اب میں ان شاءاللہ سماع سے متعلق تمام اُمور مختصر طور پر بیان کرتا ہوں۔

دوسری فصل
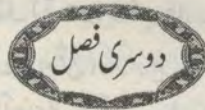
قرآن کا سننا

جاننا چاہیے کہ سننے کے قابل چیزوں میں سے دل کے لیے فوائد کے لحاظ سے اور باطن کے لیے زوائد کے اعتبار سے اور کان کے لیے لذت کی رُو سے بہترین چیز اللہ عزاسمہٗ کا کلام ہے۔ سب مسلمانوں کو اس کے سننے کا حکم ہے اور جنوں اور انسانوں میں سے تمام کافر بھی کلام الٰہی سننے کے مکلّف ہیں اور قرآن کے معجزات میں سے ایک یہ بھی معجزہ ہے کہ طبیعت اُسے پڑھنے اور سننے سے ملول نہیں ہوتی، کیونکہ اس سے بڑی رقت حاصل ہوتی ہے، یہاں تک کہ کفارِ قریش راتوں کو چھپ کر آتے اور نماز کی حالت میں جو کچھ بھی آنحضرت ﷺ قرآن شریف میں سے تلاوت فرماتے، وہ لوگ اس کو شوق سے سنتے اور تعجب کرتے جیسا کہ نضر بن حارث جو سب سے زیادہ فصیح تھا، عتبہ بن ربیع جو بلاغت میں سحر بیانی دکھاتا تھا، ابوجہل بن ہشام جو خطبوں اور دلائل میں ید بیضا رکھتا تھا اور ایسے ہی اور لوگ، یہاں تک کہ پیغمبر ﷺ ایک رات ایک سورۃ پڑھ رہے تھے تو عتبہ بے ہوش ہوگیا اور اس نے ابوجہل سے کہا کہ مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے۔ اسی طرح خداوند تعالےٰ نے جنوں کو حضور اکرم ﷺ کے پاس بھیجا۔ وہ جوق در جوق آ کر پیغمبر ﷺ سے کلام الٰہی سننے لگے، چنانچہ اللہ تعالےٰ فرمایا: فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا۔ (ترجمہ: ان جنوں نے کہا کہ ہم نے عجیب قرآن سنا ہے) پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں جنات کے اس قول سے خبر دی ہے کہ قرآن رُوحانی بیماریوں سے دل کو راہِ حق کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے اور فرمایا: يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ط وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا۔ (ترجمہ: یہ قرآن بھلائی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ پس ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور ہرگز کسی کو اپنے رب کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے)۔ پس قرآن کی نصیحت اور نصیحتوں سے بہتر، اس کا ہر لفظ اور لفظوں سے زیادہ بلیغ، اس کا ہر حکم اور حکموں سے زیادہ لطیف، اس کی نہی اور سب نہیوں سے زیادہ روکنے والی، اس کا وعدہ سب وعدوں سے زیادہ دلکش اس کی وعید اور سب وعیدوں سے زیادہ جانگداز، اس کا قصہ اور سب قصوں سے زیادہ اثر انگیز اور اس کی مثالیں سب مثالوں سے زیادہ فصیح ہیں۔ ہزاروں کو اس کے سننے نے شکار کرلیا ہے اور ہزاروں جانوں کو اس کے لطیف مضامین

نے مصیبت میں ڈال دیا ہے، وہ دنیا کے عزت والوں کو ذلیل کرتا ہے اور دنیا کے ذلیلوں کو باعزت بناتا ہے۔ جب عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ نے قبول اسلام سے پہلے یہ سنا کہ بہن اور بہنوئی مسلمان ہو گئے تو انہوں نے تلوار سونتے ہوئے ان کے قتل کی تیاری کی اور دل کو ان کی محبت سے خالی کرتے ہوئے ان کا قصد کیا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے لطف کا ایک لشکر سورۃ طٰہٰ کے گوشوں میں گھات میں بٹھادیا۔ جب آپ اپنی بہن کے گھر کے دروازہ پر آئے تو اس وقت ان کی بہن سورۃ طٰہٰ کی یہ ابتدائی آیات پڑھ رہی تھیں: طٰهٰ ۚ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى ۙ اِلَّا تَذۡكِرَةً لِّمَنۡ يَّخۡشٰى ۙ۔ (ترجمہ: یارسول اللہؐ! ہم نے قرآن آپ پر اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ اس کی وجہ سے تکلیف اٹھائیں مگر اس لیے اُتارا ہے کہ یہ ڈرنے والوں کے لیے یاد دہانی ہو) یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جان اس کی باریکیوں کا شکار ہو گئی اور آپ کا دل اس کے لطیف حقائق میں بندھ گیا۔ آپ صلح کا طریق ڈھونڈنے لگے، جنگ کا لباس اُتار دیا، مخالفت چھوڑ کر موافقت پر اُتر آئے۔

یہ بات مشہور ہے کہ جب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے رسول ﷺ کے سامنے یہ آیت پڑھی: اِنَّ لَدَيۡنَاۤ اَنۡكَالًا وَّجَحِيۡمًا ۙ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيۡمًا۔ (ترجمہ: بلاشبہ ہمارے پاس بیڑیاں اور آتشِ دوزخ اور گلے میں اٹکنے والا کھانا اور دردناک عذاب ہے) تو حضور ﷺ بے ہوش ہو کر گر پڑے اور کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس یہ آیت پڑھی: اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ مَّا لَهٗ مِنۡ دَافِعٍ۔ (ترجمہ: بلاشبہ تیرے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے، کوئی اس کو ٹالنے والا نہیں) تو آپ نے نعرہ مارا اور بے ہوش ہو گئے۔ لوگ آپ کو اُٹھا کر گھر لے گئے اور ایک ماہ تک اللہ تعالےٰ کے خوف سے بیمار رہے۔ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ آیت پڑھی: لَهُمۡ مِّنۡ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنۡ فَوۡقِهِمۡ غَوَاشٍ ؕ (ترجمہ: ان کفار کے لیے آتشِ دوزخ کے بچھونے اور اسی کے ان کے اوپر بالاپوش ہوں گے) تو وہ رونے لگ گئے یہاں تک کہ راوی کہتے ہیں کہ میں نے خیال کیا کہ آپ کی جان نکل گئی۔ پھر آپ پاؤں پر اُٹھ کھڑے ہوئے تو لوگوں نے کہا: "اے اُستاد! بیٹھ جائیے۔" آپ نے فرمایا کہ "اس آیت کی ہیبت مجھے بیٹھنے سے روکتی ہے۔" کہتے ہیں کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے کسی نے یہ آیت پڑھی یٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ۔ (ترجمہ: اے ایمان والو! وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں؟) تو آپ نے فرمایا: بار خدایا! اِنۡ قُلۡنَا قُلۡنَا بِكَ وَ اِنۡ فَعَلۡنَا فَعَلۡنَا بِتَوۡفِيۡقِكَ فَاَيۡنَ لَنَا الۡقَوۡلُ وَ الۡفِعۡلُ۔ (ترجمہ: اگر ہم کچھ کہتے ہیں تو تیرے حکم سے کہتے ہیں اور اگر ہم کچھ کرتے ہیں تو تیری عطا کی ہوئی توفیق سے کرتے ہیں، پس ہمارے لیے قول اور فعل کہاں ہے؟) حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ کے سامنے کسی نے یہ آیت پڑھی وَاذۡكُرۡ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيۡتَ۔ (ترجمہ: جب تو بھول جائے تو اپنے رب کو یاد کر) تو آپ نے کہا کہ ذکر کی شرط بھول جانا ہے اور سارا عالم ذکر میں لگا ہوا ہے۔ یہ کہہ کر آپ نے نعرہ مارا اور بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو فرمایا: "مجھے اس دل پر تعجب ہے جو کلام حق کو سنے اور جگہ پر قائم رہے اور اس جان پر تعجب ہے کہ وہ کلام الٰہی کو سنے اور بدن سے نہ نکل جائے۔" ایک شیخ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ خدا تعالےٰ کا یہ کلام پڑھ رہا تھا: وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِيۡهِ اِلَى اللّٰهِ۔ (ترجمہ: ڈور اُس دن سے جس دن تم اللہ تعالےٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے) تو ایک ہاتفِ غیب نے آواز دی کہ "آہستہ پڑھو کہ اس آیت کی ہیبت سے چار پریاں مرگئی ہیں۔" ایک درویش نے کہا ہے کہ "دس سال سے میں نے قرآن سوائے اتنی مقدار کے جو نماز میں جائز ہے، نہ خود پڑھا ہے نہ سنا ہے۔" لوگوں نے پوچھا:

کیوں؟ تو آپ نے فرمایا: "اس ڈر کے مارے کہ یہ مجھ پر حجت ہو جائے گا۔"

ایک روز میں حضرت شیخ ابوالعباس شقانی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ آپ آیت پڑھ رہے تھے: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ۔ (ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے غلام کی مثال بیان کی ہے جو کسی دوسرے کا مملوک ہے اور کسی کام کے کرنے پر قادر نہیں) اور رو رہے تھے یہاں تک کہ میں نے خیال کیا کہ دنیا سے رحلت کر گئے۔ میں نے کہا: "اے شیخ! یہ کیا حالت ہے؟" آپ نے فرمایا کہ "گیارہ سال سے میرا ورد اس مقام تک پہنچا ہے اور اس سے میں آگے نہیں نکل سکتا ہوں۔"

میں نے حضرت ابوالعباس رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا کہ "آپ ہر روز قرآن کے کتنے خرب پڑھتے ہیں؟" تو آپ نے فرمایا: "میں اس سے پہلے رات دن میں دو دفعہ قرآن ختم کیا کرتا تھا لیکن اب چودہ سال سے ابھی تک سورۂ انفال پر پہنچا ہوں۔" کہتے ہیں کہ حضرت ابوالعباس رحمتہ اللہ علیہ نے ایک قاری سے فرمایا کہ پڑھو، تو اس نے یہ آیت پڑھی: يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ۔ (ترجمہ: اے عزیز مصر! ہمیں اور ہمارے اہل و عیال کو فاقہ کی سخت تکلیف ہے اور ہم حقیر سی پونجی لائے ہیں) آپ نے فرمایا: اور پڑھو تو اس نے یہ آیت پڑھی قَالُوْۤا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ۔ (ترجمہ: (یوسف علیہ السلام) کے بھائیوں نے کہا کہ اس نے یہ چوری کی ہے تو کچھ بعید نہیں۔ اس کا بھائی (یوسف علیہ السلام) بھی اس سے پہلے چوری کر چکا ہے) آپ نے فرمایا: اور پڑھو تو اس نے یہ آیت پڑھی: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ط يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ۔ (ترجمہ: آج تم پر کوئی ملامت نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہاری خطاؤں کو بخش دے) تب آپ نے یوں دعا فرمائی: بارِ خدایا! میں ظلم میں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں سے بڑھ کر ہوں اور تو کرم میں یوسف علیہ السلام سے بڑھ کر ہے۔ میرے ساتھ وہ معاملہ کر جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے ظالم بھائیوں سے کیا تھا اور باوجود ان سب اُمور کے، سب اہل اسلام فرمانبردار اور گناہ گار قرآن کو توجہ سے سننے پر مامور ہیں کیونکہ خداوند تعالےٰ نے فرمایا ہے: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ (ترجمہ: جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے)۔ جس حال میں کوئی شخص قرآن پڑھے لوگوں کو خاموشی کے ساتھ توجہ سے اس کے سننے کا حکم دیا ہے اور نیز فرمایا ہے: فَبَشِّرْ عِبَادِ ۙ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ۔ (ترجمہ: اے رسول ﷺ! میرے ان بندوں کو خوشخبری دے دیجئے جو ہمارا کلام توجہ سے سنتے ہیں اور اس میں اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں) یعنی اس کے اوامر اور حکموں کی تعمیل کرتے ہیں اور ادب سے سنتے ہیں، نیز فرمایا ہے: الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ۔ (ترجمہ: اور وہ لوگ کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل خوف زدہ ہو جاتے ہیں) اور فرمایا ہے: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ط اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ (ترجمہ: جو لوگ ایمان والے ہیں، ان کے دل اللہ تعالےٰ کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں۔ یاد رکھو اللہ کے ذکر سے ہی دل اطمینان پاتے ہیں)۔

ایسی بہت سی آیات ہیں جو قول کی تاکید کرتی ہیں اور پھر اس کے برعکس ان لوگوں کو ملامت فرمائی ہے جو کلام الٰہی کو جیسا کہ اس کے سننے کا حق ہے نہیں سنتے اور کان سے اس کو دل میں نہیں اُتارتے۔ فرمایا ہے: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ط وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ۔ (ترجمہ: اللہ تعالےٰ نے ان کفار کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے) نیز فرمایا کہ دوزخی قیامت میں یوں کہیں گے: لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ

مَا كُنَّا فِيۡٓ اَصۡحٰبِ السَّعِيۡرِ۔ (ترجمہ: اگر ہم دنیا میں کلام حق سنتے یا اس کو خوب سمجھتے تو آج ہم اہل دوزخ میں نہ ہوتے) نیز فرمایا: وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّسۡتَمِعُ اِلَيۡكَ ۚ وَجَعَلۡنَا عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ اَكِنَّةً اَنۡ يَّفۡقَهُوۡهُ وَفِيۡٓ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرًا۔ (ترجمہ: اور ان میں سے کچھ وہ لوگ ہیں جو آپ کی طرف کان لگا کر سنتے ہیں، حالانکہ ان کے دلوں پر ہم نے پردے ڈال دیئے ہیں کہ وہ اس کلام حق کو سمجھ ہی نہ سکیں اور ان کے کانوں میں بہرہ پن رکھ دیا ہے) نیز فرمایا ہے: وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ قَالُوۡا سَمِعۡنَا وَهُمۡ لَا يَسۡمَعُوۡنَ۔ (ترجمہ: اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو زبان سے کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا اور حقیقت میں وہ سنتے نہیں) اور کتابِ الٰہی میں ایسی بہت سی آیات ہیں۔

پیغمبر ﷺ سے روایت ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اِقۡرَاَ علی فَقَالَ اَنَا اَقۡرَاءُ وَ عَلَيۡكَ اُنۡزِلَ فَقَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ اِنِّيۡ اُحِبُّ اَنۡ اَسۡمَعَ عَنۡ غَيۡرِيۡ۔ (ترجمہ: مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ تو انہوں نے عرض کیا کہ کیا میں آپ کو پڑھ کر سناؤں، حالانکہ وہ آپ پر نازل کیا گیا ہے، تو آپ نے فرمایا کہ میں دوسرے سے سننا پسند کرتا ہوں)۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سننے والا پڑھنے والے سے زیادہ کامل حال ہوتا ہے کیونکہ قاری یا تو حال کی وجہ سے پڑھتا ہے یا غیر حال کی وجہ سے اور سننے والا سوائے حال کے نہیں سنتا، اس لیے کہ بولنے میں ایک قسم کا تکبر پایا جاتا ہے اور سننے میں ایک قسم کی تواضع۔ نیز پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: شَيَّبَتۡنِيۡ سُوۡرَةُ هُوۡدٍ۔ (ترجمہ: سورۃ ہود کے سننے نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے) کہتے ہیں کہ آپ نے یہ اس لیے فرمایا کہ سورۂ ہود کے آخر میں یہ آیت تھی: فَاسۡتَقِمۡ كَمَآ اُمِرۡتَ۔ (ترجمہ: پس آپ ثابت قدم رہیے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے)۔ درحقیقت آدمی حکم الٰہی پر ثابت قدم رہنے سے عاجز ہے کیونکہ بندہ توفیق الٰہی کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ پس جب آپ کو حکم ہوا فَاسۡتَقِمۡ كَمَآ اُمِرۡتَ تو حضور ﷺ نے حیران ہو کر فرمایا کہ یہ کیسے ممکن ہو گا کہ میں اللہ تعالیٰ کے اس امر کے بجا لانے پر پورے طور پر قائم ہو سکوں گا۔ دل کے رنج کی وجہ سے آپ کی قوت جاتی رہی۔ روز بروز رنج بڑھتا گیا یہاں تک کہ ایک روز اپنے گھر میں کھڑے ہونے لگے تو ہاتھ زمین پر ٹیک کر اُٹھنے کے لیے زور لگایا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! یہ کیا حال ہے؟ آپ تو ماشاء اللہ ابھی جوان اور تندرست ہیں۔" آپ نے فرمایا: "سورۃ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے" یعنی اس حکم کے سننے سے میرے دل پر اتنا خوف غالب ہوا کہ میری قوت جاتی رہی۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: كُنۡتُ فِيۡ عِصَابَةٍ فِيۡهَا ضُعَفَاءُ وَالۡمُهَاجِرِيۡنَ وَاِنَّ بَعۡضَهُمۡ يَسۡتُرُ بَعۡضُهُمۡ بَعۡضًا مِنَ الۡعُرٰى وَ قَارِئٌ يَقۡرَاُ عَلَيۡنَا وَنَحۡنُ نَسۡتَمِعُ لِقِرَاءَتِهٖ فَجَاءَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى قَامَ عَلَيۡنَا فَلَمَّا رَاٰهُ لُقَارِئُ سَكَتَ قَالَ فَسَلَّمَ فَقَالَ مَا ذَا كُنۡتُمۡ تَصۡنَعُوۡنَ قُلۡنَا يَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ كَانَ يَقۡرَاءُ عَلَيۡنَا وَ نَحۡنُ نَسۡتَمِعُ لِقِرَاءَتِهٖ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِيۡ جَعَلَ فِيۡ اُمَّتِيۡ مَنۡ اُمِرۡتُ اَنۡ اَصۡبِرَ نَفۡسِيۡ مَعَهُمۡ قَالَ ثُمَّ جَلَسَ وَسۡطَنَا لِيَعۡدِلَ نَفۡسَهٗ فِيۡنَا ثُمَّ قَالَ بِيَدِهٖ هٰكَذَا افۡتَخَلَّقَ الۡقَوۡمُ فَلَمۡ يَعۡرِفۡ رَسُوۡلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ مِنۡهُمۡ اَحَدٌ قَالَ وَ كَانُوۡا ضُعَفَاءُ الۡمُهَاجِرِيۡنَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ اَبۡشِرُوۡا اَصۡحَابِيۡكَ الۡمُهَاجِرِيۡنَ بِالۡفَوۡزِ التَّامِّ يَوۡمَ الۡقِيَامَةِ يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ قَبۡلَ اَغۡنِيَاءِ هِمۡ بِنِصۡفِ يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗ خَمۡسَ مِائَةِ عَامٍ۔

(ترجمہ: میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت میں بیٹھا تھا جس میں کمزور مہاجرین تھے جو برہنگی سے ایک

دوسرے کو پردہ کیے ہوئے تھے اور قاری ہم پر قرآن پڑھ رہا تھا کہ اچانک رسول اللہ ﷺ ہمارے سروں پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ جب قاری نے آپ کو دیکھا تو وہ چپ ہو گیا۔ راوی کہتا ہے کہ آپ نے سلام کر کے پوچھا: "تم کیا کر رہے تھے؟" تو ہم سب نے کہا: "یا رسول اللہ! قاری ہمیں قرآن پڑھ کر سنا رہا تھا اور ہم اس کی قرأت سن رہے تھے۔" پس نبی ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالےٰ کا شکر ہے کہ اس نے میری اُمت میں ایسے لوگ پیدا کیے ہیں کہ مجھے اپنے نفس کو ان کے ساتھ صبر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔" راوی کہتا ہے کہ آپ ہمارے درمیان بیٹھ گئے تاکہ اپنے آپ کو ہمارے برابر کریں۔ پھر آپ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کر کے فرمایا کہ اس طرح بیٹھ جاؤ، پس لوگ حلقہ باندھ کر بیٹھ گئے اور اس وقت کوئی شخص ان میں اور رسول اللہ ﷺ میں تمیز نہیں کر سکتا تھا، گویا وہ سب مفلس مہاجرین تھے۔ اس کے بعد حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اے مفلس مہاجرین! قیامت کے روز تمہیں پوری کامیابی کی بشارت ہو۔ تم جنت میں اپنے دولتمند بھائیوں سے نصف روز پہلے داخل ہو گے، جس دن کی مقدار پانچ سو سال ہے۔" اس حدیث کو چند مختلف روایات سے بیان کرتے ہیں لیکن وہ اختلاف عبارت میں ہے، معنی سب کے ایک ہیں اور بالکل درست ہیں۔

روایت ہے کہ زرارہ ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ جو آنحضرت ﷺ کے ایک جلیل القدر صحابی تھے، ایک مرتبہ لوگوں کی امامت فرما رہے تھے کہ آپ نے ایک آیت پڑھی جس کے جلال و ہیبت کی تاب نہ لا کر نعرہ مارا اور جان دے دی۔ اسی طرح ابو جہینی رحمتہ اللہ علیہ جو بزرگ تابعین میں شمار ہوتے ہیں، حضرت صالح مری رحمتہ اللہ علیہ نے ان کے سامنے ایک آیت پڑھی تو انہوں نے ایک چیخ ماری اور دُنیا سے رُخصت ہو گئے۔ حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ میں کوفہ کے دیہات میں ایک گاؤں سے گزر رہا تھا تو میں نے ایک عورت کو نماز میں کھڑے دیکھا جس پر نیکی کے آثار نظر آتے تھے۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے تبرک کے طور پر سلام کیا تو اس نے کہا کہ تم قرآن جانتے ہو؟ میں نے جواب دیا، ہاں اس نے کہا: ایک آیت پڑھو۔ میں نے پڑھی۔ وہ نعرہ مار کر بے ہوش ہوئی اور جان دے دی۔ دونوں پر اللہ رحم فرمائے۔ احمد ابن ابی الحواری رحمتہ اللہ علیہ روایت فرماتے ہیں کہ میں ایک روز جنگل میں جا رہا تھا۔ میں نے ایک جوان کو موٹی اور کھردری گدڑی پہنے ہوئے ایک کنویں کے پاس کھڑے دیکھا۔ اس نے مجھے کہا: "اے احمد! آپ وقت پر آ گئے، مجھے اس وقت سماع کی ضرورت ہے تاکہ میں جان دے دوں۔ آپ ایک آیت پڑھیے۔" آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے میرے دل میں الہام کیا تو میں نے یہ آیت پڑھی: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔ (ترجمہ: بلاشبہ وہ لوگ جنہوں نے کہا تھا کہ ہمارا پروردگار اللہ تعالےٰ ہے، پھر وہ ثابت قدم رہے)۔ اس جوان نے کہا کہ "اے احمد! آسمان و زمین کے مالک کی قسم ہے کہ آپ نے وہی آیت پڑھی جو اس وقت فرشتے میرے سامنے پڑھ رہے تھے۔" یہ کہہ اسی وقت اس نے جان دے دی۔

اس امر سے متعلق اور بھی حکایات ہیں، اگر سب کا ذکر کروں تو اپنے مقصد کے بیان کرنے سے رہ جاؤں۔ اسی لیے انہی پر اکتفا کرتا ہوں اور توفیق اللہ تعالےٰ کے قبضے میں ہے۔
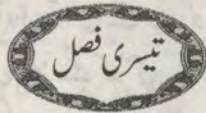
شعر کے سماع میں

جاننا چاہیے کہ شعر کا سننا مباح ہے اور پیغمبر ﷺ نے بھی سنا ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اشعار کہے اور

سنے ہیں۔ حضور ﷺ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَةً۔ (ترجمہ: بلاشبہ بعض شعر حکمت ہیں) نیز فرمایا: اَلْحِکْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ مِنْ حَیْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ۔ (ترجمہ: حکمت مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے، جہاں پائے، وہ اس کا سب سے زیادہ مستحق ہے)۔ اس روایت میں مراد شعر سے وہ شعر ہے جو حکمت ہو اور حکمت مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے، جہاں پائے وہ اس کا حق دار ہے، نیز پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ اَصْدَقُ کَلِمَةٍ قَالَتْهَا الْعَرَبُ قَوْلُ لَبِیْدٍ۔ (ترجمہ: سب سے زیادہ سچا کلام جو اہلِ عرب نے کہا ہے، وہ لبید شاعر کا قول ہے)۔

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَّا خَلَا اللّٰهِ بَاطِلٌ
وَ کُلُّ نَعِیْمٍ، لَامُحَالَةَ، زَائِلٌ

(سنو اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز باطل ہے اور ہر ایک نعمت ضرور زوال پذیر ہے)۔ عمر بن الشرید رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں: قَالَ اِسْتَنْشَدَنِیْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هَلْ تَرْوِیْ مِنْ شِعْرِ اُمَیَّةَ بْنِ اَبِی الصَّلْتِ شَیْئًا فَاَنْشَدْتُهٗ مِائَةَ قَافِیَةٍ فَجَعَلْتُ کُلَّمَا مَرَرْتُ عَلٰی بَیْتٍ قَالَ هِیْهٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَادَ اَنْ یُّسْلِمَ فِیْ شِعْرِهٖ۔ (ترجمہ: انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے شعر پڑھنے کا حکم دیتے ہوئے پوچھا کہ کیا تو اُمیہ ابن اُبی الصلت کے اشعار میں سے کچھ سنا سکتا ہے؟ تو میں نے آپ کو سو شعر سنائے اور جب میں ایک شعر ختم کرتا تو حضور ﷺ فرماتے کچھ اور سناؤ، پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ قریب ہے کہ اُمیہ شعر میں مسلمان ہو جاتا)۔

حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے ایسی بہت سی روایات ہیں، مگر لوگوں کو اس بارے میں کچھ غلط فہمیاں ہو گئی ہیں۔ کچھ لوگ تو اشعار سننے کو حرام کہتے ہیں اور رات دن مسلمانوں کی غیبت کرتے رہتے ہیں اور کچھ ہر قسم کے اشعار سننے کو حلال جانتے ہیں اور رات دن غزل میں حسنِ صورت اور زُلف کی تعریف سنتے رہتے ہیں اور اس کے متعلق ایک دوسرے کے خلاف دلائل پیش کرتے ہیں، مگر میرا مقصود ان کی تائید یا تردید نہیں۔ اس لیے میں نے اتنے پر اکتفا کیا لیکن مشائخ صوفیا رضی اللہ عنہم کا اس بارے میں طریق یہ ہے کہ ایک دفعہ لوگوں نے پیغمبر ﷺ سے شعر کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: کَلَامٌ حَسَنُهٗ حَسَنٌ وَ قَبِیْحُهٗ قَبِیْحٌ۔ (ترجمہ: شعر ایک کلام ہے کہ جس کا اچھا اچھا ہے اور بڑا بڑا) یعنی جس بات کا سننا نثر میں حلال ہے جیسے حکمت، نصائح، آیاتِ الٰہی میں استدلال اور حق کے دلائل میں غور کرنا وغیرہ وغیرہ تو اس کا نظم میں سننا بھی حلال ہے، الغرض جس طرح اس جمال پر نظر ڈالنا حرام اور ممنوع ہے جو آفت کا محل ہے، اسی طرح اس کا نظم و نثر میں سننا بھی حرام و ممنوع ہے اور اس طرح اس کی صفت کا سننا بھی حرام ہے۔ اگر کوئی شخص اس کو مطلق طور پر حلال کہتا ہے اور دیکھنے اور سننے کو بھی حلال کہتا ہے تو یہ تو کفر اور بے دینی ہے اور جو شخص یوں کہتا ہے کہ میں آنکھ، خدوخال اور زُلف میں سب حق تعالےٰ کو دیکھتا اور حق تعالےٰ ہی کو طلب کرتا ہوں کیونکہ آنکھ اور کان عبرت کا محل اور علم کا منبع ہیں۔ پس اس سے لازم آتا ہے کہ یہ شخص دوسرے سے کہے کہ میں ایک جسم کو دیکھتا اور چھوتا ہوں کہ ایک آدمی تو اس کے سننے کو روا رکھتا ہے اور دوسرا آدمی اس کے دیکھنے کو اور کہے کہ میں اس میں حق ہی کو طلب کرتا ہوں، نیز کہے کہ معنی کے ادراک کے لیے ایک حس دوسری حس سے بہتر نہیں تب تو شریعت بالکل ہی باطل ہو جائے گی اور رسول اللہ ﷺ نے جو یہ فرمایا: اَلْعَیْنَانِ تَزْنِیَانِ۔ (ترجمہ: دونوں آنکھیں زنا کرتی ہیں)۔ یہ آنکھوں کا حکم بھی اُٹھ جائے گا اور نامحرموں کو چھونے سے ملامت بھی منقطع ہو جائے گی اور

شرعی حدود بھی ساقط ہوجائیں گی اور یہ ظاہر گمراہی ہے اور جب ظاہر لوگوں کے حال میں مستغرق سماع کرنے والے صوفیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے حال کی وجہ سے سماع کرتے تھے تو انہوں نے یہ خیال کیا کہ وہ خواہش نفس سے کرتے ہیں اور ان کو دیکھ کر وہ جاہل بھی کہنے لگے کہ سماع حلال ہے، اگر حلال نہ ہوتا تو یہ صوفی لوگ نہ کرتے۔ چنانچہ انہوں نے ان کی تقلید کر کے ان کے ظاہر کو اختیار کر لیا اور باطن کو چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ وہ خود بھی ہلاک ہو گئے اور ایک قوم کو بھی ہلاک کر دیا اور یہ زمانے کی بہت بڑی آفت ہے۔ میں اپنی جگہ اس کی پوری شرح ان شاءاللہ بیان کروں گا۔

چوتھی فصل
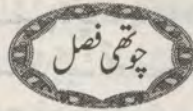
خوش آوازوں کے سننے میں

پیغمبر ﷺ نے فرمایا: زَيِّنُوا اَصْوَاتَكُمْ بِالْقُرْاٰنِ۔ (ترجمہ: قرآن پڑھنے میں اپنی آوازوں کو سنوارو) اور خدا تعالیٰ نے فرمایا: يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ۔ (ترجمہ: وہ پیدائش میں جو چاہتا ہے، زیادہ کرتا ہے) مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے مراد عمدہ آواز ہے اور پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: مَنْ اَرَادَ اَنْ يَّسْتَمِعَ صَوْتَ دَاؤدَ فَلْيَسْتَمِعْ صَوْتَ اَبِيْ مُوْسٰى الْاَشْعَرِيْ۔ (ترجمہ: جو شخص داؤد علیہ السلام کی آواز سننا چاہے، وہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی آواز سنے) اور اخبار میں آیا ہے کہ بہشت میں بہشتیوں کو بھی سماع حاصل ہوگا اور اس طور پر ہوگا کہ ہر ایک درخت سے مختلف قسم کی دلکش اور سُریلی آوازیں نکلیں گی۔ جب وہ آوازیں جو آپس میں مختلف ہوتی ہیں، باہم مل جاتی ہیں تو طبیعتوں کو ان کے سننے سے بڑی لذت حاصل ہوتی ہے اور اس قسم کا سماع انسانوں اور حیوانوں میں عام ہے، اس لیے کہ رُوح ایک لطیف چیز ہے اور آواز میں بھی ایک قسم کی لطافت ہے۔ جب ارواح ان آوازوں کو سنتی ہیں تو جنس اپنے ہم جنس کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ یہ اطبا کا قول ہے جو میں نے بیان کیا ہے اور جو لوگ اہل علم میں سے تحقیق کا دعویٰ کرتے ہیں، اس کے متعلق ان کے بھی بہت سے اقوال ہیں اور انہوں نے سریلی آوازوں کے باہم ملانے میں کتابیں تصنیف کی ہیں اور سماع الحان کو بڑی عظمت دی ہے اور ان کے اس فن کے آثار آج مزامیر[1] میں ظاہر ہیں جو انہوں نے خواہش نفس اور لہو و لعب کی طلب کو تقویت دینے کے لیے شیطان کی پیروی میں ترتیب دیئے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ کہتے ہیں کہ ایک روز اسحاق موصلی ایک باغ میں راگ گا رہے تھے اور ایک بلبل بھی نغمہ سرائی کر رہی تھی۔ وہ اسحاق کے راگ کی لذت کی وجہ سے خاموش ہوگئی اور برابر راگ سنتی رہی یہاں تک کہ درخت سے نیچے گر کر مرگئی۔

میں نے اس قسم کی حکایتیں بہت سنی ہیں، لیکن میری مراد اس سے سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ صوفیا کہتے ہیں کہ خوش اور سریلی آوازوں کی ترکیب اور تالیف سے تمام جانداروں کی طبیعتیں خوش ہوتی ہیں۔ حضرت ابراہیم خواص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں عرب کے قبائل میں سے ایک قبیلے کے پاس پہنچا اور ایک امیر کے مہمان خانے میں نزول کیا تو ایک حبشی کو دیکھا کہ طوق و زنجیر میں جکڑا ہوا دُھوپ کے اندر خیمے کے دروازے پر ڈالا ہوا ہے۔ میرے دل میں شفقت پیدا ہوئی اور میں نے ارادہ کیا کہ اسے سفارش کر کے امیر سے طلب کروں۔ جب وہ لوگ کھانے سامنے لائے تو مہمان کی تکریم کے لیے امیر خود آیا تاکہ وہ میرے ساتھ مل کر کھائے۔ جب اس نے کھانے کا قصد کیا تو میں نے انکار کر دیا اور عربوں کے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی چیز ناگوار نہیں ہوتی کہ کوئی شخص ان کا کھانا نہ

---

[1] باجے

کھائے۔ اس نے مجھ سے پوچھا: "اے جوان! تو کیوں کھانا نہیں کھاتا؟" میں نے کہا: "اس اُمید کی وجہ سے جو مجھے آپ کے احسان پر ہے۔" اس نے کہا: "میرا سب دل و متاع تیرا مال ہے، میرا کھانا کھا۔" میں نے کہا: "مجھے آپ کی املاک کی حاجت نہیں۔ آپ صرف اس غلام کو میرے کام کے لیے مقرر کر دیجیے۔" اس نے کہا: "پہلے اس کا جرم پوچھ لے، پھر اسے چھڑا لے اور جب تک تو ہماری مہمانی میں ہے، تجھے میری تمام املاک پر اختیار ہے۔" میں نے پوچھا: "بتایئے اس کا جرم کیا ہے؟" اس نے کہا: "یہ غلام حدی خواں اور بہت خوش الحان ہے۔ میں نے اس کو اپنی زمین پر کچھ اونٹ دے کر بھیجا کہ وہ میرا غلہ لاد کر لے آئے۔ چنانچہ وہ چلا گیا اور ہر ایک اونٹ پر دوشتر بار بوجھ لاد دیا اور راستے میں حدی گاتا رہا اور اونٹ دوڑتے رہے یہاں تک کہ ایک تھوڑے عرصہ میں اس سے دو چند بوجھ لے کر یہاں آ گیا جو میں نے اس کو حکم دیا تھا۔ جب اونٹوں پر سے بوجھ اُتارا تو ایک ایک دو دو کر کے سب ہلاک ہو گئے۔" حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ سن کر مجھے سخت تعجب ہوا۔ میں نے کہا: "اے امیر! آپ کی شرافت کا تقاضا یہی ہے کہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ سب سچ ہے لیکن مجھے آپ کی اس بات پر دلیل کی ضرورت ہے۔" ہم یہی باتیں کر رہے تھے کہ چند اونٹ جنگل سے پانی پلانے کے لیے کنویں پر لائے گئے۔ امیر نے ان شتر بانوں سے پوچھا کہ "ان اونٹوں نے کتنے روز سے پانی نہیں پیا؟" انہوں نے جواب دیا کہ "تین روز سے۔" امیر نے اس غلام کو حدی خوانی کا حکم دیا اور اونٹ اس کی حدی خوانی کے سننے میں ایسے مشغول ہوئے کہ کسی نے پانی کو منہ نہیں لگایا یہاں تک کہ اچانک ایک ایک کر کے سب بھاگ گئے اور جنگل میں منتشر ہو گئے۔ اس کے بعد اس نے وہ غلام زنجیریں کھول کر مجھے بخش دیا۔ ہمارا یہ مشاہدہ ہے کہ شتربان اور گدھے والا جب راستے میں گاتا ہے تو اونٹ اور گدھا سرور کی حالت میں ہو جاتا ہے اور ملک خراسان و عراق میں تو یہ عادت ہے کہ شکاری جب رات کے وقت ہرن پکڑتے ہیں تو وہ ایک طشت بجاتے ہیں۔ ہرن اس کی آواز سن کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ اس کو پکڑ لیتے ہیں۔ مشہور ہے کہ ہندوستان میں ایک جماعت ہے جو باہر جنگل میں جا کر گاتے اور سریلی آوازیں نکالتے ہیں۔ ہرن جب اس سریلی آوازوں کو سنتے ہیں تو ان کی طرف دوڑ آتے ہیں اور لوگ اس کے گرد گھومتے اور گاتے ہیں۔ یہاں تک کہ راگ کی لذت کی وجہ سے ہرن آنکھیں بند کر کے سو جاتے ہیں اور پھر وہ شکاری ان کو پکڑ لیتے ہیں۔ چھوٹے بچوں میں بھی یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جب وہ گہوارے میں روتے ہیں اور کوئی شخص سریلی آواز میں لوری دیتا ہے تو وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ طبیب ایسے بچوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کی حس درست ہے، وہ بڑے ہو کر دانش مند ہوں گے۔ یہی سبب ہے کہ ملک عجم کے ایک بادشاہ کی وفات ہوئی اور اس کے پیچھے اس کا دو سال کا ایک لڑکا رہ گیا تو وزیروں نے کہا کہ اسے تخت شاہی پر بٹھانا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے حکیم بزرجمہر سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا: "بہتر ہے لیکن یہ ضرور آزمانا چاہیے کہ اس کی حس بھی درست ہے کہ جس سے کوئی اُمید رکھ سکیں۔" انہوں نے کہا: "اس کی تدبیر کیا ہو؟" اس نے حکم دیا تو گویوں نے اس کے پاس گانا شروع کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بچہ سرور میں آ کر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ تب بزرجمہر نے کہا کہ "اس بچے سے ملک کی بھلائی کی اُمید کی جا سکتی ہے۔"

غرضیکہ سریلی آواز اور الحان کی تاثیر عقلمندوں کے نزدیک اتنی مسلم اور واضح ہے جس کے لیے کسی دلیل کی حاجت نہیں اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ سرود اور سریلی آوازیں اور ساز کوئی اچھی چیزیں نہیں، وہ یا تو جھوٹ بولتا ہے یا نفاق برتتا ہے یا پھر حس نہیں رکھتا اور انسانوں اور صوفیوں کے طبقے سے باہر ہے۔ ایک گروہ جو اس سے منع کرتا ہے، وہ اس

وجہ سے ہے کہ وہ حکم الٰہی کی رعایت کرتا ہے اور فقہا سب متفق ہیں کہ جب کھیل کود کے سامان موجود نہ ہوں اور سرود کے سننے سے دل میں بدکاری کا کوئی خیال نہ پیدا ہوتا ہو تو اس کا سننا مباح ہے اور اس کے متعلق بہت سی احادیث و آثار ہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: كَانَتْ عِنْدِىْ جَارِيَةٌ تُغَنِّىْ فَاسْتَاذَنَ عُمَرُ فَلَمَّا اَحَسَّتْهُ وَ سَمِعَتْ حِسَّهٗ فَرَّتْ فَلَمَّا دَخَلَ عُمَرُ تَبَسَّمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهٗ عُمَرُ مَا اَضْحَكَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ كَانَتْ عِنْدَنَا جَارِيَةٌ تُغَنِّىْ فَلَمَّا سَمِعَتْ حِسَّكَ فَرَّتْ فَقَالَ عُمَرُ لَا اَبْرَحُ حَتّٰى اَسْمَعُ مَا كَانَ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَعَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تِلْكَ الْجَارِيَةَ فَاَخَذَتْ تُغَنِّىْ وَرَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْمَعُ۔

(ترجمہ: میرے پاس ایک لونڈی کچھ گا رہی تھی کہ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ جب اس لونڈی کو ان کے آنے کا علم ہوا اور ان کی آہٹ سنی تو وہ بھاگ گئی۔ پس جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اندر داخل ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے تبسم فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ سے دریافت کیا: "یارسول اللہ! آپ کیوں ہنستے ہیں؟" آپ نے فرمایا کہ "ہمارے پاس ایک لونڈی کچھ گا رہی تھی۔ جب اس نے تمہاری آہٹ سنی تو وہ بھاگ گئی۔" تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ "میں اس وقت تک یہاں سے نہیں ہلوں گا جب تک کہ وہ بات نہ سن لوں جو رسول اللہ ﷺ نے سنی تھی۔" چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس لونڈی کو بلایا تو وہ گانے لگی اور رسول اللہ ﷺ سنتے رہے)۔ اسی طرح بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایسی ہی روایتیں بیان کی ہیں اور شیخ عبدالرحمٰن سلمی رحمتہ اللہ علیہ نے ان سب کو اپنی کتاب "السماع" میں جمع کر دیا ہے اور ان کی اباحت کا فیصلہ کیا ہے، لیکن مشائخ صوفیا کی مراد سماع سے اباحت فقہی نہیں جس پر عمل کرنا نہ کرنا دونوں برابر ہوں، بلکہ ان کی مراد اس سے وہ اباحت ہے جس سے اعمال میں فوائد حاصل ہوں۔ ویسے فقط مباح کے درپے ہونا عوام کالانعام کا کام ہے۔ سمجھ دار آدمیوں کو چاہیے کہ وہ ایسے کام کے درپے ہوں جس سے کچھ فائدہ حاصل ہو۔

ایک دفعہ میں مرو میں تھا۔ ائمہ اہل حدیث میں سے ایک امام نے، جو اُن سب میں زیادہ مشہور تھے، مجھ سے کہا کہ میں نے سماع کی اباحت میں ایک کتاب لکھی ہے۔ میں نے کہا کہ دین میں ایک بڑی مصیبت پیدا ہوگئی کہ حضرت امام نے ایک لہو کو، جو تمام بدکاریوں کی اصل ہے، حلال کر دیا تو انہوں نے کہا کہ اگر تو اس کو حلال نہیں سمجھتا تو کیوں سنتا ہے؟ میں نے کہا کہ اس کا حکم کئی وجوہ پر ہے۔ ایک چیز پر قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے، اگر اس کی تاثیر دل میں حلال ہے تو اس کا سماع بھی حلال ہے، اگر حرام ہے تو سماع بھی حرام ہے اور اگر تاثیر مباح ہے تو سماع بھی مباح ہے۔ غرض یہ کہ ہر وہ چیز کہ جس کا ظاہر حکم فسق کا حکم ہے اور باطن میں اس کا حال اور اس کی روشنی کئی طور پر ہے تو اس کا اطلاق کسی ایک چیز پر محال ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

پانچویں فصل
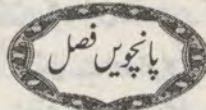
سماع کے احکام میں

جاننا چاہیے کہ اختلافِ طبائع کی وجہ سے سماع کے احکام بھی مختلف ہیں جیسا کہ ارادہ دلوں میں مختلف ہوتا ہے اور یہ ظلم ہے کہ کوئی شخص قطعی طور پر ایک ہی حکم لگا دے۔ مختصر یہ ہے کہ سماع کرنے والے دو گروہ ہیں: ایک تو وہ جو

فقط معنی کو سنتے ہیں اور دوسرے وہ جو صرف آواز کو سنتے ہیں، معانی سے سروکار نہیں رکھتے اور ان دونوں میں فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی، کیونکہ سریلی آوازوں کا سننا اس معنی کے غلبہ کی رُو سے ہوتا ہے جو انسانوں کی طبیعتوں میں ودیعت کیا گیا ہے۔ پس اگر وہ معنی حق ہے تو سماع بھی حق ہے اور اگر باطل ہے تو سماع بھی باطل ہے۔ لہٰذا جس شخص کی طبیعت میں فساد ہوتا ہے، وہ جو کچھ سنتا ہے سب فساد ہوتا ہے اور یہ سب معانی حضرت داؤد علیہ السلام کی حکایات میں آتے ہیں کہ جب حق تعالےٰ نے ان کو اپنا خلیفہ بنایا تو ان کو خوش الحانی دی، آپ کے گلے کو ساز بنادیا، پہاڑوں کو آپ کے وسیلے بنادیا یہاں تک کہ وحشی جانور اور پرندے پہاڑوں اور جنگلوں سے آپ کی آواز کے سننے کے لیے دوڑے آتے، بہتے ہوئے پانی تھم جاتے اور پرندے اُڑتے اُڑتے گر پڑتے۔ آثار میں آیا ہے کہ جس جنگل میں حضرت داؤد علیہ السلام نغمہ سرائی کرتے تو ایک ماہ تک اس جنگل کے جانور کچھ نہ کھاتے، بچے روتے اور نہ دودھ مانگتے اور جب لوگ ان کی آواز سن کر واپس لوٹتے تو بہت سے لوگ آپ کے کلام اور سریلی آواز اور لحن کی لذت سے مردہ پائے جاتے۔ یہاں تک کہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ سات سو جوان لونڈیاں شمار میں آئیں جو مرگئی تھیں اور بارہ ہزار بوڑھے بھی مر گئے تھے۔ اس پر حق تعالےٰ نے چاہا کہ ہوس پرستی کے طور پر سماع کے سننے والوں اور حق کے لیے سماع کو سننے والوں میں ایک امتیاز پیدا کردے۔ جس پر ابلیس کا طبعی اضطراب قوی ہوگیا اور انسان کو وسوسہ دینے کا ارادہ دل میں پیدا ہوا تو اس نے اپنے حیلوں کے ظاہر کرنے کی اجازت مانگی۔ اُسے اجازت مل گئی، چنانچہ اس نے اس غرض کے لیے بنسری اور طنبور بنا لیے اور حضرت داؤد علیہ السلام کی مجلس سماع کے مقابل اس نے بھی ایک مجلس جمادی یہاں تک کہ جو لوگ داؤدی آواز کو سنا کرتے تھے، دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک تو اہلِ شقاوت دوسرے اہل سعادت۔ جو لوگ اہل شقاوت تھے، وہ شیطان کے مزامیر کی طرف مائل ہوئے اور جو لوگ اہلِ سعادت تھے، وہ حضرت داؤد علیہ السلام کی آواز کے پیچھے لگے رہے۔ پھر وہ لوگ جو اہل معنی تھے اور حضرت داؤد علیہ السلام وغیرہ کی آواز ان کے دل کے سامنے نہ تھی کیونکہ وہ سب حق کو دیکھتے تھے۔ وہ اگر شیطان کے ساز کو سنتے تو حق تعالےٰ کی طرف سے اس میں ایک آزمائش سمجھتے اور اگر داؤد علیہ السلام کی آواز کو سنتے تو اس میں حق تعالےٰ کی طرف سے ہدایت سمجھتے۔ یہاں تک کہ وہ سب سے کنارہ کش ہوگئے اور سب تعلقات سے انہوں نے اعراض کرلیا اور دونوں گروہوں کو جیسا کہ وہ اصل میں تھے، دُرست کو دُرست اور خطا کو خطا دیکھ لیا۔ پس جس شخص کو سماع ایسا ہو تو وہ جو کچھ سنے، اس کے لیے سب حلال ہے۔

مدعیوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ ہمیں سماع اس کے برخلاف معلوم ہوتا ہے جو حقیقت میں وہ ہے۔ یہ بالکل محال ہے، کیونکہ وحدیت کا کمال یہ ہے کہ ہر چیز کو تو ایسا ہی دیکھے جیسی کہ وہ اصل میں ہے تاکہ دیکھنا درست ہو اور اگر تو اس کے برخلاف دیکھے گا تو تیرا دیکھنا درست نہ ہوگا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: اَللّٰھُمَّ اَرِنَا حَقَائِقَ کُلِّ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ (ترجمہ: اے اللہ! تو ہمیں تمام اشیا کی حقیقتیں ایسی ہی دکھا جیسی کہ وہ ہیں)۔ جب چیزوں کا صحیح دیکھنا یہ ہے کہ تم ان کو اسی صفت میں دیکھو جس صفت پر کہ وہ ہیں، تو صحیح سننا بھی ایسا ہی ہونا چاہیے کہ تم ہر چیز کو ایسا ہی سنو جیسی کہ وہ چیز اپنی صفت اور حکم میں ہے اور جو لوگ مزامیر پر فریفتہ ہوتے ہیں اور ہوائے نفس اور شہوت سے وابستہ ہوتے ہیں، وہ اس کے برخلاف سنتے ہیں، جو وہ اصل میں ہے۔ اگر اس کے حکم کے مطابق سماع کرتے تو اس سماع کی تمام خرابیوں سے رہائی پا جاتے، یا تم نے نہیں دیکھا کہ اہل گمراہی نے خدا تعالےٰ کے کلام کو سنا تو اس میں ان کی گمراہی پر گمراہی زیادہ ہوئی۔ چنانچہ نضر بن الحارث نے جب قرآن عزیز کو سنا تو کہہ دیا ھٰذا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ۔

(ترجمہ: یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں) اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح جو وحی کا کاتب تھا، اس نے کہہ دیا: سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ (ترجمہ: میں بھی ایسا اُتار دوں گا جیسا اللہ نے قرآن اُتارا ہے۔ پس بابرکت ہے اللہ اچھا پیدا کرنے والا ہے)۔ ایک گروہ نے اس آیت لَاتُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَيُدْرِكُ الْاَبْصَارَ۔ (ترجمہ: آنکھیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھ سکتا ہے) کو دیدار الٰہی کی نفی کی دلیل بنالیا اور ایک گروہ نے ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ۔ (ترجمہ: پھر عرش قدرت پر اس طرح سے بیٹھا) کو مکان اور جہت کے ثابت کرنے کی دلیل بنالیا اور ایک گروہ نے وَّجَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا۔ (ترجمہ: اور آیا تیرا پروردگار اور فرشتے صفیں باندھ کر) کو اپنے دعویٰ کے لیے دلیل بنایا چونکہ ان کے دل گمراہی کا محل تھے، اس لیے کلام حق کا سننا ان کے لیے کچھ نفع مند نہ ہوا اور پھر موحد (خدا کو وحدہٗ لاشریک ماننے والا) نے جب کسی شاعر کے شعر میں نظر کی اور اس کی طبیعت کے پیدا کرنے والے خدا کو دیکھا اور اس کے دل کو آراستہ کرنے والے حق کو اس کے اندر مطالعہ کیا تو عبرت کے طور پر اس کے فعل کو فاعل پر دلیل بنایا، غرض یہ کہ اس گروہِ کفار نے کلام حق کو سن کر راستہ گم کردیا اور اس گروہ صوفیا نے کلام باطل میں بھی سیدھا راستہ پالیا اور یہ بالکل حقیقت ہے جس سے انکار کرنا کھلا مکابرہ ہے اور اللہ ہی کو زیادہ علم ہے۔

چھٹی فصل
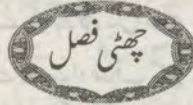
سماع کے متعلق مشائخ کے کلمات

سماع کے متعلق مشائخ رحمتہ اللہ علیہم کے اور بھی بہت سے لطیف کلمات ہیں، جن کی یہ کتاب متحمل نہیں ہوسکتی، لیکن جہاں تک ممکن ہوگا میں اس فصل میں ان کو لکھوں گا تاکہ ان شاأاللہ تعالےٰ تمہیں پورا فائدہ ہو اور توفیق اللہ کے قبضے میں ہے۔

ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلسَّمَاعُ وَارِدُالْحَقِّ يُزْعِجُ الْقُلُوْبَ اِلَى الْحَقِّ فَمَنْ اَصْغٰى اِلَيْهِ بِحَقٍّ تَحَقَّقَ وَمَنْ اَصْغٰى اِلَيْهِ بِنَفْسٍ تَزَنْدَقَ (ترجمہ: سماع حق کا فیضان ہے جو دلوں کو حق کی طرف اُبھارتا ہے۔ پس جس نے اس کو حقیقی معنوں کے ساتھ سنا، اس نے حق کی طرف راستہ پالیا اور جس نے اس کو خواہش نفس کے ساتھ سنا، بے دین ہوگیا) اور اس بزرگ کی مراد اس سے یہ نہیں ہے کہ سماع وصل حق کا سبب ہو جائے گا، بلکہ اس کی مراد یہ ہے کہ سننے والے کو چاہیے کہ اس بات کو حق کے ساتھ سنے نہ کہ صرف آواز کو تاکہ اس کا دل فیضانِ حق کا محل ہو جائے۔ پس جب وہ حق بات اس کے دل میں پہنچے گی تو دل کو اُبھارے گی۔ جو شخص اس سماع میں حق کا تابع ہوگا، اس کو مشاہدۂ حق حاصل ہوگا اور جو شخص نفس کا دوست اور تابع ہوگا، وہ حجاب میں رہ جائے گا اور تاویل سے تعلق پیدا کرے گا۔ پس اس کے سماع کا فائدہ تو مکاشفہ الٰہی ہوگا اور اس کے سماع کا فائدہ حق سے حجاب ہوگا۔ یہ یاد رکھو کہ "زندقہ" فارسی زبان کا لفظ ہے جو معرب کیا ہوا ہے اور فارسی زبان میں زندقہ کے معنی تاویل کے ہیں اور اسی سبب سے وہ لوگ اپنی کتاب کی تفسیر کو ژند اور پاژند کہتے ہیں اور جب لغت والوں نے چاہا کہ آتش پرستوں کا کوئی نام رکھیں تو انہوں نے زندیق نام رکھ دیا، کیونکہ وہ کہتے تھے کہ جو چیز یہ مسلمان کہتے ہیں، اس کی تاویل ہوسکتی ہے کیونکہ ظاہری حکم اس کو توڑتا ہے اور تنزیل دیانت میں داخل ہونا ہے اور تاویل دیانت سے باہر نکلنا ہے۔ آج کل کے بعض مصری بھی جن کو انہیں کے بچے کھچے سمجھو، وہی کچھ کر رہے ہیں جو مجوسی کہا کرتے تھے اور یہ زندیق کا اسم ان کے لیے خاص ہوگیا

ہے۔ پس ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ کی مراد اس سے یہ ہے کہ اہل تحقیق سماع میں محقق ہوتے ہیں اور اہل ہوا۔ اوّل (تاویل کرنے والے) کہ اس میں دور کی تاویل کرتے ہیں۔ اس سبب سے فسق میں پڑ جاتے ہیں۔

شبلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلسَّمَاعُ ظَاهِرُهٗ فِتْنَةٌ وَ بَاطِنُهٗ عِبْرَةٌ فَمَنْ عَرَفَ اِشَارَةً حَلَّ لَهٗ سِمَاعُ الْعِبْرَةِ وَ اِلَّافَقَدِ اسْتَدْعَى الْفِتْنَةَ وَ تَعَرَّضَ لِلْبَلِيَّةَ۔ (ترجمہ: سماع کا ظاہر فتنہ ہے اور اس کا باطن عبرت ہے۔ جو اہل اشارہ ہے اور اشارہ کو پہچانتا ہے، اس کو عبرت کا سننا حلال ہے ورنہ اس نے فتنے کو طلب کیا اور مصیبت کا سامنا کیا) یعنی جس کا دل پورے طور پر حق کی بات میں غرق نہیں ہے، سماع اس کے لیے بلا اور آفت کا محل ہے۔

ابو علی رودباری رحمتہ اللہ علیہ اس آدمی کے سوال کے جواب میں فرماتے ہیں جس نے آپ سے سماع کے متعلق پوچھا: لَيْتَنَا تَخَلَّصْنَا مِنْهُ رَاْسًابِرَاسٍ۔ (ترجمہ: کاش ہم اس سے پورے طور پر خلاصی پا جاتے) اس لیے کہ آدمی سب چیزوں کا حق ادا کرنے میں عاجز ہے۔ جب کسی چیز کا حق فوت ہو جاتا ہے تو بندہ اپنی تقصیر دیکھتا ہے اور جب اپنی تقصیر کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے کاش کہ ہم بالکل چھوٹ جاتے۔ ایک شیخ رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں: اَلسَّمَاعُ تَنْبِيْهُ الْاَسْرَارِ لِمَا فِيْهَا مِنَ الْمُغَيَّبَاتِ۔ (ترجمہ: سماع باطنوں کو اُبھارنا ہے، ان باتوں کے مشاہدے کے لیے جو باطنوں میں چھپی ہیں) تاکہ ان کے ذریعہ سے حق تعالےٰ کی بارگاہ میں حاضر رہیں، اس لیے کہ اسرار کا پوشیدہ ہونا مریدوں کے لیے سخت قابل ملامت اور ان کے سب سے برے اوصاف میں سے ہے اس لیے کہ اگرچہ دوست بظاہر دوست سے غائب ہو، دل سے حاضر ہوتا ہے اور جب غیبت آ گئی تو اس سے دوستی اُٹھ جائے گی۔ میرے شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: اَلسَّمَاعُ زَادُ الْمُضْطَرِّيْنَ فَمَنْ وَصَلَ اسْتَغْنٰى عَنِ السَّمَاعِ۔ (ترجمہ: سماع عاجز لوگوں کا سفر خرچ ہے، پس جو منزل پر پہنچ گئے، انہیں سماع کی حاجت نہیں) کیونکہ وصل کے محل میں سننے کا حکم باقی نہیں رہتا، کیونکہ سننا خبر کا ہوتا ہے اور خبر غائب کے متعلق باقی ہے۔ جب آنکھوں سے معائینہ ہو جاتا ہے تو سننا جاتا رہتا ہے۔

حضرت حضری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَيْشٍ تَعْمَلُ بِالسَّمَاعِ يَنْقَطِعُ اِذَا انْقَطَعَ مِمَّنْ يُسْمَعُ مِنْهُ يَنْبَغِيْ اَنْ يَّكُوْنَ سَمَاعُكَ مُتَّصِلاً غَيْرُ مُنْقَطِعٍ۔ (ترجمہ: تو اس سماع کو کیا کرے گا کہ جو منقطع ہو جائے۔ جب گانے والا جس سے وہ سنا جاتا ہے، رُک جائے تو اس کا اثر بھی جاتا رہے۔ پس مناسب یہ ہے کہ تیرا سماع متصل ہو جس کی تاثیر منقطع نہ ہو)۔ اس بات نے محبت کے باغ میں ہمت کے مجتمع ہونے کا پتہ دیا ہے، کیونکہ جب بندہ اس درجے پر پہنچ جاتا ہے تو سارا عالم پتھر اور مٹی اس کا سماع سنتے ہیں، لیکن یہ درجہ بہت بلند اور بزرگ ہے اور اللہ توفیق کا مالک ہے۔

ساتویں فصل
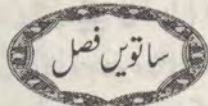
سماع میں صوفیا کا اختلاف

سماع کے متعلق مشائخ و محققین صوفیا کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ سماع غیبت کا آلہ ہے اور دلیل یہ لاتے ہیں کہ مشاہدے میں سماع محال ہے، کیونکہ دوست وصل دوست کے محل میں اس کی طرف نظر کرنے کی حالت میں سماع سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس لیے کہ سماع خبر کا ہوتا ہے اور خبر مشاہدہ کی حالت میں دُوری، پردہ اور مشغولی ہوتی ہے۔ پس سماع مبتدیوں کا آلہ ہے تاکہ غفلت کی پراگندیوں سے اس سماع کی وجہ سے مجتمع خاطر ہوں اور جو پہلے سے مجتمع ہو، وہ ضرور اس سماع کی وجہ سے پراگندہ ہو جاتا ہے۔ پھر ایک گروہ نے کہا ہے کہ سماع حاضری کا آلہ

ہے، کیونکہ محبت کلی فنا اور محویت چاہتی ہے۔ جب تک محبّ کا کل محبوب کے کل میں مستغرق نہ ہو جائے، وہ محبت میں ناقص ہوتا ہے۔ پس جیسا کہ دل کا حصہ وصل کے مقام میں محبت ہے اور باطن کا مشاہدہ، روح کا وصل اور جسم کا خدمت ہے اسی طرح ضروری ہے کہ کان کا بھی حصہ ہو جیسا کہ دیدار میں آنکھ کا حصہ ہے۔ کسی شاعر نے اپنے ہزلیہ اشعار میں جب کہ وہ شراب کی دوستی کا دعوےٰ کرتا ہے، کیا خوب کہا ہے:

اَلَا فَاسْقِنِیْ خَمْراً وَّقُلْ لِّیْ ھِیَ الْخَمْرُ
وَلَا تُسْقِنِیْ سِرًّا اِذَا اَمْکَنَ الْجَھْرُ

(ترجمہ: اے دوست! مجھے شراب پلا اور مجھے کہہ دے کہ یہ شراب ہے اور مجھے شراب مخفی طور پر نہ پلا، جب کہ ظاہر پلانا ممکن ہے)۔ یعنی اے دوست! مجھے شراب دے تاکہ میری آنکھ دیکھ لے اور میرا ہاتھ چھو لے اور میرا تالو چکھ لے، میری ناک سونگھ لے۔ اس وقت ایک قوتِ حاسہ بے نصیب رہ جائے گی اور وہ کان ہے۔ پس کہہ دے کہ یہ شراب ہے تاکہ کان بھی اپنا حصہ پالے، یہاں تک کہ میرے تمام حواس اس سے مل جائیں اور لذت گیر ہو جائیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ سماع حضوری کا آلہ ہے کیونکہ غائب، غائب ہی ہوتا ہے اور غائب منکر ہوتا ہے اور انجان اس کا اہل نہیں ہوتا۔ پس سماع دو قسم کا ہے: ایک بالواسطہ اور دوسرے بلاواسطہ۔ جو کچھ گانے والے سے سنتا ہے، وہ غیبت کا آلہ ہے اور جو کچھ باری تعالےٰ سے سنتا ہے، وہ حضوری کا آلہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس بزرگ نے فرمایا ہے کہ میں مخلوق کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ میں ان کی کوئی بات سنوں یا ان کی بات بیان کروں، سوائے حق تعالےٰ کے خاص لوگوں کے اور اللہ بہتر جانتا ہے۔

آٹھویں فصل
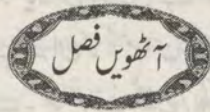
سماع میں صوفیا کے مرتبے

جاننا چاہیے کہ ان صوفیوں میں سے ہر ایک کے لیے سماع میں ایک مرتبہ اور مقام ہے، جس کے مطابق وہ اس سماع سے ذوق و لطف حاصل کرتا ہے جیسا کہ توبہ کرنے والے کے لیے جو کچھ وہ سنتا ہے، وہ اس کے لیے حسرت اور ندامت، حصول میں مدد، مشتاق کے لیے شوقِ دیدار کا سبب، یقین کرنے والے کے لیے یقین کی تاکید، مرید کے لیے بیان کی تحقیق، محبّ کے لیے تعلقات سے علیحدگی کا باعث اور فقیر کے لیے سب سے ناامیدی کی بنیاد ہو جاتی ہے۔ دراصل سماع کی مثال آفتاب کی سی ہے کہ وہ تمام چیزوں پر چمکتا ہے، لیکن ہر چیز کو اپنی صلاحیت اور مرتبے کے مطابق سورج سے روشنی، حرارت، ذوق اور مشرب حاصل ہوتا ہے۔ ایک کو تو وہ جلا دیتا ہے اور دوسرے کو روشن کرتا ہے، کسی کو پگھلاتا ہے تو کسی کو نوازتا ہے۔ یہ تمام گروہ جو میں نے بیان کیے ہیں، تحقیق کی رُو سے تین مرتبوں پر ہیں۔ ایک ان میں سے مبتدی، دوسرے متوسط درجے کے اور تیسرے کامل ہیں اور میں ہر ایک کے حال کی شرح میں سماع کے بارے میں ایک فصل بیان کروں گا تاکہ تمہاری سمجھ میں اچھی طرح آجائے، انشاءاللہ تعالےٰ۔
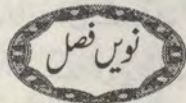
سماع کے متعلق اُمور

جاننا چاہیے کہ سماع فیضانِ حق ہے اور انسانی جسم کی ترکیب ہزل و لہو سے ہوئی ہے۔ جب جسم ہزل اور لہو

سے بنا ہے تو کسی حالت میں بھی مبتدی کی طبیعت حق تعالےٰ کی بات کے قابل نہیں ہوسکتی اور مطالبِ ربانی اور اسرارِ الٰہی کے وارد ہونے سے طبیعت کو سوز و گداز اور اضطراب حاصل ہوتا ہے، چنانچہ ایک گروہ سماع سے بے ہوش ہو جاتا ہے اور ایک گروہ ہلاک ہو جاتا ہے اور کوئی شخص ایسا نہیں رہتا کہ اس کی طبیعت حدِ اعتدال سے نہ گزر جائے۔ یہ بالکل ہمارا مشاہدہ ہے اور مشہور ہے کہ ملک روم کے شفاخانے میں ایک نہایت عجیب چیز لوگوں نے تیار کی ہے، جسے وہ انکلیون کہتے ہیں۔ چنانچہ جس چیز میں عجائبات بہت ہوں، یونانی لوگ اس کو اسی نام سے پکارتے ہیں۔ چنانچہ بڑے پیالے اور مانی وغیرہ کی عجیب صنعت کو انکلیون کہتے ہیں اور اس سے اس کی کاریگریوں اور حکمتوں کا اظہار مقصود نہیں بلکہ محض نام کا اظہار ہے اور وہ روڈ[1] کی قسم کا ایک ساز ہوتا ہے۔ ہفتے میں دو دفعہ بیماروں کو وہاں لے جا کر وہ باجا بجانا شروع کر دیتے ہیں اور اس بیمار کی بیماری کے مطابق اس کو اس باجے کی آواز سناتے ہیں۔ پھر اس کو وہاں سے باہر لے آتے ہیں اور جب چاہتے ہیں کہ کسی کو ہلاک کریں تو زیادہ دیر تک اس کو وہاں رکھتے ہیں تاکہ وہ ہلاک ہو جائے۔ درحقیقت اجلیں لکھی ہوئی ہیں، لیکن موت کے اسباب ہیں اور طبیب ہمیشہ اس کو سنتے ہیں اور یہ ان پر کچھ اثر نہیں کرتا، کیونکہ وہ ان کی طبیعت کے بالکل موافق ہے اور مبتدیوں کی طبیعت کے مخالف ہے۔

ہندوستان میں میں نے دیکھا ہے کہ زہر قاتل میں ایک کیڑا پیدا ہو جاتا ہے، اس کی زندگی اس زہر پر ہی موقوف ہوتی ہے اس لیے کہ وہ ہمہ تن زہر ہی ہو جاتا ہے۔ ترکستان میں میں نے اسلام کی سرحد پر ایک شہر میں دیکھا کہ ایک پہاڑ میں آگ لگی ہوئی تھی اور وہ جل رہا تھا اور اس کے پتھروں سے نوشادُر اُبل رہا تھا۔ اس آگ میں ایک چوہا تھا جب وہ اس آگ سے باہر نکلا تو ہلاک ہو گیا۔ ان مثالوں سے مراد یہ ہے کہ مبتدیوں کی بے چینی فیضانِ الٰہی کے حلول کی صورت میں اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ان کا جسم اس کے بالکل مخالف ہوتا ہے۔ جب وہ حالت متواتر ہوتی رہتی ہے تو مبتدی اس میں ساکن ہو جاتا ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جب جبرئیل علیہ السلام شروع میں وحی لے کر آئے تو پیغمبر ﷺ کو اس کے دیکھنے کی طاقت نہ ہوئی۔ جب نہایت کے درجے پر پہنچ گئے تو اگر ایک ساعت کے لیے بھی جبرئیل علیہ السلام نہ آتے تو حضور ﷺ غمگین جاتے۔ اس کے شواہد بہت سے ہیں اور یہ حکایتیں سماع میں مبتدیوں کے اضطراب کی دلیل اور منتہیوں کے آرام کی حجت ہیں۔

مشہور ہے کہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا ایک مرید تھا، جو سماع میں بہت اضطراب کیا کرتا تھا اور درویشوں کو اسے سنبھالنا پڑتا۔ انہوں نے حضرت شیخ کے پاس شکایت کی تو آپ نے اس مرید سے فرمایا کہ اگر اس کے بعد سماع میں تو نے بے قراری ظاہر کی تو میں تجھے اپنا ہم نشین نہیں رکھوں گا۔ ابو محمد حریری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سماع میں جب میں نے اس شخص کو دیکھا تو پایا کہ اس کے لب بند ہیں اور اس کے جسم کے ہر بال سے چشمہ اُبل رہا ہے۔ ایک دن اس کے ہوش و حواس غائب تھے۔ دوسرے دن جو دیکھا تو وہ اسی طرح بے ہوش تھا۔ جب بھی میں اُس درویش کی طرف نگاہ کرتا تو دیکھتا کہ وہ لب بند کیے ہوئے خاموش بیٹھا ہے لیکن اس کے جسم کے ہر بال سے چشمہ اُبل رہا ہے، یہاں تک کہ اس کے ہوش و حواس جاتے رہے اور ایک دن سماع کے وقت تو وہ بے ہوش ہی تھا۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ سماع میں زیادہ اچھی حالت میں تھا یا پیر کی حرمت اس کے دل پر غالب تھی۔

کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے سماع میں نعرہ لگایا۔ مرشد نے اس کو کہا: خاموش رہ۔ اس نے سر زانو پر رکھ دیا۔

[1] رود تاروں والا ایک ساز ہوتا ہے۔

جب لوگوں نے غور سے دیکھا تو مرا ہوا تھا۔ شیخ ابو مسلم فارس بن غالب فارسی سے میں نے سنا کہ انہوں نے فرمایا: ایک درویش سماع میں بہت بے قرار ہوا کرتا تھا۔ کسی شخص نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ بیٹھ جا۔ اس کا بیٹھنا تھا کہ جان دے دی۔ نیز آپ درّاج سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: میں ابن القرطی کے ہمراہ دجلہ کے کنارے کنارے بصرہ اور ابلہ کے درمیان جا رہا تھا کہ ہم ایک محل کے نیچے پہنچے تو دیکھا کہ ایک شخص محل کی چھت پر بیٹھا ہے اور ایک لونڈی اس کے سامنے گا رہی اور یہ شعر پڑھ رہی ہے:

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وُدٌّ کَانَ مِنِّیْ لَکَ یُبْذَلُ
کُلَّ یَوْمٍ تَتَلَوَّنَ غَیْرُ ھٰذَا بِکَ اَجْمَلُ

(ترجمہ: میں تو تجھ سے خدا کے لیے محبت کیا کرتا تھا اور اس کے ساتھ تیرا ہر روز ایک نئے سے نیا رنگ بدلنا کیا بھلا معلوم ہوتا تھا) اور میں نے ایک جوان کو دیکھا کہ اس محل کے نیچے گدڑی اور لوٹا لیے کھڑا ہے۔ اس نے کہا: "اے لونڈی! تجھے خدا کی قسم کہ یہ بیت دوبارہ گا کہ میری زندگی ایک سانس سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے تاکہ وہ اس بیت کے سننے سے ختم ہو جائے۔" لونڈی نے اس کو دوبارہ پڑھا۔ اس جوان نے نعرہ مارا اور اس کی جان نکل گئی۔ لونڈی کے مالک نے لونڈی سے کہا کہ تو آزاد ہے اور خود نیچے اتر آیا اور اس کے کفن و دفن کی تیاری میں لگ گیا اور سب بصرہ والوں نے اس پر نماز پڑھی۔ اس کے بعد وہ آدمی کھڑا ہوا اور اس نے کہا: "اے اہل بصرہ! میں فلاں فلانے کا بیٹا ہوں، میں نے اپنی سب ملکیتیں اللہ کی راہ میں وقف کر دی ہیں اور غلاموں کو آزاد کر دیا ہے۔" یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا اور کسی کو اس کی خبر معلوم نہ ہوئی۔ اس حکایت کے بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مرید کا سماع کے غلبے میں ایسا حال ہونا چاہیے کہ اس کا سماع بدکاروں کو بدکاری سے نجات دے اور اس زمانے میں گمراہوں کا ایک گروہ بدکاروں کے سماع میں حاضر ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم حق کی وجہ سے سماع کرتے ہیں اور فاسق لوگ اس میں ان کی موافقت کرتے ہیں اور سماع کرنے پر فسق اور فجور کے ساتھ زیادہ حریص ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ خود ہلاک ہو جاتے ہیں۔ حضرت جنیدؒ سے لوگوں نے پوچھا کہ اگر ہم عبرت کے طور پر گرجا میں چلے جائیں اور اس سے ہماری مراد اس کے سوا اور کچھ نہ ہو کہ کافروں کی ذلت کو دیکھیں اور اسلام کی نعمت پر شکر ادا کریں تو کیا یہ جائز ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اگر تم گرجے میں ایسے طور پر جا سکتے ہو کہ جب تم باہر نکلو تو ان میں سے چند آدمیوں کو اپنے ساتھ درگاہِ حق میں لا سکو تو چلے جاؤ، ورنہ نہیں۔ پس عبادت خانے والا اگر شراب خانے میں چلا جائے تو شراب خانہ بھی اس کا عبادت خانہ بن جاتا ہے اور شراب خانے والا جب عبادت خانے میں چلا جائے تو عبادت خانہ بھی اس کا شراب خانہ بن جاتا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں بغداد میں ایک درویش کے ہمراہ جا رہا تھا کہ اس اثنا میں ہم نے ایک مطرب کی آواز سنی جو یہ گا رہا تھا:

مُنٰی اِنْ تَکُنْ حَقًّا تَکُنْ اَحْسَنَ الْمُنٰی
وَ اِلَّا فَقَدْ عِشْنَا بِھَا زَمَنًا وَّ غَدًا

(ترجمہ: آرزو اگر حق ہے تو اچھی آرزو ہے ورنہ ہم نے اس آرزو میں ایک زمانہ بسر کیا ہے جو گذر چکا ہے) اس درویش نے نعرہ مارا اور دُنیا سے رُخصت ہوا۔ ایسا ہی ابو علی رودباری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک درویش کو میں نے دیکھا جو ایک گویے کی آواز میں مشغول ہو رہا تھا۔ میں نے بھی اس پر کان لگائے کہ اس کا گانا سنوں تو وہ غم ناک آواز میں یہ شعر گا رہا تھا: اُمُدُّ کَفِّیْ بِالْخُضُوْعِ اِلَی الَّذِیْ جَادَ بِالْاِصْغَاءِ

(ترجمہ: میں فروتنی سے اس شخص کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں جو سننے کی سخاوت کرتا ہے) تب اس درویش نے ایک نعرہ مارا اور گر پڑا۔ جب میں اس کے پاس گیا تو میں نے دیکھا کہ مرا ہوا ہے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ پہاڑ میں کسی راستے پر جا رہا تھا۔ میرے دل میں خوشی پیدا ہوئی تو میں نے یہ شعر پڑھے:

؎ صَحَّ عِنْدَ النَّاسِ اِنِّیْ عَاشِقٌ
غَیْرَ اَنْ لَّمْ یَعْرِفُوا عِشْقِیْ لِمَنْ
لَیْسَ فِی الْاِنْسَانِ شَیْئٌ حَسَنٌ
اِلَّا وَ اَحْسَنُ مِنهُ مَوْتُ الْحَسَنِ

(ترجمہ: لوگوں کو یہ تو صحیح طور پر معلوم ہے کہ میں عاشق ہوں مگر انہیں یہ معلوم نہیں کہ میں کس پر عاشق ہوں۔ انسان میں اس کی حسین آواز کے سوا اور کوئی چیز خوبصورت نہیں)۔ مجھ سے حضرت ابراہیم رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ شعر پھر پڑھو۔ میں نے پھر پڑھا تو آپ نے وجد کے طور پر چند قدم زمین پر مارے۔ جب میں نے غور سے دیکھا تو آپ کے قدم اس پتھر میں اس طرح گڑ گئے جس طرح کہ موم میں۔ تب آپ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ جب ہوش میں آئے تو مجھ سے فرمایا: "میں تو بہشت کے باغ میں تھا لیکن تو نے دیکھا نہیں۔" اس قسم کی حکایتیں اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ یہ کتاب ان کی متحمل ہو سکے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک درویش میں یہ بات دیکھی کہ آذر بائیجان کے پہاڑوں میں چلا جا رہا تھا اور جلدی جلدی یہ اشعار پڑھتا اور گریہ وزاری کرتا جاتا تھا:

؎ وَ اللّٰہِ مَا طَلَعَتْ شَمْسٌ وَلَا غَرَبَتْ
اِلَّا وَ اَنْتَ فِیْ قَلْبِیْ وَ وَ سْوَا سِیْ
وَلَا جَلَسْتُ اِلٰی قوم اُحَدِّثُھُمْ
اِلَّا وَاَنْتَ حَدِیْثِیْ بَیْنَ جُلَّاسِیْ
وَلَا ذَکَرْتُكَ مَحْزُوْنًا وَلَا طَرَبًا
اِلَّا وَحُبُّكَ مَقْرُوْنٌ بِاَ نْفَاسِیْ
وَلَا ھَمَمْتُ بِشُرْبِ الْمَاءِ مِنْ عَطَشٍ
اِلَّا رَاَیْتُ خَیَالًا مِنْكَ فِی الْکَاْسِ
فَلَوْ قَدَرْتُ عَلَی الْاِتْیَانِ زُرْتُکُمْ
سَحْبًا عَلَی الْوَجْہِ اَوْمَشْیًا عَلَی الرَّاْسِ

(ترجمہ: قسم اللہ کی کبھی سورج طلوع نہیں ہوا اور نہ کبھی وہ غروب ہوا، مگر ایسی حالت میں کہ تو میرے دل میں اور میرے خیالوں میں ہوتا ہے اور میں کبھی کسی قوم کے پاس گفتگو کرنے کے لیے نہیں بیٹھا، مگر ایسی حالت میں کہ میرے ہم نشینوں میں تیرا ہی ذکر کرتا ہوتا ہے اور میں نے کبھی تیرا ذکر رنج اور خوشی کی حالت میں نہیں کیا، مگر ایسی حالت میں کہ تیری محبت میری سانسوں میں ملی ہوئی ہوتی ہے اور میں نے کبھی پیاس کی وجہ سے پانی پینے کا ارادہ نہیں کیا، مگر ایسی حالت میں کہ تیرے خیال کو میں پیالے میں دیکھتا ہوں۔ اگر مجھے آنے کی قدرت ہوتی تو میں منہ کے بل گھسٹتے ہوئے اور سر کے بل پھر تیری زیارت کو آتا)۔

اس سماع سے اس کی حالت متغیر ہوگئی۔ تھوڑی دیر بیٹھ گیا اور پھر پتھر سے پیٹھ لگا کر جان دے دی، اللہ کی اس پر رحمت ہو۔

دسویں فصل
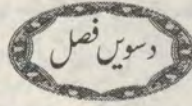
ہوس انگیز اشعار سننے کی کراہت

مشائخ کا ایک گروہ قصیدوں اور اشعار کے سننے اور قرآن کو ایسے طور پر لحن سے پڑھنے کو کہ اس کے حروف اپنے مخرج سے باہر نکل جائیں، مکروہ سمجھتا اور مریدوں کو اس سے پرہیز کرنے کا حکم دیتا ہے اور خود پرہیز کرنے میں بھی مبالغہ کرتا ہے۔ ان کے چند گروہ ہیں اور ہر گروہ کے لیے اس میں ایک اور ہی علت ہے۔ ایک گروہ ان میں سے وہ ہے جس کے پاس اس کی حرمت کے متعلق کئی روایتیں ہیں اور اس میں وہ سلف صالحین کے تابع اور مقلد ہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی لونڈی شیریں کو گانے سے جھڑکنا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس صحابی کو تازیانہ لگانا جو گاتا تھا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا معاویہ پر اس وجہ سے اعتراض کرنا کہ اس نے گانے والی لونڈیاں رکھی ہوئی ہیں اور آپ کے صاحبزادے حسن رضی اللہ عنہ کو اس حبشہ عورت کے دیکھنے سے منع کرنا جو گا رہی تھی، اور آپ فرماتے تھے کہ وہ شیطان کی رفیقہ ہے۔

ایسی ہی دوسری روایتیں ہیں جو اشعار و قصائد گانے کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں اور کہتے ہیں کہ غنا کو مکروہ سمجھنے کے لیے ہمارے پاس سب سے بڑی دلیل اس زمانے میں اور ہم سے پہلے زمانے میں اُمت کا اجماع ہے۔ یہاں تک کہ اس ایک گروہ نے اس کو مطلق حرام کہا ہے اور وہ اس کے متعلق ابو الحارث بنانی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں سماع کے متعلق بہت زور دیا کرتا تھا کہ ایک رات کوئی شخص میرے عبادت خانے کے دروازے پر آیا اور اس نے کہا: اللہ تعالےٰ کی درگاہ کے طالبوں کی ایک جماعت جمع ہوئی ہے جو شیخ کے دیدار کی مشتاق ہے، اگر مہربانی کر کے قدم رنجہ فرمائیں تو بہت بہتر ہوگا۔ میں نے کہا کہ تو چل میں آتا ہوں۔ میں باہر نکلا اور اس کے پیچھے ہولیا۔ کچھ زیادہ دیر نہ گذری کہ میں ایک گروہ کے پاس جا پہنچا، جنہوں نے حلقہ باندھا ہوا تھا اور ایک بوڑھا ان کے درمیان تھا۔ میری انہوں نے حد سے زیادہ تعظیم کی اور اس بوڑھے نے کہا اگر آپ فرمائش کریں تو کچھ شعر پڑھیں۔ میں نے قبول کیا۔ وہ آدمی نہایت خوش آواز سے اشعار پڑھنے لگے، ایسے اشعار جو شاعر لوگ فراق اور ہجر میں پڑھا کرتے ہیں اور جن کو سن کر وہ سب لوگ وجد کی حالت میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور اچھی طرح سے نعرے لگانے اور لطیف اشارے کرنے لگے۔ میں ان کی حالت پر بڑا متعجب ہوا اور ان کی خوش وقتی بدستور رہی یہاں تک کہ صبح قریب ہوگئی۔ اس وقت اس بوڑھے نے مجھ سے کہا: "اے شیخ! آپ نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ تو کون ہے اور یہ گروہ کون ہیں؟" میں نے کہا: "تیرے دبدبے نے مجھے سوال کرنے سے روک دیا۔" اس نے کہا: "میں خود تو عزازیل ہوں، جو خدا کی رحمت سے دُور ہوں اور اب ابلیس کے نام سے موسوم ہوں اور یہ سب لوگ میرے فرزند ہیں اور اس طرح بیٹھنے اور گانے میں مجھے دو فائدے ہیں: ایک تو میں اپنے فراق کی مصیبت رکھتا ہوں اور اقبال کے دنوں کو یاد کرتا ہوں، دوسرے یہ کہ عابد لوگوں کو راہِ حق سے بھٹکاتا اور غلط راستے پر ڈالتا ہوں۔" وہ فرماتے ہیں کہ سماع کا ارادہ اس وقت سے میرے دل سے دُور ہوگیا۔ میں علی بن عثمان جلابی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ ابو العباس اشقانی سے سنا کہ آپ نے فرمایا کہ ایک دن میں ایک مجمع میں تھا کہ کچھ لوگ سماع کر رہے تھے۔ میں نے ان میں جنوں کو برہنہ دیکھا، جو ناچ رہے

تھے اور تمام لوگ ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور ان کی وجہ سے گرم ہو رہے تھے۔

ایک دوسرا گروہ ہے جو اپنے مریدوں کے خوف اور خطرے کی وجہ سے کہ کہیں وہ مصیبت اور بیکاری میں نہ پڑ جائیں اور ان کی تقلید نہ کریں، توبہ کا خیال چھوڑ کر گناہ میں مشغول نہ ہوں، خواہش نفس ان میں قوت نہ پکڑے اور نفسانی خواہش ان کے نیکی کے پکے ارادے کو توڑ نہ دے جو مصیبتوں میں پڑنے کا محل اور فتنے کا سرمایہ ہیں، وہ سماع کے قائل نہ تھے اور نہ وہ ان میں بیٹھتے تھے۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ نے ایک مرید سے اس کی توبہ کی ابتدا کی حالت میں فرمایا کہ اگر تو اپنے دین کی سلامتی چاہتا ہے تو توبہ کی رعایت کر اور سماع جو صوفی لوگ کرتے ہیں، اس سے نفرت کر اور اپنے آپ کو جب تک تو جوان ہے، اس کا اہل نہ سمجھ اور جب تو بوڑھا ہو جائے تو لوگوں کو اپنی وجہ سے گنہگار نہ بنا۔

ایک اور گروہ نے کہا ہے کہ اہل سماع دو گروہ ہیں: ایک گروہ ہے جو لہو کرنے والے ہیں، دوسرا وہ ہے جو الٰہی ہیں (اللہ سے تعلق رکھنے والے)۔ لاہی تو عین فتنے میں ہوتے ہیں کیونکہ ان کو ڈر رہتا ہے اور الٰہی مجاہدوں اور ریاضتوں اور مخلوقات سے دل کے منقطع کر لینے اور باطن کو مخلوقات سے الگ کرنے کی وجہ سے فتنے سے بچے رہتے ہیں، اس لیے وہ بے خوف ہوتے ہیں چونکہ ہم لوگ نہ اس گروہ سے ہیں نہ اس گروہ سے، لہٰذا اس کا ترک کرنا ہمارے لیے بہتر ہے اور اس بات میں مشغول ہونا جو ہمارے وقت کے موافق ہے، بہت مناسب ہے۔ ایک اور گروہ نے کہا ہے کہ جب عام لوگوں کے لیے سماع میں فتنہ ہے اور ہمارے سننے کی وجہ سے لوگوں کا اعتقاد خراب ہوتا ہے اور ہمارے درجے سے لوگ حجاب میں ہوتے ہیں اور ہماری وجہ سے وہ گنہگار ہوتے ہیں تو اس عام پر ہم شفقت اور خاص کو نصیحت کرتے ہوئے اور غیرت کی وجہ سے اس سے ہاتھ اُٹھا لیتے ہیں۔ یہ طریقہ بھی بہت پسندیدہ ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ وَ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُ مَالَا يَعْنِيْهِ۔ (ترجمہ: آدمی کا اچھا اسلام یہ ہے جو ان باتوں کو چھوڑ دے جن کی اس کو ضرورت نہیں) یعنی اس چیز سے ہم ہاتھ اٹھالیں جس سے بھاگنا لازم ہے کیونکہ غیر ضروری (بے فائدہ) باتوں میں مشغول ہونا وقت کو ضائع کرنا ہے اور دوستوں کا وقت عزیز دوستوں سے مل کر ضائع نہ کرنا چاہیے۔ خاص صوفیوں کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ سماع خبر ہے اور اس کی لذت مراد کا پانا ہے اور یہ بچوں کا کام ہے، کیونکہ مشاہدے میں خبر کی کیا قدر ہے، پس مشاہدے سے کام رکھو۔ یہ سماع کے احکام ہیں جو ہم نے مختصر طور پر بیان کر دیئے۔ اب میں ان صوفیوں کے وجد، وجود اور تواجد کے بارے میں اللہ کی توفیق سے ایک باب مرتب کروں گا۔

گیارہویں فصل
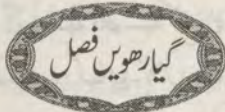
وجد، وجود و تواجد اور ان کے متعلقات

جاننا چاہیے کہ وجد اور وجود دو مصدر ہیں۔ ایک کے معنی غم کے اور دوسرے کے معنی پا لینے کے ہیں۔ دونوں کا فاعل ایک ہوتا ہے اور سوائے مصدر کے ان میں فرق نہیں کر سکتے جیسا کہ کہتے ہیں وَجَدَ يَجِدُ وُجُوْدًا اَوْ وِجْدَانًا، جب اس نے پالیا اور وَجَدَ يَجِدُ وَجْدًا، جب وہ غمگین ہوا، نیز وَجَدَ يَجِدُ جِدَّةً، جب وہ تونگر ہو گیا اور وَجَدَ يَجِدُ مَوْجُوْدَةً، جب وہ غصے ہو گیا۔ ان سب میں فرق مصدروں کی وجہ سے ہوتا ہے نہ فعلوں کی وجہ سے اور

اس گروہ کی مراد وجد اور وجود سے دو حال کا ثابت کرنا ہے جو ان کو سماع میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک حال غم کے قرین ہوتا ہے اور دوسرا حال مراد کے پالینے کے ساتھ متصل ہوتا ہے۔ غم کی حقیقت محبوب کا گم ہو جانا اور مراد کا منع کر دینا ہے اور پالینے کی حقیقت مراد کا حاصل کرنا ہے۔ حزن اور وجد میں فرق یہ ہے کہ حزن نام اس غم کا ہے جو اپنے نصیب میں ہو اور وجد اس غم کا نام ہے جو غیر کے نصیب میں محبت کے طور پر ہو اور یہ تغیرات سب طالب کی صفات ہیں۔ حق تعالےٰ تغیر پذیر نہیں اور وجد کی کیفیت عبارت کے تحت میں نہیں آسکتی کیونکہ اسے آنکھوں سے دیکھنے میں رنج ہوتا ہے اور الم کو قلم کے ساتھ نہیں بیان کیا جا سکتا۔ پس وجد طالب اور مطلوب کے درمیان ایک بھید ہے کہ اس کا بیان کرنا مکاشفے میں غیبت ہے اور وجود کی کیفیت سے نشان اور اشارہ کرنا درست نہیں ہوتا کیونکہ یہ مشاہدے میں خوشی ہے اور خوشی طالب میں پا نہیں سکتے۔ پس وجود محبوب کی طرف سے محبّ کے حق میں ایک فضل ہے کہ اشارہ اس کی حقیقت سے الگ ہے اور میرے نزدیک وجد دل میں الم کا یا تو خوشی سے یا طرح نیچے پھینک دینے سے یا رنج سے یا طرب سے پہنچنا ہے اور وجود دل سے غم کو دُور کرنا اور اس کی مراد پالینا ہے۔ واجد کی صفت یا تو حجاب کی حالت میں غلبہ شوق میں حرکت دینا ہے یا کشف کی حالت میں مشاہدہ سے آرام پانا ہے یعنی یا تو شور، فریاد، نالہ اور گریہ کی وجہ سے حرکت کرنا، یا خوشی اور سکی اور سرور سے آرام پانا اور مشائخ اس بات میں مختلف ہیں کہ وجد زیادہ کامل ہے یا وجود۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ وجود مریدوں کی صفت اور وجد عارفوں کی صفت ہے، چونکہ عارفوں کا درجہ مریدوں سے بلند ہوتا ہے، اس لیے عارفوں کا وصف بھی مریدوں سے بلند تر، کامل تر ہے کیونکہ جو چیز حصول کے تحت آتی ہے، وہ مدرک ہوتی ہے اور وہ جنس کی صفت ہے اس لیے کہ ادراک حمد کا تقاضا کرتا ہے اور خداوند تعالےٰ کے لیے کوئی حد نہیں۔ پس جو کچھ بندے نے پالیا، وہ سوائے شرب کے کچھ نہ تھا اور جو کچھ اس نے نہیں پایا، اس سے اس کا طالب بے تعلق ہو گیا اور اس کی طلب سے عاجز اور حق تعالےٰ کی حقیقت کا پانے والا نہ ہوگا۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ وجد مریدوں کا جلنا اور وجود محبوں کا تحفہ ہے جبکہ محبوں کا درجہ مریدوں سے بلند تر ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آرام تحفے کے ساتھ طلب میں جلن سے زیادہ کامل ہو اور یہ معنی حکایت کے سوا واضح نہیں ہوسکتا اور وہ حکایت یہ ہے کہ ایک دن حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ اپنے حال کے جوش میں حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آئے تو آپ کو غمگین پا کر پوچھا: اے شیخ! کیا ہوا ہے؟ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: مَنْ طَلَبَ وَجَدَ۔ (ترجمہ: جس نے طلب کیا، وہ غمگین ہوا) حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: نہیں بلکہ مَنْ وَجَدَ طَلَبَ۔ (ترجمہ: جو غمگین ہوا اس نے طلب کیا) پھر مشائخ نے اس کے متعلق کلام کیا ہے۔ جنید رحمۃ اللہ علیہ نے تو وجد کا نشان دیا ہے اور دوسرے نے وجود کی طرف اشارہ کیا ہے اور میرے نزدیک معتبر قول حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کیونکہ جب بندہ پہچان لے گا کہ اس کا معبود اس کی جنس سے نہیں ہے تو اس کا غم والم دراز ہو جائے گا۔ اس کے متعلق اس کتاب میں کسی جگہ ذکر ہو چکا ہے اور مشائخ متفق ہیں کہ عالم کا غلبہ وجد کے غلبے سے زیادہ قوی ہوتا ہے کیونکہ جب وجد کی سلطنت کو قوت ہو تو واجد خطرے کے محل میں ہوتا ہے اور جب علم کی سلطنت کو قوت ہو تو عالم امن کے محل میں ہوتا ہے۔ ان سب باتوں سے مراد یہ ہے کہ تمام احوال میں طالب کو چاہیے کہ عالم اور شریعت کا تابع ہو، کیونکہ جب وجد سے مغلوب ہو جائے گا تو خطاب اس سے اٹھ جائے گا اور جب خطاب اُٹھ گیا تو ثواب اور عذاب بھی اٹھ جائے گا، جب ثواب و عذاب اُٹھ جائے گا تو عزت اور ذلت بھی اٹھ جائے گی۔ پس اس وقت اس کا حکم مجنوں کا سا ہو جائے گا نہ اولیاء اللہ اور

مقربین کا سا۔ جب علم کی سلطنت حال کی سلطنت پر غالب ہو تو بندہ اللہ کے اوامر اور نواہی کی پناہ میں ہوتا ہے اور عزت کے پردہ سرا میں ہمیشہ مشکور ہوتا ہے۔ پھر جب حال کی سلطنت علم کی سلطنت پر غالب ہو تو بندہ حدودِ الٰہی سے خارج ہو جاتا اور خطاب سے محروم ہو جاتا ہے۔ اپنے نقص کے محل میں معذور یا مغرور ہوتا ہے اور بعینہٖ اس معنی کے مطابق حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ راستے دو ہیں، یا علم سے یا عمل سے یا ایسی روش سے جو بغیر علم کے ہو اور عمل اگرچہ نیک ہو جہالت اور نقص ہوتا ہے اور علم اگرچہ بے عمل ہی ہو عزت اور شرف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ كُفْرُ اَهْلِ الْهِمَّتِ اَشْرَفُ مِنْ اِسْلَامِ اَهْلِ الْمُنْيَةِ۔ (ترجمہ: اہل ہمت پر کفر اور ناشکری ممکن نہیں ہوسکتی) لیکن اگر فرض کریں تو اہل ہمت باوجود کفر کے بھی اہل آرزو سے ایمان میں زیادہ کامل ہوں گے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت فرمایا کہ اَلشِّبْلِيُّ سَكْرَانُ وَلَوْ اَفَاقَ مِنْ سُكْرِهٖ لَجَاءَ مِنْهُ اِمَامٌ يَنْفَعُ بِهٖ۔ (ترجمہ: شبلی رحمۃ اللہ علیہ مست ہے اور اگر اس کو ہوش آ جائے تو وہ ایک ایسا امام ہو جس سے نفع اُٹھایا جائے۔

حکایات میں مشہور ہے کہ حضرت جنید و محمد بن مسروق و ابو العباس بن عطار رحمۃ اللہ علیہم ایک جگہ جمع تھے۔ قوال ایک شعر پڑھ رہا تھا اور وہ سب حضرت تواجد کر رہے تھے، لیکن جنید رحمۃ اللہ علیہ بالکل مطمئن تھے۔ سب حضرات نے پوچھا: اے شیخ! آپ کو سماع سے کچھ وجد نہیں آیا۔ آپ نے کلام اللہ کی یہ آیت تلاوت کی۔ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ۔ (ترجمہ: اور پہاڑوں کو دیکھے گا تو خیال کرے گا کہ وہ منجمد ہیں، حالانکہ وہ بادلوں کی طرح تیزی سے چل رہے ہوں گے) لیکن تواجد وجد لانے میں ایک تکلف ہوتا ہے اور یہ حق تعالیٰ کے انعام اور شواہد حق کو دل پر پیش کرنا ہے اور وصل کا خیال اور مردوں کے فعل کی تمنا کرتا ہے۔ ایک گروہ اس بارے میں رسم کے پابند ہیں کہ انہوں نے ان صوفیوں کی ظاہری حرکات، ان کے رقص کی ترتیب اور ان کے ارشادات کی آرائش کی تقلید کی ہے اور یہ حرام محض ہے ایک گروہ محققین کا ہے کہ ان کی مراد ان حرکات اور رسوم سے صوفیا کے احوال اور ان کے درجے کی طلب ہوتی ہے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے: مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔ (ترجمہ: جو کسی قوم سے مشابہت پیدا کرتا ہے، وہ ان ہی میں سے ہوتا ہے)، نیز آپ ﷺ نے فرمایا ہے: اِذَا قَرَاْتُمُ الْقُرْاٰنَ فَابْكُوْا فَاِنْ لَّمْ تَبْكُوْا فَتَبَاكُوْا۔ (ترجمہ: جب تم قرآن پڑھو تو روؤ اور اگر خود بخود رونا نہ آئے تو تکلف سے روؤ)۔ یہ خبر تواجد کے مباح ہونے پر ناطق ہے اور اسی سبب سے اس بزرگ نے کہا کہ اگر ہزار کوس جھوٹ کے ساتھ چلوں تو ایک قدم سچ کا آتا ہے۔ اس باب میں کلام اس سے کہیں زیادہ ہے، لیکن میں نے اسی پر اختصار کیا ہے اور توفیق اللہ کے قبضے میں ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

بارھویں فصل
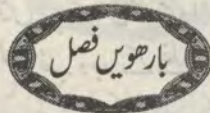
سماع میں رقص

جاننا چاہیے کہ شریعت اور طریقت میں رقص کی کوئی سند موجود نہیں کیونکہ وہ عقلمندوں کے اتفاق سے جب اچھی طرح کیا جائے تو لہو ہوتا ہے اور جب بے ہودہ طور پر کیا جائے تو لغو ہوتا ہے۔ مشائخ میں سے کسی بزرگ نے بھی اس کی تعریف نہیں کی اور نہ اس میں مبالغہ کیا ہے اور اہل حشو جو دلائل اس کے بیان کرتے ہیں، وہ سب باطل ہیں چونکہ

وجد کی حرکتیں اور اہل تواجد کے کام اس کی مانند ہیں، اس لیے فضول لوگوں کے ایک گروہ نے اس رقص کی تقلید کی ہے اور اس میں مبالغہ کرنے لگے ہیں اور اس کو اپنا مذہب بنالیا ہے۔ میں نے عوام کا ایک گروہ دیکھا جو یہ خیال کرتے ہیں کہ تصوف کا مذہب اس کے سوا اور کچھ نہیں اور انہوں نے اسے اختیار کرلیا ہے اور ایک گروہ اس کے اصل کے ہی منکر ہیں، الغرض ناچنا شرعاً اور عقلاً سب کے نزدیک بڑا اور قبیح ہے اور محال ہے کہ جو لوگوں میں افضل ہیں، وہ ایسی حرکت کریں لیکن جب سبکی دل میں پیدا ہوتی ہے اور ایک خفقان سر پر غلبہ پالیتا ہے اور وقت قوی ہو جاتا ہے تو حال اپنی بے چینی پیدا کر دیتا ہے اور رسوم کی ترتیب اٹھ جاتی ہے اور وہ اضطراب جو پیدا ہوتا ہے نہ وہ رقص ہے اور نہ ناچنا ہے نہ طبیعت کی پرورش کرنا ہے، بلکہ وہ تو جان گدازی ہے اور جو شخص اس کو رقص کہتا ہے، وہ طریقِ حق سے بہت دُور ہے۔ دراصل ایک حال ہے جس کو زبان سے بیان نہیں کرسکتے۔ وَ مَنْ لَّمْ یَزُقْ لَا یَدْرِیْ النَّظَرَ فِی الْاَحْدَاثِ۔ (ترجمہ: اور جس نے چکھا نہیں وہ نوجوانوں میں نظر کرنا نہیں جانتا) فی الجملہ نوجوانوں میں نظارہ کرنا اور ان کے ساتھ صحبت رکھنا ممنوع ہے اس کو جائز سمجھنے والا کافر ہے اور جو اس بارے میں لاتے ہیں، وہ باطل اور جہالت کی وجہ سے ہے۔ میں نے جاہلوں کا ایک گروہ دیکھا ہے جو اس کی تہمت کی وجہ سے اہل طریقت کا انکار کرتے ہیں اور میں نے دیکھا ہے کہ انہوں نے ایک مذہب بنالیا ہے۔ مشائخ رحمہم اللہ نے ان سب باتوں کو آفت سمجھا ہے اور یہ حلولی لوگوں کا مذہب ہے۔ اللہ تعالےٰ ان پر لعنت کرے، واللہ اعلم بالصواب۔

تیرھویں فصل
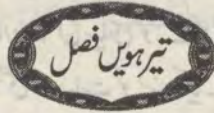
گدڑی کے بیان میں

جاننا چاہیے کہ کپڑوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا صوفیا کی عادت ہے اور بڑے بڑے مجمعوں میں جہاں بزرگ مشائخ حاضر ہوں، یہ لوگ بھی چلے جاتے ہیں۔ میں نے علما کے ایک گروہ کو دیکھا ہے کہ وہ اس کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ درست کپڑے کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا جائز نہیں اور یہ فساد کا کام ہے اور محال ہے کہ جس فساد سے درستی مراد ہو، وہ بھی درستی ہی ہو اور سب لوگ اپنے درست کپڑوں کو پھاڑلیں اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیں، پھر اس کو سئیں جیسا کہ کرُتے کی آستین، آگا پیچھا، تعویذ اور جیب ایک دوسرے سے جدا کریں اور پھر اس کو دُرست کریں۔ یہ محال ہے اور جو شخص اپنے کپڑے کو سو ٹکڑے کرکے آپس میں دوبارہ سی دے اور جو شخص پانچ ٹکڑے کر کے آپس میں سی دے، ان دونوں شخصوں میں کچھ فرق نہیں، باوجودیکہ ہر ٹکڑے میں جو وہ بناتے ہیں اور پھر آپس میں سی دیتے ہیں، اس سے ایک مومن کے دل کی راحت اور اس کی حاجت کا پورا کرنا ہوتا ہے کہ وہ گدڑی سیتا ہے اگرچہ کپڑوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے طریقت میں کوئی بنیاد نہیں تاہم سماع کے وقت صحت کی حالت میں نہیں کرنا چاہیے کیونکہ وہ فضول خرچی کے سوا اور کچھ نہیں ہے، لیکن اگر سننے والے کو غلبہ پیدا ہو جائے، اس سے خطاب اُٹھ جائے اور وہ بے خبر ہو جائے تو پھر وہ معذور ہوتا ہے۔ جب کسی شخص پر ایسی حالت طاری ہو جائے اور اگر کوئی جماعت اس کی موافقت میں کپڑے پھاڑے تو جائز ہے۔

اہل طریقت کی تمام گدڑیاں دو قسم کی ہوتی ہیں: ایک وہ جس کی حالت سماع میں غلبے کی وجہ سے درویش خود پھاڑے، دوسری وہ کہ ایک جماعت اور اصحاب ایک اور مقتدا کے حکم سے اس کے کپڑے کو پھاڑیں۔ ایک ان میں سے کسی جرم سے استغفار کی حالت میں ہو، دوسرا وجد میں بے خودی کی حالت میں ہو۔ ان سب خرقوں سے مشکل سماعی

خرقہ ہے اور وہ دو قسم کا ہوتا ہے: ایک پھٹا ہوا اور دوسرا دُرست۔ پھٹے ہوئے کپڑے کی شرط دو چیزیں ہیں یا تو یہ کہ جماعت کے لوگ اسے سئیں اور گدڑی والے کو پھر دے دیں یا کسی اور درویش کو دے دیں اور دوسرے ایثار کریں، یا تبرک کو ٹکڑے ٹکڑے کریں اور آپس میں تقسیم کرلیں لیکن جب گدڑی درست ہو تو ہم دیکھیں گے کہ اس سماع کرنے والے درویش کی مراد جس نے وہ کپڑا پھینکا ہے، کیا ہے؟ اگر اس کی مراد قوال کو دینا ہے تو اس کو ملے اور اگر مراد جماعت کو دینا ہے تو ان کو ملے۔ اگر بغیر کسی مراد کے گر پڑی ہے تو پیر کے حکم پر موقوف ہے کہ وہ کیا حکم دیتا ہے، جماعت کو دی جائے تا کہ وہ ٹکڑے کرلیں یا ان میں سے کسی ایک کو عطا کرنی چاہیے یا قوال کو دینی چاہیے۔ پس اگر قوال کو دینا مقصود ہے تو درویش کی مراد کے ساتھ اصحاب کی موافقت شرط نہیں ہے کیونکہ وہ کپڑا اس کے اہل کی طرف نہیں جارہا ہے اور اس درویش نے یا تو اپنے اختیار سے دی ہے یا مجبوری سے اور دوسروں کو اس میں کچھ موافقت ضروری نہیں ہے، لیکن اگر جماعت کو دینے کی غرض سے وہ خرقہ جدا ہوا ہے تو ان کی مراد سے موافقت شرط ہے اور جب کپڑا پھینکنے میں انہوں نے موافقت کی تو پیر کو نہ چاہیے کہ درویشوں کا کپڑا قوال کو دے دے، لیکن یہ روا ہے کہ کوئی دوست ان میں سے کوئی چیز اس قوال پر فدا کر دے اور درویشوں کو کپڑے واپس دے دے یا سب کپڑوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقسیم کرلے اور اگر کپڑا غلبے کی حالت میں پھینکا ہے تو اس میں مشائخ رحمہم اللہ کا اختلاف ہے اور اکثر کہتے ہیں کہ پیغمبر ﷺ کی حدیث کے مطابق قوال کو چاہیے جیسا کہ فرمایا ہے: مَنْ قَتَلَ قَتِيْلاً فَلَهٗ سَلَبُهٗ۔ (ترجمہ: جس مسلمان سپاہی نے جنگ میں ایک کافر سپاہی کو قتل کیا، اس مقتول کا سامان قاتل سپاہی کو ملے گا) اور اگر قوال کو نہ دیں تو وہ طریقت کی شرط سے باہر آجائیں گے اور ایک گروہ کہتا ہے میں نے بھی اس بات کو پسند کیا ہے کہ جس طرح قاتل کے متعلق بعض فقہا کے مذہب کے مطابق امام کے حکم کے بغیر مقتول کا کپڑا قاتل کو نہیں دیتے، ویسا ہی یہاں پر بھی پیر کے حکم کے بغیر وہ کپڑا قوال کو نہیں دیں گے لیکن اگر پیر کسی کو بھی دینا نہ چاہے تو اس پر کچھ اعتراض نہیں، واللہ اعلم بالصواب۔

چودھویں فصل
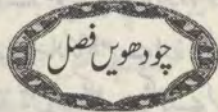
سماع کے آداب

جاننا چاہیے کہ سماع کے آداب کی شرطیں یہ ہیں کہ جب تک اس کی ضرورت نہ ہو، نہ کیا جائے اور اس کو اپنی عادت نہ بنایا جائے اور دیر دیر سے سماع کیا جائے تا کہ اس کی عظمت دل سے اُٹھ نہ جائے اور چاہیے کہ تم جب تک سماع کرو تو تمہارا پیر اس جگہ حاضر رہے اور سماع کا مکان عام لوگوں سے خالی ہو، قوال بھی شریعت کا احترام کرنے والا متدین ہو، دل دنیا کے دھندوں سے خالی اور طبیعت لہو و لعب سے متنفر ہو اور جب تک سماع کی قوت پیدا نہ ہو، ضروری نہیں کہ تم اس میں مبالغہ کرو، جب قوت زیادہ ہو جائے تو ضروری نہیں کہ اسے اپنے سے دُور کرو بلکہ قوت کے تابع رہو۔ جس بات کا وہ تقاضا کرے وہ کرو، اگر وہ ہلا دے تو ہلو اگر نہ ہلائے تو نہ ہلو، اور طبیعت کے زور اور وجد کی جلن میں تم فرق کرسکو اور سننے والے کو مشاہدے کی اتنی دانش ہو کہ فیضانِ حق کو وہ قبول کر سکے اور اس کی داد دے سکے۔ جب اس کا غلبہ دل پر پیدا ہو جائے تو تکلف سے اس کو اپنے آپ سے نہ ہٹائے۔ جب اس کا زور ٹوٹ جائے تو تکلف سے اس کو اپنی طرف جذب نہ کرے اور اس کی مراد کو اس نیت سے وزن نہ کرے کہ اس میں آزمانے والے کو بہت پراگندگی اور بے برکتی ہو۔ اگر قوال اچھا پڑھتا ہے تو اس سے یوں نہ کہے کہ تو اچھا پڑھتا ہے اور

اگر اچھا نہ پڑھتا ہو تو برا نہ کہے اور نہ اس کے شعر کو ناموزوں کہے۔ ایسی بات طبیعت کو پراگندہ کر دیتی ہے اور یہ نہ کہے کہ اچھی طرح پڑھو اور دل میں اس سے جھگڑا نہ کرے اور اس کو درمیان میں نہ دیکھے اور اسے خدا کے حوالے کرے اور اچھی طرح سے سنے اور اگر ایک جماعت پر سماع طاری ہو گیا ہو اور اس کو اس سے کچھ حصہ نہ ملا ہو تو ضروری نہیں کہ اپنی ہوشیاری کی وجہ سے ان کی بے خودی میں غور کرے اور چاہیے کہ اپنے وقت سے آرام پائے تاکہ اس کو اس سے حصہ ملے اور وقت کے سلطان کی تقویت کرے تاکہ اس کی برکتیں اسے پہنچیں۔

میں علی بن عثمان جلابی (رحمۃ اللہ علیہ) اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ مبتدیوں کو سماع نہ سننے دیں تاکہ طبیعت پریشان نہ ہو جائے کیونکہ اس میں بہت بڑے خطرے اور خرابیاں ہیں اس لیے کہ عورتیں چھتوں کے اوپر سے اور مکانوں سے ان کو سماع کی حالت میں دیکھتی ہیں اور اس بات سے سماع سننے والوں پر سخت پردے پڑ جاتے ہیں۔ چاہیے کہ جوانوں میں سے بھی کسی کو وہاں نہ بٹھائیں اس لیے کہ جاہل صوفیوں نے ان تمام باتوں کو مذہب بنالیا ہے اور سچائی کو درمیان سے اُٹھا دیا ہے اور میں ان باتوں سے جو اس قسم کی خرابیوں سے مجھ پر گذری ہیں، استغفار کرتا اور اللہ تعالیٰ سے استعانت طلب کرتا ہوں کہ میرے ظاہر اور باطن کو خرابیوں سے محفوظ رکھے اور تمہیں اور اس کتاب کے پڑھنے والوں کو اس کتاب کے حقوق کی رعایت کرنے کی وصیت کرتا ہوں اور توفیق اللہ کے قبضے میں ہے۔

آخِرُ کَلَامِنَا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی
رَسُوْلِهٖ وَاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا

تمت

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِمَنْ تَرْجَمَهٗ اِحْتِسَابًا۔ وَ لِمَنْ کَتَبَهٗ وَ صَحَّحَهٗ و قَرَءَهٗ غُفْرَانًا وَ لِمَنْ اِهْتَمَّ لِطَبْعِهٖ وَ نَشْرِهٖ لِلْحَقِّ تِبْیَانًا بِحُرْمَةِ مَنْ قَدَرْتَ لَهُمْ مِنْ لَّدُنْكَ رِضْوَانًا۔ اٰمِیْنَ فَاِنَّكَ سَمِیْعُ الدُّعَآءِ

تلخیصِ کشف المحجوب

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

حمد و دُرود

حمد در حقیقت اس پروردگار کے لیے زیبا ہے جس نے اپنی کبریائی کی تجلیات سے نوع انسانی کے مردہ دلوں کو زندہ کیا۔ پروردگار! اپنے حبیب حضرت محمد ﷺ پر، ان کی آل و اصحاب اور ان کے متبعین پر اپنی کامل رحمت نازل فرما۔

فصل اوّل

تسمیہ: میں نے حق تعالےٰ سے استخارہ کیا۔ جب اشارہ پایا تو آپ کے سوالوں کے جواب میں ایک مستقل کتاب لکھنے کا تہیہ کیا اور پھر مطالب و معانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کا نام "کشف المحجوب" رکھا۔

فصل دوم

مصنف کا نام: میں نے کتاب کے شروع میں اور اس کے اندر جا بجا اپنا نام اس لیے ثبت کیا تاکہ میرا مقصد بھی پورا ہو اور لوگوں کی نیک دُعاؤں سے متمتع بھی ہوتا رہوں۔

فصل سوم

استخارہ: ایک سچے مومن کی یہ واحد نشانی ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں کو قضائے الٰہی اور مشیت ایزدی کے سپرد کر دے اور قدم بہ قدم اس سے اعانت چاہے، تاکہ اس کا کام تکلیف اور پریشانی کے بغیر انجام پائے۔ دنیوی اور اُخروی فلاح و بہبود کے لیے فقط انسان کا کسب و تدبیر ہی کافی نہیں، بلکہ اس کا مدار توفیق الٰہی پر ہے۔

فصل چہارم

اخلاص: حق تعالےٰ کی خوشنودی کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ انسان کسی کام میں نفس کی خواہش کو کوئی دخل نہ دینے دے، بلکہ محض حق تعالےٰ کی رضا کی خاطر، کامل خلوص سے ہر کام انجام دے۔

فصل پنجم

نیت کی اہمیت: کسی بھی عمل کرنے میں جب انسان کا ارادہ صحیح نیت پر مبنی ہو تو خواہ اس عمل میں خلل واقع ہو جائے یا وہ پایۂ تکمیل تک کسی وجہ سے نہ پہنچ سکے مگر حق تعالےٰ کے حضور وہ انسان ضرور اجر کا مستحق ہوتا ہے، گویا ایک مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔

پہلا باب

علم کے بیان میں

ہر مسلمان کے لیے اس قدر علم حاصل کرنا ضروری ہے جس سے اس کا عمل درست ہو سکے، کیونکہ علم دل کو جہالت کی موت سے زندگی دیتا ہے اور آنکھوں کو کفر و شرک کی تاریکیوں سے روشنی عطا کرتا ہے۔

علم و عمل: علم و عمل لازم و ملزوم ہیں، اس لیے کہ اسلام نے جہاں عمل کے بغیر علم کی شدید مذمت کی ہے، وہاں علم کے بغیر عمل کرنے والے کو بھی گدھے کی مانند قرار دیا ہے۔ دراصل عمل وہ ہے جس کی بنیاد علم پر ہو۔

پہلی فصل

اقسامِ علم: علم کی دو قسمیں ہیں: خالق کا علم اور مخلوق کا علم۔ خالق کا علم قدیم، قائم اور غیر محدود ہے اور ہر شے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کے برعکس مخلوق کا علم حادث، فانی اور محدود ہے۔ خالق حقیقی کے وسیع علم کے پیشِ نظر اس کے جملہ احکام کے آگے سرِتسلیم خم کر دینا ہی کمال بندگی ہے۔

دوسری فصل

معرفتِ حق: دراصل انسان کا صحیح علم حق تعالیٰ کے احکام اور اس کی ذات و صفات کی معرفت ہے۔ احکام الٰہی کے علم کو علم شریعت اور اس کی ذات و صفات کے علم کو علم حقیقت کہتے ہیں۔ شریعت کے اصول اقرار، توحید اور رسالت ہیں۔ فروع حقوق اللہ اور حقوق العباد اور علم حقیقت کے اصول ذات و صفات کی معرفت ہے اور فروع خلوص، احسان اور تطہیر قلب۔ یہ دونوں علوم آپس میں لازم و ملزوم ہیں، چنانچہ علم ظاہر، باطن کے بغیر جہالت اور نفاق ہے اور علم باطن، ظاہر کے بغیر شیطانی وسوسوں میں پڑ کر جادۂ حق سے بھٹک جانا ہے۔

تیسری فصل

ملحد: جن کا کوئی دین نہ ہو، انہیں ملاحدہ کہتے ہیں۔ ان کے دو گروہ ہیں: ایک تو نفس علم ہی سے انکار کرتے ہیں اور دوسرا علم کا تو قائل ہے، لیکن ان کی نظر میں کسی بھی چیز کے بارے میں علم درست نہیں ہوتا۔ یہ دونوں صریح گمراہی میں مبتلا ہیں، اس لیے کہ نفی علم جہل ہے اور جہل ہر طبقے کے نزدیک مذموم ہے۔

چوتھی فصل

معرفت و شریعت: صوفیا کے نزدیک علوم تین ہیں: علم باللہ، علم مع اللہ اور علم من اللہ۔

علم باللہ سے مراد علم طریقت، علم مع اللہ سے مراد مقاماتِ طریقت اور اولیا کے درجات کا علم اور علم من اللہ سے مراد علم شریعت ہے۔

(تنبیہ)

تین قسم کے علماء سے دُور رہو:

۱۔ غافل علمائے سے جنہوں نے دنیا کو اپنے دل کا قبلہ، شریعت کو اپنے گھر کی لونڈی اور ظالم امراء کی بارگاہ کو محض جاہ و ثروت کی خاطر اپنی سجدہ گاہ بنالیا ہے۔

۲۔ ریاکار فقرائے سے جو فقط اغراضِ نفسانی کے لیے لوگوں سے جاہ و عزت کی طمع رکھتے اور بے بنیاد باتوں کی تعلیم دیتے ہیں۔

۳۔ جاہل متصوف سے جس نے نہ تو کسی مرشد کی صحبت میں تربیت پائی ہو اور نہ کسی اُستاد سے ادب سیکھا اور یوں ہی

نیلگوں لباس پہن کر اپنے آپ کو صوفی مشہور کر دیا ہو۔

دوسرا باب

فقر کے بیان میں: حق تعالےٰ کے نزدیک درویش کا درجہ بہت بلند ہے کیونکہ درویش دنیا کے ظاہری اسباب سے بے نیاز ہو کر قطعی طور پر حق تعالےٰ پر بھروسا رکھتا ہے، نہ تو وہ دُنیوی مال و متاع سے کبھی خوش ہوتا ہے اور نہ اس کے جانے سے غمگین۔ دراصل وہ تو نو بہ نو الطافِ ربانی کی بدولت غنی ہی ہوتا ہے۔

پہلی فصل

فقر و غناء: یوں تو فقر و غنا دونوں پسندیدہ ہیں لیکن اُمت کا اتفاق ہے کہ اہل صدق، اہل صدقہ سے بدرجہا بہتر ہیں۔

دوسری فصل

فقیر: فقیر وہ ہے جس کا نفس ہوس اور طولِ امل سے اور دل دُنیا کی جُملہ مشکلات سے محفوظ ہو۔ جب نہ ہو تو چپ رہے اور جب ہو تو خرچ کرے۔

تیسرا باب

تصوف اور صوفی کے بیان میں: تصوف یا تو صفا سے ماخوذ ہے جس کی ضد "کدورت" ہے یا پھر اصحابِ صفہ سے اور صوفی وہ ہے جس نے اپنے اخلاق و معاملات کو مہذب اور اپنے نفس کو آفتوں اور بلاؤں سے پاک صاف کر رکھا ہو۔

صوفی کی اقسام: صوفی کی تین قسمیں ہیں: صوفی، متصوف، مستصوف۔

صوفی وہ ہے جو اپنی ذات سے فانی اور حق تعالےٰ سے باقی ہو، متصوف وہ ہے جو اپنے آپ کو صوفیا کرام کی عادات و احکام کا پابند بنائے اور مستصوف وہ ہے جس نے فقط دنیوی جاہ و عزت کے لیے درویشی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو۔ صوفی صاحبِ وصول، متصوف صاحبِ اصول اور مستصوف صاحبِ فضول ہے۔

پہلی فصل

تصوف کے معنی:

(۱) تصوف نفسانی لذتوں کو چھوڑ دینے کا نام ہے۔

(۲) تصوف حق تعالےٰ کی صفت ہے جس سے بندہ بقا پاتا ہے۔

(۳) تصوف نیک خصلت کا نام ہے۔ جو شخص جس قدر بھی اچھے اخلاق رکھتا ہے، وہ سب سے بہتر صوفی ہے۔

دوسری فصل

معاملاتِ تصوف: صوفی وہ ہے جس کا دل بشری کدورتوں اور مادی آلائشوں سے پاک ہو۔ جب کلام کرے تو حقائق و معارف کے موتی اس کے منہ سے جھڑیں اور جب خاموش رہے تو اس کی خاموشی سے سچی درویشی ظاہر ہو۔

تیسری فصل

آداب: تصوف چند رسوم و علوم کا نام نہیں بلکہ حسنِ ادب اور اخلاق کا دوسرا نام ہے، جو درحقیقت حق تعالےٰ سے معاملات دُرست رکھنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ پس مرید کے لیے لازم ہے کہ ہر حالت میں مؤدب رہے۔ حق تعالےٰ کی بے ریا عبادت، اپنے سے بزرگوں کی عزت اور چھوٹوں پر شفقت کرے اور شیطانی وسوسوں اور نفسانی خواہشات سے دُور رہنا اپنا شیوہ بنالے۔

چوتھا باب

گدڑی پہننا صوفیا کرام کا شعار ہے۔ خود حضور اکرم ﷺ اور ان کے جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پیوندوں والی گدڑی پہنا کرتے تھے۔ گدڑی پہننے سے ایمان میں تازگی اور حلاوت پیدا ہوتی ہے، بشرطیکہ سنت رسول ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے پہنی جائے لیکن موجودہ زمانے میں کچھ درویش ایسے بھی ہیں جو محض نمائش کے لیے گدڑی پہنتے ہیں، جو بڑی شنیع حرکت ہے۔

پہلی فصل

گدڑی کی شرطیں: گدڑی پہننا اس شخص کے لیے جائز ہے جس کا دل دُنیوی آلائشوں سے پاک اور باطن نورِ معرفت سے آباد ہو، شریعت کا پابند اور اولیائے سلف کے بتائے ہوئے طریقوں پر کامل ہو، بلند سیرت و کردار کا مالک ہو اور گدڑی محض عجز و انکسار کی خاطر پہنتا ہو۔

دوسری فصل

گدڑی ترک کرنے کے اسباب: چونکہ بعض ریاکار اور دنیا پرست صوفیوں نے پشمینہ پہننا شروع کر دیا اور اس کے پردے میں ناشائستہ اور خلافِ شرع حرکات کرنے لگے، اس لیے حقیقی صوفیا نے گدڑی پہننے کی عادت ترک کر دی اور دُنیا سے کنارہ کش ہوگئے۔ دراصل گدڑی بظاہر انسان کی طبیعت میں کبر و نخوت کا مادّہ محو کر دیتی ہے، ورنہ انسان کے لیے سب سے بہتر لباس تقویٰ اور راست بازی ہے۔

پانچواں باب

فقر و صفوت: فقر، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، فنائے کل کا نام ہے اور صفوت، کمالاتِ انسانی میں سے ایک کمال ہے یا فقر کے مقامات میں سے ایک مقام کا نام ہے، لیکن درحقیقت یہ دونوں لفظ یکساں ہیں اس لیے کہ فقر عین فنا ہے اور صفاء صفوت عین بقا۔ جس نے فنا کا درجہ پایا، اسے لامحالہ بقا نصیب ہوئی۔

چھٹا باب

ملامت: ملامت کا طریقہ مشائخ طریقت کے نزدیک بہت پسندیدہ طریقہ ہے۔ اس سے جہاں انسان عجب، غرور اور خود بینی میں پڑنے سے بچ جاتا ہے، وہاں اس کے عشق و محبت میں استحکام بھی پیدا ہوتا ہے۔ یہ حق تعالیٰ کا دستور بھی ہے کہ وہ اپنے مخلص دوستوں کو لوگوں کی نگاہ میں ناپسندیدہ اور مطعون بنا دیتا ہے۔ انبیائے علیہم السلام کی زندگی اس کی شاہد ہے۔

پہلی فصل

اقسامِ ملامت: ملامت کی تین قسمیں ہیں (۱) راست روی، یعنی ایک شخص دین اور دنیا کے تمام امور کو کما حقہ، انجام دیتا ہے۔ باہمی معاملات کی بھی حفاظت کرتا ہے۔ بایں ہمہ مخلوق اسے ملامت کرتی ہے مگر وہ ان کی ملامت کی کوئی پروانہ کرتے ہوئے کامل عزم و خلوص سے اپنا کام کیے جاتا ہے۔ (۲) ملامت کا ارادہ، یعنی ایک شخص کو لوگوں میں عزت حاصل ہے اور سب اس کے فرماں بردار ہیں لیکن وہ اس کو عشق سرمدی کی راہ میں حجاب سمجھ کر ایک ایسی حرکت کا ارتکاب کرے جو خلافِ شرع تو نہ ہو مگر عوام اسے پسند نہ کریں چنانچہ عوام اس سے متنفر ہو کر ملامت کرنی شروع کر دیں۔ (۳) ترک کرنا، یعنی کسی کو فسق و فجور مرغوب ہو جائے اور ان کی طرف مائل ہو کر شریعت کے تقاضے چھوڑ دے، لیکن زبان سے یہ کہے کہ یہ تو ملامت کا طریقہ ہے۔

دوسری فصل

ملامتیہ: فرقۂ ملامتیہ کے بانی شیخ ابو حمدون قصار ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ملامت اختیار کرنے کا مطلب سلامتی کو ترک کرنا ہے، اپنے آپ کو بلاؤں اور مصائب میں ڈالنا ہے اور دُنیا سے اپنا رشتہ توڑ لینا ہے۔ جس نے بھی دُنیا سے اپنا رشتہ توڑ لیا، وہ واصل بحق ہوا۔ حضرت خواجہ ہجویری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ملامت کے طریقے میں بہت سے رُوحانی اور باطنی فائدے ہیں۔ اس سے میری بھی ایک رُوحانی مشکل حل ہوئی ہے جس کی وجہ سے میں ایک عرصے سے مضطرب تھا۔

ساتواں باب

تصوف کے امام (خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم)

دراصل صوفیا کرام کے امام و مقتدا خلفائے اربعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں۔ سب سے پہلے اہل تجرید کے امام اور اہل تفرید کے مقتدا حضرت سیدنا حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، جو تمام انسانی آفات سے محفوظ تھے، کاملِ جودو سخا اور صدق و وفا کا پیکر تھے۔ آپ سے بے شمار کرامتیں ظہور میں آئی ہیں۔ مشائخ نے آپ کو کشف و مشاہدہ میں سب سے مقدوم رکھا ہے۔ دوسرے فراست و اصابت کے شہنشاہ حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، جو اربابِ مجاہدہ کے سرتاج اور اُمت کے سب سے بڑے ملہم اور محدث تھے اور حق کے بے باک ترجمان۔ آپ کی بھی لاتعداد کرامتیں ہیں۔ تیسرے دُرِّ حیا حضرت سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو تسلیم و رضا اور خلت و صفا کی سچی علامت تھے۔ آپ کے بے شمار مناقب و فضائل اور کرامتیں مشہور ہیں۔ چوتھے فخر موجوداتﷺ کے برادرِ محترم، اولیاء و اصفیا کے پیشوا حضرت سیدنا ابوالحسن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، جو طریقت میں بہت بلند رُتبہ رکھتے ہیں اور حقیقت و معرفت کے تمام اُصولوں کا سرچشمہ ہیں۔ آپ کی ذاتِ اقدس سے بے حساب کرامتیں ظہور پذیر ہوئی ہیں۔

آٹھواں باب

ائمۂ اہل بیتؑ: یوں تو حضورﷺ کے اہلِ بیتِ اطہار میں سے جو ازلی طہارت و تقدس سے مخصوص ہیں، ہر ایک کو معرفت کے حقائق میں حظِّ وافر حاصل تھا اور سب کے سب صوفیا کے برگزیدہ طائفہ کے مقتدا ہیں۔ تاہم ان میں سے حضرت امام حسن، امام حسین، امام زین العابدین، امام باقر اور امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہم خاص طور پر علوم ظاہری و باطنی

میں دست گاہ رکھتے تھے اور بہت سی کرامتیں ان سے عالم وجود میں آئی ہیں۔

نواں باب

اہل صفہؓ: تمام اُمت کا اتفاق ہے کہ اصحابِ صفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم، جن کی بود و باش مسجد نبویؐ میں تھی اور دنیا سے قطع تعلق کر کے ہمیشہ ذکرِ الٰہی میں مصروف رہا کرتے تھے، فقر و مجاہدہ کے باوصف خوش و خرم اور کامل مطمئن تھے۔ حضور اکرم ﷺ کے پسندیدہ اصحاب تھے۔ حق تعالیٰ کے نزدیک یہ اتنے محترم اور باعظمت تھے کہ حضور اکرم ﷺ کو ان کی صحبت اختیار کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔ یہ سب اصحابِ صوفیا کے امام اور پیشوا ہیں، خصوصاً مسجد نبویؐ کے مؤذن حضرت بلال، محرم احوال نبی حضرت سلمان فارسی، ابو عبیدہ بن جراح، عمار بن یاسر، عبداللہ بن مسعود، مقداد بن الاسود، حباب بن حارث، صہیب بن سان رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ ان بزرگوں کے بہت سے فضائل و مناقب ہیں اور مشائخ میں ان کی عجیب و غریب کرامتیں مشہور ہیں۔ حضور اکرم ﷺ ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان کو اور ان کی متابعت کرنے والوں کو جنت میں اپنے رُفقا فرمایا ہے۔

دسواں باب

ائمہ تابعین

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بعد تابعین میں بھی بعض بزرگ ایسے تھے جو عالم باطن کے اسرار و معارف کے محرم اور مشائخ کے جلیل القدر مقتداء تھے۔ ان میں سے:

(۱) حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، جنھوں نے گو حضور اکرم ﷺ کا عہدِ سعید تو پایا تھا لیکن غلبۂ حال اور ناتواں والدہ کی خدمت کی وجہ سے دربارِ رسالتؐ میں حاضر نہ ہو سکے۔ آپ حقیقت و معرفت میں بڑی دست گاہ رکھتے تھے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ قیامت کے دن ربیعہ اور مضر کے قبیلوں کی بھیڑوں کے بالوں کے برابر میرے اُمتی صرف اویسؓ کی شفاعت سے بخشے جائیں گے۔

(۲) ہرم بن حیانؒ ہیں۔ آپ صحابہ کرامؓ کی صحبت کے تربیت یافتہ اور طریقت کے بہت بڑے بزرگ ہیں۔

(۳) خواجہ حسن بصریؒ ہیں۔ آپ اپنے وقت کے امام اور طریقت کے بزرگ ترین مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔

(۴) سعید بن المسیبؒ ہیں۔ آپ باطنی علوم کے ساتھ ساتھ ظاہری علوم کے بھی بہت بڑے عالم اور فقیہہ تھے، خصوصاً فقہ، حدیث اور تفسیر میں تو اپنی مثال آپ تھے۔ یہ سب بزرگ اہلِ طریقت کے امام گزرے ہیں۔ ان کے بہت سے اقوال اور عجیب و غریب کرامات ہیں۔

گیارھواں باب

ائمہ تبع تابعین

تبع تابعین میں بھی چند ایسے بزرگ ہیں جنھوں نے اَحیائے دین اور تجدیدِ سنت نبوی ﷺ میں نمایاں خدمات

انجام دی ہیں۔ ان میں سے:

ا۔ حبیب العجمیؒ ہیں جو شریعت و طریقت میں مردِ کامل تھے۔ ابتدائے عمر میں گوناگوں گناہوں میں مبتلا رہے لیکن خواجہ حسن بصریؒ کے ہاتھ پر توبہ کی اور مقبولِ درگاہِ الٰہی بنے۔ آپ ظاہری اور باطنی علوم کے بہت بڑے فاضل تھے اور حق تعالیٰ نے بے شمار کرامتوں سے مختص فرمایا تھے۔ آپ کا ارشاد ہے: "نفاق خلافِ وفاق ہے اور رضا عین وفاق ہے۔ نفاق منافقین کی علامت ہے اور رضا مخلصین کی۔"

۲۔ ان میں سے مالک بن دینارؒ ہیں۔ ابتدا میں تو سخت لہو و لعب میں مشغول تھے، بالآخر خواجہ حسنؒ کے دستِ مبارک پر توبہ کی اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اہلِ طریقت کے نزدیک آپ کی بہت سے کرامتیں مشہور ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: "اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین عمل وہ ہے جو اخلاص سے کیا جائے کیونکہ اخلاص عمل کے لیے ایسا ہے جیسے جسم کے لیے روح، اگر روح ہے تو جسم زندہ ہے ورنہ مردہ۔"

۳۔ اولیاء کے مقتدا حبیب بن اسلم راعی ہیں۔ آپ سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صحبت یافتہ تھے اور دریائے فرات کے کنارے بود و باش رکھتے تھے۔ مشائخ میں آپ کا بہت بلند رُتبہ ہے۔ لاتعداد کرامتیں آپ سے ظہور میں آئی ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: "اپنے دل کو حرص کا محل اور شکم کو حرام کا گھر نہ بنا۔"

۴۔ ابو حازم مدنیؒ ہیں۔ طریقت کے معاملات میں آپ کا بہت بلند درجہ تھا اور آدابِ فقر و مجاہدہ میں ایک مکمل ضابطے کے حامل تھے۔ مشائخ میں آپکا کلام نہایت پسندیدہ خیال کیا جاتا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے: "حق تعالیٰ کی رضا اور مخلوق سے بے نیازی میری دولت ہے اور جو بندہ حق تعالیٰ سے راضی ہو جاتا ہے، وہ مخلوق سے مستغنی ہی ہوتا ہے۔"

۵۔ محمد بن واسعؒ ہیں۔ اربابِ کشف و مجاہدہ میں آپ کا کوئی مثیل نہ تھا۔ کئی ایک تابعین کی صحبت سے استفادہ کیا۔ علوم طریقت میں حظِ وافر کے مالک تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ "میں نے دنیا میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں دیکھی جس میں میں نے حق کا مشاہدہ نہ کیا ہو۔" اور یہ حقیقت ہے کہ بندہ جب عشقِ الٰہی میں محو ہو کر کسی فعل کو دیکھتا ہے تو اسے فعل نہیں بلکہ فاعل حقیقی ہی دکھائی دیتا ہے۔

۶۔ ابو حنیفہ نعمانؒ بن ثابت ہیں جو اماموں کے امام، مجاہدات و عبادات میں کامل، ظاہری اور باطنی علوم و فنون کے متجر عالم، مجتہد اور صاحبِ مذہب ہیں۔ ابتدا میں آپ نے گوشہ نشینی اختیار کی تھی لیکن ایک دفعہ آپ نے حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ "حق تعالیٰ نے تمہیں میری سنت کو زندہ کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔" چنانچہ آپ نے اسی روز سے گوشہ نشینی ترک کر کے علوم اسلامی کا درس دینا شروع کیا۔

آپ کے بہت سے فضائل و مناقب ہیں۔ یحیٰ ابن معاذ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا تو عرض کیا: "یارسول ﷺ! آپ کو کہاں تلاش کروں؟" آپؐ نے فرمایا: "ابو حنیفہ کے علم میں۔" آپ بہت سے علمی اور اجتہادی فوائد اور کرامات سے مخصوص ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

"علم عمل کے بغیر ایسا ہے جیسے جسم روح کے بغیر، جس نے عمل نہ کیا تو گویا اس کے پاس علم ہی نہیں۔"

۷۔ عبداللہ بن مبارکؒ ہیں۔ آپ شریعت و طریقت میں اپنے وقت کے امام تھے۔ ابتدائے عمر میں آپ لہو و لعب میں مشغول تھے، لیکن آخر توبہ کی اور کثرت ریاضت و مجاہدہ سے بہت بلند درجہ حاصل کیا۔ آپ نے فرمایا: "حق تعالیٰ کے دوستوں کا دل کبھی بھی ساکن نہیں ہوتا کیونکہ دل کو دو چیزوں سے تسکین ہوتی ہے، حصولِ

مقصود سے یا حصولِ مقصود سے غفلت برتنے سے اور دنیا و عقبیٰ میں یہ دونوں جائز نہیں۔"

۸۔ ابو علی فضیل بن عیاضؒ ہیں۔ آپ معاملات و حقائق میں فردِ کامل تھے۔ شروع میں تو مشہور ڈاکو تھے اور ہر وقت قافلوں کو لوٹنے کے لیے کمین گاہ میں بیٹھے رہتے تھے لیکن بالآخر حق تعالیٰ نے توبہ کی توفیق عنایت فرمائی اور دنیا سے بالکل بے تعلق ہو کر مکہ معظمہ کے مجاور بن گئے۔ تصوف میں اپنے وقت کے سردار اور نہایت ہی رفیع القدر تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:

"جس نے حق تعالیٰ کو اس طرح پہچان لیا جیسا کہ پہچاننے کا حق ہے، وہ پوری طاقت سے اس کی عبادت کرتا ہے۔"

۹۔ ابو الفیض ذوالنون ابن ابراہیم مصریؒ۔ آپ اہل طریقت کے بہت بڑے دانش مندوں میں سے ایک تھے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی میں طریق ملامت اختیار کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے کسی کو آپ کے معنوی حسن و جمال کا علم نہ ہو سکا۔ جب آپ کا انتقال ہوا تو لوگوں نے آپ کی پیشانی پر یہ لکھا ہوا پایا:

"یہ اللہ کے حبیب ہیں اور اللہ ہی کی محبت میں فنا ہو گئے۔"

دوسرے یہ کہ جب آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو پرندوں نے جمع ہو کر اپنے پروں سے آپ کے جنازے پر سایہ کیا۔ آپ کا ارشاد ہے: "عارف جوں جوں خدا کے قریب ہوتا ہے، اسی قدر اس کا خشوع اور تحیر بڑھتا چلا جاتا ہے۔"

۱۰۔ ابراہیم بن ادہمؒ۔ آپ اپنے وقت کے بہت بڑے امام پیشوا، بہت سے مشائخ کے صحبت یافتہ اور پروردہ تھے۔ ابتدا میں آپ بلخ کے بادشاہ تھے لیکن ایک خارقِ عادت واقعہ سے متاثر ہو کر تخت و تاج کو خیر باد کہہ دیا اور زہد و تقویٰ کا طریقہ اختیار کیا۔ آپ لاتعداد کرامتوں سے مختص ہیں۔ سید الطائفہ جنیدؒ آپ کی شان میں فرماتے ہیں کہ ابراہیم بن ادہم علوم شریعت کی کنجی ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: "مخلوق کو چھوڑ کر حق تعالیٰ کو دوست بنا۔"

۱۱۔ بشر حافیؒ ہیں۔ آپ فضیل کی صحبت کے پروردہ اور مجاہدہ و عبادت میں بہت اُونچا مقام رکھتے تھے اور اصول و فروع کے بڑے متبحر فاضل تھے۔ ایک دن آپ منیٰ کے بازار میں چلے جا رہے تھے کہ راستے میں کاغذ کا ایک پرزہ پڑا ہوا پایا، جس پر بسم اللہ شریف لکھی ہوئی تھی۔ آپ نے ازراہِ تعظیم اُسے اٹھا لیا اور معطر کر کے کسی پاک جگہ رکھ چھوڑا۔ اسی رات آپ نے عالم خواب میں حق تعالیٰ کو دیکھا۔ آپ سے حق تعالیٰ نے فرمایا: "اے بشر! تو نے میرے نام کی عزت کی، میں تیرے نام کو دنیا و آخرت میں معزز کر دوں گا۔" چنانچہ آپ نے گناہوں سے توبہ کی اور زہد و ریاضت کا طریقہ اختیار کیا۔ آپ کا ارشاد ہے:

"اگر کوئی چاہے کہ دنیا و آخرت میں عزت حاصل کرے تو اسے تین باتوں پر عمل پیرا ہونا چاہیے:

(۱) کسی سے اپنی حاجت بیان نہ کرے،

(۲) کسی کو برائی سے یاد نہ کرے، اور

(۳) کسی کا مہمان نہ ہو۔"

۱۲۔ ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بسطامیؒ ہیں۔ آپ بزرگ ترین مشائخ کرام میں سے گنے جاتے ہیں۔ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ "ابو یزید بسطامیؒ ہم میں ایسے ہیں جیسے جبرئیل علیہ السلام فرشتوں میں ہیں۔" آپ سے حضور اکرم ﷺ کی بیشمار احادیث مروی ہیں۔ تصوف کے دس اماموں میں سے ایک آپ ہیں۔ اپنے تمام حواس کو حق تعالیٰ کی ذاتِ اقدس میں فنا کر چکے تھے۔ آپ فرماتے ہیں:

"میں نے تیس سال مجاہدہ کیا مگر میں نے علم اور اس پر عمل کرنے سے بڑھ کر اور کسی چیز کو مشکل نہ پایا۔"

۱۳۔ حارث بن اسدؒ ہیں۔ آپ اصول و فروع کے بہت بڑے عالم تھے اور اپنے وقت کے تمام اہلِ علم کے مرجع۔ آپ نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں، جن میں تصوف کے موضوع پر "الرغائب" نامی کتاب کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ آپ کا ارشاد ہے: "وہ علم جس سے حق تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو، عمل سے بدرجہا بہتر ہے بلکہ علم بذاتِ خود اعمالِ حسنہ کا خوبصورت مجموعہ ہے۔" نیز آپ کا ارشاد ہے:

"زندہ رہنا ہے تو حق کے لیے رہ، ورنہ معدوم ہو جا۔"

۱۴۔ ابو سلیمان داوٗد بن طائیؒ ہیں۔ آپ امام ابی حنیفہؒ کے شاگردِ خاص اور اہل تصوف کے سردار تھے۔ فقہ میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ آپ کے بے شمار فضائل و مناقب ہیں اور بہت سی کرامتوں سے مختص ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے کہ: "اگر تو سلامتی چاہتا ہے تو دُنیا کو چھوڑ اور اگر عزت چاہتا ہے تو عاقبت کی فکر کر۔"

۱۵۔ ابو الحسن سری ابن مفلس سقطیؒ ہیں۔ آپ حبیب راعی کی صحبت کے پروردہ اور بہت بڑے عالم تھے۔ دراصل آپ ہی پہلے بزرگ ہیں، جنھوں نے طریقت کے احوال و نکات واضح کیے۔ حضرت معروف کرخیؒ کے معتقد اور حضرت جنید بغدادیؒ کے خالو تھے۔ آپ کا ارشاد ہے: "دوزخ میں حجاب سے سخت تر کوئی عذاب نہیں اور جنت میں کشف سے کامل تر کوئی نعمت نہیں۔"

۱۶۔ ابو علی شفیق بن ابراہیم ازدیؒ ہیں۔ آپ شریعت و طریقت کے تمام علوم کے بے بدل عالم تھے۔ تصوف میں آپ کی بہت سی تصانیف ہیں۔ ابراہیم بن ادہم کے مرید اور کئی مشائخ کی صحبت کے پروردہ ہیں۔

آپ کا ارشاد ہے: "حق تعالیٰ اپنے اطاعت شعار بندوں کو مرنے کے بعد بھی زندہ رکھتا ہے، لیکن نافرمان زندہ ہونے کے باوجود مردوں سے بدتر ہیں۔"

۱۷۔ ابو سلیمان عبد الرحمٰن عطیہؒ درانی ہیں۔ آپ اپنے وقت کے بے مثال عالم، حقیقت و روحانیت میں اہلِ تصوف کے امام اور اپنی قوم کے بڑے برگزیدہ بزرگ تھے۔ رُوحانی اور باطنی کمالات آپ نے سخت ریاضت و مجاہدہ کے بعد پائے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:

"جب دنیوی توقعات و خواہشات خوفِ الٰہی پر غلبہ پالیتی ہیں تو زمانے میں ظلم گناہ اور فساد فروغ پاتا ہے۔"

۱۸۔ معروف بن فیروز کرخیؒ ہیں۔ آپ قدیم مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ شریعت و حقیقت کے علوم کے فاضل اجل تھے۔ تقویٰ اور جوانمردی میں تمام اہل طریقت کے نزدیک ایک مخصوص مقام رکھتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:

جونمرادی کی تین قسمیں ہیں:

(۱) وفا جس کی خلاف ورزی نہ کی جائے،

(۲) کسی طمع اور لالچ کے بغیر مستحقِ تعریف کی تعریف، اور

(۳) سوال کیے بغیر غریب اور مستحق کی امداد۔

۱۹۔ ابو عبد الرحمٰنؒ حاتم بن عنوان اصم ہیں۔ آپ بلخ کے بہت بڑے صاحبِ شوکت بزرگوں میں گنے جاتے تھے۔ حضرت شفیقؒ کے مرُید اور خضرویہ کے اُستاد تھے۔ طریقت کے حالات و دقائق پر آپ نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔

آپ کا ارشاد ہے: "شہوت تین قسم کی ہے:

(۱) کھانے پینے کی شہوت (۲) گفتگو میں شہوت اور (۳) دیکھنے سننے کی شہوت، لہٰذا حق تعالیٰ پر بھروسا کر کے حلال کھاؤ، زبان کو صدق وراستی کے لیے اور آنکھ کو عبرت و مشاہدہ کے لیے وقف کرو۔"

۲۰۔ امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس شافعیؒ ہیں۔ ابتدا میں آپ صوفیا کرام سے دور رہتے تھے لیکن حضرت شیبان زرائی کی زیارت کے بعد اس مقدس گروہ کے شیدائی بنے۔ آپ شریعت و طریقت کے جملہ علوم کے فاضل اور اپنے وقت کے امام تھے۔ چار مشہور صاحب مذہب ائمہ میں سے ایک آپ ہیں۔ آپ نے حضرت امام مالکؒ اور محمد بن حسن عراقیؒ سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ آپ احادیث رسول ﷺ کے ثقہ حافظ اور بہت بڑے فقیہہ و مجتہد گنے جاتے ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: "جب تو کسی عالم کو دیکھے کہ وہ محض چکنی چپڑی باتوں اور تاویلات میں مشغول ہے تو خوب سمجھ لے کہ وہ کسی طرح بھی مسلمانوں کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔"

۲۱۔ ابوعبداللہ احمد بن حنبلؒ ہیں۔ آپ اہل سنت و جماعت کے چوتھے امام ہیں۔ بہت بڑے حافظِ حدیث اور فقیہہ تھے، خصوصاً ورع اور تقویٰ میں اہلِ علم کے نزدیک ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ بہت سی کرامات اور عجیب وغریب واقعات سے آپ مخصوص ہیں۔ ایک دفعہ کسی نے آپ سے پوچھا "اخلاص کیا ہے؟" آپ نے جواب دیا: "اعمال کا تمام آفات سے رہائی پانا اخلاص ہے۔"

۲۲۔ ابوالحسن احمد بن ابی الحواریؒ ہیں۔ آپ شام کے بزرگ مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ ابوسلیمانؒ درانی کے مرید اور سفیان ابن عینیہؒ کے پروردۂ صحبت تھے۔ شریعت اور طریقت کے جملہ اُمور کے عالم تھے۔ حضور اکرم ﷺ کی کئی احادیث آپ سے مروی ہیں۔ دُنیا اور اسباب سے سخت متنفر تھے۔ آپ کا ارشاد ہے: "اپنے فقر کی عزت کو لوگوں سے چھپائے رکھ اور اگر تیرا فقر خود بخود ظاہر ہو جائے تو یہ حق تعالیٰ کی بڑی کرامت ہے۔"

۲۴۔ عسکر بن الحسین نسفیؒ ہیں۔ آپ خراسان کے بہت بڑے مشائخ میں سے گزرے ہیں۔ بڑے زاہد اور متقی تھے اور بے شمار کرامات اور حیرت انگیز واقعات آپ سے مخصوص ہیں۔ آپ نے آبادی چھوڑ کر جنگلوں میں رہائش اختیار کی تھی اور وفات بھی بصرہ کے جنگل میں پائی۔ آپ کا ارشاد ہے: "فقیر کی روزی وہ ہے جو اسے ملے۔ اس کا لباس اتنا ہے، جس سے وہ اپنا بدن ڈھانپ لے اور اس کا مسکن وہ ہے، جہاں وہ اُتر پڑے اور اس میں تکلف کرنا غفلت ہے۔"

۲۵۔ ابو زکریا یحییٰ بن معاذؒ ہیں۔ آپ بڑے عالی ہمت اور نیک سیرت بزرگ گزرے ہیں۔ خوف و رجا کے دقائق پر بہ ہمہ وجوہ حاوی تھے۔ معرفت و طریقت میں آپ کے بہت سے عمدہ نکات اور تصانیف ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: "جوانمردی یہ ہے کہ انسان خود تو انصاف کرے مگر اپنے لیے انصاف کا تقاضا نہ کرے۔"

۲۶۔ ابو صالح حمدون بن احمدؒ ہیں۔ آپ کا شمار کبارِ مشائخ میں ہوتا ہے۔ آپ جملہ علوم کے فاضل اور بے مثل عالم تھے اور اپنے وقت کے بہت بڑے فقیہہ تھے۔ مذہب میں ثوریؒ اور طریقت میں ابو ترابؒ نخشی کے پیرو تھے۔ آپ کا ارشاد ہے: "وعظ و نصیحت اس شخص پر واجب ہوتا ہے جس کی خاموشی سے دین میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو۔"

۲۷۔ ابوحفص عمروؒ بن سالم نیشاپوری ہیں۔ آپ خراسان کے بڑے مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ اربابِ وجد میں آپ کو ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ ایک دفعہ بغداد کے مشائخ نے آپ سے پوچھا: "جوانمردی کے کیا معنی ہیں؟" آپ نے فرمایا: "میرے نزدیک جوانمردی کے معنی یہ ہیں کہ عدل و انصاف کے تمام تقاضے کسی توقع کے بغیر مکمل دیانت داری سے پورے کیے جائیں۔"

۲۸۔ ابو سری منصور بن عمارؒ ہیں۔ آپ عراق اور خراسان کے بزرگ مشائخ میں بہت مقبول تھے۔ ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے علوم کے متبحر عالم تھے۔ آپ کا ارشاد ہے: "آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں: اوّل، اپنے نفس کو پہچاننے والے۔ دوم، خدا کو پہچاننے والے۔ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اس کا شغل ریاضت و مجاہدہ ہوتا ہے اور جس نے خدا کو پہچانا، اسے تسلیم و رضا کی طلب ہوتی ہے۔"

۲۹۔ ابوعبداللہ احمد بن عاصم انطاکیؒ ہیں۔ آپ قوم کے بلند پایہ سردار اور شریعت کے اُصول و فروع کے عالم تھے۔ حضرت فضیل کی صحبت کے پروردہ اور محاسبیؒ کے مرید تھے۔ تصوف میں آپ کے کلام و لطائف کا بڑا مرتبہ ہے۔ آپ کا ارشاد ہے: "دنیا کی زیبائش اسباب کی موجودگی سے ہے، لیکن فقر کی زیبائش توکل علی اللہ ہے۔"

۳۰۔ ابو محمد عبداللہ بن خفیفؒ ہیں۔ آپ بڑے زاہد اور پرہیز گار تھے۔ طریقت کے احوال میں بلند پایہ روایات آپ سے مروی ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

"جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کی زندگی اطمینان سے بسر ہو، وہ اپنے دل میں حرص کو جگہ نہ دے۔"

۳۱۔ اہلِ طریقت کے شیخ اکبر اور شریعت کے مقتدائے اعظم، اماموں کے امام ابو القاسم جنید بن محمد بغدادیؒ ہیں۔ آپ اہل وطن اور اہل ظاہر دونوں کے نزدیک یکساں طور پر مقبول تھے۔ اصول، فروع اور معاملات میں اپنے وقت کے مفتی اور بے عدیل امام تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:

"انبیائے کرام کا کلام عالم لاہوت اور عین حضور کی خبر دیتا ہے اور صدیقوں کا کلام مشاہدے کی۔"

۳۲۔ ابوالحسن احمد بن محمد نوریؒ ہیں۔ آپ بڑے فصیح و بلیغ، ریاضت و مجاہدہ کے آداب بجالانے والے اور صوفیوں کے مشہور فرقہ نوری کے بانی تھے۔ حضرت جنیدؒ کے رفیق اور سری سقطیؒ کے مرید تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:

"جو شخص عشقِ الٰہی سے کائنات کو دیکھتا ہے تو یہ مالکِ حقیقی کی طرف اس کی رہنمائی کرتی ہے۔"

۳۳۔ ابو عثمان سعید بن اسمٰعیل حیریؒ ہیں۔ اہل تصوف میں آپ کا بہت بڑا درجہ ہے اور یحییٰ ابنِ معاذؒ اور شاہ شجاع کرمانیؒ کی صحبت کے تربیت یافتہ ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: "جس شخص کو حق تعالیٰ اپنی معرفت عطا کرے، اس کے لیے مناسب نہیں کہ اپنے نفس کو معصیت سے ذلیل کرے۔"

۳۴۔ ابوعبداللہ احمد بن یحییٰ جلائیؒ ہیں۔ آپ اپنے وقت کے بلند درجہ بزرگ تھے۔ تصوف کے متعلق آپ کی نہایت عمدہ اور نفیس روایات ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: "عارف باللہ کی تمام جدوجہد رضائے الٰہی کے لیے ہوتی ہے۔"

۳۵۔ ابو محمد رویم بن احمدؒ ہیں۔ آپ اپنے زمانے میں بزرگ مشائخ میں سے تھے۔ ظاہری اور باطنی علوم کے عالم تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور تجوید میں خاصی مہارت رکھتے تھے۔ ایک روز کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ "آپ کا کیا حال ہے؟" آپ نے جواب دیا: "اس شخص کا کیا حال ہوگا جس کا مذہب خواہشاتِ نفس کی پیروی کرتا ہو، جس کی تمام محنت امورِ دنیا تک محدود ہو، جو نہ راست باز ہو نہ متقی اور نہ ہی اللہ کی معرفت رکھتا ہو۔"

۳۶۔ ابو یعقوب یوسف بن حسین رازیؒ ہیں۔ آپ اپنے وقت میں تصوف کے امام تھے۔ ذوالنون مصریؒ کے مرید اور کئی مشائخِ عظام کے پروردہ تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:

"اس شخص سے بڑھ کر کوئی ذلیل تر نہیں جو راہِ تصوف اختیار کرنے کے باوجود جاہ پرست ہو۔"

۳۷۔ ابوالحسن سمنون بن عبداللہ خواصؒ ہیں۔ آپ اپنے زمانے میں بے مثل بزرگ اور محبِّ الٰہی تھے۔ ہم عصر مشائخ

آپ کی بہت قدر کرتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:

"محب اور محبوب کے لطیف جذبات اور دلی واردات کی ترجمانی الفاظ میں نہیں کی جاسکتی۔"

۳۸۔ ابو الفوارس شاہ شجاع کرمانیؒ ہیں۔ آپ ایک شہزادے تھے۔ ابو تراب بخشی اور دوسرے اکابر مشائخ سے اکتساب فیض کیا تھا۔ تصوف کے موضوع پر آپ نے کئی کتابیں لکھیں، جن میں "مرآۃ الحکماء" زیادہ مشہور ہے۔ آپ کا ارشاد ہے: "ولی وہ ہے جو اپنی ولایت کو نہ دیکھے اور جب وہ اپنی ولایت کو دیکھے، اس کی ولایت نہ رہے گی۔"

۳۹۔ عمرؒ بن عثمان مکی ہیں۔ آپ علم حقیقت میں وقت کے امام تھے اور اس میں آپ کی کئی تصانیف ہیں۔
آپ کا ارشاد ہے: "اولیا کی قلبی اور باطنی کیفیات پر الفاظ حاوی نہیں ہو سکتے۔"

۴۰۔ ابو محمد سہل بن عبد اللہ تستریؒ ہیں۔ آپ اپنے وقت کے امام و پیشوا اور شریعت و حقیقت کا نہایت حسین مجموعہ تھے۔
آپ کا ارشاد ہے: "حقیقی فہم و فراست خلوص کے ساتھ احکام الٰہی کی پیروی ہے اور جو ایسا نہیں کرتا، وہ بے شعور ہے۔"

۴۱۔ ابو محمد عبداللہ بن فضل بلخیؒ ہیں۔ آپ عراق و خراسان کے نہایت محبوب و پسندیدہ بزرگ گزرے ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: "اس شخص پر تعجب ہے جو جنگلوں اور خطرناک بیابانوں کو طے کرتا ہوا مکہ معظمہ پہنچتا ہے، جس میں انبیا کے آثار ہیں لیکن وہ اپنے نفس کے جنگلوں اور معصیت کے دریا کو عبور کر کے اپنے دل تک رسائی حاصل نہیں کرتا، جس میں اس کے پروردگار کے آثار ہیں۔"

۴۲۔ محمد بن علی ترمذیؒ ہیں۔ آپ علوم ظاہری اور باطنی کے امام اور بہت بڑے صاحبِ کرامات بزرگ ہیں۔ مختلف علوم میں آپ کی بلند پایہ تصانیف ہیں۔ مذہب میں امام اعظمؒ کے پیرو اور احادیث میں آپ کی اسناد عالی مرتبہ سمجھی جاتی ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: "جو شخص علم شریعت نہیں جانتا، وہ اصول عبودیت سے واقف نہیں ہوتا۔"

۴۳۔ ابوبکر محمد بن عمرؒ ہیں۔ آپ بہت بڑے زاہد اور متقی بزرگ اور محمدؒ بن علی ترمذی کے پروردہ تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:

"لوگوں کے تین گروہ ہیں: (۱) علماء (۲) امراء (۳) فقراء

جب علماء گمراہ ہو جاتے ہیں تو شریعت کے اتباع میں خلل واقع ہو جاتا ہے، جب امراء گمراہ ہو جاتے ہیں تو قوم کا اقتصادی اور معاشرتی ڈھانچہ تباہ ہو جاتا ہے اور جب فقراء گمراہ ہو جاتے ہیں تو اخلاق کو ضعف پہنچتا ہے۔"

۴۴۔ ابو سعید احمد خرازؒ ہیں۔ سب سے پہلے جس شخص نے فنا و بقا کے راستے کی اِصلاح کی اور اس کے اصول مرتب کیے، وہ آپ ہی ہیں۔ تصوف میں آپ کی کئی بصیرت افروز تصانیف ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:
اس شخص پر تعجب ہے کہ حق تعالیٰ کو محسنِ حقیقی تسلیم بھی کرے، لیکن پھر بھی اس کی طرف مائل نہ ہو۔"

۴۵۔ ابو الحسنؒ علی بن محمد اصفہانی ہیں۔ معرفت میں آپ کے نہایت عمدہ نکات ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

"خدا کی درگاہ میں حضور، خدا پر یقین رکھنے سے زیادہ افضل ہے۔"

۴۶۔ ابو الحسن محمد بن اسمٰعیل خیر النساج ہیں۔ آپ اپنے وقت کے نہایت اچھے اور عمدہ واعظ تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:

"ایمان اور تقویٰ دونوں لازم و ملزوم ہیں، جہاں ایمان ہوتا ہے وہاں تقویٰ کا ہونا لازمی ہے۔"

۴۷۔ ابو حمزہؒ خراسانی ہیں۔ اکابر مشائخ میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ بہت بڑے زاہد اور متوکل علی اللہ تھے۔ آپ کا ارشاد ہے: "دراصل فقیر وہ ہے جس کو محبت نے وحشی بنادیا ہو۔"

۴۸۔ ابو العباسؒ احمد بن مسروق ہیں۔ آپ خراسان کے جلیل القدر بزرگوں میں سے ہوئے ہیں۔ ظاہری اور باطنی علوم

کے بے بدل فاضل تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:

"جو شخص اللہ کو چھوڑ کر دنیا سے لو لگائے تو اس کی خوشی درحقیقت غم ہے۔"

۴۹۔ ابو علی حسن جرجانیؒ ہیں۔ آپ اپنے وقت کے بے نظیر امام تھے۔ محمد بن علی ترمذیؒ کے مرید اور ابوبکرؒ وراق کے ہم عصر تھے۔ آپ کا ارشاد ہے: "تمام مخلوق کی قرار گاہ میدانِ غفلت ہے۔"

۵۰۔ ابو محمد بن حسین حریریؒ ہیں۔ آپ تمام علوم پر حاوی تھے، خصوصاً فقہ اور تصوف میں بہت اونچا درجہ رکھتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے: "دین اور بدن کی اصلاح تین چیزوں پر منحصر ہے۔ اکتفا، اتقا اور رزقِ حلال۔"

۵۱۔ ابو العباس احمد بن محمد بن سہل آملیؒ ہیں۔ آپ علم ظاہری اور باطنی کے بہت بڑے فاضل تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:
"ان چیزوں سے راحت پانا جن سے طبیعت کو اُلفت ہوتی ہے، مومن کو حقیقت کے درجے سے گرا دیتی ہیں۔"

۵۲۔ ابو المغیث الحسین بن منصور حلاجؒ ہیں۔ آپ اہل حال اور مستوں میں سے ہوئے ہیں، گو مشائخ ان کی ولایت میں اختلاف رکھتے ہیں لیکن ان میں ولایت کی بعض نشانیوں کے پیشِ نظر ہم انہیں بزرگ ہی سمجھتے ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: "زبان بولتی ہے لیکن اس کے بولے ہوئے الفاظ سے صحیح مطلب اخذ کرنے میں بہتوں کو دھوکا لگ جاتا ہے۔"

۵۳۔ ابو اسحاق ابراہیم بن احمدؒ ہیں۔ آپ توکل میں بہت بڑی شان رکھتے تھے۔ تصوف میں آپ نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: "تمام علم دو کلموں میں جمع کیا گیا ہے، ایک یہ کہ حق تعالیٰ نے جس چیز کی آرزو تیرے دل سے نکال دی ہے اس کے لیے تکلف نہ کر۔ دوسرے یہ کہ اللہ نے جس چیز کا کرنا تجھ پر فرض کیا ہے، اُسے ضائع نہ کر۔"

۵۴۔ ابو حمزہ بغدادیؒ ہیں۔ آپ اپنے وقت کے ایک مشہور واعظ اور محدث تھے۔ آپ کا ارشاد ہے: "حقوق دو قسم کے ہیں: ایک تیرے نفس کا، ایک مخلوق کا۔ جب تو اپنے نفس کو برے کاموں سے ہٹالے گا تو اس کا حق تو نے ادا کیا اور جب تو مخلوق کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائے گا تو اس کا حق بھی تو نے ادا کیا۔"

۵۵۔ ابوبکر محمد بن موسیٰ واسطیؒ ہیں۔ حقیقت میں آپ بہت اُونچا درجہ رکھتے تھے اور مشائخ میں بہت مقبول تھے۔ آپ کا ارشاد ہے: "جو شخص بکثرت حق تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے اس کے باطنی واردات عوام سے مخفی ہوتے ہیں۔"

۵۶۔ ابوبکر بن دُلف بن حجدر شبلیؒ ہیں۔ طریقت میں آپ کی زندگی مہذب اور نہایت پاکیزہ تھی۔ آپ کا ارشاد ہے:
"ظاہری آنکھ ممنوع چیزوں کے دیکھنے سے باز رکھی جائے اور باطنی آنکھ غیر اللہ کے دیکھنے سے۔"

۵۷۔ ابو محمد بن جعفر خالدیؒ ہیں۔ آپ کو تصوف کے اسرار و نکات پر کامل عبور حاصل تھا۔ آپ کا ارشاد ہے:
"توکل کے صحیح معنی یہ ہیں کہ انسان کا دل مادی اسباب کے ہونے نہ ہونے میں کوئی فرق محسوس نہ کرے۔"

۵۸۔ ابو علی محمد بن قاسم رودباریؒ ہیں۔ آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور تصوف میں بہت بلند درجے کے مالک تھے۔ آپ کا ارشاد ہے: "تسلیم و رضا درویش کا پہلا مقام ہے اور عشق و فنا آخری۔"

۵۹۔ ابو العباس قاسم سیاریؒ ہیں۔ ظاہری علوم کے علاوہ حقیقت کے بھی آپ بہت بڑے فاضل تھے اور اس میں آپ کی کئی مشہور کتابیں ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: "صحیح توحید یہ ہے کہ حق کے سوا تیرے دل میں کسی چیز کا گزر نہ ہو۔"

۶۰۔ ابو عبداللہ محمد بن خفیف ہیں۔ آپ اپنے وقت میں تمام علوم کے امام مانے جاتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:
"توحید کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے نفس اور طبیعت سے منہ موڑ لے۔"

۶۱۔ ابو عثمانؒ سعید بن سلام مغربی ہیں۔ آپ بہت سی کرامات سے مخصوص اور صاحب تمکین بزرگ تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:
"جو شخص فقراء کی صحبت چھوڑ کر اہل ثروت کی صحبت اختیار کرتا ہے، حق تعالیٰ اس کے دل کو مردہ بنا دیتا ہے۔"
۶۲۔ ابو القاسم ابراہیم بن محمد نصر آبادیؒ ہیں۔ آپ خوارزم کے حکمران تھے، لیکن تخت و تاج چھوڑ کر راہِ طریقت اختیار کی۔ بے مثال عالم اور صاحبِ شخصیت تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:
"جب بندہ سچے دل سے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر لیتا ہے، تو ولایت کا مقام حاصل کر ہی لیتا ہے۔"
۶۳۔ ابو الحسن علی بن ابراہیم حضریؒ ہیں۔ آپ بارگاہِ الٰہی کے باحشمت بزرگوں میں سے تھے۔ تصوف میں نہایت نفیس کلام کے مالک ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: "میرے برے بھلے کا محاسبہ چھوڑ دو کیونکہ میں اس آدمی کی اولاد میں سے ہوں جس نے اپنے پروردگار کے پہلے حکم کی بھی مخالفت کی تھی۔"

بارہواں باب

صوفیائے متاخرین

حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ "حق تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق اپنی زمین کو اولیاء اور مخلص رہنماؤں سے کسی وقت بھی خالی نہیں چھوڑتا، خصوصاً میری اُمت پر کوئی ایسا وقت نہیں گزرے گا جس میں کچھ آدمی بھلائی پر نہ ہوں، بلکہ یہ ہمیشہ اولیائے کرام کے انفاسِ قدسیہ سے تازہ اور بالیدہ رہے گی۔" میں آئندہ سطور میں موجودہ زمانے کے چند ایسے بزرگوں کا ذکر کرتا ہوں جو اُمتِ مسلمہ کو اپنے رُوحانی فیوض سے متمتع کر رہے ہیں۔ ان میں سے:
۱۔ ابو العباس احمد قصابؒ ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: "جو شخص حق تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط رکھتا ہے، اس کا دل ہمیشہ مسرور رہتا ہے۔"
۲۔ ابو سعید فضل اللہ بن محمد مہیمنیؒ ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے کہ: "تصوف کے معنی یہ ہیں کہ بندہ اپنے مالکِ حقیقی کا باوفا بندہ رہے۔"
۳۔ ابو علی بن حسین وقاقؒ ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: "جس نے وحدہٗ لاشریک کے سوا مخلوقات میں سے کسی سے اُلفت اختیار کی، اس نے اپنی رُوحانی حالت کا خون کیا۔"
۴۔ ابو عبداللہ محمد بسطامیؒ ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:
"توحید کے مظاہرے خود تیرے وجود کے ہر ذرّے سے ثابت ہیں، لیکن تو اس کا تقاضا پورا نہیں کرتا۔"
۵۔ ابو الفضل محمد بن حسن ختلیؒ ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:
"اللہ تعالیٰ کے ہر فعل میں مصلحت ہوتی ہے۔ وہ جب چاہتا ہے تو ایک سپاہی زادے کو بھی شاہی تاج پہنا دیتا ہے۔"
۶۔ ابو القاسم عبدالکریم قشیریؒ ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:
"صوفی کی مثال سرسام کی بیماری جیسی ہے، جس کے اوّل میں ہذیان اور آخر میں سکوت ہوتا ہے۔"
۷۔ ابو العباس احمد بن اشقانیؒ ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: "میں ایسی نیستی چاہتا ہوں جس کے لیے کبھی ہستی ہی نہ ہو۔"
۸۔ ابو القاسم بن علی گرگانیؒ ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: "شرک کے اوہامِ باطلہ سے نجات پانے کے لیے پختہ عقیدے اور توحید کے ساتھ بندگی کی ضرورت ہے۔"

۹۔ ابو احمد مظفر بن حمدانؒ ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: "جب حق تعالیٰ کا اختیار بندے کے حق میں بقا پاتا ہے تو بندے کا اختیار خود بخود فنا ہو جاتا ہے۔"

تیرھواں باب

موجودہ زمانے کے صوفیائے کرامؒ

موجودہ زمانے میں بھی بہت اربابِ معانی ہیں، جن میں سے بعض کے مبارک نام یہ ہیں:-

شام اور عراق کے صوفیاؒ:

۱۔ شیخ زکی بن علاءؒ
۲۔ ابو الحسن بن سالبہؒ
۳۔ ابو اسحاق ابن شہریارؒ
۴۔ ابو الحسن علی بن بکرانؒ
۵۔ ابو مسلم ہرویؒ
۶۔ ابو طالبؒ

آذربائجان کے صوفیاؒ:

۱۔ شیخ شفیق زنجانیؒ
۲۔ ابو عبداللہ جنیدیؒ
۳۔ ابو طاہر مکشوفؒ
۴۔ خواجہ حسن سمنانیؒ
۵۔ شیخ سہلکیؒ
۶۔ احمد بن شیخ خرقانیؒ

کرمان کے صوفیاؒ:

۱۔ خواجہ علی بن حسینؒ
۲۔ شیخ محمد بن سلمہؒ

خراسان کے صوفیاؒ:

۱۔ ابو العباس وامغانیؒ
۲۔ ابو جعفر محمد بن علیؒ
۳۔ ابو جعفر ترشیزیؒ
۴۔ خواجہ محمود نیشاپوریؒ
۵۔ شیخ محمد معشوقؒ
۶۔ مظفر ابن ابو سعیدؒ
۷۔ شیخ جمادی سرخسیؒ
۸۔ شیخ احمد سمرقندیؒ
۹۔ شیخ ابو الحسن بن ابی علی الاسودؒ

ماوراٗ النہر کے صوفیاؒ:

۱۔ ابو جعفر محمد بن حسین حرمیؒ
۲۔ خواجہ فقیہؒ
۳۔ ابو محمد پاسغریؒ
۴۔ احمد ایلاقیؒ
۵۔ علی ابن اسحاقؒ
۶۔ ابو الفضل بن اسدیؒ
۷۔ اسمٰعیل شاشیؒ
۸۔ شیخ سالار طبریؒ
۹۔ محمد بن حکیمؒ
۱۰۔ سعید بن ابی سعیدؒ
۱۱۔ ابو العلا عبدالرحیمؒ
۱۲۔ شیخ اوحد قسورۃ بن محمد جزویریؒ

چودھواں باب

صوفیا کے فرقے

صوفیا کرام کے بارہ گروہ ہیں، جن میں دو گروہ مردود اور باقی دس مقبول ہیں۔ اگرچہ ان فرقوں کی ریاضت و مجاہدے میں اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن توحید و شریعت کے اصول و فروع میں سب ایک ہی ہیں۔ میں ان سب کا بالاجمال تذکرہ کرتا ہوں تاکہ اس فن سے دلچسپی رکھنے والوں کی اِصلاح کا موجب ہو۔

۱۔ فرقۂ محاسبیہ: یہ ابو عبداللہ حارث ابن اسد محاسبیؒ کا پیرو ہے۔ آپ اپنے وقت کے بہت مقبول اور عارف باللہ تھے۔ اس فرقے کے نزدیک "رضا" تصوف کے مقامات میں سے کوئی مقام نہیں، بلکہ یہ احوالِ بندہ سے تعلق رکھتی ہے۔

۲۔ فرقۂ قصاری: یہ ابو صالح بن حمدون بن احمد بن عمارہ القصارہ کا پیرو ہے۔ آپ ملامت کو پسند کرتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے: "تیرے پاس اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا علم، مخلوقات کے علم سے اچھا اور پختہ ہونا چاہیے۔"

۳۔ فرقۂ طیفوریہ: یہ گروہ ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بن سروشان بسطامیؒ کا پیرو ہے۔ آپ کا طریقہ غلبہ اور مستی کا تھا۔ آپ کا ارشاد ہے کہ "طریقت میں صرف اس شخص کی اقتدا کرنی چاہیے جو احوال گردش سے نجات پا جائے اور اس کی طبیعت سکر پر قائم ہو۔"

۴۔ فرقۂ جنیدیہ: یہ گروہ ابوالقاسم جنید بن محمدؒ کا اتباع کرتا ہے۔ آپ سید الطائفہ اور طاؤس العلماء کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ آپ کا طریقہ طیفیوریوں کے برعکس "صحو" پر قائم ہے۔ آپ کا مسلک نسبتاً زیادہ مقبول ہے۔ اکثر برگزیدہ مشائخ اسی مسلک پر ہوئے ہیں۔ اس فرقے کے نزدیک کسی صاحبِ کمال کی صحبت سے استفادہ کے لیے ہوش میں ہونا ضروری ہے۔

۵۔ فرقۂ نوری: یہ گروہ ابو الحسن احمد بن محمد نوری کا اتباع کرتا ہے۔ یہ صوفی علماء میں بہت بلند پایہ اور نیک خصلت عالم تھے۔ اہل تصوف کے نزدیک آپ کا مسلک کافی پسند کیا جاتا ہے۔ اس فرقے کے اصول میں کسی اہل کمال کی صحبت سے استفادے کے لیے "ایثار" کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے بغیر دستورِ زندگی قابل اعتماد نہیں۔

۶۔ فرقۂ سہیلیہ: یہ گروہ حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ کا پیرو ہے۔ آپ اپنے زمانے کے رُوحانی بادشاہ تسلیم کیے جاتے تھے۔ آپ کا طریق اجتہاد اور ریاضت کا طریقہ ہے کیونکہ ریاضت و مجاہدہ انسان کو راہِ راست پر لاتا ہے۔

۷۔ فرقۂ حکیمیہ: یہ گروہ ابو عبداللہ محمد بن علی ترمذیؒ کا اتباع کرتا ہے۔ آپ حکیم ترمذیؒ کے نام سے مشہور تھے۔ ظاہری اور باطنی علوم میں اپنے وقت کے امام تھے۔ آپ کا طریقہ رُوحانیت اور ولایت کی بنیاد پر قائم ہے۔

۸۔ فرقۂ خرازیہ: یہ گروہ ابو سعید خرازؒ کی پیروی کرتا ہے۔ تجرید و انقطاع میں آپ بڑی شان رکھتے تھے۔ تصوف میں فنا و بقا کی اصطلاحات آپ ہی نے وضع کی ہیں اور آپ کے تمام ملفوظات ان ہی دو لفظوں پر مبنی ہیں۔

۹۔ فرقۂ خفیفیہ: یہ گروہ ابو عبداللہ محمد بن خفیف شیرازیؒ کا اتباع کرتا ہے۔ علم طریقت میں آپ کی کئی کتابیں ہیں۔ آپ ظاہری اور باطنی علوم میں یکتائے روزگار تھے۔ آپ کا طریقہ غیبت اور حضور پر مبنی ہے۔

۱۰۔ فرقہء سیاریہ: یہ فرقہ ابو العباس سیاریؒ کا پیرو ہے۔ آپ تمام علوم میں اپنے وقت کے امام تھے اور آپ کا طریقہ جمع و تفریق پر قائم ہے۔

مردُود گروہ

مذکورہ بالا دس گروہوں کے علاوہ دو مردود گروہ ہیں، جو کتاب و سنت اور اجماعِ اُمت کے خلاف سراسر باطل عقائد کے حامل ہیں۔ ان میں سے ایک کا عقیدہ ہے کہ بندہ حق تعالیٰ میں سرایت کرتا ہے اور دوسرا گروہ رُوح کا ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے اور جہالت سے اپنے ان خیالات کو ابو حلمان و مشقی اور حسین بن منصور حلاج کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ حلول اور تناسخ کا عقیدہ قرامطوں، باطنیوں اور ہندوؤں میں پایا جاتا ہے، جو بالکل خلافِ توحید و تحقیق ہے۔

مصطلحاتِ صوفیا

۱۔ رضا: رضا تصوف کے مقامات میں سے ایک مقام کا نام ہے، اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) حق تعالیٰ کی رضا　　(۲) بندے کی رضا

بندے کے حق میں اللہ تعالیٰ کی رضا فضل و کرم اور ثواب کا ارادہ کرنا ہے اور بندے کی رضا اللہ کے احکام پر قائم رہنا، ان کو بجالانا اور اس کی مشیت کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔

۲۔ حال و مقام: اپنی رُوحانی قوت و توفیق کے مطابق بارگاہِ خداوندی میں درجہ حاصل کرنے کا نام مقام ہے اور کسب و مجاہدے کے بغیر محض حق تعالیٰ کے فضل سے نکات و معانی کا دل پر نزول حال ہے، گویا مقام عمل کی قسم ہے اور حال اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بزرگی ہے۔

۳۔ صحو و سکر: ہوش کی حالت میں ذکر و عبادت کرنا صحو ہے۔ بے ہوشی اور اللہ تعالیٰ کے عشق و محبت کے غلبے کا نام سکر ہے۔

۴۔ ایثار: ایثار اپنے مسلمان بھائی کی اعانت کے لیے مستعد رہنا اور اس کی آسائش کے لیے اپنا حق چھوڑ دینا ہے۔ ایثار کی دو قسمیں ہیں: صحبت کا ایثار اور محبت کا ایثار۔ صحبت کا ایثار اپنے ہم نشین کے حقوق کی پوری حفاظت ہے اور محبت کا ایثار اپنی محبوب ترین چیز کو قربان کرنا ہے۔ صوفیا کے نزدیک ایثار کے بغیر حق کا پالینا محال ہے۔

۵۔ نفس اور اس کی حقیقت: نفس کے معنی ذات اور وجود کے ہیں لیکن صوفیا نے اس کی مختلف توجیہات کی ہیں۔ ایک گروہ رُوح کو، دوسرا جسم کو اور تیسرا ضمیر کو نفس کہتا ہے لیکن فی الحقیقت نفس اور روح ایک ہی لطیف اور پاکیزہ شے کا نام ہے۔

نفس کی تین قسمیں ہیں: (۱) نفسِ امّارہ (۲) نفسِ لوّامہ (۳) نفسِ مطمئنہ

نفسِ امّارہ انسان کو بُرائی اور خدا کی حکم عدولی کی طرف ترغیب دلاتا ہے، نفسِ لوامہ انسان کو کیے پر نادم اور پشیمان کر دیتا ہے اور مطمئنہ ذکر و عبادت کی تحریص دلاتا اور اسی سے فروغ پاتا ہے۔

۶۔ ولایت: تصوف اور معرفت کی بنیاد ولایت پر ہے۔ اس کے لفظی معنی تو سچی اور مخلصانہ دوستی کے ہیں لیکن صوفیا

کے نزدیک ولایت ایک مستقل جذبہ عشق و محبت کا نام ہے، جو عاشق کو معشوق کی ذات میں محو اور مستغرق کر دے۔ اس معنی کی رُو سے "ولی" کے معنی ہیں اللہ کا سچا اور مخلص دوست جو اس کی اطاعت سے ذرّہ بھر بھی سرتابی نہ کرتا ہو۔

۷۔ کرامت: خلافِ عادت چیز کا ظاہر ہونا کرامت ہے۔ اہل سنت و جماعت کے نزدیک اللہ کے ایک سچے ولی سے کرامت کا ظہور ممکن اور جائز ہے اور یہ لوگ اللہ کی تائید واعانت سے مافوق العادات چیزوں کے اظہار پر قدرت رکھتے ہیں۔

۸۔ کرامت اور معجزے میں فرق: کرامت اور معجزہ دونوں خارقِ عادت ہیں، لیکن کرامت ولی سے مختص ہے اور معجزہ نبی سے۔ کرامت کا اظہار ضروری نہیں لیکن معجزے کا اظہار ضروری ہے کیونکہ اس سے منکرین پر اتمامِ حجت مقصود ہوتا ہے۔

۹۔ فنا و بقا: فنا و بقا کے لفظی معنی عدم اور دوام کے ہیں لیکن دُنیائے تصوف میں ان کا تصور مختلف ہے۔ صوفیا کہتے ہیں کہ اوصافِ محمودہ کے پیدا ہونے سے اوصافِ ذمیمہ خود بخود دُور ہو جاتے ہیں۔ پس جہل کی فنا علم حق کو اور غفلت و نافرمانی اطاعت و فرماں برداری کو مستلزم ہے۔ اسی طرح جب بندہ عشقِ الٰہی میں فنا ہو کر بقا پاتا ہے تو ماسویٰ اللہ، بلکہ خود اپنی ذات سے بھی فانی ہو جاتا ہے۔ غرض یہ کہ صوفیائے کرام ان دو لفظوں کو جب استعمال کرتے ہیں تو ان سے مراد ان کی فنافی اللہ اور بقاباللہ ہی ہوتی ہے۔

۱۰۔ غیبت و حضور: حضور کے معنی یقینی دلالت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور دل کا حاضر ہونا ہے اور غیبت ماسویٰ اللہ بلکہ اپنے آپ سے بھی غائب ہونا ہے۔ پس اپنے آپ سے غائب ہونا اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونے کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ غیبت بارگاہِ حق میں حاضر ہونے کا راستے ہے۔

۱۱۔ جمع و تفرقہ: لفظی اعتبار سے بکھری ہوئی چیزوں کو یکجا کرنے کو جمع اور اکٹھی کی ہوئی چیزوں کو بکھیرنا تفرقہ ہے، لیکن صوفیا کے نزدیک اپنی تمام خواہشات کو ذاتِ حق میں اس طرح جمع کرنا گویا ذاتِ حق کے سوا اس کے ذوق و شوق اور آرزو کا اور کوئی مرجع ہی نہیں، جمع ہے اور اس کے برعکس تفرقہ ہے۔

۱۲۔ رُوح کی حقیقت: رُوح کیا ہے؟ اس میں لوگوں نے کافی اختلاف کیا ہے۔ کوئی اسے قدیم اور جو ہر لطیف کہتا ہے، کوئی حادث اور عرض لیکن جس کو حق نے نورِ بصیرت عطا فرمایا ہے، وہ جانتا ہے کہ رُوح خالقِ کائنات کا ایک "امر" ہے، جس میں حیات بخشی کے غیرفانی عناصر موجود ہیں۔ یہ جب کسی قالب میں آتی ہے تو حق تعالیٰ کی عادتِ مجریہ کے تحت اس میں زندگی اور زندگی کے جملہ خواص پیدا ہو جاتے ہیں، غرض یہ کہ روح حق تعالیٰ کی مخلوق اور عالم امر سے تعلق رکھتی ہے۔

پندرھواں باب

عرفانِ الٰہی

معرفت کے معنی ہیں پہچاننا۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے جنات اور انسانوں کو اپنی معرفت کے سوا اور کسی چیز کے لیے پیدا نہیں کیا ہے، پس حق تعالیٰ کی معرفت ہر انسان کے لیے فرض ہے اور جس شخص کو ذات اور صفاتِ الٰہی کی معرفت حاصل نہیں، وہ زندہ درگور اور حق تعالیٰ کی نظر میں قطعی بے قیمت ہے، لیکن یہ یاد رہے کہ معرفتِ الٰہی عقل و فہم کی صحت پر موقوف نہیں بلکہ اس کی علت مشیت اور عنایت ایزدی ہی ہے۔

سولھواں باب

توحید

یہ یاد رکھو کہ انسان کی زندگی میں بنیادی شے توحید ہے کیونکہ حق تعالیٰ دوسرے گناہوں کے باوصف توحید صرفہ کی برکت سے ایک عاصی کو معاف فرماتا ہے۔ پس ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ حق تعالیٰ کو یگانہ اور بے مثل جانے۔ اس کے افعال و احکام میں اس کا کوئی شریک نہ بنائے اور ہر اس فعل و حرکت سے اجتناب کرے جو محفل توحید کے تقاضے کے منافی ہو۔

سترھواں باب

ایمان

ایمان کے لفظی معنی ہیں باور کرنا اور شریعت وحقیقت کی اصطلاح حق تعالیٰ کی وحدانیت، اس کے رسولوں اور کتابوں، اس کے فرشتوں، قیامت، حشر نشر، حساب و میزان، جزا و سزا، جنت و دوزخ، مرنے کے بعد جی اُٹھنے اور تقدیر کے عوامل پر محکم اور غیر متزلزل یقین رکھنا ایمان ہے اور یہی اہلِ سنت و جماعت کا پسندیدہ عقیدہ ہے۔ معتزلہ اور خوارج اقرار و عمل کو ایمان کہتے ہیں۔ اس لیے وہ گناہ و نافرمانی کو موجب کفر خیال کرتے ہیں، غرض یہ کہ دلی تصدیق ویقین اصل ہے اور امورِ شرعی کی رعایت و اطاعت اس کی فرع ہے۔ پس تصدیق کے بغیر مغفرت ممکن نہیں اور عمل کے بغیر مغفرت ممکن تو ہے، لیکن عذاب سے قطعی نجات ممکن نہیں۔

اٹھارواں باب

طہارت

ایمان لانے کے ساتھ ساتھ عبادات کرتے وقت جس طرح ظاہری اور جسمانی طہارت ضروری ہے، اسی طرح دل اور باطن کی طہارت بھی لازمی ہے۔ اگر وضو کے بغیر نماز دُرست نہیں تو دل کی طہارت کے بغیر معرفت بھی دُرست نہیں، غرض یہ کہ جب کوئی بارگاہِ ایزدی میں ظاہری طہارت سے آراستہ ہوکر جائے تو اس کو چاہیے کہ وہ باطنی طہارت سے بھی آراستہ ہو۔ اس کا باطن نفاق، حسد، بغض، کینہ وغیرہ جیسی آلائشوں سے پاک اور توحید خالص سے آباد ہو، ورنہ اس کی کوئی بھی عبادت معتبر نہ ہوگی۔

اُنیسواں باب

توبہ

توبہ کے معنی ہیں اپنے گناہوں پر نادم اور پشیمان ہوکر حق تعالیٰ کی طرف جھکنا اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا مصمم عزم کرنا۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ”گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا معصوم ہو جاتا ہے گویا اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں۔“ شریعت وحقیقت میں توبہ ایک بنیادی چیز ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں:

(۱) گناہ سے توبہ کرکے حق کی طرف مائل ہونا (۲) ایک حق سے دوسرے حق کی طرف

(۳) اپنے آپ سے توبہ کر کے خدا کی طرف راجع ہونا

بیسواں باب

نماز

نماز کے معنی ہیں ذکر، دُعا اور فرماں برداری۔ یہ اسلام کا دوسرا رُکن ہے جس کی قرآن اور احادیث میں بہت تاکید وارد ہے۔ ایک سچے نمازی کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ اس کا ظاہر ہر قسم کی نجاست و ناپاکی سے پاک ہو، وہاں اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ اس کا دل و باطن شرک و شہوات نفسانیہ سے پاک ہو۔ اگر اس کا ظاہری قبلہ خانہ کعبہ ہو تو اس کا باطنی قبلہ عرش عظیم ہو۔ غرض یہ کہ نماز ایک ایسا فریضہ ہے جس کی ادائیگی سے بندے میں بندگی کے تمام اوصاف اجاگر ہو جاتے ہیں اور یہی معمول اللہ کے تقرب کا سب سے سہل ذریعہ ہے۔

اکیسواں باب

محبت

دراصل محبت ایک ایسی کیفیتِ قلبی کا نام ہے جسے الفاظ میں ادا کرنا محال ہے، تاہم بعض بزرگوں نے اس کی توجیہہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ دوستی میں صفائی اور خلوص کا نام محبت ہے اور فطری طور پر اللہ کی محبت بندے کو اور بندے کی محبت اللہ کو تمام چیزوں سے زیادہ پسند و عزیز ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) اللہ کی محبت (۲) بندے کی محبت

اللہ کی محبت بندے کے حق میں اس کا رحم و کرم اور بلند احوال و مقامات سے بندے کو سرفراز کرنا ہے اور بندے کی محبت اللہ کے حق میں اس کے اوامر کو بجا لانا، اس کے مناہی سے باز رہنا اور اس کی خالص توحید سے دُنیائے دل کو معمور کرنا ہے۔

بائیسواں باب

زکوٰۃ

زکوٰۃ کے معنی ہیں نمو اور تزکیہ۔ یہ اسلام کا تیسرا رُکن ہے، جو صاحبِ نصاب پر واجب ہے۔ اس کا مقصد شکر نعمت اور تزکیۂ مال ہے۔ اہل طریقت کے نزدیک جس طرح ظاہری نعمتوں میں زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے، اسی طرح باطنی نعمتوں میں بھی زکوٰۃ دینا واجب ہے۔ باطنی اور رُوحانی نعمتوں کی زکوٰۃ حفظِ ذکر اور تزکیۂ نفس ہے۔

تیئیسواں باب

جود و سخا کے بیان میں

علمائے لغت نے جود و سخا کو ہم معنی کہا ہے لیکن اہلِ معنی نے جود و سخا میں فرق بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سخی کی سخاوت کسی ذاتی غرض کے لیے ممکن ہے لیکن جود میں اپنے بیگانے کی کوئی تمیز ملحوظ نہیں ہوتی۔ جود و سخا صوفیا کرام کی ایک کمترین صفت ہے، خواہ اختیاری صورت میں ہو یا اضطراری صورت میں۔ وہ اپنا نفس، عزت، اولاد

اور اِملاک محبوبِ حقیقی کی راہ میں بے غرض خرچ کرتے ہیں اور وہ حق تعالیٰ کی محبت سے غنی ہوتے ہیں۔

چوبیسواں باب

روزہ

ماہِ رمضان کے باضابطہ روزے ہر مسلمان عاقل و بالغ پر از روئے شریعت فرض ہیں۔ روزے کے معنی اپنے تمام جسم اور جملہ حواس کو خلافِ شرع اُمور کے علاوہ کھانے پینے اور مباشرت وغیرہ سے باز رکھنا ہے اور محض کھانے پینے سے باز رہنا اور صوم کے آداب و شرائط کا کوئی لحاظ نہ کرنا روزہ نہیں۔ مقصد اس سے انضباط نفس اور حیوانی خواہشوں کو مغلوب کرنا ہے۔ طریقت و سلوک میں روزے کو بڑی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ اہلِ راز حق تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کی خاطر بحالتِ مراقبہ چالیس دن بھوکے رہتے ہیں۔ اس سے ان کی محبت میں صفائی اور رُوح میں لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔

پچیسواں باب

بھوک اور اُس کے متعلقات

بھوک کا رنج اُٹھانا باطن کی آبادی، روح کی صفائی اور دل کی روشنی کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ بھوکا رہنا بندے میں عاجزی اور فروتنی پیدا کرتا ہے اور اس طرح کے مجاہدہ و ریاضت کی بدولت طبیعت زیادہ تہذیب یافتہ اور مہذب ہو جاتی ہے۔ پیٹ بھر کر کھانے والا دُنیادار اور اللہ کی محبت میں بھوکا رہ کر اپنے نفس کو قابو میں لانے والا، دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

چھبیسواں باب

حج

عینی فرائض میں سے ایک حج فرض ہے، جو صاحبِ استطاعت مسلمان بالغ اور صحیح العقل پر واجب ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ حج سے مقصود محض بیت اللہ کا دیدار اور پتھروں کی زیارت نہیں بلکہ اس سے مقصود صاحبِ خانہ کی حضوری اور مشاہدہ، دل کو حرصِ دنیوی اور خیالاتِ باطلہ سے پاک کرنا اور اپنے نفس کو منیٰ کے میدان میں قربان کر کے ذاتِ الٰہی کے لیے خالص ہونا ہے۔

ستائیسواں باب

کشف و مشاہدہ

تجلیاتِ الٰہیہ کا دیدار اہلِ طریقت کے نزدیک کشف و مشاہدہ ہے اور اہلِ سنت والجماعت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جو شخص مجاہدہ میں رہتا ہے اور اپنی ظاہری آنکھوں کو محرمات سے بچائے رکھتا ہے، وہ ضرور حق تعالیٰ کے جمال اور تجلیات کا مشاہدہ کر لیتا ہے اور بار بار مجاہدے کی وجہ سے وہ اس مقام پر پہنچتا ہے کہ یہ تمام کائنات محبوبِ حقیقی کی صورت اختیار کر جاتی ہیں اور اس کو کائنات میں کوئی ایسی چیز دکھائی نہیں دیتی جس میں حق تعالیٰ کا جلوہ نہ ہو۔ دراصل یہ عشق و محبت کا آخری مرحلہ ہے جسے احسان کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔

اٹھائیسواں باب

آدابِ صحبت

دین اور دُنیا کے جملہ اُمور کی زینت ادب سے ہے۔ دنیا کی کوئی رسم ایسی نہیں جو آداب سے خالی ہو۔ حفظ ادب سے جہاں انسان میں شفقت و مروّت کے مبارک احساسات پیدا ہوتے ہیں، وہاں اس سے حق تعالیٰ کی خوشنودی بھی حاصل ہوتی ہے۔ ولایت کا انحصار اتباع سنت پر ہے، لہٰذا تارکُ الادب ولایت کا مقام حاصل نہیں کرسکتا۔ ادب یہ ہے کہ صحبت اور مجلس میں ہر ناشائستہ قول و فعل سے اجتناب کرے اور جب بارگاہِ حق میں حاضر ہو تو اس کے حضور کا خیال رکھے اور ایسی روش اختیار کرے جو صاحبِ حشمت بادشاہوں کے دربار میں اختیار کی جاتی ہے۔

اہلِ تصوف کی صحبت

مرید کے لیے سب سے مشکل چیز آدابِ صحبت کی حفاظت ہے، لہٰذا اسے حقوق صحبت کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیے، حفظِ مراتب کا خیال رکھے اور ہر شخص کو اس کے درجہ میں رکھے، بزرگوں کی عزت، ہم عمروں کا احترام اور چھوٹوں پر شفقت کرے۔

کھانے کے آداب

غذا کے بغیر انسان کا جینا مشکل ہے، مگر شرط یہ ہے کہ کھانے پینے میں حد سے نہ بڑھے اور غذا ہی کو مقصد حقیقی قرار دے کر بہائم کی طرح اس میں منہمک نہ رہے اور جب کھائے تو تنہا نہ کھائے بلکہ غرباء اور حاجت مندوں کو بھی یاد کرے، ہاتھ دھو کر کھائے اور جب کھا کر فارغ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کہے۔

چلنے پھرنے کے آداب

بندے کو چاہیے کہ ہمیشہ عجز و آہستگی سے قدم رکھ کر چلے اور چلتے وقت اِدھر اُدھر نظر نہ کرے اور اگر کوئی مسلمان سامنے سے آرہا ہے تو اُسے سلام کرے۔

اُنتیسواں باب

نیند کے آداب

قیام صحت کے لیے سونا ہی پڑتا ہے، لیکن اس میں حد اعتدال کو ملحوظ رکھنا چاہیے کیونکہ جو شخص زیادہ سوتا ہے، وہ غافل ہو جاتا ہے اور خدا سے غافل ہونا حجاب ہے۔ بالخصوص رات کے نصف آخر میں بیدار رہنا انبیاء و اولیاء کی پسندیدہ سنت ہے، جس سے دل کو حیات و طمانیت حاصل ہوتی ہے، الغرض نیند کی کثرت حجاب اور غفلت کی علامت ہے۔

تیسواں باب

گفتگو کے آداب

ہر چند قوتِ گویائی حق تعالیٰ کی نعمتوں میں ایک بڑی نعمت ہے لیکن اس کی آفات اور فتنے بھی بڑے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: "اپنی اُمت کے معاملے میں جس چیز سے مجھے سب سے زیادہ خدشہ ہے، وہ زبان ہے۔"

پس مومن خصوصاً مرید با صفا کو چاہیے کہ گفتگو کرتے وقت اپنی بات کی ابتدا اور انتہا پر خوب غور کرے کہ آیا اس کی گفتگو صداقت پر مبنی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو خاموشی اختیار کرے۔ بولے تو بالکل کم اور ہر بات حکمت و موعظت کا پہلو لیے ہوئے ہو۔

اکتیسواں باب

سوال کے آداب

ارشادِ الٰہی ہے کہ خدا کے "سچے بندے لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے اور جب ان سے کوئی سوال کرے تو پھر اس کا سوال ردّ بھی نہیں کرتے"، بہرحال جہاں تک ہو سکے مسلمان خدا کے سوا کسی سے سوال نہ کرے کیونکہ غیر اللہ سے مانگنا خدا سے منہ پھیرنا اور اس کی اعانت کو ناکافی سمجھنا ہے، جو صریح شرک ہے۔ ہاں اشد ضرورت، تنگ دستی اور افلاس کا مخلوقِ خدا کے سامنے اظہار ممنوع نہیں بلکہ حضور ﷺ نے نیک سیرت اور صاحبِ جمال لوگوں سے سوال کی اجازت دی ہے اور اگر یہ بالکل ناجائز ہو تو پھر زکوٰۃ و صدقات کہاں جائیں؟

بتیسواں باب

نکاح

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ "مجھے حق تعالیٰ کی تمام نعمتوں سے عورت زیادہ مرغوب ہے۔" اس لیے کہ ایک نیک سیرت و صاحبِ جمال خاتون کی صحبت انسان کے دین و دنیا دونوں کو مہذب بنا دیتی اور انسان کو معراجِ کمال تک پہنچانے میں عورت کی خدمت و اطاعت اور مخلصانہ محبت و رفاقت کا بڑا دخل ہے۔ تنہائی وحشت اور صحبت سعادت کا گھر ہے پس جسے نکاح کی توفیق ہو، بیوی کے حقوق کے ساتھ حق تعالیٰ کے حقوق کو بجالانے کی قدرت رکھتا ہو تو اس کے لیے نکاح لازمی ہے اور اتباعِ سنت بھی، لیکن جسے بہیمی اور حیوانی رُجحانات اور دل کا غیر اللہ کی محبت میں مکمل طور پر کھو جانے کا اندیشہ ہو تو تجرد فضل ہے۔

تینتیسواں باب

محاضرہ: حاضرہ حاضر رہنے سے ہے۔ صوفیا کی اصطلاح میں حضورِ قلب کے مفہوم میں بولا جاتا ہے۔
مکاشفہ: مکاشفہ کا مطلب ہے حقیقت کے خدوخال واضح ہو جانا، جس کے بعد مرید با صفا کو مشاہدہ نصیب ہوتا ہے۔
قبض: قبض کے معنی ہیں تنگی۔ اس سے مراد حجاب کی حالت میں دل کی تنگی، درد و کرب ہے۔
بسط: بسط کے معنی ہیں کشادگی۔ اس سے مراد کشف کی حالت میں دل کی کشادگی اور کیف و سرور ہے۔
اُنس: اُنس کی حالت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب حق تعالیٰ بندے کے دل پر شہودِ جمال سے تجلّی فرماتا ہے۔
ہیبت: ہیبت کی حالت بندہ کے دل پر جلال کے مشاہدے کے وقت پیدا ہوتی ہے۔
قہر: اس سے مراد حق تعالیٰ کی صفتِ قہاریت کا پرتو ہے۔ یہ طبع صوفیا کی ایک صفت ہے۔
لُطف: اس سے مراد حق تعالیٰ کی صفت "لطیف" کا عکس ہے۔ یہ بھی صوفیا کی صفت ہے۔
نفی: بشریت کے اوصاف و خواہشات کو محو کرنے کو نفی کہتے ہیں۔

اثبات: حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی ثابت کرنے کو اثبات کہتے ہیں۔
مسامرہ: رات میں عابد کا وہ وقت جس میں وہ حق تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہوتا ہے، مسامرہ کہلاتا ہے۔
محادثہ: دن کے اوقات میں وہ وقت جس میں وہ حق تعالیٰ کے ساتھ سوال و جواب میں منہمک ہو۔
علم الیقین: کسی چیز کے وجود کے متعلق یقین کے ساتھ علم، علم الیقین کہلاتا ہے۔
عین الیقین: کسی چیز کے وجود کے متعلق علم یقینی کے ساتھ اسے آنکھوں سے دیکھنا عین الیقین ہے۔
حق الیقین: مشاہدے کے بعد اس چیز کے بارے میں کامل اطمینان حاصل کر لینا، حق الیقین کا درجہ ہے۔ یہ تینوں حق کے دیدار کے درجات ہیں۔
علم: الفاظ و عبارات کے جاننے کو کہتے ہیں۔
معرفت: کسی چیز کے معنی اور حقیقت کے جاننے کو معرفت کہتے ہیں۔
شریعت: اللہ کے وہ احکام جو بندے کے اعضاو جوراح سے تعلق رکھتے ہیں، شریعت ہے۔
حقیقت: باطنی اوصاف کی تکمیل اور تزکیۂ قلب حقیقت ہے۔ شریعت و حقیقت دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ایک سچے مومن کے لیے دونوں کا اجتماع فرض ہے۔

چونتیسواں باب

سماع

حصول علم کے پانچ ذرائع ہیں، جنہیں حواسِ خمسہ کہتے ہیں۔ ان میں سے قوت سامعہ کو قوتِ باصرہ اور دوسرے حواس پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے، کیونکہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک دستور شرائع کا پہلا ذریعہ ہی قوت سامعہ ہے۔ دنیا میں جتنے انبیاء تشریف لائے، انہوں نے پہلے احکامِ الٰہی سنائے پھر لوگ ایمان لائے۔

سماعتِ قرآن

تمام سننے والی چیزوں میں سماعتِ قرآن کا درجہ بہت بلند ہے کیونکہ اس سے دل و دماغ میں فروغ، یقین و ایمان میں توانائی اور اشیائے کائنات کے متعلق حیات افروز درس ملتا ہے کیونکہ اوّل سے آخر تک الہامِ ربانی ہے۔

اشعار کا سماع

اشعار نثر کی طرح اچھے اور برے دونوں قسم کے ہوتے ہیں۔ صوفیا نے ان اشعار کے سننے کو بالکل جائز قرار دیا ہے جو اسلام و ایمان کی وضاحت، اخلاق حسنہ کے درس دینے اور خالق کائنات کے شواہد و معارف کے آئینہ دار ہوں، البتہ شرک و بدعت، فسق و فجور اور محرمات شرعیہ کا تذکرہ جس طرح نثر میں مذموم ہے، ویسے ہی نظم میں ہے۔

آدابِ سماع

جو شخص یہ کہتا ہے کہ مجھے سریلی آواز اور رُوح پرور نغمہ و ترنم اچھے نہیں لگتے، وہ بے حسی اور کو رذوقی کے باعث چوپایوں سے بھی بدتر ہے۔ طبائع مختلف ہیں اور کوئی شخص تمام لوگوں پر ایک حکم نہیں لگا سکتا۔ بہرکیف جو شخص حسِ لطیف سے عاری نہ ہو، وہ اچھی اور متوازن آوازوں سے کیف و سرور حاصل کر لیتا ہے۔

اچھی آوازوں کے سننے سے جو معانی اور جذبات دل میں پیدا ہوتے ہیں اگر وہ حق ہوں تو طبیعت حق کی طرف مائل ہوتی ہے، اگر وہ باطل ہوں تو طبیعت میں باطل راسخ ہو جاتا ہے تاہم اگر کسی کی طبع میں فساد ہی ہو تو وہ جو کچھ بھی سنے گا، سب فساد ہو گا۔ گویا سماع آفتاب کی مانند ہے، جو سب چیزوں کو روشن کرتا ہے مگر اس کی روشنی اور چیزوں کی صلاحیت کے مطابق اثر انداز ہوتی ہے، کسی پر کم اور کسی پر زیادہ، البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سماع حسبِ ضرورت اور کافی دیر کے بعد کرنا چاہیے۔ اسے عادت کے طور پر بالکل نہ اختیار کیا جائے تاکہ دل میں اس کی تعظیم قائم رہے۔

سماع اور رقص

شریعت اور طریقت دونوں رقص کے عدم جواز پر متفق ہیں۔ مشائخ نے ہر جگہ اس کی شدید مذمت کی ہے۔

وجد

راحت یا مصیبت سے خوشی یا غم کا تاثر وجد کہلاتا ہے۔ یہ رقص سے بالکل جداگانہ چیز ہے اور طالب و مطلوب کے درمیان ایک بھید ہے جو صرف وجدان ہی سے محسوس ہوتا ہے، الفاظ سے ادا نہیں ہو سکتا۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

جناب مولوی فیروز الدین رحمتہ اللہ علیہ ایک عظیم المرتبت مصلحِ قوم شمار ہوتے ہیں، جنھوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی علمی و ادبی کم مائیگی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے انہیں جہالت کے بحرِ عمیق سے نکالنے کا پختہ ارادہ کیا اور اللہ کے فضل و کرم سے سرسید احمد خان اور اُن کے دیگر رفقاء کی تقلید میں ہندوستان کے مسلمانوں کے علمی و ادبی ذوق کی ترقی و ترویج کا کام ایسے انداز میں انجام دیا جو سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ مولوی فیروز الدین رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے ان اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے فیروز سنز پرائیوٹ لمیٹڈ کی بنیاد رکھی اور دینی، علمی، ادبی، اخلاقی اور درسی کتب کی تحریر و اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ فیروز سنز اپنے قیام کے 108 سال مکمل کر چکا ہے اور مولوی فیروز الدین رحمتہ اللہ علیہ کے جاری کردہ کارِ عظیم کو بے حد کامیابی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

علم و ادب کے میدان میں مولوی فیروز الدینؒ کی چند عظیم کاوشیں

(۱) کشف المحجوب (اُردو ترجمہ): مولوی فیروز الدینؒ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز حضرت داتا گنج بخشؒ کی مایہ ناز تصنیف "کشف المحجوب" کے اُردو ترجمہ سے کیا، جو "بیان المطلوب" کے نام سے 1894ء میں شائع ہوئی۔ کشف المحجوب کو سب سے پہلے اُردو میں ترجمہ کرنے کا اعزاز آپ ہی کو حاصل ہے۔

(۲) تجریدِ بخاری: صحیح بخاری میں سے احادیث کا منتخب مجموعہ، جسے مولوی فیروز الدینؒ نے ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ مرتب کیا۔

(۳) تسہیل القرآن: قرآن مجید کا بامحاورہ اور سلیس اُردو زبان میں ترجمہ مع تفسیر جو مولوی فیروز الدینؒ نے اپنی زندگی کے آخری دور میں مکمل کر کے شائع کرایا۔

(۴) فیروز اللغات (اُردو جامع): یہ لغت، لغت نگاری کی جدید سائنسی بنیادوں پر مرتب کیا گیا ہے۔ اردو میں رائج ہونے والے نئے الفاظ اور علمی، ادبی، سائنسی، فنی اور دفتری اصطلاحات کے علاوہ قدیم و متروک الفاظ بھی شامل کیے گئے ہیں۔

(۵) فیروز اللغات (فارسی اُردو): فارسی کے تقریباً ساٹھ ہزار سے زائد قدیم و جدید الفاظ مع تفصیلی معانی اس لغت میں ترتیب دیے گئے۔

(۶) فیروز اللغات (عربی اُردو): پچاس ہزار سے زائد قدیم و جدید عربی الفاظ، مرکبات اور اصطلاحات کے معانی و مترادفات پر مشتمل لغت، جس کے لیے عربی زبان کی مستند ترین لغات سے استفادہ کیا گیا۔

(۷) مثنوی مولانا روم (منظوم اُردو ترجمہ): مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی "انوار العلوم" کا منظوم اُردو ترجمہ، خوبصورت الفاظ و تراکیب کے ساتھ کئی جلدوں میں تحریر کیا گیا اور جسے ادبی دنیا کا ایک شاہکار قرار دیا گیا۔

(۸) گلستان و بوستان (اُردو ترجمہ): ان تراجم کو علمی و ادبی حلقوں میں بے حد پذیرائی حاصل ہوئی جس میں نثر کو نثر اور شاعری کو شاعری ہی کے انداز میں ترجمہ کیا گیا۔ یہ کتابیں اپنے دور میں مدرسوں کے نصاب میں شامل رہیں۔

(۹) ماہنامہ تعلیم و تربیت: مولوی فیروز الدینؒ نے اساتذہ کی تربیت کے لیے ایک علمی و ادبی مجلّہ "تعلیم و تربیت" جاری کیا تھا جسے 1941ء میں خالصتاً بچوں کے لیے وقف کر دیا گیا۔ اس وقت سے اب تک یہ محبوب اور کثیر الاشاعت رسالہ ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

ISBN 969-0-00606-1

9789690006066

Rs. 495.00

فیروز سنز پرائیوٹ لمیٹڈ

لاہور راولپنڈی کراچی